اس صفحہ سے پہلے والے صفحات پھٹے ہوئے ہیں
Muhammad Yaqub

حصہ ششم

افریقہ اور مغرب اقصیٰ

حصہ ہشتم

سسلی یا صقلیہ

مندرجات

صفحہ

سرقوسہ کا محاصرہ، ایک نئی مصیبت۔ قریانہ کا معرکہ

الم انگیز سانحہ۔ خدا کی قدرت۔

۲۔ صقلیہ پر اسلامی پرچم ——— مسلمانوں کی جہانداری کے دلکش مناظر ۴۰۵

قصریانہ کا محاصرہ

۳۔ ابوالاغلب کا دور حکومت ——— شان دار۔ یادگار ۴۱۷

بحری طاقت کی طرف توجہ۔ دورِ فتوحات۔ اسکاٹ کا بیان

دا عتراف۔ تورنتو پر قبضہ۔ روما پر یلغار۔

۴۔ نیا ماحول ——— نیا تاجدار۔ نیا دور ۴۲۱

دشمن کی مرعوبیت۔ زبردست بحری لڑائی۔ یادگار فتح سقوط

قصریانہ کے بعد۔ بغاوت۔ بیزنطی حکومت کی شرمندگی۔ مالٹہ

پر مسلمانوں کا قبضہ۔

۵۔ شان دار دور ——— بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے ۴۲۶

سرقوسہ کا شاندار محاصرہ۔ رومی بیڑے کی آمد مسلمانوں کا

کارنامہ۔ ایک انقلاب گھمسان کا رن

۶۔ دورِ اختلال ——— بدنظمی۔ بے ضبطی۔ تعطل ۴۳۱

رومیوں کا حال زار

۷۔ سنبھالا ——— مقدس باپ نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ ۴۳۵

رومیوں کی جوہمت مندیاں۔ کلیسائے روما۔ پھر بیزنطی بیڑہ

باپ بیٹے کی جگہ۔ بطینق پر قبضہ۔

۸۔ ابوالعباس کا قتل ——— حالات و نتائج کے بعد دولتِ اغالبہ کا خاتمہ ۴۳۹

حصہ ہشتم

سلطنتِ عثمانیہ

صفحہ

دورِ عروج و کشورکشائی ۔ اصلاحات ۔ علم و تعلیم، علماء ۔ رعایا پروری ۔ خطابخشی اور داد و دہش ۔ رواداری غیر مسلموں کے ساتھ ۔ اشاعت اسلام ۔ تعمیرات ۔ خون ناحق ۔ سازش، بغاوت شورش ۔ ادبار و زوال کی داستان ۔ ضمیمہ ــــ !

احوال و سوانح

ــــ فہرست ملوک و سلاطین و خلفاء

دورِ عروج و کشورکشائی ــــ

مندرجات ــــ

زندگی کا نیا دور ۔ حکومت کی داغ بیل ۔ حسن اتفاق ۔ دو راستے پہلی فتح عظیم ۔ ایک اور فتح ۔ گیلی پلی پر قبضہ ۔ فتح ادرنہ حیرت انگیز شجاعت قسطنطنیہ کی باجگزاری سلسلہ فتوحات متحدہ یورش ۔ وفادار عیسائی ۔ فتوحات کا سیلاب ۔ بلغاریہ کا حشر ۔ افواجِ متحدہ ۔ یونان اور قسطنطنیہ ۔ سالونیکا اور سرویا کی فتح ۔ تاریخی معرکہ ۔ سرویا اور بوسینا ۔ فتح قسطنطنیہ ۔ کچھ اور فتوحات ۔ کریمیا کی فتح ۔ البانیہ کا سقوط ۔ فتح عظیم ۔ ہرزی گوینیا ۔ اسمٰعیل صفوی سے جنگ ۔ دیار بکر اور کردستان شام کی فتح ۔ چند اور فتوحات ۔ مصر پر قبضہ، حجاز مقدس خلافت اسلامیہ پر قبضہ ۔ بغداد پر قبضہ ۔ رہوڈس کی فتح ۔ ہنگری مسلمانوں کے قبضہ میں ۔ موصل اور بغداد پر تسلط ۔ عدن مقبوضات عثمانی میں ۔ تیونس اور قبرص کی فتح ۔ جارجیا پر قبضہ

صفحہ

ایران سے منفعت۔ بحث صلح ۔ بغداد پر از سر نو قبضہ۔ کریٹ پر ترکی قبضہ۔ روس سے جنگ اور صلح ۔ آسٹریا کی شکست روس اور آسٹریا کی صلح ۔ دردانیال پر جنگ گیلی پولی کا معرکہ۔

اصلاحات ۴۹۹

مندرجات

اوقاف کی انتہا۔ قانون نامہ۔ جاگیری نظام میں اصلاح۔ قانون رعایا۔ عام قوانین۔ بحری اصلاحات۔ اصلاحات کا شاندار دور۔ اصلاحات کا عام دور۔ مدارس و مکاتب علمی تراجم۔ فوجی اصلاحات۔ فرانسیسی توپچی اور انجنیئر۔ بحریہ کی اصلاح۔ اصلاحات محمودی۔ پاشاؤں کے اختیارات۔ اپیل کا حق۔ اوقاف کا انتظام۔ عمامہ کے بجائے ٹوپی۔ اصلاحات جیل۔ مجلس تعلیم عامہ۔ جنگی اصلاحیں۔ کونسل آف سٹیٹ عدالت عالیہ۔ ضابطہ فوجداری۔ پارلیمنٹ کا قیام۔ ترکیہ کا بنیادی دستور۔ کابینہ کا قیام۔ اعلان آزادی۔ فریب ہی فریب۔ انجمن اتحاد و ترقی۔ خفیہ جلسے۔ حلف نامہ۔ استبداد خون آشام۔ انقلاب کا کوتح۔ اعلان دستور۔ الفاظ پاشا کے الفاظ۔ پھر شرارت۔ اصلاحات کمالی۔ جمہوریت اور عزل خلافت۔ تحریک خلافت۔ پتلون اور ہیٹ۔ پردہ کی تنسیخ۔ لاطینی رسم الخط۔ ترکی زبان اور اذان۔ مسجد ایا صوفیہ

صفحہ

سیکولر حکومت

صفحہ

حصہ نہم

تعمیرات

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

حصہ دوم

فتح ہند ———— درہ خیبر کے راستہ سے

سلطان محمود غزنوی کی داستان فتح و ظفر

صفحہ

چند نئے خاندانوں کی فہرست۔

صفحہ

صفحہ

عہد مغلیہ (۲)

دور زوال و ادبار

صفحہ

حصہ یازدہم

انگریزوں کا عہد استیلا

حصّہ دوازدہم

پاکستان

صفحہ

حصّہ اوّل

عہدِ نبویؐ

باب ۱
عرب کا تعارف

عربستان ـــــ ایک بہت بڑا جزیرہ نما ہے، اس کا ایک حصہ صرف ریگستان پر مشتمل ہے، اور باقی تین اطراف کو سمندر محیط ہے، یعنی مغرب کی طرف بحر احمر، مشرق کی جانب بحر عمان اور خلیج فارس، اور جنوب کی سمت بحر ہند، مغرب کی جانب سرزمین عرب کی سرحدیں افریقہ سے ملی ہوئی ہیں، اور شرق کی جانب ایشیا سے،

طول و عرض جزیرہ نمائے عرب کا زیادہ سے زیادہ طول ۲۳ درجہ یعنی ۱۵۵۵ میل ہے، اور اس کا زیادہ سے زیادہ عرض ۱۲۲۶ میل ہے، اور جملہ رقبہ بطور ۱۸۶۶۰۰ مربع میل سے کسی قدر زیادہ ہے، گویا اس کا رقبہ مملکت فرانس سے زیادہ ہے[1]

مجموعی رقبہ عرب کا مجموعی رقبہ، ۱۲ لاکھ[2] مربع میل ہے جس میں ریگستانی، سنگستانی اور آبادرانی، تمام علاقے شامل ہیں،

اس ملک کا سب سے بڑا صحرا، شمالی حد میں شام و عرب کا درمیانی ریگستان ہے، دوسرا ریگستان جنوبی حد میں عمان اور یمامہ کے درمیان ایک وسیع صحرا ہے جس کو صحرائے اعظم، اور ربع خالی کہتے ہیں، اس کا مجموعی رقبہ تقریباً ۲ لاکھ ۵۰ ہزار میل ہے[3]

عرب کا نصف حصہ زرخیز اور شاداب ہے اور بقیہ نصف خشک اور غیر آباد ـــ ہوں نے ملک عرب میں جو پہاڑی سلسلہ ہے وہ بہت زیادہ بلند نہیں، تمام طور پر ان کی طے زیادہ کا بوجھ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہے، جبل السراۃ ـــ عرب کا سب سے بڑا ہی سب سے بڑی خصوصیت

موسم اور طوفان یوں تو ملک عرب کا شمارہ ابتدا ممالک میں رہا ہے، لکہ

---

[1] تمدن عرب از موسیو لی بان، [2] [3] ایضاً

عربی گھوڑا، قوی اور نازک مزاج چست و چالاک، اور اپنی آزادی کے گھمنڈ میں چور رہتا ہے، پھولے ہوئے نتھنے، اونچی گردن، پتلی کمر، دم پیچھے کو ابھری ہوئی، تربیت پذیر کم خوراک تیز رفتار ——— یہ ہے عربی گھوڑا ——— عربی گھوڑا صورت کے لحاظ سے بھی بڑا خوش اندام ہوتا ہے، اور سیرت کے لحاظ سے بھی یورپ کے بہترین نسل کے گھوڑوں پر فوقیت رکھتا ہے"[1]

اسپ و شتر کی اہمیت

اونٹ بدوی (عرب) کا جان نثار رفیق، اس کی دوسری انا، اس کی رضاعی ماں، رضاعی باپ ہوتا ہے، بدوی پانی کے بجائے اونٹ کا دودھ پیتا ہے، اس کا گوشت کھاتا ہے، اس کی کھال اوڑھتا ہے، اس کے بالوں سے اپنا خیمہ بناتا ہے، اس کی مینگنیاں ایندھن کے طور پر جلاتا ہے۔

اس کے برخلاف گھوڑے کی ملکیت دولت کی علامت ہے، عرب کا گھوڑا ——— الخیل ——— جسم کی خوب صورتی، قوت عمل، فہم و تمیز اور مالک کے ساتھ جاں نثارانہ وفاداری کے لئے مشہور ہے آٹھویں صدی میں عربوں نے الخیل عربی گھوڑے کو اندلس کے ذریعہ یورپ سے تعارف کرایا، یہاں اس گھوڑے نے اندلسی اور بربری گھوڑوں میں اپنے دائمی آثار چھوڑے ہیں، انگریزی گھوڑوں نے صلیبی لڑائیوں کے دوران عربی گھوڑوں کا تازہ خون حاصل کیا تھا۔

اگر کسی عرب کے خیمہ میں پانی کی قلت ہو، یہاں تک کہ خود اس کے بچے پانی کے لئے بلک رہے ہوں، تب بھی صاحب خانہ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر پانی کا آخری قطرہ تک اپنے گھوڑے کی گگری میں ڈالتا نظر آئے گا[2]

---

[1] تمدن عرب [2] فلپ ہتی کی "مختصر تاریخ عرب"

عرب

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں
لوؤں کی لپٹ، بادِ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے، سراب اور بیاباں
کھجوروں کے جھنڈ، اور خارِ مغیلاں
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی!!

باب ۲

ولایاتِ عرب

جغرافیین عرب نے، ولایاتِ عرب کی تقسیم یوں کی ہے:-

(۱) حجاز

یہ ایک پہاڑی اور ریگستانی خطہ ہے، اور سواحلِ بحر احمر کے وسطی حصہ میں واقع ہے، مکہ اور مدینہ اسی خطہ میں ہیں،

(۲) یمن

حجاز کے جنوب میں جزیرۃ العرب کے حصہ شرقی و جنوبی کا زرخیز ترین علاقہ،

(۳) حضرموت

(۴) مہرہ

(۵) عمان

(۶) احسا

یعنی خلیج عدن سے خلیج فارس تک کا علاقہ

(۷) نجد

یعنی عربستان کا وسطی حصہ، بہت زرخیز علاقہ ہے، یہ زرخیز علاقہ ہر چہار طرف سے ریگستان سے گھرا ہوا ہے[1]

تقسیم بطلیموسی بطلیموس نے تمام ملک (عرب) کو تین طبعی حصوں میں تقسیم کیا ہے،

(۱) عرب آباداں ——— یا العرب المیمونہ

(۲) عرب ریگستان ——— یا عرب الرمال

[1] تمدن عرب

(۳) عرب ریگستان ——— یا عرب الحجر

عرب آبادان میں بحراحمر کے ساحل پر حجاز، سواحل بحراحمر و ہند پر یمن، حضرموت اور سواحل خلیج فارس پر عمان و بحرین اور وسط عرب میں یمامہ اور نجد داخل ہیں [1]

عہدِ جاہلیت

اسلام سے پیشتر کا زمانہ عہدِ جاہلیت کہلاتا ہے

عہدِ جاہلیت یعنی اسلام سے پیشتر کے عرب انحطاط اور پستی کے آخر درجہ تک پہنچ چکے تھے، ان میں کچھ فضائل بھی تھے، خوبیاں بھی تھیں، وہ سیر چشم تھے، مہمان نواز تھے وہ بات کے دھنی تھے، وفاداری میں یکتا تھے، نڈر اور دلیر تھے، جری اور بیباک تھے، اور ساتھ ہی ان میں اخلاقی رذائل نے بھی گھر کر لیا تھا۔

وہ شراب کے رسیا تھے، جُوا ان کا بہترین مشغلہ تھا، خوں خواری اور خونریزی سے انہیں الفت تھی، بات بات پر لڑنا ان کا روزمرہ کا کھیل تھا، انتقام ان کی فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا، لڑکی سے انہیں نفرت ہوگئی تھی، اکثر ایسا ہوتا کہ پیدا ہوتے ہی وہ اسے زندہ زمین میں دفن کر دیتے، زناکاری ان کے نزدیک کوئی معیوب چیز نہ تھی، انسانی خون کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی،

عقائد

عقائد کے لحاظ سے بھی ان کی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی

عربوں میں ایک مختصر سی تعداد عیسائیوں اور یہودیوں کی تھی، لیکن یہ عیسائی اور یہودی بھی گم کردہ راہ تھے، انہیں نہ انجیل سے مس تھا، نہ توریت سے واسطہ، اپنے مذہب کی مقدس کتابوں میں انہوں نے تحریف کر کر کے حسبِ حال بنا لیا تھا،

ان یہودیوں اور عیسائیوں سے قطع نظر، وہاں کی غالب ترین اکثریت بت پرست تھی، یہ ایک خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، انہیں اپنے ان گنت دیوتاؤں کی پوجا کرنے میں لطف آتا تھا، یہ ظاہر پرستی کے شکار بھی ہو چکے تھے، یہ صرف پتھر ہی کو نہیں پوجتے تھے، ہر اس چیز کو پوجنے لگے تھے، جو ان کے لئے عجیب یا دہشت انگیز تھی، آسمان کے جگمگاتے ہوئے تارے، چمکتا ہوا چاند شعاعیں بکھیرنے والا سورج، درخت، سانپ، نہ جانے کتنی چیزوں کو انہوں نے اپنا معبود، اور خدا بنا لیا تھا

[1] ارض القرآن بحوالہ

ہم پرستی ان کے خمیر میں داخل ہو چکی تھی، یہ اسے بھول چکے تھے کہ انسان کا مجد و وقار کیا ہوتا ہے، انہیں صرف یہ یاد تھا کہ انسان خدا کے سوا، ہر طاقتور، انوکھی، اور نظر فریب چیز کی عبادت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔

خانۂ کعبہ حضرت ابراہیم نے خانۂ کعبہ کی تعمیر اس لئے کی تھی کہ وہاں ایک خدا کی پرستش ہو، ایک خدا کا بول بالا ہو، گردنیں اس کے سامنے جھکیں، احکام اسی کے چلائیں، ثنا و صفت، زبان پر صرف اسی کی جاری ہو،

اور اب وہی خانۂ کعبہ بتوں کا سب سے بڑا مسکن تھا، یہاں قدم قدم پر بت موجود تھے، کتنی بڑی ستم ظریفی تھی یہ بھی کہ خدا کے گھر میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، ان بتوں پر انسانی زندگی کی قربانی بھی رائج تھی[1] ——— اور یہ جہالت کی انتہا تھی

سیاسی حالات ہمیشہ سے عربوں کی یہ فطرت اور جبلت رہی تھی کہ وہ غلامی سے متنفر تھے، آزادی کے لئے زندہ رہنا ہی ان کا اصل شعار تھا،

یونانی اور رومی فاتحین یونانی اور رومی فاتحین نے صحرائے عرب اور سنگستانی عرب کو فتح کر لیا تھا[2] لیکن عرب آباد ان کے حدود میں وہ کبھی قدم نہ رکھ سکے، وہ بدستور اپنی آزادی اور حریت کا پرچم لہراتا رہا،

آزادی خطرہ میں لیکن اب ان کی آزادی بھی خطرہ میں پڑ چکی تھی، ایک طرف ایران کا تخت شاہی تھا جس نے اگرچہ عملاً عربوں کو اپنا غلام نہیں بنایا تھا لیکن اس کی ہیبت اور سطوت سے عرب کافی مرعوب اور متاثر تھے، بعض سرحدی علاقوں کے عرب فرمانرواؤں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، وہ روم کی سلطنت کو (جو اپنے وقت کی بہت بڑی سامراجی حکومت تھی) "کامن ویلتھ" اور اپنے تئیں اس کا ایک ممبر سمجھ رہے تھے۔

خالص عرب باشندے اگرچہ اب تک آزاد تھے، لیکن حالات ایسے تھے کہ اگر وہ کسی انقلابی تحریک

---

[1] تاریخ اسلام از سید امیر علی [2] ارض القرآن

سے دوچار نہ ہوتے، تو جلد یا بہ دیر انہیں غلامی کی زندگی اختیار کرنا پڑتی، اور روم و ایران میں سے کسی ایک یا دونوں کے غلام بن جاتے، وہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے، ان کی کوئی مضبوط حکومت نہیں تھی، ان کا کوئی نظم حکومت نہیں تھا، نہ ان کے پاس فوج تھی، نہ پولیس، انہیں اپنی شجاعت پر ناز تھا، لیکن یہ شجاعت انہیں وقت کی بہت بڑی سامراجی حکومتوں کے تسلط سے بچانے کی قدرت نہیں رکھتی تھی،

غرض، اخلاقی، مذہبی، روحانی، مادی، مالی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، ہر زاویۂ نگاہ سے وہ عروج کے بجائے پستی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے۔

باب ۳
شاندار ماضی بعید

عربوں کے ماضی کا انداز ان کے موجودہ حالات سے نہیں لگایا جاسکتا، اسلام کے وجود میں آنے سے پیشتر ان کی جو زار و زبوں حالت تھی اس سے بھی ان کے "شاندار ماضی بعید" پر روشنی نہیں پڑسکتی، عربوں کا وہ دورِ ماضی جو ابتدائے تاریخ سے شروع ہوا تھا بہت یکتا، اور باوقار تھا، ابتدائے تاریخ سے میری مراد عہد قبل از مسیح ہے، بلکہ اس سے بھی ہزاروں سال پہلے،

غلط ذہانت عربوں کے شاندار ماضی بعید کی جھلک دیکھ کر اکثر مستشرقین یہ دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے بھی عرب اپنی تہذیب اور ثقافت کے اعتبار سے بہت اونچے درجہ پر فائز تھے، نیز یہ کہ اسلام نے عربوں کو کچھ سکھایا نہیں بلکہ وہ اسلام سے پہلے ہی بہت کچھ جانتے تھے۔

لیکن یہ دعویٰ یا تو جہالت پر مبنی ہے یا خبثِ نفس پر، عربوں کا وہ دور جو زمانہ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، بیشک بہت شاندار تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ ترقی اس درجہ تنزل میں تبدیل ہوئی کہ عرب پڑھنا لکھنا تک بھول چکے تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسیرانِ جنگ کا فدیہ یعنی معاوضہ رہائی یہ قرار دیا کہ وہ کچھ آدمیوں کو لکھنا سکھادیں،

بہرحال مستشرقین یورپ نے اسلام کی اہمیت کم کرنے کے لئے، یہ یکسر بے بنیاد بات اپنے ذہن و دماغ سے پیدا کی، اس سے اُن کی ذہانت تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن افسوس کہ اس ذہانت کا استعمال نہایت غلط موقع پر کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہنر عیب بن گیا۔

مستشرقین یورپ کے اس بے بنیاد دعوے کو خود یورپ کے سمجھدار اور ژرف نگاہ طبقہ نے بھی کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ ان مزعومات و تخیلات کی تردید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور دلائل کی قوت سے ثا

سے ان مزخرفات کی تردید کی،

چنانچہ فرانس کے ایک مشہور مستشرق نے ان تخیلات و مفروضات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بڑی نکتہ کی بات کہی ہے، وہ کہتا ہے

"اگر یہ دعویٰ صحیح ہوتا تو قرآن تمدن اور تہذیب کے عام ابتدائی تعلیمات، اور کم از کم محرماتِ نکاح کے بیان کی تکلیف گوارا نہ کرتا!" [۱]

یہ اتنا مدلل اور مبرہن جواب ہے کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ کہنے یا لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی

ٹھوس حقائق

حقیقت یہ ہے کہ معاندین اسلام، اپنے جوشِ مخالفت، اور جذبۂ عناد میں ٹھوس حقائق تک کی پروا نہیں کرتے، وہ دلیل اور واقعیت سے بے نیاز ہو کر ہر ایسی بات کہہ گذرتے ہیں جس سے اسلام کی عظمت اور وقار پر حرف آتا ہو، یہ لوگ یہ سوچ کر دیدہ و دانستہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ شاید ایک آدھ آدمی ہی ان کے دام فریب میں آجائے ــــــــ، ایں ہم غنیمت است!!

قرآن میں جن اقوام عرب کی تہذیب و حضارت تمدن اور تہذیب، صناعی اور ہنرمندی، جذبۂ تخلیق اور قوتِ تعمیر مادی برتری اور سربلندی، جاہ و حشم، دبدبہ و صولت اور وقار و تجمل کا ذکر آیا ہے، ایک عرصہ تک یورپ کے سبک سر، "محققین کرام" انہیں محض داستان اور کہانی سمجھتے رہے، شاید ان کا خیال تھا جس طرح یونان کے علم الاصنام کی حقیقت، افسانہ اور کہانی کے سوا کچھ نہیں ہے، اسی طرح قرآن کے بتائے ہوئے واقعات بھی داستان پاستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن قرآن خدا کا کلام ہے، اس کی تائید و توثیق میں اس کائنات کا ذرہ ذرہ زمزمہ پرداز ہے۔

قدرت کا انکشاف

ایک عرصہ تک قرآن کے بیان کردہ واقعات کی تائید "ثبوت" سے نہ ہوسکی، لیکن اس عہد ارتقا میں جہاں ایک طرف یورپ کے ارباب علم نے اسلام اور قرآن کے خلاف مورچہ بندی کی، وہاں قدرت نے حقائق کے ایسے خزانے کھول دیئے کہ نہ مخالفین اور معاندین، بلکہ تمام اصحاب فکر و نظر دنگ رہ گئے۔

اس زمانہ میں حفریات ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کرچکا ہے یعنی زمین کی کھدائی کے بعد جو کتبے آثار، نقوش الواح وغیرہ جو دستیاب ہوئے ہیں، بڑی کدوکاوش کے بعد ان کے رسم الخط سے یورپ کے اصحاب فضل و کمال نے واقفیت بہم پہنچائی، اور اب تک کے نتائج یہ ہیں کہ ان کے اکتشافات اثریہ سے ہر ہر قدم پر قرآن کے بیان کی تائید، اور توثیق ہی ہوئی ہے،

یمن حضرت موت، حوران۔ تدمر، حجاز، عراق، حجر (اور دوسرے مقامات) میں قدیم عربوں کے بہت سے آثار عمارات اور یادگاریں ہیں جن میں ہزاروں کتبے اور نقوش کھدے ہیں، ان کتبات و نقوش سے علمائے آثار قدیمہ نے عجیب و غریب نتائج استنباط کئے ہیں، یہ کتبات اور نقوش زیادہ تر حمیری، سبائی، آرامی اور نبطی خط میں ہیں ——— [1]"

سد مآرب

ان کتبات کو عرب مؤرخین نے بھی بڑی سعی و کوشش کے بعد پڑھا، اور اب قدیم و جدید آثار کا یورپ کے محققین نے بھی سراغ لگایا، اور قدم قدم پر تائید الٰہی پر مجبور رہو۔

"عرب کا ملک قدرتی دریا سے محروم ہے، اس کی زرعی زندگی کا مدار ان پہاڑی چشموں پر ہے، جو بہہ کر وادیوں میں پھیل جاتے ہیں، یہ چشمے پہاڑوں سے اس طرح ناگہانی طور سے ابل پڑتے ہیں کہ قدرتی آبادیوں کو بے نشان کر دیتے ہیں، ان وجوہ سے قدیم عرب وادیوں میں بند تعمیر کیا کرتے تھے، جس کو عربی میں "سد" کہتے ہیں عرب کا مشہور ترین سد، سد مآرب ہے، جسے سد عرم بھی کہتے ہیں جو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے منہدم ہے اور جس کی شکستہ دیوار اب تک زائرین عدن کے لئے نشان عبرت ہے،

یورپین سیاحوں میں سد مآرب کا مشاہدہ سب سے پہلے ارناؤ نے کیا، لیکن اس کی اصل اہمیت گلازر نے ظاہر کی ——— یہ سد ایک زمانہ ممتد میں یعنی مختلف سلاطین یمن کے عہد میں تعمیر ہوا، اس میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں، اوپر سے نیچے تک کی کھڑکیاں حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں، سد کے دائیں بائیں مشرق مغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے، جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا، اس سد کے حالات ہمارے مفسرین نے جو بیان کئے ہیں (تفسیر طبری دیکھو) بعینہ مستشرق) ارناؤ کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے [2] (فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ بابت سال ۱۸۷۴ء)

---

[1] ارض القرآن۔

خاص امتیاز عرب کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ مختلف زبانوں میں مختلف قوموں کا مسکن رہا ہے۔ وہاں نئی نئی قومیں آتی اور بستی رہی ہیں، اور انہوں نے قدم جما کر پرانی قوموں کو دھکے دے دے کر پسپا اور جلاوطن ہونے پر مجبور کیا ہے؛

کلدانی دور عربوں کے عروج و ارتقا، اور ان کی تہذیبی اور ثقافتی معراج کا زمانہ وہ تھا جب وہاں کلدانی قبیلہ آکر بسا تھا، یہ لوگ ایک خاص تہذیب کے خالق تھے، اُن کے جو آثار قدیمہ جنوبی عرب میں اب تک خرابات اور کھنڈروں کی صورت میں موجود ہیں، وہ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے، کہاں تک ترقی حاصل کرلی تھی؛ ان کی حکومت مصر اور عراق تک پھیلی ہوئی تھی، انہوں نے بڑے عالی شان محلات و قصور تعمیر کئے، انہوں نے شاندار اور فلک شکوہ ایوان تیار کئے، انہوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر تراش کر اپنی زندگی کے ایسے نقوش قائم کئے جو ہزارہا صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی، اُن کی قوت تخلیق کے مٹے ہوئے دبے ہوئے، مرجھائے ہوئے خراب و خستہ، لیکن پائندہ اور مستحکم نمونے کے طور پر موجود ہیں، انہوں نے جس ذوق و شوق خلوص اور عقیدت، جذبہ اور سرگرمی کے ساتھ اپنی عبادت گاہیں، اپنے مندر اپنے پوجاپاٹ کے مقامات بنائے، زمانہ انہیں داستان پارینہ بنا چکا، لیکن اس داستان کے کچھ پھٹے ہوئے اوراق، زمین کے سینہ، پہاڑ کے دامن، اور آسمان کے سایہ میں اب بھی موجود ہیں، عدن کا وہ حیرت انگیز اور نادرۂ روزگار تالاب، جو آج بھی محققین آثار قدیمہ کے لئے ایک درس عظمت اور ظاہر بینوں کے لئے درس حیرت ہے، انہی کے دست نقش سازی کی قوت تعمیر و تخلیق کا شاہکار ہے،

بنو قحطان اس دنیا میں کوئی چیز بھی ہمیشگی کا جامہ پہن کر نہیں آئی ہے، جاندار ہو یا بے جان سب کو مرنا ہے، مٹنا ہے، اس مرنے اور مٹنے کی عمر کم یا زیادہ ہوسکتی ہے، اس کے محدود ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا، جس طرح افراد و اشخاص مرتے اور فنا ہوتے ہیں، اسی طرح قومیں اور ملتیں بھی فنا کے گھاٹ اُترتی ہیں، اور جس طرح قومیں اور ملتیں فنا کے گھاٹ اُترتی ہیں، اسی طرح وسیع اور گنجان، آباد اور پُر رونق شہروں پر بھی موت طاری ہوتی ہے، وہ شہر جن کی عظمت و رفعت کی داستانیں کتابوں میں موجود ہیں، جن کی عمارتوں اور سڑکوں، ایوانوں، محلوں، دریاؤں، تالابوں، دفتروں

تاریخ اسلام از امیر علی

اور حمو طیبوں کا ذکر سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وقت کے مرکز تہذیب و ثقافت[1] جو عبد مناف کا بیٹا تھا کے ذمہ آئی، کیا ہے؟

وہ شاندار شہر، ویرانوں میں تبدیل ہو گئے، بلند و بالا عمارتیں مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ وسیع اور کشادہ سڑکیں گرد و غبار کے طوفان میں دب گئیں، دریاؤں نے اپنا رُخ بدل دیا، اور کہیں سے کہیں بھاگ کر پہنچ گئے تالاب سوکھ گئے، کنوئیں اندھے ہو گئے۔

کلدانیوں کو ایک سامی قبیلہ بنو قحطان نے تباہ و برباد کر دیا، یہ قبیلہ فرات کے کسی مشرقی ملک[2] سے آیا تھا، اسی کے ایک سپوت یعرب[3] نے یہاں کے لوگوں کو "عرب" بنا دیا۔

صحیح وجہ تسمیہ لیکن یعرب کا مسکن یمن تھا، اس لئے سب سے پہلے خود یمن یعنی جنوبی عرب کو عرب کہنا چاہیئے، لیکن اس کے برخلاف عرب کا لفظ پہلے شمالی عرب کے لئے مستعمل ہوا۔

اہلِ جغرافیہ کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ عرب کا پہلا نام "عربہ" تھا، جو تخفیفاً بعد کو "عرب" بولا جانے لگا، اور اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پا گیا، چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی، جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہیں اس کی تصدیق ہوتی ہے،

اب سوال یہ ہے کہ اس ملک کا نام "عربہ" کیوں قرار پایا؟ اصل یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عربہ صحرا، اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے، عبرانی میں عربا، بیابان اور میدان کو کہتے ہیں، اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں، عرابہ کے معنی ہدایت کے ہیں، اور —— اعراب —— اہل بادیہ اور صحرا نشینوں کے لئے اب تک مستعمل ہے۔

چونکہ عرب کا ملک زیادہ تر ایک بیابان بے آب و گیاہ ہے، اس لئے اس کا نام "عربا" قرار پایا پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں کو عرب کہنے لگے"[4]

ساتویں صدی مسیحی تک قبیلہ یعرب کی حکومت یمن اور دوسرے عربی خطوں پر قائم رہی

---

[1] تاریخ اسلام از امیر علی [2] تاریخ اسلام از امیر علی [3] ارض القرآن

خاص ابتیاز

فدم حوالہ

باب ۴
خاندانِ قریش

اب ہم عہد جاہلیت کے اختتام کے قریب پہنچ رہے ہیں عہد سعادت ہماری آنکھوں کے سامنے آتا چلا جا رہا ہے۔

عرب میں سب سے آخری قبیلہ جو آکر آباد ہوا، اسے ہم اصطلاحاً "مستعرب" کہہ سکتے ہیں!۔ اس خاندان کا آغاز حضرت اسمٰعیلؑ سے ہوا جو حضرت ابراہیمؑ کے فرزند ارجمند تھے اور جنہوں نے باپ کے کہنے سے اپنی جانِ ناتواں قربانی کے لیے پیش کر دی تھی کہ وہ اپنے لرزتے ہوئے بوڑھے ہاتھوں سے اپنے نوجوان لختِ جگر کا گلا کاٹ کر اپنے خواب کے مطابق، خدا کی خوشنودی حاصل کریں، خدا کو یہ ادا ایسی بھائی، کہ ایک طرف تو ان کی جان بچالی دوسری طرف قربانی کی رسم مذہبی طور پر مسلمانوں میں اس طرح جاری ہوئی کہ آج تک کوئی مسلمان گھرانا ایسا نہیں ہے جہاں انتہائی جوش اور عقیدت کے ساتھ عیدالاضحیٰ کے موقع پر یہ رسم نہ انجام پاتی ہو!

خانۂ کعبہ

خانۂ کعبہ کی تعمیر حضرت اسمٰعیلؑ ہی کے مقدس اور محترم ہاتھوں انجام پائی۔

حجاز میں سب سے زیادہ محترم، معزز اور مقدس خاندان قریش کا تھا، پانچویں صدی عیسوی میں اس قبیلہ کے ایک شخص قصیؔ نے رفتہ رفتہ سارے حجاز کو اپنے زیرنگیں کر لیا، اس سے قبل مکہ عبارت تھا، چند خیموں اور جھونپڑیوں سے، لیکن قصیؔ کی اولوالعزمی نے مکہ کو ایک بارونق شہر بنا دیا، یہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھا سنہ ۴۸۰ھ میں اس کی وفات ہوئی، اور اس کا بیٹا عبدالدار اس کا جانشین ہوا،

عبد شمس اور عبد مناف

عبدالدار کی وفات کے بعد، اس کے پوتوں اور بھائی عبد مناف کے بیٹوں میں امورِ اختیار و اقتدار سے متعلق تنازعہ پیدا ہو گیا، آخر کافی رد و کد اور بحث و تمحیص کے بعد تقسیم کار کی یہ اسکیم فریقین نے منظور کر لی۔

(۱) مکہ کی آب رسانی اور محاصل کی وصولی کا دروبست عبد شمس کے سپرد ہوا، جو عبد مناف کا بیٹا تھا

(۲) کعبہ کی تولیت مجلس مشاورت کی سرپرستی، قومی امور کی انجام وہی عبدالدار کے پوتے کے ذمہ آئی،

ہاشم اور اُمیہ عبد شمس اپنے حق اقتدار و اختیار سے اپنے محبوب اور چہیتے بھائی ہاشم کے حق میں دست بردار ہو گیا، ہاشم مکہ کا ایک سربرآوردہ اور باعزت تاجر تھا، مہمانوں کی خوب خاطر مدارات کرتا تھا، لوگوں سے مروت اور حمیت کا برتاؤ کرتا تھا سنہ ۵۱۰ء میں ہاشم کا انتقال ہو گیا، اور اس کا بھائی مطّلب اس کا جانشین بنا، اس کے اندر بھی ہاشم کے صفات بدرجۂ اتم موجود تھے، سنہ ۵۲۰ء میں مطلب کی وفات ہوئی تو اس کا بھتیجا اور ہاشم کا بیٹا عبدالمطلب اس مسند عز و جاہ پر متمکن ہوا۔

اُمیہ ——— عبد شمس کا بیٹا تھا، لیکن اس میں وہ کردار کی بلندی نہیں تھی جو اس کے خاندان کے دوسرے افراد میں پائی جاتی تھی،

عبدالمطلب خاندان قریش کے سرتاج تھے، اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے سارا قبیلہ اُن کا بے حد احترام کرتا تھا، جب کوئی نزاعی مسئلہ پیش ہوتا تھا، یہی حکم اور ثالث بنائے جاتے تھے۔[۱]

اصحاب فیل ابرہہ، حبشہ کی فوج لے کر خانہ کعبہ کو ڈھانے انہی کے زمانہ میں ہاتھیوں کی قطار لے کر وارد ہوا تھا، یہ واقعہ سنہ ۵۷۰ء کا ہے[۲]

ابرہہ کی فیل کشی نے مکہ کے رہنے والوں کو حواس باختہ کر دیا جس کو جہاں جگہ ملی بھاگ گیا، حرم مکہ سے قریش بھی نکل کر جدھر سینگ سمایا، چلے گئے۔

لیکن عبدالمطلب نے راہِ فرار اختیار کرنے سے انکار کر دیا، انہوں نے کہا،

"خدا کی قسم ——— حرم الٰہی کی پناہ سے نکل کر غیر اللہ کی پناہ میں ہرگز نہ جاؤں گا!"

وہ بیت اللہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور پورے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ کہا،

۱۔ طبری ۲۔ تاریخ اسلام از امیر علی

اَللّٰھُمَّ اِنْ تَعْفُ فَاِنَّھُمْ عِیَالُكَ وَاِنْ تُرِدْ شَیْئًا فَھِیَ مَا بَدَا لَكَ

یعنی: اے اللہ اگر تو انہیں معاف فرمادے تو یہ خلقت تیری ہی عیال ہے، اور اگر تو کچھ اور کرنا چاہتا ہے تو جو کچھ بھی تو کرے وہی مناسب ہے[1]

اولادِ عبدالمطلب

عبدالمطلب کے کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں، ان میں سے چند نے بہت شہرت پائی،

(۱) عبداللہ

(۲) عبدمناف (ابوطالب)

(۳) عباس

(۴) حمزہ

عبدالمطلب اپنی اولاد کے اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے، لائق، خوب صورت، بہادر، شجاع، فیاض، دریادل، نیک اولاد پاکر کون باپ ہے جس کا دل باغ باغ نہ ہوگا؟

اکثم بن صیفی نے بطحا میں اولاد عبدالمطلب کو چلتے پھرتے دیکھا، تو کہا،

"یہ اللہ کے لگائے ہوئے درخت ہیں انسان کے نہیں ہیں"[2]

عبداللہ

یہ عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، لیکن نہایت حلیم اور بردبار، نیک اور پرہیزگار متین اور ہونہار،

اہل قریش عبداللہ کو بہت بابرکت مانتے تھے۔ آں حضرتؐ انہی کے صاحبزادے تھے،

عبدمناف

ان کا لقب ابوطالب تھا، نہایت بااصول، باوضع، چہرے سے رعب داب برستا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا، شرف اور سیادت ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں،

طبیعت کے نرم، لیکن اگر مقابلہ پڑجائے تو نہایت غیور، کسی سے دبتے نہیں تھے، کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے، سب کے کام آتے تھے،

حضرت علی مرتضیٰ انہی کے صاحبزادے تھے،

---

[1] [2] طبری

عباس یہ بھی عبدالمطلب کے نیک اور سعادت مند فرزندوں میں تھے، خاندان بنو عباس کے مورث بھی تھے،

حمزہ نہایت بہادر اور شجاع، سارا عرب اُن کی دلیری اور تہور کا لوہا مانتا تھا، ساتھ ہی ساتھ پاس عہد کے خوگر تھے، بڑے بڑے سرکش اور تند مزاج جب اُن کے سامنے آتے تھے، تو سنبھل کر بیٹھتے تھے، اور سنبھل کر بات کرتے تھے۔

ابولہب (عبدالعزیٰ) بھی عبدالمطلب کا بیٹا تھا، اپنی طبیعت، افتاد مزاج، خصلت، اور عادات و جبلت کے لحاظ سے بے انتہا دنی، رسول اللہ کو اور اسلام کو اُس نے نقصان پہنچانے کی جتنی کوششیں کیں کبھی بڑے سے بڑے دشمن اور معاندنے بھی نہیں کیں۔

اسی کی اسلام دشمنی کے نتیجہ کے طور پر قرآن میں "سورۃ لہب" نازل ہوئی، ابولہب، خود جتنا بد باطن تھا اس کی بیوی اس سے زیادہ تھی، ان دونوں نے سازشیں کر کر کے بارہا اس کی کوشش کی رسول اکرم کی جان لے لیں، ان میاں بیوی کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح دعوت اسلام کامیاب نہ ہونے پائے، کسی طور سے بھی، محمد کی بات نہ سنی جاتے، عرب بدستور بت پرست رہیں، خدا کی وحدانیت کا نہ ذکر ہو نہ چرچا۔

اگر رسول اللہ کی دعوت ذاتی اور شخصی ہوتی تو شاید یہ شخص کامیاب ہو جاتا لیکن وہ دعوت خدا کی طرف سے تھی، خدا اپنے نام کا بھی محافظ تھا، اور اپنے رسول کا بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ابولہب اور اس کے شرکا و رفقا دنیا میں بھی ذلیل اور رسوا ہوئے، اور آخرت میں بھی کندۂ جہنم بنے،

جاء الحق وزھق الباطل، ان الباطل کان زھوقا

عبدالمطلب کی وفات عبدالمطلب نے وفات کے وقت آپ کو ابوطالب کی تولیت میں دیا، جب اُن کی وفات ہوئی، تو ــــ اُم ایمن کہتی ہیں میں نے اُس دن دیکھا رسول اللہ عبدالمطلب کے تابوت کے پیچھے پیچھے رو رہے ہیں ــــ [1]

---

[1] طبقات ابن سعد جزو اوّل

ابوطالب

ابوطالب نے آں حضرت کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کے بعد جس ایثار، فدویت، محبت خلوص جانبازی کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، ابوطالب کو اپنے بھتیجے سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ اس کی خاطر انہوں نے بے تامل اپنی قوم سے دشمنی مول لے لی، ہر طرح کے شدائد اور نوائب کا مقابلہ کیا۔ آبائی دین کے مقابلہ میں بھتیجے نے ایک نئے دین کی دعوت دینی شروع کی، اور یہ دعوت کفار مکہ اور اصحاب قریش پر اتنی گراں گزری کہ وہ ہر اصول اور روایت کو نظر انداز کر کے آپؐ کے درپئے آزار ہو گئے۔ لیکن کٹھن سے کٹھن مواقع پر، ہر آڑے وقت میں جو شخص سینہ سپر ہو کر سامنے آیا وہ ابوطالب تھے۔ حضرت علیؓ ابوطالب کے بیٹے تھے، اور آں حضرتؐ کے چچازاد بھائی، بچپن ہی سے حضرت علیؓ کو آں حضرت کی رفاقت اور معیت دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب تھی۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے رسول اللہؐ کو نماز پڑھتے دیکھا تو بے تامل خود بھی نیت باندھی، اور بڑے بھائی کی اقتدا میں نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ باپ (ابوطالب) نے یہ منظر دیکھا، اور مسکرا دیئے، نہ بیٹے کو ڈانٹا نہ بھتیجے کو ملامت کی زندگی کی آخری سانس تک ابوطالب کی محبتِ رسولؐ، اور تعلق خاطر میں فرق نہیں آیا، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ بھی ادب و احترام کے ساتھ ان کا نام سنتے اور ذکر کرتے ہیں، جس نے رسول امیؐ پر اپنے آپ کو قربان کر دیا، اگر وہ بھی عقیدت، عظمت، اور محبت کا سزاوار نہیں تو اور کون ہو گا؟

وہ لوگ جو منی [illegible] حضرت محمدؐ کو چالیس سال بعد نبی مانتے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو طالبؑ کو کیونکر مسلمان مانیں؟

وہ لوگ جن کا کام ہی صرف اور صرف مسلمانوں کو کافر کہنا ہے وہ کیونکر مانیں گے؟

وہ لوگ جو امام حسینؑ اور یزید بن معاویہ ملعون کی جنگ کو دو شہزادوں کی جنگ سے تعبیر کریں۔ وہ کیونکر مانیں گے۔

عہدِ رسالت باسعادت

تاجکان اور [illegible] دفینوں کے اندر پنہاں اور قدوس علم ہیں [illegible]
خدایا! ان لوگوں کو اپنے حال پر رکھو۔
"خدا شناسی ظالم کو ظالم سے مرواتا ہے"
کیا افغانستان میں ایسا نہیں ہوا ہے؟

محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

لوگ بیٹھے ہیں ... ہم آل محمد سے دشمن نہیں ہیں۔
غور کریں ؟ لکھا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔
تو آلہ لینا ہے ؟ → very True agree

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی ، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگذر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

باب ۳

ظہورِ پُرنور

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا دُعائے خلیل و نویدِ مسیحا!

۵۷۱ء یا اس کے لگ بھگ مکّے کے ایک معزز قبیلہ قریش میں ایک لڑکا پیدا ہوا، قریش کا یہ قبیلہ شہر کے معبد کا متولّی تھا جس میں بے شمار بُت تھے، اور یہ معبد گرد و نواح کے زائروں کا مرجع تھا، قرآن میں اس بچّے کا نام محمد اور ایک جگہ احمد آیا ہے یہ نام جس کے معنی "بہت تعریف کیا ہوا" کے ہیں، وہ نام ہے جس پر دُنیا کے اتنے لڑکوں کے نام رکھے جاتے ہیں کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس بچّے کے والد نے اس کی ولادت سے پہلے ہی وفات پائی، اور جب چھ سال کا ہوا تو ماں بھی گذر گئیں۔[1]

ولادت عبدالمطلب کا جوان اور چہیتا بیٹا — عبداللہ — ابھی چند ماہ ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا تھا، کہ ۹ ربیع الاوّل (۲۰ اپریل ۵۷۱ء) کو یہ سوگوار گھر مسرت کے شادیانوں سے پھر معمور ہو گیا، جوان مرگ بیٹے کی محبت، نوزائیدہ پوتے کی طرف منتقل ہو گئی، وفورِ محبت میں نام ایسا چنا، جو خاندانی ناموں سے بالکل الگ تھا —— "محمد"! لوگ بھلا کیوں چپ رہتے ؟ پوچھا، یہ ایسا الگ تھلگ سا نام کیوں ؟ جواب دیا، نام کی نامانوسیت پر غور نہ کرو، معنویت کو دیکھو، میرا یہ بیٹا ساری دُنیا کی مدح و ستائش کا مرکز بنے گا! لوگ خاموش ہو رہے، لیکن کاتبِ قدرت نے یہ نامِ نامی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔

رضاعت عربوں کو اپنی "عربیت" پر بڑا ناز تھا، وہ چاہتے تھے، اُن کے بچّے عرب خصوصیات کا نمونۂ کامل ہوں، عربیت کا جتنا تحفظ دیہات میں ممکن تھا، شہر میں ناممکن تھا، اسی

---

[1] فلپ ہتّی، مختصر تاریخ عرب

خیال سے شرفا و رؤسائے عرب، اپنے بچوں کو بدی عورتوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔

چنانچہ چھ مہینہ کی عمر میں عبدالمطلب کا یتیم پوتا، حلیمہ سعدیہ کے آغوشِ عاطفت میں دے دیا گیا۔

اس یتیم بچے کو گھر میں لاتے ہی حلیمہ کا غریب خانہ، برکتوں کا مخزن بن گیا، محبت پہلے ہی کم نہ تھی، اب اور بڑھ گئی [1]

دادا کی محبت

عمر کا مسافر ابھی چھ منزلیں طے کر کے کچھ آگے بڑھا تھا کہ ماں کا انتقال بھی ہو گیا لیکن ابھی عبدالمطلب زندہ تھے، اور جب تک وہ زندہ تھے، آغوشِ مادر اور شفقتِ پدر، دونوں چیزیں موجود تھیں ——— "صحنِ کعبہ میں عبدالمطلب کے لئے فرش بچھایا جاتا، رسول اللہ ؐ ہنوز لڑکے ہی تھے، تاہم جب تک حضرت نہ آلیتے، عبدالمطلب اس فرش کے قریب تک نہ جاتے، آپ آتے تو اپنے چچا کی نشست سے آگے بڑھ کر دادا کے پاس پہنچ جاتے، عبدالمطلب وفورِ محبت سے بیتاب ہو کر کہہ اٹھتے "میرے بیٹے کو آنے دو، اس کی ایک خاص شان ہو گی ———" [2]

عبدالمطلب کا انتقال

آپؐ کی عمر ابھی آٹھ ہی سال کی تھی کہ محبت کرنے والے اور جان چھڑکنے والے دادا عبدالمطلب کا وقتِ آخر آن پہنچا، اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ (۵۷۹ء) [3]

عبدالمطلب نے وفات کے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو دو ذمہ داریاں سونپیں،

(۱) سقایۂ زمزم

(۲) کفالت محمد

وفات کے وقت عبدالمطلب نے ابوطالب سے کہا،

اوصیک یا عبد مناف بعدی

بمفرد بعد ابیہ فرد

فارقہ وھو ضجیع المھد

---

[1] ابوالفداء ص ۱۲، طبری ——— حسب روایت طبری حضرت آمنہ کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۶ سال ۳ ماہ کی تھی [2] طبری [3] تاریخ اسلام از امیر علی

فکنت کالام لہ فی الوجد

تدنیہ من احشائہا والکبد

فانت من ارجی بنی عندی

لدفع الضیم او لشد عقد

یعنی :-

اے عبد مناف میں اپنے بعد تم کو وصیت کرتا ہوں،

اس یگانہ کی نسبت جو اپنے والد کے بعد تنہا رہ گیا ہے،

وہ ہنوز گہوارہ ہی میں تھا کہ والد اس سے جدا ہو گئے،

مگر تم شفقت سے اس کی ماں جیسے رہے،

ایسی ماں جو سینہ اور کلیجہ سے بچہ کو لگائے رہتی ہے،

اپنی اولاد میں مجھے تم سے زیادہ امید ہے،

سختی سے بچانے، یا مشکل میں کامیابی لانے کی![1]

چچی کا برتاؤ ابوطالب کو خود بھی یتیم و بے سر بھتیجے سے بہت زیادہ محبت تھی، باپ کی وصیت نے اس محبت میں اور اضافہ کر دیا۔

اگرچہ ابوطالب صاحبِ مال و زر نہیں تھے لیکن شخصی اور خاندانی وجاہت نے انہیں بہت زیادہ معزز اور محترم بنا دیا تھا، سب ان کی عزت کرتے تھے، ان کی بات کا مان رکھتے تھے، ان کے جذبات کی پاسداری کرتے تھے۔

آں حضرتؐ کی پرورش کا بار ابوطالب کی بیوی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم نے بڑی خوشی اور محبت سے اٹھایا۔ روایت ہے کہ جب وہ جاں بحق ہوئیں، تو رسول اللہؐ نے فرمایا ——— آج میری ماں مر گئیں! پھر آپ نے اپنی قمیص کا کفن دیا، قبر میں اترے، لحد میں لیٹ گئے، کہا گیا، یا رسول اللہ فاطمہ پر آپ بہت غمگین ہوئے، آپ نے فرمایا ——— "وہ میری ماں تھیں، اپنے بچوں کو بھوکا رکھتیں اور مجھے سیر کرتیں

[1] ابوالفداء

ان کے بال بکھرے ہوتے، مگر میرے بالوں میں تیل لگاتیں اور سنوارتیں۔[1]

چچا کی شفقت

ابوطالب کا یہ عالم تھا کہ وہ حتی الامکان ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے محبوب کو اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، وہ کوئی ایسی بات نہیں ہونے دیتے جس سے محمد کے نازک اور معصوم دل کو ٹھیس پہنچے، وہ اپنی اولاد تک کی بھتیجے کے مقابلہ میں پروا نہ کرتے تھے۔

ابوطالب کا ذریعہ معاش تجارت تھا، ایک مرتبہ وہ شام کے سفر پر روانہ ہونے لگے، سفر کی تکلیفوں کے خیال سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپؐ کو ساتھ نہ لے جائیں، اب آپ کی عمر مبارک بعض مورخین کے نزدیک بارہ کی بعض کے نزدیک تیرہ سال کی ہو چکی تھی[2] ابوطالب جب روانہ ہونے لگے، تو آپؐ نم آلود آنکھوں کے ساتھ چچا سے لپٹ گئے، محبت کرنے والے چچا سے یہ کیفیت نہ دیکھی گئی، انہوں نے پھر کچھ نہ کہا، اور ساتھ لے لیا،

سنِ شعور

غرض، اس طرح آپؐ سنِ شعور کو پہنچے، بچپن سے نوجوانی تک آپؐ کی زندگی ایک آئینے کی طرح صاف، اور روشن نظر آتی ہے، آپ نے کبھی کسی ایسے کام میں شرکت نہیں کی جو کسی اعتبار سے بھی قبیح ہو، آپؐ کی زندگی سراپا تقدس، اور نیکی تھی، لہو ولعب، شرک وفسق، شراب اور جوا، ناچ رنگ، بدعہدی اور ظلم، ان چیزوں کے قریب بھی کبھی آپ نہیں پھٹکے، پاک دامانی اور طہارت نفس کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ——— "جب آپ سنِ بلوغ کو پہنچے، آپ کے اوصاف یہ تھے، صاحب مروت، ذی حلم، فصیح اللسان، صادق القول، صادق الوعدہ، امین اور پارسا ایسے کہ آپؐ کے ہم عمروں میں کوئی بھی آپ کا مثل ونظیر نہ تھا، قوم میں آپ "امین" کے لقب سے مشہور تھے"[1]

فکر معاش

آپ بے انتہا غیور تھے، اگرچہ آپ کے ساتھ ابوطالب کا برتاؤ بالکل باپ کا سا تھا، لیکن آپ کی حمیت نے اسے گوارا نہ کیا کہ آپ خود کچھ نہ کمائیں، خاندان کا پیشہ تجارت تھا، چنانچہ اسی پیشہ کو اختیار کر لیا، آپؐ کے پاس کوئی ذاتی سرمایہ نہ تھا کہ اپنا کاروبار شروع کر سکتے، لیکن آپ کی صداقت، دیانت اور امانت کی ساکھ اتنی زیادہ تھی کہ بے تکلف روپیہ والے

---

[1] ص ابوالفداء

ب اپنا مال آپ کے حوالہ کر دیتے، سرمایہ اُن کا ہوتا محنت آپؐ کی، آپؐ اس محنت اور سچائی کے ساتھ کام کرتے کہ ٹوٹے سے کبھی دوچار نہیں ہوتے، ہر مرتبہ نفع ہوتا، آپؐ نفع بحصہ رسدی تقسیم کر لیتے۔

دیانت اور امانت

آپ کی دیانت اور امانت کا شہرہ، مکہ کی ایک دولت مند خاتون خدیجہ کے کانوں تک پہنچا، خدیجہ کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، تجارتی کاروبار کا سلسلہ کافی کامیاب اور کافی وسیع تھا، وہ بھی خاندان قریش سے تعلق رکھتی تھیں، چند پشتوں کے بعد آپؐ کا اوران کا خاندان مل جاتا تھا۔

ایک روز خدیجہ نے آپؐ کو بلایا، اور استدعا کی کہ میرا مال تجارت شام لے جائیے، جو معاوضہ (اجرت) ——— میں دوسروں کو دیتی ہوں، آپؐ کو اس سے دوگنا دوں گی، آپ نے منظور فرما لیا[1] خدیجہ کے غلام ——— کے ساتھ آپؐ مالِ تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے اور کامیاب و کامران واپس آئے،

پیامِ نکاح

غلام نے خدیجہ سے آں حضرت کی سیرت و کردار کے بارے میں اپنے مشاہدات اپنی مخدومہ کے سامنے حرف بہ حرف بیان کئے[2] وہ خود بھی جانتی تھیں کہ آپؐ ——— "مروت اور جواں مردی میں تمام قوم سے افضل خلق میں سب سے اچھے، اختلاط و معاشرت میں سب سے شریف تر، باتیں کرنے میں سب سے بہتر، حلم و امانت میں سب سے بڑے تکلم میں سب سے سچے فحش و اذیت میں سب سے دور و نفور، نہ کبھی گالی گلوچ کرتے دیکھے گئے، نہ کبھی سے لڑتے جھگڑتے، یا کسی پر شک و شبہ کرتے پائے گئے ———[3]

چنانچہ خدیجہ نے ——— "یہ باتیں سن کر پیغمبرؐ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نکاح کی درخواست کی ———[4]"

شادی

آں حضرتؐ کو جب حضرت خدیجہ کا پیام نکاح پہنچا، تو آپؐ نے منظور کر لیا ——— اس وقت آپ ۲۵ برس کے تھے، اور خدیجہ چالیس برس کی تھیں، واقعہ

---

[1] طبقات ابن سعد، جزو اول [2] ابوالفدا [3] طبقات ابن سعد، جزو اول [4] ابوالفدا

اصحاب فیل سے دہ پندرہ برس پہلے پیدا ہو چکی تھیں —— [1] نکاح —— تمیں اونٹ کے مہر —— [2] پر منعقد ہوا۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر نو

خانۂ کعبہ کی عمارت بہت بوسیدہ اور کمزور ہو چکی تھی، قریش نے اسے از سر نو تعمیر کرایا —— " جب حجر اسود تک تعمیر پہنچی تو عرب کے قبائل میں سے ہر ایک نے یہ چاہا کہ اس پتھر کو اس کے اصل مقام پر دوبارہ نصب کرنے کی عزت اور فخر مجھے حاصل ہو، بات جب زیادہ بڑھی تو یہ فیصلہ ہوا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حرم کعبہ میں داخل ہو اُسے حکم مان لیا جائے، اور وہ جسے چاہے اس ذمہ داری کا امین بنا دے، دوسرے روز سب سے پہلے آپؐ حرم کعبہ میں داخل ہوتے، سب نے بے تامل آپ کو حکم بنا لیا، آپ نے چادر بچھائی، اس پر حجر اسود رکھا، اور فرمایا ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی اس چادر کا کونہ پکڑ لے، تاکہ یہ سعادت سب کے حصّہ میں آئے سب کو یہ رائے پسند آئی، چنانچہ اسی پر عمل درآمد ہوا، پھر آپؐ نے حجر اسود دستِ مبارک سے اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا —— [3]"!

اور اس طرح ایک بہت بڑی خوں ریزی سے عربوں کو اپنی ذات، دانائی اور تدبّر کے باعث بچا لیا، صلی اللہ علیہ وسلم!

---

[1] طبقات ابن سعد، جزو اوّل [2] ابوالفداء [3] ابوالفداء

باب ۶

نبوّت

تبلیغ ـــــــ ہجرت

آں حضرتؐ نے منصب رسالت پر فائز ہونے سے پہلے بھی بُت پرستی نہیں کی، وہ سوچا کرتے تھے یہ دُنیا کیا ہے؟ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس زندگی اور حرارت کا مقصد و منتہا کیا ہے؟ انسان کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ دُنیا کی تخلیق کس لئے ہوئی ہے؟ یہ چاند، یہ تارے، یہ سُورج، یہ درخت، یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ سمندر، یہ سب کیا ہیں؟ ان سب کو، ایک نظام خاص کا تابع کس نے کیا ہے؟ ـــــــ وہ کون ہے؟

خلوت گزینی مظاہر پرستی اور ظواہر پرستی سے آپؐ کو کوئی دلچسپی نہ تھی، اسرارِ کائنات کی گتھی سُلجھانے کے لئے آپ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے، وفادار، قدر شناس اور جاں نثار بیوی ـــــــ حضرت خدیجہؓ ـــــــ چند روز کا آذوقہ ساتھ کر دیتیں اور جب تک وہ ختم نہ ہو جاتا آپ وہیں رہتے۔

آخر کار آپؐ کی صالحیت، دُنیاوی کثافت پر غالب آگئی، صادق اور امین آپ پہلے ہی سے تھے، اب رویائے صادقہ یعنی سچے خواب بھی آپ کو دکھائی دینے لگے[1] "آپ کوئی خواب نہ دیکھتے تھے جو صبح کی سفیدی کی طرح پیش نہ آتا ہو! ـــــــ"[2]

نزولِ وحی ـــــــ "رسول اللہؐ کی عمر جب پُورے چالیس برس کی ہو گئی تو ماہ ربیع الاوّل میں[3] ـــــــ" اور ایک دوسری روایت کے مطابق ـــــــ "۱۷ رمضان یوم دوشنبہ کو حرا میں رسول اللہؐ پر فرشتہ (جبرئیل) نازل ہوا[4] ـــــــ" اور کہا۔

---

[1] طبقات ابن سعد جزو اوّل [2] ابوالفداء [3] طبری [4] طبقات ابن سعد جزو اوّل

اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق اقرأ و ربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم"

دہشت اس واقعہ نے آپ پر دہشت طاری کردی، آپ سیدھے حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے، سارا ماجرا بیان کیا،

حضرت خدیجہ، آں حضرت کے صفات، کردار اور سیرت سے واقف تھیں، انہوں نے آپؐ کی دل جوئی کی، کہا "خدا آپ کو رسوا نہیں کرے گا، آپ سچ بولتے ہیں، امانت ادا کرتے ہیں صلہ رحمی کرتے ہیں —— [1]" پھر وہ اپنے ایک عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو بہت بڑے عیسائی عالم تھے، انہوں نے سنتے ہی کہہ دیا —— "یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ پر اترا تھا، اگر میں زندہ رہا تو دعوتِ محمدی کی مدد کروں گا، اور ایمان لے آؤں گا —— [2]!"

تبلیغ و دعوت اب آپؐ پر بار بار وحی نازل ہونے لگی، اور آپؐ نے دعوت کا سلسلہ شروع فرما دیا،

انسان کی صداقت، خدمات، امانت، شرافت، سیرت اور کردار کا صحیح ترین اندازہ اس کے گھر والوں، دوستوں، ساتھیوں اور ملازموں ہی کو ہو سکتا ہے، ان سے اس کے اخلاق اور سیرت کی کوئی بات چھپی نہیں ہوتی، وہ رازِ درونِ پردہ کے محرم ہوتے ہیں، وہ خوبیوں اور برائیوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، باہر کے لوگ جو رائے قائم کرتے ہیں، وہ اتنی صحیح مکمل، اور بے لاگ نہیں ہوتی جتنی گھر والوں کی ہوتی ہے۔

دعوت کا جواب آں حضرتؐ نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا، اور اسلام کی دعوت دی، تو یہ دعوت سب سے پہلے، انہی لوگوں کو دی، جو ہر اعتبار سے آپ سے قریب اور واقف تھے،

سب سے پہلے جس نے اسلام کی دعوت قبول کی، وہ آپ کی خلوت و جلوت کی رفیق اور رازداں

---

[1] [2] طبقات ابن سعد جزو اول

"جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں[1]" پھر آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ ——— جو ابھی نوعمر تھے ——— ایمان لائے، پھر آپ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ نے یہ دعوت دل و جان سے قبول کی، پھر جب حضرت ابوبکرؓ تک آپؐ کی دعوت پہنچی انہوں نے بھی بے تامل اسلام قبول کرلیا[2]

اسلام میں اولیت

"عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ جب مبعوث ہوئے میں حاضر خدمت ہوا، میں نے دریافت کیا، اس باب (اسلام) میں کسی نے آپ کی پیروی کی؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں ایک عورت نے، ایک لڑکے نے، ایک غلام نے، حضرت کی مراد خدیجہؓ، علیؓ، اور زیدؓ بن حارثہ سے تھی ——— ![3]"

پھر حضرت ابوبکرؓ کی سعی و کوشش اور تحریک سے، ——— "عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف سعد بن ابی وقاص، زبیر ابن العوام، اور طلحہ ابن عبیداللہ مشرف بہ اسلام ہوئے ——— ![4]"

بعثت

"تین سال تک آپؐ خفیہ طور پر اسلام کی دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے ——— ![5]" پھر آپ کو خدا کی طرف سے ——— "کھلم کھلا فریضہ رسالت ادا کرنے کا حکم ملا، آپؐ نے فرمایا، میں اللہ کا رسول ہوں، تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، بتوں کی پرستش ترک کردو، جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، نہ روزی دیتے ہیں، نہ زندگی نہ موت ——— ![6]"

ابولہب اور بنوامیہ

یہ دعوت حق ان لوگوں کو بہت ناگوار گزری، جو ان گنت بتوں کی پوجا کرتے تھے، اس دعوت کے قبول کرلینے میں انہیں اپنی سرداری اور امارت کا زیاں بھی نظر آیا، انہوں نے سنتے ہی ہنگامہ مخالفت برپا کردیا۔ وہ اپنے بتوں کی توہین نہیں برداشت کرسکتے تھے، وہ ایک خدا کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتے، اتنے سارے بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کو آقائے کل ماننا، انہیں بہت عجیب معلوم ہوتا تھا۔

---

[1] ابوالفداء [2] طبری [3] ابوالفداء [4] طبقات ابن سعد جزو اول [5] طبری

مخالفت یوں تو سب ہی کی طرف سے ہو رہی تھی، لیکن ابولہب اور بنو اُمیہ کی طرف سے زیادہ شور بہت زیادہ تھا، وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ آل ہاشم کا ایک فرد منصب نبوت پر سرفراز ہو جائے، اور وہ اس شرف سے محروم رہیں ——— !"[1]

ابوطالب سے شکایت

آخر قریش کے سربرآوردہ لوگوں نے ابوطالب سے شکایت کی کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو بُرا کہتا ہے، ہمارے اسلاف و اجداد کو کافر کہتا ہے، ہمیں گمراہ اور غلط کار قرار دیتا ہے، اسے روکو ——— اور اگر تم نے اسے نہ روکا تو پھر ہم تم سے بھی سمجھ لیں گے، ابوطالب نے آپ کو بلا کر سمجھایا، بجھایا، آپ نے فرمایا، اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیں تو بھی میں حق کا راستہ اور ہدایت خلق کا کام نہیں ترک کروں گا ——— !"[2]

یہ سن کر ابوطالب کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں[3] اور اُنہوں نے پھر مداخلت نہیں کی، بلکہ آں حضرت کے لئے تاحیات سپر بنے رہے۔

تشدد کا دور

جب آں حضرت سے قریش مایوس ہو گئے، اور ابوطالب سے بھی کوئی امید نہ رہی، تو وہ بدترین قسم کے تشدد پر اتر آئے، اُنہوں نے آں حضرت کو اور نو مسلموں کو ننگِ انسانیت اور لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بنا لیا۔

آپؐ کو گالیاں دی جاتیں، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے، نو مسلموں کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا، گرم پتھر ان کے سینے پر رکھ دیئے جاتے، نماز کی حالت میں آپ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی جاتی، بائیکاٹ بھی کیا گیا[4]، قتل کرنے کی تدبیریں بھی کی گئیں لیکن ان مخالفتوں کی آپؐ نے ذرا بھی پروا نہ کی، حق کی دعوت کا جو سلسلہ شروع ہو گیا، وہ پوری سرگرمی اور جوش کے ساتھ جاری رہا، اور جن لوگوں کے سینے حق کی دعوت قبول کرنے کے لئے کھلے ہوئے تھے، اُنہوں نے ان شدائد اور مصائب کی ذرا پروا نہیں کی، اسلام قبول کیا، اور مصائب جھیلتے رہے۔ اسی اثنا میں، حضرت حمزہؓ، اور

---

[1] ابوالفداء [2] ابوالفداء [3] ابوالفداء [4] طبری

حضرت عمرؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا، اگرچہ حضرت عمرؓ اسلام کے سخت مخالف تھے، لیکن کلام پاک کی چند آیتیں سن کر دل کے دروازے قبول حق کے لئے کھل گئے[1]۔ ان دونوں بزرگوں کے قبول اسلام سے اگرچہ مسلمانوں کو بڑی تقویت پہنچی، لیکن مشرکین مکہ کی معاندانہ سرگرمیوں میں بھی اور اضافہ ہو گیا۔

ہجرت حبشہ

قریش کے ظلم و جور سے تنگ آ کر آں حضرت کے حسب الحکم کچھ مسلمانوں نے ترک وطن کر کے ملک حبش میں ہجرت کی، مہاجرین کے قافلے دو مرتبہ ہجرت کر کے حبشہ گئے "پہلی مرتبہ بارہ صحابہ اور دوسری مرتبہ ستر اشخاص نے ہجرت کی[2]"! یہ واقعہ "نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب[3] کا ہے"

دراندازی

قریش نے اپنا ایک وفد حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجا کہ وہ ان "باغیوں" کو واپس کر دے، لیکن اس نے یہ مطالبہ نہ مانا، مسلمانوں کو بہت اعزاز اور احترام کے ساتھ اپنے ملک میں پناہ دی، اور آں حضرت کی ذات گرامی سے شیفتگی اور والہانہ تعلق خاطر کا اظہار کیا،

حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات

حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وجاہت اور شخصیت کے باعث مشرکین مکہ آں حضرت کو بہت زیادہ ہدف ستم نہ بنا سکتے تھے، لیکن یہ ظاہری سہارا بھی جلد ختم ہو گیا۔ "ہجرت سے ۳ برس پہلے حضرت خدیجہؓ واصل بہ حق ہوئیں اور آن کی وفات کے تین دن بعد ابوطالب بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے[4]"!

یہ دونوں حادثے ایسے تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کو بہت متاثر کیا لیکن آپ کے عزم و ہمت میں کوئی فرق نہیں آیا، تبلیغ اسلام کا سلسلہ برابر جاری رہا،

---

[1] ابوالفداء [2] طبری - (ابوالفداء اور طبقات ابن سعد میں دوسری مرتبہ ہجرت کرنے والے مردوں کی تعداد ۸۳ اور عورتوں کی ۱۸ لکھی ہے) [3] طبقات ابن سعد جزو اول -

[4] طبری - (لیکن ابوالفداء میں جو روایت درج ہے اس کی رو سے پہلے ابوطالب پھر حضرت خدیجہ کا انتقال ہوا)

سفرِ طائف حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد، آپ نے مکہ سے باہر نکل کر تبلیغ کا ارادہ کیا ——— "آپؐ زید بن حارثہ کے ساتھ شوال سنہ نبوی میں طائف تشریف لے گئے، آپ دس دن تک طائف میں رہے، کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس آپؐ نہ جاتے اور گفتگو نہ کرتے مگر ان لوگوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی، (بلکہ) آپ کو پتھر مارنے لگے، آپ کے دونوں قدموں سے خون بہنے لگا، زید بن حارثہ وار اپنے اوپر روکتے تھے، مگر بے سود، ان کے سر میں بھی متعدد زخم آئے، (آخر) آپ واپس آگئے ——— لہ" اور آتے ہی پھر تبلیغ و دعوت کا کام شروع کر دیا۔

اسلام مدینہ میں انصار کے قبیلۂ اوس اور خزرج کے بعض حق شناس لوگ حج کے زمانہ میں مکہ آئے، انہوں نے آپ کی زبان سے اسلام کی دعوت سنی مسلمان ہو گئے، ان کے ساتھ تعلیم و تبلیغ اسلام کے لئے آپ نے ——— "مصعب بن عمیرؓ کو بھیجا جو اسعد بن زرارہ کے ہاں فروکش ہوئے ٹہ" اور اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے کام میں منہمک ہو گئے، دوسرے سال پھر کچھ لوگ آئے اور انہوں نے رسول اللہؐ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کر لیا، اب مدینہ میں ان انصار کی بدولت اسلام اچھی طرح پھیلنے لگا،

ہجرتِ نبوی اسلام کے لئے مکہ تنگ دل ثابت ہوا، لیکن مدینہ نے اپنی آغوشِ عقیدت کھول دی، اوس اور خزرج جیسے با اثر قبائل کے قبول اسلام نے اسلام کو بہت زیادہ مستحکم کر دیا،

ادھر مکہ میں مشرکین کے ظلم اور تعدی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا، وہ نہ صرف دعوتِ اسلام کے دشمن تھے بلکہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو بھی زندہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

آخر آپ نے مناسب یہ سمجھا کہ دعوتِ اسلام کا مرکز مدینہ کو قرار دیا جائے، پہلے آپؐ کے حسب ہدایت عام مسلمان وہاں پہنچے، پھر خود آپ بھی، حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے سہ مشرکین نے آپؐ کو قتل کرنے اور بعد میں تعاقب کر کے گرفتار کر لے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے،

لہ طبقات ابن سعد جزو اول سہ سہ طبری

مدینہ میں ورود

"جمعہ کے روز ۲۲ جولائی ۶۲۲ء کو ——— [1] آپ مدینہ میں تشریف فرما ہوئے [2] انصار مدینہ نے دیدہ و دل فرش راہ کئے، اور کاروان نبوی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، ہر شخص کی تمنا یہ تھی کہ آپ اس کے ہاں قیام فرمائیں لیکن آپ نے فرمایا "اونٹنی کو چلنے دو" وہ حضرت ابو ایوب کے مکان کے سامنے رک گئی، آپ وہیں اتر پڑے، فرمایا۔ المنساء ءم حلہ ذات نبوی کی میزبانی کا شرف اس طرح حضرت ابو ایوبؓ کے حصہ میں آیا ——— "سعد بن زرارہ نے رسول اللہ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لی، وہ ان کے ہاں رہی ——— [3]!" آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ——— ابو ایوبؓ کے ہاں سات مہینے رہا ——— [3]!"

"زید بن کچھ دنوں کے بعد حضرت علیؓ بھی تشریف لے آئے، حضرت ابو بکر کا خاندان بھی آگیا ——— حارثہ اور ابو رافع، حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ، ام المومنینؓ اور بنتؓ زمعہ اور اسامہ بن زیدؓ کو لے آئے۔ آپ نے ان سب کو حارثہ بن نعمان کے گھر پر اتارا ——— [3]!"

مسجد نبوی

آں حضرتؐ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے ایک زمین خریدی، حضرت ابو بکرؓ نے اس کی قیمت ادا کی ——— "پھر رسول اللہؐ نے اینٹیں لانے کا حکم دیا، اینٹیں لائی گئیں، مسجد نبی شروع ہوئی، نیو پتھر سے اٹھائی گئی، ستون درختوں کے تنوں کے بنائے گئے، اور چھت کھجور کی شاخوں سے پاٹی گئی ——— [4]!"

پیمان اخوت

مدینہ آکر آپؐ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان "عقد مواخات" یعنی پیمان اخوت استوار کرایا۔

انصار نے اس پیمان وفا کو اس شان سے نباہا کہ جائیداد و املاک تک میں مہاجرین کا حصہ رکھ لیا، وراثت بھی انہیں دینے لگے، بعض نے تو یہاں تک کیا کہ اگر دو بیویاں تھیں تو کسی ایک کو کسی مہاجر بھائی کے حق میں طلاق دینے پر تیار ہو گئے، یہ دوسری بات ہے کہ ایسا ہونے نہیں پایا، لیکن خلوص

---

[1] بعض روایتوں میں دو شنبہ کا دن ہے [2] طبری [3] طبقات ابن سعد [3] طبری

[4] فتوح البلدان، جزو اوّل۔

نیت کا ثبوت تو مل گیا۔

پھر جب مہاجرین کی حالت سدھر گئی، وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے، تو ان سہولتوں سے وہ از خود دستبردار ہو گئے لیکن انصار کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی یا بے لطفی کبھی نہیں پیش آئی!

مکّہ کے مہاجر یہاں تباہ حال آئے تھے، نہ اُن کے پاس گھر تھا، نہ زر، نہ کھیت، نہ روٹی، نہ روزگار، نہ اطمینان لیکن یہ مہاجر جب ایک ایک انصاری کے بھائی بن گئے تو انہیں سب کچھ مل گیا، گھر بھی، روزی بھی، اطمینان بھی، کیا دنیا کی تاریخ اسلام کے سوا، اس ایثار، اور مواخات کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ ـــــ کلاّ ثم کلاّ!

باب

مجاہدات و غزوات

قریش اور مشرکین مکہ کو یہ بات بہت گراں گذر رہی تھی کہ مسلمان ان کے پنجۂ ستم سے بچ کر مدینہ پہنچ گئے، اور وہاں امن و آسائش سے رہنے لگے، چنانچہ وہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے، اُن کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ پر یورش کر کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں،

جنگ بدر مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام بدر ہے، یہ مشہور اور تاریخی لڑائی یہیں برپا ہوئی۔

مشرکین مکہ نے مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے ارادہ سے مدینہ پر یورش کی، ابوسفیان اس لشکر کا (جو نوسو پچاس افراد پر مشتمل تھا[1]) سردار تھا، آں حضرتؐ تین سو افراد[2] کے ساتھ اس ریلے کو روکنے کے لئے نکلے،

مشرکین کے پاس روپیہ تھا، اناج تھا، ہتھیار تھے، گھوڑے تھے، اونٹ تھے، چنے ہوئے، سرد و گرم چشیدہ، جنگ آزما سورما تھے، پھر انہیں اپنے اوپر اپنے وسائل پر اعتماد تھا بلکہ بلا یقین تھا کہ حسب ضرورت کمک ملجائے گی۔

اور دوسری طرف ۳ سو نفوس تھے، جن کے پاس صرف دو[3] گھوڑے تھے، زرہیں ٹوٹی ہوئی، ہتھیار ناکمل، لیکن ان میں اور اُن میں ایک فرق تھا ——— بہت بڑا فرق ———

وہ زندگی کو عزیز رکھتے تھے، یہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے تھے، وہ اپنے دست و بازو پر نازاں تھے، یہ نصرت الٰہی پر بھروسہ رکھتے تھے، وہ اپنے ساز و سامان جنگ پر اکڑ رہے تھے، یہ اپنی

---

[1] ابوالفداء ——— دوسری روایتوں میں تعداد ۱ سو تھی [2] طبری ——— دوسری روایتوں میں ۳۱۳ نفوس کی تعداد بتائی گئی ہے۔ [3]

جاں نثاری اور فداکاری پر نازاں تھے، جنگ شروع ہونے سے قبل سعد بن عبادہؓ نے رسول اکرم کو مخاطب کرکے کہا تھا ــــ "اگر آپؐ ہمیں سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں تو ہم کود پڑیں گے!" اور حضرت مقدادؓ نے عرض کیا تھا ــــ "ہم داہنے بائیں آگے پیچھے آپؐ کے ساتھ لڑیں گے!"

جنگ شروع ہوئی!

یہ عجیب و غریب جنگ تھی، یہ کفر و اسلام کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی، بھائی بھائی کے مقابلہ میں تلوار تانے ہوئے تھا، باپ بیٹے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، بیٹا باپ کے سامنے نبرد آزما تھا ــــ ایک طرف عصبیت اور جاہلیت تھی، دوسری طرف حق اور اسلام!

جنگ ختم ہوئی!

کفر کا لشکر ہار گیا، اسلام کے جاں نثار جیت گئے۔

قریش کے بڑے بڑے سردار اس جنگ میں کام آئے، شیبہ، ابوجہل، عتبہ، زمعہ، امیہ ابن خلف یہ وہ لوگ تھے جن کی قوت و طاقت، دبدبہ و سطوت، فنونِ جنگ کی مہارت کا ڈنکا بجتا تھا، انہیں خود اپنے اوپر ناز تھا، ان پر ان کے وطن کو، قوم کو، قبیلہ کو فخر تھا، لیکن یہ ناز اور فخر رائگاں گیا، یہ مارے گئے۔ اور قریش کی کمر ٹوٹ گئی۔

جو لوگ گرفتار ہوئے، وہ بھی چوٹی کے لوگ تھے، عباسؓ ــــ آں حضرتؐ کے چچا، اور عبدالمطلب کے بیٹے عقیل ــــ حضرت علی کے بھائی اور ابوطالب کے صاحبزادے، اور بھی کئی سربرآوردہ اصحاب قریش گرفتار ہوئے،

حسنِ سلوک جو لوگ گرفتار ہوئے، آں حضرتؐ کے حکم کے بموجب اُن کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا گیا، جن مسلمانوں کی تحویل میں یہ قیدی رکھے گئے، اُن کی کیفیت یہ تھی کہ خود فاقہ کرتے تھے، بھوکے رہتے تھے مگر اپنے قیدیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے تھے۔

"یہ جنگ ۱۷ ماہ رمضان ۲ھ کو بروز جمعہ برپا ہوئی تھی"[1]

---

[1] ابوالفداء

جنگِ اُحد

جنگِ بدر کے مقتولین کا انتقام لینے کے لئے ابوسفیان نے لوگوں کو بھڑکایا، اور پہلے سے زیادہ زور شور کے ساتھ مشرکین مکہ نے ابوسفیان کی سربراہی میں تیاریاں شروع کر دیں۔

"....... تین ہزار قریش، جن میں سات سو زرہ پوش اور دو سو سوار تھے اور باقی پیادے، ابوسفیان کی سرکردگی میں نکلے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی ساتھ تھی، اس کے ساتھ پندرہ عورتیں مقتولین بدر پر روتی اور مسلمانوں سے لڑنے کے لئے مشرکوں کو برانگیختہ کرتی تھیں، بدھ کے روز ۴ شوال ۳ھ[1] کو یہ لوگ مدینہ کے قریب مقام ذوالحلیفہ میں آ اترے ......"[2] "مسلمانوں کا لشکر بھی مقابلہ کے لئے نکلا جو سات سو نفوس پر مشتمل تھا[3]) اور کوہِ احد پر خیمہ انداز ہوا، اس لشکر میں ...... "سو آدمی زرہ پوش باقی بے زرہ، اور پا پیادہ تھے کسی کے پاس سوا دو شخصوں کے گھوڑا نہ تھا ......!"[4]

تعداد کا تفاوت

اس جنگ میں بھی تعداد کا فرق بہت زیادہ تھا، کہاں تین ہزار کہاں سات سو، لیکن مسلمانوں کے حوصلے میں کوئی فرق نہیں آیا،

گھمسان کی لڑائی ہوئی، مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے، پہاڑ کی پشت پر جو دستہ متعین تھا وہ اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت کی طرف بڑھا، موقع دیکھ کر خالد بن ولید (جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) حملہ آور ہوئے، اور مسلمانوں کی فتح شکست سے تبدیل ہو گئی، اس جنگ میں رسول اللہؐ بھی زخمی ہوئے، کچھ دیر کے لئے یہ یقین ہو گیا کہ آپ شہید ہو گئے، بڑے بڑے صحابہ نے ہمت ہار دی، حضرت عمرؓ تک تلوار پھینک کے الگ کھڑے ہو گئے، کہ اب اس ساری تگ و دو سے کیا حاصل[5]؟ ایک انصاری ابن نضر نے کہا، اب زندگی بے لطف ہے، تلوار کھینچی اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے[6]، حضرت علیؓ بدستور کفار و مشرکین کے مقابلہ میں جمے رہے[7] جب کعب بن مالک نے رسول اللہؐ کو دیکھ کر اعلان کیا کہ آپ زندہ ہیں، تو پھر مسلمان، پورے حوصلہ کے ساتھ لڑنے لگے[8] کفار نے سارا زور اسی طرف لگا دیا کہ آپؐ کو شہید کر دیں لیکن انصار پروانہ وار آپؐ پر قربان ہوتے رہے، مہاجرین کا بھی یہی حال تھا، حضرت طلحہؓ تلوار کا وار

---

[1] مطابق ۶۲۴ء [2] ... [3] ... [4] الالفاروق [5] ... [6] ... [7] ... [8] الفاروق۔

ہاتھ پر روکتے تھے، ایک ہاتھ کٹ گیا تو سینہ تان کر آگے آکر جم گئے کہ فخر کائنات چشم زخم سے محفوظ رہیں[1]

حضرتِ حمزہ کی شہادت

اس جنگ میں آں حضرت کے چچا حضرتِ حمزہ بھی شہید ہوئے ابوسفیان کی بیوی اور امیر معاویہ کی ماں ہندہ نے جوشِ عداوت میں آپ کا کلیجہ چبا لیا۔

مسلمان اس جوش و خروش سے دوبارہ آمادہ جنگ ہوئے کہ قریش کو جنگ جاری رکھنے کی ہمت نہ پڑی، وہ مکہ واپس چلے گئے،

صلح حدیبیہ

ماہ ذی قعد ۶ھ میں[2] — رسول اللہ — عمرہ کے ارادہ سے نکلے، قربانی کے ستر جانور آپ کے ساتھ تھے[3] — مہاجرین اور انصار کی تعداد ۱۴ سو تھی، سب احرام (بارادۂ حج) باندھے ہوئے تھے[4] ———

لیکن مشرکین مکہ نے مزاحمت کی، قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے، لیکن پھر یہ معاہدہ ہوا کہ آپ آئندہ سال حج کے لئے تشریف لائیں اس سال واپس جائیں، جو مسلمان مکہ میں ہیں وہ مدینہ نہیں جائیں گے، مدینہ میں جو ہیں، وہ مکہ میں رہنا چاہیں تو انہیں منع نہیں کیا جائے گا، مکہ کا کوئی مسلمان مدینہ چلا جائے تو اسے مکہ واپس بھیج دیا جائے، رسول اللہ نے اس معاہدہ پر بڑی سختی سے عمل کیا لیکن خود قریش کی طرف سے پھر اس کی اجازت ہوگئی کہ مکہ کا جو مسلمان چاہے وہ مدینہ جا سکتا ہے۔

اس معاہدہ کے بعد مشرکین کو مسلمانوں کی سیرت اور کردار جمیل کے مشاہدہ کا زیادہ موقع ملا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل میں تیزی کے ساتھ اسلام پھیلنے لگا، اور اس طرح مسلمانوں کو عملی اور اخلاقی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔

یہودیوں کا استیصال

رسول اللہ نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ بہت رعایت کی، انہیں مساوی حقوق عطا فرمائے، اُن کی مذہبی آزادی کا

---

[1] الفاروق [2] ابوالفداء [3] طبری [4] ابوالفداء

احترام کیا، ان کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی بھی مداخلت سے ہمیشہ احتراز کیا،

لیکن یہودی ہمیشہ مسلمانوں سے اور رسول اللہ سے جلتے رہے، وہ صلح پر کبھی قائم نہیں رہے، انہوں نے معاہدات کا کبھی احترام نہیں کیا، انہوں نے محض مسلمانوں کو زک دینے کے لئے مشرکین مکہ سے درپردہ ساز باز کا سلسلہ جاری رکھا، وہ مسلمانوں کے شہر میں رہتے تھے لیکن مسلمانوں کے دشمنوں کے یار غار بنے ہوئے تھے، انہیں ہر طرح کی خبریں پہنچاتے تھے، ان کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

"سمہ ھ میں ان کی (یہود کی) کھلی ہوئی بدعہدی اور غداری[1] کے باعث بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا، انہوں نے اس شرط پر صلح چاہی کہ وہ ترکِ سکونت کر لیں گے، چنانچہ صلح کر لی گئی، اور وہ آپ کی اجازت سے اپنا مال و منال لے کر خیبر چلے گئے۔

۔۔۔۔ ۵ھ میں آپؐ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے غزوۂ خندق یا جنگِ احزاب میں (معاہدہ کے برعکس) مشرکین مکہ کو (فوجی) مدد دی تھی[2]! پھر جب آپؐ ادھر سے گذرے تو معذرت کے بجائے گالیوں پر اتر آئے،

آخر خود انہی کے مقرر کئے ہوئے حکم نے فیصلہ کیا کہ ۔۔۔۔ جو لوگ جنگجو ہیں وہ قتل کر دیئے جائیں، عورتیں لونڈی اور بچے غلام بنا لئے جائیں، ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے[3]۔۔۔۔"

بظاہر یہ فیصلہ سخت ہے لیکن حکم نے یہ فیصلہ یہود کی مذہبی کتاب تورات کے مطابق کیا تھا، اس لئے انہیں بے چون و چرا ماننا پڑا[4]۔

فتح خیبر

اب یہودیوں کا مرکز خیبر تھا، بنو نضیر بھی یہاں پہنچ چکے تھے: وہ یہودیوں کو اسلام، داعی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے، یہاں کے یہودی مالدار بھی تھے اور طاقتور بھی، مسلمانوں سے خائف بھی، اور ان کے دشمن بھی، آخر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں سے لڑیں گے، اور جو کام مشرکین مکہ سے نہ ہو سکا وہ کر دکھائیں گے ۔۔۔۔ یعنی

---

[1] [2] [3] [4] فتوح البلدان بلاذری اوّل،

مسلمانوں کا استیصال ــــــ اسے خود اپنے مال وزر اور قوت وطاقت کے بل پر انجام دیں گے، اور مسلمانوں کا قلع قمع کر کے دم لیں گے۔

غالب علی کل غالب علی ابن ابی طالب

یہود کی فوجی تیاری اور حملہ آور ہونے کے ارادہ کی جب آپؐ کو اطلاع ملی، تو آپؐ ــــــ ماہ محرم ۷ھ میں ــــــ [۱] تقریباً ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کو لے کر خیبر کی طرف بڑھے ــــــ یہودیوں کے پاس چھ قلعے تھے اور بیس ہزار جنگ جو سورما ــــــ [۲] جنگ شروع ہوئی ــــــ یہاں کے باشندے عرصہ تک آپؐ کے مقابلہ پر جمے رہے، رسول اللہؐ نے مہینہ بھر ان کا محاصرہ جاری رکھا ــــــ [۳] "یہودیوں کے پاس جو قلعے تھے، ان میں قلعہ قموص نہایت استوار اور محفوظ تھا، یہودیوں کا مایۂ ناز بہادر پہلوان مرحب یہیں رہتا تھا اس قلعہ کو سر کرنے کی کوشش حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور کئی جلیل القدر صحابہؓ نے کی، لیکن کامیابی نہ ہو سکی، دوسرے روز ــــــ "آں حضرتؐ نے فرمایا کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا، جو قلعہ فتح کئے بغیر واپس نہ آئے گا، دوسرے دن حضرتؐ نے علیؓ کو علم دیا، علیؓ نے مرحب کو قتل کر دیا، قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کے پھینک دیا، قلعہ میں خود بھی در آئے اور مسلمان بھی داخل ہو گئے ــــــ" [۴]

اس شکست کے بعد یہودیوں نے اس درخواست کے ساتھ ــــــ "صلح کر لی کہ ہمارے خون معاف کئے جائیں، ہمارے بال بچے قید نہ کئے جائیں، ہمیں باغبانی اور آبادکاری کا کام خوب آتا ہے، ہمیں یہیں رہنے دیجئے، آپؐ نے ان کی درخواست منظور فرمالی، اور بٹائی پر معاملہ فرمالیا ــــــ" [۵]

یہودیوں کا اعتراف

رحمۃ للعالمینؐ نے خیبر کے یہودیوں کی گذشتہ شرارتوں اور خباثتوں کو معاف کر دیا، سارے کھیت اور نخلستان اس شرط پر پھر انہیں واپس کر دیئے کہ آدھے تمہارے، آدھے ہمارے ــــــ ہر سال جب بٹائی کا وقت آتا تو عبداللہؓ بن رواحہ تخمینہ کرنے خیبر جاتے، اور آدھوں آدھ کر دیتے، ایک دفعہ یہود نے

---

[۱] ابوالفداء [۲] طبری [۳] فتوح البلدان [۴] طبری [۵] فتوح البلدان۔

عبداللہؓ کو رشوت دینی چاہی، انہوں نے کہا، اے خدا کے دشمنو! کیا تم مجھے حرام خوری کا لالچ دیتے ہو؟ خدا کی قسم میں تمہارے پاس اس شخص کی طرف سے آیا ہوں جسے میں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اور تم سے مجھے نفرت ہے تاہم مجھے اس بات پر نہ تمہاری دشمنی نے آمادہ کیا ہے، نہ اس کی محبت نے کہ تمہارے ساتھ عدل کا برتاؤ نہ کروں، یہود نے (متاثر ہو کر) کہا، زمین اور آسمان اسی عدل پر قائم ہیں —— !ا؎"

فتح مکہ

مسلمانوں کی قوت و طاقت میں اضافہ ہو گیا تھا، ان کی مالی حالت بہتر ہو چکی تھی، ان کی تعداد ہزاروں تک بلکہ لاکھوں تک پہنچ گئی تھی، وہ اب ایک مستقل قوت تھے مستقل طاقت تھے، ان کا وجود، عزت اور احترام کے ساتھ معاصرین نے تسلیم کر لیا تھا، ان کی صداقت راستبازی، جمال کردار، اور جمال سیرت کے لوگ ثنا خواں اور مداح تھے، وہ کبھی کسی معاملہ میں حق و صداقت کا دامن نہیں چھوڑتے تھے، خواہ انہیں نفع ہو یا نقصان!

ابھی تک مسلمان صلح حدیبیہ پر قائم تھے، تطہیر کعبہ ان کا مقصد زندگی تھا، مگر اس مقصد کو بھی وہ عہد شکنی کر کے نہیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔

لیکن خود مشرکین مکہ نے عہد شکنی کی، معاہدہ کے خلاف، قریش نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو اپنے حلیف بنی بکر کی تائید میں قتل کر دیا، خزاعہ کے لوگ آپؐ کے پاس فریاد کناں آئے تھے آپؐ نے قریش سے کہلوایا کہ یا تو وہ فسخ عہد کا اعلان کریں، یا خون بہا ادا کریں، اور بنو بکر سے تعلق منقطع کر لیں، قریش نے فسخ عہد کو ترجیح دی، پھر انہوں نے جب جنگ کا تصور کیا، تو ابوسفیان کو تجدید عہد کے لئے بھیجا، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، آپؐ نے تجدید عہد نہیں کی،

رسول اللہؐ —— دس رمضان ۸ھ کو دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھے، —— !۲؎"

۱؎ موطا میں ہے، یہود نے اپنی عورتوں کے زیور جمع کر کے رشوت میں پیش کیا (باب ماجاء فی المساقاۃ)

۲؎ فتوح البلدان، اول ۳؎ ابوالفداء ۴؎ ابوالفداء، طبری۔

قریش میں اس لشکر گراں کے روکنے کی تاب نہ تھی، راستہ میں ابوسفیان ملے، حضرت عباسؓ کی سفارش سے، (حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود) رحمت للعالمینؐ نے ان کی جان بخشی کی جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جو داعی اسلام کی جان کا گاہک تھا، آج اس کی تمام گذشتہ خطائیں معاف کر دی گئیں، یہی نہیں ہاری ہوئی قوم کے ہارے ہوئے اور دل شکستہ سردار ابوسفیان کی عزت افزائی فرمائی جاری تھی، ارشاد ہوا جو خانۂ کعبہ میں پناہ گزیں ہو جائے، جو ابوسفیان کے گھر میں خانہ نشین ہو جائے، اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی؛[1] مسلمانوں کا لشکر فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوا، کسی کی ہمت نہ پڑی کہ مزاحمت کرتا، کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ سامنے آتا ——— اللہ نے اپنے رسولؐ کو فتح عنایت فرمائی، لڑائی کی نوبت نہ آئی!

عفوِ عام

آج ۸ سال کی جلاوطنی کے بعد خانۂ کعبہ میں وہ مہاجرؐ داخل ہوا جسے اس کے اہل وطن نے گالیاں دی تھیں، جس کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، جس کے جسم اطہر پر اونٹ کی اوجھڑیاں ڈالی تھیں، جس کے خلاف بار بار صف آرا ہوئے تھے، جسے زخمی کیا تھا، لہولہان کیا تھا، جس کا بائیکاٹ کیا تھا، جس کا گھر چھین لیا تھا، جس کے قتل کے منصوبے تیار کئے تھے، اور اس مہاجرؐ کے ساتھ وہ مہاجرین بھی تھے جنہیں محض قبول اسلام کے جرم میں جلتی ہوئی ریت پر لٹایا گیا تھا، جن کے سینوں پر گرم گرم پتھر رکھے گئے تھے، جنہیں نیزوں سے چھیدا گیا تھا، جن کے عزیزوں کو قتل کیا گیا تھا، جن کی عورتوں کو بے آبرو کیا گیا تھا، جن کے بچوں کو چھین لیا گیا تھا، جن پر عرصۂ زندگی تنگ کر دیا اور جنہیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

آج وہ مہاجر اپنے آقا کے ساتھ فاتح، اور کشور کشا کی حیثیت سے مکہ میں آئے تھے، اور یہ قریش یہ اہل مکہ، یہ عرب جو ہمیشہ لڑتے رہے تھے، سر جھکائے کھڑے تھے کہ اپنی قسمت کا فیصلہ سنیں، اور وہ فیصلہ وقت کے عام اصول اور رواج کے مطابق، قتل عام کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟

دیکھنا ——— وہ فاتح مہاجرؐ حرم کعبہ میں ——— "دو رکعت نماز پڑھتا ہے،

[1] فتوح البلدان ص۴۵ طبری

پھر کہا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کو نصرت دی، اور تمام جماعتوں کو شکست دی، حمد بھی خدا ہی کے لئے ہے، اور حکومت بھی۔ ——— ہاں تم لوگ (میرے بارے میں) کیا گمان کرتے ہو؟ اور کیا کہنا چاہتے ہو؟

سہیل نے کہا ہم حسنِ ظن رکھتے ہیں، اور کلمۂ خیر کہتے ہیں، تو شریف بھائی اور شریف ابن عم ہے۔ حضرت نے فرمایا میں بھی وہی کہتا ہوں جو یوسف نے (اپنے ستم گر بھائیوں سے) کہا تھا لا تثریب علیکم الیوم ——— آج کے دن تم پر کوئی مواخذہ نہیں[1] ——— انتم الطلقا ——— تم آزاد ہو! ———!"

یہ عفوِ عمومی کی نوید سنکر بڑے بڑے سرکشوں اور دشمنوں کی گردنیں فرطِ ندامت سے جھک گئیں۔

خطبۂ نبوی

پھر آپ نے فرمایا ——— "عہدِ جاہلیت کا ہر خون، مال، غرور، بزرگی، میرے ان دونوں قدموں کے نیچے دب گیا، بجز کعبہ کی سدانت (خدمت) اور سقایت (حاجیوں کو پانی پلانے) کے ——— پھر بلال بام کعبہ پر چڑھے، اذان دی ———[1]!"

بت ہٹا دیئے گئے۔ تصویریں مٹا دی گئیں۔ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

غیر مسلم کا اعتراف

ایک غیر مسلم مورخ کا قول:-

"جنوری ۱۳۰ھ کے ختم پر ——— مکہ پوری طرح فتح ہو گیا۔ محمد شہر کے سب سے بڑے حرم (خانہ کعبہ) میں داخل ہوئے، آپ نے یہاں کے تمام بت توڑ دالے، ان بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ بیان کی جاتی ہے، آپ —— "جاء الحق وزھق الباطل" (حق آیا اور باطل چلا گیا) (قرآن بنی اسرائیل ۱۰) فرماتے جاتے تھے اور بتوں کو توڑتے جاتے تھے لیکن خود شہر کے لوگوں کے ساتھ آپ نے بڑی فراخدلی برتی، مفتوحہ شہر میں اس شان سے کسی فاتح کے داخل ہونے کی مثال اس سے پہلے کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی ہے[2]

اور بعد میں ۱۹۵۲ء تک کب ملی ہے؟ برلن میں؟ ٹوکیو میں؟ رنگون اور سنگاپور میں؟ کہیں بھی؟

---

[1] طبری [2] فلپ ہتی کی "مختصر تاریخ عرب"۔

باب
وفات

فتح مکہ کے بعد آں حضرتؐ کا مشن پورا ہوچکا تھا، اسلام اب دور دراز گوشوں تک پھیل رہا تھا قرآن نازل ہوچکا تھا، اسلامی شریعت تکمیل پا چکی تھی، حکومت الٰہیہ قائم ہو چکی تھی، باطل ناکام ہوچکا تھا، اور حق کا بول بالا ہوچکا تھا، جہاں سے اسلام کے داعی کو مسلمانوں کو، اسلام کے ہمدردوں کو دیس نکالا ملا تھا، آج وہاں اسلام کی حکومت تھی، احکام و فرائض کی تعیین ہوچکی تھی اور خود قرآن کریم نے کہہ دیا تھا "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی" یعنی دین (اسلام) مکمل ہوگیا، اور نعمت تمام ہوگئی۔

حجۃ الوداع آپؐ نے ——— سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع (آخری حج) ادا کیا ——— ! آپؐ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب دنیا سے آپؐ کے تشریف لے جانے کا وقت آگیا ہے، چنانچہ اس آخری حج کے موقع پر آپؐ نے جو خطبہ دیا، وہ دراصل وداعی خطبہ ہے جس میں آخری مرتبہ مسلمانوں کو نصیحت فرمائی۔

ارشادات نبوی آپؐ نے فرمایا ——— "اللہ نے تمہارے جان و مال کو تم پر ایسا ہی محترم کردیا ہے، جیسے تمہارے اس شہر کی حرمت، جیسے تمہارے اس دن (یوم حج) کی حرمت، خبردار کیا میں نے تبلیغ کردی؟ لوگوں نے عرض کیا، جی ہاں، آپؐ نے فرمایا اے اللہ گواہ رہنا ——— اللہ سے ڈرتے رہو، فساد برپا کرتے ہوئے نہ پھرو، جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ اسے ادا کردے ———"

مساوات ——— لوگ اسلام میں برابر ہیں، سب لوگ آدم و حوا کے طفت الصاع (دفنے میں، بالکل برابر) ہیں سوا تقوے کے، نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی

ا عربی

کر عربی پر، خبردار کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں، آپ نے فرمایا، اے اللہ گواہ رہنا ——— !

معافی
"ہر وہ خون جو زمانہ جاہلیت میں ہوا، وہ میرے قدموں کے نیچے ہے، سب سے پہلا خون جسے میں رکھتا (معاف کرتا) ہوں، وہ آدم بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کا ہے، خبردار، کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں، فرمایا، اے اللہ گواہ رہنا ——— !"

حرمت سود
"ہر سود جو زمانہ جاہلیت میں تھا، وہ میرے قدموں کے نیچے ہے سب سے پہلا سود جسے میں وضع (معاف) کرتا ہوں، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، خبردار کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں، آپ نے فرمایا، اے اللہ گواہ رہنا ——— !"

عورتوں سے سلوک
"فرمایا میں تمہیں عورتوں کے بارے میں خیر کی وصیت کرتا ہوں تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے، تمہارا ان پر حق ہے اُن کا تم پر حق ہے، خبردار کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں، فرمایا اے اللہ گواہ رہنا ——— !"

غلاموں سے سلوک
"میں تمہیں ان کے متعلق وصیت کرتا ہوں، جو تمہارے غلام ہیں انہیں وہی کھلاؤ جو تم کھاؤ، وہی پہناؤ جو تم پہنو، خبردار کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا، جی ہاں، فرمایا اے اللہ گواہ رہنا ——— !"

حقوق بین المسلمین
"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس کے ساتھ دغا نہ کرے، نہ اس کی خیانت کرے، نہ اس کی غیبت کرے، نہ اس کا خون حلال ہے، خبردار، کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں آپ نے فرمایا، اے اللہ گواہ رہنا ———

اہلبیت
"میرے بعد گمراہی پھیلانے والے کفار نہ بن جانا، میں تم میں ایک ایسی چیز

چھوڑتا ہوں کہ اگر تم اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے یعنی کتاب اللہ، اور میری عترت (اولاد) میرے اہل بیت، خبردار، کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں، فرمایا اے اللہ گواہ رہنا"۔[1]

علالت اور وفات

"آپ حج سے فراغت پاکر مدینہ تشریف لائے، آخر ماہ صفر ۱۱ھ میں مزاج ناساز ہوا"[2]۔ "اسی حالت میں اسامہ بن زید کو جیش اسلام کا میر لشکر بنا کر شام بھیجا، جہاں ان کے والد شہید کئے گئے تھے"[3]۔

"آپ چودہ روز علیل رہے اور ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ ۱۱ھ وفات پائی"[4]۔

تاثرات الم

آں حضرتؐ کی وفات ایک ایسا سانحہ تھا جس نے بہت سے لوگوں کے ہوش و حواس درہم برہم کر دیئے حضرت عمرؓ کی یہ کیفیت ہوئی، کہ وہ تلوار سونت کر نکل پڑے اور کہا جو یہ کہے گا، رسول اللہؐ نے وفات پائی اس کی گردن اڑا دوں گا۔ "واللہ رسول اللہ نہ مرے ہیں نہ مریں گے۔ آپؐ تو صرف غائب ہو گئے ہیں"[5]۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر کو للکارا اور فرمایا:۔

من کان یعبد محمداً فان محمد قد مات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حیی لا یموت

(جو محمد کی پوجا کرتا تھا، وہ جان لے کہ محمد نے وفات پائی، اور جو خدا کی پرستش کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہئے وہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا)، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی "انک میت وانھم میتون (بے شک آپ بھی مرنے والے ہیں اور یہ لوگ بھی مریں گے) عمرؓ نے کہا"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا میں نے اس آیت کو پڑھا ہی نہیں تھا"[6]۔

تدفین

دوسرے روز حضرت علیؓ نے غسل دیا اور حضرت عائشہ کے حجرہ میں ۱۳ ربیع الاول (منگل) آپؐ[7] کی تدفین عمل میں آئی۔

جب احمد مرسل نہ رہے کون رہے گا۔ سچ کہا ایک غیر مسلم مؤرخ نے۔

---

[1] طبری [2] ابن الفدا [3] طبری [4] طبری [5] طبری

دُنیا میں نصرانیوں کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً دوگنی ہے لیکن اس کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا کی تمام کتابوں کے مقابلہ میں صرف قرآن ہی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے، ــــــــ دُنیا کی چالیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، قرآن کی ۶۲۳۹ آیتیں، اس کے ۷۷۹۳۲ الفاظ اور اس کے ۳۲۳۶۲۱ حروف اب بھی بڑی دقتِ نظری اور دیدہ ریزی کے ساتھ شمار کئے جاتے ہیں، قرآن صرف ایک مذہب کا دل، اور آسمانی بادشاہت کا راستہ دکھانے والا ہی نہیں، بلکہ وہ علوم و فنون اور سائنس و حکمت کا نچوڑ، اور ایک ایسی سیاسی دستاویز بھی ہے جس میں ارضی بادشاہت کے قوانین بھی پیش کئے گئے ہیں

فلپ ہتی کی کتاب "مختصر تاریخ عرب!"

ضمیمہ ۱

غزوات کی تعداد

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس جن جنگوں میں شرکت فرمائی، یا جو آپ کے حسب ہدایت لڑی گئیں، ان کی تعداد میں اختلاف ہے، لیکن اگر امعان نظر سے دیکھا جائے، اور تحقیق کی نگاہ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا، غزوات نبوی کی تعداد بہت کم ہے، اور یہ مختصر تعداد بھی اس لئے ہے کہ کافرں اور مشرکوں نے جنگ کو ناگزیر بنا دیا، خود یورشیں کی، حملے کئے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی تدبیریں کیں، معاہدے توڑے، سازشیں کیں، ننگ انسانیت جرائم کا ارتکاب کیا،

اس کے باوجود ان ناگزیر جنگوں میں بھی رسول اللہ نے جنگ کے دوران میں، اور جنگ کے بعد بھی ایسے اقدامات فرمائے، جن سے جاہلیت کی تاریخ حرب نا آشنا تھی، یہ اقدامات اس لئے فرمائے گئے۔ کہ آپؐ رحمۃ اللعالمین تھے، آپؐ نے اسیران جنگ کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ کر برتاؤ کیا، آپ نے جنگ کے دوران میں بوڑھوں، بچوں، عورتوں کے قتل کی ممانعت فرمائی، آپ نے ہرے بھرے درختوں کے کاٹنے، لہلہاتے کھیتوں کے اجاڑنے، اور غیر جنگ جو لوگوں پر حملہ آور ہونے کی ممانعت فرمائی، آپؐ نے اللہ کے بندوں کا ——— خواہ ان کا دین اور عقیدہ کچھ بھی ہو ——— خون بہانے سے حتی الامکان پورا پورا اجتناب فرمایا، آپؐ نے جنگ کی طرف بھی پیش قدمی نہیں کی، ہاں جب جنگ دروازہ تک آ گئی تو آپ نے ضرور مقابلہ فرمایا،

——— صرف پانچ جنگیں ایسی ہوئی ہیں جن میں درحقیقت لڑائی کی نوبت پہنچی ۔ مورخین حرب و سیر نے یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ ۲۷ مہمیں خود آں حضرتؐ کی سرکردگی میں واقع ہوئیں اور ۷۴ ایسے اشخاص کی ماتحتی میں جنہیں آں حضرتؐ نے سردار بنا کر بھیجا تھا، اس حساب سے کل ۱۰۱ مہمیں ہوئیں یہ تعداد ابن سعد، کاتب الواقدی نے لکھی ہے (دیکھو قسطلانی نوح جہ صفحہ ۳۸۶) ابن اسحاق نے، آں حضرت

کی مہمات کی تعداد تو ۲۷ ہی بیان کی ہے، مگر دیگر مہموں کی تعداد صرف ۳۸ لکھی ہے۔ (دیکھو ابن ہشام صفحہ ۳، ۲، ۹۷۲) ابوالعلیٰ نے جابرؓ سے روایت کی ہے کہ صرف ۲۱ مہمیں پیش آئیں، مگر زید بن ارقمؓ جو سب سے زیادہ مستند راوی ہیں غزوات کی تعداد ۱۹ بیان کرتے ہیں، مہموں کی یہ تعداد جو بیان ہوئی ان میں واقعی جنگوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) بدر

(۲) احد

(۳) احزاب

(۴) خیبر

(۵) حنین

فتح (مکہ) کے وقت کوئی جنگ نہیں ہوئی، وہ صلح سے مسلمانوں کے حوالہ کر دیا گیا،

ان مہموں میں آں حضرتؐ نے اپنے آپ کو، اور مسلمانوں کو بچانے کے لئے دشمنوں سے مدافعانہ جنگ کی دشمن کا نقصان بدر میں ۴۹ احد میں ۲۰، احزاب میں ۳، خیبر میں ۹۳ اور حنین میں بھی ۹۳ تھا، مسلمانوں کی طرف کا نقصان علی الترتیب ۱۴، ۷۴، ۵، ۱۹ اور ۱۷ تھا، ان جنگوں میں کل اموات مسلمانوں کی طرف ۱۲۹ اور دشمنوں کی طرف ۲۵۸ ہوئیں ——— [۱]"

[۱] تحقیق الجہاد،

ضمیمہ (۲)

مختصرات
(از ۱ھ تا ۱۰ھ)

۱ھ تعمیر مسجد نبوی،
حضرت عائشہؓ کی رخصتی،

۲ھ رمضان کے روزوں کی فرضیت
تحویل قبلہ
حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح، مہر تقریباً سوا سو روپے، جہیز، ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا،
ایک چھاگل، دو چکیاں، دو مٹی کے گھڑے،

۳ھ حضرت امام حسنؓ کی پیدائش،
بنت رسولؐ حضرت ام کلثوم سے حضرت عثمانؓ کا نکاح، قانونِ وراثت کا نزول،
مشرکہ عورتوں سے مسلمان مردوں کے نکاح کی حرمت،

۴ھ حضرت امام حسینؓ کی ولادت،
شراب کی حرمت کا حکم،

۵ھ پردہ کا حکم (آیت حجاب)
صلوٰۃ خوف کی اجازت
تیمم کی اجازت،
لعان کا طریقہ
پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا کا نفاذ۔

غزوۂ خندق ۔

حضرت عائشہؓ پر تہمت ،

سنہ ۶ھ تبلیغی خط شہنشاہانِ عالم کے نام :-

(۱) قیصر روم

(۲) شاہ ایران

(۳) عزیز مصر

(۴) نجاشی شاہ حبش ۔

قیصر روم نے آں حضرت کے ساتھ اظہار عقیدت کیا خسرو پرویز شاہ ایران نے گستاخی کی، نامۂ مبارک چاک کر ڈالا، شاہ مصر نے بھی اظہار عقیدت کیا، شاہ حبش نے اسلام قبول کر لیا،

سنہ ۷ھ (۱) درندے، پنجہ والے پرندے، گدھا اور خچر حرام قرار پائے،

(۲) لونڈیوں سے تمتع کے لئے استبرا کی شرط عائد کی گئی ،

(۳) چاندی سونے کا تبادلہ تفاضل کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ،

سنہ ۸ھ بحرین کے حاکم کا قبول اسلام

عمان کے باشندوں کا قبول اسلام

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبول اسلام

غزوۂ حنین

سنہ ۹ھ مشرکوں کے خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کی ممانعت ——— حکم زکوۃ

حرمت سود ——— غزوۂ تبوک

سنہ ۱۰ھ قبائل عرب کے قافلوں کا قبول اسلام کے لئے حاضر مدینہ ہونا ،

حضرت علی کا بحکم رسول اللہ یمن کی طرف کوچ اور سلسلہ تبلیغ اسلام ،

ضمیمہ ۳

ازواجِ مطہرات

(۱) حضرت خدیجہ رضؓ بنت خویلد (بیوہ)

(۲) حضرت سودہ رضؓ بنت زمعہ (بیوہ)

(۳) حضرت حفصہ رضؓ بنت عمر (بیوہ)

(۴) حضرت اُم سلمہ رضؓ (بیوہ)

(۵) حضرت زینب رضؓ بنت خزیمہ (ام المساکین) (بیوہ)

(۶) حضرت زینب رضؓ (زید کی مطلقہ)

(۷) حضرت جویریہ رضؓ (بیوہ)

(۸) حضرت ام حبیبہ رضؓ (عبیداللہ بن جحش کی مطلقہ)

(۹) حضرت میمونہ رضؓ (بیوہ)

(۱۰) حضرت صفیہ رضؓ (بیوہ)

(۱۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ

(۱۲) حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ

ان میں سے کئی نے آپؐ کی زندگی میں وفات پائی، باقی نے آپؐ کی وفات کے بعد،

ضمیمہ ۴

اولادِ نبوی

(۱) حضرت فاطمہ رض
(۲) حضرت زینب رض
(۳) حضرت ام کلثوم رض
(۴) حضرت رقیہ رض
(۵) حضرت قاسم
(۶) حضرت ابراہیم

ان میں حضرت فاطمہ کے سوا، تمام اولاد کا انتقال آپ کی زندگی ہی میں ہو گیا، حضرت فاطمہ رض آپ کی وفات کے ۶ ماہ بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر اپنے محبوب باپ سے جا ملیں!

ضمیمہ ۵

شمائل نبوی

"رسول اللہ دوہرے بدن کے بڑے باعظمت، بہت صاف ستھرے تھے، چہرہ مبارک چمکتا تھا، نہایت خوش خلق تھے، قد مبارک متوسط آدمی سے زیادہ اور لمبے سے کم تھا، شکم مبارک ابھرا ہوا نہ تھا، تمام اعضا میں تناسب تھا، بالوں میں تھوڑا سا گھونگھریالا پن تھا، اگر مانگ نکالی جاتی نکل آتی، رنگ چمکدار تھا جس میں سرخی ملی ہوئی تھی، آواز نرم تھی، ریش مبارک گھنی، دہانہ کشادہ تھا، گفتار شیریں، بازو اور سینہ کشادہ، سینہ مبارک کے بالائی حصہ پر بال تھے، کلائیاں لمبی تھیں، ہتھیلیاں کشادہ اور تلوے پر گوشت، چلتے تو یہ معلوم ہوتا، بلندی سے پستی کی طرف اتر رہے ہیں، نگاہ نیچی رکھتے جس سے ملتے پہلے خود سلام کرتے، جب کوئی شخص آپ کا ہاتھ پکڑتا تو اس وقت تک نہ چھڑاتے جب تک وہ خود ہی نہ چھوڑ دیتا، جب کوئی سائل آپ سے حاجت روائی کی درخواست کرتا تو حاجت روائی فرماتے یا سہل و نرم کلام سے جواب دیتے"[1]

---

[1] طبری

حصہ دوم

عہد خلافتِ راشدہ

ابوبکرؓ

جس سے بنائے عشق و محبّت ہے استوار

پس منظر

اور ایک روز محمد بن عبداللہ (باپ تنا وامّاتنا) نے اس دُنیا سے کنارہ کیا، اور اس حادثہ کے رونما ہوتے ہی مسلمانوں کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہو گئی۔

اب کیا ہوگا؟ ——— !

اب تک یہ تھا کہ رسالت مآبؐ اس دنیا میں تشریف فرما تھے، ان پر وحی نازل ہوتی تھی، ان کے پاس جبریلِ امین تشریف لاتے تھے، ان سے اور خدا سے کلام و پیام کا سلسلہ جاری تھا،

یہ سلسلہ اب ٹوٹ گیا!

اب وحی قیامت تک کسی پر نہیں آئے گی!

اب جبریل قیامت تک اس خاکدانِ عالم پر قدم نہیں رکھیں گے۔

اب خدا قیامت تک کسی بندے کو شرفِ کلام نہیں عطا کرے گا!

پھر اب کیا ہوگا؟ ——— اب گتھیاں کیونکر سلجھیں گی، مشکلات کا حل کس طرح ہوگا؟ معاملات کے سلجھنے کی کیا صورت ہوگی؟ حالات کو درو براہ کون کرے گا؟

فکر اور غم کے اس اندھیرے میں ابوبکرؓ کا پُر نور چہرہ چمکتا ہوا لوگوں کو نظر آیا،

یہ ابوبکرؓ وہی تھے، جنہوں نے رسول اللہ کے ایک اشارہ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، جنہوں نے رسول کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی، اور اب کہ لوگ بدحواس ہو رہے تھے، وہ منبر پیامبری پر تشریف لائے، انہیں دیکھتے ہی لوگوں کی ڈھارس بندھ گئی، ناامیدی کافور ہو گئی، یا کہ اس نے لے لی، اور رسول اللہؐ کی جانشینی پر وہ شخص مامور ہو گیا، جو رسول اللہ کو بہت زیادہ محبوب تھا

رسول اللہ کا بہت زیادہ معتمد تھا، وہ دنیا میں پہلا اور آخری شخص تھا جس کے مال کو رسول اللہ نے اپنا مال سمجھا اور مسند خلافت پر بیٹھ کر ابوبکرؓ نے ثابت کر دیا کہ ملت اسلامیہ نے پریشانی کے ہجوم میں ان پر جو اعتماد کیا تھا، وہ کتنا صحیح تھا!

ولادت

"ولادت سرورِ عالمؐ کے دو برس چند ماہ بعد، یعنی ۵۷۳؁ ولادتِ محمدی یا ۵۷۳ء میں حضرت ابوبکرؓ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے ـــــ" وہیں پلے بڑھے، ماں باپ نے نام عبدالکعبہ رکھا تھا، لیکن قبول اسلام کے بعد آں حضرتؐ نے عبدالکعبہ کو عبداللہ سے بدل دیا، خوب رو اور خوش اندام تھے، اسی لئے "عتیق" بھی نام پڑ گیا۔

ذریعۂ معاش

دولت مند گھرانے کے فرد تھے، جب سن شعور کو پہنچے، تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا، اور اس میں خوب پھلے پھولے، اور کامیاب رہے، تجارت کے سلسلہ میں مکہ سے باہر بھی جاتے رہتے تھے، زیادہ تر شام کی طرف،

محبوب اور معزز

آں حضرتؐ سے تقریباً ہم عمر تھے، بچپن سے دوستانہ تعلقات تھے، یہ آنحضرتؐ کی صحبت اور فطرت سلیم کا اثر تھا کہ عہد جاہلیت میں بھی پاک دامن رہے نہ لہو و لعب میں کبھی حصہ لیا، نہ خرافات اور لغویات میں سیرت اور کردار کی بلندی کے باعث اپنے قبیلہ اور قوم میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے،

قبول اسلام

حضرت رسول مقبولؐ نے جب اسلام کی دعوت دی، تو سب سے پہلے، بغیر کسی تامل اور تذبذب کے (مردوں میں) جس نے اس دعوت پر لبیک کہا، وہ ابوبکرؓ ہی تھے۔

رحم و مروت

"آپ کو خدا نے فطرتاً نرم دل، اور بنی نوع انسان کا ہمدرد پیدا کیا تھا آنکھوں میں مروت تھی، دل دردمندی اور خوف الٰہی سے بھرا رہتا تھا کبھی کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتے تھے، جہاں تک بن پڑتا خدا ترسی اور فیاضی سے کام لیتے، لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے پیش آتے، جود و کرم کا جوہر دکھا کے غریبوں کی خبرگیری کرتے، محتاجوں کے پیٹ بھرتے، اور گم غلاموں کو مول لے لے کر آزاد کرتے ـــــ"

شخصیت اور وجاہت

آپ کا شمار قریش کے رؤسا اور اکابر میں تھا انساب عرب سے خوب واقف تھے، حالات امم سابقہ سے بخوبی آگاہ تھے، اس لئے بڑے معاملہ فہم مانے جاتے تھے، دارالندوہ میں جو اہم معاملہ پیش آتا، اس میں آپ کی رائے زیادہ اہم اور باوقعت تسلیم کی جاتی تھی، اتقا اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ کبھی جھوٹ نہ بولتے، شراب کو عہد جاہلیت ہی میں اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، قوم میں جب کبھی کوئی قتل ہو جاتا، خوں بہا کی رقم مشخص کرنا اور قاتل کو اپنی کفالت وحراست میں رکھنا خاص آپ کا کام تھا[۱]

حضرت بلال کا واقعہ

حضرت بلال کا آقا ان کے قبول اسلام کے باعث بہت ناراض اور برہم تھا، اور طبعاً سفاک اور بے رحم بھی، اس نے چاہا بلال، اسلام سے دستبردار ہو جائیں، جب یہ نہ ہو سکا تو وہ "انتقام" پر اتر آیا، وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹا دیتا، پھر سینہ پر وزنی اور گرم پتھر رکھ دیتا، اور کہتا جب تک لات وعزیٰ پر ایمان نہیں [illegible] تک ہی گت بنتی رہے گی۔ مگر اس ظلم وستم کا جواب بلال کی زبان پر صرف ایک تھا احد، احد، یعنی اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے،

حضرت ابوبکر صدیق کی نظر سے جب یہ لرزہ خیز منظر گذرا، فوراً بلال کو خریدا، اور حسبۃً للہ آزاد کر دیا[۲]

یار غار

قبول اسلام کے بعد جس فداکاری، ایثار، اور خلوص کے ساتھ آں حضرت کا ساتھ دیا، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی:

ایک مرتبہ اپنا سارا اثاثہ راہ خدا میں دے دیا، رسول اللہ نے پوچھا گھر میں کچھ چھوڑا؟ فرمایا، خدا اور اس کا رسول!

ہجرت کے بعد مدینہ میں جب مسجد نبوی کے لئے آپؐ نے زمین خریدی تو اس کی قیمت ابوبکرؓ ہی نے ادا کی، ہجرت کے موقع پر اپنی جان خطرہ میں ڈال کر آل واولاد کو یونہی مکہ میں بے آسرا اور بے سہارا چھوڑ کر، ذات رسالتؐ کے ساتھ ہو لئے، اور غار ثور میں پناہ گزیں ہوئے، یہیں کفار ڈھونڈتے ڈھونڈتے

جب قریب پہنچے تو حضرت ابوبکر پر آں حضرتؐ کی خیر طلبی کے باعث اضطراب سا طاری ہوا، آپ نے
کامل سکون کے ساتھ فرمایا، لاتحزن ان اللہ معنا۔ (مت ڈرو، خدا ہمارے ساتھ ہے)

جہاد آں حضرت کے ساتھ تقریباً تمام غزوات میں جوش اور فداکاری کے ساتھ شرکت کی جب بڑے بڑے کارآزمودہ اور سرد وگرم چشیدہ لوگوں کے پائے ثبات میں لغزش آ گئی، ابوبکر کے استقلال اور استقامت، فداکاری اور جاں نثاری، دوستی اور رفاقت میں کوئی فرق نہیں

خلافت آں حضرتؐ کے وصال کے بعد تقریباً بالاتفاق، آپ کو جانشین رسول منتخب کیا گیا، اس گراں بار ذمہ داری کو جس سچائی اور بے لوثی کے ساتھ آپ نے انجام دیا، وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔

آں حضرتؐ کی وفات کے بعد جب زکوٰۃ کی عدم ادائی، ارتداد کی کارفرمائی اور نام نہاد مدعیانِ نبوت کی دعوت کا سلسلہ شروع ہوا تو ایمان اور کردار کی پوری استقامت کے ساتھ آپ نے ان حالات کا مقابلہ کیا، اور بالآخر ان کا استیصال کر کے دم لیا، حالات کی ابتری اور نزاکت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں نرمی کا مشورہ دیا تھا[1] لیکن حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے، لیکن انت جبان فی الاسلام، اور اسلام قبول کرنے کے بعد پست حوصلہ بن گئے؟ اس موقع اگر حضرت ابوبکرؓ سے ذرا بھی کمزوری سرزد ہوتی تو اسلام پھر کبھی نہ ابھر سکتا۔

خطبۂ خلافت بیعت کے بعد —— "ابوبکرؓ منبر پر چڑھے، اور رسول اللہؐ کی نشست گاہ سے ایک زینہ نیچے بیٹھے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی، اور کہا میں تم لوگوں پر والی بنا لیا، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں راہِ راست پر چلوں تو پیروی کرو، اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ بزرگی میں تم سے افضل ہوں، لیکن بوجھ اٹھانے میں تم سے افضل —— !"

سیرتؓ کار حضرت ابوبکر منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد بھی، بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، انہوں نے اپنی کامیاب تجارت کو چھوڑ کر خلافت کا بارِ گراں اٹھایا

ایثار اور خدویت کے ساتھ زندگی بسر کی ——— انہوں نے لوگوں میں بیت المال سے مساویانہ
کو کسی پر فضیلت نہیں دی، وہ بیت المال سے روزانہ تین درہم بطور مدد معاش لیا کرتے تھے، اور
رسول اللہ کہلاتے تھے ——— !"

"جمادی الآخر ۱۳ھ میں علیل ہوئے بیماری جب شدت پکڑ گئی، تو حضرت عمر کو اپنا جانشین نامزد کیا (پھر کہا) میں نے بیت المال سے جو مال لیا تھا، جب میں مر جاؤں تو فلاں مقام پر جو میرا باغ ہے اُسے فروخت کر کے قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ ابوبکرؓ نے اپنے غسل کے لئے اپنی بیوی اسماء بنت عمیس کو وصیت کی، انہی نے (وفات کے بعد) انہیں غسل دیا، رات کے وقت دفن کئے گئے اُن کی وفات ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ کو ہوئی ——— !"

نماز جنازہ ——— عمرؓ بن خطاب نے پڑھائی، وہ اسی مکان میں دفن کئے گئے جس میں رسول اللہؐ کی قبر ہے، وفات کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی، ان کی خلافت، دو سال چار ماہ رہی ——— !"

صفت وحلیہ

——— "ابوبکر گورے دبلے پتلے تھے رخسار سبک تھے پسلیاں جھکی ہوئی تھیں، مہندی اور کسم کا خضاب لگاتے تھے، ابوبکرؓ کے زمانہ میں جن لوگوں سے فتوٰی لیا جاتا تھا وہ یہ تھے، علیؓ ابن ابی طالب، عمرؓ بن خطاب، معاذؓ بن جبل، ابیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت، اور عبداللہ بن مسعود ——— !"

بہت بڑی خدمت

حضرت ابوبکرؓ کی یوں تو ساری زندگی، اسلام اور داعی اسلام کی خدمت میں گزری، لیکن آپ کی سب سے بڑی خدمت قرآن کی کتابی صورت میں (مصحف کے نام سے) ترتیب ہے، اگر آپ نے بروقت اس طرف توجہ نہ کی ہوتی، تو اس سلسلہ میں بعد کو مفاسد کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا، لیکن آپ نے بروقت اقدام واہتمام کر کے قرآن کریم کی سالمیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پائندہ کر دیا !

خلافت صدیقی پر ایک نظر

اگرچہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ صرف سوا دو سال کی مختصر مدت تک محدود ہے، لیکن یہ سوا دو سال اہمیت

کے لحاظ سے اپنے دامن میں ایسے دُور رس، فیصلہ کن اور نازک تر مقامات، حالات، اور کیفیات تھے کہ ان میں سے کوئی ایک واقعہ بھی تاریخ کا رُخ بدل سکتا تھا، اگر آپ نے مانعین زکوٰۃ کو ڈھیل دی ہوتی یا مرتدین کے ساتھ رعایت کی ہوتی، یا باطل مدعیان نبوت کے ساتھ چشم پوشی کی ہوتی، اسامہ کے معاملہ میں تاخیر روا رکھی ہوتی، یا کم از کم اسامہؓ کی سپہ سالاری ختم کر دی ہوتی، تو ان میں سے ہر واقعہ بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمزور بنا دیتا، لیکن آپ نے ایسے استقلال، استقامت اور حوصلہ کا ثبوت دیا کہ لوگوں میں ایک نئی اُمنگ پیدا ہو گئی، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں وہ استقلال پیدا ہوا کہ وہ کوہ گراں کی طرح ثابت اور مستقل ہو گئے۔

سلہ سلہ طبری

عمرؓ

گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان

622
571
51

63

63

11
29
22
6

خلاصۂ حیات

حضرت ابوبکرؓ نے اس دنیا سے رخت سفر باندھا، حضرت عمرؓ کی نامزدگی قوم نے تسلیم کرلی اور وہ منصب خلافت پر فائز ہو گئے۔

حضرت ابوبکر رقیق القلب تھے، رحم دل تھے، بامروت تھے، حضرت عمرؓ سخت مزاج تھے۔ اصول کے معاملہ میں متشدد تھے، حق کے معاملہ میں رعایت اور مروت کے قائل نہیں تھے، لیکن مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد ان میں وہ نرمی اور لینت آگئی، جو اس منصب کے لئے ضروری تھی، لوگ برسر منبر انہیں ٹوک دیتے تھے، ان پر اعتراض کرتے تھے، ان کی فکر و رائے سے اختلاف کرتے تھے، اور زیادہ تر یہ اختلاف تند و ترش لہجہ میں ہوتا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے کبھی قوت اور طاقت کے بل پر لوگوں کی آواز دبانے کی کوشش نہیں کی، وہ راتوں کو گشت کرکے دیکھتے تھے کون آسودہ حال ہے، کون فاقہ مست، وہ بھوکوں کو دیکھ کر لرز جاتے تھے، خود کاندھے پر اناج کی بوری رکھتے اور لے کر پہنچتے تھے، وہ لوگوں کا حق دلانے میں ذرا بھی تاخیر روا نہ رکھتے تھے، وہ اپنے غلام کو بھی وہی کھلاتے تھے جو خود کھاتے تھے، وہی پہناتے تھے جو خود پہنتے تھے، بحر و بر کی حکومت ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن لباس فاخرہ نہ خود پہنا، نہ اپنے عاملوں اور گورنروں کو پہننے دیا، ایران و روم کے خزانے ان کے قدموں پر لاکر ڈال دیئے گئے، لیکن ان کے دسترخوان کی سادگی میں فرق نہ آیا، ممالک غیر کے سفراء ان سے ملنے آتے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ زمین پر معمولی سا لباس پہنے ہوئے جو شخص دراز ہے، یہی اس پر ہیبت و عظمت شخصیت کا حامل ہے جس کے نام سے باطل لرزتا اور ناحق کانپتا ہے، بیت المقدس میں ایک فاتح فوج کے سپہ سالار اعلیٰ کی حیثیت سے عمرؓ نے جب قدم رکھا تو پیوند لگا ہوا لباس ان کے بدن پر تھا، لیکن رعب و جلال کا یہ عالم کہ اکڑی ہوئی گردنیں اسے دیکھتے

ہی ادب سے جھک گئیں!

ولادت

حضرت عمرؓ آں حضرتؐ سے ۱۳ سال چھوٹے تھے، جب ذرا سمجھ آئی تو باپ نے اونٹوں کے چرانے کا کام سپرد کر دیا، اس کام میں اگر ذرا بھی غفلت برتتے تو سخت گیر باپ کے ہاتھوں مارے جاتے۔

قبول اسلام

عہد جاہلیت میں اسلام کے نام اور داعی اسلامؐ کے پیام کے سخت و شدید دشمن تھے ایک مرتبہ اس ارادہ سے نکلے کہ آج محمدؐ کا فیصلہ کر کے لوٹوں گا، راستہ میں معلوم ہوا بہن اور بہنوئی بھی اسلام قبول کر چکے ہیں، راستہ ہی سے پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہاں تلاوت قرآن ہو رہی تھی، کلام الٰہی کا سننا تھا کہ دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی، سرکشی اطاعت سے بدل گئی، اسلام قبول کر لیا، جس سختی سے اسلام کے مخالف تھے، اب اسی جوش کے ساتھ اسلام کے منادا اور مبلغ بن گئے۔

ہجرت اور جہاد

رسول اللہؐ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت فرمائی تو کچھ عرصہ کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی وطن مالوف پر ایک الوداعی نظر ڈالی، اور بظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نئے شہر — مدینہ — کی طرف روانہ ہو گئے۔

غزوات میں رسول اللہؐ کے دوش بدوش شرکت کی، استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا، جنگ احد میں جب آں حضرتؐ کی وفات کی افواہ مشہور ہوئی تو حوصلہ نے جواب دے دیا، تلوار ایک طرف پھینک دی کہ اب لڑ کر کیا کریں گے؛ لیکن جب معلوم ہوا یہ افواہ غلط تھی تو پھر اسی جوش و خروش سے شریک جنگ ہو گئے۔ بدر سے لے کر تبوک تک تمام جنگوں میں آں حضرتؐ کے ساتھ شریک رہے،

خلافت

حضرت ابوبکرؓ کی نامزدگی قوم نے قبول کر لی اور حضرت عمرؓ خلافت کے منصب پر فائز ہو گئے، آپ نے ۲۸ جمادی الآخر ۱۳ھ کو زمام خلافت ہاتھ میں لی[1] تقریباً ساڑھے دس سال تک اس شان کے ساتھ فرائض خلافت انجام دیئے کہ وہ تاریخ اسلام کے ایک روشن اور تابناک باب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں،

سا حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ کا دور خلافت بھی بے نفسی بے لوثی اور فنائیت کا دور تھا، اپنی

---

[1] طبری

ذات کے لئے کچھ نہیں چاہا، اپنے خاندان کے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی، کمزور کا ساتھ دیا، مظلوم کی داد رسی کی، ظالم کو سزا دی، انصاف اور مساوات کے معاملہ میں بڑی سے بڑی شخصیت کا لحاظ بھی نہ کیا، جبلہ بن ایہم غسانی، چھوٹا موٹا بادشاہ تھا، قبول اسلام کے بعد مکہ آیا، طواف کی حالت میں ازار پر ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا، اس کی نخوت اس بدتمیزی کو برداشت نہ کر سکی، بدو کے منہ پر طمانچہ مار دیا، اس نے دربار خلافت میں استغاثہ پیش کیا، فیصلہ جبلہ کے خلاف ہوا وہ فرار ہو کر مرتد ہو گیا، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے انصاف کی آن پر حرف نہ آنے دیا،

شہادت ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ ۔ ۶۴۴ء کو ابولولو، ایک غیر مسلم غلام نے نماز کی حالت میں خنجر سے حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔

وفات کے وقت آپ نے چھ آدمیوں کی ایک مجلس بنا دی کہ وہ کثرت آراء سے جسے چاہے خلیفہ منتخب کر لے مجلس نے یہ حق اپنے ایک رکن حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو دے دیا، انہوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا، اور اس طرح ان کی خلافت پر بیعت ہو گئی۔

عثمانؓ

جان دی — دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

خلاصہ حیات

ولادت مکہ پر ابرہہ کی فوج کشی (عام الفیل) کے چھٹے سال آپ نے اس دنیا کو اپنے وجود سے رونق بخشی، بنو امیہ کے خاندان سے تھے،

کاروبار ہوش سنبھالا تو تجارت شروع کر دی۔ خوب کمایا، خوب کھلایا، دل رحم و مروت سے معمور تھا کبھی سائل کا سوال رد نہیں کیا، خدا نے تجارت میں بہت برکت دی، لاکھوں کما ڈالے، مگر بڑی دریا دلی سے خرچ بھی کر دیئے۔

قبول اسلام حضرت ابوبکر صدیق سے بچپن کی دوستی تھی، جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو عثمانؓ کو بھی تلقین کی آں حضرت کی سیرت پاک کا نقش دل پر بیٹھا ہوا تھا، بے چون و چرا حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، اور اپنی دولت بے دریغ راہ اسلام پر خرچ کرنے لگے۔

شرف خاص آپ بے انتہا بردبار، رحم دل، بامروت اور خلیق و متواضع تھے، آپ کی حیاداری مشہور تھی، آں حضرتؐ آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے، چنانچہ اپنی ایک صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے شادی کر دی، ان کا جب انتقال ہو گیا تو دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کو آپ کے حبالۂ عقد میں دے دیا، اسی باعث آپ ذوالنورین کہلائے۔

اسلام کا پہلا مہاجر اسلام قبول کرنے کے بعد بے حد اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن پائے ثبات و استقامت میں لغزش نہ آئی،

پھر آں حضرتؐ کے حکم سے چند مسلمانوں کا جو مختصر سا قافلہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گیا، اس میں حضرت عثمانؓ بھی تھے، اور ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بھی، رسول اللہ نے یہ منظر دیکھا تو متاثر ہوئے،

اور عادی۔

بعد ازاں جب مسلمانوں کو مکہ سے مدینہ کا اذن ہجرت ملا، تو حضرت عثمانؓ وہاں بھی ہجرت کر کے ہر چیز سے منہ موڑ کے، گھر بار، عزیز دوست، دولت، ثروت سے کنارہ کش ہو کے وہاں پہنچ گئے۔

بیعت رضوان ایک مرتبہ آں حضرتؐ کی طرف سے پیام بر بن کر آپ مکہ گئے، کفار نے ازراہِ شرارت آپ کو واپس نہ آنے دیا، آں حضرت حدیبیہ کے مقام پر فروکش تھے (۶ھ)، حضرت عثمان کے بارے میں یہ افواہ مشہور ہوگئی کہ کفار نے انہیں قتل کر دیا، آں حضرتؐ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے قربانی کی بیعت لی یہ بات خدا کو اتنی پسند آئی کہ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا اذ یبایعونک تحت الشجرۃ

خلافت یکم محرم ۲۴ھ کو آپ نے زمام خلافت سنبھال لی[1]

جامع القرآن حضرت عثمان کی ایک حیثیت جامع القرآن کی بھی ہے، آپ نے قرآن جمع کیا، اور اسے مرتب کیا، طویل سورتوں کو طویل سورتوں کے ساتھ اور چھوٹی سورتوں کو چھوٹی سورتوں کے ساتھ کر دیا[2]

عادات وصفات حضرت عثمانؓ کاتب وحی بھی تھے، آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں بھی ہے "عشرہ مبشرہ" اِن دس صحابیوں کو کہتے ہیں جنہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل چکی تھی۔

شہادت حضرت عثمانؓ بہت نرم دل تھے، آن کی نرم دلی سے لوگوں نے ناجائز فائدے بھی اٹھائے،

حضرت عثمانؓ نے مختلف صوبوں میں جو گورنر مقرر کئے تھے، ان کے بعض طور طریقوں سے لوگوں کو شکایات پیدا ہوئیں، خود حضرت عثمانؓ کے جود وعطا سے بھی محرومین کو صدمہ پہنچا، اور وہ سازش پر آمادہ ہو گئے رفتہ رفتہ یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ خاص مدینۃ الرسول میں باغیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، با

[1] [2] طبری

محاصرہ چالیس روز تک جاری رہا، حضرت علیؓ نے باغیوں اور مفسدوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ راہِ راست پر نہ آئے، احتیاطاً آپ نے حضرات حسنین علیہم السلام کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ صدر دروازہ پر حفاظت اور نگہبانی کے لئے مامور کر دیا۔

باغی یہ رنگ دیکھ کر پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئے اور شہید کر دیا،

یہ واقعہ ایسا اچانک پیش آیا کہ سارے مدینہ پر ایک عجیب سراسیمگی طاری ہو گئی، تین روز تک باغیوں کی حکومت رہی، اس کے بعد کہیں جا کر امن و امان قائم ہوا[1]

حلیہ ــــ اوسط قد والے، خوب صورت گھنی داڑھی والے گندم گوں شخص تھے شانے بڑے بڑے، دونوں شانوں کے بیچ میں فاصلہ سر کے بال گھن دار، دانت سونے کے تار سے بندھے ہوئے، داڑھی کا خضاب زرد ہوتا تھا، عثمانؓ کے زمانہ میں فقہا یہ لوگ تھے، علی ابن ابی طالب عبداللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زیدؓ بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابو الدرداءؓ، ابو سعید الخدری، عبداللہ بن عمر، سمعان بن ربیعہ الباہلی ــــــ

---

[1] طبری

علیؓ

جو دیدہ ور ہیں خاکِ درِ بوتراب ہیں

خلاصہ حیات

ولادت حضرت علیؓ آں حضرتؐ کے مبعوث ہونے سے دس سال پہلے تولد ہوتے، شروع ہی سے آں حضرتؐ آپ پر بہت مہربان تھے، چنانچہ ابوطالب کے سایہ پدری کی بجائے اوائل عمر ہی سے آپ آں حضرتؐ کے سایۂ عاطفت میں پلے اور بڑھے،

اسلام حضرت علی نے آں حضرتؐ کو نماز پڑھتے دیکھا خود بھی پڑھنے لگے اسلام کا چرچا سنا، فوراً اسلام قبول کر لیا، باپ (ابوطالب) نے بیٹے کو اس رنگ میں دیکھا، نہ منع کیا، نہ تادیب کی۔

عشق رسول رسول اللہؐ کی ذات گرامی سے حضرت علیؓ کو والہانہ عشق تھا، جب آپؐ نے ہجرت کا فیصلہ کیا، تو کفار گھر کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے کہ جیسے ہی آپؐ باہر نکلیں، قتل کر دیں، آپؐ حضرت ابوبکر کے ساتھ ہجرت کے ارادہ سے تشریف لے گئے، اپنی چارپائی پر حضرت علیؓ کو لٹا دیا، جو امانتیں اہل مکہ کی تھیں وہ حوالے کر دیں حضرت علیؓ جانتے تھے، یہ پھولوں کی سیج نہیں بستر مرگ ہے، مگر ذرا ہراساں نہ ہوئے، نہایت اطمینان سے لیٹ گئے، صبح کفار نے آنحضرتؐ کے بجائے آپ کو بستر پر استراحت فرما دیکھا، تو بہت تلملائے لیکن اب کیا کر سکتے تھے۔

عشق کی انتہا صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ لکھنے کا کام حضرت علیؓ کے سپرد ہوا، کفار نے اعتراض کیا کہ اس میں "محمدؐ" کے ساتھ "رسول اللہ" نہ لکھا جائے، ہم اگر نبی مانتے تو جھگڑا ہی کاہے کا تھا، رفع شر کے لئے آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، رسول اللہ کا لفظ کاٹ دو، حضرت علیؓ نے عرض کیا، میں آپ کو رسول مانتا ہوں، رسول لکھ چکا ہوں، یہ لفظ مجھ سے نہ کٹ سکے گا، آخر

خود آں حضرتؐ نے اپنے دست مبارک سے یہ لفظ مٹایا،

شجاعت حضرت علیؓ کی شجاعت، سپہ گری اور فنون جنگ کی مہارت ہمعصروں میں سب پر بالا تھی، بڑے بڑے معرکے سر کئے، بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑا، بڑے بڑے کارآزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ، جنگ جو سورماؤں کے دانت کھٹے کر دیئے۔

خیبر کی جنگ میں مرحب پہلوان کا قلعہ کسی سے سر نہ ہو سکا، حضرت ابو بکرؓ گئے، اور لوٹ آئے، حضرت عمرؓ نے دو مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے، آپؐ نے فرمایا کل میں اسے بھیجوں گا، جو خدا اور اس کے رسول کو عزیز ہے، اور جسے خدا اور اس کا رسول عزیز رکھتے ہیں، وہ اس معرکہ کو سر ہی کر کے آئے گا۔ دوسرا دن آیا حضرت علیؓ کا مزاج ناساز تھا، سب لوگ اس امید میں آئے کہ دیکھیں نگاہ رسالت کسے سرفراز کرتی ہے، آپؐ نے حضرت علیؓ کو یہ ذمہ داری سونپی، اور آپ پہلے ہی حملے میں مظفر و منصور ہوئے، حضرت عمرؓ تک کو حضرت علیؓ کی اس سرفرازی پر رشک آ گیا۔

ہجرت آں حضرتؐ جب مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے، تو کچھ عرصہ کے بعد لوگوں کی امانتیں واپس کر کے حضرت علیؓ بھی مدینہ منورہ پہنچ گئے،

شادی ۲ھ میں حضرت علیؓ کی شادی حضرت فاطمہؓ سے ہوگئی۔ حضرت فاطمہؓ سے شادی کی درخواست، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی کی تھی، لیکن آپؐ نے حضرت علیؓ کو ترجیح دی، اور انہی سے نہایت سادگی کے ساتھ سلطان کونینؐ کی چہیتی بیٹی کی شادی ہو گئی، حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں حضرت علیؓ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی،

مجاہدات تقریباً تمام غزوات میں حضرت علیؓ نے شرکت کی، ذوالفقارِ علی جب بے نیام ہوتی تو بجلی بن کر، کافروں کے خرمن حیات پر گری، بڑے بڑے مانے ہوئے پہلوان اور سورما مقابلہ میں آئے اور مارے گئے، بعض معرکوں میں بڑے بڑے لوگوں کا حوصلہ چھوٹ گیا، لیکن حضرت علیؓ شمع نبوت کے گرد پروانہ بن کر طواف کرتے رہے، اور دشمنوں کے سر کاٹتے رہے، نہ ان پر ہراس تھا، نہ دہشت، اسلام کی خاطر وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہتے تھے،

لہ الفاروق ٹہ طبری

خلافت

حضرت علیؓ نے پوری بے نفسی کے ساتھ خلفائے ثلثہ کی بیعت کی ان کا ساتھ دیا، انہیں مفید مشورے دیتے، ان کی ذکر صائبہ کا ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا۔ لولا علی لھلک عمر، یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا! حضرت عمرؓ جب بیت المقدس تشریف لے گئے۔ تو حضرت علیؓ مدینہ میں رہے، اور حضرت عمرؓ کی قائم مقامی کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ کے بعد ۲۴ ذی الحجہ ۳۵ھ کو آپ خلافت پر متمکن ہوئے، [۱]

فتنہ کا آغاز

حضرت علیؓ خلفائے ثلثہ کی زندگی میں بھی اپنے تقوے، اخلاص، جوش عمل، قربانی اور ایثار، خوش بیت اور جاں نثاری، زہد وعبادت، تہور وشجاعت، تدبر اور اصابت فکر ورائے میں کسی سے کم نہیں تھے، اور اب تو کوئی ان کا ہم پایہ بھی نہیں رہ گیا تھا، لہٰذا آن کی خلافت اور استحقاق خلافت سے کسی کو مجال انکار نہ تھی،

حضرت علیؓ کے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد بعض صحابۂ کرام نے قصاص عثمانؓ کی تجویز پیش کی حضرت علیؓ نے فرمایا، امن قائم ہو لے حالات سازگار ہو جائیں، تو یہ کام ضرور کیا جائے گا لیکن مخصوص اور فتنہ پسند عناصر نے اس مطالبہ کو نعرہ بنا لیا، اور سازش وبغاوت کی تیاریاں کرنے لگے۔

صلح وجنگ

جنگ جمل کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کی نزاع غلط فہمی پر مبنی تھی، وہ بڑی آسانی سے، پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ دور ہو گئی، دونوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو گئے،

لیکن امیر معاویہؓ کا معاملہ دوسرا تھا، انہوں نے مطالبۂ قصاص عثمانؓ کی آڑ لے کر بیعت تک کرنے سے انکار کر دیا، چونکہ حضرت علیؓ کی بیعت تمام ہو چکی تھی، لہٰذا انہوں نے منکرین بیعت کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی،

خوارج

حضرت علیؓ ہر اعتبار سے امیر معاویہ کے لشکر کو شکست دے سکتے تھے، لیکن خوارج نے سر اٹھایا، یہ جماعت پہلے حضرت علیؓ کے ساتھ تھی، پھر "ان الحکم الا للہ" کا نعرہ لگا کر مخالفت کرنے لگی، خوارج کی آویزش میں ایسے مصروف ہوئے کہ پورے طور پر شام کی خودسر حکومت پر توجہ نہ کر سکے

---

[۱] طبری نے ۱۲ رمضان لکھی ہے۔

شہادت

۱۷ رمضان سنہ ۴۰ھ کو ایک خارجی ابن ملجم نے نماز فجر کے وقت حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ کیا، یہ حملہ مہلک ثابت ہوا، اس کے بعد آپ صرف دو روز زندہ رہے، ابن ملجم گرفتار ہو گیا، آپ نے فرمایا، اگر میں مر جاؤں تو اسے قتل کر دینا، اگر زندہ بچ گیا تو میں جانوں اور یہ شخص۔"

وفات کے وقت لوگوں نے دریافت کیا ہم حضرت امام حسن کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ آپ نے کہا "میں کچھ نہیں کہتا، یہ تمہارا کام ہے، جسے چاہو اپنا امیر بناؤ۔

مدت خلافت

تقریباً پونے پانچ سال آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، وفات کے وقت ۶۳ سال کے قریب عمر تھی، حضرت امام حسن نے نماز جنازہ پڑھائی اور کوفہ کے دار الخلافہ میں تدفین عمل میں آئی۔

علمائے عہد علوی

دورِ حضرت علیؓ کے وہ اصحاب جن سے علم حاصل کیا جاتا تھا، یہ تھے:-

حارث الاعور، ابو الطفیل عامر بن واثلہ، حبۃ العرنی، رشید الہجری، حویرہ بن مسہرہ، اصبغ بن نباتہ، میثم التمار، امام حسن بن علی ——————— [1]!

ناکام سازش

ابن ملجم کے دو اور ساتھیوں نے اسی دن امیر معاویہ اور عمرو بن عاص کو بھی قتل کرنے کا عہد کیا تھا، امیر معاویہ زخمی ہو گئے، عمرو بن عاص بچ گئے، اور ابن ملجم کی طرح، اس کے دونوں ساتھی بھی قتل کر دیئے گئے!

---

[1] طبری

انتخاب

(خلیفہ یا امیر کے طریقہ انتخاب کے بارے میں اسلام خاموش ہے، اصل بات یہ ہے کہ اصولی باتیں قرآن میں اور حدیث میں محکم طور پر بیان ہوئی ہیں تفصیل ہمیشہ حالات مصالح اور وقت کی تابع ہوتی ہے اسے امت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح موزوں سمجھے عمل کرے۔

خلیفہ یا امیر کے بارے میں اسلام یہ تو بتاتا ہے کہ اس پر عوام کو اعتماد ہونا چاہیئے، اسے عوام کے رجحانات کا (بشرطیکہ وہ دین سے معارض نہ ہوں) پاس اور احترام کرنا چاہیئے مگر اسی طرح عوام کے لئے یہ تاکید ہے کہ امیر اور خلیفہ جب تک قرآن اور حدیث کے خلاف اقدام نہ کرے اس کی اطاعت فرض ہے لیکن اگر وہ زعم حکومت میں حدود سے تجاوز کرے تو صاف تصریح موجود ہے لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق !)

آں حضرت ؐ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا، تو کسی شخص کے لئے کوئی وصیت نہیں کی، مہاجر اور انصار نے حضرت عمرؓ کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنی جانشینی کے لئے "منتخب" کیا، پھر عوام سے اپنی رائے کی توثیق کرائی، پھر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

حضرت عمرؓ نے چند آدمیوں کو منصب خلافت کا اہل سمجھا جن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بھی تھے خلیفہ کے انتخاب کی ذمہ داری، ارباب حل وعقد کی ایک جماعت پر ڈالی، انہوں نے حضرت عثمانؓ کو منتخب کر لیا، اور وہ خلیفہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ شہید ہوئے، وہ اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کر سکے، اہل مدینہ اور متعدد جلیل القدر صحابہ کرام کے اصرار سے حضرت علیؓ نے خلافت کا بار گراں اپنے دوش مبارک پر رکھا اور تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ امیر معاویہ نے بیعت سے انکار کر کے طغیان وسرکشی کا دروازہ کھولا۔

اصلاحات نظم ونسق مملکت

خلافت راشدہ کا نظام حکومت مبنی تھا خوفِ الٰہی پر، اس کی بنیاد اور اساس یہ تھی کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں خدا اُسے دیکھ رہا ہے، ہم جو کچھ کریں گے خدا کے ہاں اس کی جوابدہی کرنا پڑے گی، ہم نے جو کچھ کیا اس کی ذمہ داری صرف ہم پر ہے، اور اس ذمہ داری سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا، یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے سارے دور میں بھی کہیں وہ کمزوری نظر نہیں آتی، جو بادشاہوں، ڈکٹیٹروں، ملیٹروں، اور جمہوریت کے علمبرداروں میں نظر آتی ہے۔

ایک نصیحت یزید بن ابی سفیان کو، جب شام کی مہم پر حضرت ابوبکرؓ نے مامور کیا، تو فرمایا ——— "اے یزید، تمہاری قرابت داریاں ہیں، شاید ان کو تم اپنی امارت سے فائدہ پہنچاؤ، درحقیقت یہی سب سے بڑا خطرہ ہے، جس سے میں ڈرتا ہوں، رسول اللہ نے فرمایا، جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور ان پر کسی، کو بلا استحقاق محض رعایت کے طور پر افسر بنا دے، تو اس پر خدا کی لعنت ہو ——— [1]!"

نئے اصلاحات حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں آں حضرتؐ کے مقرر کئے ہوئے گورنروں کو بحال رکھا، اور حکومت کے دوسرے شعبے ممتاز صحابہ کے سپرد کر دیئے، مالیات کا شعبہ ابوعبیدہؓ اور عدالت کا محکمہ عمرؓ کے حوالہ کر دیا، حکومت اسلامیہ کا شہری نظام سب سے پہلے عمرؓ نے قائم کیا تھا، انہوں نے ہر صوبہ پر ایک گورنر کا تقرر کیا جو ان کے ہدایات کے ماتحت حکومت کرتا تھا، خلیفہ کو عاملہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے کلی اختیارات حاصل تھے، خراج کا افسر، مالیات کا سب سے بڑا افسر تھا، گورنر نظم ونسق میں مختار تھا اور خراج کا افسر مالیات کے محکمہ کا مستقل حاکم تھا، مالیات کے افسر کا تقرر خلیفہ کے اختیار میں تھا، عثمانؓ نے بھی عمرؓ کی پالیسی اختیار کی ——— [2]!

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ مسند ابن حنبل [2] النظم الاسلامیہ

قیام دفاتر حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے "صرف دولت" کو ایک منظم شکل دینے کے لئے دفاتر قائم کئے، یہ دفاتر مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ فوج میں سپاہیوں اور ان کی تنخواہوں کی باقاعدہ فہرست رہتی تھی، دیوانی خراج میں ریاست کی آمدنی اور اس کے آمد و صرف کا حساب رہتا تھا ــــــ![1]"

فوجی تنظیم ــــــ"عہد جاہلیت میں جنگ کے وقت قبیلہ کے افراد تلواریں، نیزے اور کمانیں لے کر نکلتے اور حریف سے مقابلہ کرتے، جنگ کے بعد اپنے گھر واپس آجاتے اور کاروبار میں لگ جاتے، اسلام نے عربوں کی شیرازہ بندی کی، عمرؓ نے فوج کو ایک منظم شکل دی، اور فوجی نظم و نسق کے لئے دیوانی فوج قائم کی ــــــ![2]"

پولیس کا نظام حضرت علیؓ کے عہد میں باقاعدہ پولیس کا نظام قائم ہوا، اس محکمہ کے سب سے بڑے افسر کو "صاحب شرطہ" کہا جاتا تھا ــــــ![3]"

جیل ــــــ"آں حضرتؐ اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں مجرم کو ایک گھر یا مسجد میں بند کر دیا جاتا تھا، قید خانہ کا رواج عمرؓ کے زمانہ میں ہوا، پھر برابر قائم رہا ــــــ![4]"

پروانۂ تقرر جس شخص کا تقرر کسی بڑے منصب پر ہوتا تھا، اسے ایک پروانہ دیا جاتا تھا جس میں اس کے اختیارات کا ذکر ہوتا تھا، جہاں اس کا تقرر ہوتا تھا، وہاں ایک مجمع عام میں یہ پروانہ پڑھ کر سنایا جاتا تھا، اور اس سے عہد لیا جاتا تھا کہ ــــــ"وہ ترکی گھوڑے پر نہ سوار ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، اہل حاجت کے لئے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔"

بحری بیڑہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں بحری جنگ پر زیادہ توجہ کی گئی چنانچہ امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی کوششوں سے تھوڑی ہی مدت کے اندر، اسلام کا بحری بیڑہ اتنی ترقی یافتہ حالت میں پہنچ گیا کہ ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو بحری جہازوں

---

[1] النظم الاسلامیہ [2] النظم الاسلامیہ [3] کتاب الخراج

کا قافلہ لے کر شام پر حملہ کیا، تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے رومۃ الکبریٰ کے اس عظیم الشان بحری بیڑے کو ایسی ذلت بخش شکست دی کہ اس کا منہ ہمیشہ کے لئے پھر گیا۔

تعمیرات عامہ

عام پبلک کے فائدے کے لئے عہد عثمانیؓ میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں، پل بنائے گئے، نہریں تیار کرائی گئیں، مہمان سرائے کی بنا پڑی، دیوان اور دفتر کے لئے عمارتیں عالم وجود میں آئیں، مسجد نبوی کی بھی توسیع ہوئی،

تعمیرات کا ذوق دراصل اس مدنیت سے ہے، جو سادگی کی ضد ہے اور یہ مدنیت پیدا ہوتی ہے خود پسندی اور خدا فراموشی سے اسلام جب تک اصلی حالت میں باقی رہا مسلمانوں کا ذوق تعمیر نہیں ابھرا جب اسلام کی سادگی فراموش ہوگئی، تو دوسرے جذبے ابھرنے لگے۔

مشورت، جمہوریت اور عوامیت

جمہوریت اور عوامیت (ڈیموکریسی اینڈری پبلک) ان دو اصطلاحات نے دنیا کو بڑے مغالطہ اور فریب میں مبتلا کر رکھا ہے،

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب (اور عوامیت کا حال بھی سوا اس کے کیا ہے کہ)

بس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری!

لیکن بغیر اس اصطلاح کو استعمال کئے ہوئے اسلام کے عہد خلافت راشدہ میں جمہوریت اور عوامیت کا جو دل آویز منظر نظر آتا ہے، وہ دنیا نے پھر کبھی نہیں دیکھا، اور اس وقت تک نہیں دیکھ سکے گی، جب تک جارج برنارڈ شا کے الفاظ میں محمدؐ کی طرف رجعت نہ کی جائے۔

ذیل میں چند واقعات وامثال ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکر کا عمل —— جب کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو حضرت ابو بکرؓ اہل الرائے اور فقہائے صحابہ سے مشورہ کرتے تھے، اور مہاجرین وانصار میں سے چند ممتاز صحابہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمنؓ بن عوف، معاذؓ بن جبل، ابی بن کعبؓ، اور زیدؓ بن ثابت کی مجلس مشورت طلب کرتے تھے ——!

مشورت —— "آں حضرتؐ ابو بکرؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ عمرؓ سے عمرؓ کے عہد میں عثمانؓ اور علیؓ کی حیثیت وزراء کی تھی، اس زمانہ میں خلیفہ نظم مملکت میں مجلس شیوخ سے مشورہ کرتا تھا، یہ مجلس بڑے بڑے صحابہ، اعیان قوم، اور سرداران قبائل پر مشتمل تھی، اس کا اجلاس مسجد نبوی میں ہوتا تھا ——!

حجابت —— خلفائے راشدین نے ملاقات کی عام اجازت دے رکھی تھی چنانچہ ہر شخص بے تکلف ان کے پاس جا سکتا تھا کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی ——!

لہ تاریخ اسلام بحوالہ طبقات ابن سعد ۔ ۲ لنظم الاسلامیہ

مجاہدات و فتوحات

خلافت راشدہ کا دور مجاہدات و فتوحات کے اعتبار سے ممتاز و منفرد ہے مختصر طور پر چند خاص مہمات کا ذکر ہم کرتے ہیں،

فتح عراق

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولیدؓ کو فتح عراق پر مامور فرمایا، وہ فتح کا پرچم لہراتے ہوئے ابلہ پہنچے، عراق کا ایرانی حاکم ہرمز مقابلہ کے لئے نکلا، ایرانیوں نے اپنے پیروں کو زنجیروں سے جکڑ لیا تھا کہ میدان سے منہ موڑنے نہ پائیں، لیکن ایرانیوں نے شکست فاش کھائی، ہرمز مارا گیا، اردشیر نے بہت بڑی فوج مدد کے لئے بھیجی، حضرت خالدؓ نے اس سے بھی مقابلہ کیا، دشمن کی تیس ہزار سپاہ کام آئی، اور بڑے بڑے افسر مارے گئے ——[1]

متعدد شہروں کو فتح کرتے ہوئے حضرت خالدؓ حیرہ پہنچے، ایرانی محاصرہ کی تاب نہ لا سکے، ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی!

عین التمر

اور متعدد مقامات فتح کرنے کے بعد حضرت خالدؓ نے انبار کا معرکہ سر کیا،

دومۃ الجندل

حضرت خالدؓ کا فتح مند لشکر پھر آگے بڑھا، اور دومۃ الجندل کا محاصرہ کر لیا، یہاں عراق اور شام کی سرحدیں ملتی تھیں، دومۃ الجندل کے حاکم جودی نے جو عیسائی تھا مقابلہ کیا، شکست کھائی، اور مارا گیا، حضرت خالدؓ نے پھاٹک توڑ کر قلعہ پر قبضہ کر لیا،

فراض

حضرت خالدؓ نے بعض دوسرے مقامات فتح کرنے کے بعد، فراض کے فتح کرنے کا ارادہ کیا یہاں شام عراق اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں، اس لئے رومی بھی ایرانیوں کے ساتھ مل گئے، اگرچہ اس جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں تین تین طاقتیں تھیں، لیکن تینوں نے شکست فاش کھائی، پیچھے دریا تھا، سامنے مسلمان، بھاگنے کا راستہ نہ ملا، دشمن کی فوج بالکل برباد ہو گئی •

[1] تاریخ اسلام

اجنادین کی فتح حضرت ابوبکرؓ نے عمرو بن العاص کو فتح فلسطین پر مامور کیا تھا، اجنادین کے مقام پر بہت بڑی رومی فوج موجود تھی، لیکن مسلمان غالب آگئے ۔ ۲۸ جمادی الاول سنہ ۱۳ھ)

جنگ قادسیہ حضرت عمرؓ نے (سنہ ۱۴ھ) سعدؓ بن ابی وقاص کی سرکردگی میں بیس ہزار کا ایک لشکر ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے بھیجا، مقابلہ میں رستم کا لشکر تھا، ایرانی، فوجوں کی تعداد حد شمار سے خارج تھی، نماز ظہر کے بعد لڑائی شروع ہوئی رات گئے تک جاری رہی ، دوسرے روز پھر بڑے زور کا رن پڑا، اس معرکہ میں دس ہزار ایرانی ہلاک ہوئے، دو ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا، لیکن لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا، تیسرے دن فیصلہ کن لڑائی شروع ہوئی: آج ایرانیوں نے سب سے زیادہ زور ہاتھیوں پر دیا تھا، مسلمان سپاہی اپنے نیزے لے کر ان ہاتھیوں پر پل پڑے، نیزے ہاتھیوں کی آنکھ پر پڑتے اور وہ چنگھاڑتے ہوئے پیچھے ہٹتے، ایک بزرگ حضرت قعقاعؓ نے نشان کے ہاتھی پر ایسا وار کیا کہ اس کی سونڈ کٹ کر گر پڑی، وہ بھاگا، اور اس کے پیچھے پیچھے تمام ہاتھی بھی بھاگ کھڑے ہوئے، اب گھمسان کی لڑائی اور دست وبازو کا معرکہ شروع ہوا، سارا دن جنگ کے عالم میں گذرا، ساری رات اسی حالت جنگ میں گذر گئی، دوسرے روز دوپہر ڈھل جانے کے بعد ایرانیوں کا مایۂ ناز سپہ سالار رستم ہلاک ہو گیا اب ایرانی فوج میدان جنگ میں نہ ٹھہر سکی، بھاگ کھڑی ہوئی، اور اس طرح ایران کی صدہا برس کی عظمت خاک میں مل گئی، قادسیہ کی جنگ نے ایران کی قسمت پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا دی، تین ہزار سے زیادہ ایرانی کھیت رہے ۔

مدائن کا معرکہ لیکن نہیں! ——— ابھی ایک آخری معرکہ، اور ناقابل فراموش مرحلہ اور باقی تھا، وہ تھا مدائن، نوشیرواں اور یزدگرد کے پایہ تخت اور مجوسیوں کی عظمت و جلال کے مرکز کا سقوط!

چند چھوٹی چھوٹی جنگوں کو سر کرنے کے بعد مسلمانوں کا لشکر، مدائن کے سامنے پہنچ گیا: ایرانیوں نے مسلمانوں کے اقدام کو روکنے کے لئے چال یہ چلی کہ دریائے دجلہ کے پل کو توڑ دیا، کشتیاں ہٹا دیں، لیکن یہ روک مسلمانوں کے

لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی، ان کا سیل زمین گیر، ان رکاوٹوں کو کب خاطر میں لاتا تھا، یہ منظر دیکھ کر سپہ سالار لشکر اسلام سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا،

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!

سالار لشکر کا یہ اقدام دیکھ کر ساری فوج دریا میں اتر گئی، یہ لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے، ہنستے مسکراتے ہوئے پار پہنچ گئے۔ ایرانیوں کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایسے جیالے، اور دلاور لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ جو یوں دریائے ذخار کو پار کرلیں، ان پر مسلمانوں کی دہشت بیٹھ گئی، وہ انہیں مافوق الانسان سمجھنے لگے مسلمانوں کو کنارے پر اترتا دیکھ کر دفعتہً ان کے منہ سے نکلا۔

"دیواں آمدند، دیواں آمدند"! اور بھاگ کھڑے ہوئے، یزدگرد کو یہ خبر ملی تو وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا اب مدائن مسلمانوں کا انتظار کر رہا تھا، چنانچہ صفر ۱۶ھ میں سعد بن ابی وقاص اپنا لشکر لے کر مدائن میں داخل ہوگئے، جمعہ کا مبارک دن تھا، کسریٰ کے ایوانِ شاہی میں اس کے تخت جلال و کبریائی کی جگہ خدا کے بندے خضوع و خشوع کے ساتھ سجدے میں جھک گئے،

کروڑوں روپے کا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اور ایرانی عظمت و جلال کی داستان ہمیشہ کے لئے ایک افسانۂ پارینہ بن گئی، ؎ پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت

بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

یہ شاعری نہیں حقیقت ہے۔ ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقت!

جنگ سے پہلے اتمام حجت کے لئے مسلمانوں نے یزدگرد اور رستم سے ملاقات کرکے قبول اسلام کی دعوت دی تھی، تو یزدگرد نے کہا تھا ——— "اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو تم میں سے کوئی زندہ یہاں سے واپس نہ جاتا۔"

اور رستم نے جواب دیا تھا ——— "آفتاب و ماہتاب کی قسم تم سب کو خاک میں ملا دوں گا!"

لیکن وہ یزدگرد کہاں ہے؟

وہ رستم کیا ہوا؟

اور وہ پیوند لگے کپڑے پہننے والے عرب کہاں سے کہاں پہنچ گئے؟

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے!

چند اور معرکے اب مسلمانوں کا لشکر تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا، اور تھوڑی مدت میں ایرانیوں کے دوسرے مراکز جلولا، حلوان، تکریت اور پھر ۱۷ھ میں رقہ، حران، نصیبین، سماطہ وغیرہ مقامات فتح کر کے جزیرہ کا پورا علاقہ فتح کر لیا، کچھ ہی عرصہ کے بعد خوزستان کے پورے علاقہ پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا، شوستر کے مقام پر ہرمزان نے مقابلہ کیا، بعد میں وہ مسلمان ہو گیا، اور حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے کام لیا،

نہاوند یزدگرد ابھی زندہ تھا، اور اپنی فتنہ سامانیوں سے باز نہ آتا تھا، اس نے پھر ایرانیوں کی ایرانی عصبیت سے اپیل کی، ڈیڑھ لاکھ لشکر جمع ہو گیا، مردان شاہ سپہ سالار بنا اور نہاوند میدان جنگ قرار پایا، یہاں پھر بڑی خونریز جنگ ہوئی، تیس ہزار سے زیادہ ایرانی قادسیہ کی طرح یہاں بھی ہلاک ہوئے، ہزاروں مسلمان بھی شہید ہوئے، لڑائی سے پہلے مردان شاہ نے حضرت مغیرہؓ اسلامی سفیر سے سراپا پندار و نخوت بن کر کہا تھا ——— "دنیا میں سب سے زیادہ ناپاک اور نجس قوم جو ہو سکتی ہے وہ تم عرب ہو، تم اتنے ذلیل ہو کہ ہم اپنے تیر بھی تمہارے ناپاک خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے ———!"

اور مغیرہؓ نے جواب دیا تھا ——— "ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک تمہارے اس ملک کو نہ فتح کر لیں، یا قتل نہ ہو جائیں!"

فتح ایران ۲۱ھ میں عبداللہ بن عبداللہ نے اصفہان فتح کر لیا، ۲۲ھ میں ہمدان، قزوین اور زنجان کے علاقے فتح ہو گئے، پھر نعیم بن مقرن نے رے پر قبضہ کر لیا، اور ان کے بھائی سوید نے قومس کو فتح کر لیا، ۲۳ھ میں طبرستان کے سارے علاقہ نے سر اطاعت خم کر دیا، یہی حشر آرمینیہ اور آذربائیجان کا ہوا۔

خراسان اسی سنہ (۲۲ھ) میں احنفؓ، یزدگرد کے مرکز مرو کی طرف بڑھے، ہرات فتح کیا، بلخ پر قبضہ کیا، نیشاپور کو زیر نگیں کیا، گویا سارا خراسان قبضہ میں آ گیا، یزدگرد خاقان چین کے ہاں بھاگ گیا، ایرانیوں نے احنف سے صلح کر لی، اور امن و عافیت راحت و آسائش کی زندگی بسر

کرنے لگے،

۲۳ھ میں فارس کی طرف مسلمانوں کا لشکر بڑھا، اور بہت جلد توج، اصطخر، شیراز اور فارس کے دوسرے اہم مقامات سرنگوں ہو گئے، اسی سنہ میں کرمان فتح ہوا، اور سیستان نے اطاعت قبول کر لی،

فتح دمشق اجنادین سے فارغ ہو کر خالد نے ابوعبیدہؓ کی شرکت میں دمشق کا محاصرہ کیا، کئی ماہ تک محاصرہ جاری رہا، اسی اثناء میں ابوبکرؓ وفات پا گئے، ایک روز خالد کمند کے ذریعہ چند فدا کاروں کو ساتھ لے کر فصیل کی دیوار پر چڑھے، پھر شہر کے اندر پہنچ گئے، محافظوں کو قتل کیا، پھاٹک کھول دیے، مسلمان سپاہی فوراً اندر داخل ہو گئے، دمشق کے عیسائیوں کو اس یک بیک حملہ نے حواس باختہ کر دیا، وہ دوسری طرف سے دوڑے دوڑے ابوعبیدہؓ کے پاس گئے، اور صلح کی التماس کی، وہ خالد کی ترک تازیوں سے بے خبر تھے، صلح منظور فرمالی، اب صورت حال یہ تھی کہ ایک سمت سے خالد فاتحانہ اپنے لشکر سمیت داخل ہوئے، دوسری طرف سے ابوعبیدہؓ مصالحانہ، اس طرح ۱۴ھ میں دمشق پورے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا پھر اسی سنہ میں اردن کا پورا صوبہ ایک زبردست جنگ کے بعد فتح ہو گیا، یہاں بھی عیسائیوں کو شکست کے سوا کچھ نہ ملا، پھر اور آگے بڑھ کر حمص اور بعلبک وغیرہ بھی سرنگون ہو گئے، یہاں بھی اسلام کا پھریرا لہرانے لگا، اسی سال ابوعبیدہ کے ہاتھوں، عیسائیوں کا ایک اور بہت بڑا مرکز لاذقیہ بھی فتح ہو گیا

جنگ یرموک مسلمانوں کی فاتحانہ یلغار، اور رومیوں کی پسپائی اور حسرت نصیبی دیکھ کر ہرقل قیصر روم نے اپنے پایۂ تخت انطاکیہ میں بیٹھ کر پوری قوت وطاقت کے ساتھ ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کر لیا، اس نے مذہب کے نام پر منتشر اور پراگندہ عیسائیوں کو مجتمع کیا اور دو لاکھ سے زیادہ لشکر فراہم کر لیا، مسلمانوں کا لشکر ۳۰، ۳۵ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ مسلمان بھی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ وقت کی دو بڑی مہذب، متمدن لیکن خدا فراموش قوموں — ایرانیوں اور رومیوں یعنی عیسائیوں اور مجوسیوں — سے فیصلہ کن جنگ کر کے رہیں گے وہ بھی تیار ہو گئے، یرموک کا میدان کارزار قرار پایا، یہ رجب ۱۵ھ کا واقعہ ہے۔

عیسائیوں نے اس جنگ کو ہر قیمت پر جیتنے کا عزم کر لیا، وہ بطریق اور راہب جو ترک دنیا کر

چکے تھے، تلواریں اور نیزے لے لے کر مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے کئی ہزار رومیوں نے اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہن لی تھیں کہ بھاگنا چاہیں تو بھی نہ بھاگ سکیں، اس جنگ میں عرب کے چیدہ چیدہ بہادر اور سردار شریک تھے، ایسے معرکہ کی جنگ اس سرزمین پر کبھی نہیں ہوئی تھی،

یہ ایسی لڑائی تھی کہ زمین دہل اٹھی، اور آسمان کانپنے لگا، رومیوں کے تقریباً ایک لاکھ آدمی مارے گئے، تین ہزار کے قریب مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا،

اس جنگ نے رومیوں کی کمر توڑ دی، ہرقل نے انطاکیہ میں یہ خبر سنی تو شام کو الوداع کہا، اور باصد حسرت وناکامی قسطنطنیہ چلا گیا،

فتح بیت المقدس

سنہ ۱۶ھ میں عمروؓ بن العاص نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا، عیسائیوں نے صلح کی درخواست کی، اور التماس کی کہ عمرؓ خود آکر معاہدۂ صلح لکھیں، رجب سنہ ۱۶ھ میں حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر، وہ بیت المقدس روانہ ہوئے جابیہ کے مقام پر عہد نامہ امن وصلح لکھا گیا، اس سے فارغ ہو کر وہ بیت المقدس پہنچے، وہی سادہ لباس جس میں پیوند لگے ہوئے تھے لیکن عظمت وجلال کا یہ عالم کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں خم تھیں!

شمالی افریقہ اور قبرص

سنہ ۲۷ھ میں ابن ابی سرح والی مصر نے عثمانؓ کی اجازت سے شمالی افریقہ پر حملہ کیا، طرابلس الغرب کے حدود میں وہاں کا فرماں روا جرجیر سوا لاکھ فوج کے ساتھ مقابل ہوا، کافی عرصہ تک جنگ جاری رہی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، پھر عثمانؓ نے عبداللہ بن زبیر کی سرکردگی میں ایک اور فوج بھیجی انہوں نے ایسا دباؤ ڈالا کہ طرابلس الغرب فتح ہو گیا، پھر تیونس، مراکش، الجزائر اور دوسرے ملحقہ علاقے بھی زیر نگیں ہو گئے، اسی سال امیر معاویہ نے جو اب عہد عثمانی میں پورے شام کے والی بن چکے تھے، (سنہ ۳۲ھ میں) قبرص پر مکمل قبضہ کر لیا،

عجم سے کابل تک

سنہ ۲۹ھ میں سارے عجم میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، عبداللہؓ بن عامر نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا، فارس پر دوبارہ قبضہ کر لیا، طبرستان کی بغاوت سعیدؓ بن العاص نے فرو کی، پھر سارا طبرستان فتح کر لیا، یہ سنہ ۳۰ھ کا واقعہ ہے، عبداللہ بن عامر نے

اسی سال خراسان کی بغاوت کو دبایا، نیشاپور پر قبضہ کرلیا، یزدگرد پھر ادھر آگیا تھا، وہ مارا گیا، ابن عامر کے حسب ہدایت عبدالرحمٰن بن سمرہ نے سجستان کو جیتا، پھر کابل کی طرف بڑھے، دوآر کے باشندوں کو سرنگوں کیا، پہاڑ پر ٹھوس سونے کا ایک بت تھا، اس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں، عبدالرحمٰن نے اس کے ہاتھ کاٹ کر آنکھیں نکال لیں، پھر وہاں کے مرزبان کو واپس کردیا، اور کہا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ بت نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ پھر ابن عامر کے حسب الحکم عبدالرحمٰن نے غزنہ سے لے کر کابل تک کا علاقہ فتح کرلیا،

مصر و اسکندریہ کی فتح

سنہ ۲۰ھ میں عمرو بن العاص نے فسطاط کا محاصرہ کرلیا، فرمانروائے مصر مقوقس (قبطی) تھا، سات مہینے تک محاصرہ جاری رہا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، آخر زبیر کی حسن تدبیر اور فراست سے یہ قلعہ فتح ہوگیا، مقوقس نے صلح کی درخواست کی جو منظور کرلی گئی، اور بغیر کشت خون کے مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا،

اس صلح سے ہرقل بہت برہم ہوا اور سنہ ۲۱ھ میں رومیوں کا ایک لشکر گراں اسکندریہ روانہ کردیا۔ لیکن مقوقس نے ہرقل کا ساتھ نہیں دیا۔ بالآخر یہاں بھی رومیوں کو ذلت بخش شکست ہوئی، اور اسکندریہ فتح ہوگیا، عیسائیوں کو اجازت دی گئی کہ خواہ اسلام قبول کریں یا اپنے مذہب پر قائم رہ کر جزیہ دیں۔ بہت سے مسلمان ہوگئے، بہت سے اپنے مذہب پر قائم رہے ؎

شجاعت اور جانبازی

۱۳ھ میں حضرت عمرؓ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے، ان کے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی ایران کی طرف سے شورش اور بغاوت کے مظاہرے شروع ہو گئے، مشہور ایرانی سپہ سالار رستم نے مہران شاہ کو تازہ دم فوج کے ساتھ درفش کاویانی کے سایہ میں روانہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے لڑے، اور ان کا استیصال کر دے، مہران شاہ نے دریائے فرات کے ساحل پر اپنی فوجیں آتار دیں، دریا کے دوسری جانب مسلمانوں کا لشکر تھا، مہران شاہ کی ہمت نہ پڑی کہ دریا پار کر کے مسلمانوں سے بھڑ جاتے لیکن سالار جیش اسلام ابو عبید ثقفی جوش شہادت سے مخمور تھے انہوں نے رفقاء شرکا کی رائے بھی نہ سنی، اور اپنے لشکر سمیت فرات پار کر کے دشمن کے سامنے پہنچ گئے، لڑائی چھڑ گئی، ایرانی فوج میں ہاتھیوں کی بھی ایک قطار تھی، ان ہاتھیوں سے عرب کے گھوڑے پہلی بار آشنا ہوتے تھے، وہ بھڑکے مسلمانوں نے گھوڑوں کو چھوڑا اور پیادہ پا میدان مصاف میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے لگے انہوں نے تلواروں سے ہودوں کی رسیاں کاٹ دیں، اور ہاتھی سوار دھڑا دھڑ گرنے لگے، ابو عبید ثقفیؓ نے بڑھ کر ایک ہاتھی پر تلوار کا وار کیا، لیکن خالی گیا، ہاتھی نے انہیں سونڈ میں لپیٹا اور کچل دیا، وہ شہید ہو گئے　　——　　شہادت ہے مطلوب مقصود مومن!

اور اس طرح شہید ہو کر انہوں نے آنے والی فوجوں اور مجاہدوں کے سامنے، شجاعت اور جانبازی کی ایک نہ بھولنے والی تاریخ پیش کر دی۔

نعمان بن مقرن

نہاوند کی لڑائی، زور شور سے جاری تھی، ایرانی بڑے ثبات و استقلال سے لڑ رہے تھے، یہ ان کی زندگی اور موت کی جنگ تھی، مسلمانوں کی فداکاری اور جانثاری بھی اپنے شباب پر تھی، اسی جنگ کے دوران میں سالار لشکر اسلام نعمان بن مقرن نے بڑی بہادری سے جان دی

حضرت قباث

اسی جنگ میں　——　قباث کے ہاتھ سے تلواریں اور نیزے ٹوٹ کر گرتے جاتے تھے، مگر ان کے تیور بل نہ آتا تھا، نیزہ ٹوٹ کر گرتا دیکھتے

کوئی ہے جو اس شخص کو ہتھیار دے جس نے خدا سے اقرار کیا ہے کہ میدانِ جنگ سے مڑ کر ہٹے گا؟ لوگ فوراً تلوار یا نیزہ ان کے ہاتھ میں لا کر دے دیتے، اور پھر وہ شیر کی طرح جھپٹ کر دشمن پر جا پڑتے،

حباش بن قیس

"حباش بن قیس جو ایک بہادر سپاہی تھے، بڑی جانبازی سے لڑ رہے تھے اسی اثنا میں کسی نے اُن کے پاؤں پر تلوار ماری، ایک پاؤں کٹ کر الگ ہو گیا حباش کو خبر تک نہ ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو ڈھونڈھتے پھرتے تھے کہ میرے پاؤں کو کیا ہوا؟ اُن کے قبیلہ کے لوگ ہمیشہ اس واقعہ پر فخر کرتے تھے۔

زبیر بن العوام

محاصرے کو سات مہینے کی طویل مدت گزر گئی، مگر فسطاط کا قلعہ فتح نہیں ہوا عمرو بن العاص عاجز آ گئے۔ تنگ آ کر کہا، آج میں مسلمانوں پر فدا ہوتا ہوں، یہ کہہ کر ننگی تلوار ہاتھ میں لی، اور سیڑھی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے، چند اور صحابہ نے ساتھ دیا، سب نے ایک ساتھ تکبیر کے نعرے بلند کئے، ساتھ تمام فوج نے نعرہ مارا کہ قلعہ کی زمین ہل گئی، عیسائی یہ سمجھ کر کہ مسلمان قلعہ کے اندر گھس آئے، بدحواس ہو کر بھاگے، ادھر زبیر نے فصیل سے اتر کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا، تمام فوج اندر گھس گئی، مقوقس نے یہ دیکھ کر صلح کی درخواست کی، اور اسی وقت سب کو امان دے دی گئی۔!

عکرمہ بن ابو جہل

جنگ یرموک میں — عکرمہ نے جو ابو جہل کے فرزند تھے فوج کی طرف دیکھا اور کہا، "مرنے پر کون بیعت کرتا ہے"؟ چار سو شخصوں نے بیعت کی، (ان سب نے) اس ثابت قدمی سے لڑائی لڑی کہ قریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔

ذمّی

ذمی، ایک ایسی اصطلاح ہے جس سے غیر مسلم چڑتے ہیں، اسلام کے خلاف جو وہ فردِ جرم عائد کرتے ہیں اس میں ایک مد یہ بھی ہے کہ اسلام غیر مسلموں کو ذمی بنا لیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے ذمی کیا ہے؟

ذمی کی تعریف

ذمی یا اہل ذمہ وہ غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کا مذہب قبول نہیں کرتا، لیکن اُن کی حفاظت میں آجاتا ہے، وہ مسلم حکومت میں رہتا ہے، اس کی جان و مال کی حفاظت کی جاتی ہے، اس سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی، اور اگر وہ فوجی خدمت کرے، تو جزیہ ساقط ہو جاتا ہے، اسے اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی ہوتی ہے،

اسلام نے ذمیوں کو کیا حقوق دیئے ہیں؟ اور ان حقوق پر عہدِ خلافت راشدہ میں کس طرح عمل ہوا ہے ہم مختصر طور پر ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

صلحنامۂ حیرہ

حضرت خالد نے اہل حیرہ سے محاصرہ کے بعد ان کی درخواست پر صلح کر لی، اور جو صلحنامہ لکھا وہ یہ تھا، ——— "اہل حیرہ ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ ادا کریں گے، ہم (مسلمان) اس کے معاوضہ میں ان کی حفاظت کریں گے، اگر ان کی حفاظت نہ کر سکیں، تو یہ رقم ان پر واجب نہ رہے گی، اور اگر وہ بدعہدی کریں، تو ہم بری الذمہ ہیں ———"[1]

فرمانِ صدیقی

حضرت ابوبکر نے از روئے معاہدہ حیرہ کے عیسائیوں کو جو حقوق مرحمت فرمائے وہ یہ تھے ——— "ان کی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہ کئے جائیں، نہ ان کا کوئی ایسا قصر گرایا جائے جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہوں ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی، نہ تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے ———"[2]

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ طبری [2] تاریخ اسلام بحوالہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف

حمص کے عیسائی

۱۵ھ میں جنگ یرموک کی تیاریوں کے وقت جنگی مصالح کے ماتحت سالار عسکر اسلام ابو عبیدہؓ نے فیصلہ کیا کہ اپنے مفتوحہ مقام "حمص" کو چھوڑ کر دمشق کو مرکز بنائیں ـــــ جب یہ فیصلہ ہو چکا تو ابو عبیدہؓ نے حبیب بن مسلمہ کو جو افسر خزانہ تھے بلا کر کہا، اس وقت ہم عیسائیوں کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ اس لئے جو کچھ ان سے وصول ہوا ہے، سب واپس کر دو چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی واپس کر دی گئی عیسائیوں پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے خدا تم کو واپس لائے، یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا، انہوں نے کہا توراۃ کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا ـــــ![1]

کیا آج بھی فاتح حکومتیں مفتوح ملکوں اور ملتوں کے ساتھ یہی برتاؤ کرتی ہیں؟

غور سے سنو ـــــ جاپان کے ناگاساکا اور ہیروشیما کیا جواب دیتے ہیں؟ جرمنی کیا کہتا ہے؟ کوریا سے کیا صدا آ رہی ہے یا ـــــ یا ـــــ جاپان کے دو لاکھ سے زیادہ بن باپ کے بچے کیا فریاد کر رہے ہیں؟ جرمنی کی عصمت دریدہ دوشیزائیں کیوں رو رہی ہیں؟ کوریا کے خرابے اور کھنڈر کیا پکار رہے ہیں؟

پھر بھی ہم غیر مہذب تھے، اور وہ مہذب ہیں۔

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں!

عمرؓ کا عہد نامہ

فتح بیت المقدس کے بعد حضرت عمرؓ نے جو عہد نامہ صلح لکھ کر مفتوح قوم کے حوالہ کیا اس کا خلاصہ یہ:-

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان و مال گرجا، صلیب، تندرست، بیمار، اور ان کے تمام مذہب والوں کے لئے ہے کہ نہ ان کے گرجاؤں میں سکونت کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کو یا ان کے احاطے کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، نہ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان و مال لے کر نکل جانا چاہے تو وہ بھی مامون ہے تا آنکہ وہ اپنی جائے پناہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس تحریر پر خدا، رسول، خلفا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے، اس پر خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عبدالرحمٰن

[1] الفاروق بحوالہ کتاب الخراج

بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان گواہ ہیں! ـــــــــ [1]

خدا سے ڈرو حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے جزیہ نہیں ادا کیا ہے، دریافت فرمایا کیوں ادا نہیں کیا ہے؟ جواب ملا عسرت اور ناداری کے باعث، فرمایا، انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو لوگ دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں، خدا انہیں قیامت میں عذاب دے گا۔

معاہدہ حیرہ امام ابو یوسفؒ نے، اپنی مشہور زمانہ کتاب میں لکھا ہے، کہ معاہدہ حیرہ میں (جو حضرت ابو بکرؓ نے کیا تھا) یہ تصریح ہے کہ ـــ "اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے کے قابل نہ رہے، یا کسی مصیبت میں گھر جائے، یا غریب اور نادار ہو جائے اور اس کے مذہب والے اسے خیرات دینے لگیں، تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا، اور اس کی آل اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے مصارف حیات دیئے جائیں گے![2]"

غدار وطن ذمی "شام جب فتح ہوا، تو عرواکس بھی فتح ہوا جس کی سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی، صلح کے باوجود یہاں کے لوگ غداری سے باز نہ آتے تھے، رومیوں سے درپردہ ساز باز رکھتے تھے، جاسوسی کرتے رہتے تھے، وہاں کے حاکم عمیر بن سعد کو عمرؓ نے لکھا ـــــ "جس قدر ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب ہے، سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو، اور ان سے کہہ دو کہ یہاں سے چلے جائیں، اور اگر یہ (ذمی) اس پر بھی راضی نہ ہوں تو ایک برس کی مہلت دو، پھر جلا وطن کر دو![3]"

مجمع عام میں عمرو بن العاص (فاتح مصر) کے فرزند ارجمند نے جب ایک قبطی عیسائی کو بے وجہ مارا تو حضرت عمرؓ نے اس قبطی کے ہاتھ سے مجمع عام میں سزا دلائی، اور عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر کہا

---

[1] طبری [2] کتاب الخراج [3] فتوح البلدان (الفاروق)

مذکم تعبدتم الناس — تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا ہے ؛ حالانکہ
وقد ولدتهم امهم — ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا ! [1]
احرارًا

ذمیوں کے حقوق حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ قرظہ بن کعب انصاری کو لکھا تمہارے علاقہ کے ذمیوں نے درخواست دی ہے کہ ان کی ایک نہر پٹ کر مٹ گئی ہے جس کا بنانا مسلمانوں کا فرض ہے، مجھے ان کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ملک سے نکل جائیں یا عاجز و درماندہ ہو جائیں، یا ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں،

---

[1] کنز العمال (الفاروق) ،

غلامی

"یونان کے فلاسفہ نے نوعِ انسان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، پیدائشی آزاد، اور پیدائشی غلام ارسطو نے غلامی کا رواج سوسائٹی کے لئے ضروری قرار دیا تھا، دوسری قوموں کی طرح عربوں میں بھی غلامی کا رواج تھا، اسلام نے غلاموں کی حیثیت صرف جنگی قیدیوں کی قرار دی، اور ان سے منصفانہ برتاؤ کرنے کی ہدایت کی، قرآن کی بہت سی آیات اس دعوے کی دلیل ہیں، شریعتِ اسلامی میں کسی مسلمان کو کبھی حالت میں بھی غلام بنانا جائز نہیں[1] صرف جہاد کے اسیرانِ جنگ غلام بنائے جا سکتے ہیں، البشرطیکہ غیر مسلموں نے مسلمانوں پر حملہ کر لے ہوں پیش قدمی کی ہو، لیکن جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں انہیں امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد کے نزدیک غلام بنانا بالکل ناجائز ہے ——— [2]"

غلامی عارضی ہے

"اسلام نے غلامی کو ایک عارضی چیز قرار دیا، اور غلاموں کے لئے حصولِ آزادی کا بہت وسیع عمل پیدا کر دیا ——" اگر تمہارے لونڈی غلام تم سے مکاتبت کی درخواست کریں تو تم انہیں مکاتب بنا دو ——— آیت ۳۳ سورۃ توبہ ——— فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ مکاتبت مستحب ہے، امام احمد بن حنبل کے نزدیک واجب ہے مصرفِ زکوٰۃ میں مکاتب غلام کی مالی امداد کرنا بھی داخل ہے اور صدقات کے مال سے غلام خرید کر آزاد کئے جا سکتے ہیں۔

ارشادِ مرتضوی

"حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے، مجھے ایسے شخص کو غلام کہتے ہوئے شرم آتی ہے جو کہتا ہے، میرا پروردگار ایک ہے، ایک دفعہ آپ نے اپنے غلام کو کچھ دام دیئے اور فرمایا، دو مختلف قیمتوں کے کپڑے خرید لاؤ، جب وہ خرید لایا، تو آپ نے قیمتی کپڑا اسے دے دیا، اور معمولی اپنے لئے رکھ لیا، اور فرمایا، تم جوان ہو تمہیں زیب و زینت کی خواہش ہونی چاہیئے

---

[1] آیت ۴ سورۃ حجرات [2] النظم الاسلامیہ

میرا کیا میں اب عمر رسیدہ ہوں ۔۔۔۔ [1]"

ایثار صدیقی حضرت ابوبکرؓ نے بہت سے غلاموں کو خریدا اور راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔ حضرت بلال حبشی انہی کے آزاد کردہ غلام تھے۔

حضرت عمرؓ کا حکم صحیح بخاری کتاب المکاتب میں ہے کہ حضرت انسؓ کے غلام شیرین نے مکاتبت کی درخواست کی، انس نے انکار کیا، شیرین حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا، آپ نے انسؓ کو مجبور کیا کہ وہ مکاتبت تسلیم کر لیں، تاکہ وہ اپنی حسبِ خواہش آزاد ہو سکے،

غلام کا حصّہ حضرت عمرؓ نے بدر وغیرہ کے مجاہدین کی جب تنخواہیں مقرر کیں تو ان کے غلاموں کی بھی انہی کے برابر تنخواہ مقرر کی، اضلاع کے جو عمال تھے، ان کی نسبت ہمیشہ یہ بھی دریافت کرتے رہتے تھے غلاموں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے؟ اگر یہ معلوم ہوتا وہ غلاموں کی عیادت کو نہیں جاتا تو صرف اسی جرم پر معزول وموقوف کر دیتے تھے۔ اکثر غلاموں کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے، اور حاضرین کو سنا کر کہتے تھے، خدا ان لوگوں پر لعنت کرے، جن کو غلاموں کے ساتھ کھانا سے انکار ہے۔ سرداران فوج کو کہلا بھیجا تمہارا کوئی غلام کسی کو امان دے تو وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے سمجھی جائے،

---

[1] الفاروق

بیت المال

مسلمانوں کا بیت المال کیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی؟ خلافت راشدہ کے دور میں اس کی کیا کیفیت رہی؛ یہ داستان بھی سننے کے لائق ہے،

بیت المال کا محافظ

"آخر عہد میں حضرت ابوبکرؓ نے بیت المال کے لئے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی، لیکن اس میں کوئی رقم جمع کرنے کی نوبت نہ آئی، ایک مرتبہ کسی نے کہا آپ بیت المال کی حفاظت کے لئے کوئی محافظ کیوں نہیں رکھتے؛ جواب دیا اس کی حفاظت کے لئے ایک قفل کافی ہے ——— !"

اس لئے کہ نہ عوام سے جڑے ہوئے روپیہ کی افراط تھی، نہ عوام کی نیت خراب تھی!

بیت المال کا جائزہ

——— "اکثر ایسا ہوتا کہ روپیہ تقسیم کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ بیت المال میں جھاڑو پھروا دیتے، وفات کے بعد جب بیت المال کا جائزہ لیا گیا تو اس میں صرف ایک درہم نکلا ——— !"

بیت المال کا اونٹ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا عمرؓ بہ نفس نفیس اس کی تلاش میں نکلے، کسی شخص نے کہا "آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں کسی کو حکم دیجئے تلاش کرلائے گا" جواب دیا "ای عبد اعبد منی" یعنی مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہوسکتا ہے؟"

آج اشتراکیت اور عوامیت کے اس دور میں بھی حکومت کے سربراہ ——— کو عوام کی امانت کا اتنا پاس و لحاظ ہے؟

حضرت علیؓ اور بیت المال

حضرت علیؓ بیت المال کے مصارف پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے، اپنی ذات پر بھی کچھ نہیں خرچ کرتے تھے، ایک بار عمرو بن سلم

اصفہان کا خراج لائے۔ اس میں شہد بھی تھا، اور چربی بھی آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم کو شہد کی ضرورت تھی، عمرو بن سلم نے کچھ شہد اور چربی بھیج دی حضرت علیؓ نے فوراً شہد اور چربی واپس منگا کر بیت المال میں داخل کر دی، جو حصّہ خرچ ہو چکا تھا اس کی قیمت ادا فرما دی۔

حضرت علیؓ کی ڈانٹ

ابو رافع ؓ عہد علوی میں بیت المال کے نگران تھے، ایک مرتبہ انہیں ٹوکا، اور فرمایا ——— "تمہارا یہ حال ہے کہ اپنی لڑکی کو (بیت المال کے) موتیوں سے آراستہ کرتے ہو، جب فاطمہ کے ساتھ میری شادی ہوئی، تو میرے پاس مینڈھے کی صرف ایک کھال تھی جس پر رات کو سوتا تھا، اور دن کو اسی پر مویشی کو چارہ دیتا تھا، ایک خادم تک میرے پاس نہ تھا!"

حضرت علیؓ کا عمل

جاڑے کا موسم تھا، اور حضرت علیؓ ایک پرانی چادر اوڑھے کانپ رہے تھے، ایک شخص نے عرض کیا، امیر المؤمنین بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا بھی حق ہے، فرمایا، تمہارے حصّہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، یہ چادر میں مدینہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

بغاوت

۔۔۔۔حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جب وہ منصب خلافت پر فائز ہوئے "بوران دخت" نے خراسان کے مشہور مدبر اور مانے ہوئے بہادر رستم کو ایرانی افواج کا سپہ سالار بنایا، اس نے ایرانیوں کے مذہبی جذبات بھڑکا دیئے، سارے ایران میں مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دی، پوری ایرانی قوم مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے یکسر جوش وانتقام بن گئی، اور چند ہی روز میں عراق کے تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت کی چنگاریاں پھیل گئیں، بوران دخت نے ایران کے دو مشہور بہادروں، نرسی اور جابان کو رستم کی امداد واعانت پر مقرر کیا، یہ دونوں اپنی فوجیں لے کر دو مختلف راستوں سے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے چل پڑے دوسری طرف سے ابو عُبیدہ ثقفیؓ آ رہے تھے، خارق کے مقام پر ان کی اور جابان کی مڈبھیڑ ہو گئی، ابو عبیدؓ نے جابان کے لشکر کو ذلت بخش شکست دی گئی، چند افسر ہلاک ہوئے، اور خود جابان زندہ سلامت گرفتار ہو گیا، لیکن جابان کو مسلمانوں کے لشکر میں کوئی پہچانتا نہیں تھا، اس نے دھوکے سے کام لیا، اور رہائی حاصل کر لی، رہائی کے بعد بعض مسلمانوں نے اسے پہچان لیا، اور پھر سے گرفتار کر لیا، اور ابو عبیدؓ کی خدمت میں پیش کیا آپؓ نے سارا ماجرا سنکر فرمایا

"ہم بدعہدی نہیں کر سکتے، اسے ایک مسلمان (خواہ غلط فہمی سے سہی) رہا کر چکا ہے، لہٰذا یہ آزاد کر دیا جائے، یہ حکم سنتے ہی مسلمانوں کی گردنیں جھک گئیں، اور مملکت کا یہ بہت بڑا باغی آن کی آن میں رہا کر دیا گیا۔

بصیرت اور فراست

اس باب میں ہم چند ایسے واقعات کا ذکر کریں گے جن سے معلوم ہو گا کہ نازک ترین لمحات میں بھی خلفائے راشدین کی بصیرت اور فراست نے کس خوبی سے بڑے بڑے فتنوں اور طوفانوں کا قلع قمع کیا، کس کامیابی سے شورش اور بغاوت کا استیصال کیا، کس پامردی اور استقلال سے ناموافق اور ناسازگار حالات میں بھی وہی کیا، جو حق، صداقت اور دین کا تقاضا تھا!

فتنۂ ارتداد آں حضرتؐ کے وفات پاتے ہی بعض قبائل عرب مرتد ہو گئے بعض جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہو گئے، بعض لوگ اسلام پر تو قائم رہے، لیکن زکوٰۃ کے ادا کرنے سے انکار کرنے لگے۔

حضرت ابوبکرؓ کے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی یہ سب مسائل آپ کے سامنے حل طلب طور پر پیش ہوئے لیکن آپ ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے، مرتدین کا مقابلہ کیا، مدعیان نبوت کا قلع قمع کیا اور مانعین زکوٰۃ کو مجبور کیا کہ وہ بیت المال میں زکوٰۃ کی رقم داخل کریں اور عین اس زمانہ میں جب یہ فتنے اٹھ رہے تھے، اور شورشیں برپا ہو رہی تھیں، آپ نے خدا کی نصرت پر بھروسہ کر کے اسامہؓ بن زید کی سرکردگی میں وہ مہم بھی مدینہ سے باہر بھیج دی جسے رسول اللہؐ نے مامور فرمایا تھا، اور جب بدلے ہوئے حالات میں اجل صحابہ تک فوج کو مدینہ سے باہر بھیجنے کی رائے دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

یہ سارے کارنامے آپ کی بصیرت اور فراست پر دال ہیں، اگر آپ نے مہم نہ بھیجی ہوتی، یا مانعین زکوٰۃ کے سامنے سر خم کر دیا ہوتا، یا مرتدین سے چشم پوشی کی ہوتی، یا مدعیان نبوت کو مہلت دی ہوتی تو اسلام ایک تماشہ بن کر رہ جاتا!

ابن عمرؓ کا واقعہ عبیداللہ بن عمرؓ نے ابولؤلؤ قاتل عمرؓ کے ایک ساتھی کو شبہ کی بنا پر قتل کر دیا، مقدمہ حضرت عثمانؓ کے ہاں پیش ہوا، انہوں نے صحابہ سے رائے لی، حضرت علیؓ نے کہا، قصاص لیا جائے، بعض صحابہ نے کہا، کل عمرؓ قتل ہو چکے ہیں آج ان کے لڑکے کو قتل کرنا مناسب نہیں ہے، عمرو بن العاص نے کہا، آپ عبیداللہ کو معاف کر سکتے ہیں، امید ہے خدا آپ سے اس کا مواخذہ نہ کرے گا، اس اختلاف رائے پر آپ نے فرمایا، چونکہ مقتول کا کوئی وارث نہیں ہے اس لئے میں بحیثیت ولی کے قصاص کو دیت سے بدل دیتا ہوں اور اپنی جیب خاص سے دیت ادا کر دی۔[1]!

[1] تاریخ اسلام حصہ... بحوالہ ابن اثیر

پاسِ عہد — بہ حالتِ جنگ

جنگ انسان کا ذہنی توازن ختم کر دیتی ہے، عدل، انصاف، رواداری، انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، کوشش صرف ایک امر پر مرکوز رہتی ہے، کہ دشمن کو شکست دی جائے۔

آج سے ۱۴ سو برس پہلے کو چھوڑیئے، آج جب کہ دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے، کیا حال ہے، کیا اس تمدن اور حضارت کے عہد میں بھی بے گناہ شہریوں پر بم نہیں پھینکے جاتے؟ کیا دشمن قوم پر ازراہ دھندا ایٹم بم نہیں برسائے جاتے؟ کیا کھیتوں کو نہیں جلایا جاتا، کیا پانی میں زہر نہیں ملایا جاتا؟ کیا متعدی بیماریوں کے جراثیم کی "نشر و اشاعت" نہیں ہوتی؟ کیا آگ نہیں لگائی جاتی؟

یہ سب کچھ ہوتا ہے "امن" کے نام پر ہوتا ہے، "انسانیت" کی خاطر ہوتا ہے، لیکن آج سے ۱۴ سو برس پہلے ایک "امّی" نے اپنے دورِ حکومت میں کیا کیا؟ اس کے خلفائے راشدین نے کیا کیا؟ اس داستان کو دنیا نہ سنے یہ دوسری بات ہے لیکن اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا،

چند وصیتیں

سنہ ۱۳ھ میں جب حضرت ابو بکرؓ نے شام پر فوج کشی کے لئے چند سردار منتخب فرمائے تو ان سے کہا ——— "تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لئے وقف کر دیا ہے (عیسائیوں کے راہب مراد ہیں) ان کو چھوڑ دینا کسی عورت، بوڑھے اور بچہ کو نہ قتل کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، کھانے کے سوا بکری اور اونٹ کو بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مالِ غنیمت میں غبن نہ کرنا، بزدلی نہ دکھانا ———[1]"

حمص کے عیسائی

قیصر روم نے جب مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنا ٹڈی دل لشکر فراہم کیا، تو حمص کے مقام پر (۱۵ھ) سالار عسکر اسلام ابو عبیدہؓ نے مسلمان افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ——— "خدا نے تم کو بار بار جانچا، اور تم اس جانچ میں پورے اترے، اس کے صلہ میں خدا نے تم کو ہمیشہ مظفر و منصور رکھا، اب تمہارا دشمن اس سر و سامان سے تمہارے مقابلہ کے لئے

---

[1] تاریخ الخلفا

چلا ہے کہ زمین کانپ اٹھی ہے، اب بتاؤ کیا صلاح ہے؟ معاویہؓ کے بھائی، یزیدؓ بن ابی سفیان نے کہا میری رائے ہے کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں رہنے دیا جائے، اور ہم خود شہر کے باہر لشکر آرا ہوں، اس کے ساتھ ہی ساتھ خالدؓ اور عمروؓ بن العاصؓ کو خط لکھا جائے کہ وہ دمشق اور فلسطین سے چل کر مدد کو آئیں۔ شرجیلؓ بن حسنہؓ نے کہا، اس موقعہ پر ہر شخص کو آزادانہ رائے دینی چاہیئے، یزید کی رائے بے شبہ خیر خواہی پر مبنی ہے لیکن میں اس کا مخالف ہوں شہر والے عیسائی ہیں، ممکن ہے وہ تعصب سے ہمارے اہل و عیال کو پکڑ کر قیصر کے حوالے کر دیں، یا خود مار ڈالیں، ابوعبیدہؓ نے کہا اس کی تدبیر یہ ہے کہ ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں، شرجیلؓ نے اٹھ کر کہا، اے امیر تجھ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں، ہم نے ان عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں، ان سے نقض عہد کیونکر ہو سکتا ہے؟

ابوعبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ——— [1]!"

آج ہم اس برس کے بعد مہذب اور متمدن دنیا کے لڑنے والے اسلام کے ان امدیوں سے آگے نکل گئے ہیں یا پیچھے ہیں؟

سجستان کی شرط سنہ ۲۳ھ میں سجستان نے اطاعت قبول کر لی، اہل سیستان کی شرط یہ تھی کہ ان کی تمام اراضی محفوظ قرار دی جائے، اور مسلمان اس سے کوئی سروکار نہ رکھیں مسلمانوں نے یہ بات مان لی، اور ——— "اس شرط کا اتنا پاس و لحاظ رکھا، کہ کھیتوں کے پاس سے جلدی سے گذر جاتے تھے کہ چھو نہ جائیں ——— [2]!"

فاتحانہ ——— اور مصالحانہ سنہ ۱۴ھ میں دمشق فتح ہوا، یہ فتح بھی عجیب و غریب تھی، ایک طرف سے خالدؓ اپنے لشکر کو لے کر فاتح و منصور بن کر داخل ہوا، دوسری طرف ابوعبیدہؓ نے عیسائیوں کی درخواست منظور کر لی، اور مصالحانہ داخل ہوئے، چونکہ ابوعبیدہؓ صلح کر چکے تھے، لہٰذا، یہ تسخیر مصالحانہ قرار پائی، فاتحانہ نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق کے عیسائیوں سے نہ مال غنیمت لیا گیا، نہ کسی کو لونڈی یا غلام بنایا گیا [3] ——— ابوعبیدہؓ صلح کر چکے تھے،

---

[1] الفاروق بحوالہ فتوح البلدان [2] ابن اثیر [3] طبری

مسلمان کا پاس عہد، جنگ کی فتح مندیوں اور فیروز مندیوں پر بھی غالب آتا ہے، اور غالب آیا،

جارج کا اسلام

جنگ یرموک کے موقع پر رومیوں نے طلب سفارت کے لئے اپنا سفیر جارج نامی مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا، سفیر جب پہنچا تو مغرب کی نماز کی تیاریاں ہو رہی تھیں، نماز شروع ہوئی، مسلمانوں کی محویت اور استغراق دیکھ کر اسے سکتہ سا ہو گیا، نماز کے بعد اس نے ابو عبیدہؓ سے پوچھا، عیسیٰؑ کے بارے میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟ ابو عبیدہؓ نے چند آیتیں پڑھیں، جو حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور عبدیت سے متعلق تھیں وہ سنکر بے ساختہ کہہ اٹھا بلاشبہ تمہارا پیغمبر سچا ہے، پھر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا،

"جارج مسلمان ہو کر اپنی قوم (عیسائیوں) کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن ابو عبیدہؓ نے اس خیال سے کہ بدعہدی کا خیال نہ ہو اسے واپس جانے پر مجبور کیا ——— [1]"

---

[1] الفاروق

عدل و انصاف اور مساوات

"قاضیوں کا تقرر خلافت کی طرف سے کیا جاتا، حضرت عمرؓ نے، قاضیوں کے لئے ایک لائحہ عمل مقرر کیا تھا ——— ۱"

حضرت عمرؓ کا اصول

"مدعی، مدعا علیہ کو ایک نظر سے دیکھو، ان کی نشست میں کسی قسم کا امتیاز روا رکھا جائے، عدل و انصاف میں کسی کے ساتھ رعایت نہ کرو۔ جن جدید مسائل میں تردد پیدا ہو ان میں عقل و درایت سے کام لو، پچھلے نظائر اور امثال کی روشنی میں غور کرو، مدعی کو اتنی مہلت دو کہ وہ گواہ اور ثبوت آسانی سے پیش کرسکے، مسلمان ایک دوسرے کے لئے عادل گواہ کی حیثیت سے پیش ہو سکتے ہیں، بجز ان مسلمانوں کے جن پر شرعی حد جاری ہو چکی ہو، جن کی جھوٹی گواہی کا تجربہ ہو چکا ہو، یا ان کا فریق مخالف کے ساتھ ذاتی تعلق یا قرابت داری ہو ——— ۱"

عدالت اعلیٰ

"عدالت اعلیٰ میں ماتحت عدالت کے فیصلے اس وقت بھیج دیئے جاتے تھے جب وہ انہیں نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی، جب فریقین کو اس کے فیصلہ سے اطمینان نہ ہوتا تھا، تو وہ عدالتِ اعلیٰ میں اپیل کرسکتے تھے، خلافتِ راشدہ میں صرف علیؓ نے عدالت اعلیٰ کے فرائض انجام دیئے، آپ نے اس کے لئے کوئی دن یا وقت مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ شب و روز میں جس وقت بھی کوئی مظلوم داد خواہ ہوتا اسی وقت انصاف کر دیتے ——— ۲"

محتسب

"محتسب احکام شرعی کا تحفظ اور ان کی پابندی کراتا تھا، منڈیوں اور بازاروں کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا تھا، وہ وزنوں اور پیمانوں کی جانچ پڑتال بھی کرتا رہتا تھا، اور اس کام کے لئے ایک باقاعدہ دفتر بھی موجود تھا[۲]، جہاں تمام دوکانداروں اور خرید و فروخت کرنے والوں کو معین اوقات میں آنا پڑتا تھا،

---

۱ و ۲ النظم الاسلامیہ ۳ النظم الاسلامیہ بحوالہ احکام السلطانیہ

حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے احتساب کا نظام قائم کیا ۔۔۔۔۔ ! حضرت علیؓ اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی احتساب کی کارفرمائی جاری تھی، خلافتِ راشدہ کے بعد دوسرے ادوار میں اس شعبہ نے خاصی ترقی کی ۔۔۔۔۔

مساوات

مساوات کا شور ہم آج بھی سنتے ہیں، اور اس شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، لیکن اسلام نے مساوات کامل کا جو نظارہ دنیا کو دکھایا، اس کی مثال آج تک نہ مل سکی، عہد خلافتِ راشدہ میں مساوات کی جو مثالیں چند سال کی مختصر سی مدت میں نظر آگئیں، وہ جمہوریت اور عوامیت کے صدہا سال میں بھی نظر نہ آسکیں،

شاندار مثال

۔۔۔ عہد صدیقی میں زکوٰۃ، عشر، جزیہ، اور غنیمت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگیا تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے کوئی خزانہ نہیں قائم کیا، اسلامی ضروریات میں صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچتا، اس کو بلا تفریق آزاد و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ، مرد اور عورت، عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے، اس مساوات پر ایک شخص نے اعتراض کیا، تو فرمایا فضل و منقبت اور شے ہے، اس کو رزق کی کمی بیشی سے کوئی علاقہ نہیں ۔۔۔۔۔ [1]

حضرتِ عمرؓ پر مقدمہ

ایک مرتبہ ابی بن کعب نے عمرؓ کے خلاف زید بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا، عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوئے، حضرت زیدؓ نے تعظیم کی، عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق ابی کے ساتھ بیٹھ گئے، ابی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا، عمرؓ کو دعوے سے انکار تھا، ابی نے قاعدہ کے موافق عمرؓ سے قسم لینی چاہی، زید نے ابی سے کہا، امیر المؤمنین کو قسم سے معاف رکھو، عمرؓ اس ترمیم پر آزردہ ہوگئے، فرمایا، جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر برابر نہ ہوں اس وقت تک تم منصب قضا کے اہل نہیں ہوسکتے [2]

عمرؓ کا کوڑا

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ صحابئ رسول ابی بن کعب کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے، جب وہ اٹھے تو ازراہ تعظیم لوگ ساتھ ہوگئے، اسی موقع پر عمرؓ کا ادھر سے

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ طبقات ابن سعد [2] تاریخ اسلام بحوالہ کنز العمال

گذر ہوا، انہوں نے فوراً ابی کے ایک کوڑا لگایا، فرمایا ——— "تم نہیں جانتے اس طرح کی تعظیم متبوع کے لئے فتنہ اور تابع کے لئے ذلت ہے ———!"[1]

جبلہ بن ایہم غسانی

فرمانروائے وقت جبلہ بن ایہم مسلمان ہو گیا، طواف کعبہ کے وقت اس کی چادر کا گوشہ ایک بدو کے پاؤں کے نیچے آ گیا، جبلہ نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا، بدو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، جبلہ نے عمرؓ سے شکایت کی، فرمایا، تم نے جیسا کیا ویسا پایا، جبلہ نے کہا، ہم وہ ہیں کہ اگر ہم سے کوئی گستاخی کرے تو اس کی سزا قتل ہے، جواب دیا - ہاں عہد جاہلیت (کفر) میں ایسا ہی تھا، لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا ہے"!

غلام اور سردار

قریش کے کچھ سردار، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ملنے آئے، اتفاق سے صہیب، بلالؓ عمارؓ وغیرہ موجود تھے، جو آزاد شدہ غلام تھے، اور دنیاوی لحاظ سے معمولی درجہ کے لوگ سمجھے جاتے تھے، عمرؓ نے سب سے پہلے انہی لوگوں کو بلایا، سرداران قریش انتظار میں باہر بیٹھے رہے، ابوسفیانؓ کو یہ طرز عمل ناگوار گذرا تھا، خدا کی قدرت ہے، غلاموں کو باریابی کی اجازت ملتی ہے، ہم منتظر بیٹھے ہیں! ایک ساتھی نے کہا "ہم کو عمر کی نہیں اپنی شکایت کرنی چاہیئے، اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا، لیکن جو اپنی شامت سے پیچھے پہنچے، وہ آج بھی پیچھے رہنے کے مستحق ہیں ———!

علیؓ اور یہودی

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کھو گئی وہ ایک یہودی کو ملی، آپ نے اُسے دیکھ کر پہچان لیا، اور قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا، قاضی نے حضرت علی سے ثبوت مانگا، آپ ثبوت نہ دے سکے، قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا، وہ اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً مسلمان ہو گیا، اس نے کہا ——— "یہ انصاف تو نبیوں جیسا ہے، امیر المؤمنین مجھے اپنی عدالت کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ دے دیتا ہے ———!

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ مسند داری،

آزادئ تقریر

ایک دفعہ حضرت عمرؓ سے ایک آدمی نے برسرِ عام کہا "عمر کیا عاملوں (گورنروں) کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذاب الٰہی سے بچ جاؤ گے؟ تم کو یہ خبر ہے کہ مصر کا عامل عیاض بن غنم جو مصر کا عامل ہے، باریک کپڑے پہنتا ہے اور اس کے دروازے پر دربان مقرر ہے؟ عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا، اور حکم دیا عیاض کو جس حالت میں پاؤ ساتھ لے آؤ، محمدؓ نے وہاں پہنچکر دیکھا تو واقعی دروازے پر دربان تھا، اور وہ باریک کرتہ پہنے بیٹھے تھے، اسی ہیئت اور لباس میں انہیں لے کر مدینہ آئے حضرت عمرؓ نے وہ کرتہ اتروا کر بالوں کا ایک کرتہ پہنوایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا جنگل میں لے جا کر چراؤ، عیاض کو انکار کی مجال نہ تھی، مگر بار بار کہتے تھے، اس سے مرجانا بہتر ہے، عمرؓ نے کہا، تجھے اس سے عار کیوں ہے؟ تیرے باپ کا نام غنم اسی لئے پڑا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا، عیاض نے دل سے توبہ کی اور جب تک زندہ رہے، اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے؟[1]

عمرؓ کا سوال

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ منبر پر چڑھ کر کہا "صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک شخص وہیں کھڑا ہو گیا، اور تلوار میان سے کھینچ کر بولا، تمہارا سر اڑا دیں گے، عمرؓ نے اس کے آزمانے کو ڈانٹ کر کہا، کیا تو میری شان میں یہ لفظ کہتا ہے، اس نے کہا ہاں ہاں تمہاری شان میں، عمرؓ نے کہا، الحمد للہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ میں کج ہوں گا تو وہ سیدھا کر دیں گے؟[2]

حضرت عثمانؓ اور عمروؓ بن العاصؓ

۲۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے عمروؓ بن العاصؓ کو معزول کر کے عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرحؓ کو مصر کا گورنر بنا دیا عمروؓ بن العاصؓ سے مصر کا خراج زیادہ وصول نہیں ہوتا تھا، تقاضہ پر انہوں نے عثمانؓ سے کہا، "اونٹنی اس سے

---

[1] [2] الفاروق بحوالہ کتاب الخراج

زیادہ دودھ نہیں دے سکتی، ابن ابی سرح نے دوسرے سال بہت کافی توفیر دکھائی، عثمان رض نے عمرو بن العاص سے کہا۔ "دیکھو اونٹنی نے دودھ دیا!" عمرو رض نے جواب دیا، "ہاں لیکن بچے بھوکے رہ گئے!"

ابوموسیٰ رض سے سوال

ابوموسیٰ اشعری بصرہ کے والی تھے، ۲۹ھ میں کردوں نے بغاوت کی، ابوموسیٰ نے جہاد پر وعظ کہا، اور راہ خدا میں پیادہ پا چلنے کے فضائل بیان کئے، بہت سے لوگ آمادہ ہو گئے، ابوموسیٰ رض جب روانہ ہوئے، اُن کی سواری میں ایک عمدہ ترکی گھوڑا تھا، اور چالیس خچروں پر ان کا سامان بار تھا، ایک شخص نے بڑھ کر باگ روک لی، اور کہا "قول و فعل میں یہ اختلاف! اب ہم کو سواری دو اور خود پیدل چلنے کا ثواب حاصل کرو، ابوموسیٰ نے کوڑا مارا، لوگ شکایت لے کر عثمان رض کے پاس پہنچے اور ابوموسیٰ کی معزولی کا مطالبہ کیا، حضرت عثمان رض نے ابوموسیٰ رض کو معزول کر کے عبداللہ رض بن عامر کو والی مقرر کر دیا[1]!"

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ ابن اثیر

خلافیات

اس عنوان کے ماتحت ہم چند اہم امور کا ذکر کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ خلفائے راشدین کے دورِ اوّل میں صحابہ اپنے باہمی اختلافات کا تصفیہ کس طرح کیا کرتے تھے، اور دورِ ثانی میں یعنی حضرت عثمانؓ کے وقت سے چند مستثنیات کو چھوڑ کر اختلافات نے کیا صورت اختیار کر لی تھی؟

حضرت علیؓ کا توقف — حضرت ابوبکرؓ کے استفسار پر حضرت علیؓ نے فرمایا —— "میں آپ کی امارت ناپسند نہیں کرتا، لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن نہ جمع کر لوں گا نماز کے سوا اپنی چادر تک نہ اوڑھوں گا، حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد آپ نے بیعت کر لی اور حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کا اعتراف فرمایا، کہ خدا نے آپ کو جو رتبہ دیا ہے، اس پر ہم کو حسد نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کو اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں، یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آپ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں رسول اللہ کے رشتہ داروں کو اپنے رشتہ داروں سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اس صاف دلی کی گفتگو کے بعد دونوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو گئے، حضرت ابوبکرؓ نے مجمع عام میں حضرت علیؓ کے توقف بیعت پر آپ کی جانب سے عذر خواہی کی، اور حضرت علیؓ نے سب کے سامنے آپ کے فضائل کا اعتراف فرمایا —— !"[1]

خالدؓ کی معزولی — شام کی فتوحات کے معاً بعد حضرت عمرؓ نے سیف الاسلام مجاہد اسلام اور فخر بن اسلامیہ خالدؓ کو معزول کر دیا، خالدؓ نے حمص پہنچ کر ایک تقریر اپنی [illegible] کے بارے میں کی، کہا، "امیر المومنین نے مجھے شام کا افسر مقرر کیا، اور جب میں نے سارا شام فتح کر لیا تو معزول کر دیا، اس فقرے پر ایک سپاہی اٹھا، اس نے کہا، "اے سردار چپ رہ ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے —— !"

---

[1] تاریخ اسلام، بحوالہ بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ خیبر

خالدؓ نے کہا "لیکن عمر کے ہوتے ہوئے فتنہ کا کیا احتمال ہے؟" خالد مدینہ آئے، عمرؓ سے ملے، کہا "عمرؓ! خدا کی قسم تم میرے معاملہ میں ناانصافی کرتے ہو" حضرت عمر نے کہا، "واللہ خالدؓ تم مجھے محبوب بھی ہو، اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں،" یہ کہہ کر تمام عمالان ملکی کو خط بھیجا کہ "میں نے خالدؓ کو ناراضی یا خیانت کی بنا پر موقوف نہیں کیا، چونکہ میں یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں، اس لئے میں نے ان کا معزول کرنا مناسب سمجھا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے [1]۔"

غور کیجئے تو حضرت عمر کے اس فیصلہ میں معلوم و معروف اختلاف رائے کے باوجود بنیادی طور پر جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ ہے "ذات اور فرد سے قوم و ملت اور خدا کو بالاتر سمجھنے کا!"

---

[1] الفاروق بحوالہ کتاب الخراج

اہل بیت نبوی

اہلِ بیت نبوی کے ساتھ ابوبکرؓ کا برتاؤ بھی بہت اچھا تھا اور عمرؓ کا بھی، جب صحابہ کے وظائف مقرر ہوئے، تو بعض صحابہ کی رائے یہ تھی کہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین ہونے کی حیثیت سے سرفہرست عمرؓ ہی کا نام ہو، اور اسی اعتبار سے رقم ملے، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، سب سے پہلے علیؓ، پھر عباسؓ کو مقدم رکھا، پھر بنی ہاشم کے دوسرے لوگ، بعد ازاں بنی امیہ وغیرہ اپنے قبیلہ کو پانچواں نمبر دیا، تنخواہوں میں بھی یہی اصول ملحوظ رکھا، سب سے زیادہ تنخواہیں ان صحابہ کی تھیں جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے، امام حسن اور حسین اگرچہ بدری نہ تھے لیکن آں حضرتؐ کے تعلق کے باعث ان کی وہی تنخواہیں رکھیں جو بدریوں کی تھیں، آں حضرتؐ کے غلام زید کے بیٹے اسامہ کی تنخواہ اپنے بیٹے عبداللہ سے زیادہ مقرر کی، حالانکہ یہ غزوۂ بدر میں شریک رہ چکے تھے، عبداللہ نے باپ سے شکایت کی، جواب دیا، رسول اللہؐ اسامہ کو تجھ سے اور اسامہ کے باپ کو تیرے باپ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ——— [1]

---

[1] کتاب الخراج

علوم و فنون

ے تعلیم ــــــ خلافت راشدہ کے دور میں عبارت تھی، صرف قرآن اور حدیث سے، چنانچہ اس دور میں زیادہ زور اسی چیز پر دیا گیا،

حضرت عمرؓ نے مختلف صحابہ کو قرآن کا درس دینے کے لئے مختلف مقامات پر بھیجا، نیز سورۂ البقرہ، المائدہ، حج، نساء اور نور، کا یاد کرنا ضروری قرار دے دیا کہ ان سورتوں میں احکام و مسائل ہیں، قرآن کے صحیح پڑھنے اور اعراب کی تصحیح کے لئے ادب اور عربیت کی تعلیم پر زور دیا، جو لوگ فن لغت سے بے بہرہ تھے انہیں منع کر دیا کہ وہ قرآن کی تعلیم نہ دیں، اسی طرح حفاظ حدیث کو تعلیم حدیث کے لئے مختلف مقامات پر بھیجا، کوفہ، بصرہ، شام دوسرے مقامات پر صحابہ کرامؓ کو اسی مقصد کے ماتحت روانہ کیا،

خانہ جنگی

مسلمانوں میں خانہ جنگی کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہوا، حضرت عثمانؓ بہت بامروت، خلیق، نرم خو اور نرم دل تھے، مخالفین نے انہیں خویش پروری کے سلسلہ میں متہم کیا اور شورش کا آغاز کردیا،

امیر معاویہؓ کا اصرار

امیر معاویہؓ نے شام واپس جاتے وقت کہا،

—— میرے ساتھ چلیے وہاں آپ کا بال بیکا نہیں ہوسکتا!

لیکن حضرت عثمانؓ نے کہا۔

"میں جوار رسول نہیں چھوڑ سکتا ———— معاویہ نے کہا۔

مجھے ناگہانی حادثہ کا خطرہ ہے،

فرمایا،

حسبی اللہ ونعم الوکیل

۳۴ھ میں کوفہ، بصرہ اور مصر کے باغی متحدہ طور پر یورش کرکے مدینہ پہنچے، موسم حج کے باعث مدینہ سونا تھا، خلقت مکہ میں تھی، باغیوں کی سرکشی حد سے بڑھ گئی، جمعہ کے دن آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ منبر سے گر کر بے ہوش ہوگئے، امام حسین وغیرہ آپ کی حفاظت کے لئے پہنچے، لیکن آپ نے سب کو واپس کردیا،

باغیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ خلافت سے دستبردار ہوجائیں، آپ کا جواب یہ تھا، سر دے دوں گا لیکن خدا کی بخشی ہوئی خلافت کو نہ چھوڑوں گا،

حضرت علیؓ نے باغیوں کو سمجھا بجھا کر ہٹا دیا، لیکن وہ ہر طرح فتنہ و فساد پر آمادہ تھے، انہوں نے بیت عثمانؓ کا محاصرہ کرلیا، امام حسینؓ اور عبداللہؓ بن زبیر وغیرہ آپ کی حفاظت کے لئے سینہ سپر دروازے پر موجود تھے باغیوں کا جوش اور بڑھ گیا، انہوں نے حضرت علیؓ اور ام المؤمنین ام حبیبہؓ کی شان میں گستاخی کی ——

مغیرہ بن شعبہ نے کہا، یا مکے چلے جایئے یا شام، یا باغیوں کا مقابلہ کیجیے، فرمایا میں وہ پہلا شخص نہیں

لینا چاہتا جس کے ہاتھوں امتِ مسلمہ کی خونریزی شروع ہو، مکہ اور شام بھی نہیں جاؤں گا کسی قیمت پر، جوارِ رسول کو نہیں چھوڑوں گا، باغیوں نے دروازے میں آگ لگا دی کچھ لوگ دیوار پر چڑھ کر اندر داخل ہو گئے حضرت عثمانؓ تلاوت کر رہے تھے، کنانہ بن بشیر نے پیشانی پر لوہے کی لاٹ ماری، خون سے کلام اللہ کے اوراق رنگین ہو گئے، عمرو بن الحمق نے سینہ پر چڑھ کر مسلسل وار کئے، حضرت نائلہ (حضرت عثمانؓ کی بیوی) بغیرا ری کے ساتھ اپنے شوہر کو بچانے کے لئے دوڑیں، ان کی تین انگلیاں ہتھیلی سے اڑ گئیں اور سودان بن حمران نے لپک کر شہید کر دیا، شہادت کے وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی "فسیکفیکہم اللہ وھو السمیع العلیم" اور اس طرح ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن ایک بہت بڑا صحابی، ایک بہت بڑا انسان اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مدینہ پر باغیوں کا قبضہ

مدینہ پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا، بدامنی کے باعث دو روز تک نعش مبارک بے گور وکفن پڑی رہی،

صحابہ کے تاثرات

حضرت علیؓ نے اس حادثہ کی خبر سنکر دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا، "خدایا میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں!" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اگر ساری مخلوق اس قتل میں شریک ہوتی تو قوم لوط کی طرح اس پر آسمان سے پتھر برستے!" حضرت حذیفہؓ نے فرمایا "عثمانؓ کی شہادت سے وہ رخنہ پیدا ہو گیا، جسے پہاڑ بھی بند نہیں کر سکتا،

جنگِ جمل

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد صحابۂ کرام کی ایک موقر جماعت نے اصرار کر کے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا،

مسند خلافت پر فائز ہونے کے بعد آپ نے سب سے پہلے ۳۶ھ میں ان عمال کو برطرف کرنے کی جانب توجہ کی، جو آپ کی نگاہ میں اپنے منصب کے اہل نہ تھے، چنانچہ امیر معاویہ بھی برطرف کر دیئے گئے، لیکن انہوں نے اس برطرفی کو نہ مانا، قصاص عثمانؓ کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں اور حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیراہن بھی شام میں منگوایا، عوام میں اس کی نمائش کی، اور لوگوں کو قصاص پر ابھارا، حضرت علیؓ قصاص لینے پر تیار تھے، لیکن دو مشکلیں ان کے راستے میں حائل تھیں ایک تو یہ کہ نظم وامن

معتقد تھا، آپ فرماتے تھے، جب تک نظم و امن بحال نہ ہو جاتے، اس طرح کا اقدام، اور زیادہ بدامنی کا موجب ہو گا، دوسرے قاتلینِ عثمانؓ جب تک معین اور مشخص طور پر نہ معلوم ہو جائیں، اس وقت تک قصاص کس سے لیا جائے؟ کس طرح لیا جائے؟

ادھر تو حضرت علیؓ امیر معاویہؓ کی سرکشی کا جواب دینے کی تیاریاں کر رہے تھے، ادھر مکہ میں کچھ منافقوں ورانداز وں، مفسدوں اور سبائیوں نے حضرت عائشہ کو ہموار کر کے قصاص عثمانؓ کے مطالبہ پر آمادہ کر لیا۔

ام المومنین حضرت عائشہ کی دعوت پر ہزاروں مسلمانوں نے جاں نثاری کا عہد کر لیا، حضرت عائشہؓ اپنا کارواں لے کر صفر ۳۶ھ میں بصرہ کی طرف بڑھیں، حاکم بصرہ عثمانؓ بن حنیف نے مقابلہ کا فیصلہ کر لیا، ادھر حضرت عائشہؓ کے لشکر میں حضرت طلحہ و حضرت زبیر بھی تیاریاں کرنے لگے۔

جنگ میں عثمانؓ کو شکست ہوئی، وہ گرفتار ہوا، لیکن ام المومنین نے اُسے رہا کر دیا،

حضرت علیؓ اب تک مدینہ میں تھے، انہیں یہ خبریں پہنچیں تو معاویہ سے مقابلہ کا ارادہ فی الحال ترک کر کے بصرہ کی طرف بڑھے، آپ کا مقصد ام المومنین سے جنگ نہیں تھا صلح تھا، حضرت طلحہ و زبیر بھی صلح چاہتے تھے، حضرت عائشہ کی بھی مرضی یہی تھی، البتہ مفسدوں اور درانداز وں کی تو کوشش یہ تھی کہ صلح نہ ہونے پائے، چنانچہ عین اس وقت جب صلح تقریباً ہو چکی تھی، رات کے اندھیرے میں دونوں فوجوں پر انہوں نے حملہ کر دیا، ہر فریق یہ سمجھا کہ یہ بدعہدی ہوئی ہے، چنانچہ صلح کے بجائے جنگ شروع ہو گئی —— عین معرکہ کارزار میں حضرت علیؓ کی نظر حضرت زبیر پر پڑی، فرمایا تم کو یاد ہے ایک دن رسول اللہؐ نے تم سے پوچھا تھا تم علی کو دوست رکھتے ہو؟ تم نے کہا تھا ہاں یارسول اللہ۔ پھر آپ نے فرمایا تھا ایک دن تم ان سے ناحق لڑو گے —— حضرت زبیرؓ نے فرمایا، ہاں مجھے یاد آ گیا، پھر اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر سے کہا، علیؓ نے ایسی بات یاد دلا دی ہے جو میرے ذہن سے اُتر گئی تھی، میں واپس جاتا ہوں، تم بھی لوٹ چلو، لیکن انہوں نے انکار کیا، اور حضرت زبیر تنہا لوٹ گئے ——————!

بہر حال لڑائی جاری رہی: حضرت عائشہ فوج کے بیچ میں اونٹ پر تشریف فرما تھیں محمل مبارک پر ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی قبیلہ بنی ضبہ اور ازد نے اونٹ کو اپنے حصار میں لے لیا، اس معرکہ

میں، ام المؤمنین کی حفاظت کرتے ہوئے پونے پانچ ہزار کے قریب آدمی شہید ہوئے،

حضرت علی کی رائے کے مطابق حضرت عائشہؓ کا اونٹ زخمی کر دیا گیا، وہ بلبلا کر بیٹھ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی کا پانسہ پلٹا اور حضرت عائشہؓ کی فوج نے ہمت ہار دی، حضرت علی نے اعلان کر دیا، کہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، جو ہتھیار ڈال دے یا گھر کا دروازہ بند کر لے اُسے امن ہے، نہ کسی مسلمان کو قیدی بنایا جا سکتا ہے، نہ اس کا مال، مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کے بعد حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر ان کی روانگی کا انتظام کر دیا، مدینہ جاتے وقت حضرت عائشہؓ نے کہا "میرے بچو، یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی! علی ان واقعات کے بعد بھی میرے نزدیک اخیار میں ہیں[1]" حضرت علی نے کئی میل تک حضرت عائشہ کی مشایعت فرمائی، پھر امام حسنؓ اور حسینؓ کو ساتھ کر دیا، حضرت عائشہ کو زندگی بھر اس جنگ کا افسوس رہا، جب اس کا ذکر آتا تھا آنکھیں آب گوں ہو جاتی تھیں اور فرماتی تھیں، "کاش بیس برس پہلے میں اس دنیا سے اٹھ گئی ہوتی[2]"

جنگ شروع ہونے سے پہلے ابوسلامہ کے ایک سوال کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا "دونوں (مقاتل جنگ آزادی) میں سے جو بھی خالصتہً للہ صاف دلی کے ساتھ قتل ہو گا وہ جنت میں جائے گا!"

جنگ صفین

رجب ۳۶ھ میں منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد بعض ناگزیر مصالح کے باعث حضرت علی نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا، پھر جریر بن عبداللہ بجلی کے ہاتھ ایک خط بھیجا، جس میں لکھا تھا ——— "قاتلین عثمانؓ کی بہت آ رہے چکے، بیعت کرو، اس کے بعد با قاعدہ مقدمہ پیش کرو، میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ کر دوں گا[1]"

امیر معاویہ نے عمروؓ بن العاص کو مصر کی حکومت دینے کا تحریری وعدہ کر کے[2] انہیں اپنے ساتھ ملا لیا، عمرو بن العاص نے کہا ——— "شام کے اکابر کو اس بات کا یقین دلا دو کہ قتل عثمان میں علی کا ہاتھ ہے" امیر معاویہ نے عمرو کے مشورہ کے مطابق، شام کے بہت بڑے آدمی شرجیل کو یہ یقین دلا کر کہ قتل عثمان میں علیؓ شریک تھے اپنا ہمنوا بنا لیا[3]

---

[1] [2] [3] بحوالہ اخبار الطوال

آخر صفین کے میدان میں امیر معاویہ نے فوجیں اتار دیں، شامی فوج نے پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا، مجبور ہو کر حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ پانی چھین لایا جائے، عراقی سپاہیوں نے شامیوں کو شکست دے کر چشمہ پر قبضہ کر لیا، مگر حضرت علیؓ نے قبضہ کے بعد بھی شامیوں کا پانی بند نہیں کیا[1]

صلح کی کئی کوششیں ہوئیں لیکن وہ سب ناکام ہوئیں، صفر ۳۷ھ سے جنگ نے شدت اختیار کر لی، اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا، ۴۵ ہزار شامی، اور ۲۵ ہزار عراقی اس جنگ میں کام آئے[2] آخری معرکہ لیلۃ الہریر کا تھا، اس معرکہ میں شامیوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی، عمروؓ بن العاص سے امیر معاویہ نے مشورہ کیا، انہوں نے کہا "ہم قرآن کو حکم بنانے کی دعوت دیتے ہیں، یہ دعوت اگر علیؓ نے قبول کر لی تو اور نامنظور کر دی تو ہر حالت میں ان کی فوج میں تفرقہ پڑ جائے گا"[3] یہی ہوا بھی، حضرت علیؓ تحکیم کو نہیں ماننا چاہتے تھے، لیکن سادہ لوح مسلمانوں کے اصرار سے ماننا پڑا، حضرت علیؓ کی فوج کے کچھ لوگ تحکیم کے خلاف تھے وہ الگ ہو گئے اور خارجی کہلائے، تحکیم میں عمروؓ بن العاص نے دوسرے حکم ابو موسیٰ اشعری کو دھوکہ دے کر امیر معاویہ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ شریح بن ہانی نے عمرو بن العاص کو کوڑے مارنا شروع کر دیئے، اس نامنصفانہ فیصلہ کو حضرت علی نے نہیں مانا، اور پھر جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں، ادھر خوارج نے بہت زور باندھا، اور ظلم و ستم، سفاکی اور درندگی، شقاوت، اور بہیمیت کے ایسے مظاہرے کئے کہ اندرونی نظم و امن درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

حضرت علیؓ نے خوارج کو راہ راست پر لانے کی لاکھ کوششیں کیں، مگر وہ کامیاب نہ ہوئے، جنگ ہوئی اور خوارج کو شکست ہوئی، لیکن اب علوی فوج بھی بہت خستہ اور درماندہ ہو چکی تھی، جب خوارج کے مرحلہ سے فراغت پا کر حضرت علیؓ نے امیر معاویہ پر لشکر کشی کا ارادہ کیا تو اشعث بن قیس کندی نے کہا ـــــ امیر المومنین ہمارے ترکش اب خالی ہو چکے ہیں، نیزوں کے پھل خراب ہو گئے ہیں![4] ادھر امیر معاویہ نے نزاع باہمی، خارجیوں کی شورش، فوج علوی کی خستگی دیکھ کر موقعہ سے فائدہ اٹھایا، مصر پر قبضہ کر لیا، اور ۳۸ھ میں عمروؓ بن العاص کو مستقل والی بنا دیا، جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے محمد کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرا دیا[5]

---

۱ طبری ۲ ابوالفدا ۳ طبری

امیر معاویہؓ موقعہ سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے حضرت علیؓ کے دوسرے مقبوضات پر بھی قبضہ کرنے کی کوششیں کیں، چنانچہ امیر معاویہ نے بسر بن ابی ارطاۃ جیسے ظالم کو حجاز اور یمن کی طرف بھیجا جس نے ظلم و ستم کا خوب خوب سرزمین مقدس پر مظاہرہ کیا، زبردستی، تلوار کی نوک پر امیر معاویہ کی بیعت لینے کی کوشش کی، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ علوی فوج سر پر پہنچ گئی ہے تو بھاگ کھڑا ہوا[1]

صلح

آخر ۴۰ھ میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیان اسی شرط پر صلح ہو گئی کہ :-

(۱) حجاز، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علی کے پاس رہے گا۔

(۲) شام، مصر، اور مغرب امیر معاویہ کے پاس، اس طرح ایک مدت مدید اور عرصہ دراز کے بعد عارضی طور پر خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا، اس کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

---

[1] ابن اثیر

حصّہ سوم

عہدِ بنو امیّہ

عہد بنی امیہ

از سنہ ۴۰ھ تا سنہ ۱۳۲ھ

اموی خلفا

۱- معاویہ بن ابی سفیان سنہ ۴۰ھ

۲- یزید بن معاویہ سنہ ۶۰ھ

۳- معاویہ بن یزید سنہ ۶۴ھ

۴- مروان بن حکم سنہ ۶۴ھ

۵- عبدالملک بن مروان سنہ ۶۵ھ

۶- ولید بن عبدالملک سنہ ۸۶ھ

۷- سلیمان بن عبدالملک سنہ ۹۶ھ

۸- عمر بن عبدالعزیز سنہ ۹۹ھ

۹- یزید بن عبدالملک سنہ ۱۰۱ھ

۱۰- ہشام بن عبدالملک سنہ ۱۰۵ھ

۱۱- ولید بن یزید بن عبدالملک سنہ ۱۲۵ھ

۱۲- یزید بن ولید سنہ ۱۲۶ھ

۱۳- ابراہیم بن ولید سنہ ۱۲۶ھ

۱۴- مروان الحمار سنہ ۱۲۷ھ تا سنہ ۱۳۱ھ

عارف

احوال وسوانح

عنوانات :

۱ - امیر معاویہ از سنہ ۴۰ھ تا سنہ ۵۹ھ
۲ - یزید بن معاویہ سنہ ۶۰ھ تا سنہ ۶۴ھ
۳ - معاویہ بن یزید سنہ ۶۴ھ تا سنہ ۶۴ھ
۴ - مروان بن حکم سنہ ۶۴ھ تا سنہ ۶۵ھ
۵ - عبدالملک بن مروان سنہ ۶۵ھ تا سنہ ۸۶ھ
۶ - ولید بن عبدالملک سنہ ۸۶ھ تا سنہ ۹۶ھ
۷ - سلیمان بن عبدالملک سنہ ۹۶ھ تا سنہ ۹۹ھ
۸ - عمر بن عبدالعزیز سنہ ۹۹ھ تا سنہ ۱۰۱ھ
۹ - یزید بن عبدالملک سنہ ۱۰۱ھ تا سنہ ۱۰۵ھ
۱۰ - ہشام بن عبدالملک سنہ ۱۰۵ھ تا سنہ ۱۲۵ھ
۱۱ - ولید بن یزید سنہ ۱۲۵ھ تا سنہ ۱۲۶ھ
۱۲ - یزید بن عبدالملک سنہ ۱۲۶ھ تا سنہ ۱۲۶ھ
۱۳ - ابراہیم بن ولید سنہ ۱۲۶ھ تا سنہ ۱۲۷ھ
۱۴ مروان بن محمد سنہ ۱۲۷ھ تا سنہ ۱۳۲ھ

تعارف

خلافتِ راشدہ کے بعد جو حکومتِ الٰہیہ کا پہلا اور شاید آخری نمونہ تھا مسلمانوں کی خلافت حکومت میں منتقل ہوگئی، اب اُن کے خلفا وہ نہ رہے تھے، جو راتوں کو گشت کے لئے نکلتے تھے جن کے دن ستم کشوں کی دادرسی میں صرف ہوتے تھے جن کی شب یادِ الٰہی میں بسر ہوتی تھی جن کا زور مہمات ملکی و ملی میں صرف ہوتا تھا، جو عوام میں اس طرح گھل مل کر رہتے تھے کہ آقا اور غلام میں تمیز ناممکن ہو جاتی تھی جن کی زندگی اتنی سادہ تھی کہ پھٹے اور پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے، سوکھا اور روکھا کھانا کھاتے تھے، لیکن جن کے رعب، دبدبے، جاہ و تجمّل اور عظمت و جلالت کا یہ عالم تھا کہ ملوک و سلاطین اُن کے نام سے لرزتے تھے، جن کا عدل شاہ اورنگ نشین اور فقیر بے نوا میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا تھا، جو اپنے خاندان اور طائفۃ المسلمین میں کوئی حدِ فاصل نہیں قائم کرتے تھے، جن کی مساوات غلام اور سلطان میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں سمجھتی تھی، جو بیت المال سے سبب کا ایک دانہ لینا بھی گناہ سمجھتے تھے، جو بیت المال کے چراغ سے صرف اس وقت تک فائدہ اٹھاتے تھے جب تک کارِ خلافت انجام دے رہے ہوں جنہوں نے بیت المال کو کبھی مالِ غنیمت نہیں سمجھا، یہ انصاف کرتے تھے، قرآن و حدیث کی بنیاد پر نظامِ حکومت کو استوار کرتے تھے، پھر بھی یومِ جزا کے خوف سے لرزتے رہتے تھے اس دن سے ڈرتے تھے جب ایک ایک بات، ایک ایک کام، ہر ہر عمل کا محاسبہ کیا جائے گا، جب فیصلہ نہ نسب پر ہوگا، نہ امارت پر، نہ شکوہِ خسروی پر، نہ خاندان پر، بلکہ اُس کی بنیاد صرف تقویٰ ہوگی،

ان خلفا کے بجائے اب جو ملوک و سلاطین تختِ کبریائی پر نمودار ہوئے گو اپنے تئیں خلیفۃ اللہ فی الارض کہلاتے تھے لیکن (الّا ماشاء اللہ) اربابِ دنیا، صرف ملک، سلطان، بادشاہ!

یہیں سے ملوکیت کا سوتا پھوٹتا ہے۔ یہیں سے اسلام کے نخلِ جمہوریت پر تیشے اور آرے چلتے ہیں، یہیں سے مسلمانوں کا خلیفہ عجم کے فرماں رواؤں کی طرح ٹھاٹھ اور شان کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اب وہ خس پوش جھونپڑی میں نہیں رہتا فلک بوس محلوں میں رہتا ہے، اب اس کا دربار مسجد میں نہیں ہوتا ایوان زرنگار میں ہوتا

سنبھ، اب وہ عوام کے دوش بدوش نماز نہیں پڑھتا مسجد میں اپنے لئے ایک الگ مقصورہ رکھتا ہے، اب وہ آنکھ بند کرکے انصاف نہیں کرتا، اپنوں کو دیکھتا ہے، سیاسی مصلحتوں کو دیکھتا ہے، اقتضائے وقت کو دیکھتا ہے، اب وہ اپنے جانشین کا انتخاب جمہور امت پر نہیں چھوڑتا، ارباب حل وعقد پر نہیں چھوڑتا، اصحاب زہد و ورع پر نہیں چھوڑتا بلکہ بے تامل اپنے بیٹے کو اپنا جانشین اور ولی عہد بنا لیتا ہے، مخالفوں کو نوک شمشیر سے خاموش کرتا ہے، اختلاف رکھنے والوں کے لئے گرشتہ قبر کا انتظام کرتا ہے، غیر معتمد لوگوں کی زہر ہلاہل اور اچانک حملے سے مدارات کرتا ہے وہ اپنے جانشین کے لئے یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ صاحب تقویٰ ہو، امر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہو، صرف اتنا ہی کافی سمجھتا ہے کہ وہ اس کا لخت جگر ہے ——— ان میں اور ان میں کتنا فرق تھا؟ کتنا عظیم الشان فرق!

بہرحال جمہوریت کے چمن زار سے نکل کر شخصیت اور ملوکیت کے خارزار میں قدم رکھتے ہوئے دل کو دھچکہ ضرور لگے گا، خلافت راشدہ کی جنت سے نکل کر استبداد و قہرمانیت اور شخصیت مطلقہ کی دنیا میں آکر دل کی دھڑکن ضرور بڑھ جائے گی ——— لیکن حقائق خواہ کتنے ہی سنگین ہوں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا!

امیر معاویہ

حضرت علیؓ کے حادثۂ شہادت کے بعد، لوگوں نے حضرت امام حسنؓ کے دست حق پرست پر خلافت کی بیعت کرلی، امیر معاویہ قصاص عثمانؓ کی آڑ لے کر جب حضرت علیؓ کا مقابلہ کرنے سے نہیں چوکے، تو امام حسنؓ کی خلافت کیسے تسلیم کرلیتے ؛ جب کہ امام یہ بھی معلوم تھا کہ محمدؐ کا یہ نواسہ قتل و خوں ریزی کو طبعاً پسند نہیں کرتا،

چنانچہ وہی ہوا حضرت امام حسن نے خونریزی سے بچنے کے لئے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا،

علامہ ابن عبد البر نے اپنی مشہور کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دستبرداری صرف امیر معاویہ کی زندگی تک کے لئے تھی[1] لیکن پھر یہ سوال اس لئے نہیں اٹھ سکا کہ کچھ عرصہ بعد امام حسن کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے آپ کو زہر دے دیا جس سے آپ کی وفات ہوگئی، وفات کے بعد امیر معاویہ کے کارندوں نے آپ کو روضۂ نبوی میں دفن بھی نہیں ہونے دیا حالانکہ حضرت عائشہؓ نے کھلے دل سے اجازت مرحمت فرمادی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بقیع کے قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی، یہ سلوک اس شخص کے ساتھ کیا جارہا تھا جس کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا ——— "خدایا! میں اس کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے محبوب رکھ!"

امیر معاویہ اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں، قیساریہ کا معرکہ سر کیا جس میں اسی ہزار رومی کام آئے، ۱۸ھ میں حضرت عمرؓ نے دمشق کا عامل بنا دیا، ۲۳ھ میں حضرت عثمانؓ نے پورے شام کا والی بنا دیا۔

۵۹ھ میں مرض اماوت میں مبتلا ہوئے اور ۷۸ سال کی عمر میں ۱۹ سال ۳ مہینے حکومت کرکے رجب ۶۰ھ میں رخصت ہوگئے۔

عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابوسفیان امیر معاویہ کے مشیر و ندیم تھے، ان میں سے عمروؓ بن عاص کی ذہانت واقعہ عظیم سے، مغیرہ بن شعبہ کی طباعی امیر معاویہؓ کا عندیہ تاڑ کر از خود یزید کے لئے ولایت عہد کی تحریک کرنے سے، اور زیاد ابن ابوسفیان کی فراست، امیر معاویہ سے اپنا دعوا کردہ حساب فارس کے آمد و خرچ

---

[1] استیعاب

منظور کرا لینے سے ظاہر ہے۔

(امیر معاویہ بڑے حلیم اور بردبار تھے، لوگوں سے سخت و سست سنتے تھے مگر خاموش رہتے تھے، سن سب کی لیتے تھے، کرتے وہ تھے جو چاہتے تھے بڑی سے بڑی بات پر بھی غصہ سے دور رہتے تھے،)

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے ایک انصاری کو پانچسو دینار بھیجے، انہوں نے اس رقم کو حقیر خیال کیا اپنے لڑکے کے ہاتھ میں یہ تھیلی رکھی، اور اسے قسم دی کہ معاویہ کے منہ پر کھینچ مار دینا، وہ معاویہؓ کے پاس آیا، اور عرض گزار ہوا، امیر المومنین، پدر بزرگوار نے مجھے یہ حکم دیا ہے۔ معاویہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا بیٹے اپنے باپ کا حکم پورا کرو۔ لیکن اپنے چچا کے ساتھ رعایت کرنا یعنی تھیلی زور سے نہ مارنا۔[۱]"

یزید امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد رجب ۶۰ھ میں تخت نشین خلافت ہوا، ربیع الاول ۶۴ھ میں ۳ سال ۹ مہینے حکومت کرکے ۳۸ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

حادثۂ کربلا اسی کے زمانہ میں پیش آیا، یہ سیر و شکار کا شائق تھا، امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

معاویہ بن یزید یزید کے مرنے کے بعد ربیع الاول ۶۴ھ میں اس کا لڑکا معاویہ تخت حکومت پر بیٹھا، اپنے باپ کے دور کی سیاہ کاریاں دیکھ کر وہ بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا، مشکل سے ۳ مہینے اس نے حکومت کی، پھر اس نے مسلمانوں کے سامنے تقریر کی کہ میں یہ بار گراں نہیں اٹھا سکتا، تم جسے چاہو اپنا خلیفہ بنا لو۔[۲]

مروان بن حکم ذی قعدہ ۶۴ھ میں مروان بن حکم نے تخت حکومت پر قبضہ کر لیا، یہ بھی اموی تھا اور امویوں کو اس سے بہت سی امیدیں تھیں، طے یہ ہوا کہ مروان کے بعد خالد بن یزید اور ان کے بعد عمرو بن سعید بن عاص حکومت کے وارث ہوں گے، لیکن چند ماہ بعد مروان نے اس عہد کو منسوخ کرکے اپنے بیٹے عبد الملک اور اس کے بعد عبد العزیز کو ولی عہد بنا دیا،

رمضان ۶۵ھ میں مروان ۶۳ سال کی عمر میں صرف ۹ ماہ حکومت کرکے ختم ہو گیا۔

---

[۱] الفخری [۲] طبری

عبدالملک بن مروان عبدالملک بہت بڑا عالم تھا، بڑے بڑے ائمہ اس کے علمی پایہ کے معترف تھے، بہادر بھی بہت تھا، رمضان ۶۵ھ میں یہ تخت حکومت پر بیٹھا ۱۵ شوال ۸۶ھ کو ساٹھ سال کی عمر میں ۲۱ سال حکومت کر کے وفات پائی۔

ولید بن عبدالملک شوال ۸۶ھ میں ولید تخت حکومت پر بیٹھا، ۹ سال اور چند ماہ حکومت کر کے جمادی الآخر ۹۶ھ میں وفات پائی، صرف ۴۶ سال زندہ رہا۔

یہ مختصر مدت حکومت فتوحات اور یہ نو سے لبریز ہے۔

سلیمان بن عبدالملک ولید کے انتقال کے بعد جمادی الثانی ۹۶ھ میں سلیمان اورنگ نشین حکومت ہوا پورے تین سال حکومت کی ۴۵ سال عمر پائی صفر ۹۹ھ میں انتقال ہوا۔

سلیمان کے عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ ولید کے زمانہ کے تمام بڑے بڑے سپہ سالار اور جرنیل اور فاتح "قتل" کر دیئے گئے۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

حقیقت یہ ہے کہ سلیمان معاف کرنا نہ جانتا تھا، انتقام اس کی سرشت بن چکا تھا!

عمر و بن عبدالعزیز صفر ۹۹ھ میں سلیمان کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر متمکن ہوئے، یہ مروان بن حکم کے پوتے تھے، ان کی والدہ حضرت عمر فاروق کی پوتی تھیں، یہ خود عبدالملک کے داماد تھے،

خلافت سے قبل بھی گراں بار مناصب پر فائز رہے، بیس برس سے زیادہ مصر کے گورنر رہے،

بڑے نیک، صالح، خدا ترس، متقی اور پرہیزگار شخص تھے، ان کے دور خلافت کو خلافت راشدہ کا نمونہ اور تتمہ کہا جاتا ہے انہوں نے پھر سے خلافت میں وہی جھلک پیدا کر دی جس کی نظیر صرف ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمان و علی کے دور میں مل سکتی تھی،

جب تک خلافت کے منصب پر نہیں فائز ہوئے تھے، عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے تھے، خلافت کا منصب

قبول کرنے کے بعد یکسر خشیت الٰہی کی تصویر بن کر رہ گئے تھے، تقویٰ آپ کی فطرت بن گیا تھا، اور لطف و لینیت نے آپ کے مزاج اور عادات پر قبضہ کر لیا تھا۔

سلیمان کی تدفین کے بعد جب گھر پہنچے تو پریشان تھے ایک کنیز نے پوچھا خیر تو ہے؟ جواب دیا، مشرق و مغرب میں امت محمدی کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو، اور بغیر اس کے مطالبہ یا اطلاع کے جس کی ادائی مجھ پر فرض نہ ہو، پھر بھلا میں پریشان کیسے نہ رہوں!

ڈھائی سال کے قریب منصبِ خلافت پر فائز رہ کر، رجب ۱۰۱ھ میں وفات ہوئی، وفات کے وقت آپ کی عمر صرف ۴۰ سال کے قریب تھی! ابن سعد کی روایت ہے کہ بنو امیہ نے شرعی اصلاحات سے تنگ آ کر ایک غلام کو ہزار اشرفی انعام میں دیں، اور زہر دلوا کر آپ کی جان لی، یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے، اس لئے کہ اگر چند سال بھی عمر بن عبدالعزیز اور زندہ رہ جاتے تو پھر اموی دور کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا اور نظام اسلام منظم ہو جاتا۔

یزید بن عبدالملک

۱۰۱ھ میں یزید بن عبدالملک نے تخت خلافت پر تمکن کیا، اس کی ماں کا نام عاتکہ تھا، جو یزید کی بیٹی اور امیر معاویہ کی پوتی تھی شعبان ۱۰۵ھ میں یزید کا انتقال ہو گیا، وفات کے وقت اس کی عمر چالیس سال کی تھی، اس طرح چار سال کے قریب وہ حکمران رہا۔

یزید نے اپنے بھائی ہشام بن عبدالملک کو خلیفہ، اور اپنے بیٹے ولید کو اس کا ولی عہد نامزد کیا۔

ہشام بن عبدالملک

رمضان ۱۰۵ھ میں ہشام نے مسند خلافت سنبھالی، ۲۰ سال کے قریب حکومت کر کے ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں اس نے وفات پائی، وفات کے وقت اس کا سن ۵۵ سال کا تھا،

ولید بن یزید

ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں ولید بن یزید تخت حکومت پر بیٹھا، ایک سال دو مہینے حکومت کرنے کے بعد، جمادی الثانی ۱۲۶ھ میں قتل کیا گیا، عمر ۴۲ سال،

ہشام اس سے بہت نالاں تھا اس کے بجائے اپنے لڑکے مسلمہ کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ ارادہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ وہ اس دنیا سے سدھار گیا، اور تخت حکومت پر یزید بیٹھ گیا۔

اس کے قتل کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے، خوب شراب پیتا تھا، فسق و فجور اس کی زندگی کا شعار بن چکا تھا، ہوسناکی، سفاکی، شقاوت اور ظلم اس کے خصوصیات زندگی میں شمار ہو سکتے ہیں، یزید بن عبدالملک نے اسے شکست دی، اور وہ قلعہ میں محصور ہو گیا، لوگ جب اسے قتل کرنے کے لئے اندر داخل ہوئے تو وہ حسب روایت ابن اثیر قرآن شریف کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گیا اور کہنے لگا جس طرح قرآن پڑھتے ہوئے عثمانؓ مارے گئے، اسی طرح میں چاہتا ہوں میرا بھی خاتمہ ہو۔

یزید بن عبدالملک اسے یزید الناقص بھی کہتے ہیں، یہ رجب ۱۲۶ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا، لیکن چھ مہینے بعد بعمر ۴۴ سال ۱۲۶ھ میں وفات پا گیا۔

ابراہیم بن ولید یہ ذی الحجہ ۱۲۶ھ میں تخت پر بیٹھا، اور چند ماہ بعد اس کا دورِ خلافت ختم ہو گیا۔

اس کے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی مخالفت اور بغاوت کا دور پھر شروع ہو گیا، جنہیں یزید بن عبدالملک نے خاموش کر دیا تھا، یا مجبور کر دیا تھا، وہ پھر زور و شور سے بغاوت کا پرچم لہراتے ہوئے میدان میں آ گئے، ابراہیم نے بغاوت کو دبانے، باغیوں کا سر کچلنے چھینے ہوئے مقامات کو حاصل کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، لیکن مشیت مخالف تھی، ہر تدبیر الٹی پڑی، آخر وہ بھاگ نکلا، اور اس طرح اس کی خلافت اس کی زندگی ہی میں افسانۂ پارینہ بن گئی۔

مروان بن محمد بن مروان اسے مروان الحمار بھی کہتے ہیں، یہ صفر ۱۲۷ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا، ابراہیم کو جو مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا، اسے قتل نہیں کیا بلکہ معاف کر دیا۔

مروان خاندان بنی امیہ کا آخری فرمانروا تھا، یہ اگرچہ بہت سی صلاحیتیں رکھتا تھا، لیکن جب یہ سریرآرائے خلافت ہوا تو حالات اتنے ناسازگار ہو چکے تھے کہ اس کے سنبھالے نہ سنبھل سکے، ہر طرف بغاوت، مخالفت،

قبول کرلے گی آرائی ،

نے آباسی خاندان کی طرف سے تبلیغ و دعوت کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا، اب یہ تحریک ابومسلم خراسانی کے ہاتھ میں آئی ، یہ تاریخ کا عجیب و غریب انسان تھا ، سراپا سحر و کرشمہ ، بہرحال یہ میدان میں آیا - اور بہت جلد اس نے اموی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا ، اور ایک نئے خاندان (بنو عباس) کو برسرِ حکومت کر دیا جس کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کبھی حکومت اس کے ہاتھ آئے گی - کیونکہ اصل دعوت امامت تو سادات کے لئے تھی لیکن وہ پس پردہ رہ گئے ، اور خاندان بنو عباس برسرِ حکومت ہو گیا ، مروان الحمار ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں قتل ہوا ، اور اس کے قتل ہوتے ہی اموی خاندان کے جاہ و جلال اور حکومت کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا ؛

فتنۂ ولی عہدی

آں حضرتؐ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو کسی کو اپنا جانشین نہیں مقرر کیا، انصار و مہاجر نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنا لیا، حضرت ابوبکرؓ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو ذاتی طور پر نامزد کیا، قوم نے ان کی نامزدگی تسلیم کر لی حضرت عمر جب اس دنیا سے رخت سفر باندھنے لگے تو انہوں نے چھ آدمیوں کی ایک مجلس قائم کر دی کہ ان میں سے کوئی خلیفہ منتخب کر لیا جائے، حضرت عثمانؓ کو اچانک شہادت کے باعث اس سلسلہ میں کسی اقدام کا موقعہ نہ ملا حضرت علیؓ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا اور جاں بری کی امید نہ رہی تو لوگوں نے پوچھا کیا ہم حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ آپ نے جواب دیا " نہ میں اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں"[1] لیکن امیر معاویہ نے اس جادۂ صواب سے انحراف کیا، انہوں نے خلافت کو موروثی بادشاہت میں تبدیل کر دیا جس کے بارے میں اسی وقت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کہا تھا ——— "غلط ——— اس سے امت کی بھلائی مقصود نہیں، تم خلافت کو ہرقل (شہنشاہ روم) کی شہنشاہی بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل مسند آرائے حکومت ہو ——— "؟

اٹل فیصلہ لیکن امیر معاویہ اپنے فیصلہ پر اٹل تھے، ہر قیمت پر وہ یزید کو مسلمانوں پر مسلط کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، صحابۂ کرام نے مخالفت کی، ارباب حل و عقد نے نصیحت کی، رفقاء نے اس غلط راستے سے ہٹانا چاہا لیکن وہ کسی حالت میں بھی اپنی رائے بدلنے پر تیار نہیں تھے انہوں نے یزید کو ہر قسم کے ناروا ذرائع استعمال کر کے ولی عہد تسلیم کرا لیا، اس طرح وہ خود تو مطمئن ہو گئے کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو گا، لیکن اسلام میں ملوکیت کی ایسی بدعت رائج کر گئے اور جمہوریت کو اس طرح ختم کر گئے کہ پھر صدیوں تک مسلمان اس مصیبت سے چھٹکارا نہ پا سکے،

حجاز کا معاملہ مغیرہؓ بن شعبہ اور زیاد بن ابی سفیان نے کوفہ اور بصرہ کے لوگوں کو ہموار کرنے کا ذمہ لے لیا، سب سے اہم معاملہ حجاز مقدس کا تھا، جب تک حجاز خلافت

---

[1] مروج الذہب

نہیں تسلیم کرتا، اس وقت تک خلافت کی اہمیت ہی کیا رہ جاتی ہے چنانچہ حجاز کے لئے امیر معاویہ نے مروان بن حکم کو منتخب کیا، حجاز کی رائے عامہ پر جن لوگوں کا غیر معمولی اثر تھا، اور جو اپنے زہد و تقویٰ، نیکی و پارسائی صداقت و دیانت، راست بازی اور امانت کے اعتبار سے سارے حجاز کے سرتاج مانے جاتے تھے وہ تھے امام حسینؓ، عبداللہؓ بن عمر عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر، عبداللہ بن عباس، عبداللہؓ بن زبیر، مروان نے ان حضرات کے سامنے یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ رکھا، اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہا، امیر المومنین معاویہ، ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح یزید کو نامزد کرنا چاہتے ہیں، عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکرؓ اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے فوراً مروان کو ٹوکا، اور کہا، "خبردار، یہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی سنت نہیں قیصر و کسریٰ کی سنت ہے، ان دونوں میں سے کسی نے بھی اپنے لڑکے کو ولی عہد نہیں بنایا بلکہ اپنے خاندان تک کو اس سے دور رکھا، دوسرے بزرگوں نے بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی، مروان نے یہ ساری کیفیت امیر معاویہ کو لکھ بھیجی۔ ۱۸

جبر و جور امیر معاویہ اس مسئلہ کو جلد از جلد طے کر دینا چاہتے تھے، آخر انہوں نے حجاز کے لوگوں کو بھی ڈرا دھمکا کر[1] اہل حل و عقد کو تلوار کے سائے میں کھڑا کر کے اپنی بات منوالی، اور ۵۶ھ میں یزید کی بیعت لے کر اسلام کی جمہوری روح کو ایک عرصہ دراز تک کے لئے معطل کر دیا،

تلوار کی دھمکی امیر معاویہ نے جب دیکھا کہ حجاز کے ارباب رائے، اور ارباب حل و عقد ان کی بات بھی نہیں مانتے تو انہوں نے فرمایا، اگر تم لوگوں نے اب کوئی مخالفت کی، تو تلوار سے کام لیا جائے گا، پھر (اس مجلس سے) باہر نکل کر مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ——— "یہ لوگ یعنی عبداللہؓ بن زبیر وغیرہ مسلمانوں کے سربرآوردہ، اور ان کے بہت اچھے لوگ ہیں، ان کی صلاح و مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کیا جائے گا، ان حضرات نے یزید کی بیعت کر لی ہے، لہٰذا آپ حضرات بھی بیعت کر لیجئے؟" اہل مدینہ کو انہی حضرات کے فیصلہ کا انتظار تھا، سب نے سر تسلیم خم کر دیا[2]

وصیت نامہ وفات سے کچھ قبل یزید کے لئے جو وصیت نامہ لکھا اس میں تحریر فرمایا:- "میں نے تمہارے راستے کے کانٹے ہٹا دیئے، راستہ صاف کر دیا، دشمنوں کی

---

[1] طبری [2] ابن اثیر

زیر کر لیا، سارے عرب کی گردنیں تمہارے آگے جھکا دیں، تمہارے لئے ایک بہت بڑا خزانہ جمع کر دیا!"

پھر کچھ اور باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں فرمایا: — "جو شخص لومڑی کی طرح کاوے دے دے کر شیر کی طرح حملہ کرے گا، وہ عبداللہ بن زبیر ہے، اگر وہ صلح کر لیں (یعنی یزید کی بیعت کر لیں) تو خیر، ورنہ قابو پانے کے بعد ان کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ان کے ٹکڑے اڑا دینا![1]" اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس وصیت پر حرف بہ حرف عمل کیا گیا تفصیل اپنے موقع سے آئے گی۔

آرنلڈ کی رائے

امیر معاویہ کے اس اقدام و عمل پر رائے زنی کرتے ہوئے، تھامس آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے: —

"[redacted] معاویہ نے خلافت راشدہ کا وہ نظام سیاسی ختم کر دیا تھا جس کی بنیاد شورہ اور مذہبی اصول پر قائم تھی۔ اس کی جگہ موروثی نظام کی داغ بیل ڈالی جس میں سیاسی مصلحتوں کے سامنے مذہبی اصول ثانوی درجہ رکھتے تھے خلافت بنی امیہ مذہب سے زیادہ سیاست کا پاس کیا جاتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی،"

ایک اور تبصرہ

"النظم الاسلامیہ" (مطبوعہ مصر) کے فاضل اجل مؤلف نے لکھا ہے: —

"امیر معاویہ کے زمانے سے خلافت موروثی ہو گئی تھی آپ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کر دیا، اس سلسلے میں آپ بازنطینی اور ساسانی نظام سے بہت متاثر تھے، جن کے ہاں نظام حکومت وراثتی تھا، اور بادشاہ اپنی زندگی میں ولیعہد مقرر کر دیا کرتا تھا، امیر معاویہ نے یزید کی ولیعہدی کے لئے اپنی پوری حکمت عملی اور سیاسی شعور صرف کر دیا تھا بیعت سے پہلے گورنروں کے نام حکم بھیجا تا کہ یزید کی بیعت کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا جائے۔"

حکمت عملی

امیر معاویہ نے یزید کی بیعت کے لئے حالات کو سازگار بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا جن سے مخالفت کا اندیشہ تھا انہیں مقرب بارگاہ بنا لیا، بڑے بڑے عہدے دیئے۔ ان سے رواداری برتی اور ان کی غلط کاریوں سے درگذر کیا، اس حکمت عملی کا اثر یہ ہوا کہ اکثریت ان

---

[1] طبری

کی ممنوا ہوگئی اور لوگ یزید کی بیعت پر آمادہ ہوگئے۔ جب شام و عراق کے باشندوں نے بیعت کر لی تو امیر معاویہ یزید کی بیعت لینے مدینہ پہنچے۔ ابن زبیرؓ اور حضرت امام حسینؓ وغیرہ کے انکار پر امیر معاویہ نے جوش غضب میں کہا: "اب میرے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا، خدا کی قسم اگر ایک لفظ بھی مخالفت کا کسی کی زبان سے نکلا تو لفظ پورا ہونے سے پہلے گردن اڑا دی جائے گی، پھر اپنے پولس افسر کو بلا کے حکم دیا۔ ان میں سے ہر شخص کے پاس دو۔ دو آدمی ننگی تلواریں لے کر کھڑے ہوجائیں۔ اگر ایک لفظ بھی مخالفت کا ان کی زبان سے نکلے تو فوراً گردن اڑا دو؛ امیر معاویہ نے ان بزرگوں کے ساتھ نہایت نامناسب کیا، انہوں نے خلافت کے استحقاق کی شرطوں کو قطعاً نظر انداز کردیا۔ اور منصب خلافت کو موروثی سلطنت میں تبدیل کردیا جس میں شوریٰ اور انتخاب کا کوئی دخل نہ تھا۔ جو ملوق امام حسینؑ سے ایسا سلوک کرے۔ کیا وہ مسلمان ہے؟ یا مسلمان کے روپ میں فتح مکہ سے پہلے والا ابوسفیان؟

ملوکیت کی بنیاد

امیر معاویہ نے اس نظام شوریٰ کو ختم کردیا جس کی بنیاد پر خلفائے راشدین کا انتخاب ہوا تھا۔ آپ نے خلافت کی جگہ ملوکیت کی بنیاد رکھی، جس کے باعث مسلمان اپنے طبعی حق یعنی شوریٰ سے محروم ہوگئے۔ یہ وہ حق تھا جس کے عرب خوگر تھے، قرآن نے بھی اس کی حمایت کی تھی، احادیث بھی اس کی تحسین کرتی تھیں، ولی عہدی کے سلسلہ میں امویوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنی زندگی میں ایک چھوڑ دو دو تین تین ولی عہد مقرر کرنے کی رسم جاری کی۔

ایک مثال

فاتح مصر عمروؓ بن عاص کے بیٹے حضرت عبداللہ اپنے زہد و ورع، تقویٰ اور دینداری کے اعتبار سے نہ صرف اپنے باپ سے بلکہ بہتوں سے بڑھے ہوئے تھے، امیر معاویہ نے جب یزید کی بیعت کا فیصلہ کرلیا، تو مصر کے گورنر مسلمہ کو لکھا کہ یزید کے لئے بیعت لے لی جائے، حضرت عبداللہ نے صاف انکار کردیا کہ میں ایک فاسق وفاجر کی بیعت نہیں کرتا، مسلمہ نے یہ سن کر ایک جاہل اور تندخو عہدے دار عابس کو پولیس کی جمعیتہ دی کہ جاؤ عبداللہ کو راہ راست پر لاؤ، وہ عبداللہ کے گھر فسطاط پہنچا اور آگ اور لکڑی فراہم کرکے ان کے گھر میں آگ لگانے کا بندوبست کرنے لگا ــــ آخر مجبوراً انہوں نے بیعت کی تب جان بچی۔

۱ے حسن المحاضرہ

حادثۂ کربلا

تخت نشین خلافت ہونے کے بعد یزید نے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو تاکید کی کہ وہ حضرت امام حسینؓ اور عبداللہؓ بن زبیر سے بیعت لے لے، ولید نے مروان سے رائے لی اس نے کہا، معاویہ کی خبر موت مشتہر ہونے سے پہلے بیعت لے لو، ورنہ دشواری پیش آئے گی، اگر یہ بیعت سے انکار کریں تو قتل کر دو،

بیعت سے انکار

لیکن ان دونوں حضرات نے بیعت نہیں کی، عبداللہؓ بن زبیر مکہ میں جاکر حرم میں پناہ گزیں ہو گئے، امام حسینؓ بھی شعبان ۶۰ھ میں مکہ پہنچے اور شعب ابی طالب میں قیام فرمایا،

کوفہ سے بلاوا

یہاں کوفہ سے بلاوے آنے لگے کہ آپ تشریف لائیے، مسند خلافت قبول کیجئے، ہم بیعت کے لئے تیار ہیں، آپ نے تحقیق احوال کے لئے حضرت مسلم کو وہاں بھیجا، مسلم آپ کے چچا زاد بھائی تھے ۔ یزید نے بصرہ کے والی عبیداللہ بن زیاد کو تاکیدی حکم بھیجا کہ مسلم کو کوفہ سے نکال دو، ورنہ قتل کر دو، مسلم ہانی کے ہاں پناہ گزیں ہوئے، عبیداللہ نے ہانی سے مسلم کا مطالبہ کیا، اُن کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا، عبیداللہ نے انہیں برسرِ عام پٹوا دیا، پھر قید کر دیا، بعد میں انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا،

حضرت مسلم کی شہادت کے بعد (حضرت ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کے روکنے کے باوجود) حضرت امام حسینؓ ذی الحجہ ۶۰ھ میں مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے،

خطبۂ امام عالی مقام

مقام بیضہ میں آپ نے ایک دل ہلا دینے والا خطبہ دیا، جو اپنی صداقت، بینائی اور اثر انگیزی کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے، یہ بڑا طویل خطبہ ہے، لیکن اس کی رُوح یہ ہے ـــــ "لوگو جس نے ظالم ـ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرنے والے ـ خدا کے عہد کو توڑنے والے ـــ خدا اور رسول کے مخالف، اور ـــ خدا کے بندوں

پر ظلم اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا، اور قولاً وعملاً اُسے غیرت نہ آئی تو خدا کو
حق ہے کہ اس شخص کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کر دے!"
آگے چل کر آپ نے فرمایا: "ان لوگوں نے (بنو امیہ نے) شیطان کی اطاعت اختیار کی، رحمٰن کی اطاعت
چھوڑ دی، ملک میں فساد پھیلایا۔ حدود الٰہی کو معطل کر دیا، مال غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں، خدا
کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام، اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے، اس لئے مجکو غیرت آنے کا حق
زیادہ ہے!"
اس تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام حسینؓ نے یزید کی بیعت کیوں نہیں کی؟ جہاد پر کیوں آمادہ
ہوتے، رفقا کے مشوروں کو کیوں قبول نہیں فرمایا؟

کربلا میں قیام

۲ محرم ۶۱ھ کو قافلہ کربلا میں خیمہ زن ہوا، ۳ کو ابن سعد فوج گراں لے کر
کربلا پہنچا، ۷ محرم کو اس نے دریائے فرات پر پہرہ بٹھا دیا کہ خاندان رسولؐ کو پانی
کا ایک قطرہ نہ مل سکے، ابن زیاد نے ابن سعد کی مدد کے لئے شمر ذی الجوشن کو بھی بھیج دیا، ۹ محرم کو ابن
سعد نے پھر حضرت امام کو بیعت کی ترغیب دی لیکن آپ نے انکار کر دیا، آپ جانتے تھے اب کیا ہونے والا
ہے، لہٰذا اپنے ساتھیوں کو اجازت دی کہ جس کا جی چاہے واپس چلا جائے لیکن جاں نثاران اہل بیت نے
ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

جنگ کا آغاز

۱۰ محرم ۶۱ھ ۷۲ سرفروشوں کا قافلہ میدان میں آیا۔
جنگ شروع ہوگئی!
ایک طرف ۷۲ نفوس قدسی دوسری طرف چار ہزار کا لشکر —— لیکن ان ۷۲ نے سہ ہزار کے چھکے چھڑا دیئے
جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ حضرت امام حسینؓ شہید ہو چکے تھے، خاندان رسالت کے بیس نفوس اللہ کی راہ میں
اپنی جان قربان کر چکے تھے، اب اس قافلہ میں صرف عورتیں تھیں، چند بچے اور ایک عابد بیمار!

نعش بے سر

حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیا گیا، اور نعش بے سر
کربلا میں دفن کر دی گئی[1]

[1] طبری

یزید کا اظہار افسوس

یزید نے اس خبر پر اظہار افسوس کیا، پھر جب اہل بیت کا لٹا ہوا قافلہ شام پہنچا تو اس نے امام عالی مقام کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا،

"افسوس! انہوں نے اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء کا خدائی فرمان نہیں پڑھا تھا،"

یزید کا برتاؤ

یزید کے گھر میں یہ قافلہ ٹھہرا، امام زین العابدین کو وہ اپنے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھلاتا تھا، اموی فوج کے سپاہیوں نے اہل بیت کا جتنا سامان لوٹ لیا تھا، یزید نے وہ سب مع شے زائد واپس دلوا دیا، پھر اس نے اس قافلہ کو مدینہ بھیج دیا،

شاید اس لئے کہ اپنی سلطنت کے قیام و استحکام کے لئے جو کچھ وہ کر گزرا تھا، اور ضمیر کی خلش، ملاطفت کا رنگ نہ اختیار کرلے؟

سبِّ علیؓ

امیر معاویہ کے دورِ حکومت میں کئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں، اور خوب پھلیں پھولیں انہی نئی چیزوں میں ایک چیز تھی، مساجد کے منبروں پر مجمع عام کے سامنے اس دنیا سے اٹھ جانے کے باوجود حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھار،

حجر بن عدیؓ کی شہادت

حجر بن عدیؓ کوفہ کے رہنے والے تھے، ان کا شمار اصحاب نبیؐ میں تھا حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ سے والہانہ محبت رکھتے تھے، مغیرہؓ بن شعبہ پابندی کے ساتھ اس کارنامہ کو انجام دیتے رہتے تھے، ایک مرتبہ حجر بن عدیؓ سے ضبط نہ ہو سکا انہوں نے برابر کا جواب دیا، لیکن مغیرہ معاویہ کی طرح ضابط اور حلیم بھی تھے، ٹال گئے،

سنہ ۵۰ھ میں مغیرہ کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد زیاد بن ابو سفیان کوفہ کا بھی والی قرار پایا، اس نے بھی حضرت علیؓ پر گالیوں کی بوچھار جاری رکھی، اور حجر بن عدی نے بھی مدح علی کا سلسلہ جاری رکھا، آخر زیاد کی تحریک پر امیر معاویہ نے اپنے دارالحکومت میں بلا کر قتل کرا دیا، حضرت عائشہؓ نے امیر معاویہ سے جب وہ حج کے لئے گئے، شکایت کی ــــــ "معاویہ تم کو حجر اور اُن کے ساتھیوں کے قتل پر خدا کا خوف نہ آیا؟[1]"

مروان بن حکم کی دشنام طرازیاں

خاص مدینۃ الرسولؐ میں مروان بن حکم جمعہ کے دن منبر پر چڑھ کر حضرت علیؓ کی شانِ گرامی میں گالیاں بکتا تھا، حضرت امام حسنؓ اس کی ہرزہ سرائیوں کو سنتے تھے، اور خاموش رہتے تھے، ایک مرتبہ اُس نے ایک شخص کی زبانی نہایت فحش باتیں کہلا بھیجیں، آپ نے سن کر صرف اس قدر جواب دیا کہ اس سے کہہ دینا خدا کی قسم، میں تجھے گالی دے کر تیری دشنام طرازی کا داغ ہلکا نہ ہونے دوں گا، ایک دن میں اور تو دونوں خدا کے حضور میں پہنچیں گے، اگر تو سچا ہے تو خدا سے اجر پائے گا، جھوٹا ہے تو وہ سب سے بڑا منتقم ہے،

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ اخبار الطوال۔

عمرؓ بن عبد العزیز کی ممانعت

امیر معاویہ کے زمانہ سے عمر بن عبد العزیز کی تخت نشینی تک ہر جمعہ کے خطبہ میں سبِ علی کا رواج عام تھا یعنی حضرت علی کو گالیاں ضرور دی جاتی تھیں،

عمر بن عبد العزیز نے اس مذموم رسم کو بالکل بند کر دیا، اپنے تمام عمال کے نام فرمان جاری کیا کہ آئندہ سے حضرت علیؓ مرتضیٰ کی شان میں کوئی نا ملائم لفظ نہ استعمال کیا جائے۔

اگر حالات سازگار ہوتے اور عمر بن عبد العزیز کو زیادہ مدت تک بغیر کسی خدشہ کے حکومت کرنے کا موقع ملتا تو شاید وہ بہت سی کوتاہیوں اور گمراہیوں کی تلافی کر دیتے لیکن اپنے اعمال صالحہ کی ذرا سی جھلک دکھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اہلِ بیتِ نبوی

اہلِ بیت نبوی کے ساتھ امیر معاویہ کا برتاؤ بہر حال غنیمت تھا، کم از کم وہ خود اپنی ذات سے نسبتہً اچھا برتاؤ کرنے کی کوشش کرتے تھے، بے حد حلیم الطبع تھے اس لئے ان کی کھری کھری باتیں بھی چپ چاپ سُن لیتے تھے۔

(۱)

حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کو ایک بار چالیس ہزار روپے کی ضرورت پیش آئی، آپ نے حضرت علی سے کہا علی کی نگاہ میں بیت المال مسلمانوں کا تھا، کسی کی ذاتی ملک نہ تھی، معذرت کر دی، معاویہ نے یہ رقم پیش کر دی

(۲)

حضرت علیؓ کی چچازاد بہن اروی نے ایک مرتبہ امیر معاویہ کو خوب خوب سنائیں، ابوسفیان پر بھی طنز کے تیر پھینکے، عمرو بن العاص بیچ میں بولے تو ان کی ماں اور نسب کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے انکشاف کیا، امیر معاویہ خاموشی سے سب سنتے رہے، پھر ان سے اپنائیت کی باتیں کیں، اور چھ ہزار درہم پیش کر دیئے،

(۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ امیر معاویہ کے سخت مخالف تھے، اور اس مخالفت کا ہر موقع پر اظہار و اعلان بھی کرتے رہتے تھے، ایک مرتبہ انہیں اس کے باوجود امیر معاویہ نے دس لاکھ درہم عطا کئے۔

ایک مشہور اور مستند شیعی مؤرخ —— نے لکھا ہے —— "اشراف و اعیان قریش میں عبداللہ بن عباس عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن جعفر طیار، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، آبان بن عثمان اور آل ابی طالب کے بہت سے افراد، معاویہ کے پاس دمشق آیا کرتے تھے، معاویہ ان سب کی خاطر مدارات کرتے تھے، مہمان نوازی کرتے تھے، ان کی ضروریات و احتیاجات پورے کرتے تھے، حالانکہ یہ لوگ ہمیشہ ان کے ساتھ تند و تیز گفتگو کرتے تھے امیر معاویہ ان باتوں کو کبھی مذاق میں اڑا دیتے تھے کبھی سُنی کی اَن سُنی کر دیتے تھے، اور ان کی خدمت میں بیش قیمت تحائف اور بڑی بڑی رقمیں پیش کیا کرتے تھے،

حرمین کی بے حرمتی

کعبہ خدا کا گھر ہے، یثرب، مدینۃ الرسول ہے، لیکن ملوک بنی امیہ کے عہد میں نہ خدا کا گھر بچا، نہ رسول کا شہر، مدینہ کی بے حرمتی بھی ہوئی، اور خانۂ کعبہ کی بھی، مدینہ کو لوٹنے والے، اور کعبہ پر آگ برسانے، دیار رسول کے رہنے والوں کو بے حجابانہ قتل کرنے والے اور جوار خداوندی میں پناہ گزیں لوگوں کا محاصرہ کرنے والے، اور بیت عتیق پر آتش باری کرنے والے لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، لیکن انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی مدینہ اور مکہ کی وہ بے حرمتی کی جو ابرہۃ الاشرم بھی شاید نہ کر سکا تھا، جس کی مثال نہ عہد جاہلیت میں ملتی ہے، نہ عہد اسلام میں، جو تاریخ کا ایسا ناپاک واقعہ جو اپنی مثال خود آپ ہے، یہ ایسا دلدوز، جگر فگار، اور الم انگیز سانحہ ہے، جو اسلام کی تاریخ میں، ——— نہیں انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، بہر حال یہ واقعہ ہوا ——— اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔

امیر معاویہ کے بعد یزید کے عہد میں حرمین شریفین یعنی مکہ اور مدینہ کی حرمت تک باقی نہ رہی، گو یزید خلیفۃ المسلمین تھا! لیکن مسلمانوں کا حرم مقدس بھی اس کی ترکتازیوں سے محفوظ نہ رہا۔

یوں تو سنہ ۴۰ھ میں امیر معاویہ کے کارندے بسر بن ارطاۃ نے بھی مدینہ میں مکانات ڈھائے تھے، مظالم کئے تھے لیکن یزید کا دور بہت آگے نکل گیا،

ابن زبیرؓ نے حجاز سے امویوں کو نکال دیا، سارے حجاز نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، یہ خبر سنکر یزید سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے مسلم بن عقبہ کو دس ہزار فوج کے ساتھ حجاز روانہ کیا، اور تاکید کر دی کہ اہل مدینہ اگر بیعت سے انکار کریں تو تلوار سے کام لینا، انہیں شکست دینے کے بعد تین دن تک مدینۃ الرسول کو لوٹنا،

مسلم بن عقبہ نے بڑی مستعدی سے یزید کے احکام کی پیروی کی، انصار و مہاجرین کے اکابر و اشراف کو اس نے قتل کیا، اور تین دن تک مدینۃ الرسولؐ کو اس کی فوجیں لوٹتی رہیں، اور تین دن کی لوٹ، اور قتل عام کے بعد بھی اس کا جی نہ بھرا اس نے اعلان کیا جو شخص یزید کی بیعت نہیں کرے گا، وہ قتل کر دیا جائے گا۔

مدینہ کو تباہ کر کے مسلم بن عقبہ براہِ راست ابن زبیر کے مقابلہ کے لئے مکّہ کی طرف اپنا لشکر لے کر بڑھا لیکن راستے میں مر گیا، اس کا قائم مقام حصین بن نمیر بنا، یہ محرم ۶۴ھ میں مکہ پہنچا، ابن زبیرؓ حرم محترم میں معتکف تھے، اس نے کعبہ کا محاصرہ کر کے سنگباری شروع کر دی، اس حرکت سے خانۂ کعبہ کی عمارت کو بہت نقصان پہنچا، محاصرہ کے دوران میں یزید کا انتقال ہو گیا۔ اس تغیر حکومت سے ابن زبیرؓ کو بڑا اچھا موقع مل گیا تھا کہ اپنی حکومت مستحکم کر لیں، لیکن انہیں شامیوں سے آتنی کد، اور امویوں سے اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ انہوں نے نہ شام جانا پسند کیا، نہ امویوں کی رفاقت قبول کی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گرتی ہوئی عمارت پھر مستحکم ہو گئی، اور جب مستحکم ہو گئی تب ۷۲ھ میں عبدالملک نے حجاج بن یوسف ثقفی کو، ابن زبیرؓ کے مقابلہ کے لئے بھیجا، اس نے مکّہ کا محاصرہ کیا، اور خانۂ کعبہ پر سنگ باری شروع کر دی، محاصرہ نے بہت طول کھینچا، حالات بدلنے لگے محاصرہ کی سختی کی تاب نہ لا کر ابن زبیر کے دس ہزار ساتھی اموی حکومت سے مل گئے، خود ابن زبیر کے بیٹے ان کا ساتھ نہ دے سکے، لیکن ان کے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا، جمادی الثانی ۷۳ھ میں بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

اس واقعہ حرہ کے بعد از راہ انتقام اہل مدینہ پر مظالم کی بارش عمال بنی امیہ کر رہے تھے، ہر مدنی گویا اپنے گھر میں محبوس و محصور تھا،

یہ منظر صحابی رسول حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے نہ دیکھا گیا، وہ مدینہ سے چل کر دمشق پہنچے، اور عبدالملک سے کہا ——— "امیر المومنین، مدینہ منورہ جس حال میں ہے آپ کو خوب معلوم ہے، آں حضرتؐ نے اپنے اس شہر کا نام "طیبہ" یعنی پاک شہر رکھا تھا، امیر المومنین اگر صلۂ رحمی کے خیال سے اہل مدینہ کا حق پہچان لیں تو اچھا ہے"———

عبدالملک یہ سن کر و فور طیش سے آگ بگولا ہو گیا، اسکا چہرہ غصّہ سے تمتما اٹھا، حضرت جابرؓ اپنے نابینا ہونے کے باعث اسکی یہ کیفیت نہ دیکھ سکے، قریب تھا کہ وہ آپ کی شان میں بھی گستاخی کرتے کہ عبدالملک کے مقرب بارگاہ، اور حضرت جابرؓ کے شاگرد قبیصہ ہاتھ پکڑ کر آپ کو باہر نکال لائے، اور فرمایا: "یا ابا عبد اللہ ان ھولاء القوم صاروا ملوکا۔ یعنی یہ خلفائے بنو امیہ اب خلیفہ نہیں رہے بادشاہ بن گئے ہیں۔

[1] طبقات ابن سعد

غدر وفریب

ہر دور میں حتیٰ کہ عہد جاہلیت تک میں عربوں کی ایک بہت بڑی اور لائق رشک و تقلید خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بات کے دھنی اور قول کے پکے تھے، جو بات کہہ دی وہ پتھر کی لکیر ہوگئی، خاص طور پر امان دینے کے معاملہ میں تو وہ اتنے جذباتی حساس اور مستقل تھے کہ خواہ خود مٹ جائیں، سارا خاندان تباہ ہو جائے، ننھے ننھے بچے قتل ہو جائیں، بھائی بہن، بیوی کا گلا کاٹ ڈالا جائے لیکن جسے ایک دفعہ امان دے چکے، پناہ دے چکے، پھر وہ جب تک زندہ رہتے تھے اسے واپس نہیں لیتے تھے، اگرچہ جسے پناہ اور امان دی ہے وہ کتنا ہی بڑا خاطی اور گناہگار اور مجرم کیوں نہ ہو، اگرچہ اس نے خود پناہ دینے والے کو اس سے پہلے کتنا ہی عظیم اور ناقابل فراموش صدمہ کیوں نہ پہنچایا ہو، اگرچہ اس کی گرفتاری اور سزا یابی خود پناہ دینے والے کے لئے کتنی ہی موجب انعام و بخشش کیوں نہ ہو لیکن ——،

لیکن بنو امیہ کے عہد حکومت میں امان کی پابندی اور پناہ کا نباہ بھی شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔

ابن زیاد کی اماں شکنی

ابن زیاد نے محمد بن اشعث کو مسلم کی گرفتاری کے لئے بھیجا، محمد نے جان بخشی کا وعدہ کیا کیونکہ وہ جان پر کھیل کر مقابلہ پر ڈٹ گئے تھے) اور ابن زیاد کے پاس لے آیا ابن زیاد نے اماں کی ذرا پرواہ نہ کی، اور مسلم کو قتل کر دیا۔

عبدالملک کا غدر

عبدالملک نے عمرو ابن سعید اموی کو جو ولی عہد خلافت تھا، دھوکے سے بلایا، آدمی پہلے سے چھپا دیئے تھے جیسے ہی عمرو پہنچا عبدالملک نے اس کو زنجیروں میں کسوا کر قتل کر دیا، وہ بیچارہ چیخنے لگا "یہ دھوکہ ہے"! عبدالملک نے کہا "ایک ملک میں دو حکمران نہیں رہ سکتے"!

حجاج کی فریب کاری

حجاج نے فوج کی تنخواہ گھٹا دی، ایک فوجی ابن جارود نے مخالفت کی، فوج نے اس کا ساتھ دیا، مقابلہ ہوا، ابن جارود ایک تیر کھا کر ختم ہو گیا، حجاج نے امن عام کی منادی کرا دی، انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، اس کے بعد حجاج نے تمام مشتبہ اور سرغنہ آدمیوں کو قتل کر دیا، ——

بیت المال

رسول اللہؐ کے عہد گرامی میں بیت المال کی یہ کیفیت تھی کہ ایک پائی بھی مقررہ مصارف کے علاوہ کسی اور مد میں نہیں خرچ ہو سکتی تھی خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد باسعادت میں بیت المال کی یہ کیفیت تھی کہ وہ خود زمانہ کے شدائد سہتے تھے، ہر طرح کی تکلیفیں اٹھاتے تھے، اپنے خاندان والوں کو ہدف مصائب دیکھتے تھے، مگر کبھی بھی انہوں نے بیت المال کی آمدنی کو اپنی ذاتی آمدنی نہ سمجھا، ایک ایک پائی کے صرف میں وہ خدا سے ڈرتے رہے، اپنے حکام و عمال کا سختی سے محاسبہ کرتے رہے،

بیت المال کی آمدنی سے وہ غریبوں کی رکھوالی کرتے تھے، بیواؤں کی مدد کرتے تھے، غریبوں اور مسکینوں کی خبر گیری کرتے تھے، فاقہ مستوں اور تباہ حالوں کی حاجت روائی کرتے تھے مگر کبھی بھولے سے بھی یہ بات ان کے دل میں نہیں آئی کہ اس رقم سے وہ اپنے یا اپنے اہل خاندان یا اپنے دوستوں کے لئے امارت اور تنعم کے سامان بھی مہیا کر سکتے ہیں، لونڈی اور غلام بھی خرید سکتے ہیں، رقص و موسیقی کے مراکز بھی قائم کر سکتے ہیں، گویوں، سازندوں، مسخروں اور درباری شاعروں پر ابر کرم بھی برسا سکتے ہیں،

ہاں ——— انہوں نے یہ کچھ نہیں کیا، لیکن ان کے بعد آنے والوں نے یہ سب کچھ کیا، اور جی بھر کے کیا۔

علی مرتضیٰ کا ترکہ

خلافت راشدہ کی آخری کڑی حضرت علی مرتضیٰ تھے، آپ کی تدفین کے بعد حضرت امام حسن نے ایک خطبہ دیا فرمایا ——— کل جو شخص تم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوا ہے، (فضائل و مناقب کے لحاظ سے) نہ اس کے پیش رو اس سے آگے جا سکے، نہ پس رو اس تک پہنچ سکیں گے، آنحضرتؐ اس کو اپنا پرچم عطا فرماتے تھے، اور معرکہ آرائی کے لئے روانہ کرتے تھے، وہ کبھی جنگ سے ناکام نہیں لوٹا میکائیل اور جبرئیل، اس کے چپ و راست چلتے تھے) اس نے (دنیا سے رخصت ہونے کے بعد) صرف سات سو درہم چھوڑے ہیں، جو اس نے اپنی تنخواہ سے بچائے تھے، اس کے سوا سونے چاندی کا کوئی ٹکڑا نہیں چھوڑا ہے، یہ رقم بھی

اُس نے ایک جا کر مہیا کرنے کے لیے جمع کی تھی[1]!

حضرت علی مرتضیٰؓ کے مابعد خاندانِ امیّہ برسرِ حکومت ہوا، اس خاندان نے بیت المال کے ساتھ کیا سلوک کیا اس کے زمانہ میں بیت المال کس طرح دفعتہً خزانۂ شاہی بن گیا، یہ ایک پُردرد داستان ہے، لیکن دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی،

ایک لاکھ دینار

سلیمان بن عبدالملک نے سعید بن خالد کو، اس صلہ میں کہ اُنھوں نے آڑے وقت میں ایک شاعر کی قصیدہ خوانی سے متاثر ہو کر اس کی تیس ہزار دینار سے مدد کی تھی، شاعر کے حسنِ بیان سے متاثر ہو کر ایک لاکھ دینار انعام اور بخشش کے طور پر مرحمت فرمائے[2]،

طریح پر نوازشیں

طریح بن اسمٰعیل الثقفی ولید بن یزید کا درباری شاعر تھا، اپنے ممدوح کی مدح میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا، ایک ایک شعر پر انعام پاتا تھا، ایک ایک قصیدہ پر سیم و زر سے ہمیانیاں بھر لیتا تھا، اور یہ سب رقم اسے بیت المال سے ملتی تھی مستحق اور ضرورتمند منہ دیکھتے رہ جاتے تھے، اور یہ اپنی طلاقتِ لسانی سے بازی لے جاتا تھا[3]،

حماد الراویہ

حماد بن میسرہ لغت، نسب اشعار اور عربوں کی تاریخ حرب اختلاف اور ان کے گزرے واقعات کا بڑا ماہر تھا، ملوک بنی امیہ اس پر بہت مہربان رہتے تھے، ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے اس کے ایک شعر سے متاثر ہو کر اسے بیت المال کے روپیہ سے دو خوب صورت کنیزیں مرحمت فرمائیں، اور کئی تھیلیاں سونے چاندی سے بھری ہوئی مرحمت فرمائیں[4]

کمیت شاعر

یہ بہت بڑا شاعر تھا، شعر و شاعری، لغت عرب، تاریخ عرب، اور قصص عرب کا ماہر تھا اپنے تشیع میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی، بنو ہاشم سے اسے شغف تھا، بنو امیہ کی خوب خوب ہجو کرتا تھا، اور سادات بنی فاطمہ کی شان میں قصائد کہا کرتا تھا، ایک مرتبہ اُس نے کہا،

"خدا ان لوگوں کو بھوکا رکھے جنھیں بنو امیہ شکم سیر کریں اور ان لوگوں کو شکم سیر کرے جو بنو امیہ کے جور و ظلم کے باعث بھوکے ہوں!"

---

[1] ابن سعد [2] [3] [4] روایات الاغانی،

ایک مرتبہ یہ ہشام بن عبدالملک کے قبضہ میں آگیا، تب چھوڑا، جب اپنی شان میں چند فی البدیہہ شعر کہلوا لیئے، پھر تالیف قلب کے لیئے اور بنو ہاشم سے روگرداں کرنے کے لیئے (کہ وہ زرپاشی نہیں کرسکتے تھے) کمیت کو چالیس ہزار درہم، اور تیس ہشامی خلعتیں اس کی بیوی کو بیس ہزار درہم، اور بیس ہشامی خلعتیں[1] مسلمانوں کے بیت المال سے عطا فرمائیں۔

جریر کی قدر افزائی ایک مرتبہ عبدالملک نے جریر شاعر کو چار ہزار درہم، اور بہت سا ساز و سامان خوش ہو کر (بیت المال سے) مرحمت فرمایا[2]۔

عبدالملک اور عاتکہ ایک مرتبہ عبدالملک سے اس کی بیوی عاتکہ (یزید بن معاویہ کی بیٹی) روٹھ گئی، وہ بہت پریشان ہوا، دربار کے ایک مصاحب نے اپنی دلچسپ حرکتوں سے دونوں میں ملاپ کرا دیا۔

عبدالملک نے کہا،

"کیا مانگتے ہو؟"

مصاحب (عمرو بن ہلال) نے عرض کیا،

"بہت سی زمین اسے برتنے کا ساز و سامان، ایک ہزار دینار اپنے اور اپنی آل اولاد اور عزیزوں کے لئے وظائف ———!"

عبدالملک نے یہ منہ مانگا انعام فوراً (مسلمانوں کے بیت المال سے) مرحمت فرمایا[3]۔

ابن سریج پر عنایت ولید بن عبدالملک، بھی شعر و شاعری، اور موسیقی کا بہت بڑا قدردان تھا، مشہور گویا ابن سریج اسے بہت پسند تھا، ایک مرتبہ اس نے اپنے دربار میں ابن سریج کو طلب کیا، اس کی زبان سے اپنی تعریف میں اشعار آبدار سنے، پھر خوش ہو کر اسے اتنا نوازا، ایسا نوازا کہ اس کے حسب الحکم "ابن سریج خلعت فاخرہ سے ڈھانپ دیا گیا، اس کے سامنے دیناروں اور درہموں کی تھیلیاں ڈھیر کر دی گئیں[4]۔"

---

[1] [2] [3] [4] روایات الاغانی

شعر ایک ہزار
ولید بن یزید خاندان بنو امیہ میں اپنے افعال ناشائستہ کے اعتبار سے سب پر بازی لے گیا تھا، بے حد فضول خرچ تھا، شعرا کا بڑا قدردان تھا، اس کے جشن تخت نشینی کے موقع پر ایک شاعر یزید بن منبہ نے ایک قصیدہ پیش کیا، یہ قصیدہ ولید کو اتنا پسند آیا کہ ہر شعر کے بدلے میں ایک ہزار روپیہ انعام دیا، قصیدہ میں کل پچاس شعر تھے، اس طرح اسے مسلمانوں کے بیت المال سے جو امور خیر کے لئے تھا، ایک شاعر نے چشم زدن میں پچاس ہزار وصول کر لئے۔

عمر بن عبدالعزیز کا اعتراف
عمر بن عبدالعزیز جب مسند آرائے خلافت ہوئے، تو تمام لوگوں سے پہلے انہوں نے بیت المال کو اس کا حق واپس دلا دیا، سب سے پہلے اپنے گھر کی طرف توجہ کی، ان کی بیوی فاطمہ کو ان کے والد عبدالملک بن مروان نے ایک قیمتی ہیرا دیا تھا، آپ نے فاطمہ سے کہا —— "یا تو اس ہیرے کو بیت المال میں داخل کر دو، ورنہ مجھے دستبرداری منظور کر لو!"

وفادار بیوی نے اسی وقت بیت المال کی امانت بیت المال کو واپس کر دی!"

بیت المال سے اموی خاندان کے لوگوں کو جو بیش قرار وظائف ملتے تھے، ان کا سلسلہ یکسر بند کر دیا، شاہی جاہ و جلال اور دبدبہ و طنطنہ کے مظاہرے کے لئے جو مصارف ہوتے تھے ان کا خاتمہ کر دیا، تمام شاہی سواریاں فروخت کر دیں قیمت بیت المال میں داخل کر دی، اپنا سارا ذاتی سامان حتیٰ کہ لونڈی غلام تک فروخت کر دیئے، اور جو قیمت ہاتھ آئی، وہ بیت المال کے حوالے کر دی۔

بیت المال کی شمع
عمر بن عبدالعزیز رات کو جب تک خلافت کا کام کرتے تھے اس وقت تک بیت المال کی شمع جلتی تھی، جب کام سے فارغ ہوتے تھے فوراً شمع گل کر دی جاتی تھی، پھر اگر ضرورت ہوتی اپنا ذاتی چراغ جلواتے تھے۔

سیب کا ایک دانہ
ایک بار بیت المال میں بہت سے سیب آئے، آپ کے ایک چھوٹے بچہ نے ایک سیب اٹھا لیا، آپ نے فوراً اس سے چھین لیا، وہ روتا ہوا ماں کے پاس گیا، انہوں نے بازار سے منگا دئیے، گھر میں آئے تو سیب کی خوشبو ناک میں آئی، بیوی سے پوچھا، انہوں نے
[illegible]

لہو و لعب

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے حکام و عمال کو تاکید کی تھی کہ وہ بے چھنا ہوا آٹا نہ استعمال کریں، ترکی گھوڑے پر بغیر زین کے بیٹھیں، زندگی میں سادگی کو مقدم رکھیں، لیکن خلافتِ راشدہؓ کے بعد جو دورِ حکومت شروع ہوا اس میں راگ رنگ، لہو و لعب، عیش و تنعم اور رندی و سرمستی کا شمار ضروریاتِ حیات میں ہونے لگا تھا،

گھڑ دوڑ کا شوق

ہشام بن عبدالملک کو گھوڑوں اور گھڑ دوڑ کا بڑا شوق تھا، وہ گھوڑوں کی پرورش اور پرداخت پر بڑی توجہ کرتا تھا، اس کے پاس گھڑ دوڑ کے (۴ہزار) بہترین اور منتخب گھوڑے (ابن اثیر کے بیان کے مطابق) تھے۔

موسیقی سے شغف

ولید بن یزید موسیقی کا بڑا دلدادہ اور شائق تھا، اس کے دربار میں گویئے اور ساز ندے ۱ابن سریج، معبد، عریض، ابن عائشہ، ابن محرز، طویس، ۱ور رحمان وغیرہ کا جماؤ رہتا تھا، عربی ادب کی مشہور اور ضخیم کتاب آغانی میں ان گویوں، موسیقاروں کے "کمالاتِ فن" اور ان کے سرپرستوں کی ولدوہش کی طویل داستانیں بڑے مزے لے کر کی گئی ہیں،

صبا رفتار گھوڑے

ولید بن یزید گھوڑوں کا بھی بہت شیدا تھا، اس معاملہ میں یہ ہشام بن عبدالملک سے بھی کئی قدم آگے تھا، اس نے بڑے اچھے گھوڑوں کا جو ذخیرہ جمع کیا تھا مؤرخین مانتے ہیں کہ وہ وقت کے بہترین گھوڑے تھے، اور گھڑ دوڑ کے میدان میں اپنی صبا رفتاری کے جھنڈے گاڑ دیتے تھے

رنگ رلیاں

تاریخ کی کتابیں عام طور پر اور فن غنا و موسیقی کی عربی انسائیکلوپیڈیا الاغانی خاص طور پر ان رنگ رلیوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں،

آشنا ہو،
دیا روں اور دورِ ہم
فتنۂ خلافت راشدہ کے بعد فتنے کا دروازہ بند ہو گیا، اور آزادی اور بے حجابی کا دور دورہ شروع
(جو گنا، کیجئے خراب ہے آج!)

ــــــــــــــ

لہ ٹہ تہ سہ روایات الاز

شانِ ملوکیت

۱۔ امیر معاویہ نے قیصر و کسریٰ کے دربار کے کروفر قائم کر رکھے تھے، وہ تخت شاہی پر
جلوہ فرما ہوتے۔ تخت حفاظت کے لئے پولس کا انتظام تھا۔ اس سے قبل خلوت
لئے بھی خاص انتظام تھا۔ امیر معاویہ کا دربار ساسانیوں کے دربار کی جیتی جاگتی تصویر
تھی۔ آپ نے حضرت علیؓ کے الم انگیز حادثۂ شہادت سے متاثر ہو کر مسجد میں نماز پڑھنے کے
لیے مخصوص حجرہ تعمیر کرایا تھا۔ جہاں آپ تنہا نماز پڑھتے تھے، جب سجدے میں جاتے تھے
تو محافظ ننگی تلواریں لئے کھڑے رہتے تھے۔" (النظم الاسلامیہ)

معاویہ سے ایک سوال

ایک مرتبہ حضرت مقدام بن معدی کرب اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ
معاویہ سے ملے، اور کہا "میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا
ہوں کیا آنحضرتؐ نے ریشم پہننے کی ممانعت نہیں کی ہے"؟ معاویہ نے جواب دیا، ہاں کی ہے، دریافت کیا
تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا آنحضرتؐ نے سونے کے استعمال کی ممانعت نہیں کی ہے؟ جواب د
کی ہے، سوال کیا میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا آنحضرتؐ نے درندوں کی کھال پہننے ا
اور بچھانے سے منع نہیں کیا ہے؟ کہا، ہاں کیا ہے، مقدام نے کہا، معاویہ خدا کی قسم یہ تمام چیز
تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں، معاویہ نے کہا، مقدام مجھے یقین ہے کہ میری تمہارے سامنے ایک پیش
جائے گی، پھر انہیں ان کے دونوں ساتھیوں سے زیادہ صلہ دیا۔

مسجد میں شکوہِ شہریاری

ثم یخرج فیقول یا غلام اخرج الکرسی فیخرج الی
المسجد فیوضع فیسند الی المقصورة و یجلس علی

یقوم الاحداث

معاویہ گھر سے نکلتے تو غلام کو کرسی نکالنے کا حکم دیتے، چنانچہ مس

سے ٹیک لگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے، اور ان کے سامنے مقدمات و حادثات پیش کئے جاتے —
مسجد میں مقصورہ بنانا، کرسی پر بیٹھنا، پھر دادرسی کرنا، اسی عہد کی ایجاد تھی!

ہشام بن عبدالملک کا دربار

حماد الراویہ بہت بلند مرتبہ شاعر تھا، تاریخ وفقہ ماہر تھا، ملوک بنی امیہ کا وہ ندیم اور مصاحب مرتبہ اسے ہشام بن عبدالملک کے دربار میں حاضر ہونے کا موقع ملا، وہ کہتا ہے،

"میں ایک وسیع اور کشادہ محل میں حاضر ہوا جہاں سنگ رخام کا فرش تھا ہر دو پتھروں کے بیچ سونے کی پتیاں لگی ہوئی تھیں، یہی حال دیواروں کا بھی تھا، ہشام ایک سرخ رنگ کی مسند پر بیٹھا ہوا تھا، بدن پر سرخ ریشم کی چادر پڑی تھی، مشک اور عنبر کی خوشبو اس کے روئیں روئیں سے چھوٹ رہی تھی، ایک سونے کی کشتری میں اس کے سامنے نافہ مشک رکھا تھا۔ جب اسے ہاتھ میں لے کر الٹتا پلٹتا، سارا دربار خوشبو سے مہک جاتا، میں نے سلام کیا، اس نے جواب دیا، اتنے میں شعلہ جوالہ کی طرح دو کنیزیں برآمد ہوئیں، ایسا حسن و جمال میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ہر ایک کے کانوں میں سونے کے حلقے پڑے تھے، حلقوں میں آبدار موتی جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ اتنے میں امیر المومنین نے صبوحی مانگی، ایک خوش جمال کنیز جام بدست حاضر ہوئی"

یہ اُن لوگوں کا حال تھا جو ابوبکر و عمر کی مسند پر بیٹھے تھے!

انقلابات ہیں زمانہ کے!

دس ہزار دینار کی کنیز

ایک مرتبہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ایک کنیز کا گانا سنا، بہت پسند آیا، فوراً دس ہزار دینار میں اسے خرید لیا۔

رواداری

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کی ایسی تلقین کی کہ یہ چیز مسلمانوں میں اتنی رچ گئی کہ وہ اگرچہ عام زندگی میں اسلام کی تعلیمات کا نمونہ نہ رہ سکے ہوں، لیکن جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، انہوں نے ہی زندگی کے ہر دور میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، بلکہ انہیں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ نوازا، قدر افزائی کی، سرپرستی کی، ترقی کرنے اور ابھرنے کے مواقع دیئے،

یہ کا عیسائی طبیب

امیر معاویہ کا ذاتی طبیب ابن آثال تھا، یہ عیسائی تھا، بعد میں یہ حمص کا کلکٹر بھی مقرر ہوا، سرجون اور منصور رومی کو بھی مالیات کے ذمہ دار مناصب سونپے گئے۔

ایک مرتبہ امیر معاویہ نے کلیسائے یوحنا کو مسجد میں (معاوضہ دے کر) شامل کر لینا چاہا، لیکن عیسائی رضامند نہ ہوئے، باہمہ اقتدار و اختیار، جلال و جبروت امیر معاویہ نے توسیع مسجد کا خیال ترک کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز کا فرمان

اموی دور حکومت میں جو عمال و حکام مقرر ہوئے، ان میں بڑے بڑے سفاک اور ظالم لوگ بھی نمودار ہوئے، حجاج ان بدناموں میں بہت زیادہ مشہور تھا، اس نے خزانۂ شاہی کی آمدنی بڑھانے کے لئے نومسلموں سے بھی جزیہ کا سلسلہ رکھا، حالانکہ قرآن و حدیث کی رو سے کسی مسلمان سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا، لیکن حجاج نے جو چاہا کیا، اور اس نے جو کچھ کیا، اس کے آقاؤں نے اسے سند قبول عطا فرمائی،

لیکن عمر بن عبدالعزیز نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی ایک عام حکم جاری کر دیا کہ مسلمانوں سے ہرگز کبھی اور کسی صورت میں بھی جزیہ نہ لیا جائے، حاکم مصر نے حضرت کو لکھا اس حکم کے باعث مصر کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، اس مرتبہ تو قرض لے کر مصارف کا بندوبست کرنا پڑا، حضرت نے جواب دیا: رسول اللہ کو ہادی بنا کر خدا نے بھیجا تھا، ٹیکس وصول کرنے والا نہیں، لہٰذا جزیہ فوراً منسوخ کر دو

پ نے اپنے فرمان میں یہاں تک لکھ دیا کہ جو ذمی اسلام قبول کرلے اس سے قطعاً جزیہ نہ لیا جائے،

غیر مسلموں کا جزیہ غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ وہی برتاؤ عمر بن عبدالعزیز نے شروع کیا، جو عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین میں ہوتا تھا،

حیرہ کے ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا، بدلے میں وہ بھی قتل کیا گیا۔ ایک مسلمان نے ایک ذمی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا، اسے چالیس دروں کی سزا ملی، اموی خاندان کے جن افراد نے ذمیوں کی جائداد پر قبضہ کر لیا تھا، سب انہیں واپس دلائیں، دمشق کا ایک گرجا ایک مسلمان خاندان کی جاگیر میں شامل ہو گیا تھا، عیسائیوں نے عمر بن عبدالعزیز سے شکایت کی، فوراً واپس کر دینے کا حکم صادر فرمایا، اشعث کی بغاوت کے سلسلہ میں حجاج کا شبہ تھا کہ ذمیوں نے بھی اس کی مدد کی تھی، اس لئے اس نے ان کے جزیہ کی رقم دونی کر دی تھی، یہ اضافہ حضرت نے فوراً ساقط کر دیا، ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے اس زعم میں کہ وہ خاندان شاہی کا فرد ہے، ایک عیسائی سے سخت کلامی کی، عمر بن عبدالعزیز نے ہشام کو ڈانٹ دیا، اس نیک نیتی اور خلوص کا صلہ خدا نے یہ دیا کہ انتہائی ظلم و شقاوت کے باوجود حجاج عراق سے ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ سے زیادہ رقم کسی سال نہ وصول کر سکا، عمر بن عبدالعزیز کے عہد گرامی میں بغیر ظلم و جور کے یہ آمدنی ۱۲ کروڑ سے تجاوز کر گئی، اس لئے کہ رعایا خوشحال تھی اور امن و امان کا دور دورہ اور فارغ البالی عام تھی،

توسیع علوم وفنون

تاریخ میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے، جس نے دنیا کو علوم وفنون سے روشناس کرایا، جس نے پوری بے تعصبی اور رواداری سے کام لے کر غیر مسلموں کے علوم وفنون کی بھی سرپرستی کی اور انہیں پھیلنے پھولنے کے مواقع دیئے، جس نے علم کی توسیع وترقی میں وہ حصہ لیا کہ کوئی بھی قوم اس معاملہ میں ان کی حریف نہیں بن سکتی۔

معاویہ کا کارنامہ سب سے پہلے امیر معاویہ نے عبید بن شریہ سے تاریخ قدیم کی داستانیں سلاطین عجم کے حالات اور زبانوں کے آغاز اور نشو ونما کی تاریخ لکھائی، یہ مسلمانوں میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب تھی[1]

ضبطِ احادیث عمر بن عبد العزیز نے احادیث کے ضبط ونظم کی طرف خاص توجہ کی، مدینہ کے گورنر قاضی ابو بکر بن حزم کو لکھا کہ احادیث نبوی کو لکھ لو، مجھے خوف ہے علما کے ساتھ کہیں علم بھی نہ مٹ جائے۔

یونانی کتاب ایک یونانی کتاب جو فن طب میں تھی، ماسرجویہ نے عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، لیکن اس کتاب کی طرف حکومت نے کوئی خاص التفات نہیں کیا تھا۔ عمر بن عبد العزیز نے اس کی نقلیں کرائیں اور ملک میں شائع کر دیا۔

مجموعہ احادیث ہشام بن عبد الملک کو علم وفن سے بھی لگاؤ تھا۔ اس نے امام زہری سے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا، جو چار سو حدیثوں پر مشتمل تھا، فارسی کی ایک کتاب کا اس نے عربی میں ترجمہ کرایا، یہ ایرانیوں کے علوم وفنون ان کے بادشاہوں کے حالات وسوانح اور سیاسی واقعات وحوادث پر مشتمل تھی،

کیمیا کی ایک کتاب خالد بن یزید بن معاویہ کو علم سے بڑی دلچسپی تھی، فلسفہ اور کیمیا اس کے خاص موضوعات تھے، فن کیمیا پر اس نے کئی مختصر کتابیں لکھیں

[1] فہرست ابن الندیم

ان میں سے کتاب الحرارہ وغیرہ کو ابن ندیم نے دیکھا تھا، اور ان کا اپنی فہرست میں

ارسطو کے خطوط

ہشام بن عبدالملک کے کاتب سالم نے ارسطو کے خطوط کو سے ترجمہ کیا تھا، ارسطو نے یہ خطوط سکندر کو لکھے تھے،

علوم وفنون کی ایجاد و ترویج کا کام صحیح معنی میں تو عہد عباسیہ کی یادگار ہے، لیکن امویوں کے دور میں اس کی داغ بیل ڈالی گئی تھی، کام اگرچہ کم ہوا، لیکن جو کچھ بھی ہوا وہ قابل ذکر بھی ہے اور لائق ستائش بھی،

ایک بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس عہد کے قلمی آثار و نقوش بڑی حد تک دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔

نظمِ حکومت

اصلاحات۔ تنظیم۔ تجدید

امویوں کے عہدِ حکومت میں حکومت کے ضبط و نظم میں خاصی ترقی ہوئی، دفتری تنظیم نے بھی اسی دور میں جنم لیا، عمال، حکام، اور کارندوں کی نگرانی کا مکمل انتظام ہوا، ڈاک کی ترسیل، اور تحصیل وصول میں ایک خاص انتظام پر عمل ہوا، زمینوں کا بندوبست بھی اس دفعہ میں کیا گیا اسلامی سکہ بھی اسی دور میں عالم وجود میں آیا، غرض اس دور کا انداز حکومت ترقی کی طرف ایک نمایاں قدم تھا؛

جہاز سازی کا کارخانہ

امویوں نے اپنے دورِ حکومت میں بعض اصلاحات بھی کیں تعمیری امور بھی انجام دیئے، ایرانی حکومت کو مرتب اور منتظم بھی کیا۔

۵۴ھ میں امیر معاویہ نے مصر میں جہاز سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا بعض دوسرے ساحلی مقامات یعنی اردن اور عکا میں بھی اس طرح کے کارخانے قائم کیے گئے، پولیس کا نظام زیادہ مستحکم ہو گیا، ذرائع خبر رسانی میں توسیع ہوئی، ڈاک پہنچانے کے لئے گھوڑوں کا انتظام کیا گیا، متعدد نہریں بھی کھدائی گئیں جس سے زراعت میں ترقی ہوئی، افریقہ کا مشہور شہر قیروان عہد معاویہ میں عقبہ بن نافع نے آباد کیا تھا،

اسلامی سکہ

۷۶ھ میں عبدالملک بن مروان کے عہد میں پہلی مرتبہ اسلامی سکہ بنا، ورنہ اب تک رومی، ایرانی اور قبطی سکے چلتے تھے، نیز اب تک حکومت کے دفاتر کی زبان یا فارسی تھی یا رومی، لیکن عبدالملک نے یہ رسم ختم کر دی، اور عربی کو رائج کر دیا، حجاج نے اسی کے زمانہ میں واسط نام کا شہر بسایا،

نیا شہر

سلیمان بن عبدالملک نے شام میں ایک شہر آباد کیا جس کا نام رملہ تھا، رملہ کا محلِ وقوع اسے اتنا پسند آیا کہ اسی شہر کو اس نے اپنا پایۂ تخت بنا لیا، یہاں بہت سی سرکاری عمارتیں بن گئیں، دفاتر قائم ہو گئے، چہل پہل اور رونق نے اس کی آبادی، خوبی اور خوشنمائی میں بہت

زیادہ اضافہ کر دیا،

غیر شرعی ٹیکس

عمر بن عبدالعزیز نے جب خلافت کی باگ اپنے مقدس ہاتھوں میں لی، تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جتنے غیر شرعی اور غلط ٹیکس اور محاصل، فرمانروایان بنی امیہ یا ان کے حکام و عمال نے عاید کئے تھے وہ سب منسوخ کر دیئے۔

یزید بن مہلب کو جو بڑے دبدبہ اور طنطنہ کا آدمی تھا، اور جسے سلیمان نے بہت نوازا تھا فوراً خراسان کی گورنری سے معزول کر دیا، کیونکہ خیانت کا جرم اس پر ثابت ہو گیا تھا،

معذوروں کے وظائف

ملک میں جتنے معذور اور مجبور لوگ تھے، عمر بن عبدالعزیز نے ان کی فہرست مرتب کرائی، بیت المال سے ان کے وظائف مقرر کئے، ایک لنگر خانہ قائم کیا، شیر خوار بچوں کے لئے وظائف کا اعلان کیا، نادار قرض داروں کے قرض کی ادائی کا انتظام کیا،

عراق کا بندوبست

حضرت عمرؓ کے زمانہ سے اب تک عراق کا دوبارہ بندوبست نہیں ہوا تھا، یزید بن عبدالملک نے اپنے دور میں عراق کا پھر سے بندوبست کیا۔

افتادہ زمینیں

ہشام بن عبدالملک نے اپنے زمانہ میں افتادہ زمینوں کی طرف خاص توجہ کی، بحریہ کی بھی از سر نو تنظیم کی گئی، بحری بیڑے کی ترقی کے لئے شمالی افریقہ میں جہاز سازی کے کئی نئے کارخانے قائم کئے،

ہشام کے عہد میں کئی نئے شہر بھی بسائے گئے، شام میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام رصافہ رکھا گیا، گرما کا موسم وہ یہیں گزارتا تھا، سندھ کے دو نئے اسلامی شہر منصورہ اور محفوظہ بھی اسی کے دور میں تعمیر ہوئے۔

صوبوں کی تشکیل

عہد بنو امیہ میں سلطنت کی وسعت بہت بڑھ گئی تھی، انتظامی مصالح کے نقطۂ نظر سے امور سلطنت پانچ صوبوں پر مشتمل تھی،

(۱) حجاز، یمن، عرب وسطی،

(۲) مصر

(۳) عراق (عراق عرب اور عراق عجم دونوں) کابل، خراسان، بحرین، عمان، ماوراء النہر، سندھ، پنجاب، یہ ایک صوبہ کے ماتحت تھے جس کا مرکز کوفہ تھا۔

(۴) جزیرہ، آرمینیہ، آذربائیجان اور ایشیائے کوچک کے علاقے۔

(۵) شمالی افریقہ، جس میں اندلس وغیرہ بھی شامل کئے گئے تھے،

نظم و نسق — بنو امیہ کا نظام حکومت چار بڑے بڑے محکموں پر مبنی تھا،

(۱) دفتر خراج۔

(۲) دفتر رسل و رسائل — یہ دفتر صوبوں کے نظم و نسق کی نگرانی رکھتا تھا،

(۳) دفتر پیداوار،

(۴) دیوان خاتم — یہاں خلیفہ کے احکامات کی نقلیں تیار کی جاتی تھیں، پھر انہیں دھاگے سے نتھی کیا جاتا تھا، بعد ازاں لاکھ کی مہر لگائی جاتی تھی، پھر یہ مراسلے محفوظ کر دیئے جاتے تھے۔

ظلم وشقاوت

حکومت، جب حکومت بن جاتی ہے، اس کا رشتہ خدا سے ٹوٹ کر سیاست سے بندھ جاتا ہے، تو اس میں حدود کا خیال نہیں رہتا، خدا کا ڈر جاتا رہتا ہے، خدا کے بنائے ہوئے حدود کی پابندی باقی نہیں رہتی، خدا کے بندوں پر اندھا دھند ظلم ہونے لگتا ہے۔

مسلمانوں کی حکومت جب تک حکومتِ الٰہیہ رہی، عمرؓ اور علیؓ کے قاتل تک پر ظلم نہ کیا جا سکا، لیکن یہی حکومتِ الٰہیہ جب شخصی اور استبدادی حکومت میں تبدیل ہو گئی تو دفعتہً حالات میں زبردست انقلاب ہو گیا اور ظلم وشقاوت کی اتنی فراوانی ہوئی کہ اس کی کوئی غیر معمولی اہمیت نہ رہ گئی، اس کا شمار روزمرہ کے معمولی واقعات میں ہونے لگا۔

ابن زبیر کی لاش

امیر معاویہ کے بعد شقاوت اور سفاکی ظلم اور بربریت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ عبد الملک کے دورِ حکومت میں جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبد اللہ بن زبیر کو شکست دی تو ان کی لاش سولی پر لٹکا دی، یہ لاش حضرت ابوبکر کے نورسے، حضرت اسما بنت ابی بکر کے بیٹے حضرت زبیر جیسے محبوب صحابی رسول کے لختِ جگر، اور حضرت عائشہ کے بھانجے کی تھی، کئی روز بعد جب ادھر سے اسما کا گذر ہوا تو بیٹے کی لاش کو سولی پر لٹکا دیکھ کر فرمایا "شہسوار ابھی سواری سے نہیں اترا؟"

قتیبہ بن مسلم کا سر

قتیبہ بن مسلم بھی جس نے خاقان چین کو حکومت امویہ کا باج گذار بنا دیا تھا: سلیمان کے انتقام سے نہ بچ سکا، اس کی خطا یہ تھی کہ اس نے ولید کی اس رائے کی تائید کیوں کی تھی کہ سلیمان کی ولایت عہد منسوخ کر دی جائے؟ سلیمان کا انداز دیکھ کر اُس نے گردن جھکا کر سر کٹانے کے بجائے میدان جنگ میں قتل ہونے کو ترجیح دی، کٹا ہوا سر سلیمان کے دربار میں بھیج دیا گیا۔

محمد بن قاسم کا قتل

محمد بن قاسم سے بھی سلیمان ناخوش تھا، اس لئے کہ وہ حجاج کا بھانجا تھا جس سے وہ خوش نہیں تھا اور چونکہ حجاج کا انتقال ہو چکا تھا، لہٰذا محمد بن قاسم ہی سے انتقام لیا جا سکتا تھا،

محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا، وہاں اسلام کا پرچم لہرایا، اس شان عدل سے وہاں حکومت کی کہ ہندو اس کا بت بنا کر اظہار عقیدت کرنے لگے۔ لیکن بغیر کسی خطا اور قصور کے سلیمان نے اسے معزول کر دیا معزول ہونے کے بعد وہ واپس آیا، تو قید خانہ کے دروازے اس کے استقبال کے لئے کھلے ہوئے تھے، قید ہونے کے بعد تسکین قلب نہ حاصل ہوئی اور بالآخر وہ وہیں قتل کر دیا گیا۔

موسیٰ بن نصیر کی درگت

موسیٰ بن نصیر وہ سپہ سالار اعظم تھا جس نے سارے اندلس پر اموی حکومت کا پرچم لہرایا، جس نے کروڑ دل ملا مال غنیمت کے طور پر خزانۂ شاہی میں داخل کیا، لیکن سلیمان کے اعتماد کا اہل وہ نہ ثابت ہو سکا موسیٰ جب اندلس کی دولت لے کر شام کی طرف بڑھا تو ولید مرض الموت میں گرفتار ہو چکا تھا سلیمان نے موسیٰ کو لکھا تھا کہ رفتار آہستہ کر دو تاکہ اس وقت دمشق پہنچو جب ولید کی آنکھیں بند ہو چکی ہوں لیکن موسیٰ نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی، اس نے چاہا کہ اپنے آقائے ولی نعمت سے اپنے کارناموں کی داد لے، وہ جب دمشق پہنچا، ولید زندہ تھا، اس نے حوصلہ افزائی اور قدر دانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، پچاس ہزار اشرفیاں انعام دیں، کئی گراں بہا خلعت عطا کئے۔ لیکن وہ چند دن کا مہمان تھا، جلد ہی اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں، سلیمان نے برسر اقتدار آتے ہی دنیا کے اس بہت بڑے فاتح اور جرنیل کو یہ انعام دیا کہ دھوپ میں کھڑا رکھا۔ برسر عام اس کی توہین کی اور کئی لاکھ بدلے کا تاوان اس پر عائد کر دیا۔ جسے وہ نہ دے سکا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیائے دول سے رخصت ہو گیا۔

عبدالعزیز بن موسیٰ کا خون

موسیٰ بن نصیر کا فرزند ارجمند، شجاعت اور تہور میں یکتا، دلاوری اور بہادری میں یگانہ، جذبۂ جہاد سے چور، نشۂ شہادت سے مخمور، سودائے اسلام سے معمور، عبدالعزیز کے کارنامے تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

اندلس کے فتوحات میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہے، جتنا طارق کا، جتنا موسیٰ بن نصیر کا، جتنا کسی فلاں کا
مورخین کا بیان ہے کہ عبدالعزیز کو خود اس کی فوج نے قتل کر دیا تھا، کیونکہ وہ اپنی عیسائی بیوی کے کہنے میں آکر کبھی کبھی خلوت میں تاج پہننے لگا تھا، اس نے اپنی نشست گاہ میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنوایا تھا، جس میں داخل ہوتے وقت، لوگوں کو جھکنا پڑتا تھا، اس سے فوج کو شبہ ہوا کہ وہ عیسائی ہو گیا ہے لہٰذا قتل کر دیا۔

لیکن یہ بات اتنی خلاف عقل و قیاس ہے جسے باور نہیں کیا جا سکتا، خود حضرت عمر کے دور میں امیر معاویہ بادشاہوں کی طرح رہتے تھے، پھر جب اموی سلطنت قائم ہوئی، تو یزید، مروان، ولید اور سلیمان ان میں سے کون بادشاہ نہ تھا، ان کو ان کی فوج نے کیوں قتل نہ کر دیا، اسلام نے کتابیہ عورت سے شادی کی اجازت دی ہے، اس اجازت سے جو مسلمان چاہے فائدہ اٹھا سکتا ہے، چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی لوگوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا، شہید ستم موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کی عیسائی بیوی کے بارے میں یہ شبہ کس بنیاد پر کیا گیا کہ اس نے عبدالعزیز کو عیسائی بنا لیا ہے؟ حالانکہ وہ نماز پڑھتا تھا، مسجد میں جاتا تھا، تلاوت کلام پاک کرتا تھا، روزے رکھتا تھا، علماء کے فتووں کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ موسیٰ کے بعد عبدالعزیز کا اندلس میں اتنے بڑے منصب پر فائز رہنا سلیمان کے مصالح سیاسی کے خلاف تھا، باپ کا حشر دیکھ کر اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اندلس سے دمشق آ جائے گا، لہٰذا اصل بات وہی صحیح نظر آتی ہے جو مورخین کی بعض دوسری روایتوں میں ہے، یعنی عبدالعزیز کے قتل میں سلیمان کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

زید بن علی کی قبر زید بن علی حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے تھے، اور گوشہ عافیت میں معتکف تھے ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک سے اس کی طلب پر ملے، اس نے نہایت خیرہ چشمی کے ساتھ ان کے حسب نسب پر حملہ کیا، الزامات لگائے اور خالد کے پاس کوفہ بھیجنے کی ہدایت کی، انہوں نے حد سے بڑھایا تو وہ ادھر گوشہ گیا، آپ جب وہاں سے واپس آئے، تو آپ کی

زبان پر یہ الفاظ تھے، ـــــ جو شخص زندگی کو محبوب رکھتا ہے، اسے ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑتا ہے!"

ادھر کوفہ کے لوگوں نے جن میں خواص بھی شریک تھے، آپ کو امامت اور خلافت کی دعوت دی، آپ کے رفقاء نے کہا یہ ہمیشہ سے دھوکہ دیتے آئے ہیں، ان پر اعتماد نہ کیجئے، لیکن آپ زندگی سے بیزار ہو چکے تھے، میدان میں اتر پڑے، دوران جنگ میں، ایک تیر پیشانی مبارک پر لگا، اسے نکالتے وقت روح پرواز کر گئی۔

آپ کی نعش مبارک قبر سے نکلوا کر کوفہ کے حاکم نے سولی پر لٹکا دی ـــــ زیدیہ فرقہ انہی حضرت زید کی طرف منسوب ہے حضرت زید کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا قول ہے:۔

خروجه یضاهی	حضرت زید کا بنو امیہ کے مقابلہ میں اٹھ کھڑا ہونا
خروج رسول اللہ	رسول اللہ کی بدر میں تشریف لیجانیکے مشابہ ہے
یوم بلار	دروزق انفیرا

ہشام کی قبر پر ماتم

ولید بن یزید نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ہشام کے تمام عہدے داروں کو برطرف کر دیا، اور ان پر اتنے ظلم ڈھائے کہ وہ ہشام کی قبر پر جا جا کر روتے تھے،

یحییٰ ابن زید کا قتل

ولید بن یزید کے دور میں زید بن علی کے صاحبزادے یحییٰ بن زید مقابلہ کے لئے اٹھے، اس مقابلہ میں یحییٰ کو ناکامی ہوئی، اور وہ قتل کر دیئے گئے، ان کی پوری جماعت بھی تہ تیغ کر دی گئی،

خالد بن عبداللہ کی ہلاکت

خالد بن عبداللہ قسری کو ولید بن یزید نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا، اس لئے کہ اس سے ہشام کے زمانہ کی جو رقم اس نے طلب کی تھی (اور جو خود ہشام نے اس سے نہ لی تھی) وہ نہ ادا کر سکا تھا۔

امام ابراہیم کا قتل اموی خاندان کے آخری خلیفہ مروان الحمار نے امام ابراہیم کو (جو عباسی تحریک کے داعی تھے اور ابو مسلم خراسانی جن کا دست و بازو تھا) گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

حضرت انسؓ سے گستاخی عبدالملک بن مروان نے اپنے عہد خلافت میں حجاج کو پروان چڑھایا، اور حجاج نے سفاکی، درندگی، شقاوت اور خونریزی کا ایسا ریکارڈ قائم کیا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

ایک مرتبہ حجاج نے مشہور صحابی اور رسول اللہ کے خادم خاص حضرت انسؓ کی بر سر دربار سخت توہین کی، ان کی گردن مبارک پر مہر لگائی جو مجرموں اور خطا کاروں کی گردنوں پر لگائی جاتی تھی، حضرت عبداللہ بن مسعود (صحابی رسول) کے قراءت کا مذاق اڑایا کرتا تھا،

امام ابو حنیفہ کو دُرّے کی سزا ۱۲۹ھ میں ابن ہبیرہ عراقین کا گورنر مقرر ہوا، یہ بڑا سخت گیر بھی تھا، اور سیاست دان بھی، اس نے چاہا کہ ان تمام لوگوں کو ممنون و کرم کر لے، جو علما کی حیثیت سے ممتاز ہیں اور عوام پر اثر رکھتے ہیں، یا جو مخالف ہیں جن کا آگے چل کر ان سے مخالفت کرنے کا اندیشہ ہے، امام ابو حنیفہ کے بارے میں اس کا خیال تھا، کہ وہ حضرت زید بن علی کے ہمدرد ہیں، اور واقعہ بھی یہی تھا، اس لئے اس نے امام کے سامنے بھی عہدہ پیش کیا مگر آپ نے ابی و استنکف انکار کر دیا، حالانکہ آپ کے متعدد ہم عصروں نے بے جھجک یہ مناصب قبول کر لیے، امام کے انکار پر وہ بہت برہم ہوا، پہلے انہیں جیل میں ڈال دیا، جب اس پر بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ تو اس نے قسم کھائی کہ امام کو کوڑوں سے پٹوائے گا، اس نے اپنی یہ قسم پوری کی، ایک کوڑے مسلسل امام ابو حنیفہ کے سر پر لگائے گئے، آپ لہو لہان ہو گئے، آخر آپ اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مکہ معظمہ چلے گئے، اور کوفہ اس وقت تک نہ آئے جب تک عباسی بر سر اقتدار نہ آ گئے،

حجاج کی دہشت حضرت ابو بکر جصاص نے اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھا ہے کہ حجاج منبر پر چڑھ جاتا اور اول فول بکنے لگتا، یہاں تک کہ نماز کا وقت قریب قریب جاتا رہتا، نہ خدا سے ڈرتا تھا، نہ مخلوق خدا سے شرماتا تھا،

لا یقول له قائل الصلوٰة	کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کہتا اے شخص
ایها الرجل، والله حال	نماز کا وقت گذرا جا رہا ہے (کیونکہ)
دون ذلك السیف	اس معاملہ میں تلوار اور کوڑا حائل ہو جاتا
والسوط	تھا!

عبدالملک کا اعلان خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں ایک معمولی بدو بر سر منبر خلیفہ وقت کو ٹوک سکتا تھا، اس کی گرفت کر سکتا تھا، اس پر اعتراض کر سکتا تھا، اس کا محاسبہ کر سکتا تھا، لیکن بعد میں یہ کیفیت نہ رہی، عبدالملک نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے اندر، منبر رسول پر کھڑے ہو کر کہا،

والله ما انا بالخلیفة	خدا کی قسم میں کمزور خلیفہ نہیں ہوں
المستضعف والله	خدا کی قسم آج کے بعد اگر کسی نے
لا یامرنی احد بعد	خوف خدا کی مجھے تلقین کی تو میں اس
مقامی هذا اتق الله	کی گردن اڑا دوں گا۔
الا ضربت عنقه	

ارباب حق وصداقت

اسلام کی تاریخ کو ایک عجیب اور قابل فخر امتیاز یہ حاصل رہا ہے کہ ملوکیت، استبدادیت، قہرمانیت، شخصیت اور آمریت کے بدترین سے بدترین دور میں بھی ایسے ارباب حق وصداقت ابھرتے رہے ہیں جنہوں نے حق بات کہنے میں کبھی جھجک نہیں محسوس کی، پھانسی کے تختہ پر جیل کی چار دیواری میں، علانیہ شہر یا گاؤں میں، دربار شاہی میں فوج کی موجودگی میں، تلواروں کی چمک میں، نیزوں، تلوار وشمشیر تیروں کے ہجوم میں نہ اُن کے پاؤں کانپے نہ ان کی زبان لڑکھڑائی، انہوں نے وہی کہا جسے حق سمجھا، وہی کہتے رہے جو ان کی نظر میں حق تھا، سچ تھا!

خلافت راشدہ کے بعد سے لے کر اب تک نہ جانے کتنی حکومتیں بنیں لیکن کسی حکومت کی تاریخ بھی مسلمانوں کے ارباب حق وصداقت سے خالی نہیں ہے، ہر عہد میں، ہر عہد میں وہ اس طرح چمکتے رہے جس طرح اندھیری رات میں بجلی کوندجاتی ہے، اور شعلہ مشتعل ہے بہتوں نے اپنی راہ پالی اور حق کے پرستار بن گئے،

احنف بن قیس! یزید کی ولایت عہد کے سلسلہ میں امیر معاویہ نے احنف بن قیس سے استصواب رائے کیا، انہوں نے کہا اگر سچ کہوں تو آپ کا خوف ہے، جھوٹ بولوں تو خدا سے ڈر لگتا ہے، آپ یزید کے شب و روز کے مشاغل سے خوب واقف ہیں، اس کے خفیہ اور اعلانیہ حالات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں، پھر اگر امت محمدی کے لئے آپ یزید کو بہتر سمجھتے ہیں، تو صلاح ومشورہ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ایسا نہیں سمجھتے، تو خود عالم آخرت کے سفر پر جاتے ہوئے، یزید کو دنیا کا توشہ نہ دے جائیے[1]

ابن زبیر کا جواب! امیر معاویہ نے عبداللہ بن زبیر سے اصرار کیا کہ وہ یزید کی بیعت کریں، اسے ولی عہد تسلیم کریں، اسے خلیفہ کا لقب دے دیں، انہوں نے کہا،

(۱) یا تو رسول اللہ کی طرح کسی کو نامزد نہ کیجئے مسلمان جسے پسند کریں گے منتخب کرلیں گے —

---

[1] طبری

(۲) یا ابوبکر کی طرح ایسے شخص کو نامزد کیجیے جس کا آپ سے کوئی تعلق نہ ہو۔
(۳) یا عمر کی طرح چند آدمیوں میں سے ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دیجیے۔

اس کے علاوہ کوئی چوتھا طریقہ ہم نہیں قبول کریں گے

معاویہ کو نصیحت

ایک مرتبہ ابو مریم آزدی نے معاویہ سے کہا رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ خدا جس شخص کو مسلمانوں کا والی بنائے، اگر وہ ان کی حاجتوں سے آنکھیں بند کر کے پردہ میں بیٹھ جائے، تو خدا بھی قیامت کے دن اس کی حاجتوں کے سامنے پردہ ڈال دے گا۔

سعید بن مسیب کا انکار

سنہ ۸۵ھ میں عبدالملک نے اپنے دو لڑکوں، ولید اور سلیمان کو علی الترتیب ولی عہد بنایا، عام نے بیعت کرلی، لیکن مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیب نے صاف انکار کر دیا، فرمایا میں ایک خلیفہ کی زندگی میں دوسرے خلیفہ کی بیعت نہیں کر سکتا حضرت سعید سے لوگوں کو بہت عقیدت تھی، وہ اپنے زہد و تقویٰ کے باعث بڑے اعزاز و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، حاکم مدینہ ہشام بن عبدالملک نے حضرت سعید پر بڑی سختیاں کیں، ان کے جسم اطہر پر درے لگوائے ان کی تشہیر کرائی، قید کر دیا، لیکن تابعی رسول کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا ہوئی۔

خلیفہ کے روبرو

سنہ ۷۵ھ میں عبدالملک مدینہ آیا، اس کی تقریر کے بعد میں اس کے ایک کارندے نے کھڑے ہو کر گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— جو کچھ سختیاں ہوئیں، وہ تمہاری نافرمانی کے باعث ہوئیں، یہ نتیجہ تھا بنو امیہ اور امیر المومنین کے ساتھ تمہارے ناپسند طرز عمل کا، پھر اس نے کہا، تم وہ لوگ ہو جن کے بارے میں قرآن نے کہا ہے، وہ امن و آسائش کے ساتھ تھے، فراغت کے ساتھ ان کے پاس رزق پہنچتا تھا، مگر انہوں نے خدا کی ناشکری کی اس کا اللہ نے انہیں مزہ چکھایا اور بھوک اور خوف کو ان کا لباس بنا دیا۔

فوراً ہی ایک حق گو بزرگ ابن عبد نے کہا۔

۔ تم جھوٹے ہو، ہم لوگ ایسے نہیں، پوری آیت پڑھو، یہ بھی تو خدا ہی نے کہا ہے، کہ ان کفار کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا، جسے ان لوگوں نے جھٹلایا۔ اس کی سزا میں ان کو عذاب نے آپکڑا

اور وہ لوگ ظالم تھے! ہم لوگ تو خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں!"

رجاء بن حیات کی سچائی

سلیمان بن عبدالملک جب مرض الموت میں گرفتار ہوا، تو اس نے اپنے ایک ننھے سے بچہ ایوب کو ولی عہد مقرر کیا، مشہور محدث رجاء بن حیات سلیمان کی رفاقت میں تھے، انہوں نے بے جھجک کہا۔ خلیفہ ایسے صالح شخص کو بنائیے کہ قبر میں امن حاصل ہے! بات سلیمان کے دل میں بیٹھ گئی چنانچہ اس نے اپنے بعد عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ، اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک کو ولی عہد نامزد کر دیا۔

قول فیصل

معاویہ بن یزید چالیس دن حکومت کرکے جب تخت خلافت سے دستبردار ہوا تو اس نے عامۃ المسلمین کے سامنے ایک تقریر کی۔

"لوگو! میرے دادا امیر معاویہ نے اس ہستی سے حریفانہ مقابلہ کیا، جو آں حضرت کا قرابت مند ہونے کے لحاظ سے ان سے کہیں زیادہ خلافت کا مستحق تھا، میرا اشارہ حضرت علی کی طرف ہے، تم جانتے ہو انہوں نے سب کچھ تمہارے ہی بل بوتے پر کیا تھا، وہ اپنی راہ گئے، اور گناہوں کی گٹھری اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کی موت کے بعد میرے باپ یزید نے خلافت حاصل کی، حالانکہ وہ اُس کا اہل نہ تھا، اس نے اپنی نفسانی خواہشات پر عمل کیا، لیکن موت نے اُسے زیادہ دن تک مہلت نہ دیا، آخر کار وہ بھی اپنے گناہوں کی پوٹلی لے کر قبر میں پہنچ گیا۔"

یہاں تک پہنچنے کے بعد معاویہ بن یزید آبدیدہ ہو گیا کہ اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے، پھر اس نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ احساس ہے کہ یزید کا انجام برا ہے، اس نے آنحضرت کے خاندان کے لوگوں کو شہید کیا، حرم میں قتل و خون ریزی کی، کعبہ کی بے حرمتی کی اور اسے خراب کیا، میں اس بار گراں (خلافت) کا متحمل نہیں ہو سکتا (آپس میں) مشورہ کرکے کسی دوسرے شخص کو اپنا خلیفہ منتخب کر لو!"　　(النظم الاسلامیہ)

تلافی مافات

امیر معاویہ کے دور سے لے کر سلیمان بن عبدالملک کے عہد تک خاندان بنو امیہ کے اقرباء کو بڑی فیاضی اور دریادلی کے ساتھ بیش قیمت جاگیریں عطا کی گئیں، انعامات دیئے گئے، سیم و زر کی تھیلیاں عطا کی گئیں، دوستوں اور ہواخواہوں پر داد و دہش کے ڈونگرے برسائے گئے، عامۃ المسلمین کی دولت مال غنیمت بن گئی تھی، اور اس کے خوب حصے بخرے ہو رہے تھے،

لیکن عمر بن عبدالعزیز کو جو ذاتی جاگیر موروثی طور پر حاصل تھی، اور بہت بڑی تھی، سب سے پہلے آپ نے یہ جاگیر واپس کی، لوگوں نے کہا، پھر آپ کی اولاد کیا کرے گی؟ فرمایا اس کا خدا حافظ ہے،

پھر اہل خاندان کو بلایا اور کہا ——— "اے لوگو امت مسلمہ کا نصف یا دو تہائی مال صرف تمہارے قبضہ میں ہے!" یہ سنتے ہی خاندان بنی امیہ کے لوگ بپھر گئے، سب نے متفق اللفظ ہو کر کہا، جب تک ہمارے سر دھڑ سے جدا نہ ہو جائیں، ہم یہ جائدادیں واپس نہیں کر سکتے! عمر بن عبدالعزیز نے عمر فاروق کے لہجہ میں کہا، "خدا کی قسم اگر اس حق میں تم نے میری اعانت نہ کی تو میں تمہیں ذلیل کر کے رہوں گا!"

اب جو نظر اٹھی تو سب کی اکڑی ہوئی گردنیں جھکی ہوئی تھیں، پھر انہوں نے مسجد میں عام مسلمانوں سے خطاب کیا اور خلفائے بنو امیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ——— "اموی خلفا نے ہمیں یعنی اپنے اہل خاندان کو بہت سی جاگیریں دیں، عطایا دیئے، نہ جن کے عطا کرنے کا انہیں حق تھا، نہ جنہیں قبول کرنا ہمارے لئے مناسب تھا اب میں یہ جاگیریں اور یہ عطایا ان کے اصل حقداروں کو واپس کرتا ہوں، اور اس کام کا آغاز اپنی ذات اور اپنے خاندان سے کرتا ہوں!"

پھر انہوں نے اسناد منگائے، اور انہیں قینچی سے کاٹنا شروع کیا صبح سے ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

پھر حکام و عمال کی طرف توجہ کی، ان لوگوں نے عوام کا جو مال لوٹا یا غصب کیا تھا، وہ انہیں یا ان کے ورثا کو واپس دلوایا، عراق میں تو حالت یہاں تک پہنچی کہ خزانہ خالی ہو گیا، آخر مرکز سے

روپیہ بھیجنا پڑا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید بن عبدالملک جب سریر آرائے خلافت ہوا تو اس نے اپنے محترم اور مقدس پیش رو کی تمام شرعی اصلاحات بیک قلم منسوخ کر دیں، اور وہی نظام جاری کر دیا، جو عمر بن عبدالعزیز سے پہلے رائج تھا یعنی خالص شخصی لوسا ستبدادی حکومت۔

خلیفہ کا فرمان

فان عمر کان مغروراً	عمر (بن عبدالعزیز) ایک فریب خوردہ شخص
فاذا جاکم کتابی ھذا	تھا، جیسے ہی میرا فرمان تم تک پہنچے فوراً
اعیدوا الناس الی طبقتھم	لوگوں کو سابقہ حالت کی طرف لوٹا دو،
الاولی اخصبوا ام اجدبوا	خواہ وہ سرسبزی کا زمانہ ہو یا قحط سالی کا،
احبوا ام کرھوا احیوا ام	لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند، زندہ رہیں
ماتوا (عقد الفرید)	یا مرجائیں!

اس طرح جو کچھ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کیا تھا، قلم کی ایک جنبش سے اس پر پانی پھر گیا۔

ہشام کے ٹھاٹھ ہشام بن عبدالملک کے شاہانہ جاہ و جلال خدم و حشم اور ٹھاٹھ کا اندازہ ہو سکتا ہے، کہ جب وہ ایک خالص روحانی سفر یعنی حج کے لئے (روانہ ہوا) جہاں صرف احرام یعنی ایک بے سلے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے) تو ——— "صرف اس کے لباس فاخرہ کا بوجھ چھ سو اونٹوں پر بار تھا ———!

ایک مرتبہ ولید بن عبدالملک نے مشہور مسخرے اشعب کو دمشق طلب کیا، اور اس سے کئی دلچسپ نقلیں کرائیں، اور اس کی مضحکہ خیز حرکتیں دیکھیں بہت خوش ہوا اور ایک ہزار درہم انعام کے طور پر اسے مرحمت فرمائے۔

لہ عقد الفرید

محاربات و فتوحات

توسیع مملکت، اور محاربات و فتوحات کے اعتبار سے بنو امیہ کا دور بہت ممتاز ہے، اس دور میں اسلام کے حدود میں اضافہ ہوا، اسلام کے پرستاروں میں اضافہ ہوا، ایک طرف چین، دوسری طرف کابل، اندلس، سسلی قسطنطنیہ، فرانس، سندھ، پنجاب، خراسان اور نہ جانے کتنے مقامات پر ترک تازیاں ہوئیں اور ان میں سے اکثر مقامات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام کے زیرنگیں ہو گئے جن کی تفصیل اپنے موقع سے کچھ آچکی ہے، کچھ آئے گی،

غزنہ کی طرف

سنہ ۴۳ھ میں دولت امویہ کی فوجوں نے چند چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد غزنہ کا رخ کیا، یہاں زبردست مقابلہ ہوا لیکن دشمن کو شکست ہوئی، سجستان سے لے کر غزنہ تک کا سارا علاقہ مسلمانوں کے تسلط میں آگیا [1] سنہ ۵۳ھ میں مسلمان فوجیں پرچم فتح لہراتی ہوئی سمرقند کے دروازے پر پہنچ گئیں، زبردست مقابلہ ہوا، بالآخر سمرقند والوں نے سات لاکھ درہم پر صلح کرلی اور یرغمال کے طور پر خرفائے سمرقند کے لڑکے بھی مسلمانوں کی تحویل میں دے دیئے۔ سنہ ۴۴ھ میں سندھ کے متعدد مقامات اور ہندوستان کی سرحدات پر مسلمانوں نے حملہ کیا [2] پھر اسلامی فوجیں قندھار پہنچیں، یہاں ایک خونریز جنگ ہوئی بہت سے مسلمان شہید ہوئے، لیکن پلہ بالآخر مسلمانوں کے ہاتھ رہا، سنہ ۴۹ھ میں امیر معاویہ نے ایک بڑی فوج قسطنطنیہ پر حملہ کے لئے بھیجی، اس میں کئی اکابر صحابہ بھی شریک تھے، امیر معاویہ کا لڑکا یزید بھی اس مہم میں موجود تھا،

جزیرہ روڈس

سنہ ۵۳ھ میں بحر روم کا جزیرہ روڈس بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا، سنہ ۵۴ھ میں ایک اور جزیرہ ارواڈ بھی سرنگوں ہو گیا، ان مقامات پر امیر معاویہ نے مسلمانوں کی نوآبادیاں بھی قائم کر دیں،

---

[1] ابن اثیر [2] فتوح البلدان

طنجہ پر قبضہ

یزید کے عہد میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، شمالی افریقہ میں عقبہ بن نافع کی فتحمندیاں میں برابر اضافہ ہوتا رہا، ۶۲ھ میں شمالی افریقہ کی سب سے بڑی اور مرکزی حکومت طنجہ کو شکست دی، اور اس ملک پر قبضہ کرلیا،

عبدالملک کا دور فتنوں اور ہنگاموں کا دور تھا، اس کے زمانہ میں بڑے زور شور سے توابین خون حسین کا انتقام لینے اٹھے، خارجیوں نے بڑی قوت اور شدت سے مقابلہ کیا، ابن زبیر کی فوجوں سے مڈبھیڑ ہوئی، لیکن وہ اپنی تدبیر سے سب پر غالب آیا، مصر، عراق اور تمام مقامات پر پھر اس نے قبضہ کرلیا، جو امیوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

ملکہ دامیہ

جبل اوراس کی ملکہ دامیہ کو بھی عبدالملک کے عہد میں شکست ہوئی، یہ عورت کاہنہ مانی جاتی تھی، اس کے دونوں لڑکوں کی جان بخشی کی گئی، اس فتح کے بعد اب افریقہ میں مسلمانوں کا کوئی حریف نہ رہ گیا۔

ابن اشعث

ابن اشعث نے حجاج کی ظلم آرائیوں سے متاثر ہو کر علم بغاوت بلند کیا، اور بڑی قوت حاصل کرلی، حجاج کو اس کے مقابلہ میں کئی ذلت بخش شکستیں ہوئیں، ابن اشعث کے ساتھ عوام تھے، فوج تھی، قوت تھی، ہمت اور حوصلہ تھا، عبدالملک اتنا گھبرایا کہ اس نے ابن اشعث سے حجاج کو معزول کرکے صلح کرنی چاہیئے، لیکن عراقی نہ مانے آخر ایک عرصہ کی جنگ آزمائی کے بعد ۸۵ھ میں دھوکہ سے اس کی جان لے لی گئی، ابن اشعث کے ساتھیوں میں مشہور نامور تابعی اور بزرگ حضرت سعید بن جبیر بھی تھے، کچھ عرصہ بعد حجاج نے انہیں بڑی بے دردی اور سفاکی سے شہید کرادیا

قتیبہ کے کارنامے

۸۶ھ میں ولید کے دور حکومت میں حجاج نے قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا والی مقرر کیا،

قتیبہ نے بڑے بڑے معرکے سر کیئے، ترکستان کے علاقوں کو باج گذار بنایا، سمرقند کو صلح کرنے پر مجبور کیا فرغانہ کے دارالسلطنت کاشان کو فتح کیا، سمرقند میں مسلمانوں کی نوآبادی قائم کی ۹۶ھ میں فرغانہ سے کاشغر تک کا علاقہ درست کرا کے ایک لشکر گراں چین کے حدود کے اندر پہنچا دیا، خاقان چین نے سمرقند کے

بت پرستوں کی مسلمانوں کے خلاف مدد کی تھی اسی لئے یہ چڑھائی کرنی پڑی، خاقان چین مسلمانوں کے پیہم فتوحات سے پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا، اس نے جزیہ پر صلح کر لی،

سندھ پر قبضہ

ولید ہی کے زمانہ میں سندھ پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہوا، سندھ کے راجہ داہر نے سندھ کے بحری قزاقوں کی سرکوبی سے انکار کر دیا، جنہوں نے عرب عورتوں کو گرفتار کر لیا تھا، یہیں سے بات بڑھی اور فتح سندھ پر ختم ہوئی،

اندلس کی فتح

اسی زمانہ میں طارق بن زیاد نے اندلس (ہسپانیہ) پر حملہ کیا اور موسیٰ بن نصیر کی سربراہی میں اسے فتح کر لیا، یہ تینوں عظیم الشان فتوحات۔

(۱) چین،

(۲) سندھ

(۳) اندلس،

ایک ہی زمانہ میں ایک ہی شخص (ولید) کے دورِ حکومت میں، اور ایک ہی گورنر (حجاج) کے دورِ فرمانروائی میں حاصل ہوئیں،

ان عظیم المرتبت فتوحات کے علاوہ اور چھوٹی موٹی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں،

سسلی پر حملہ

اسی دور میں بحرِ روم کے حسین و جمیل اور سرسبز و شاداب جزیرہ سسلی (صقلیہ) پر حملہ ہوا،

یہ تمام ممالک جو فتح ہوئے، فتح ہونے سے پہلے اقتصادی، ذہنی، تمدنی، معاشرتی، تہذیبی اعتبار سے نہایت پسماندہ تھے، لیکن مسلمانوں کے ظلِ عاطفت میں آنے کے بعد، ان کی دنیا بدل گئی، یہ گمنام تھے، نامور ہو گئے، یہ تباہ حال تھے، مرفہ حال بن گئے، یہ کچھ نہ تھے، سب کچھ ہو گئے، یہ کمزور تھے، توانا ہو گئے، یہ انقلاب سے محروم تھے، انقلاب نے ان کی کایا پلٹ دی، مسلمانوں نے انہیں اپنی تحویل میں لے کر ان میں چار چاند لگا دیے،

جرجان پر قبضہ

سلیمان کے دور میں قہستان اور جرجان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، یہ فتوحات یزید بن مہلب کے ہاتھوں حاصل ہوئیں، طبرستان پر بھی کاری حملہ ہوا، لیکن

صلح پر معاملہ ختم ہو گیا،

سلیمان کے عہد میں قسطنطنیہ پر بھی ایک زبردست حملہ ہوا، لیکن شدید سردی اور برفباری کی مسلمان تاب نہ لا سکے، اس لئے یہ مہم پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔

ہشام کا دور

ہشام کے دور میں ترکستان، آرمینیہ، آذربائیجان، اور سندھ کے متعدد مقامات پر جنگی مورچے قائم ہوئے، بغاوتیں ہوئیں، شورشیں ہوئیں، فتنے اٹھے، لیکن اموی عساکر کے سامنے، آخر کار انہیں ہار ماننا پڑی، ان میں سے ہر معرکہ میں کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہوا۔

بربر نے بھی ہشام کے دور میں سر اٹھایا، خوارج بھی میدان میں آئے، اندلس میں بھی حالات زیر و زبر ہوئے، لیکن ہشامی فوجیں ان سب چیزوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتی رہیں۔

بغاوت، شورش، خانہ جنگی

ہرات کی بغاوت

ہرات، اور بلخ کے لوگوں نے ۴۲ھ میں بغاوت کی، قیس بن ہیثم نے زور و قوت سے بغاوت فرو کر دی، اور وہاں کے آتش کدے "نوبہار" کو زمین کے برابر کر دیا، ۴۳ھ میں کابل میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے، عبدالرحمٰن بن سمرہ نے باغیوں کا زور توڑ دیا، کابل کا محاصرہ کر لیا، اور ایسی آگ برسائی کہ شہر پناہ کی دیواریں شق ہو گئیں، ۴۷ھ میں غور کے باشندے مرتد ہو گئے، اور علم بغاوت لے کر کھڑے ہو گئے، لیکن عمرو بن غفاری نے ان باغیوں کا سر کچل دیا، اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔

افریقیہ میں بغاوت

یزید کی وفات سے کچھ پہلے افریقیہ میں پھر بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور اس کی وفات تک بھڑکتے رہے، لیکن عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں یہ ٹھنڈے ہو گئے۔

یزید بن مہلب کی بغاوت

مہلب بن ابی صفرہ بڑا نامور اموی امیر تھا، اس نے اموی خاندان کی بڑی خدمات انجام دی تھیں، اس کی اولاد ساری حکومت پر چھائی ہوئی تھی،

یزید بن عبدالملک، خاندان مہلب کا عام طور پر، اور یزید بن مہلب کا خاص طور پر دشمن تھا کیونکہ اس نے اس کے بعض سسرالی عزیزوں کو اپنے دور امارت میں سزائیں دی تھیں، یزید بن عبدالملک نے جب آل مہلب کی عام گرفتاری کا بغیر کسی وجہ کے حکم دیا، تو یزید کو موقع مل گیا، اس نے علم بغاوت بلند کیا خراسان اور عراق پر چھا گیا، زور شور سے اموی افواج کا مقابلہ کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا،

یزید کے دور میں کچھ اور بغاوتیں اور شورشیں بھی ہوئیں، بالآخر وہ ناکام ہو گئیں۔

جب یزید بن عبدالملک نے ولید بن یزید بن عبدالملک کو قتل کر دیا، تو اگرچہ لوگ ولید بن یزید کی ظلم آرائیوں اور سفاکیوں کے شاکی تھے، لیکن انہوں نے یزید بن عبدالملک کی اس دراز دستی کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا، چنانچہ حمص، فلسطین، اردن، اور جزیرہ کے حاکموں نے بغاوت کر دی، اور یزید بن عبدالملک کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یزید بن عبدالملک ان اندیشوں سے غافل نہ تھا اس نے فوراً باغیوں کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا، حمص کے باشندوں نے مجبور ہو کر سر تسلیم خم کر دیا، یہی حشر فلسطین اور اردن کا بھی ہوا، جزیرہ نے بھی چار و ناچار بیعت کر لی، ان باغیوں میں سے بعض کو سزا ملی بعض کو انعام،

مروان الحمار کا قتل

مروان الحمار تقریباً چھ سال تک فرمانروائی کرتا رہا، لیکن یہ سارا دور، بغاوت، اور شورش کا تھا یہاں تک کہ مروان الحمار کا بھی خاتمہ ہو گیا، اور اموی حکومت کا چراغ بھی گل ہو گیا۔

مروان کے زمانہ میں قبائلی عصبیت بھی بھڑک اٹھی تھی، اور اپنا کام کر رہی تھی، عباسی تحریک کے داعیوں نے ایسا زور باندھا کہ مروان نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کے لئے کچھ نہ ہو سکا۔

مروان کے تخت پر بیٹھتے ہی تمام ملک میں شورش شروع ہوئی، حمص اور فلسطین نے بھی اس کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، مروان نے مقابلہ کیا، ہمت اور دلاوری کے ساتھ میدان میں آترا، لیکن ایک طرف کامیاب ہوتا تھا، دوسری جانب ناکام، ایک بند باندھا دوسرا ٹوٹ گیا، ایک زخم بھر گیا، دوسرا ہرا ہو گیا، سلیمان بن ہشام بھی ستر ہزار فوج لے کر اس کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا، خوارج نے بھی سر اٹھایا، اور کافی مشکلات پیدا کیں، قبائلی عصبیت نے خود عربوں کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا، ان سب باتوں سے ابو مسلم نے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور ایسا بھرپور وار کیا کہ اموی حکومت پھر نہ سنبھل سکی،

بہت جلد ابو مسلم نے سارے خراسان پر قبضہ کر لیا، پھر مرو بھی زیر ہو گیا، بعد ازاں طوس، نیشاپور، اور جرجان بھی ابو مسلم کے قبضہ میں آ گئے، پھر ابو مسلم کے سالار عراق عجم پر بڑھے، یہاں بھی کامیابی آغوش کھولے منتظر تھی۔ رے، اصفہان، نہاوند، شہر زور وغیرہ ایک ایک کر کے ابو مسلم کے ہاتھ میں آتے گئے،

عراق بھی چند دن سے زیادہ مقابلہ میں نہ ٹک سکا، اسے بھی گردن جھکا دینی پڑی، آخر دریائے زاب کے کنارے ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی، ہزاروں اموی سپاہی غرق آب ہو گئے، صرف خاندان بنو امیہ کے ۳۰۰ افراد ڈوبے،

اموی حکومت کے خاتمہ کے بعد بنو عباس نے بنو امیہ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی، جو جہاں مل گیا تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا، اموی خلفا کی قبریں کھود دی گئیں، اور انہیں زمین کے برابر کر دیا گیا، ہشام بن عبد الملک کی لاش صحیح سلامت نکل آئی، اسے سولی پر لٹکا کر جلا دیا گیا، اب تک ظلم صرف زندوں کے جسم و جان پر ہوتا تھا، بنو عباس نے مردوں کی ہڈیاں بھی نہ چھوڑیں، انہوں نے بنو امیہ کے زندوں کو بھی مارا اور مردوں کو بھی ——— یہ ہے دنیا! یہ ہے دنیا کے لئے جنگ و جدل اور ظلم و ستم کا انجام، بنو امیہ نے جو بویا تھا وہ کاٹ لیا، ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند!

حصہ چہارم

۲۳۴۵۶۷۸۹

عہدِ بنو عباس

تعارف

خلفائے دولت عباسیہ

سنہ ۱۳۲ھ سے

سنہ ۶۵۶ھ تک

۱- سفاح	سنہ ۱۳۲ھ	۱۲- مستعین باللہ	سنہ ۲۴۸ھ
۲- منصور	سنہ ۱۳۶ھ	۱۳- معتز باللہ	سنہ ۲۵۲ھ
۳- مہدی	سنہ ۱۵۸ھ	۱۴- مہتدی باللہ	سنہ ۲۵۵ھ
۴- ہادی	سنہ ۱۶۹ھ	۱۵- معتمد باللہ	سنہ ۲۵۶ھ
۵- ہارون رشید	سنہ ۱۷۰ھ	۱۶- معتضد باللہ	سنہ ۲۷۹ھ
۶- امین	سنہ ۱۹۳ھ	۱۷- مکتفی باللہ	سنہ ۲۸۹ھ
۷- مامون	سنہ ۱۹۸ھ	۱۸- مقتدر باللہ	سنہ ۲۹۵ھ
۸- معتصم باللہ	سنہ ۲۱۸ھ	۱۹- قاہر باللہ	سنہ ۳۲۰ھ
۹- واثق باللہ	سنہ ۲۲۷ھ	۲۰- راضی باللہ	سنہ ۳۲۲ھ
۱۰- متوکل باللہ	سنہ ۲۳۲ھ	۲۱- متقی باللہ	سنہ ۳۲۹ھ
۱۱- منتصر باللہ	سنہ ۲۴۷ھ	۲۲- مستکفی باللہ	سنہ ۳۳۳ھ

۲۳- مطیع باللہ سنہ ۳۳۴ھ
۲۴- طائع باللہ سنہ ۳۶۳ھ
۲۵- قادر باللہ سنہ ۳۸۱ھ
۲۶- قائم باللہ سنہ ۴۲۲ھ
۲۷- مقتدی باللہ سنہ ۴۶۷ھ
۲۸- مستظہر باللہ سنہ ۴۸۷ھ
۲۹- مسترشد باللہ سنہ ۵۱۲ھ
۳۰- راشد باللہ سنہ ۵۲۹ھ

۳۱- مقتفی باللہ سنہ ۵۳۰ھ
۳۲- مستنجد باللہ سنہ ۵۵۵ھ
۳۳- مستضئ باللہ سنہ ۵۶۶ھ
۳۴- ناصر باللہ سنہ ۵۷۵ھ
۳۵- ظاہر باللہ سنہ ۶۲۲ھ
۳۶- مستنصر باللہ سنہ ۶۲۳ھ
۳۷- مستعصم باللہ سنہ ۶۴۰ھ تا ۶۵۶ھ

M. Munir Ahmad

کاروانِ فتح و اقبال

خلافت عباسیہ بغداد، تقریباً سوا پانچسو سال تک قائم رہی، اس طویل مدت میں، نیک اور بد، ہر طرح کے خلیفہ ہوئے، لیکن انہیں خلیفہ کہنا خود ان پر بھی ظلم ہے، اور حقیقت میں بھی، یہ اپنے وقت کے سلاطین تھے، اور بادشاہوں میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ بھی ان میں تھیں اور جو برائیاں ہوتی ہیں، وہ بھی ان میں موجود تھیں۔ بادشاہ متضاد اوصاف و کمالات کا جامع ہوتا ہے۔ وہ رحیم بھی ہوتا ہے، اور منتقم بھی، عادل بھی، اور دشمن انصاف بھی، انسان بھی، اور درندہ بھی، پابند عہد بھی، اور عہد شکن بھی، حق کو قبول کر لینے والا بھی، اور حق کو ٹھکرا دینے والا بھی، خلفائے عباسیہ میں بھی یہ تمام کمالات بدرجۂ اتم (اپنی شاہی برادری کے دوسرے لوگوں کی طرح) موجود تھے۔

عہد عباسیہ میں مسلمانوں کا کاروان فتح و اقبال آگے بڑھا، اور بہت دور تک بڑھتا چلا گیا قلم کا داستان گو سب سے پہلے اسی داستان کو چھیڑتا ہے کہ یہ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، روح پرور بھی، اور کیفیت افروز بھی۔ اس داستان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ مسلمان پہلے کیا تھے۔ اور اب کیا ہیں! شاید یہ داستان جمیل کچھ حرکت پیدا کر سکے۔

ختن پر حملہ سنہ ۱۳۳ھ میں خالد بن ابراہیم نے ختن پر فوج کشی کی، یہاں کا فرمانروا اخشید بن شبلی معمولی سی مدافعت کے بعد چین کی طرف نکل گیا۔

یہ بالکل ابتداء کا واقعہ ہے یعنی جب خلافت عباسیہ عالم وجود میں آئی تھی، لیکن یہ پہلی مثال بہت کامیاب رہی، اس کے بعد فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ بہت عرصہ تک جاری رہا۔

ہارون کی یلغار سنہ ۱۸۱ھ میں خود ہارون نے صفصاف کا قلعہ فتح کیا اور اسی سنہ میں عبد الملک بن صالح الہاشمی کوچک میں انقرہ تک بڑھتا چلا گیا اور مطمورہ فتح کیا سنہ ۱۸۷ھ میں قاسم بن رشید نے قرہ کا محاصرہ کیا اور عباس بن جعفر نے سنان یہاں کے باشندوں نے

محاصرے سے گھبرا کر تین سو بیس مسلمان قیدیوں کو جو ان کے ہاتھوں میں اسیر تھے رہا کر کے صلح کر لی۔
ہارون کی یہ ابتدائی یلغار تھی۔ اس کے بعد اس نے جو شاندار یلغاریں دنیا کے سامنے پیش کیں وہ اس سے کہیں زیادہ شاندار تھیں۔

ہارون اور شاہ روم

۱۸۷ھ میں بادشاہ روم نقفور نامی نے ایک خط ہارون الرشید کے پاس نقض عہد کا جو مسلمانوں اور ملکہ زینی ملکہ روم کے درمیان تھا روانہ کیا اس میں لکھا تھا کہ "یہ خط نقفور بادشاہ روم کی طرف سے ہارون بادشاہ عرب کی طرف ہے۔ واضح ہو کر جو ملکہ مجھ سے پہلے روم پر قابض تھی اس کے زمانہ میں تمہاری وہی حیثیت تھی جو شطرنج میں رخ کی ہوتی ہے اور اس کی حیثیت بوجہ ضعیفۃ الرائے اور حماقت کے بمنزلہ پیدل کی تھی۔ اس واسطے اس نے تمہیں بہت سا مال دیا اور صلح کر لی۔ لیکن اب جبکہ تمہارے پاس میرا خط پہنچے تو وہ مال جو تم نے اس سے حاصل کیا تھا فوراً واپس کر دو ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب تلوار فیصلہ کرے گی۔" فقط یہ پڑھ کر ہارون الرشید کو اتنا غصہ آیا کہ غصہ کی وجہ سے برافروختہ ہو گیا حتیٰ کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کسی کو تاب نہ رہی۔ چہ جائیکہ کوئی بات کر سکتا۔ اس کے ہم جلیس اور وزراء اس کے سامنے سے اٹھ کر چلے آئے۔ ہارون الرشید نے بغیر کسی وزیر سے مشورہ کئے ہوئے دوات قلم منگا کر اس کی پشت پر لکھ دیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہارون امیر المومنین کی طرف سے نقفور روم کے کتے کو معلوم ہو کہ او کافر کے بچے میں نے تیرا خط پڑھا جس کا جواب تو عنقریب آنکھوں سے دیکھ لے گا سننے کی ضرورت نہیں۔ فقط۔ اور خود بنفس نفیس لشکر کو لے کر اسی روز روانہ ہو گیا۔ جب شہر ہرقل میں پہنچا تو وہ معرکہ آرائی کی جو آج تک مشہور چلی آتی ہے۔ اور فتح حاصل کی بہ مجبوری نقفور نے صلح کی درخواست کی اور ہر سال خراج دینا منظور کیا۔ جس کو ہارون رشید نے قبول کر لیا اور واپسی کا حکم دے دیا۔

مامون کا اقبال

بغداد کی شورش کے زمانے میں جبکہ ایک طرف مامون کی فوجیں بغداد کے محاصرہ میں مصروف تھیں، دوسری طرف ان فوجوں کا ایک حصہ کوہستان کابل میں برسر پیکار تھا۔ اس زمانہ میں کابل کے بادشاہ نے اطاعت قبول کر کے اسلام قبول کر لیا

اور تاج شاہی مامون کی پیشکش کے لئے بھیجا۔

مامون کی جگہ، اگر کوئی کم ہمت فرماں روا ہوتا، تو وہ ضرور حواس باختہ ہو جاتا، لیکن اس نے یہ بات سیکھی ہی نہیں تھی، وہ عزم کا پکا، ارادے کا پورا، اور حوصلہ کا پختہ انسان تھا، اس کا بڑھا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

مامون کی فوج کشی

محرم ۲۱۵ھ میں مامون نے بنفس نفیس ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی اور منبج وابق۔ انطاکیہ اور طرطوس ہوتا ہوا ایشیائے کوچک میں داخل ہوا اور حصن ماجد کو صلح اور حصن قرہ کو بزور شمشیر فتح کر کے برباد کر ڈالا اور امیر اشناس کو حصن سندس اور جعفر کو حصن ستاذ پر مامور کیا، اشناس نے قلعدار کو گرفتار کر لیا اور ستاذ کے قلعدار نے اطاعت قبول کر لی اور مامون ظافر و غانم دمشق واپس گیا۔

اس کے ایک سال بعد رومیوں نے طرطوس اور مصیصہ کے کئی ہزار مسلمان قتل کر ڈالے۔ مامون کو اس کی خبر ہوئی تو ۲۱۶ھ میں پھر روم پر فوج کشی کی اور انطیعو کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں کے باشندوں نے صلح کر لی اور پھر مامون نے معتصم کو رومی قلعوں کی تسخیر پر مامور کیا۔ اس نے تیس قلعے اور مطمورہ کو فتح کیا اور قاضی یحییٰ بن اکثم نے بہت سے رومی گرفتار کئے۔ اور مامون کیسوم ہوتا ہوا دمشق لوٹ آیا۔

کریٹ کی فتح

جزیرہ کریٹ کا کچھ حصہ ولید اموی اور اس کے بعد ہارون کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔ مامون کے زمانہ میں ابو حفص عمر بن عیسیٰ اندلسی نے یہاں ایک اور قلعہ فتح کیا اور رفتہ رفتہ پورا جزیرہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ (۲۱۲ھ)

عموریہ کی فتح

عموریہ رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور ان کا نہایت مستحکم قلعہ تھا۔ آغاز اسلام سے لے کر اس وقت تک یہ بالکل محفوظ و مامون چلا آتا تھا۔ اس لئے معتصم نے اسی کو حملہ کے لئے منتخب کیا، اسلحہ، خچر، چرمی خیمے، چرمی حوض، آتشبار مادے، اور جملہ فوجی سامان اس کثرت سے فراہم کیا اس سے پہلے کبھی کسی مہم کے لئے اتنا سامان نہیں مہیا کیا گیا تھا۔

اس سروسامان سے وہ رومی حکومت کی طرف بڑھا، اور سلوقیہ پہنچ کر منزل کی، اور یہاں سے

انگورہ پر حملہ کرنے کے لئے افشین اور اشناس کو مختلف سمتوں میں بھیجا اور ایک دن مقرر کر کے سب کو ایک مقام پر جمع ہونے کا حکم دیا۔

میمنہ پر افشین اور میسرہ پر اشناس کا تقرر ہوا قلب کی قیادت خود معتصم نے اپنے ہاتھوں میں رکھی اور تینوں ایک دوسرے سے دو دو فرسخ کا فاصلہ دے کر تاخت و تاراج کرتے ہوئے عموریہ پہنچے۔ یہاں ایک مسلمان جو رومیوں کے ہاتھ میں پڑ کر عیسائی ہو گیا تھا نکل کر ان سے مل گیا اور بتایا کہ شہر پناہ میں ایک جگہ سوراخ ہے جو باہر سے چھپا دیا گیا ہے۔ لیکن اندر سے کھلا ہے۔ معتصم نے اسی مقام پر اپنا خیمہ نصب کر کے سنگباری کے ذریعہ سوراخ توڑ دیا۔ عموریہ کے بطریق باطیس نے توفیل کو اطلاع دی کہ شہر پناہ میں سوراخ ہو چکا ہے، اس لئے میرا ارادہ ہے کہ کسی شب کو نکل کر مسلمانوں پر چھاپہ مارتے ہوئے آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہ خط مسلمانوں کے ہاتھ پڑ گیا۔ معتصم نے اسی وقت شہر پر سنگباری کر کے اس کو ایک مقام سے توڑ دیا۔ عموریہ اور مسلمانوں کے درمیان صرف خندق حائل تھی معتصم نے کھالوں کے بورے بنا کر اور اس میں مٹی بھر کے اس کو پٹوا دیا اور مسلمان سنگ بار آلات کے ساتھ شہر پناہ تک پہنچ گئے اور پھاٹک کے پاس دیوار توڑنا شروع کر دی۔ دوسری طرف افشین اور اشناس باری باری کر کے دو دن تک پوری قوت کے ساتھ حملہ کرتے رہے تیسرے دن خود معتصم میدان میں آیا اور صبح سے شام تک نہایت گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی، شام ہوتے ہوتے ہزاروں رومی زخمی ہو گئے۔ شہر پناہ کے اس حصہ کے محافظ بطریق ویدوانے رؤسائے روم سے اپنی حالت زار بیان کر کے امداد طلب کی، لیکن ان میں اس کو مایوسی ہوئی اور اسے مجبور ہو کر معتصم سے جان بخشی کا طالب ہونا پڑا۔ اس نے امان دے دی اور بطریق مذکور اس کے پاس چلا آیا۔ ابھی دونوں کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی، کہ مسلمان ریلا کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ صورت دیکھ کر بطریق بہت خوفزدہ ہوا معتصم نے اس کو اطمینان دلایا کہ تم مت گھبراؤ، تمہارے تمام مطالبات پورے کئے جائیں گے۔ تمہاری خواہش کے خلاف نہ ہوگا مسلمانوں کے عموریہ میں داخل ہو جانے کے بعد رومی، کلیسائے اعظم کی آڑ پکڑ کے لڑنے لگے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس میں مجبوراً آگ لگا دینی پڑی، اس آڑ کے ختم ہونے کے بعد عموریہ پر قبضہ ہو گیا۔ صرف باطیس بطریق ایک برج میں جما ہوا تھا، معتصم نے اسے امان دے کر وہاں سے ہٹا دیا اور عموریہ پر کامل

قبضہ ہو گیا اس انقلاب میں بہت سے عوام مارے گئے لیکن امن پسند عمائد اور معززین کو کسی نے ہاتھ نہ لگایا اس فتح میں اس کثرت سے مال غنیمت ہاتھ آیا کہ پانچ دن تک برابر نیلام ہوتا رہا، اس کے بعد جو بچ رہا وہ پھونک دیا گیا، عام مسلمانوں نے لوٹ مار شروع کر دی لیکن معتصم نے اسی وقت روک دیا اور عماریہ کے تمام جنگی استحکامات توڑ دیئے (۲۲۳ھ)

سسلی پر حملہ

۲۸۰ھ میں فضل بن جعفر ہمدانی نے سسلی پر حملہ کیا اور مسینی کے بندرگاہ پر فوجیں اتار کر مختلف سمتوں میں پھیلا دیں اور خود نابل کی طرف بڑھا۔ یہاں کے باشندے سامان حاصل کر کے اس کے ساتھ ہو گئے، مسلمانوں نے دو سال تک اس کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی، آخر میں شہر کے چاروں طرف چکر لگا کر ایک مقام پر شہر میں داخلہ کا ایک راستہ معلوم کر لیا، اہل شہر دوسرے حصّہ کی مدافعت میں مشغول تھے اس لئے مسلمان پہاڑ کو عبور کر کے دفعتاً عقب سے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس ناگہانی حملہ سے گھبرا کر اہل شہر نے میدان چھوڑ دیا اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، اسی سال شہر سکانہ فتح ہوا۔

رومیوں کی درگت

۲۸۵ھ میں موفق کے غلام راغب نے طرطوس سے بحری حملہ کیا، اور رومیوں کے تیس جہاز گرفتار کر کے جلا دیئے، اس حملہ میں تین ہزار رومی قتل ہوتے

فتح گرجستان

۴۵۶ھ میں الپ ارسلان نے ارن اور گرجستان کے صوبوں پر فوج کشی کی، اور اس کے لڑکے ملک شاہ اور وزیر نظام الملک نے رومیوں کے متعدد قلعے فتح کئے اور شہر مریم نشین کا محاصرہ کیا، یہ عیسائیوں کا بڑا مقدس شہر تھا۔ پوری عیسائی دنیا اس کی تعظیم کرتی تھی۔ اس کے گرد سنگین شہر پناہ اور چاروں طرف نہر رواں تھی، عیسائیوں نے مدافعت میں پوری قوت صرف کر دی، لیکن سلجوقی شہر پناہ تک پہنچ کر کمند کے ذریعہ فصیل پر چڑھ گئے، اہل شہر نے جو مدافعت کرتے کرتے تھک چکے تھے، سپر ڈال دی اور شہر پر قبضہ ہو گیا۔

الپ ارسلان دوسری سمت مصروف پیکار تھا، اسے مریم نشین کی فتح سے بڑی مسرت ہوئی اور وہ ملک شاہ اور نظام الملک کو واپس بلا کر سپید شہر کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر کے اعال لال کے قلعہ کا رخ کیا، یہ

بڑا سنگین اور مستحکم شہر تھا، اس کے مشرق و مغرب میں پہاڑ کی قدرتی دیوار اور متعدد مستحکم قلعے تھے، دوسری سمت نہر حائل تھی، الپ ارسلان نے اس پر پل تعمیر کر کے شہر پر حملہ کیا، اہل شہر نے ہر چند مدافعت کی لیکن رو کنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور سلجوقیوں نے انہیں شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔

اعمال لال کی تسخیر کے بعد شہر آنی کا رُخ کیا اور راستہ کی عیسائی آبادیوں کو مطیع کرتے ہوئے آنی پہنچا یہ اتنا بڑا شہر تھا کہ اس میں پانچ سو گرجے تھے، اس کے تین طرف دریائے ارس تھا اور چوتھی سمت نہر تھی شہر تک پہنچنے کے لئے تھوڑا سا خشکی کا راستہ تھا، الپ ارسلان نے لکڑی کا برج بنا کر سنگباری اور تیر اندازی کے ذریعہ اہل شہر کو فصیل سے ہٹا دیا، اور حملہ کر کے شہر پناہ کی دیوار تک پہنچ گیا، عین اس وقت اس کا ایک حصّہ جو سنگ باری سے کمزور ہو چکا تھا، گر گیا اور سلجوقی اس راستہ سے نکل کر شہر پر قابض ہو گئے۔ گرجستان کے فرمانروا نے جب دیکھا کہ سلجوقیوں کا روکنا بس سے باہر ہے تو اس نے جزیہ دے کر صلح کر لی اور الپ ارسلان مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کے لئے فوج چھوڑ کر مرو واپس ہو گیا، ان فتوحات سے اسلامی دنیا کو بڑی شادمانی و مسرت ہوئی قائم باللہ نے خاص طور سے خوشنودی کا اظہار اور الپ ارسلان کے لئے دعا کی۔

بغاوتیں اور سازشیں

عباسیوں کے عہد میں بغاوتیں اور سازشیں بھی ہوئیں، لیکن جب تک اقبال یاور تھا، بڑی سے بڑی سازش بھی کچھ نہ بگاڑ سکی، جب بد اعمالیوں کے باعث اقبال نے ساتھ چھوڑ دیا، تو دوست بھی دشمن ہوگئے، اور وہی بغاوتیں جو آسانی سے دبا دی جاتی تھیں، پھلنے پھولنے لگیں، یہاں تک کہ انہی سازشوں کے باعث، اس حکومت ہی کا خاتمہ ہوگیا۔

ذیل میں بغاوتوں اور سازشوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

ظالم مجوسی

۱۳۷ھ میں سنباد نام ایک مجوسی اس کے انتقام کے لئے اٹھ کھڑا ہوا خراسان کے کوہستانی علاقہ کے تمام عجمیوں نے اس کا ساتھ دیا، سنباد نے خراسان کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمان عورتوں کو قید کر کے خانہ کعبہ ڈھانے کا عزم ظاہر کیا، منصور کو یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے جمہور بن مرار عجلی کو دس ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ اس نے ہمدان اور رے کے درمیان سنباد کو بڑی فاش شکست دی۔ ساٹھ ہزار مجوسی مارے گئے۔ سنباد نے شکست کھا کر طبرستان نکل جانا چاہا لیکن راستہ میں اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

بغاوت کا استیصال

۲۱۹ھ میں بصرہ کے راستہ میں زط[1] نے شورش برپا کی اور ایک شخص محمد ابن عثمان کو سرغنہ بنا کر لوٹ مار شروع کر دی معتصم نے عجیف بن عنبسہ کو ان کی سرزنش پر مامور کیا، اس نے واسط میں ان کا مقابلہ کر کے ان کے تین سو آدمی قتل اور تین سو گرفتار کئے اور ان کے سر معتصم کے ملاحظہ کے لئے بھیجے اور ۷ مہینے تک ان کا استیصال کرتا رہا اور ۲۲۰ھ میں ان کے ۲۷ ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو قید کر کے بغداد لایا معتصم کے ملاحظہ کے بعد ان کو عین زربہ جانے کی اجازت دی گئی، لیکن راستہ میں رومیوں نے ان سب کو ختم کر دیا۔

---

[1] زط عراق میں مخلوط اقوام کا ایک جرگہ تھا۔

بابک خرمی کا قتل

افشین بابک کو لے کر معتصم کے پاس سرمن رآی روانہ ہوا۔ بابک پر فتحیابی افشین کا نہایت اہم کارنامہ تھا، اس لئے افسران فوج نے کئی منزل باہر نکل کر افشین کا استقبال کیا اور ۲۲۳ھ میں وہ سرمن رائے میں داخل ہوا۔ معتصم نے بابک کو ملاحظہ کرنے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر قتل کرا دیا اور اس کی لاش سولی پر لٹکائی۔ اس کا بھائی عبداللہ بغداد میں سولی پر چڑھایا گیا۔

زنگیوں کی بغاوت

عہد عباسی کا ایک بہت بڑا فتنہ "صاحب الزنج" کی بغاوت تھی۔ اس نے بہت سے سادہ لوح عوام کو اپنی کرشمہ سازیاں دکھا کر اپنا معتقد کر لیا تھا، اور ان کے ہجوم کو لے کر جدھر نکل جاتا تھا، قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اس نے بصرہ پر قبضہ کر کے اس کو بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس کے کل باشندوں کو قتل کر دیا اور آس پاس کی تمام بستیاں پھونک دیں۔ ۲۵۶ھ سے ۲۷۰ھ تک زنگیوں اور عباسی فوجوں میں بڑے خونریز معرکے ہوئے۔ زنگیوں نے اس قدر قتل عام کیا کہ مردوں کا دفن کرنا مشکل ہو گیا اور لاشوں کی تعفن سے سخت وبا پھیل گئی اور بے شمار آدمی لقمۂ اجل ہو گئے۔ سنہ ۲۷۰ھ میں زنگیوں کا ایک سردار بہبوذ مارا گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا میں رسول بنا کر بھیجا گیا ہے اور اسے غیب کی باتوں کا علم ہے۔

سادات بنی ہاشم اور عرب کی عورتیں پکڑ کر دو دو تین تین درہم میں نیلام کی جاتی تھیں اور زنگی عورتیں ان سے لونڈیوں کی طرح خدمت لیتی تھیں، چودہ پندرہ سال تک مسلسل یہ مظالم قائم رہے، مقتولین کی صحیح تعداد کا اندازہ کوئی مورخ نہ کر سکا۔ ان کا بیان ہے کہ اس شورش میں اتنے آدمی مارے گئے کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صاحب الزنج کے اور آدمیوں کو چھوڑ کر صرف مہلبی نے ۱۵ لاکھ قتل کئے۔ تنہا بصرہ میں ایک دن میں پانچ لاکھ آدمی قتل ہوئے۔ بالآخر بڑی خونریز لڑائیوں کے بعد موفق نے ۲۷۰ھ میں صاحب الزنج کا خاتمہ کر کے خلق اللہ کو ان مظالم سے نجات دلائی۔ اس کے قتل سے ساری دنیا کو مسرت ہوئی۔ جس وقت اس کا سر نیزہ پر آویزاں کر کے بغداد لایا گیا تو یہاں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی، بغدادیوں نے [illegible] کر کے چراغاں کیا اور ہر شخص کے دل سے موفق کے لئے دعا نکلنے لگی۔

توسیع علوم و فنون

عباسیوں کا زمانہ اپنے پیش رو امویوں سے اس اعتبار سے بہت نمایاں اور ممتاز ہے کہ اس دور میں علوم و فنون کو بہت ترقی ہوئی، علوم عقلیہ کا فروغ ہوا، فلسفہ، منطق اور دوسرے علوم و فنون رائج ہوتے یونانی اور سنسکرت زبان سے بہت سی کتابوں کے ترجمے ہوئے، اور ان علوم و فنون نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری دنیا کو بے بہا فائدے پہنچائے، مسلمانوں کے اس علمی کارنامے کو اگر تاریخ سے حذف کر دیجئے، تو یہ دنیا صرف دار الجہل نظر آئے گی، یورپ کی موجودہ علمی ترقیاں دراصل عباسیوں کے علمی سرچشمہ کی رہین منت ہیں۔

علوم مذہبی تصنیف و تالیف اور اقوام غیر اور السنۂ غیر کے علوم و فنون کا ذوق خلیفہ منصور کے عہد میں پیدا ہوا، حدیث، تفسیر، فقہ، اور مغازی نیز سیرت کی تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا، چنانچہ امام مالکؒ نے مؤطا تحریر فرمائی امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تدوین کی، ابن اسحق نے سیر مغازی کا کام انجام دیا ان حضرات کے علاوہ ابن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں معمر نے یمن میں سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ہشیم الیث ابن لہیعہ، ابن مبارک، امام ابو یوسف اور ابن وہب وغیرہ محدثین و فقہاء نے اپنے اپنے مقامات پر حدیث و فقہ کی تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کی، علاوہ ازیں ادب و تاریخ پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔

غرض، عباسی عہد علمی اعتبار سے اسلام کی تاریخ میں ایک یگانہ حیثیت رکھتا ہے، اگر عباسیوں نے نقل و توسیع و اشاعت علوم پر توجہ نہ کی ہوتی تو مسلمان بھی کورے رہتے، اور یورپ بھی جاہل نظر آتا، کیونکہ یورپ نے جو کچھ سیکھا مسلمانوں ہی سے، ان کی کتابوں سے، ان کے علوم سے سیکھا۔

علوم عقلی و ادبی کتب منطق، فلسفہ اور فارسی کے ترجمے عہد عباسیہ میں خوب ہوئے، خلیفہ منصور کے کاتب عبد اللہ بن مقفع نے جو خود بھی بہت بڑا ادیب اور فلسفی تھا۔ ارسطا طالیس کی کتاب قاطیغوریاس، باری آرمیناس اور انولوطیقا اور منطق کی مشہور کتاب

ایساغوجی کا ترجمہ کیا، کلیلہ و دمنہ کو بھی سب سے پہلے اسی نے عربی کا جامہ پہنایا، جو آج بھی عربی لٹریچر میں امتیاز خاص کی حامل ہے۔ ترجمہ کے علاوہ علم سیاست پر دو رسالے لکھے۔ فارسی سے علم الاخلاق کی کتاب کا ترجمہ الادب الکبیر۔ اور الادب الصغیر بھی ابن مقفع ہی کی یادگار ہے، ان کتب کے علاوہ اس نے اور متعدد کے دوسرے مترجموں نے ایران کے بانیان مذاہب مانی دلیساں اور مرقیون کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ یہ اگرچہ بہت بڑی علمی خدمت تھی، لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تھا، وہ یہ کہ زہر تو پھیلا دیا مگر تریاق کا بندوبست نہ کیا، ان علوم جدیدہ نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت بڑا اثر ڈالا، اور اس اثر کے دفعیہ کی کوئی تدبیر نہ کی گئی، یہاں تک کہ علم کلام کی بنیاد پڑی اور اس نے ان مفاسد کا بڑی حد تک استیصال کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

قانون خراج

خلیفہ ہوتے ہی ۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی نے معاویہ بن یسار کو اپنا معتمد وزیر بنا لیا معاویہ نے اپنے دور وزارت میں مختلف شعبوں کو ترقی دی اور ان میں مفید اصلاحات رائج کیں، ہر شعبہ کے دفاتر عمدگی سے مرتب کئے، شعبہ خراج میں اس سے پہلے پیداوار کا ایک مقررہ خراج لیا جاتا تھا، معاویہ نے بٹائی کا طریقہ رائج کیا، کھجور اور دوسرے پھل دار درختوں پر خراج لگایا اور قانون خراج پر ایک کتاب بھی لکھی، اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ اسلام میں اس موضوع پر یہ سب سے پہلی کتاب تھی، تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، بلکہ یہاں حقیقت اور اظہار واقع ہوگا۔

کتاب الجدل

خلیفہ مہدی نے سب سے اول زندیقوں اور ملحدوں کی تردید میں کتاب الجدل لکھوائی۔

مہدی کو ملحدوں اور زندیقوں سے سخت نفرت تھی، وہ الحاد اور زندقہ کے دور کرنے کے سلسلہ میں حسب ضرورت کبھی وقت تلوار اور قلم دونوں سے کام لیتا تھا، اور جب تک کامیاب نہ ہوتا، چین سے نہ بیٹھتا۔

علم کلام کی بنیاد

مذہبی اصلاح کے سلسلہ میں مہدی نے بعض مفید علمی خدمات انجام دیں اور الحاد و زندقہ کے تدارک کے لئے حکماء کو مناظرانہ کتابوں کی تالیف کا حکم دیا، جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی، اس طرح اس عظیم الشان فن کی ایجاد کا سہرا جو مسلمانوں کے لئے سرمایۂ فخر ہے، مہدی

کے سر ہے۔ علم کلام کے علاوہ بعض ادبی کتابیں بھی لکھوائیں۔ چنانچہ مفضل ضبی نے اس کے حکم سے امثال وایام عرب پر ایک کتاب لکھی ہے۔

علم کلام ہی وہ فن ہے جس نے ان شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا، جو دُنیا کے میل جول اور جدید علوم کی توسیع واشاعت سے مسلمانوں میں پھیلنے لگے تھے۔

بیت الحکمۃ

دولت عباسیہ میں علم وفن کا آغاز ابوجعفر منصور نے کیا تھا، ہارون نے اس کو اور زیادہ ترقی دی اور بیت الحکمۃ کے نام سے تالیف وتراجم کا ایک ادارہ قائم کیا اور اس میں بیش قرار تنخواہوں پر علماء ومترجمین مقرر کر کے ان سے یونانی، فارسی، اور دوسری زبانوں کی متعدد مفید اور اہم کتابیں ترجمہ کرائیں۔

اس بیت الحکمۃ کو اپنے افادی اور علمی لٹریچر کے باعث تاریخ عباسیہ میں ایک ناقابلِ فراموش امتیاز حاصل ہے۔

کتاب الخراج

ہارون سے پہلے عموماً عمال پر کوئی احتساب نہ تھا، خراج کی تحصیل وصول میں سختی برتی جاتی تھی۔ شرعی محاصل کے علاوہ اور بہت سی ناجائز آمدنیاں لی جاتی تھیں۔ ہارون الرشید نے اس کی اصلاح کے لئے قاضی ابو یوسف سے خراج کا قانون مرتب کرایا، جو آج بھی کتاب الخراج کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگرچہ یہ کتاب دراصل خراج وصدقات وجزیہ وغیرہ محاصل حکومت کے قوانین ہے لیکن اس میں حکومت اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت ذمی، اور مسلمان رعایا کے حقوق وفرائض، حکومت کے عمال اور عہدہ داروں کے اختیارات، ان کے فرائض، ان کی نگرانی وغیرہ اسلامی اصول حکمرانی کے متعلق بہت سی مفید ہدایات ہیں۔

یہ کتاب تاریخ کے ہر دور میں عقیدت کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہے، امام ابو یوسف کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو صدقہ جاریہ کی طرح تا قیام قیامت باقی رہے گا!

اور

مامون اور علم کی سرپرستی

مامون نے سلاطین روم سے تعلقات پیدا کئے، ان کو ترجمہ کرانے ہدایا وتحائف بھیجا اس کے بدلہ میں ان سے فلسفہ کی

ں چنانچہ ان کے پاس افلاطون، ارسطاطالیس بقراط - جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ کی جو کتابیں موجود تھیں، بھیجدیں، ماموں نے ماہرین مترجموں کو ان کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا چنانچہ ان لوگوں نے جہاں تک ممکن تھا، ان کا ترجمہ کیا ترجمہ ہونے کے بعد پھر مامون نے لوگوں کو ان کتابوں کے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کا شوق دلایا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانہ میں بغداد میں علم کا بازار گرم ہو گیا، جب علماء اور صاحب وجاہت لوگوں نے دیکھا کہ مامون وابستگان علم وفن کو اپنا مقرب خاص بناتا ہے، اور ان کی صحبتوں میں بیٹھ کر ان کے مناظروں اور ان کے علمی مباحث سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ان کو بڑے بلند مراتب پر پہنچاتا ہے، تو ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا شوق پیدا ہو گیا علماء فقیہ، محدثین، متکلمین، اہل لغت مورخین، شعراء، ماہرین اور نسابین سب کے ساتھ یہی طرز عمل تھا - اس قدر دانی اور علماء کی سابقت فی العلم سے اسی زمانہ میں اکابر علماء کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جس نے اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے طب کا راستہ بنایا، اور ادب کے آئین واصول مرتب کئے تا آنکہ عباسی حکومت رومیوں کے عہد کمال کا مقابلہ کرنے لگی۔[1]

طب کی کتاب

واثق نے مشہور فلسفی وطبیب حنین بن اسحٰق سے طب پر ایک کتاب لکھائی - جس کا نام کتاب المسائل الطبیعہ تھا -

زیچ ملک شاہ

ملک شاہ سلجوقی، خلافت عباسیہ کا متولی بھی تھا - اور بجائے خود بھی فرماں روا تھا، بڑی خوبیوں کا آدمی تھا،

ملک شاہ سلجوقی خود بھی صاحب علم اور اس سے زیادہ علم وفن اور اہل علم وارباب کمال کا قدردان تھا، اس کے دور کے علمی خدمات کے سلسلہ میں سب سے اہم اور قابل ذکر زیچ ملک شاہی ہے جسے اس کے نام پر حکیم عمرو خیام نے ترتیب دیا تھا، یہ زیچ چھپ کر شائع ہو چکی ہے -

مدرسہ نظامیہ

نظام الملک طوسی نے اپنے زمانے میں اس نے علم وفن کی بڑی خدمت کی اور تعلیم کی اشاعت کی بڑی کوشش کی - بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، مرو، موصل، آمل اور عراق کے تمام شہروں میں مدرسے قائم کئے - عماد الدین اصفہانی کا بیان ہے کہ جس

علم

[1] سے علم کلام کی بہ حوالہ طبقات الامم

بستی میں کوئی بڑا عالم موجود تھا، وہاں نظام الملک نے ایک مدرسہ اور ایک کتب خانہ قائم کیا۔ ان سب سے بڑا مدرسہ نظامیہ بغداد تھا، اسے بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا تھا، اس کی تعمیر پر دو لاکھ دینار بھی تقریباً دس لاکھ روپیہ صرف ہوا، دو سال میں اس کی عمارت تیار ہوئی، ذیقعدہ ۴۵۹ھ میں بڑے اہتمام سے اس کا افتتاح ہوا کئی لاکھ روپے سالانہ اس کا خرچ تھا، اس کے متعلق دارالاقامہ بھی تھا، تمام طلبہ کو وظائف ملتے تھے، اس دور کے منتخب علماء درس کے لئے فراہم کئے تھے، امام ابو اسحٰق شیرازی، ابو نصر صباغ، ابن الخطیب شارح حماسہ ابو الحسن فصیحی قطب الدین شافعی اور امام غزالی جیسے یگانۂ عصر علماء مختلف اوقات میں اس مدرسہ کی تعلیم و تدریس کی مسند پر بیٹھے مدرسہ نظامیہ کے تفصیلی حالات آئندہ کسی جلد میں آئیں گے۔

ان مدارس کے اخراجات کا معتدبہ حصہ نظام الملک اپنی جیب خاص سے دیتا تھا اور حکومت کی جانب سے بھی امداد مقرر تھی ابن اثیر کا بیان ہے کہ نظام الملک نے ممالک محروسہ کے سارے شہروں میں مدارس قائم کئے، اور ان کے مصارف کے لئے بڑی بڑی رقمیں مقرر کیں۔

قزوینی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک اپنی آمدنی کا جز کروروں سالانہ تھی دسواں حصہ مدارس کے لئے نکالتا تھا، اور چھ لاکھ دینار سالانہ تقریباً تیس لاکھ روپے حکومت کی جانب سے ملتے تھے،

مدرسہ مستنصریہ مدرسۂ مستنصریہ سے پہلے بغداد کا سب سے بڑا مدرسہ نظامیہ تھا، لیکن وہ نظام الملک طوسی کی یادگار تھا، خاص عباسی خلفاء کی کوئی علمی یادگار نہ تھی، مستنصر نے اس کمی کو پورا کیا اور ایسا عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، جس کے سامنے نظامیہ ماند پڑ گیا۔

ذہبی کا بیان ہے کہ ۶۲۵ھ میں دجلہ کے ساحل پر اس مدرسہ کی بنیاد پڑی، سات برس میں عمارت بن کر تیار ہوئی اور ۶۳۲ھ میں بڑی شان و شوکت سے اس کے افتتاح کی تقریب عمل میں آئی، قضاۃ، علماء و مدرسین اور اکابر دولت و عمائد سلطنت اس تقریب میں شریک تھے۔

مدرسہ کے متعلق ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں ۸۰ بار شتر نفیس اور منتخب کتابیں تھیں، مدرسہ میں چاروں مذاہب کے ۲۴۸ طلبہ داخل ہوئے اور چار درجے استاد شیخ الحدیث، شیخ النحو، شیخ الطب اور شیخ الفرائض مقرر کئے گئے، چھوٹے مدرسین کی تعداد ان کے علاوہ تھی، طلبہ کو مدرسہ کی جانب سے کھانے

مٹھائیاں اور میوے ملتے تھے، مدرسہ کے مصارف کے لئے بہت بڑی جائیداد وقف کی۔

ابن واصل کا بیان ہے کہ روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی مدرسہ نہ تھا اور نہ کسی مدرسہ کا وقف اتنا بڑا تھا، اس میں چاروں مذاہب کے طلبہ تھے، مدرسہ سے متعلق ایک شفاخانہ، مطبخ اور ٹھنڈے پانی کے لئے آبدار خانہ تھا، طلبہ کو چٹائیاں فرش، تیل، کاغذ، قلم دوات، مفت اور کھانے کے علاوہ ہر طالب علم کو ایک اشرفی ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، مدرسہ سے متعلق ایک عمدہ حمام بھی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ عہد عباسیہ ایجاد و توسیع علوم و فنون کے اعتبار سے اسلام کی پوری تاریخ میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے اس عہد میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں ایک عرصہ تک یورپ کی درسگاہوں میں بطور نصاب درس شریک رہیں، یورپ کی موجودہ علمی ترقی رہین منت ہے مسلمانوں کی علم نوازی کی۔

عدل و انصاف

اگرچہ عباسیوں نے ظلم و ستم میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، انہوں نے عوام اور علماء کو اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش کی جس نے ذرا بھی سرتابی کی، اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی اور اسے قرار واقعی سزا دی گئی،

لیکن عباسیوں کی تاریخ میں ہمیں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ انہوں نے عدل و انصاف کو قائم رکھا، اور اس سلسلہ میں ایسی شاندار مثالیں قائم کیں، جو آج تک اپنا ایک خاص وزن رکھتی ہیں، ذیل میں چند تاریخی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

علی بن عیسیٰ کی معزولی

خراسان کے والی علی ابن عیسیٰ کے جور و ظلم سے مسلمان اور ذمی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب عاجز تھے وہ خراسان کے اعیان و عمائد کی تذلیل و تحقیر کرتا تھا اور سب سے ناجائز روپیہ وصول کرتا تھا، لیکن ہارون الرشید کو خوش رکھتا تھا، اس لئے اس کو اس کی زیادتیوں کی خبر نہ ہونے پاتی تھی، لیکن جب اس کے مظالم حد سے بڑھ گئے، اور ہارون الرشید کے پاس پیہم اس کی شکایتیں پہنچیں تو اس نے بڑی ذلت کے ساتھ علی بن عیسیٰ کو معزول کر کے اس کی جگہ ہرثمہ بن اعین کا تقرر کیا۔

فریاد رس مامون

ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت نے فریاد کی کہ مامون کے لڑکے عباس نے اس کی جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے، جب مقدمہ پیش ہوا تو مامون نے عباس کو بڑھیا کے پاس کھڑا کر کے دونوں کے بیانات لئے، شاہزادہ آہستہ آہستہ بولتا تھا، اور بڑھیا کی آواز بلند تھی۔ وزیر دولت احمد بن ابی خالد نے روکا کہ امیر المومنین کے سامنے بلند آواز سے باتیں کرنا خلاف ادب ہے، مامون نے کہا، حق نے اس کی آواز بلند کر دی ہے اور عباس کو گونگا کر دیا ہے۔ دونوں کے بیانات سننے کے بعد بڑھیا کے حق میں فیصلہ دیا اور موکل کو لکھ کر اس کی جائیداد واپس کرا دی اور بڑھیا کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی۔

معتضد کے مقابلہ میں ابو حازم کا انصاف

ایک امیر نے مختلف آدمیوں سے قرض لے رکھا تھا معتضد نے قاضی ابو حازم کے پاس کہلا بھیجا کہ اس شخص کے ذمہ میرا قرض بھی ہے، امید ہے کہ دوسرے قرضخواہوں کے ساتھ میرا قرض بھی عدالت سے دلوایا جائے گا، قاضی ابو حازم نے جواب میں کہلایا کہ امیرالمومنین اپنا وہ قول یاد کریں جو منصب قضا سپرد کرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں نے قضا کا عہدہ اپنی گردن سے نکال کر تمہاری گردن میں ڈالدیا ہے۔ اس لئے اب مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ محض دعویٰ پر بغیر کسی شہادت کے کوئی فیصلہ دوں، معتضد نے جواب میں کہلایا کہ فلاں فلاں دو ذی عزت آدمی میرے شاہد ہیں، ابوحازم نے پھر جواب میں کہلایا کہ شاہدوں کو عدالت میں آکر شہادت دینی چاہیئے، میں جرح کروں گا، اگر شہادت سچی ثابت ہوئی تو قبول کی جائے گی ورنہ جو ثابت ہوگا اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، لیکن قاضی ابوحازم کی جرح کے خوف سے دونوں شاہدوں میں سے کسی نے شہادت نہ دی۔ اس لئے معتضد کا دعویٰ مسموع نہ ہوا[1]

قادر باللہ کا عدل

ابن طقطقی لکھتا ہے کہ قادر کے زمانہ میں عباسی خلافت کا وقار دوبارہ قائم ہوا۔ اس کی رونق بڑھ گئی اور اس کے پورے نظام میں قوت پیدا ہو گئی، دیالمہ خودسری کے عادی چلے آتے تھے، جسے جو منصب چاہتے تھے دے دیتے تھے، جسے چاہتے تھے معزول کر دیتے تھے ۳۹۵ھ میں شرف الدولہ قاضی القضاۃ نے حج کی امارت کیلئے ابو احمد الحسین کے تقرر کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ تقرر قادر کے خلاف مزاج تھا اس نے مسترد کر دیا۔

قیام عدل میں اتنا اہتمام تھا کہ بڑے بڑے ارکان دولت بھی کسی پر زیادتی نہ کر سکتے تھے، قاضی بغداد حسین ابن ہارون کا بیان ہے کہ کرخ میں ایک یتیم کی قیمتی جائیداد محکمۂ قضا کی تولیت میں تھی، قادر کے حاجب کے بعض احباب اس کو خریدنا چاہتے تھے، حاجب نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ میں جائیداد کو قضا کی تولیت سے آزاد کر دوں تاکہ وہ من مانی قیمت پر خرید لیں، میں نے اس کی تعمیل نہیں کی، حاجب نے مجھ کو بلا بھیجا، مجھے بڑا خوف پیدا ہوا اور جانے کا وعدہ کر کے حاجب کے شر سے بچنے کے لئے معروف کرخی کے مزار پر دعا

[1] تاریخ الخلفا

کے لئے چلا گیا، یہاں ایک درویش بیٹھا تھا، اس نے پوچھا کس لئے دعا کرتے ہو، میں نے واقعہ بیان کیا، یہاں سے واپس ہو کر حاجب کے گھر پہنچا وہ دیکھتے ہی برس پڑا، بڑے نازیبا الفاظ استعمال کئے، اور میرا کوئی عذر نہ سنا، اتنے میں ایک نوجوان نے ایک رقعہ لا کر حاجب کو دیا، اسے پڑھ کر اس کا رنگ اڑ گیا اس نے مجھ سے معذرت کی اور پوچھا کیا آپ نے خلیفہ کو اس واقعہ کی خبر کر دی تھی، میں نے انکار کیا، بعد میں معلوم ہوا کہ جو درویش معروف کرخی کی قبر پر ملا تھا وہ خود قادر باللہ تھا۔

اگرچہ یہ ملوک ہر اعتبار سے مطلق العنان تھے، لیکن عدل و انصاف کے معاملہ میں اسلام کے قائم کئے ہوئے روایات سے انحراف کرتے ہوئے جھجکتے تھے اور ذاتی عیش و تنعم کے باوجود قاضی کے معاملات میں شاذ و نادر ہی مداخلت کی جرأت کرتے تھے۔

خانہ جنگیاں

عباسیوں کے عہد میں خانہ جنگیاں بھی ہوئیں اور امویوں کے زمانہ میں زیادہ ہوئیں ، ان خانہ جنگیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے دبدبہ میں فرق آگیا ، خلافت کی عظمت کمزور ہو گئی ، پہلے ترکوں نے تسلط حاصل کیا - پھر دیالمہ سلاجقہ اور دوسری قوتیں ابھریں ، رفتہ رفتہ خلافت بغداد ایک ایسی حکومت بن گئی ، جو جائداد وقف کی طرح بیچی نہیں جاسکتی ، لیکن جس پر تمام مکمل متولی کا قبضہ ہوتا ہے ، ان متولیوں نے خوب بہت فائدہ اٹھایا ، اور خلفا کو کمزور کر دیا ، ان کی ہیبت مٹ گئی ، ان کا دبدبہ ختم ہو گیا - اگرچہ شروع میں خانہ جنگیوں کے دبانے میں کامیاب ہوگئے ،

ابومسلم کے کارنامے

عباسی دعوت چونکہ اہل بیت کے نام پردہ میں ہوئی تھی اس لئے ان کے بہت سے ہواخواہ اس میں شریک ہوگئے تھے ، لیکن بنی امیہ کے خاتمے کے بعد جب ان کی توقع کے خلاف اہل بیت کے بجائے بنی عباس کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو وہ ان کے خلاف ہو گئے - چنانچہ ایک محب اہل بیت شریک نے بخارا میں علم بغاوت بلند کیا - تیس ہزار آدمی اس کے ساتھ ہو گئے لیکن ابومسلم نے اس کا خاتمہ کرادیا ، ایک اور خراسانی امیر بسام بن ابراہیم باغی ہو گیا - اس کے ساتھ بھی ایک جماعت ہو گئی تھی ، سفاح نے خادم ابن خزیمہ کو بھیجکر اس کا بھی خاتمہ کرادیا

امین اور مامون کی جنگ

۱۹۵ھ میں علی بن عیسیٰ بن ماہان کو امین نے ۵۰ ہزار فوج کے ساتھ مامون کے مقابلہ کے لئے خراسان بھیجا ، امین کی ماں زبیدہ خاتون نے خود اس فوج کو روانہ کیا اور فوج کے افسر علی بن عیسیٰ کو ہدایت کر دی کہ مامون کی گرفتاری کے بعد اس کے ساتھ کوئی اہانت آمیز سلوک نہ کیا جائے - اس کا احترام ملحوظ رکھا جائے اور ایک چاندی کی زنجیر دی کہ گرفتاری کے بعد اس میں باندھا جائے غرض شعبان ۱۹۵ھ میں فوج بغداد سے اس شان سے روانہ ہوئی کہ اہل بغداد نے کبھی ایسا منظر آنکھوں سے نہ دیکھا تھا

مامون کو بغداد کی تمام خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس لئے وہ مدافعت کے پورے انتظامات کر چکا تھا اور اس کی فوجیں مقابلہ کے لئے روانہ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ آگے بڑھ کر علی بن عیسیٰ کو اطلاع ملی کہ طاہر بن حسین خراسانی فوج کے ساتھ مقابلہ کے لئے رے پہنچ چکا ہے۔ اس لئے علی بھی اسی سمت بڑھا رے سے چند فرسخ کی مسافت پر دونوں کا سامنا ہوا۔ طاہر نے جنگ شروع ہونے سے پہلے فوج میں امین کی فسخ بیعت اور مامون کی بیعت کا اعلان کرا دیا تاکہ علی بن عیسیٰ لوگوں کو امین کی بیعت کا فریب نہ دے سکے۔ بغدادی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار تھی، اس کے مقابلہ میں خراسانی ۴ ہزار سے بھی کم تھے۔ تاہم انہوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ طاہر نے بغدادی فوج کا قلب توڑنے میں پورا زور صرف کر دیا اور اسکی فوج کے ایک سپاہی نے علی کو تیر کا نشانہ بنا دیا۔ علی کے قتل ہوتے ہی بغدادی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور خراسانیوں نے ان کی بڑی تعداد قتل کر دی طاہر نے مامون کو ان الفاظ میں فتحمندی کی اطلاع دی، امیر المومنین کو مژدہ ہو کہ علی کا سر میرے سامنے ہے۔ اس کی انگوٹھی میری انگلی میں ہے اور اس کی فوج میرے قبضۂ اقتدار میں ہے ـــــ ذوالریاستین نے یہ مژدہ مامون کو سنایا اور رعایا نے آکر سلام خلافت پیش کیا۔ اس کے دو دن بعد علی بن عیسیٰ کا سر پہنچا جس کی تشہیر کرائی گئی۔

ذوالریاستین کی ترکیب

ذوالریاستین بڑا مدبر اور عالی دماغ تھا۔ پہلے اس نے خراسانی امراء کو ملانے کی کوشش کی لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو مامون نے ذوالریاستین کے مشورہ سے قیام حق عمل بالحق اور احیائے سنت کی عام دعوت دی اور خود عدل وانصاف میں خاص اہتمام کرنے لگا۔ اس تدبیر سے چند ہی دنوں میں سارا خراسان اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ مامون نے چوتھائی خراج معاف کر دیا، اس کا اتنا اچھا اثر پڑا کہ سارا خراسان مامون کے ساتھ ہو گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ مامون ہمارا بھانجا (مامون کی ماں عجمی تھی) اور ہمارے نبی کا ابن عم ہے:

فسطاط پر قبضہ

۲۹۲ھ میں فسطاط پر (جو طولون حکومت کے ماتحت تھا) قبضہ ہو گیا اور یہاں مکتفی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ فسطاط پر قبضہ کے بعد محمد بن سلیمان نے طولونی خاندان کے تمام ارکان اور ان کے وابستگان دولت کو یہاں سے ہٹا کر نیا نظام قائم کیا اور مصر و شام سے طولونی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

مقتدر کی ہلاکت

خلیفہ مقتدر نے اگرچہ ۲۵ سال تک فرماں روائی کی، لیکن اس کا سارا عہد عہدِ فتن تھا، شورش، ہنگامے، سازش، بغاوتیں، دو مرتبہ اسے تخت سے اترنا پڑا۔ آخری مرتبہ جان بھی گئی، اور تختِ حکومت بھی،

قرامطہ کا ظہور

۲۷۸ھ میں فرقہ قرامطہ کا ظہور ہوا، یہ فرقہ باطنیہ کی ایک شاخ ہے اور باطنیت ایران کے ثنوی مذہب سے نکلی تھی، اس مذہب میں دو طاقتیں کارفرما مانی جاتی ہیں نور و ظلمت، نور سے خیر کا اور ظلمت سے شر کا ظہور ہوتا ہے، یہی دونوں طاقتیں یزداں اور اہرمن کے نام سے موسوم ہیں، اس کے عقائد میں بہت سے فلسفیانہ خیالات کی آمیزش ہے عبدالقادر بغدادی نے کتاب الفرق بین الفرق میں اس کی تفصیل کی ہے۔

قرامطہ سے مقابلہ

۲۹۴ھ میں موسم حج کے اختتام کے بعد ذکرویہ قرامطی حجاج کے قافلوں کی تلاش میں نکلا اور کئی قافلے جو حج سے فراغت کے بعد واپس جا رہے تھے پورے کے پورے تہ تیغ کر دیئے۔ عورتوں تک کو زندہ نہ چھوڑا۔ ان کی عورتیں دم توڑنے والوں کو پانی پلانے کے بہانے کشتوں کے انبار میں گھومتی تھیں، جس میں ذرا جان نظر آتی تھی، اس کو مار ڈالتی تھیں، مکہ کے راستے کے تمام کنوئیں اور پانی کے حوض اور تالاب پاٹ دیئے۔ مقتول حجاج کی بے شمار دولت ان کے ہاتھ آئی۔

ان قافلوں کی اس دردناک بربادی سے مکتفی اور عام مسلمان بہت متاثر ہوئے اور مکتفی نے ہیرو وصیف اور بہت سے فوجی افسروں کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ذکرویہ کے مقابلے کے لئے بھیجا انہوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد قرامطہ کو بڑی فاش شکست دی ان کی بڑی تعداد قتل ہوئی، ذکرویہ خود زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔[1] اور وہ تمام مسلمان قیدی جو ان کے ہاتھوں میں اسیر تھے، رہا ہوئے، حجاج کا لوٹا ہوا مال واپس ملا۔ ذکرویہ زخموں کے صدمہ سے مر گیا۔ اس کی لاش مکتفی کے ملاحظہ کے لئے بغداد بھیجی گئی، کچھ قرامطی بچ کر شام نکل گئے تھے حسین بن حمدان[2] نے ان کا تعاقب کر کے خاتمہ کیا، اور جہاں تک ہو سکا عراق سے ان کا استیصال کیا گیا۔

آزادیٔ تقریر

خلافتِ راشدہ کے دور میں عامی سے عامی شخص کو فکر وخیال، اور قول وعمل کی جو آزادی حاصل تھی، اس کا خمیازہ، اموی دور ہی میں نکل گیا تھا، لیکن نہ صرف اموی، نہ صرف عباسی، بلکہ ہر دور میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جو بڑی سے بڑی ہستی کے مقابلہ میں خواہ وہ سلطانِ عصر، اور خلیفۂ وقت ہی کیوں نہ ہو، دل کی بات کہنے سے نہیں چوکتے تھے، عباسی عہد میں اس طرح کی مثالیں کم ملتی ہیں لیکن یہ صفحہ بالکل سادہ نہیں ہے، اس دور میں بھی ایسے لوگ اسٹیج پر آتے رہے، جو اپنے دل کی بات کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔

منصور کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ منصور خطبہ دے رہا تھا اور خدا کی حمد شروع کی تھی کہ ایک شخص نے اٹھ کر کہا "امیر المؤمنین آپ جس کا (خدا) ذکر کر رہے ہیں اسے میں آپ کو یاد دلاتا ہوں" منصور نے کہا، مرحبا تم نے بڑی جلیل القدر ذات کو یاد کیا اور بڑی عظیم ہستی کا خوف دلایا، میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہو کہ جب ان کو خدا کا خوف دلایا جاتا ہے تو ان کی نخوت اور ان کا غرور ان کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ پند وموعظت ہمارے ہی گھر سے شروع ہوتی ہے اور ہمارے ہی یہاں سے نکلی ہے۔ اس لئے ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت تمہارا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگ کہیں کہ اس شخص نے خلیفہ پر اعتراض کیا اور اس کے بدلہ میں اس کو سزا دی گئی، یہ بہت پست مقصد ہے میں تم کو معاف کرتا ہوں"۔

رحم ورعایت

عباسیوں کے عہد حکومت میں ہمیں ایسی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے خطاکاروں اور مجرموں سے درگزر کی، ان کی ناقابلِ معافی باتوں کو نظر انداز کیا، اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس کی بظاہر کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ باغیوں تک کو معافی دے دی، ہجو گو شاعروں اور بدگوئی کرنے والے دشمنوں کو معاف کر دیا۔ نہ صرف معاف کیا، بلکہ انعام سے مالا مال بھی کر دیا۔

باغی کی معافی

قطن بن معاویہ نے نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم کا ساتھ دیا تھا جب انہوں نے خروج کیا تھا ان کے قتل کے بعد وہ گرفتار ہو کر خلیفہ منصور کے سامنے پیش کیا گیا اس نے کہا۔

"امیر المومنین میں قطن بن معاویہ ہوں جس نے حضور کے خلاف اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ آپ کی نافرمانی کی، آپ کے دشمن کا ساتھ دیا۔ آپ کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ ان جرائم کے بعد اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو آپ اس کے اہل ہیں اور اگر سزا دینا چاہیں تو میرے چھوٹے سے گناہ کے بدلے میں قتل کر سکتے ہیں۔ منصور نے پھر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد سر اٹھا کر کہا: کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے پھر اپنے جرائم دہرائے۔ منصور نے کہا: امیر المومنین نے تم کو معاف کیا۔ یہ سنکر میرا حوصلہ بڑھا، میں نے عرض کی حضور کے دروازے سے اس حال میں واپس جاؤں گا کہ میری جائیداد اور میرا گھر ضبط ہے۔ اس لئے اگر رائے عالی ہو تو اس کی واگذاری کا بھی حکم ہو جائے۔ منصور نے اسی وقت عبدالملک بن ایوب والی بصرہ کے نام یہ حکم لکھوا دیا کہ "امیر المومنین قطن بن معاویہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان کی جائداد گھر اور جو کچھ ضبط کیا گیا ہو سب واپس کر دیا جائے۔" یہ حکم لے کر میں بصرہ پہنچا اور عبدالملک کے حوالہ کیا۔ اس نے فوراً میری پوری املاک واگذاشت کر دی۔

حسن سلوک

عبدالسلام بن صالح کا بیان ہے کہ ایک شب کو مامون نے مجھے روک لیا ہم دونوں آدھی رات گئے باتیں کرتے رہے کہ چراغ جھلملانے لگے۔ مامون نے روشنی کے محافظ کو آواز دی مگر وہ سو چکا تھا۔ میں نے چاہا کہ اٹھ کر درست کر دوں لیکن مامون نے روک دیا اور خود اٹھ کر درست کر دیا۔ اس کے بعد ملازم بیدار ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت اس پر ضرور ڈانٹ پڑے گی۔ لیکن مامون نے کچھ نہیں کہا۔

امین کا شاعر اور مامون

امین کے درباری شاعر حسین بن ضحاک نے اس کا نہایت دردناک مرثیہ لکھا تھا۔ اس میں مامون کے مفروضہ ظلم وستم کی داستانیں بیان کی تھیں۔ جب مامون کے ہاتھوں میں زمام خلافت آئی تو اس نے حسین سے کوئی مواخذہ نہیں کیا، صرف دربار میں آنے کی ممانعت کر دی، پھر چند دنوں کے بعد خود ہی اس کو بلا کر پوچھا کہ فلاں فلاں ابیات جو تم نے لکھے ہیں کہاں تک صحیح ہیں۔ اس نے کہا "امیر المومنین میں امین کے قتل پر اپنے جذبات دبا نہ سکا۔ وفور غم میں غلط

اور صحیح کی تمیز کس کو ہوتی ہے۔ میں نے مرحوم کے ماتم کا حق جن لفظوں میں ہو سکا ادا کر دیا۔ اگر آپ مواخذہ کریں تو آپ کا حق ہے اور بخشش دیں تو آپ کی فیاضی ہے۔ یہ سنکر خود مامون کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حکم دیا اس کی تنخواہ بحال کر دی جائے۔

معتضد کی انسانیت

ایک مرتبہ ایک خادم پشت پر کھڑا مگس رانی کر رہا تھا۔ اتفاق سے مورچھل معتضد کے سر پر زور سے لگ گیا اور اس کی ٹوپی گر گئی۔ لوگ ڈر گئے کہ خادم کو معلوم نہیں کیا سزا ملے گی۔ معتضد نے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ایک دوسرے خادم سے کہا یہ آدمی اونگھ گیا ہے اس کو آرام کرنے کے لئے بھیجدو اور کوئی دوسرا آدمی بلالو۔ اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا "یہ مگس ران اونگھ گیا تھا۔ بھول چوک سے غلطی کرنے والے پر عتاب و مواخذہ نہیں ہے۔"

عوام کی اقتصادی حالت

دولت کا غیر اسلامی اور ناجائز صرف جس طرح امویوں کے دور میں شروع ہو گیا تھا، اسی طرح عباسیوں کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔

لیکن کم از کم ایک بات ضرور تھی،

یہ کہ عوام کی حالت کچھ زیادہ ناروزبوں نہیں تھی، وہ بہر حال آسائش، اور طمانیت کی زندگی بسر کرتے تھے ضروریات زندگی کے سلسلہ میں انہیں ایسی دشواریاں نہیں پیش آتی تھیں، جو ان کی زندگی اجیرن کر دیں، اور وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگیں۔

ارزانی کا دور منصور کے زمانے میں ارزانی کا یہ حال تھا کہ مینڈھا ایک درہم میں، باربردار جانور چار وانق میں، کھجور ایک درہم میں ساٹھ رطل یعنی تقریباً تیس سیر، روغن زیتون ایک درہم میں آٹھ سیر گائے کا گوشت ایک درہم میں ایک من سے زیادہ، بکری کا گوشت، ایک درہم میں تیس سیر شہد ایک درہم میں پانچ سیر چربی ایک درہم میں چھ سیر ملتی تھی۔ اس ارزانی کی وجہ سے رعایا نہایت آسودہ حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتی تھی۔

نظم و نسق اب جس زمانہ کی تاریخ حوالہ قلم کی جا رہی ہے، وہ زمانہ، صرف شخصی آمریت کا زمانہ تھا۔ بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا، وہ جو چاہتا تھا غیر مسئول طور پر کر سکتا تھا، اور کرتا تھا، اس مطلق العنانی کا اثر نظم و ضبط اور ملک کے آئین و دستور پر بھی پڑا تھا، قانون کی پابندی ہے تو بہت زیادہ، اور نہیں ہے تو بالکل نہیں، خلفائے راشدین کے زمانہ میں حدود اللہ کے سلسلہ میں کوئی رعایت قطعاً ناممکن تھی، لیکن اب حدود اللہ کا اجرا بھی فرمان سلطانی کا تابع تھا۔ اس میں رعایت بھی ہو سکتی تھی، اور اسے منسوخ بھی کیا جا سکتا تھا۔

منصور اور ایک شرابی ابن ہرمہ بہت بڑا شرابی تھا۔ ایک دفعہ منصور کے پاس آ کر اس نے

یہ اشعار پڑھے (ترجمہ اشعار) آپ جس شخص کو امن دیتے ہیں اس کی ماں ہلاک ہوتی ہے اور جس شخص کو ہلاک کرتے ہیں اس کی ماں روتی پھرتی ہے۔ یہ سنکر منصور بہت خوش ہوا اور کہا کہ کیا مطلب ہے اس نے کہا کہ آپ عامل مدینہ کو لکھ دیجئے کہ جب وہ مجھے نشہ میں دیکھے تو مجھ پر حد نہ لگائے۔ منصور نے کہا کہ میں خداوند تعالےٰ کے حدود میں دخل انداز نہیں ہوسکتا۔ اس نے کہا تو پھر کوئی حیلہ ہی میرے لئے کر دیجئے۔ منصور نے عامل مدینہ کو لکھا کہ جب کوئی شخص ابن ہرمہ کو نشہ کی حالت میں پکڑ کر لائے تو اس لانے والے کے سو درے اور ابن ہرمہ کے ۸۰ درے لگا دینے چاہئیں اس حکم کے بعد اگر عامل مدینہ (عون) خود بھی اس کو نشہ کی حالت میں دیکھتا تو کچھ نہ کہتا کہ کون اسی درے لگوانے کے بدلے میں سو درے کھائے۔ کہتے ہیں کہ منصور نے ابن ہرمہ کو ہزار درہم بھی عطا کئے تھے۔

حسن انتظام بنی امیہ کے دور میں اکثر انتظامی شعبے آپس میں خلط ملط تھے، لیکن مہدی نے ان کو الگ کر کے ان کی علیحدہ علیحدہ تنظیم کی اور نگران مقرر کئے اور اس کا نام دیوان الازمہ رکھا، اس جدید تنظیم سے بہت سے نئے شعبے اور محکمے قائم ہو گئے اور حکومت کا پورا انتظام نہایت مرتب ہو گیا۔ مکہ۔ مدینہ یمن اور بغداد وغیرہ اہم شہروں کے درمیان اونٹ اور خچروں کی ڈاک قائم کی اور پوری اسلامی قلمرو کے کوڑھیوں کی پرورش کا انتظام کیا۔

حق کی آواز

بنو عباس کے جلال و جبروت کا یہ عالم تھا کہ امراء اور وزراء تک ان کے سامنے آتے ہوئے کانپتے تھے، ان کی ہاں میں ہاں ملانا اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ ان کے ایک اشارہ پر سر تن سے جدا ہو سکتا تھا۔ ان کے ایک اشارہ پر ایک گداگر بے نوا، سلطان وقت کا حریف بن سکتا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ اہل دنیا کے لئے تھا جو لوگ خدا سے ڈرتے تھے، وہ دنیا میں کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، ان کا نعرۂ حق بلند ہوتا تھا، اور قیمت میں اپنی جان پیش کر کے بھی سچی بات کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

عبد اللہ کا جواب صاف

۱۴۴ھ میں جب بنو ہاشم نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی تو منصور نے سختی سے ان کی تلاش شروع کی اور بنو ہاشم کے اشخاص کو بلا کر ان کا پتہ پوچھا۔ مگر کسی نے صحیح جواب نہ دیا۔ منصور نے نفس ذکیہ کے والد عبداللہ پر سختی کی کہ وہ نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کو حاضر کریں۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ اگر وہ میرے پاس ہوتے جب بھی قتل کے لئے تمہارے حوالہ نہ کرتا۔

منصور سے ایک سوال

ابو مسلم کے قتل کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ دربار میں داخل ہوا اور پوچھا "ابو مسلم کہاں ہے" ؟ منصور نے جواب دیا "فرش پر لیٹا ہوا ہے۔" عیسیٰ نے کہا "کیا قتل کر دیا گیا ــــ" ؟ منصور نے اثبات میں جواب دیا، عیسیٰ نے "انا للہ" پڑھا اور کہا اس کے کارناموں اور جاں بخشی کے بجائے یہ سلوک ؟"

لیکن منصور کی نگاہ خشم گیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

خلیفہ اور قاضی

ایک مرتبہ مہدی کا ایک لڑکا قاضی شریک کی خدمت میں حاضر ہوا اور ٹیک لگا کر ان سے حدیث پوچھی۔ شریک نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اس نے دوبارہ پوچھا، شریک نے پھر کوئی توجہ نہ کی۔ لڑکے نے کہا آپ خلفاء زادوں کی توہین کرتے ہیں۔

شریک نے کہا ایسا نہیں ہے البتہ علم کی نا قدری نہیں کرتا بلکہ احترام کرتا ہوں۔ شاہزادہ سمجھدار تھا۔ فوراً سمجھ گیا اور گھٹنے ٹیک کر حدیث پوچھی، شریک نے کہا ہاں اس طرح علم حاصل کیا جاتا ہے۔

رشید کا گریۂ بے اختیار

ابن سماک ایک روز ہارون الرشید کے پاس آیا ہارون کو پیاس لگی اس نے پانی مانگا۔ جب کسی نے پانی لا کر دیا۔ تو ابن سماک نے کہا ذرا ٹھہریئے اگر آپ کو شدت کی پیاس ہو اور کہیں پانی نہ دستیاب ہو تو آپ ایک پیالہ پانی کتنے میں خرید سکتے ہیں۔ ہارون نے جواب دیا کہ نصف سلطنت میں۔ ابن سماک نے کہا اچھا اب پانی پی لیجئے۔ جب ہارون پانی پی چکا تو ابن سماک نے پھر پوچھا کہ اگر یہ پانی جو آپ نے پیا ہے پیٹ میں رہ جائے تو اس کے خارج کرانے میں کیا خرچ کر سکتے ہو۔ ہارون نے کہا کہ باقی تمام بادشاہت دے دوں۔ ابن سماک نے کہا بس آپ یاد رکھیئے کہ آپ کی تمام بادشاہت ایک پیالہ پانی اور پیشاب کی قیمت رکھتی ہے ایک لائق شخص کے لئے اس کی رغبت کرنا محض حماقت ہے۔ یہ سنکر ہارون الرشید بہت رویا۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ شیبان سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا وہ مصاحب جو تمہیں خوف دلاتا ہے اور نڈر رہنے کا انجام برا ہو۔ رشید نے یہ سنکر کہا کہ ذرا کھول کر بیان کیجئے کہ آپ کا کیا مطلب ہے انہوں نے کہا جو شخص تم سے کہے کہ قیامت میں کل کو تم سے رعیت کے متعلق سوال ہونے والا ہے خدا سے ڈرتے رہو وہ اس شخص سے بہتر ہے جو تمہیں یہ بتلا دے کہ تم اہل بیت ہو تمہارے گناہ معاف ہیں کیونکہ تم نبی صلعم کے قریبی عزیز ہو یہ سن کر رشید اتنا رویا کہ پاس بیٹھنے والوں کو اس پر رحم آ گیا۔

مامون سے ایک سوال

مامون نے ایک روز بیان کیا کہ میں ایسا کسی شخص سے لاجواب نہیں ہوا جتنا کہ اہل کوفہ سے ایک شخص آیا اور اس نے عامل کوفہ کی شکایت کی۔ میں نے کہا تو جھوٹا ہے وہ تو بڑا عادل ہے۔ اس نے کہا امیر المومنین نے سچ فرمایا اور میں واقعی جھوٹا ہوں مگر اس عامل کو ہمارے شہر ہی کے واسطے کیوں مخصوص فرمایا کسی دوسرے شہر میں کیوں نہ متعین کیا گیا تاکہ دوسرے شہر والے بھی عدل و انصاف سے بھر دے، جیسا کہ ہم کو انصاف سے بھر رکھا ہے۔ میں نے آخر مجبور ہو کر یہی کہا کہ اچھا جاؤ ہم نے اسے معزول کیا[1]

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی

نظام الملک اور الپ ارسلان

الپ ارسلان (سنہ ۴۵۵ھ) نے اپنے کاتب نظام الملک طوسی کو وزیر بنایا، عمید الملک کندری کا درخور قائم رہا، ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اس لئے اس میں اور نظام الملک میں اختلاف شروع ہو گیا، نظام الملک نے الپ ارسلان کو بھڑکا کر عمید الملک کو قید کرا دیا اور چند دنوں کے بعد وہ قتل کر دیا گیا، قتل کے وقت اس نے الپ ارسلان کے پاس یہ پیام کہلا بھیجا کہ "حضور کے خانوادہ کی خدمت میرے لئے مبارک تھی، اس کے طفیل میں مجھے دونوں جہان کی نعمتیں ملیں حضور کے چچا نے وزیر بنا کر دنیا کا حاکم بنایا اور حضور نے درجۂ شہادت پر سرفراز کر کے دوسرے جہان میں امتیاز بخشا اور نظام الملک سے کہلا بھیجا کہ تم نے بادشاہ کو وزیر کشی کی تعلیم دے کر ایک بری رسم قائم کی ہے عجب کیا ہے کہ ایک دن تم کو یا تمہاری اولاد کو بھی یہ دن دیکھنا پڑے۔

قبول حق

قبول حق کی استعداد بہت بڑی نعمت ہے، انسان نفس کے بہکاوے میں آ کر، بڑی بڑی غلطیاں کر گزرتا ہے۔ لیکن اگر وہ انہیں تسلیم کر لے تو اس کی بہت بڑی سعادت ہے۔

عباسی خلفا کی زندگی پر ایک نظر ڈالیئے، اس فہرست میں جہاں ایسے لوگ نظر آئیں گے، جو حق کے مقابلہ میں تندی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے تھے، وہاں ایسے لوگ بھی دکھائی دیں گے جو حق بات سنتے تھے، اور اسے تسلیم بھی کر لیتے تھے، ان کا نفس انہیں گمراہ کرتا تھا، لیکن ان کا ضمیر انہیں سچی بات کے ماننے اور تسلیم کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا۔

ہارون کا ایک واقعہ

ہارون نے ایک مرتبہ ابن سماک سے نصیحت کی درخواست کی۔ انہوں نے فرمایا کہ خدا سے ڈر، جس کا کوئی شریک نہیں اور اس پر یقین رکھ کہ کل تجھے خدا کے روبرو جانا ہے اور وہاں تجھے دو مقاموں میں سے ایک مقام اختیار کرنا ہے جس کے علاوہ تیسرا مقام نہیں ہے۔ یہ مقام جنت و دوزخ ہیں۔ یہ سنکر ہارون اتنا رویا کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، یہ حالت دیکھ کر ہارون کے حاجب فضل بن ربیع نے کہا "سبحان اللہ امیر المومنین کے جنت جانے میں بھی کوئی شبہ ہے وہ خدا کے حقوق ادا کرتے ہیں، اس کے بندوں کے ساتھ عدل کرتے ہیں اس کے صلہ میں انشاء اللہ ضرور جنت میں جائیں گے۔" ابن سماک نے ہارون سے فرمایا — امیر المومنین اس دن فضل تیرے ساتھ نہ ہوگا، اس لئے خدا سے ڈرتا رہ اور اپنے

نفس کی دیکھ بھال رکھ " یہ سنکر ہارون پھر زار زار رویا ۔

متعہ کی حرمت کا اعلان

ایک بار قاضی یحییٰ بن اکثم مامون کے دربار میں پہنچے تو اتفاق سے اس وقت مامون نہایت برہمی کے ساتھ حضرت عمرؓ کا یہ قول "رسول اللہ صلعم اور ابو بکرؓ کے زمانے میں دو متعہ تھے میں ان کو روکتا ہوں" نقل کر کے کہہ رہا تھا کہ جس چیز کی رسول اللہؐ اور ابو بکرؓ کے زمانے میں اجازت تھی اس کے روکنے کا کسی کو کیا حق ہے، قاضی صاحب بیٹھ گئے، ان کا چہرہ متغیر تھا مامون نے پوچھا یحییٰ چہرہ کیوں متغیر ہے؟ انہوں نے کہا امیر المومنین اسلام میں ایک رخنہ پڑ گیا " اس نے پوچھا " وہ کیا ---؟" یحییٰ نے کہا زنا کی حلت کا اعلان " اس نے تعجب سے پوچھا " زنا ---؟" یحییٰ نے کہا " ہاں زنا ---! متعہ زنا ہی تو ہے ۔" مامون نے کہا " وہ کس طرح ---؟" یحییٰ نے کہا " کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلعم سے اور کلام اللہ کی یہ آیت " الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم " یعنی تمتع صرف دو طرح کی عورتوں سے جائز ہے بیوی یا لونڈی --- " پھر کر پوچھا کہ متوعہ عورت لونڈی ہے " مامون نے کہا نہیں ۔ پوچھا تو پھر کیا بیوی ہے اور اس کو شوہر کی وراثت اور شوہر کو اس کی وراثت ملتی ہے اور اس کے اور بیوی کے تمام شرائط یکساں ہیں ۔ مامون نے کہا نہیں ۔ یحییٰ نے کہا جب متوعہ ان دونوں میں سے کسی میں داخل نہیں ہے تو پھر قرآن کے مقرر کردہ حدود سے باہر ہے، اس استدلال کے ساتھ حضرت علیؓ کی یہ روایت سنائی کہ مجھ کو رسول اللہ صلعم نے حکم دیا کہ میں نے متعہ کی حرمت کی جس کی پہلے آپ نے اجازت دی تھی منادی کرا دی --- اس گفتگو کے بعد مامون نے اپنے فعل پر استغفار کیا اور متعہ کی منادی کرا دی ۔

باغ فدک

چند افراد نے اس سے فدک کی واپسی کی درخواست کی ۔ اس نے اس بارہ میں تحقیقات اور علماء سے استصواب کے بعد فدک یحییٰ بن حسین کے لڑکے محمدؒ کے حوالہ کر دیا ۔ اور اس طرح ، اس نے ایک بہت بڑے ، اور بہت پرانے جھگڑے کا اپنی طرف سے خاتمہ کر دیا ۔

واثق اور ایک قیدی

۲۳۱ھ میں روم سے ایک ہزار چھ سو مسلمان قیدی چھڑا کر آئے ابن داؤد نے کہا کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہو اس کو ان قیدیوں میں سے دو دو دینار دیکر چھوڑ دیا جائے اور جو شخص اس کا قائل نہ ہو اس کو مقید ہی رکھا جائے ۔

خطیب کہتے ہیں کہ ایک احمد بن داؤد ہی واثق پر تا بریافتہ ہو رہا تھا اور وہی اس کو تشدد پر مائل کرتا تھا اور لوگوں کو خلق قرآن کی دعوت دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص واثق کے پاس قید کر کے لایا گیا جو مقید بآہن تھا جب وہ آیا تو اس وقت ابن داؤد بھی موجود تھا۔ اس نے ابن داؤد کو مخاطب کر کے کہا جس مسئلہ کی طرف تم لوگوں کو بلاتے ہو اس کا علم رسول اللہ صلعم کو بھی تھا یا نہیں۔ اگر آنجناب کو اس کا علم تھا تو حضور نے اس کی طرف لوگوں کو نہیں بلایا۔ ابن ابی داؤد نے کہا کہ علم ضرور تھا۔ قیدی نے کہا کہ جب علم تھا تو جو کام رسول خدا نے نہیں کیا تم اس کو کیوں کرتے ہو اور آنجناب نے ناجائز رکھا تم کس طرح جائز سمجھتے ہو۔ اس کو سُنکر لوگ متحیر رہ گئے اور واثق ہنس کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے زنانہ میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔ بار بار کہتا تھا کہ جس امر کو رسول اللہ صلعم نے ناجائز قرار دیا ہم اس کو جائز سمجھ رہے ہیں جس معاملہ میں حضور صلعم نے خاموشی اختیار کی ہم اس میں تشدد کر رہے ہیں۔ اس کے بعد قیدی کے لئے تین سو دینار دینے کا حکم دیا اور اُس کو اُس کے شہر میں بھجوا دیا۔ اس کے بعد کسی کا امتحان نہیں لیا اور اسی روز سے ابن ابی داؤد سے بھی ناراض ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ قیدی ابو عبداللہ بن محمد ازدی امام ابو داؤد و امام نسائی کے استاد تھے[1]۔

متوکل اور ایک عالم

احمد بن علی بصری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ متوکل نے تمام علماء کو اپنے یہاں جمع کیا اور جب تمام آگئے تو پھر مجلس میں خود آیا۔ احمد بن معدل کے سوا تمام علماء اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ متوکل نے عبیداللہ سے دریافت کیا کہ اس شخص نے ہماری تعظیم کی؟ انہوں نے جواب دیا کہ امیرالمومنین ان کی بینائی میں فرق ہے۔ احمد بن معدل نے فوراً جواب دیا "نہیں میری بینائی میں فرق نہیں ہے، میں اچھی طرح دیکھتا ہوں۔ مگر اے امیرالمومنین میں تم کو عذاب خدا سے بچانا چاہتا ہوں کیونکہ نبی کریم صلعم نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوں ... اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔" یہ سُنکر متوکل انہیں کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔

ملک شاہ کی سلامت روی

ملک شاہ سلجوقی (عہد مقتدی باللہ) نغمہ و سرود سے بھی ذوق رکھتا تھا، اس سلسلہ میں ایک سبق آموز واقعہ قابل ذکر

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی

ہے۔ ایک مرتبہ ایک حسین اور خوش گلو مغنیہ کا گانا سن رہا تھا، اس کی آواز اور صورت بہت بھائی سلطان کی نیت میں فتور پیدا ہوا، یہ دیکھ کر مغنیہ نے کہا۔ "اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حسین و جمیل چہرہ آتش دوزخ کا ایندھن بنے، حلال و حرام کے درمیان صرف ایک بول کا فاصلہ ہے" سلطان کے دل پر یہ بات اثر کر گئی۔ اس نے کہا "تم سچ کہتی ہو" اور اسی وقت قاضی کو بلوا کر اس سے نکاح کر لیا[1]

رجوع الی الحق، اور رقت قلب کی یہ مثال تنہا نہیں تاریخ کے صفحات کھنگالے جائیں تو اس طرح کی مثالیں اتنی فراہم ہو سکتی ہیں کہ ایک پورا دفتر تیار ہو جائے۔

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی

جود و کرم

بذل و عطا، داد و دہش، اور جود و کرم کی جتنی، شاندار اور یگانہ مثالیں، عباسیوں کے دور خلافت میں ملتی ہیں مشکل سے تاریخ کسی ایک ہی خاندان میں اتنی اور ایسی مثالیں پیش کر سکے گی۔

اور اس جود و کرم کے لئے کوئی خاص طبقہ مخصوص نہیں تھا، عزیز، رشتے دار، علما، صلحا، کے علاوہ، گویا ساز ندوں، شاعروں اور مصاحبوں پر بھی ابر کرم کی بارش ہوتی تھی، اور خوب ہوتی تھی، دیکھتے دیکھتے مفلوک اور نادار، لکھ لٹ، اور لکھ پتی بن جاتا تھا۔

سفاح کی سخاوت عبداللہ بن حسن علوی کا بیان ہے کہ میں نے دس لاکھ کی رقم نہیں دیکھی تھی سفاح کو میری اس حسرت کا جب علم ہوا، تو اس نے یہ رقم خطیر منگا کر میرے سامنے ڈھیر کر دی، اور جب میں جانے لگا، تو کہا "اسے بھی تو لیتے جاؤ۔"

مروان کا توشہ خانہ ربیع حاجب کا بیان ہے کہ آخری اموی فرمانروا مروان بن محمد کا جو توشہ خانہ عباسیوں کے قبضہ میں آیا تھا، اس کو منصور نے ایک دن کھولا تو اس میں صرف ریشم کے تھانوں کی بارہ ہزار گانٹھیں نکلیں اور جب مہدی کے قبضہ میں یہ توشہ خانہ آیا تو اس نے خادموں اور غلاموں میں اسے تقسیم کر دیا۔ ایک ایک شاعر کو اس نے پچاس ہزار اشرفیاں دیں۔

خطیب نے اپنی یگانۂ روزگار کتاب تاریخ بغداد میں، مہدی کی فضول خرچیوں، غلط بخشیوں، اور رنگ رلیوں کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

ہارون الرشید کی دریا دلی ہارون الرشید اپنے دادا ابو جعفر منصور کے قدم بقدم چلتا تھا مگر فرق یہ تھا کہ منصور بخیل و حریص تھا اور یہ نہیں تھا بلکہ شاید اس سے بڑھ کر سخاوت اور جود و عطا میں کوئی خلیفہ اس کا ہمسر گذرا ہو۔ حتیٰ کہ ایک بار اس نے سفیان بن عیینہ کو ایک لاکھ روپیہ عطا کر دیا تھا اور اسحٰق موصلی کو ایک دفعہ دو لاکھ روپیہ دینے کا حکم دے دیا تھا اور

مروان بن ابی حفصہ کو ایک قصیدہ کے عوض پانچ ہزار دینار دے دیئے تھے اور اسی کے ساتھ خلعت اور اپنا خاص گھوڑا اور دس رومی غلام بھی عنایت کئے تھے۔

تین کروڑ

مامون کی غلط بخششوں کے لئے خزانہ کی آمدنی ناکافی ثابت ہوتی تھی۔ لیکن مامون کا ہاتھ رکتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ دمشق میں تھا۔ روپیہ کی تنگی تھی مگر اتفاق سے جلد ہی خراج کی تین کروڑ کی رقم آ گئی۔ مامون نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم تو روپیہ لے کر واپس جائیں اور ہمارے ساتھی محروم رہیں اور اسی وقت کل رقم تقسیم کرا دی۔

اس کا اصولِ زندگی یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے اہل حاجت کی ضرورت پوری کی جائیں۔ یحییٰ بن خالد برمکی سے کہا کرتا تھا کہ لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کا موقع غنیمت جانو۔ آسمان کی گردش اور زمانہ کا ظلم کسی کو ایک حالت میں نہیں رہنے دیتا اور نہ کسی کی حیثیت ہمیشہ یکساں قائم رہتی ہے۔

شانِ ملوکیت

عباسی خلافت کی بنیاد، مذہب اور حب اہل بیت پر تھی، قدرتاً یہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے کہ اس دور میں مذہب کی قدر قیمت کیا تھی، اور اہل بیت اطہار کے نقوش قدم کہاں کہاں نظر آتے ہیں؟

امام حسینؓ نے یزید سے جنگ اس لئے نہیں کی تھی کہ اس کی بادشاہت ختم کر کے اپنی ملوکیت قائم کر دیا جائے کی تھی بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کریں، اور اس زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں جس کی مثالیں آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے عہد گرامی میں صاف اور بین طور پر نظر آتی ہیں۔ لیکن ان مثالوں کے بجائے یہاں جو نمونہ نظر آتا ہے وہ صرف ملوکیت کا ہے۔

منصور کی قدردانیاں منصور موسیقی سے بہت دلچسپی رکھتا تھا اور شعرا اور گویوں کو بڑی بڑی رقمیں دیتا تھا کبھی کوئی شاعر اور گویا اس کے دربار سے خالی ہاتھ واپس نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "جو لوگ سرور مجھے نقد دیتے ہیں ان کا انعام ادھار پر نہیں ٹالا جا سکتا۔"

ہادی کی شراب نوشی ذہبی کہتے ہیں کہ ہادی شراب پیا کرتا تھا اور لہو و لعب میں مشغول رہتا تھا اور ایک نفیس گدھے پر سواری کرتا تھا، اور خلافت پر بہت معقول چڑک کرتا تھا مگر باوجود اس کے نہایت فصیح و قادر الکلام اور اعلیٰ درجہ کا ادیب تھا[1]

ہادی کا شکوہ و جلال ہادی جملہ اوصاف جہانبانی سے متصف تھا۔ ابن طقطقی لکھتا ہے کہ ہادی بیدار مغز، غیور، فیاض، جری، بہادر، سخت گیر، مجتمع الحواس اور عزم و ہمت کا فرمانروا تھا۔ سیوطی کا بیان ہے کہ وہ بڑے دبدبہ اور جبروت کا خلیفہ تھا، جب وہ نکلتا تھا تو عصابردار اور سپاہی اس کے آگے ننگی تلواریں اور کھنچی ہوئی کمانیں لے کر چلتے تھے۔

---

[1] تاریخ الخلفا سیوطی

ہارون کی غلط بخشی

اسحٰق موصلی کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ہارون الرشید کے پاس آ کر قصیدہ پیش کیا (ترجمہ) جب اس عورت نے بخل کا حکم دیا تو میں نے کہا بخل کم کر کیونکہ مال ایسی چیز ہے جو آنی جانی ہے۔ میں لوگوں کو سخی کا دوست دیکھتا ہوں اور بخیل کا دنیا میں کوئی دوست نظر نہیں آتا۔ بخل بخیل کو عیب دار بناتا ہے۔ میرا نفس اس سے بری ہے کہ مجھے کوئی بخیل کہے۔ اس جوان کے اچھے حالات میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس کے پاس کچھ ہوتا ہے، تو ہمیشہ عطا کرتا رہتا ہے، میں فقر سے خوف اور تونگری سے حسرت کیوں کروں جبکہ امیرالمؤمنین کا میری طرف بہت اچھا خیال ہے۔" یہ سنکر ہارون الرشید نے کہا ہاں ہاں کیوں خوف کرتے ہو۔ اے فضل اس کو ایک لاکھ درہم دے دو۔ واللہ اس کے اشعار بہت ہی اچھے ہیں اور اس کے اصول اور فضول بہت ہی پاکیزہ ... نے عرض کیا یا امیرالمؤمنین میرے اشعار سے تو یہ آپ کا فرمان ہی بہت اچھا ہے (جس کی وجہ ... نے کہا فضل اس کو ایک لاکھ اور دے دو۔"

امین کے مصارف

کہتے ہیں کہ امین اطراف و کناف سے کھیلنے کودنے والوں کو بلاتا تھا اور ان کی تنخواہیں مقرر کر دیتا تھا اور وحوش اور درندے اور ہر قسم کی چڑیاں پال رکھی تھیں۔ اپنے اہل بیت اور امراء سے پردہ کرتا تھا اور ان کو ذلیل کرتا تھا۔ بیت المال کو لٹا دیتا تھا۔ جواہر نفائس فضول خرچی میں ضائع کر دیئے تھے۔ کھیل کود کے واسطے مختلف مکان بنوائے تھے ایک گویئے کو اچھے گانے کے صلہ میں ایک کشتی سونے کی بھر دی تھی۔ پانچ کشتیاں کھیل کے لئے ان پانچ جانوروں شیر، ہاتھی، عقاب، سانپ اور گھوڑے کی شکل پر بنوائی تھیں اور ان پر بہت سا مال خرچ کیا تھا۔[1]

مامون کی شادی کے مصارف

مورخین کا بیان ہے کہ تاریخ اسلام میں اس شان کی شادی کی دوسری مثال نہیں ملتی اور اسے عہد مامون کے اہم واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ بارات میں مامون کے سارے خدم و حشم فوج اور جملہ عمائد شریک تھے۔ ۱۹ دن تک

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی

برات مقیم رہی۔ حسن نے بڑی اولوالعزمی سے بارات کی مدارات کی۔ یہ واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ شادی کے ان کاغذ کے پرزوں پر نقدی، جائداد، غلام اور ہر قسم کا نقد و جنس اور ساز و سامان لکھ کر ان کی گولیاں بنا کر لٹائیں۔ جس کو جو گولی ملی فوراً اس کو مرقومہ چیز اس کے حوالہ کر دی گئی۔ ان گولیوں کے علاوہ طلائی اور نقرئی سکے براتیوں پر لٹائے گئے۔ مامون کے بیٹھنے کے لئے خالص سونے کا فرش تھا جیسے ہی اس نے اس پر قدم رکھا۔ اوپر سے بیچ موتی نچھاور کئے گئے اور جب پہلی مرتبہ مامون بوران سے ملا تو بوران کی دادی نے دولہا دلہن کے اوپر سے ایک ہزار بیش قیمت دُرِّ یتیم نچھاور کئے۔ مورخین اس شادی کے اخراجات اندازہ پانچ کرور کرتے ہیں[1]

متوکل باللہ کی حیات رنگین

مسعودی اور ابن طقطقی وغیرہ نے لکھا ہے کہ متوکل شراب پیتا تھا چار ہزار کنیزیں اس کے حرم میں تھیں۔ اس نے تفنن طبع کے لئے دربار میں مسخروں، بھانڈوں کو جلا دی تھی اور اس قبیل کی بہت سی چیزیں رائج کیں جس سے یہ مذاق پہلے امراء اور اراکین سلطنت میں پھر رعایا میں بھی پیدا ہو گیا۔

معتز کی شان

پہلے خلفا کے ساز میں چاندی کا تھوڑا سا کام ہوتا تھا، لیکن معتز کی سواری کا ساز خالص سونے کا ہوتا تھا۔[2]

مقتدی سے ملک شاہ کی لڑکی کی شادی

محرم ۴۸۰ھ میں ملک شاہ سلجوقی کی لڑکی پہلی مرتبہ رخصت ہو کر خلیفہ مقتدی باللہ کے پاس بغداد آئی، اس کی بارات کا جلوس اس شکوہ و تجمل کا تھا کہ اہل بغداد نے اس سے پہلے کبھی ایسا منظر نہ دیکھا تھا، ۱۳۰ اونٹوں اور ۷۴ خچروں پر جہیز کا طلائی و نقرئی سامان بار تھا اونٹوں اور خچروں کی جھولیں دیبائے رومی کی اور ان کی گھنٹیاں سونے اور چاندی کی تھیں خالص چاندی کے بارہ صندوقوں میں دلہن کے زیورات، جواہرات، اور ملبوسات تھے، خچروں کے آگے ۳۳ طلائی ساز کے اعلیٰ نسل کے گھوڑے تھے، ایک خالص سونے کا گہوارہ تھا تمام سلجوقی امراء جلوس کے ہمرکاب تھے، سب کے علیحدہ علیحدہ شمع و مشعل بردار تھے، اسی

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ ابن خلکان ج ا ص ۹۳ – ۹۴ [2] الفخری [3] تاریخ الخلفا سیوطی

نشان کا جلوس امراء کی بیویوں کا تھا۔ سب سے آخر میں دولہن کی سواری تھی، اس کے محفہ پر سونے اور جواہرات کا مرصع پردہ آویزاں تھا، اس کے گرد دو سو حسین ترکی کنیزوں کا گلرنگ دستہ تھا، یہ جلوس نہر معلیٰ پر پہنچا تو یہاں کے باشندوں نے اشرفیاں اور کپڑے نچھاور کئے، مقتدی نے وزیر دولت ابو شجاع کو تین سو سواروں کے ساتھ دلہن کے استقبال کے لئے بھیجا، اور اس کے لئے ایک نادر الوجود محفہ بھیجا، اس شان سے یہ جلوس قصر خلافت تک آیا۔

اس شب کو بغداد کے گلی کوچوں میں اتنی روشنی تھی کہ پورا شہر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

قیصر و کسریٰ

مقریزی کہتے ہیں کہ لوگوں پر تعجب ہے کہ وہ کسریٰ اور ہرقل کا تو ذکر کرتے ہیں مگر امیر معاویہؓ کو بھول جاتے ہیں[1]

لیکن، امیر معاویہ کے بعد جو ملوک و سلاطین تخت خلافت کی زینت بنے، ان کے کارنامے دیکھنے کے بعد لوگ مجبور ہیں کہ امیر معاویہ کو بھول جائیں۔ اور صرف انہیں یاد رکھیں۔

رنگ رلیاں

ابن سعد نے سلمانؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے سلمانؓ سے پوچھا،
سلمان! میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟

سلمانؓ نے جواب دیا۔

"اگر آپ مسلمانوں سے ایک درہم بھی وصول کر کے بیجا خرچ کرتے ہیں تو بادشاہ ہیں ورنہ خلیفہ!"[2]

حضرت عمرؓ کی ساری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس کا جہاں سے جی چاہے، کوئی مطالعہ کرے۔ خلافت کا منصب قبول کرنے سے پہلے اور خلافت کا منصب قبول کرنے کے بعد بھی۔

اسی روشنی میں اب ذرا تاریخ کا دوسرا صفحہ آئیے اور دیکھئے کیا کیا گل بوٹے نظر آتے ہیں؟

منصور اور امام اعظم

منصور نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کو منصب قضا نہ قبول کرنے کے جرم میں، دُرّے لگائے اور قید کر دیا، اسی قید کی حالت میں آپ کا انتقال ہوا، ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے اس پر خروج کا فتویٰ دیا تھا۔ اس لئے اس نے زہر دلوا کر آپ کا کام تمام کرا دیا[3]

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی [2] [3] تاریخ الخلفاء

منصور کی وصیت

منصور نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے جانشین کے لئے جو وصیت نامہ مرتب کیا تھا، اس میں تحریر کیا تھا کہ

"میں نے تیرے لئے اتنی دولت جمع کر دی ہے اگر دس برس تک بھی تجھے خراج نہ ملے تو اخراجات کی تنگی کا تو شاکی نہ ہوگا۔

منصور اور مہدی

منصور نے سیم وزر کے انبار جمع کر لئے تھے، مرتے وقت وہ بہت بڑی دولت مہدی کے لئے چھوڑ گیا تھا، مسعودی کے بیان کے مطابق جواہرات کے علاوہ خزانہ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ اشرفیاں اور ساٹھ کروڑ درہم تھے۔ مہدی نے چند دنوں میں یہ ساری دولت اڑا دی، آخر میں خزانہ بالکل خالی ہو گیا، اور ابو حارثہ خزانچی نے کنجیاں لا کر اس کے سامنے پٹک دیں کہ خالی خزانہ کے لئے کنجیوں کی کیا ضرورت ہے!

لیکن جن کے ہاتھ میں اقتدار کی تلوار، اور حکومت کا خنجر ہوتا ہے، وہ کتنے ہی لکھ لٹ ہوں، کنگال نہیں بنتے، مہدی کی شاہ خرچیوں سے اگر ایک طرف خزانہ میں خاک اڑنے لگتی تھی، تو دوسری طرف وہ پھر، زر و جواہر سے مملو ہو جاتا تھا!

امین کی چاندنی

محمد بن راشد کہتے ہیں کہ ابراہیم بن مہدی نے مجھ سے بیان کیا مدینۃ المنصور میں امین کے ساتھ میں بھی تھا۔ مجھے اس نے ایک رات طلب کر کے یہ کہا کہ دیکھو یہ کیسی اچھی رات ہے چاندنی چٹک رہی ہے۔ پانی میں چاند کا عکس پڑ کر مناظر پیش کر رہا ہے۔ اگر ایسے میں دور شراب چلے تو بہت ہی اچھا ہے، میں نے کہا جیسے آپ کی مرضی ہو، چنانچہ شراب کا دور جاری ہو گیا۔

امین کی رنگ رلیاں

امین نہایت خوش رو، کشیدہ قامت اور شجاع و بہادر تھا۔ علمی استعداد بھی خاصی تھی۔ فصاحت و بلاغت اور ادب انشاء میں مہارت رکھتا تھا لیکن تدبیر و سیاست سے خالی اور عیش پرستی کا دلدادہ تھا چنانچہ حکومت ملنے کے بعد لہو و لعب، سیر و تماشہ عیش و عشرت میں ایسا ڈوبا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی، خواجہ سراؤں کو بڑی بڑی قیمتوں پر خرید کر ان

کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، ان کو اپنا محرم راز اور امور سلطنت میں مشیر کار بنایا۔ تمام ممالک محروسہ سے مسخروں کو جمع کر کے ان کے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کئے۔ ہر قسم کے جانوروں کو جمع کر کے ان کا عجائب خانہ قائم کیا، اپنے بھائیوں، خاندان شاہی کے ارکان اور افسران کو دربار سے الگ کر دیا۔ ان کی تحقیر و تذلیل کی، بیت المال کا کل نقد و جنس خواجہ سراؤں اور اپنے ہم نشینوں میں تقسیم کر دیا۔ عیش پرستی اور تفریحی مشاغل کے لئے طرح طرح کی نزہت گاہیں بنوائیں۔ دجلہ کی سیر کے لئے شیر، ہاتھی، عقاب، سانپ اور گھوڑوں کی شکل کے قیمتی بجرے بنوائے، ان پر بیٹھ کر دجلہ کی سیر کا لطف اٹھاتا تھا، شبانہ روز حسین عورتوں اور مسخروں کے ساتھ انہی رنگ رلیوں میں مصروف رہتا تھا۔ فضل بن ربیع اس کے پردہ میں حکومت کرتا تھا اور وہ شراب و کباب اور رنگ رلیوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ یہی غفلت اور لاپرواہی اس کی تباہی کا سبب بنی۔ اس کی غفلت کے علاوہ اس کے خود غرض عزیز فضل بن ربیع کے ناعاقبت اندیشانہ مشوروں نے اس کو اور زیادہ تباہ کیا۔

واثق کا دسترخوان ابن فہم کہتے ہیں کہ واثق کا دسترخوان چاندی کا بنا ہوا تھا جس کے چار ٹکڑے تھے۔ ہر ایک ٹکڑا بیس آدمی اٹھایا کرتے تھے اور جتنے کٹورے، گلاس اور برتن تھے تمام چاندی اور سونے کے تھے[1]

معتمد کے مشاغل معتمد کو رقص و نغمہ اور شعر و موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس کی بزم عیش میں ہر وقت ادب، شعر، رقص و سرود اور لہو و لعب کے مشاغل کا چرچا رہتا تھا۔ مورخین نے ان مجالس طرب کے بہت دلچسپ حالات لکھے ہیں۔

مقتدر کی رنگین مزاجی خلیفہ مقتدر باللہ کو عیش پرستی نے بالکل ناکارہ کر دیا تھا۔ اس کو امور مملکت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہر وقت عورتوں کی صحبت اور شراب نوشی میں مصروف رہتا تھا۔ عورتیں اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ اس کی ماں اور اس کی قہرمانہ ام موسیٰ حکمرانی کرتی تھیں۔ ان کے سامنے وزراء تک کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

---

[1] تاریخ الخلفا

فضول خرچیوں کی داستان

مقتدر باللہ نے ٹھاٹھ باٹھ اور طمطراق اتنا بڑھا دیا تھا کہ حکومت اس کے اخراجات کی متحمل نہ رہ گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محل شاہی میں محض گیارہ ہزار خواجہ سرا تھے۔[1]

لونڈیوں اور محلات شاہی پر بے دریغ روپیہ لٹاتا تھا، خزانہ کے تمام قیمتی جواہرات ان میں تقسیم کر دیئے تھے۔ اس کی تخت نشینی کے وقت خزانہ قیمتی جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں بعض بعض جواہرات نادرۂ روزگار تھے۔ تین مثقال وزن کا ایک در یتیم ایک لونڈی کو دے دیا۔ بیش قیمت جواہرات کی ایک تسبیح قہرمانہ کو دے دی۔ ہارون الرشید کا خریدا ہوا تین لاکھ اشرفی کا ایک یاقوت بھی اسی طرح ضائع کر دیا اور تھوڑی ہی مدت میں خزانہ جواہرات سے بالکل خالی ہو گیا۔

ایک ایک دربار کی شان و شوکت میں لاکھوں روپیہ صرف ہو جاتا تھا۔ ۳۰۵ھ میں روم کے سفراء کی باریابی کی تقریب میں ایک خاص دربار منعقد کیا تھا۔ اس کی شان و شوکت پر لاکھوں روپیہ صرف کیا۔ خطیب نے اس دربار کی پوری تفصیل لکھی ہے جس سے عباسی تمدن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس کی اس بیجا نمائش اور اسراف کی وجہ سے مصارف بڑھ گئے تھے۔ حکومت کے مصارف کے علاوہ مقتدر نے اپنے تعیش میں جو دولت اڑائی اس کا تخمینہ مورخین نے سات کروڑ اشرفی لگایا ہے۔ فضول خرچی نے خزانہ بالکل خالی کر دیا تھا۔ اکثر ملازموں کی تنخواہ کی تقسیم میں دشواری پیش آتی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کئی کئی مہینے کی تنخواہ چڑھ جاتی تھی۔ بعض مرتبہ تنخواہ کی تقسیم کے لئے شاہی سامان فروخت کرنے کی نوبت آ جاتی تھی۔

خلافت کے ٹھاٹھ

قاہر ہر وقت شراب کے نشہ میں مخمور رہتا تھا۔ اس کی شبستان عیش میں ساقی گری کے لئے ایک قد و قامت کی حسین و جمیل لونڈیوں کا پورا رسالہ تھا جو خندق برق مردانہ لباس میں ملبوس رہتی تھیں۔ عیش پرستی کے لئے اس نے ایک باغ لگوایا تھا اور اسی میں ایک عالیشان محل تعمیر کرایا تھا۔ باغ کی زینت اور محل کی آرائش کے لئے مختلف ملکوں سے درخت اور سامان آرائش منگائے تھے۔[1]

---

[1] تاریخ الخلفاء

نقض عہد اور اماں شکنی

عہد جاہلیت میں بھی عربوں کی آن اور وضع یہ رہی ہے کہ انہوں نے جسے ایک مرتبہ اماں دے دی پھر اس کی جان کے گاہک نہیں ہوئے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو، خواہ انہوں نے نادانستگی ہی کے باعث اماں کیوں نہ دے دی ہو۔

اسلام نے اس آن، اس شان، اور اس وضع میں اور زیادہ حسن و جمال پیدا کر دیا، اس نے کردار کی اس صفت کو بہت زیادہ جلا دے دی۔

لیکن، حکومت کا نشہ ان اخلاقی، اور مذہبی اقدار کو بھی خاطر میں نہیں لاتا، چنانچہ ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ اماں دے دی گئی، لیکن قابو پانے کے بعد، اسے بڑی آسانی کے ساتھ توڑ دیا گیا، ذرا بھی پروا نہ کی گئی کہ عہد کتنا مستحکم، اور اماں کتنی مؤکد تھی؛

منصور کی عہد شکنی

پہلے یہ منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ سے خواہش کی کہ وہ اپنے بجائے مہدی کو ولیعہد مان لے لیکن وہ اپنے حق سے دست بردار نہ ہوا تو منصور نے اس کا رتبہ گھٹانا شروع کیا۔ دربار میں ان کی جگہ بھی بدل دی اور اپنے بیٹے مہدی کے مقابلے میں اس کو گرانے اور ہر طرح کی تکلیف پہنچانے لگا۔ بالآخر ۱۴۷ھ میں اس کا نام ولیعہدی سے خارج کر کے اپنے لڑکے مہدی کو ولیعہد بنا دیا۔ اور اس طرح وہ عہد اس نے توڑ دیا، جو اس نے خدا کو گواہ بنا کر، عیسیٰ کی ولی عہدی کے بارے میں کیا تھا۔

منصور سے ایک سوال

منصور نے جب نفس زکیہ کو "اماں" دینے کا وعدہ کیا، تو انہوں نے لکھا، میں خلافت کا تم سے زیادہ حقدار اور ایفائے عہد کا تم سے زیادہ پابند ہوں۔ کیونکہ تم جیسی اماں مجھے دے رہے ہو ایسی معلوم نہیں کتنی امانیں دوسروں کو دے چکے ہو۔ تم مجھے کس طرح کی اماں دیتے ہو؟ جیسی ابن ہبیرہ کو دی یا جیسی اپنے چچا عبداللہ

بن علی کو دی، یا جیسی اپنی قوت بازو ابو سلمہ کو دی؟!!

منصور کا غصہ اور بڑھ گیا۔!

نفس زکیہ نے، جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے، ان سب کو امان دی گئی، پھر امان کے عہد کو پس پشت ڈال کر قتل کر دیا گیا۔

منصور کی امان شکنی منصور کے خلاف جب اس کے چچا عبداللہ بن علی نے بغاوت کی۔ تو اس نے ابو مسلم سے مدد کی درخواست کی ابو مسلم منصور کی مدد و اعانت کے لیے تیار ہو گیا اور نصیبین میں عبداللہ کو شکست دے کر اس کی جماعت منتشر کی۔ عبداللہ بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان کے گھر میں پناہ گزیں ہوا سلیمان نے منصور سے سفارش کر کے اس کی خطا معاف کرا دی لیکن امان ملنے کے بعد جب عبداللہ منصور کے پاس گیا تو اس نے اس کو قید کرا دیا اور قید ہی میں وہ مرا۔

پاس امان کی سزا خلیفہ منصور نے زیادہ بن عبیداللہ کو نفس زکیہ کی گرفتاری پر مامور کیا۔ یہ سید عامدینہ پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت نفس زکیہ بھی مدینہ آئے ہوئے تھے۔ زیاد نے ان کو امان دے کر بلا بھیجا۔ یہ آ گئے۔ زیاد نے امان کا پاس کر کے انہیں چھوڑ دیا اور اس کی سزا میں خود قید کیا گیا۔

نفس زکیہ اور منصور کا کردار علویوں نے مکہ میں جمع ہو کر منصور کو خفیہ قتل کر دینے کی سازش کی۔ عبداللہ بن محمد نے اس کام کا بیڑا اٹھایا لیکن نفس زکیہ نے اختلاف کیا اور کہا کہ ہم اس وقت تک اس کو دھوکے سے قتل نہ کریں گے جب تک اس کو خلافت سے دست برداری کا پیام نہ دے لیں۔

ہارون کی عہد شکنی ۱۷۶ھ میں نفس زکیہ کے بھائی یحییٰ بن عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب نے دیلم میں خروج کیا۔ مشرقی ملکوں کے بہت سے باشندے ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند ہی دن میں ان کی قوت بہت بڑھ گئی۔ ہارون الرشید نے فضل بن یحییٰ برمکی کو ان کے مقابلہ پر مامور کیا۔ برمکی خاندان، اہل بیت کا ہمدرد تھا۔ اس لیے فضل نے لڑنے کے بجائے حسن تدبیر

سے یحییٰ کو صلح پر آمادہ کر لیا اور یہ شرط قرار پائی کہ خود ہارون ان کو امان لکھ کر دے گا جس میں قضاۃ، فقہا اور عمائد بنو ہاشم کے دستخط ہوں گے۔ ہارون نے یہ تمام شرطیں مان لیں اور انعام و اکرام سے بھی نوازا، لیکن پھر قید کر دیا اور یحییٰ نے قید ہی میں انتقال کیا۔

خلیفہ مستعین باللہ کی ہلاکت

مستعین کی دستبرداری کے وقت امیر محمد ابن عبداللہ نے معتز سے اس کی جان و مال کی حفاظت کا وعدہ لیا تھا، لیکن خلیفہ ہونے کے بعد اس نے وعدہ کو طاق نسیاں کے حوالہ کر دیا اور شوال ۲۵۲ھ میں مستعین کو مروا ڈالا۔

کشتگانِ ستم

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

جو لوگ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یا ضمیر کی آواز پر کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ ملوک سلاطین کے ظلم وستم سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رہ سکتے، جو لوگ عافیت پسند ہوتے ہیں، جرم اور خطاسے دور رہتے ہیں، لیکن ملوک وسلاطین کے دامن سے وابستہ رہتے ہیں، وہ بھی اپنی زندگی سے زیادہ موت سے قریب رہتے ہیں۔

ملوک وسلاطین کی تاریخیں اسی قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، عتاب سلطانی، نہ حق کو دیکھتا ہے نہ ناحق کو، وہ صرف اس لئے ہے کہ بجلی بن کر گرے، اور معتوب کے جسم وجان کا رشتہ قطع کردے۔ اس طرح کی بہت سی مثالوں میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

ابومسلم کا قتل

منصور نے ایک دن ابومسلم کے آنے کے وقت مسلح آدمی چھپا رکھے، جب وہ آیا تو اس کی تلوار باہر رکھوالی گئی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر منصور نے تیور بدل کر کہا تم اپنے حدود سے کتنا آگے بڑھ گئے۔ اپنا نام پہلے لکھتے ہو، میری پھوپھی آمنہ کو تم نے شادی کا پیام دیا، تم اپنے کو سبط بن عبداللہ بن عباس بتاتے ہو۔ ابومسلم ہر جرم کی معذرت میں دست بوسی کرتا جاتا تھا، اس کے جرائم گنانے کے بعد منصور نے تالی بجائی اور مسلح آدمی نکل کر اس کے اوپر ٹوٹ پڑے اور عباسی حکومت کا یہ بانی اعظم جس نے اسی کی تائید میں چھ لاکھ آدمیوں کا خون کیا تھا، خود خاک وخون میں تڑپنے لگا۔

ابومسلم کا سب سے بڑا، اور ناقابلِ معافی جرم یہ تھا کہ اس نے امویوں کا استیصال کیا، اور عباسی خلافت کی بنیاد ڈالی۔

وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب

نفس زکیہ کی شہادت

رمضان ۱۴۵ھ میں عیسیٰ نے مدینہ میں منادی کرادی کہ "خدائے تعالیٰ نے باہم مسلمانوں کی خونریزی حرام کی ہے۔ اس لئے امن وصلح کا پیغام قبول کرو، جو شخص ہمارے پاس آجائے، یا گھر میں بیٹھ جائے، یا مسجد نبوی میں چلا جائے، یا ہتھیار ڈال دے یا مدینہ چھوڑ دے وہ مامون ہے، ہم کو اور نفس زکیہ کو تنہا چھوڑ دو، ہم دونوں سمجھ لیں گے۔" لیکن اہل مدینہ نے اس امان کا نہایت سخت جواب دیا اور دوسرے دن جنگ شروع ہو گئی۔ نفس زکیہ نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا۔ ابتداء میں ان کے ساتھیوں نے حمایت کا پورا حق ادا کیا۔ لیکن آخر میں بعضوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور نفس زکیہ محمد بن قحطبہ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اور ان کا سر کاٹ کر کے منصور کے پاس بھیجا گیا۔ منصور نے لوگوں کی عبرت کے لئے پہلے کوفہ میں پھر اور مقامات میں اس کی تشہیر کرائی۔

حضرت ابراہیم کا قتل

نفس زکیہ کے قتل سے فراغت کے بعد منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ کو ابراہیم کے مقابلہ میں جانے کا حکم دیا۔ باخمرا میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ پہلے حملہ میں عیسیٰ کی فوج کا بڑا حصہ پسپا ہو گیا، لیکن عیسیٰ نے پھر سنبھل کر اس زور سے حملہ کیا کہ ابراہیم کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ ابراہیم چھ سو جاں نثاروں کے ساتھ نہایت بہادری سے لڑتے رہے مگر دفعتہً مخالف فوج کا ایک تیر ان کی حلق میں آکر لگا اور ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ —— "میں کچھ چاہتا تھا مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی" —— اسی حالت میں ان کے ساتھی ان کو علیحدہ اٹھا کر لے گئے۔ ان کے ہٹتے ہی ان کی فوج نے میدان چھوڑ دیا اور ان کا سر کاٹ لیا گیا۔ یہ واقعہ ذی الحجہ ۱۴۵ھ کا ہے۔ اس وقت ابراہیم کا سن اڑتالیس سال کا تھا۔[1]

یعقوب کو سزائے قید

یعقوب مہدی کا نہایت کارگزار، خدمت گزار، اور وفادار وزیر باتدبیر تھا، لیکن اس کے دل میں آل حسن کی محبت بھی تھی اور وہ علانیہ ان سے اظہار عقیدت کرتا تھا اپنے دور وزارت میں اس نے بہت سے زیدیوں کو مناصب جلیلہ پر فائز کردیا، اور ان کی قابلیت سے حکومت کو فائدہ پہنچایا۔ لیکن حاسدوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے مہدی کو ورغلایا ساری سلطنت یعقوب اور اس کے آدمیوں کی مٹھی میں ہے۔ مہدی علویوں کے بارے میں

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ ابوالفداء

یعقوب کے جذبات عقیدت سے واقف تھا اس کے دل میں یہ بات اتر گئی۔ ایک موقع پر آزمائش کے طور پر اس نے یعقوب سے ایک علوی کو قتل کرنے کا وعدہ لیا اور اس کے حوالہ کر دیا۔ علوی نے یعقوب سے کہا "میں علی ابن ابی طالب اور فاطمہ کی اولاد ہوں، تم میرے خون کا بار اپنی گردن پر لیکر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔" یعقوب نے کہا "خدا کی قسم یہ بار میں اپنی گردن پر نہ لوں گا تم یہ مال لو اور اپنی جان بچا کر نکل جاؤ۔" ایک لونڈی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے فوراً مہدی کو اطلاع دی مہدی نے اسی وقت اس علوی کو گرفتار کرا لیا اور یعقوب سے بلا کر پوچھا "تم نے علوی کو کیا کیا" ۔ "انہوں نے کہا خدا نے اس سے امیر المومنین کو مطمئن کر دیا۔" مہدی نے کہا "کیا وہ مرگیا" ۔ "یعقوب نے اثبات میں جواب دیا۔ مہدی نے اس سے قسم لی اور قسم لینے کے بعد علوی کو بلوا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ یعقوب اس کو دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اب اس کے لئے کسی حیلہ کی گنجائش نہ تھی۔ مہدی نے اسی وقت اس کو قید کرا دیا۔[1]

مہدی کو یعقوب کی تمام خوبیاں اور کارگزاریاں اس "جرم عظیم" کے سامنے ہیچ نظر آئیں۔ اس نے ذرا بھی یہ نہ سوچا کہ مملکت کو یعقوب کی ذات سے کتنے فائدے پہنچ رہے ہیں۔ حالانکہ مہدی کی خلافت اور سلطنت کی بنیاد تمام تر حب اہل بیت ہی پر تھی! ——— فاعتبروا یا اولی الابصار

حسین بن علی بن حسن کا قتل

خلیفہ ہادی کے حکم سے محمد بن سلیمان اور سلیمان بن منصور نے مقام فخ میں حسین بن علی بن حسن کا مقابلہ کیا۔ اور شکست دی اور ان کا سر قلم کر کے ہادی کے سامنے پیش کیا، سر دیکھ کر وہ بہت برہم ہوا اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ کسی طاغوت کا سر لائے ہو۔ اس کا کم سے کم بدلہ یہ ہے کہ تم کو کچھ نہ دیا جائے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ہادی سر دیکھ کر رو دیا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی ترک یا دیلم کا سر لائے ہو۔ یہ عترت رسول کا سر ہے اس کا کمترین بدلہ یہ ہے کہ اس کا صلہ نہ دیا جائے۔

تقریباً اس سے ملتے جلتے الفاظ یزید نے بھی قاتلان حسین کے لئے استعمال کئے تھے۔ سیاست کی دنیا میں الفاظ کی کوئی قدر نہیں، جب تک عمل قول سے ہم آہنگ نہ ہو۔

---

[1] الفخری ابن اثیر،

جعفر اور ہارون

برامکہ اہل بیت اطہار کے ساتھ صرف حسن سلوک کا برتاؤ کرتے تھے اور ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ یحییٰ بن عبداللہ کو (نفس ذکیہ کے بھائی) رشید نے گرفتار کرا کے قید کرنے کے لئے جعفر کے حوالہ کیا۔ جعفر نے انہیں رہا کر دیا۔ فضل بن ربیع نے یہ ماجرا ہارون رشید کو کہہ سنایا، دوسرے روز جب جعفر دربار میں آیا تو ہارون نے پوچھا یحییٰ کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا امیر المومنین وہ اب تک قید خانے میں بند ہے۔ اس نے کہا سچ کہتے ہو؟ اس مکرر سوال پر جعفر تاڑ گیا کہ ہارون کو اس کی خبر ہو گئی، عرض کی میرے آقا وہ امیر المومنین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اس لئے میں نے ان کو چھوڑ دیا۔ ہارون نے جواب دیا اچھا کیا میں بھی ان کو چھوڑنا چاہتا تھا لیکن جب جعفر چلا گیا تو ہارون نے کہا میں تجھ کو قتل کر کے چھوڑوں گا۔[1]

حالانکہ سب سے زیادہ ہارون اس حقیقت کا رمز شناس تھا کہ جعفر نے اپنے حسن انتظام اور جود و عطا سے نہ صرف خلافت عباسیہ کا رتبہ بلند کر دیا تھا، بلکہ ہارون کی منزلت میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔

امام علی رضا کی وفات

مامون کو امام علی رضا سے اتنی محبت تھی کہ اس نے اپنی ایک لڑکی ام حبیب ان سے بیاہ دی اور دوسری ام الفضل محمد بن علی رضا سے شادی کے چند ہی دن کے بعد علی رضا دفعتہً انتقال کر گئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ موت انگور کھانے سے ہوئی۔[2] اسی بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ان انگوروں میں خود مامون نے زہر ملوا دیا تھا۔ بعض مورخین اس روایت میں کلام کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل پر ظلم

مامون کے عہد میں خلق قرآن کا فتنہ اٹھا تھا۔ اس کو اس مسئلہ سے اتنا شغف تھا کہ جو علماء اس کے منکر تھے انہیں سخت مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ مامون جس قدر خلق قرآن کے عقیدہ میں سخت تھا، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اسی قدر اس کے انکار میں متشدد تھے۔ آپ بھی آزمائش سے نہ بچ سکے لیکن مرتے دم تک آپ سے اس کا اقرار نہ کرا سکا اور مرتے وقت معتصم کو ان پر سختی کرنے کی وصیت کر گیا۔ یہ جاہل اور ناشناس ادب تھا، اس نے امام ابن حنبلؒ پر بڑی سختیاں کیں اور یہ فتنہ مامون کے عہد سے زیادہ بڑھ گیا۔ معتصم کا غلو یہاں تک بڑھا کہ اس نے سارے

---

[1] طبری ج ۱۰ ص ۔

ممالک محروسہ میں علماء سے خلق قرآن کا اقرار کرانے کے فرامین جاری کر دیئے اور معلموں کو حکم دیا کہ بچوں کو اس عقیدہ کی تلقین کریں۔[1]

امام شافعی، اور امام مالک کے واقعات پر مستقل کتابیں موجود ہیں، لہٰذا صرف ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

ذوالریاستین کا قتل

رجب ۲۰۲ھ میں مامون مرو روانہ ہوا۔ ابھی مامون سرخس پہنچا تھا کہ ۲ شعبان ۲۰۲ھ کو ذوالریاستین فضل بن سہل مامون کا وزیر اعظم ایک حمام میں خفیہ قتل کر دیا گیا اور قاتل روپوش ہو گئے۔ مامون نے پتہ چلانے والے کے لئے دس ہزار انعام مقرر کیا۔ عباس بن ہیثم دینوری نسان کو گرفتار کیا۔ ان میں سے ایک غالب مسعودی دوسرا قسطنطین رومی تیسرا فرج دیلمی اور چوتھا موفق صقلبی تھا۔ یہ سب مامون کے سامنے پیش ہوئے اور کہا کہ آپ ہی نے ہمیں قتل کا حکم دیا تھا۔ مامون نے اسی وقت سب کے سر قلم کر کے فضل کے بھائی حسن کے پاس بھجوا دیئے اور تعزیت میں لکھا کہ فضل کے قتل سے تم لوگوں پر جو مصیبت پڑی ہے اس کا مجھے خوب اندازہ ہے اور اس کی تلافی کے لئے فضل کی جگہ حسن کو وزارت عظمیٰ پر ممتاز کیا اور اس کی لڑکی بوران سے شادی کی۔

ہرثمہ کا قتل

عرب سردار ہرثمہ مامون کی خدمت میں جب باریاب ہوا تو اس نے اس سے کہا کہ تم نے کوفہ میں علویوں کو بڑھنے کا موقع دیا اور ابو السرایا کو بھڑکایا اگر تم چاہتے تو ان سب کو پکڑ سکتے تھے۔ ہرثمہ نے ہر چند معذرت کی لیکن مامون نے شنوائی نہ کی اور اس کو پٹوا کر قید کر دیا اور وہ قید ہی کی حالت میں قتل کر دیا گیا۔[2] یہ واقعہ ۲۰۰ھ کا ہے۔

اس طرح عجمی اثرات کے باعث ایک بہت بڑے شخص بہت بہادر، اور بہت بڑے عرب سردار سے مامون خود اپنی نادانی، اور علویوں سے دوستی کے باعث محروم ہو گیا۔

امین کا انجام!

امین ہارون کا بیٹا تھا، ہارون نے مامون کو خراسان اور امین کو بغداد بخش دیا تھا دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوئی، امین ہار گیا اور مامون جیت گیا۔ اس ہار جیت کا جو لازمی نتیجہ نکل سکتا تھا، وہ نکلا یعنی امین بے دردی اور قساوت کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

---

[1] تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۰۴　[2] ابن اثیر

قتل باہتمام خلیفہ

احمد بن نصر کے سامرا پہنچنے کے بعد واثق نے علماء کی ایک عام مجلس منعقد کی اور احمد سے پوچھا کہ قرآن کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا قرآن اللہ کا کلام ہے اور احمد بالکل صاف ہو کر قتل کے لئے آمادہ ہے۔ واثق نے پھر پوچھا کیا قرآن مخلوق ہے؟ انہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ قرآن کلام اللہ ہے۔ پھر سوال کیا کہ قیامت اور رویت باری کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ انہوں نے کہا۔ امیر المومنین! اس کے متعلق رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد ہے کہ تم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح بے بدلی کے صاف آسمان پر چودھویں کا چاند دیکھتے ہو۔ اس لئے میں اس حدیث کا پابند ہوں۔ اور دوسری مرفوع حدیث سفیان بن عیینہ کی ہے کہ ابن آدم کا قلب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہے جس کو وہ بدلتا ہے" اور رسول اللہ صلعم دعا فرماتے ہیں کہ "اے دلوں کے پلٹنے والے میرا دل اپنے دین پر قائم رکھ" یہ سن کر اسحٰق بن ابراہیم بولے دیکھو تم کیا کہہ رہے ہو؟ احمد نے کہا تم ہی نے مجھ سے کہلوایا ہے۔ اسحٰق نے کہا میں نے کہا تھا؟ احمد نے جواب دیا تم ہی نے مجھے امیر المومنین کو نصیحت کرنے کا مشورہ دیا تھا اور میری نصیحت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلعم کی حدیث کی مخالفت نہ کریں۔ اس گفتگو کے بعد واثق نے لوگوں سے پوچھا ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ سب اہل دنیا تھے، حاکم وقت کا اشارہ پاتے ہی زبانیں دراز ہو گئیں۔ عبد الرحمٰن بن اسحٰق نے جو کبھی پہلے بغداد کے قاضی رہ چکے تھے اور احمد بن نصر کے دوست تھے ان کو مباح الدم قرار دیا۔ ابو عبد اللہ ارمنی نے کہا امیر المومنین! اس کا خون مجھے پلا دیجئے۔ قاضی ابن ابی داؤد جو ابن نصر کے خون کا بار بھی اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے اور خلیفہ کی رضا مندی کے بھی خواہاں تھے یہ گول رائے دی کہ یہ کافر ہے، اس سے توبہ کرائیے، غالباً اس کو کوئی دماغی مرض اور عقلی فتور لاحق ہو گیا ہے۔

ان فتووں کے بعد اسی مجلس میں واثق نے اپنے ہاتھ سے احمد بن نصر کا سر قلم کیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

[illegible] احمد بن النصر خزاعی [illegible] حدیث تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم تھے قتل کر دیا [illegible] کا واقعہ [illegible] بیان کرتے ہیں [illegible] بغداد [illegible] قید کر کے بلایا اور ان سے خلق قرآن کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ قرآن شریف مخلوق نہیں ہے

انہوں نے پھر ان سے قیامت میں خداوند تعالیٰ کی رویت کے متعلق پوچھا آپ نے کہا کہ روایت سے ضرور رویت ثابت ہوتی ہے اور ایک حدیث پڑھ کر سنادی۔ واثق نے کہا تم جھوٹے ہو، انہوں نے کہا تم جھوٹے ہو۔ انہوں نے کہا افسوس ہے کہ تم خداوند تعالیٰ کو محدود مجسم اور ایک مکان میں مقید اور ایک دیکھنے والے کی آنکھ میں سماجانے والا سمجھتے ہو اور یہ صریح کفر ہے۔ فقہاء معتزلہ کی جو ایک جماعت واثق کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اس نے ان کی موت اور قتل کا فتویٰ دے دیا۔ واثق نے تلوار منگائی اور کہا جس وقت میں کھڑا ہوں تم میرے ساتھ نہ کھڑے ہونا کیونکہ ایسی صفات کے خدا کو پوجنے والے شخص کے قتل میں جو قدم میں اٹھاؤں گا۔ اس کا مجھے ضرور ثواب ملے گا۔ احمد بن نصر ایک چمڑے کے فرش پر پابہ زنجیر بٹھا دیئے گئے اور واثق نے ان کے پاس جا کر ان کو شہید کر دیا اور حکم دیا کہ ان کا سر بغداد بھیجا جائے اور وہاں لٹکا دیا جائے اور ان کا جسم سر من رائے میں سولی پر چڑھا دیا جائے۔ چنانچہ ان کا سر اور جسم اسی حالت میں رہا حتیٰ کہ جس وقت متوکل بادشاہ ہوا تو اس نے اتروا کر دفن کرا دیا۔ جس وقت انہیں سولی پر چڑھایا گیا تھا تو ان کے کان میں ایک پرچہ لکھ کر لٹکا دیا گیا تھا کہ یہ سر احمد بن نصر بن مالک کا ہے اس کو واثق باللہ نے قول خلق قرآن اور نفی تشبیہ خداوند تعالیٰ کی طرف بلالیا۔ اس سر پر ایک چوکیدار مقرر تھا کہ اس کو نیزہ کے ساتھ قبلہ رخ نہ ہونے دے۔[1]

ہولناک قتل

ایک سب سے بڑی خرابی متوکل میں یہ تھی کہ اس کو حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد سے مخاصمت بلکہ نفرت اور دشمنی تھی، وہ ان سے محبت رکھنے والوں تک کا دشمن ہو جاتا تھا، ایک دن اپنے لڑکوں معتز اور موید کے استاد یعقوب بن سکیت سے پوچھا کہ "تم کو ان سے محبت ہے یا حسنؓ حسینؓ سے۔" یعقوب نے جواب دیا ۔۔۔۔ کہ علیؓ کا غلام قنبر ان دونوں سے بہتر ہے، یہ جواب سن کر متوکل نے اسی وقت ان کو ترکوں سے روندوا کر مروا ڈالا اور ان کے لڑکوں کو دیت ادا کی۔[2]"

مشہد مقدس اور متوکل

اسی نفرت کی بناء پر خلیفہ متوکل نے جو اسے اہل بیت سے تھی ۲۳۶ھ میں حضرت حسینؓ کے مشہد مبارک اور اس کے قریب جوار کے مکانات منہدم کرا کے اس میں کھیتی کرائی اور اس کی زیارت سے لوگوں کو روک دیا۔[3]

---

[1] [2] تاریخ الخلفاء سیوطی [3] طبری جلد ۱۲ ص ۱۴۰

متوکل اور حضرت علیؓ

متوکل کی مجلسوں میں علی الاعلان حضرت علیؓ کے عیوب بیان کئے جاتے تھے۔ منتصر اس کی مخالفت کرتا تھا اور عیب جوئی کرنے والوں کو دھمکاتا تھا اور متوکل سے کہتا تھا کہ علیؓ ہمارے بزرگ اور بنی ہاشم کے شیخ ہیں۔ اگر آپ کو ان کو برا کہنا ہے تو خود کہیئے لیکن ان بیہودوں سے نہ کہلایئے۔

ابن زیات کا حشر

ان خوبیوں کے ساتھ زیات بڑا مغرور متکبر اور ظالم تھا۔ اس نے لوگوں کو سزا دینے کے لئے ایک تنور بنوایا تھا جس کے اندر ہر طرف کیلیں لگی ہوئی تھیں جس کو سزا دینا مقصود ہوتا تھا، اس کے اندر بٹھا دیا جاتا تھا اور ذرا حرکت کرنے سے کیلیں ہر طرف سے چبھنے لگتی تھیں۔ اگر کوئی رحم کی درخواست کرتا تو جواب ملتا کہ رحم ایک طرح کی کمزوری ہے، لیکن ظلم کبھی پھلتا نہیں تھا، کن راچاہ در پیش۔ معتصم اور واثق کا زمانہ تو آرام سے گذرا، متوکل کے زمانہ میں اسی تنور میں ڈال کر ہلاک کیا گیا۔

قبر حسینؓ اور متوکل

۲۳۶ھ میں متوکل نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی قبر مبارک اور ان مقابر کو جو اس کے ارد گرد واقع تھیں کھدوا دینے کا حکم دے کر وہاں کاشتکاری کرنے کو کہا اور لوگوں کو اس کی زیارت سے منع کر دیا، بہت دنوں تک یہ خراب اور جنگل بنا رہا۔ اس کی اس حرکت کی وجہ سے لوگوں کو اس سے بہت صدمہ پہنچا اور اس کو ناصبی (خارجی) کا لقب دے دیا اور اہل بغداد نے اس کو دیواروں اور مسجدوں پر گالیاں لکھ کر چسپاں کیں۔ شعرا نے اس کی ہجو میں نظمیں لکھیں۔ چنانچہ منجملہ ان کے ایک نظم یہ بھی تھی (ترجمہ)

واللہ بنی امیہ نے پیدا ہو کر نبی صلعم کے نواسہ کو ظلم سے قتل کیا۔ اب اس کے مثل ایک اور بنی امیہ آگیا، اور اس نے آپ کی قبر اکھڑوا پھینکی اسے رنج اور افسوس تھا کہ وہ ان کے قتل میں کیوں شریک نہیں تھا، اس لئے ان کی ہڈیاں اکھڑوا دیں۔

۲۳۷ھ میں نائب مصر کے نام حکم جاری کیا کہ وہ ابوبکر محمد بن اللیث قاضی القضاۃ کی داڑھی منڈوا کر اور گدھے پر چڑھا کر اس کی تشہیر کرے اور اس کے ۲۰ تازیانے مارے اور وہ اہل تھا بھی وہ اسی قابل۔ لوگ

اس کے ظلم سے تنگ آ گئے تھے اور عقیدۂ جہمیہ رکھتا تھا ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس کو معزول کر کے شہر میں تشہیر کرائی گئی اور روزانہ بیس[۲] کوڑے لگوائے گئے اور اس کے بجائے حارث ابن مسکین کو یہ عہدہ تفویض کیا گیا

یحییٰ کا سر — حسین بن اسمٰعیل ابوالحسین یحییٰ بن عمر ایک علوی بزرگ تھے مقابلہ پر مامور ہوا، اس نے اور عبدالرحمٰن نے بل کر ان کو شکست دی اور ان کے اعوان و انصار کی بڑی تعداد قتل و گرفتار ہوئی ۔ خود یحییٰ بھی شہید ہوئے، ان کا سر محمد بن عبداللہ بن طاہر کے پاس خراسان بھیجا گیا ۔ اس نے مستعین کے پاس بھجوا دیا (سنہ ۲۵۰ھ)

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

اس دنیا میں یہ ہوتا رہتا ہے کہ جو آج دولت مند ہے وہ کل نادار ہے، جسے بالش کمخواب پر تکلیف محسوس ہوتی ہے، وہ ہاتھ کا تکیہ بنا کر، زمین پر بغیر کسی بستر کے سوتا ہے، جو صدہا غلاموں اور خادموں کا آقا تھا، ایک وقت ایسا آیا کہ خود اسے ملازمت کرنی پڑی، دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گذارنی پڑی، ذلت اور پستی کے عالم میں سانس لینا پڑی۔

اس طرح کے واقعات چشم بینا کے لئے عبرت اور موعظت کی داستان ہیں اور یہ داستان ایسی ہے، جسے کبھی کبھی سن لینا، قلب کی بہت سی بیماریوں کا تیر بہدف علاج ہے،

اولاد حسنؑ کی گرفتاری

منصور نے رباح بن عثمان بن حیان المری کو مدینہ کا حاکم بنا کر بھیجا اور سخت تاکید کی کہ محمد اور ابراہیم (برادر نفس زکیہ) کی تلاش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ اس نے نہایت سختی کے ساتھ تلاش شروع کی۔ اس کی سختی دیکھ کر نفس زکیہ اور ابراہیم کو گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لئے وہ برابر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہے اور ان کا پتہ نہ چل سکا، رباح نے عبداللہ ابن حسن پر سختی کر کے ان سے پوچھنے کی کوشش کی۔ انہیں قتل بھی کرا دیا۔ لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔ اس لئے منصور کا غصہ اور تیز ہو گیا اور اس نے رباح کو حکم دیا کہ اگر نفس زکیہ محمد اور ابراہیم نہیں ملتے تو حسنؑ کی کل اولاد گرفتار کر لی جائے۔ چنانچہ یہ سب گرفتار کر کے پابجولاں بغداد بھیجے گئے۔ منصور نے انہیں قید میں ڈلوا دیا۔

یہ بڑھیا کون ہے

۱۸۷ھ میں ہارون نے جعفر کو قتل کرا دیا، انتقام کی کارفرمائی شروع ہوئی۔ محلات، باغات، جائیدادیں۔ نقد و جنس غرض کل اثاثہ ضبط کر لیا گیا۔ یحییٰ اور فضل دونوں باپ بیٹے جیل کے مصائب اور سختیاں جھیلتے جھیلتے بالترتیب ۱۹۰ھ ۱۹۳ھ میں نہایت بے کسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے، جن کی داد و دہش کے افسانے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں،

جود کی ندی پاشیوں کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان کے در سے مایوس نہ گیا، بڑا نادار بن کر در پر آتا، بنا دیتے تھے، علماء کو بوریہ فقر سے، قصرِ ایوان میں پہنچا دیتے تھے، شعرا اور ادبا کی ایسی سرپرستی کرتے تھے کہ وہ دنیا میں جنت کے مزے لوٹنے لگتے تھے، ادبار کے بعد یہ کیفیت ہوئی کہ جعفر کی ماں عبادہ جس کی خدمت میں چار چار سو کنیزیں رہتی تھیں، عین عید کے دن پھٹے پرانے کپڑوں میں محمد بن عبدالرحمٰن امام مسجد کوفہ کے گھر معمولی امداد کے لئے نظر آتی ہے اور اس کے پاس بکری کی دو کھالوں کے سوا (جن میں سے ایک اوڑھنی اور ایک بچھاتی ہے) اور کچھ نہیں ہے۔

امین کا قتل

طاہر کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت گھبرایا کہ اگر امین ہرثمہ کی پناہ میں چلا جاتا ہے تو اس مہم کی کامیابی کا سہرا اسی کے سر ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے امین کے محل کے گرد خفیہ پہرہ لگا دیا کہ جیسے ہی وہ نکلے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ امین کو اس کی خبر ہو گئی۔ اس نے جب دیکھا کہ پناہ مانگنے پر بھی اس کی جان بخشی ہوتی نظر نہیں آتی [illegible] آپ کی حفاظت کا سامان کر لوں تو چلئے گا۔ مگر امین پر کچھ ایسا خوف و ہراس طاری تھا کہ وہ ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوا، ہرثمہ نے مجبور ہو کر کشتیاں تیار کرا دیں۔ امین نے اپنے لڑکوں کو بلا لیا اور آخری مرتبہ ان سے رو رو کر جدا ہوا۔

محل سے نکل کر کشتیوں پر بیٹھا۔ ہرثمہ نے اس کے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دیا۔ طاہر کے آدمی پہلے ہی سے چھپے ہوئے تھے، جیسے ہی کشتیاں چلیں۔ انہوں نے دفعتاً حملہ کر کے ڈبو دیا۔ امین کو کسی نہ کسی طرح ملاح نے نکال لیا اور وہ پکڑ کر قید کر دیا گیا۔ رات کو طاہر کے آدمیوں نے قید خانہ میں گھس کر قتل کر دیا اور اس کا سر قلم کر کے طاہر کے حضور میں پیش کیا، اس نے ان لوگوں کی عبرت کے لئے پہلے اسے نصب کرایا، پھر مع عصا، خاتم اور دائے خلافت کے مامون کے پاس بھجوا دیا اور محرم ١٩٨ھ میں بغداد پر مامون کا مکمل قبضہ ہو گیا اور جمعہ کے دن جامع بغداد میں بحیثیت خلیفہ کے اس کے نام پہلا خطبہ پڑھا گیا۔

قتل کے وقت امین کی عمر ٢٨ سال تھی مدت خلافت ٤ سال آٹھ ماہ اور چند دن۔

مہتدی کا قتل

ترک دیوانہ وار خنجر لے کر مہتدی پر جھپٹ پڑے، باکیال کے چچا زاد بھائی نے جو

شراب کے نشہ میں چور تھا، وار کر کے گردن کی رگ کاٹ دی۔ خون کا فوارہ پھوٹ نکلا، وحشی ترک نے زخم میں منہ لگا کر خون پیا اور پی کر بولا۔ "آج جس طرح میں نے شراب سے سیر ہو کر پی تھی، ویسے ہی خون سے بھی خوب آسودہ ہوا" ۔یہ واقعہ رجب ۲۵۵ھ کا ہے۔ اس کے سوا قتل کی نوعیت کے متعلق اور روایتیں بھی ہیں۔

معتز کی ماں کا حشر معتز کی گرفتاری کے بعد اس کی ماں قبیحہ اپنی دولت کو بچانے کے لئے روپوش ہو گئی تھی۔ اس کی دولت و ثروت کا عام شہرہ تھا، اس لئے معتز کے قتل کے بعد اس کی تلاش شروع ہوئی، لیکن پتہ نہ چل سکا مگر زیادہ دن تک وہ چھپی نہ رہ سکی اگر وہ تلاش کر کے نکالی جاتی تو اس کے ساتھ اور برا سلوک کیا جاتا، اس لئے وہ خود نکل آئی اور کل دولت صالح بن وصیف کے حوالہ کر دی، ابن اثیر کا بیان ہے کہ پہلے پانچ لاکھ دینار سرخ بھیجے، اس کے بعد اصل خزانہ کا جس میں اٹھارہ لاکھ اشرفیاں تھیں پتہ چلا، نقد کے علاوہ بہت سے بیش قیمت جواہرات تھے، ان میں ایک زمرد اتنا بڑا تھا کہ اس زمانہ میں اس قد کا دوسرا زمرد نہ تھا، ایک صندوقچے میں بڑے بڑے موتی تھے، اس کے علاوہ یاقوت اور دوسرے مختلف جواہرات تھے۔ جس وقت صالح کے پاس یہ دولت پہنچی تو اس نے کہا کہ "اس بڑھیا کے پاس اتنی دولت موجود تھی اور صرف پچاس ہزار دینار کے لئے اس نے اپنے لڑکے کی جان لی۔ اور کل دولت پر قبضہ کر کے اس کو جلا وطن کر دیا[1]

مقتدر کا دردناک انجام مونس کی فوج کے آدمی پہنچ گئے اور تلواریں لیکر مقتدر پر ٹوٹ پڑے وہ ہر چند چلایا کہ میں خلیفہ ہوں لیکن وحشیوں نے کوئی شنوائی نہ کی اور جواب دیا کہ "ہاں ہم تم کو پہچانتے ہیں، تمہاری ہی تلاش تھی۔ تم ابلیس کے خلیفہ ہو"۔ اور زخمی کر کے زمین پر پٹک کر قتل کر دیا اور سر جدا کر کے کرسی پر آویزاں کیا، بدن کے کپڑے اتار کر عریاں لاش پھینک گئے، کسی نے دفن کرنے کی بھی ہمت نہ کی ایک راہ گیر نے گڑھا کھود کر لاش زمین میں دبا دی اس طرح ایک نا اہل خلیفہ کا عبرتناک انجام ہوا۔

قاہر کی قہرمانیاں تخت نشینی کے بعد قاہر نے مقتدر کی ماں کو گرفتار کر کے جس کی دولتمندی کے بڑے افسانے مشہور تھے۔ اس سے سختی کی، اس نے انکار کیا اور کہا اگر میرے پاس

---

[1] ابن اثیر ج ۷ ص ۶۵

دولت ہوتی تو میں روپے کے لئے اپنے لڑکے کی جان کیوں گنواتی —— اس کے انکار پر قاہر نے کوشش کی کہ وہ اوقاف ہی سے دست بردار ہو جائے اور قاہر کو ان کے بیچنے کا اختیار دے دے لیکن اس نے اس سے بھی انکار کیا اور کہا میں نے ان کو کارِ خیر کے لئے وقف کیا ہے اب نہ اُن کو توڑ سکتی ہوں اور نہ اُن کے فروخت کرنے کا اختیار دے سکتی ہوں مگر قاہر نہ مانا اور اوقاف سے زبردستی دستبرداری لکھوا کر ان کو گرو بنایا اور اوقاف کو فوج کے اخراجات کے بدلہ میں دے دیا ۔

عہدِ ادبار و انحطاط

جس طرح افراد و اشخاص بیمار ہوتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی بیمار پڑتی ہیں جس طرح افراد و اشخاص عروج و زوال سے ہمکنار ہوتے ہیں، اسی طرح قومیں، ملتیں اور حکومتیں بھی، عروج و زوال سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ عباسی حکومت بڑے جاہ و جلال، اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ قائم ہوئی تھی، لیکن جب اس حکومت کے فرماں روا عیش و عشرت میں پڑ گئے، تو یہ رو بہ زوال ہونے لگی، اس کی ترقیاں رک گئیں، اور انحطاط نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ادبار و انحطاط کا عہد جب شروع ہوتا ہے تو ختم کر کے دم لیتا ہے۔ بالکل یہی بات بنو عباس پر بھی صادق آئی، خلفا کی نا اہلیاں جب حد سے زیادہ بڑھ گئیں، تو ادبار و زوال کی آمد کو کوئی نہ روک سکا۔

(حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کا قول ہے کہ "بادشاہ بمنزلہ بازار کے ہے جس چیز کی نکاسی زیادہ ہوتی ہے وہی بازار میں زیادہ آتی ہے سو اگر بادشاہ زاہد و عابد ہے تو اس کے پاس ایسے ہی لوگ آتے ہیں۔ اگر فاسق و فاجر ہے تو ایسے ہی شخص ملتے جلتے ہیں"۔[1]

ان خلفا نے، جب زہد و عبادت سے رشتہ منقطع کر لیا، اور فسق و فجور سے دامن نہ بچا سکے تو کس طرح سر بلند رہ سکتے تھے؟)

خلافت کی زبوں حالی

گو راضی میں بہت سے اوصاف تھے اور اس نے خلافت کا ظاہری ٹھاٹھ اور وقار قائم رکھا لیکن اس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اس لئے اس کو نہ سنبھال سکا اور اس کے زمانہ میں دولت عباسیہ کے پرزے اڑ گئے مغرب یعنی شمالی افریقہ کا علاقہ عرصے سے عباسیوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور یہاں علویوں کی آزاد حکومت قائم تھی، مصر و شام کے ایک حصہ میں محمد بن طغج کی نیم آزاد حکومت قائم تھی۔ وہ صرف عباسی حکومت کو خراج ادا کرتا تھا، مشرقی صوبوں میں بھی جو عباسی حکومت کا خاص علاقہ تھا۔ خود سر امراء نے آزاد اور نیم آزاد حکومتیں قائم کر لی تھیں ماوراء النہر میں سامانی حکمران تھے، موصل، دیار ربیعہ اور دیار مضر میں آل حمدان کی حکومت تھی۔ طبرستان اور

[1] تاریخ الخلفا سیوطی

جرجان میں دیلمی حکومت قائم ہو چکی تھی، فارس کا علاقہ اور خوزستان کا ایک حصہ عماد الدولہ کے قبضہ میں تھا اور اس کے بڑے حصہ پر ابو عبداللہ بریدی مسلط تھا۔ عراق عجم کے لیے رکن الدولہ اور وشمگیر میں رسہ کشی ہو رہی تھی۔ کرمان ابو علی محمد بن الیاس کے تصرف میں تھا۔ بحرین اور یمامہ پر قرامطہ مسلط تھے۔ بصرہ اور واسط ابن رائق کے پاس تھے، غرض عراق سے لے کر سندھ تک دولت عباسیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ خلیفہ کے قبضہ میں صرف بغداد اور اس کے نواح کا حصہ رہ گیا تھا۔ ابن رائق کی امیر الامرائی کے بعد اس پر بھی راضی کو کوئی اختیار نہ رہ گیا اور وہ محض زرنگار تخت پر بیٹھ کر اس ادبار کا تماشہ دیکھتا تھا۔

مہتدی کی تقریر ترکوں کی سیادت، خلافت پر قائم ہو چکی تھی، خلیفہ بے بس تھا اور وہ حکمران، ایک مرتبہ جب اتراک کی یورش ہوئی، تو مہتدی نے ان الفاظ میں اپنا طلسم قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن ترک، اس کے طلسم کی لوح اپنے پاس رکھتے تھے، وہ ان الفاظ سے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے۔

"مجھے مستعین اور معتز نہ سمجھنا، میں موت کے لئے تیار ہو کر آیا ہوں جب تک میری تلوار کا قبضہ میرے ہاتھ میں ہے، اس وقت تک وہ تمہارے سروں پر چمکتی رہے گی۔ یاد رکھو اگر میرا ایک بال بھی گرا تو اس کے بدلہ میں تمہارا پورا گروہ برباد کر دیا جائے گا، کیا مذہب، حیا اور خوف دنیا میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔ خلفاء اور خدا کے ساتھ تمہاری یہ مخالفت، تمہارا یہ اقدام اور تمہاری یہ جسارت کب تک قائم رہے گی، خلیفہ خواہ تمہارا خیر خواہ ہو یا بدخواہ، تمہاری جسارت دونوں کے ساتھ یکساں رہتی ہے، اگر تمہیں یہ خیال ہے کہ تمہاری ذات سے مجھ کو دنیاوی فائدہ پہنچتا ہے تو مجھے بتاؤ کہ تمہاری دنیا سے مجھے کیا ملا بالکل! تم کو معلوم ہوگا کہ تمہارے لبعض متوسلین میرے بھائیوں اور میری اولاد سے زیادہ دولت مند اور فارغ البال ہیں اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو جاؤ تم ان کے گھروں کا جائزہ لو۔ دیکھو تم کو وہاں فرش، فروش، لونڈی غلام خدم حشم، جاگیر، آمدنی میں سے کوئی چیز بھی تمہارے برابر نظر آتی ہے۔"

معتز کی بے بسی ۲۵۵ھ میں جب دیکھا کہ پوری تنخواہ نہیں مل سکتی تو ترکوں نے کہا کہ اگر

مہتدی کا زمانہ خلافت ۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ، بمطابق ۸۶۹ء تا ۸۷۰ء

اس وقت ان کو پچاس ہزار دینار بھی دے دیئے جائیں تو وہ اس پر قناعت کر لیں گے لیکن معتز کے پاس ایک حبہ نہ تھا اس لئے وہ اتنا مطالبہ بھی پورا نہ کر سکا۔ فوج تنخواہ کے قلت سے پہلے سے برہم تھی۔ اس لئے تنخواہ سے مایوس ہو کر قصر سلطانی پر حملہ کر دیا اور معتز کو محل سے باہر بلا بھیجا۔ اس نے کہلا دیا کہ اس وقت میں نے دوا پی ہے اس لئے باہر نہیں آسکتا۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو تم میں سے کوئی آدمی خود اندر چلا آئے۔ یہ سنکر سب کے سب محل میں گھس گئے اور معتز کو پکڑ کے اس کو پیٹتے ہوئے باہر گھسیٹ لائے اور اتنا مارا کہ اس کی قمیص کے پرزے اڑ گئے اور تپتی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں کھڑا کر دیا۔ وہ تپش سے ایک پاؤں اٹھاتا تھا تو ایک رکھتا تھا اور وحشی ترک برابر طمانچے مارتے جاتے تھے۔ خلیفہ وقت کی اس طرح ذلیل و رسوا کرنے کے بعد قاضی ابوالشوارب اور گواہوں کے روبرو اسے معزول کر کے ایک سنگدل ترک کے حوالہ کر دیا۔ اس نے سزا کا سلسلہ جاری رکھا اور کھانا پانی بند کر دیا۔

تین دن کے بعد اسے تہ خانے میں چنوا دیا۔ اور غریب اسی میں گھٹ کر مر گیا۔

ضمنی حکومتیں عباسیوں کے عہد ادبار و انحطاط میں، بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں، پھر انہوں نے ترقی کی، اور باب خلافت کی آستاں بوسی کرتے کرتے اس پر قابض اور متصرف ہو گئیں۔ خلیفہ ان کے ہاتھ میں شاہ شطرنج کی طرح کام کرتا تھا۔ جن حکومتوں نے خلیفہ کی سیادت کا بار گراں اپنے مضبوط کاندھوں پر نہیں اٹھایا انہوں نے اپنے حدود کے اندر آزادی اور خود مختاری کا جھنڈا لہرایا۔

چند حکومتوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

اندلس کی حکومت ۱۳۸ھ میں اندلس میں بنو امیہ کی حکومت عبدالرحمن الداخل نے قائم کی جو کئی سو برس تک قائم رہی۔

فاطمی حکومت معتمد کے زمانے میں مصر کی فاطمی حکومت کی بنیاد پڑی جو نہ صرف خلافت بغداد کی سیادت سے آزاد تھی بلکہ اپنے نسب خاندان میں اس کی حریف مقابل اور ایک نئے مذہبی معتقدات کی داعی تھی اور آگے چل کر تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی ترقی میں بھی وہ عباسی حکومت کی

...ابل بن گئی۔

نئی حکومت مقتدر ۳۱۵ھ کے زمانے میں دیلم کے علاوہ مشرقی آذربائیجان میں زیاری حکومت قائم کی۔

دیلمی حکومت کا قیام قاہر کے عہد کا ایک اہم واقعہ فارس میں بنی بویہ یا دیلمی حکومت کا قیام ہے جو آگے چل کر خلافت بغداد کی متولی بنی۔ اسی خاندان کا مورث اعلیٰ ابو شجاع بویہ بن فنا خسرو سلاطین فارس کی اولاد سے تھا۔ ابن ماکولا اس کو بہرام گور کی اولاد سے بتاتا ہے اور ابن مسکویہ نے فارس کے آخری تاجدار یزدگرد کی نسل سے قرار دیا ہے۔ ابن ماکولا امام الانساب ہے اس لئے اس کی رائے قابل ترجیح ہے۔

یہ خاندان گو سلاطین ایران کی اولاد سے تھا لیکن حکومت و سلطنت کا مدتوں سے خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کے افراد زیادہ تر غربت و افلاس میں مبتلا تھے۔ بویہ ماہی گیری کے ذریعہ بسر اوقات کرتا تھا، لیکن اس کے لڑکے علی، حسن اور احمد بیدار بخت تھے۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے حکومت حاصل کی، بعد میں یہی تینوں عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے[1]

طولونی حکومت احمد بن طولون ترکی غلام زادہ تھا۔ ۲۵۴ھ مطابق ۸۶۸ء میں اس کی حکومت کی بنیاد پڑی اور ۲۹۲ھ مطابق ۹۰۴ء میں اس کا خاتمہ ہوا اور اس کا رقبہ حکومت پھر بدستور دولت عباسیہ کا ماتحت علاقہ ہو گیا اس حکومت کی عمر کل ۳۹ سال تھی لیکن اس قلیل مدت میں اس نے مصر میں بڑے پائیدار نقش چھوڑے۔ اس کی یادگار جامع طولونیہ آج تک قائم ہے۔ اس میں کل پانچ فرمانروا ہوئے۔ احمد بن طولون، خمارویہ بن احمد، جیش بن خمارویہ، ہارون بن خمارویہ اور شیبان بن احمد بن طولون،

---

[1] بنی بویہ کا زمانہ کوہ ۳۵-۳۶ سال سے زیادہ نہیں لیکن ان کے کارناموں اور عظمت شان کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں اس خاندان کو خاص اہمیت حاصل ہے اس حکومت کا بانی عماد الدولہ تین بھائی تھے عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ اور تینوں نے ایران و عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کیں۔ عماد الدولہ کے سلسلہ میں عضد الدولہ، صمصام الدولہ، شرف الدولہ، بہاء الدولہ، سلطان الدولہ، جلال الدولہ اور ملک الرحیم فرمانروا ہوئے۔ رکن الدولہ کے سلسلے میں فخر الدولہ۔ مجد الدولہ۔ علاء الدولہ، ظہیر الدولہ اور معز الدولہ کے سلسلہ میں صرف عز الدولہ ہوا۔ یہ حکومت ۳۲۲ھ میں قائم ہوئی اور ۳۶۹ھ میں سلجوقیوں نے اس کا خاتمہ کیا۔ (تاریخ اسلام)

دولت سلجوقیہ

اب سلجوقی حکومت کا رقبہ خراسان سے لے کر ایران و عراق تک پھیل چکا تھا، لیکن ابھی تک خلافت بغداد نے اس کی تصدیق نہیں کی تھی۔ ۴۴۳ھ میں طغرل بک نے قائم سے فرمانِ حکومت کی استدعا کی۔ اس کی استدعا پر قائم نے فرمانِ حکومت عطا کیا، اسی کے ساتھ خلعت اور رکن الدولہ کے لقب سے بھی سرفراز کیا اور طغرل کو بغداد آنے کی دعوت دی۔ طغرل بک نے اس کے جواب میں دس ہزار نقد جواہرات کے قیمتی ہار بیش قیمت ملبوسات، قائم کی نذر کے لئے دو ہزار امیر الامراء اور ۵ ہزار دوسرے ارکان دولت کے شکرانہ میں بھیجے، قائم نے سلجوقی سفارت کی پذیرائی کے لئے خاص دربار منعقد کیا، اس خلافت بغداد کے ساتھ سلجوقیوں کے تعلقات کی بنیاد پڑی۔

دولت خوارزمیہ

۵۵۱ھ میں ایل ارسلان خوارزم شاہ برسرِ اقتدار ہوا، اس کے زمانہ میں سلطان سنجر کا انتقال ہو گیا، اور خراسان کا نظام درہم برہم ہو گیا، اس لئے ارسلان نے مستقل آزاد خوارزمی حکومت قائم کر لی[1] جو ساتویں ہجری کے وسط تک قائم رہی اور تاتاریوں کے ہاتھ اس کا خاتمہ ہوا۔

---

[1] تاریخ گزیدہ صفحہ ۱۹۱ اس میں چھ فرمانروا ہوئے، اتسز بن محمد، ایل ارسلان بن اتسز، محمود بن ارسلان، علاء الدین تکش بن ایل ارسلان، علاء الدین تکش، جلال الدین بن علاء الدین (تاریخ اسلام)

سعی اصلاح احوال

عہد زوال شروع ہونے کے بعد خلفائے بنو عباس میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے جنہوں نے حالات کو سدھارنے کی کوشش کی، کچھ عرصے کے لئے کسی حد تک حالات سدھر بھی گئے، لیکن، کوئی مستقل اور پائیدار کام نہ ہو سکا، حالات کی ابتری بڑھتی ہی رہی، یہ ساری اصلاح بعض کا سنبھالا تھیں سنبھالے سے مریض جاں بر نہیں ہوتا۔

عباسی عمر بن عبد العزیز

ابو العباس بن ہاشم ہاشمی کا بیان ہے کہ میں رمضان کی ایک شام کو امیر المومنین مہدی کے پاس تھا۔ افطار کے قریب اٹھنے کا ارادہ کیا، اس نے بٹھا لیا۔ اتنے میں مغرب کا وقت آگیا ہم سب نے ساتھ نماز پڑھی نماز کے بعد کھانا آیا، تو اس میں دو روٹیاں، ایک برتن میں نمک، ایک سرکہ اور ایک میں روغن زیتون تھا۔ مہدی نے مجھے کھانے پر بلایا میں بیٹھ گیا، اور اس خیال سے کہ یہ محض افطار ہے اصل کھانا بعد میں آئے گا، بہت کم کھایا۔ مہدی نے کہا کیوں کھاتے کیوں نہیں۔ کیا روزہ نہیں تھے۔ میں نے کہا، روزہ تو تھا۔ پھر پوچھا۔ کیا کل روزہ رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں نے کہا رمضان کا مہینہ ہے، روزہ کیوں نہ رکھوں گا۔ کہا پھر پیٹ بھر کھانا کھاؤ کیونکہ جو سامان تمہارے سامنے موجود ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ابو ہاشم کہتے ہیں کہ یہ سنکر مجھے حیرت ہوئی میں نے کہا امیر المومنین خدا نے آپ کو ہر طرح نعمتیں عطا کی ہیں، رزق کا دائرہ وسیع کیا ہے، پھر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا جو کچھ تم نے کہا وہ صحیح ہے اور خدا کا شکر ہے۔ مگر میں نے سوچا کہ بنی امیہ میں تو عمر ابن عبد العزیزؒ پیدا ہوں اور بنی ہاشم میں ان کی مثال ناپید ہے۔ اس پر مجھے غیرت آئی اور میں نے یہ زندگی اختیار کی۔

معتضد کا کارنامہ

معتضد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترکوں کا زور توڑ کر سلطنت اور رعایا دونوں کو ان کے پنجۂ ظلم سے آزاد کر دیا، ان کی قوت توڑنے کے لئے اس نے

نہایت سخت پالیسی اختیار کی۔ فوج افسران کو سرتابی پر زندہ دفن کرا دیتا تھا۔ گو یہ سزا بظاہر سخت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ترکوں کی خیرہ سری جس حد کو پہنچ چکی تھی اس کی اصلاح بغیر اس کے ناممکن تھی۔

منتصر اور اہل بیت اپنے والد کے برعکس منتصر کو آلِ اطہار کے ساتھ بڑی عقیدت تھی چنانچہ خلیفہ ہونے کے ساتھ ہی اس نے علویوں اور اہل بیت کے ساتھ زیادتیوں کا سلسلہ یک قلم روک دیا اور ان کے متعلق بحث و مباحثہ کی قطعی ممانعت کر دی حضرت امام حسین علیہ السلام اور جملہ آلِ ابی طالب کے مقابر کی زیارت کی عام اجازت دے دی، فدک حضرت حسنین علیہ السلام کی اولاد کو واپس کر دیا علویوں کے جس قدر اوقاف تھے سب واگذار کر دیئے اور شیعان علی سے تعرض کرنے کی ممانعت کر دی۔

آل ابی طالب کا وطن مدینہ تھا، یہاں کے حکام خلیفہ وقت کی مرضی کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور عموماً ان سے بدسلوکی کرنے کے عادی چلے آتے تھے منتصر نے جب مدینہ کے سابق حاکم صالح بن علی کو معزول کر کے علی بن حسن کو مدینہ بھیجا تو رخصت کرتے وقت کہا "علی! میں تم کو اپنے گوشت و خون کی طرف بھیج رہا ہوں، دیکھوں ان کے ساتھ تمہارا کیسا برتاؤ رہتا ہے، اور تم ان کے لئے کیسے ثابت ہوتے ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "انشاء اللہ میں امیر المومنین کے فرمان کی پوری تعمیل کروں گا"۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "خدا کی قسم! اہل باطل کبھی سربلند نہیں ہو سکتے، خواہ ان کی پیشانی سے مہتاب ہی کیوں نہ طلوع ہوا اور اہل حق کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے خواہ تمام عالم ان کی ذلت پر کیوں نہ متفق ہو جائے"۔

مسترشد کا جوش کار مسترشد کے پیش رو مدتوں سے محض تخت کی زینت تھے، تلوار ہاتھ میں لینا بھول گئے تھے مسترشد خود میدان جنگ میں نکلتا تھا، فوجوں کی قیادت کرتا تھا، اور عام سپاہیوں کے دوش بدوش لڑتا تھا اپنی شجاعت سے اس نے عباسی خلافت کو سلجوقیوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرایا، اور عراق میں ان کا اثر و اقتدار ختم کر دیا۔

تاریخ الخلفاء

نئے شہر

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

عباسیوں نے اپنے دور حکومت میں متعدد نئے شہر بھی آباد کئے اور بسائے، ان میں سے چند کا مختصر سا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

بغداد کی تعمیر سفاح نے وقتی طور پر ہاشمیہ کو پایۂ تخت بنایا تھا، منصور کے زمانہ میں جب عباسی حکومت کی بنیاد پوری طرح مضبوط ہو گئی اور اس کے نظام میں وسعت اور ترقی ہوئی تو اس نے بغداد آباد کر کے اس کو دارالخلافہ بنایا اور بعد کے خلفاء برابر اس کی تعمیر اور آبادی میں اضافہ کرتے رہے تا آنکہ ایک صدی کے اندر بغداد دنیا کا عظیم الشان شہر بن گیا ہے۔

مدینۃ المنصور بنی عباس کے اعوان و انصار زیادہ تر عراق و خراسان میں تھے یہیں سفاح کی سب سے پہلی بیعت ہوئی تھی، اس لئے اس نے عراق ہی کو پایۂ تخت قرار دیا (یعقوبی ج ۲ صفحہ ۴۱۹)، یہ شہر سفاح کے نام سے مدینۃ المنصور بھی کہلاتا تھا (دینوری ص ۳۴۳)

سامرا ترک تہذیب و تمدن سے نا آشنا محض وحشی تھے، اس لئے بغداد میں ان کے ہجوم سے اہل شہر کو بڑی تکلیفیں پہنچتی تھیں، بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے، عورتیں، بوڑھے بچے کچل جاتے تھے اور یہ پرواہ نہ کرتے تھے۔ اہل بغداد نے معتصم سے فریاد کی، اس نے ترکوں کی آبادی کے لئے بغداد کے قریب ایک مستقل شہر سامرا آباد کیا اور خود یہیں رہنے لگا[1]

جعفریہ تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد منتصر نے جعفریہ کو جسے متوکل نے بڑے ذوق و شوق سے بے شمار دولت صرف کر کے بنوایا تھا، ویران کر دیا اور یہاں کی آبادی کو اس کی کھول پر منتقل کر دیا[2]

---

[1] تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۲۲ و مروج الذہب ج ۷ صفحہ ۱۲۱ [2] یعقوبی ج ۲ صفحہ ۳۰۳

بنو عباس کے اولیات

جس کے عہد میں زبانیں مختلف ہو گئیں وہ سفاح ہے۔

جس نے سب سے پہلے نجومیوں کو بلایا اور ان کے کہنے پر عمل کیا اپنے غلاموں کو حاکم بنایا غرباء کو منہ نہ لگایا وہ منصور ہے۔

جس نے سب سے اول جلو میں تلواریں اور نیزے لے کر سپاہیوں کو چلایا وہ ہادی ہے۔

جس نے سب سے اول گیند بلا یعنی چوگان کھیلا رشید ہے۔

جس کو سب سے پہلے اس کے لقب کے ساتھ پکارا گیا اور جو سب سے پہلے لقب کے ساتھ لکھا گیا امین ہے

جس نے سب سے پہلے ترکوں کو دیوان میں جگہ دی معتصم ہے۔

جس نے سب سے اول ذمیوں کا فرول کا لباس خاص مقرر کیا متوکل ہے اور اسی واقعہ سے ظاہر ہو گئی تصدیق حضرت رسول صلعم کی اس حدیث کی جس کو طبرانی نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ تم ترکوں کو اس سے پہلے چھوڑ دو کہ وہ تم کو چھوڑیں کیونکہ سب سے اول وہی ہوں گے جو میری امت کے ایک بادشاہ کو ان سے جدا کر دیں گے۔

جس نے سب سے اول چوڑی آستین اور چھوٹی ٹوپیاں استعمال کیں وہ مستعین ہے۔

جس نے سب سے اول گھوڑوں کو چاندی کا زیور پہنایا وہ معتز ہے۔

جس پر سب سے اول جبر و قہر کیا گیا معتمد ہے

جو سب سے پہلے بچپن میں خلیفہ بنایا گیا مقتدر ہے۔

سب سے آخر خلیفہ جو تدبیر لشکر اور اموال سے الگ کیا گیا۔ راضی ہے یہی وہ خلیفہ ہے جس نے سب سے آخر میں شعر کہا خطبہ پڑھا اور ہمیشہ لوگوں کو نماز پڑھاتا رہا اور یہی وہ خلیفہ ہے جس نے اپنے ہم نشینوں ندیموں کو اپنے سامنے بٹھایا اور یہی وہ آخر خلیفہ ہے جس کا وظیفہ۔ جاگیر خدام، کنیزیں، خزانہ، مطبخ، مجلس، نگہبان پہلے خلفاء کی طرح الگ تھا۔ یہی وہ آخر خلیفہ ہے کہ جس کے بعد پھر کسی خلیفہ نے لباس خلافت پہن کر سفر نہیں کیا۔

تمت بالخیر

آخر وہ وقت آگیا کہ عباسی حکومت کا چراغ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اموئوں کی طرح گل ہوگیا۔ آپس کی خانہ جنگیاں، آپس کے نزاعات، آپس کے مناقشے، یہی رنگ لاتے ہیں، بغداد کبھی تباہ نہ ہوتا، اگر خود مسلمان اسے بچا لینا چاہتے۔

معتصم کی نااہلی اور اس کے شیعہ وزیر ابن علقمی کی وجہ سے بغداد کی حالت اس زمانہ میں بہت ابتر ہو رہی تھی، شیعہ سنیوں اور سنیوں کے مختلف فرقوں کے اختلاف، جنگ و جدال اور شہر کے فتنہ پرست بدمعاشوں کی فتنہ انگیزی سے حکومت کا سارا نظام بگڑ گیا، عباسی حکومت کی آمدنی اتنی گھٹ گئی اور اس کے مصارف پورے ہونا مشکل ہو گئے، معتصم نے ابن علقمی کے مشورے سے فوج کا ایک حصہ برخاست کر دیا اور باقی فوج اور دوسرے عمال حکومت کی تنخواہوں کے مصارف، تاجروں اور اہل حرفہ اور کاشتکاروں پر پھیلا دیئے گئے۔ اس سے شورش اور بڑھ گئی شیعہ سنیوں کے اختلاف میں شیعوں نے ابن علقمی کے بل پر سنیوں پر زیادتی شروع کر دی گو ابن علقمی معتصم پر حاوی تھا لیکن معتصم کو شیعوں کی زیادتی ناگوار گذری اس نے اپنے لڑکے ابوبکر اور امیر رکن الدین کو بھیج کر کرخ کا محلہ جس میں شیعہ آباد تھے: لٹوا لیا۔

ابن علقمی پہلے سے خلافت بغداد کے ساتھ تعصب رکھتا تھا، اس واقعہ کے بعد اس نے عباسی خلافت کو ختم کر کے علوی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور عباسی فوج کے باقی حصہ کو بھی معتصم کو یہ اطمینان دلا کر الگ کرا دیا کہ اس سے جو روپیہ بچے گا وہ تاتاریوں کی مدافعت کے دوسرے انتظامات میں کام آئے گا۔

فوج برخاست کرانے کے بعد اس نے مختلف ذرائع سے تاتاریوں کو بغداد پر حملہ کی دعوت دی، ابن خلدون لکھتا ہے کہ فوج کو الگ کرنے کے بعد اس نے ابن صلایا والی اربل کے ذریعہ تاتاریوں کو بغداد پر حملہ کے لئے آمادہ کیا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس نے عباسی حکومت کو مٹا کر علوی حکومت قائم کرنے کے لئے تاتاریوں سے خط و کتابت کی۔

ذی الحجہ ۶۵۵ھ میں ہلاکو نے بغداد پر فوج کشی کر دی عباسی فوج کو پہلے ہی ابن علقمی الگ کرا چکا تھا، تاہم قلیل فوج باقی رہ گئی تھی، اس کو لے کر امیر دویدار نے بڑی پرزور مدافعت کی، اور پہلے حملہ میں تاتاریوں کو پسپا کر دیا، لیکن پھر انہوں نے اس زور کا دوسرا حملہ کیا کہ عباسی فوجیں اس کی تاب نہ لا سکیں اور شکست کھا کر بغداد کی جانب پسپا ہو گئیں، اتفاق سے عین اس وقت دجلہ کا ایک بند ٹوٹ گیا تھا، اس سے راستہ میں پانی حائل ہو گیا اور تاتاریوں نے تعاقب کر کے پوری فوج تہ تیغ کر دی، امیر دویدار قتل ہوا اور اس کے تمام ساتھی گرفتار ہو گئے، اور تاتاریوں نے بڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا، اب اہل بغداد میں کوئی سکت باقی نہ تھی لیکن ابھی ابن علقمی کا جذبۂ انتقام ٹھنڈا نہ ہوا تھا، اس نے ہلاکو سے اپنی جان بخشی کرائی اور معتصم اور اس کے ساتھ بغداد کے تمام علماء و فقہاء و مدرسین و اکابر و اعیان کو یہ یقین دلا کر ہلاکو کے پاس لے گیا کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، ہلاکو معتصم کو منصب خلافت پر برقرار رکھے گا اور اپنی لڑکی کی شادی اس کے لڑکے ابوبکر کے ساتھ کر دے گا لیکن سب قتل کر دیئے گئے، معتصم کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کیا اور اس کی لاش کو پیروں سے مسلا۔[1] اور ان میں سے کسی کو گور و کفن تک میسر نہ ہوا، یہ واقعہ محرم ۶۵۶ھ پیش آیا۔

اس کے بعد وحشی تاتاری بغداد میں گھس پڑے اور کئی دن تک قتل عام کرتے رہے، عورتوں اور بچوں نے نکل جانا چاہا، لیکن تاتاریوں نے ان کو بھی زندہ چھوڑا۔[2] آبادی کو ختم کر کے چالیس دن تک نہایت بیدردی سے بغداد کو لوٹتے رہے۔

سچ کہا تھا سعدی شیرازی نے،

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المؤمنین

---

[1] تاریخ اسلام بحوالہ ابن خلدون ج ۳ صفحہ ۵۳۷ و ابوالفداء ج ۳ صفحہ ۱۲۵ [2] ابن خلدون ج ۳ صفحہ ۵۴۷

حصہ پنجم

ہسپانیہ

ہسپانیہ

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح اُن کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں!

——— اقبال

خلفائے اندلس

عبدالرحمٰن الداخل	۱۳۸ھ / ۷۵۶ء	۱۷۲ھ / ۷۸۸ء
ہشام بن عبدالرحمٰن	۱۷۲ھ / ۷۸۸ء	۱۸۰ھ / ۷۹۶ء
الحکم بن ہشام	۱۸۰ھ / ۷۹۶ء	۲۰۶ھ / ۷۹۹ء ۸۲۲ء
عبدالرحمٰن ثانی	۲۰۶ھ / ۸۲۲ء	۲۳۸ھ / ۸۵۲ء
محمد بن عبدالرحمٰن	۲۳۸ھ / ۸۵۲ء	۲۷۳ھ / ۸۸۶ء
منذر بن محمد	۲۷۳ھ / ۸۸۶ء	۲۷۵ھ / ۸۸۸ء
عبداللہ بن محمد	۲۷۵ھ / ۸۸۸ء	۳۰۰ھ / ۹۱۲ء
عبدالرحمٰن الناصر	۳۰۰ھ / ۹۱۲ء	۳۵۰ھ / ۹۶۱ء
الحکم ثانی	۳۵۰ھ / ۹۶۱ء	۳۶۶ھ / ۹۷۶ء
ہشام ثانی	۳۶۶ھ / ۹۷۶ء	۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء
سلیمان بن حکم	۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء	۴۰۷ھ / ۱۰۱۶ء

فتح اندلس

طارق کی فاتحانہ یلغار

اندلس یورپ کے مغربی جنوبی حصے کی طرف واقع ہے، اس کے اور ملک افریقہ کے درمیان صرف بارہ میل کا سمندر جو بحر ظلمات (اطلانٹک) کو بحر متوسط سے ملاتا ہے، اس ملک کے مشرق کی جانب بحر متوسط (مڈیٹیریرینین سی) اور شمال کی طرف جبل برتات (پرانیز) اور خلیج لیکے واقع ہیں، مغرب کی جانب ملک پرتگال اور بحر ظلمات، اور جنوب کی طرف ملک افریقہ اس کے حدود کو ختم کرتا ہے۔

مسلمانوں سے پہلے اندلس کی حالت

مسلمانوں کے ورود اندلس سے پہلے، وہاں کے حالات زیادہ سے زیادہ ابتر ہو چکے تھے، یہودیوں پر ایسے لرزہ خیز اور ہیبت ناک مظالم توڑے جاتے تھے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کاشتکاروں کو بھی ظلم کی چکی میں مسلسل پیسا جا رہا تھا، غلاموں کی حالت سب سے زیادہ ابتر تھی وہ صرف اس لئے تھے کہ مرنے کے لئے زندہ رہیں، !

اقتصادی نظام بھی حد درجہ خراب و خستہ تھا، نہ تقسیم پیداوار صحیح اصول پر مبنی تھی، نہ تقسیم زر، اسامی حالت خاص طور پر، خطرناک صورت حال کی غمازی کر رہی تھی، اسپین کا بادشاہ لنذریق (راڈرک)، اصل بادشاہ کو معزول کر کے غاصبانہ طور پر، حکومت کا مالک بن بیٹھا تھا، حد درجہ عیاش بھی تھا، اس کے محل میں فرمانروائے سبتہ جولین کی لڑکی شاہانہ تربیت کے لئے مقیم تھی، وہ اپنی عصمت اس عیاش فرماں روا سے نہ بچا سکی، اس کا باپ جولین مسلمانوں سے مل گیا۔

دربار خلافت کا حکمنامہ

موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ نے، جولین سے گفتگو کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت طلب کی، اجازت ملنے کے بعد خود تو افریقہ میں مقیم رہا، اپنے غلام، طارق کو جو شہر طنجہ کا گورنر تھا، ایک فوج دے کر فتح اندلس کے لئے

طارق اپنا مختصر سا بیڑہ اور سرفروشوں کی ایک جماعت لے کر چل پڑا، ساحل پر اترتے ہی کامیابیوں اور کامرانیوں نے اس کے قدم چومنا شروع کئے، متعدد لڑائیاں لڑتا ہوا، اور چھوٹے چھوٹے مقامات کو فتح کرتا ہوا وہ وادیٔ لکہ میں پہنچا، یہاں خود شاہ لنذریق ستر ہزار جمعیت کے ساتھ مقابلہ کے لئے موجود تھا لنذریق کی فوج طارق سے پانچ گنا زیادہ تھی، لنذریق کے ساتھ وہ بانکے رانٹ بھی تھے جنہوں نے ایسی ایسی بھاری زرہیں پہنی تھیں کہ میدانِ جنگ سے اگر بھاگنا چاہیں تو بھی نہ بھاگ سکیں طارق لنذریق کی تیاریوں سے واقف تھا اس نے اپنی کشتیاں جلادیں، اور فوج کے سامنے ایسی زبردست تقریر کی جس نے اسلامی فوج کے ہر سپاہی میں مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر دیا، بڑے زور کا رن پڑا۔

شروع میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا، لنذریق کی فوج غالب آجائے گی، اور عرب ہر سپاہی میدان چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کریں گے لیکن طارق بن زیاد کی دل ہلا دینے والی تقریر نے جادو کا کام کیا،

دشمن کا تعاقب

جو لوگ بھاگنے کے لئے پر تول رہے تھے، وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ جم گئے اور پھر ایسے زور کا حملہ دشمن کے لشکر پر کیا کہ اس کے پاؤں اکھڑ گئے، اسلامی لشکر نے دور دور تک دشمن فوج کا تعاقب کیا، اس جنگ میں لنذریق کے بڑے بڑے افسر مارے گئے، اور خود لنذریق بھی کام آگیا یہ واقعہ فتح ۵ شوال ۹۲ھ (۷۱۱ء) کا ہے۔

فوج کی نئی تقسیم

اس کے بعد طارق نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلا مغیث رومی کی سرکردگی میں قرطبہ فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا، دوسرا امیر زید کی سربراہی میں ملتون کی طرف روانہ ہوا اور تیسرا اپنی کمان میں رکھ کر خود طلیطلہ کو فتح کرتا ہوا شمال کی طرف بڑھا۔ امیر زید، شہر استیجہ ملتون اور البیرہ فتح کرتا ہوا، طارق سے آکر مل گیا مغیث نے ایک خونریز جنگ کے بعد، قرطبہ فتح کر لیا۔

طارق نے نہ صرف اندلس کے ایک بہت بڑے شہر طلیطلہ کو فتح کیا بلکہ اور بھی بہت سے شہر فتح کئے اس کے نام کی ایسی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ اسے لڑائی کی بہت کم نوبت آئی اور جہاں پہنچا، اہل شہر

نے دروازے کھول دیئے، اور امان طلب کر لی۔

بے اندازہ مالِ غنیمت

طارق کو ہر جگہ بے اندازہ مالِ غنیمت حاصل ہوا، روپیہ، ہیرے جواہرات، زمرد، ایک سے ایک قیمتی اور گراں مایہ چیز، اس نے یہ سب چیزیں، جن کی مالیت کروڑوں روپیہ سے متجاوز تھی، بڑی دیانت داری کے ساتھ اپنے آقا موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں افریقہ روانہ کر دیں، اور موسیٰ نے یہ سب چیزیں ہاتھ لگائے بغیر اپنے آقا، خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں، —— طارق کو تہنیت نامہ بھیج کر —— روانہ کر دیں، خلیفہ بہت خوش ہوا، اس نے موسیٰ کی بھی حوصلہ افزائی کی، اور طارق کی بھی۔

یہودیوں کی عزت افزائی،

اب تک اندلس میں یہودی بڑی ذلت اور نامرادی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے ساتھ ننگِ انسانیت مظالم روا رکھے جاتے تھے، انہیں جانوروں سے زیادہ بدتر سمجھا جاتا تھا، ان کی جان، مال و عزت آبرو کوئی چیز بھی ان کی نہ تھی، ان کی دولت چھین لی جاتی تھی، ان کی عورتیں اغوا کر لی جاتی تھیں، سرِ بازار ان کی بے آبروئی کی جاتی تھی، انہیں ناکردہ گناہ ہونے کے باوجود قتل کر دیا جاتا تھا، اور ان کے قبیلوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا تھا، جو کتے اور سؤر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

لیکن، اندلس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہودیوں کی قسمت پلٹ گئی، انہیں محسوس ہوا اور پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ بھی آدمی ہیں، ایک عرصۂ دراز کی غلامی اور ذلت کے بعد، پہلی مرتبہ، سب سے پہلی مرتبہ، انہیں عزت ملی تھی، مسلمان جب ایک شہر کو فتح کر کے دوسرے شہر کی طرف کوچ کرتے تھے، تو بالعموم یہودیوں ہی کے ہاتھ میں وہاں کا نظم و انتظام سونپ جاتے تھے۔ اور وہ وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

مسلمانوں نے صرف یہودیوں ہی کو نہیں نوازا، انہوں نے اندلس کے غلاموں کو کاشتکاروں کے پسماندہ طبقوں کو بھی نوازا، ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا، انہیں وہ تمام حقوق عطا کئے، جو ان سے چھین لئے گئے تھے، اور اس طرح دفعتہً اندلس کے خزاں دیدہ چمن میں بہار سا گئی، —— کلیاں پھوٹیں، شگوفے چٹکے، اور پھول کھل گئے!

موسیٰ بن نصیر کی فتوحات

شان دار ——— سبق آموز ——— عبرت انگیز

۹۳ھ میں موسیٰ ایک لشکر جرار لے کر اندلس پہنچا، اس سے پہلے اس نے نوید فتح سننے کے بعد، اپنے بیٹے عبدالعزیز کو، جو شجاعت اور شہامت میں یکتا تھا، اندلس کا گورنر بنا کر بھیج دیا تھا۔

اندلس کی سرزمین پر جب موسیٰ نے قدم رکھا، تو اگرچہ لذریق کو شکست ہو چکی تھی، اور متعدد بڑے بڑے شہر فتح ہو چکے تھے، پھر بھی ابھی ایسے متعدد قلعے اور شہر موجود تھے، جو فتح نہیں ہوئے تھے۔ اور جن کے حفاظت و دفاع کے لئے بڑی تیاریاں اور ساز و سامان کے ساتھ عیسائی، سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

شدونہ کی فتح

موسیٰ اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا، لیکن اس کی امنگ اور ولولہ جہاد میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا، اس نے اندلس میں آتے ہی ایک بڑے اور مضبوط شہر شدونہ (سدونیا) کو فتح کر لیا، پھر ایک اور شہر قرمونہ پر حملہ آور ہوا، یہ اندلس کے شہروں میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم شہر تھا، لیکن موسیٰ کے ہاتھوں یہ بھی فتح ہو گیا، جیسے پکا ہوا پھل جھولی میں خود بخود آ گرتا ہے، اس سے فارغ ہو کر آگے بڑھا۔

اشبیلیہ کی فتح

اشبیلیہ اندلس کا بہت خوبصورت اور دلفریب شہر تھا، یہاں کی آب و ہوا، یہاں کے مناظر، یہاں کی تہذیب و تمدن، یہاں کی سیاسی اہمیت ہر چیز اپنے اندر ایک خصوصیت رکھتی تھی، پوپ کا نمائندہ بھی اسی شہر میں مقیم تھا، یہاں کے لوگ مقابلہ کے لئے پوری طور پر تیار تھے۔

موسیٰ نے اس شہر پر کئی حملے کئے لیکن یہاں کی فصیلیں اتنی مضبوط تھیں کہ وہ ہر حملے کو جھیل لے گئیں، لیکن موسیٰ نے اتنے پے در پے حملے کئے کہ اہل شہر مجبور ہو کر قلعہ بند ہو گئے، انہیں مناسب

شرائط پر اماں دے دی گئی۔

پھر موسیٰ، طلیطلہ پہنچا، یہاں طارق سے ملاقات ہوئی، یہاں کچھ روز ستانے کے بعد طارق اور موسیٰ، پھر کشور کشائی کے لیئے روانہ ہوتے، چنانچہ اس ہلّہ میں ارغون (ارگان) اور سر قسطیہ (سارا گوسا) فتح کر لیئے گئے، طارق نے جن جن شہروں کو فتح کیا، وہاں کے لوگوں سے جو معاہدے کئے اور جو انتظامات بروئے کار لایا، موسیٰ نے ان سب کو بحال رکھا، کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔

سرزمین فرانس پر عربوں کے قدم

اندلس کو پورے طور پر زیر کر لینے اور فتح کر لینے کے بعد، موسیٰ طارق کی معیت میں جبل برنات یعنی مشہد فرانس تک پہنچ گیا۔ اور بغیر کسی مزاحمت کے برشلونہ (بارسلونا) اور اربونہ (ناربون) پر قبضہ کر لیا، دریائے اون کے کنارے خیمہ زن ہوا، اور شہر لیون (لائینز) کے مستحکم قلعہ پر اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

عبدالعزیز بن موسیٰ کے کارنامے

جب موسیٰ اور طارق طلیطلہ میں ملاقات کر کے آئندہ کا پروگرام طے کر رہے تھے، موسیٰ کا ہونہار، شجاع، اور مجاہد پیشہ بیٹا، عبدالعزیز، جنوبی اندلس میں فتوحات کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔

عیسائیوں کا بہت بڑا بہادر اور صاحب تدبیر فرمانروا تدمیر یہیں حکومت کر رہا تھا، وادی سکہ کی جنگ میں اس کی بے نظیر شجاعت کے کارنامے دیکھے جا چکے تھے، عبدالعزیز خود بھی بہادر تھا، اور بہادروں کا قدرشناس بھی، تدمیر کی بہادری اس کے دل پر نقش ہو گئی، لیکن اب مقابلہ کے سوا چارہ نہیں تھا، تدمیر اطاعت پر رضامند نہ تھا، اس نے عربوں سے مقابلہ کے لیئے درہ ہائے کوہ اور محفوظ مقامات پر فوج کو مورچہ بند کر دیا۔

تدمیر کی چال یہ تھی کہ عربوں کو اندر بلا کر شکار کرے، اور عبدالعزیز اس فکر میں تھا کہ عیسائیوں کو میدانی لڑائی لڑنے پر مجبور کرے، دونوں اپنی اپنی گھات پر لگے رہے، آخر عبدالعزیز کامیاب ہوا، تدمیر بادل نخواستہ اپنی فوجوں کو لے کر میدان لوک (لوگو) میں آ اترا، بڑی زبردست اور خونریز جنگ

ہوئی مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، عیسائی ہارے بڑی طرح ہارے، تدمیر شکست خوردہ حالت میں بھاگ کر قلعہ اوری اولا میں پناہ گزیں ہو گیا لیکن کب تک؟ آخرکار اسے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

عبدالعزیز نے کمال اولوالعزمی کے ساتھ اس کی فرمانروائی قائم رکھی، صرف خراج پر اس سے صلح کر لی یہ معاہدہ ۴ رجب سنہ ۹۴ھ کو تحریر ہوا۔

غرناطہ بھی عبدالعزیز کے ہاتھ پر فتح ہوا،

موسیٰ دربار خلافت میں

یکایک دمشق سے پروانہ آیا کہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ولید بن عبدالملک نے موسیٰ کو یاد فرمایا ہے۔ موسیٰ تعمیل حکم پر مجبور تھا، چنانچہ اس نے اندلس کی گورنری اپنے بیٹے عبدالعزیز کو سونپی، افریقہ کی ولایت پر اپنے دوسرے بیٹے عبداللہ کو مامور کیا اور خود مالِ غنیمت لے کر دربار خلافت کی طرف روانہ ہوا۔

موسیٰ جب دمشق کے قریب پہنچا تو ولید بن عبدالملک مرض الموت میں مبتلا تھا۔ اس کا ولی عہد سلیمان بن عبدالملک تھا، سلیمان کو جو یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بے اندازہ مالِ غنیمت لے کر آ رہا ہے، اس نے موسیٰ سے کہلایا کہ وہ دمشق پہنچنے کی رفتار دھیمی کر دے تاکہ سلیمان کے عہد خلافت میں وہ دمشق پہنچے، اور یہ مالِ غنیمت ولید کے بجائے سلیمان کے ہاتھ آئے، لیکن موسیٰ نے اس ارشاد کی تعمیل نہ کی اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تاکہ اپنے آقا سے سند خوشنودیٔ مزاج حاصل کرے۔

عتاب شاہی

موسیٰ نے اپنے مرنے والا آقا کی خوشنودیٔ مزاج کے ساتھ ساتھ اپنے ہونے والے آقا کا مستقل عتاب بھی حاصل کر لیا،

چنانچہ جیسے ہی ولید مرا (سنہ ۹۶ھ) اور سلیمان بر سر حکومت ہوا، اس نے ننگ انسانیت انتقام کا سلسلہ شروع کر دیا، موسیٰ نے جس بے نفسی، ایثار، للّٰہیت، اور خالص اسلامی جذبہ کے ماتحت یوں منتے والے کارنامے انجام دیئے تھے، اس کا صلہ سلیمان نے یہ دیا کہ اسے معزول کر دیا، اس پر بغیر کسی جرم اور واقعی خطا کے دو لاکھ اشرفیاں جرمانہ کیں، اس کا مال و اسباب ضبط کر لیا، اسے دھوپ میں کھڑا رکھا اس کی توہین کی، اس کے بیٹوں کو قتل کرا دیا، حتیٰ کہ عبدالعزیز تک کی جان لے لی، اور پھر اس کا کٹا ہوا سر

سر اپنے باپ کے پاس بطور تحفہ کے بھیجا موسیٰ بڑی آسانی سے سلیمان کے خلاف بغاوت کر سکتا تھا، افریقہ اور اندلس کا بادشاہ بن سکتا تھا، اور سلیمان اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا، لیکن موسیٰ نے اپنی جان قربان کر دی، نزاع باہمی، اور خود غرضی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔

حسرت ناک موت

موسیٰ حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں (۱۹ھ) پیدا ہوا تھا اس کی ساری زندگی اسلام کے لئے لڑتے گذری، اس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے، لیکن بڑھاپے میں سلیمان بن عبدالملک نے جوش انتقام سے بے بس ہو کر اس کو ذلت اور نکبت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

سلیمان تو اس کے قتل کا حکم بھی دے چکا تھا لیکن ابن مہلب نے اس کے کارناموں کا واسطہ دیا تو بڑی مشکل سے جان بخشی کی، لیکن جرمانہ قائم رکھا، اس مرد مجاہد کے پاس تھا کیا جو جرمانہ ادا کرتا، جو کچھ تھا، وہ دے دیا تب بھی جرمانہ نہ ادا ہو سکا، ہاں وہ حقیقی معنوں میں نان جویں کو محتاج ہو گیا۔ آخر ۹۷ھ میں بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اس نے اپنی جان عزیز، جان آفریں کو سپرد کر دی ——— سلیمان مر گیا، لیکن اپنے نام کو بٹہ لگا کر، موسیٰ بھی مر گیا، لیکن اس کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر اب تک روشن ہیں!

1,2,3,4,5,6,7,8,9,0

عہد بنو امیہ میں

اندلس کے والی اور فرماں روا

موسیٰ بن نصیر کے عزل اور عبدالعزیز بن موسیٰ کے قتل کے بعد، دربار خلافت دمشق سے، نئے نئے والی مقرر ہوتے رہے، ان والیوں اور فرماں رواؤں کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے، چونکہ عبدالعزیز کے بعد جو والی بنے، ان کے عہد کے فتوحات اور ترقیات میں خاص طور پر کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے لہٰذا اس فہرست پر اس دور کو ختم کر کے نیا باب عبدالرحمٰن الداخل سے شروع کیا جائے گا جس نے اندلس کو خلافتِ اندلس میں تبدیل کر دیا اور خلافتِ اندلس کو ہر اعتبار سے ایسے عروج پر پہنچا دیا کہ اندلس کی تاریخ بغیر اس کے نام کے مکمل نہیں ہو سکتی حقیقت یہ ہے کہ اندلس کی شاندار تاریخ کا آغاز بھی عبدالرحمٰن الداخل

کی وفات سے ہوتا ہے

اس کے بعد کئی سو برس تک اندلس کی حکومت، جاہ و جلال اور شکوہ و تمکنت کے ساتھ جو دنیا پر موجود رہی لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ پودا اسی کا لگایا ہوا تھا، ورنہ کون کہہ سکتا ہے، اندلس کی تاریخ کیا ہوتی؟ ——

۱ - طارق بن زیاد	سنہ ۹۲ھ / ۷۱۱ء	سنہ ۹۳ھ / ۷۱۲ء
۲ - موسیٰ بن نصیر	سنہ ۹۳ھ / ۷۱۲ء	سنہ ۹۵ھ / ۷۱۴ء
۳ - عبدالعزیز بن موسیٰ	سنہ ۹۵ھ / ۷۱۴ء	سنہ ۹۷ھ / ۷۱۶ء
۴ - ایوب بن حبیب (عارضی)	سنہ ۹۷ھ / ۷۱۶ء	سنہ ۹۸ھ / ۷۱۷ء

۵- الحر بن عبدالرحمٰن	۹۸ھ / ۷۱۷ء	۱۰۰ھ / ۷۱۹ء
۶- السمح بن مالک	۱۰۰ھ / ۷۱۹ء	۱۰۲ھ / ۷۲۱ء
۷- عبدالرحمٰن بن عبداللہ الغافقی (عارضی)	۱۰۲ھ / ۷۲۱ء	۱۰۳ھ / ۷۲۱ء
۸- عنبسہ بن سحیم	۱۰۳ھ / ۷۲۱ء	۱۰۷ھ / ۷۲۶ء
۹- عذرہ بن عبداللہ	۱۰۷ھ / ۷۲۶ء	
۱۰- یحییٰ ابن سلمہ	۱۰۷ھ / ۷۲۶ء	۱۰۸ھ / ۷۲۶ء
۱۱- عثمان ابن ابی عبیدہ	۱۰۸ھ / ۷۲۶ء	۱۰۹ھ / ۷۲۷ء
۱۲- عثمان ابن ابی نصح	۱۰۹ھ / ۷۲۷ء	۱۱۰ھ / ۷۲۸ء
۱۳- حذیفہ بن الاحوص	۱۱۰ھ / ۷۲۸ء	۱۱۱ھ / ۷۲۹ء
۱۴- الہیثم بن عبدالکلابی	۱۱۱ھ / ۷۲۹ء	۱۱۳ھ / ۷۳۱ء
۱۵- محمد بن عبداللہ	۱۱۳ھ / ۷۲۹ء	ـــــ
۱۶- عبدالرحمٰن بن عبداللہ	۱۱۳ھ / ۷۳۱ء	۱۱۴ھ / ۷۳۲ء
۱۷- عبدالملک بن القطن الفہری	۱۱۴ھ / ۷۳۲ء	۱۱۶ھ / ۷۳۴ء
۱۸- عقبہ بن الحجاج	۱۱۶ھ / ۷۳۴ء	۱۲۲ھ / ۷۴۰ء
۱۹- عبدالملک بن القطن الفہری	۱۲۳ھ / ۷۴۰ء	
۲۰- بلج ابن بشر القیاض	۱۲۳ھ / ۷۴۱ء	۱۲۴ھ / ۷۴۲ء
۲۱- ثعلبہ بن سلامہ	۱۲۴ھ / ۷۴۲ء	۱۲۵ھ / ۷۴۳ء
۲۲- ابوالخطار بن خوار	۱۲۵ھ / ۷۴۳ء	۱۲۷ھ / ۷۴۵ء
۲۳- ثوابہ بن سلامہ	۱۲۷ھ / ۷۴۵ء	۱۲۹ھ / ۷۴۷ء
۲۴- یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری	۱۲۹ھ / ۷۴۷ء	۱۳۸ھ / ۷۵۶ء

خلفائے بنی امیہ

حسب ذیل خلفائے بنو امیہ کے دور میں ملک اندلس فتح ہوا۔

۱ - ولید بن عبدالملک بن مروان
۲ - سلیمان بن عبدالملک بن مروان،
۳ - عمر بن عبدالعزیز،
۴ - یزید بن عبدالملک بن مروان،
۵ - ہشام بن عبدالملک بن مروان،

عبدالرحمٰن الداخل

حسنِ اتفاق کی عجیب و غریب داستان

اندلس کی فتح میں بربر قبائل کا حصہ کسی طرح عربوں سے کم نہ تھا۔ بربر بھی ویسے ہی خالص مسلمان تھے، جیسے عرب، انہیں اپنے دین پر ناز تھا، وہ اسلام کی تعلیم مساوات کو حاصل کائنات سمجھتے تھے، لیکن عربوں نے ان کے ساتھ وہ سلوک نہ کیا جس کے وہ متمنی تھے۔ متعدد عرب قبائل فتح کے بعد اندلس میں آکر بس گئے، ان میں اور بربروں میں چپقلش شروع ہوگئی، صفحاتِ سابق میں ولاۃ اندلس کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ کس قدر جلد جلد ان گورنروں کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی، آخر اس کی وجہ اس کے سوا کوئی نہ تھی کہ قبائلی عصبیت نے نظم و انتظام میں ابتری پیدا کر دی تھی، خانہ جنگیوں کی آگ بھی برابر بھڑکتی رہتی تھی، اور اس آگ میں مسلمانوں کا وقار جلتا رہتا تھا!

اسپین کے لوگ ان آئے دن کی ہنگامہ آرائی، خانہ جنگی، کشت و خون اور فتنہ و فساد سے عاجز آگئے تھے، وہ چاہتے تھے یہ حکومت بدلے اور کوئی ایسی حکومت قائم ہو، جو مضبوط و مستحکم ہو، جو باغیوں کی سرکوبی کر سکتی ہو، عیسائی فساد انگیزوں کو زیر کر سکتی ہو، مسلمانوں میں ضبط و نظم قائم رکھ سکتی ہو، جو اس پر قانع نہ ہو جاتے جو کچھ حاصل ہو جاتا، جس میں آگے بڑھنے، ترقی کرنے اور عروج حاصل کرنے کی امنگ ہو، جو اپنی صلاحیت، فسادِ باہمی، اور جنگ زرگری میں نہ صرف کرے، بلکہ جس کی صلاحیت، اسلام کے عروج، مسلمانوں کی ترقی، اور اس نئے دیس کی نہضت و ارتقا پر صرف ہو۔

لیکن ——— ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی!

عرب اور بربر آپس میں برسرِ پیکار تھے، عرب اور عرب ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے، مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے کی تاک میں تھے، کوئی صورت ایسی نہ تھی جس سے یہ سمجھا جاتا کہ

اب عادت سازگار ہو گئے ہیں، اور اندلس کی حکومت یکسوئی کے ساتھ ملک کی فلاح وصلاح کا پروگرام بروئے کار لائے گی۔

بنو عباس کی زیادتیاں

۱۳۲ھ میں حکومت بنی امیہ کا تختہ الٹ گیا، آخری اموی تاجدار، مروان الحمار، اگرچہ بڑا معاملہ فہم بیدار مغز اور شجاع تھا لیکن ادبار کی گھٹاؤں کو وہ نہ روک سکا، زوال کا جو طوفان آرہا تھا ایک تنکے کی طرح وہ اس میں بہہ گیا۔

بنو امیہ کے بعد بنو عباس نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور برسر اقتدار ہوتے ہی انہوں نے ان تمام سختیوں، شہادتوں اور زیادتیوں کا ایک ایک کرکے بدلہ لینا شروع کر دیا جو بنی امیہ سے ظہور میں آچکی تھیں۔

بنو عباس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ بنو امیہ کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے وہ مظالم کئے کہ خود بنو امیہ سے بڑھ گئے، غرض جب بنو امیہ کا قتل عام ہو رہا تھا تو خاندان شاہی کا ایک شخص عبدالرحمٰن اپنے سر پر ننگی تلواروں کی جھنکار دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، سامنے دریائے فرات لہریں لے رہا تھا، دریا میں کودا، پار اترا، کسی طرح گرتا پڑتا افریقہ پہنچا، وہاں کے لوگ گویا منتظر ہی تھے، انہوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا، تخت حکومت پیش کیا اور وہ بڑی حد تک امن وامان کے ساتھ اور کسی حد تک خونریزی کے بعد خلیفہ عبدالرحمٰن الداخل کے زندہ جاوید نام کے ساتھ تخت حکومت پر جلوہ فرما ہوا، یہ واقعہ ۱۳۸ھ کا ہے۔

ستارۂ اوج واقبال

عبدالرحمٰن اپنے ساتھ ستارۂ اوج اقبال بھی لایا تھا، امیر یوسف الفہری نے بار بار بغاوت کی۔ اس لئے کہ عبدالرحمٰن کے سریر آرائے حکومت ہونے سے پہلے وہی اندلس کا الاکُل مختار بنا ہوا تھا، اس کی اطاعت مصلحت کا تقاضا نہ تھی اور بغاوت ناکام ہوئی، عبدالرحمٰن کامیاب ہوا، وہ شام سے بھاگ کر یہاں اس لئے آیا تھا کہ فرمانروائی کرے، اپنے اس مقصد میں وہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوتا، کوئی سرکشی اس کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی۔

عباسی لشکر کی اندلس پر چڑھائی

۱۴۶ھ / ۷۶۳ء میں خلیفہ ابو جعفر المنصور عباسی نے اپنے ایک امیر العلاء ابن مغیث کو ایک لشکر جرار دے کر اندلس کی فتح پر مامور کیا، اشبیلیہ کے قریب العلاء اور الداخل کی افواج میں مقابلہ ہوا۔ العلاء قتل ہوا، اور عباسی فوج نے شکست کھائی ——— معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا، اصل میں یہ آزمائشی مہم تھی، ورنہ خلافت عباسیہ خود اپنے مسائل میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اتنے دور دراز مقام پر فوج کشی کرنا نہ اس کے لئے مناسب تھا نہ قرین مصلحت،

یمنی قبائل کی بغاوت

۱۵۱ھ / ۷۶۸ء میں یمنی قبائل مقیم اندلس نے بارادہ بغاوت قرطبہ پر فوج کشی کی خلیفہ عبد الرحمٰن کے حکم سے عبد الملک بن عمر حاکم اشبیلیہ نے بڑھ کر مقابلہ کیا، اس کے بیٹے نے کم ہمتی دکھائی تو اسے وہیں قتل کر دیا۔ اہل یمن عبد الملک کی یورش کی تاب نہ لا کر بری طرح پراگندہ اور منتشر ہو کر بھاگے، ان کی قوت بالکل ٹوٹ گئی۔ پھر ان میں مقابلہ کی طاقت باقی نہ رہ گئی، اس بغاوت اور جنگ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں طرفین کے تیس ہزار آدمی کام آئے۔

ہم ہزار بربر

۱۶۶ھ میں عبد الرحمٰن نے ایک اور مدبرانہ قدم اٹھایا! اگرچہ اندلس پر عبد الرحمٰن کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کر رہا تھا لیکن سازشیں اور بغاوتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، یہ سازشیں اور بغاوتیں زیادہ تر عرب قبائل ہی کی طرف سے رونما ہوتی رہتی تھیں، اس لئے کہ انہی میں کشور کشائی اور فرمانروائی کی امنگ تھی، عبد الرحمٰن نے سوچا جب تک توازن قوت کے اصول پر کام نہ کیا جائے، یہ ہنگامہ آرائیاں جاری رہیں گی چنانچہ اس نے اہل بربر کو اندلس آنے کی ترغیب دی، چنانچہ چالیس ہزار بربر آ کر اس کی فوج میں شریک ہو گئے۔ ان بربروں سے اس نے بڑے کام لئے، دشمنوں اور مخالفوں کی خوب سرکوبی کی۔

شارلیمین کا دست مصالحت

اندلس کے عیسائی، اگرچہ مرفہ الحالی اور سکون و عافیت کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن ان میں رہ رہ کے بغاوت

مانشمار بھڑکتا تھا، آس پاس کے عیسائی فرماں روا بھی ہمیشہ دبتے رہتے تھے، چنانچہ فرانس کا بادشاہ شارلیمین بھی ایک عرصہ تک عبدالرحمن سے برسرپیکار رہا، لیکن تھک کر اس نے سلطان کے پاس سفارت بھیجی اور صلح کی التجا کی، جو منظور کر لی گئی۔

تعمیرات کا آغاز اندلس کی یادگار زمانہ عمارتوں کی (جن کے آثار و نقوش اب تک قائم ہیں) داغ بیل، درحقیقت عبدالرحمن کے ہاتھوں پڑی، مسجد قرطبہ اور باغ رصافہ کی تعمیر اسی کے عہد میں شروع ہوئی تھی، تکمیل اس کے بیٹے ہشام کے عہد میں ہوئی۔

اہل خاندان سے حسن سلوک بنو امیہ کے لوگوں پر عباسیوں نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، عبدالرحمن نے انہیں اندلس پہنچایا۔ بڑے بڑے عہدے دیئے، جاگیریں عطا کیں، انعامات سے نوازا، اگرچہ ان سب کا سلسلہ لمبے سازشوں اور بغاوتوں کی صورت میں رہا، لیکن وہ اپنے طرز اور روش پر قائم رہا۔

خلاصۂ کلام عبدالرحمن نے اپنے عہد میں مسجدیں بنوائیں، محلات تعمیر کیے، مدرسے قائم کیے، سراؤں کی بنیاد ڈالی، رفاہ عام کے کاموں سے اسے بڑی دلچسپی تھی، اور ان کاموں کو شروع کرتے وقت ذرا نہیں سوچتا تھا کہ ان پر خرچ کتنا آئے گا اور اپنی اولوالعزمی سے انہیں اتمام تک پہنچا کر دم لیتا تھا!

وفات ۱۷۲ھ میں، یہ نیک نام اور نیک فرجام بادشاہ اس دنیا سے رخصت ہوا۔

عروج و زوال

حالات کا مسلسل اتار چڑھاؤ۔

عبدالرحمٰن نے ہشام کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا، اور بڑے بیٹے سلیمان کو نظر انداز کر دیا تھا، اس لئے کہ سلیمان صفاتِ ملوکانہ سے محروم تھا، اور ہشام ہر اعتبار سے اس منصب کا مستحق تھا۔

ہشام کا دورِ حکومت

چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد ہشام تختِ حکومت پر بیٹھا، یہ بڑا عابد، زاہد، متقی، پرہیزگار، خدا ترس، ساتھ ہی مدبر، منتظم، بہادر اور شجاع تھا، اُسے تخت پر بیٹھتے ہی بغاوتوں سے سابقہ پڑا، لیکن بڑی کامیابی کے ساتھ اُس نے بغاوتوں کو فرو کیا۔

کم و بیش ۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۴۰ سال کی عمر میں بیمار پڑا، اور اس دنیا سے سدھارا، اس کا جانشین الحکم ہوا، جس نے دنیا کی صرف ۲۲ بہاریں دیکھی تھیں۔

الحکم کی تخت نشینی

الحکم میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو عبدالرحمٰن الداخل میں تھیں، وہی تدبر، وہی مآل اندیشی، وہی حکمتِ عملی، وہی شجاعت و بسالت وہی استقلال و استقامت، پھر اس میں کچھ چیزیں، باپ اور دادا سے زیادہ بھی تھیں، اسے انصاف کا بڑا پاس رہتا تھا، اس نے بڑی منت سماجت کے بعد قاضی بشیر کو، عہدۂ قضا قبول کرنے پر راضی کیا، وہ انصاف کے معاملہ میں بڑے سخت تھے، ایک مرتبہ خود سلطان کو عدالت میں طلب کیا، اور اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا، لیکن سلطان کی پیشانی پر بل بھی نہیں آیا۔

برشلونہ پر عیسائی قبضہ

الحکم کی یہ خوبیاں اس کے لئے وبالِ جان بن گئیں، جب وہ تختِ حکومت پر بیٹھا، تو اس کے دو بڑے چچاؤں سلیمان اور عبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کی، الحکم ان الجھنوں میں گرفتار تھا کہ اس زمانہ میں

فائدہ اُٹھا کر عیسائیوں نے سر اُٹھایا، چنانچہ فرانسیسیوں نے ۱۸۵ھ میں برشلونہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ بھی کر لیا، عربوں نے پورا صوبہ خالی کر دیا، اور سرحدی قلعوں میں پناہ گزین ہوگئے۔

الحکم نے اپنے حاجب عبدالکریم ابن مغیث کو اس مہم پر مامور کیا اس نے نہایت قابلیت کے ساتھ اس مہم کو سر کیا، فرانسیسیوں کو ملک سے خارج کر دیا اور اشبیلیہ پر قبضہ کر کے قرطبہ واپس آگیا۔

خوفناک قحط ۲۰۰ھ میں اندلس کو ایک خوفناک قحط سے دوچار ہونا پڑا، ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے، الحکم پر اس ساری مدت میں خواب و خور حرام رہا، وہ اسے ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا دکھ سہے، مصیبت اٹھائے تکلیفیں برداشت کرے، اور خود عیش و آرام کی زندگی بسر کرے، اس نے اپنے اوپر ہر لذت حرام کر لی، اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا، جب تک یہ مصیبت اس کی مملکت سے دور نہیں ہوگئی۔

علم دوست فرمانروا الحکم، علم کا بڑا قدر دان تھا، اور اہل علم کو بہت عزیز رکھتا تھا، اس کے عہد میں مدارس کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا، علماء کی قدر و منزلت بڑھی،

۲۰۲ھ میں اس نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو ولی عہد مقرر کیا، ۲۰۶ھ میں جمعرات کے دن اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

عبدالرحمٰن ثانی عبدالرحمٰن ثانی بھی ایک اولوالعزم فرماں روا تھا، اس نے ۲۰۸ھ میں عبدالکریم ابن عبدالواحد کو قسطلہ اور الیہ کی تسخیر کے لئے فوج گراں دے کر روانہ کیا، عبدالکریم نے عیسائی قلعوں پر قبضہ کر لیا، اور انہیں خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔

عیسائیوں کی سرکوبی عیسائی دراندازانہ اپنی سرگرمیوں میں برابر مصروف تھے، وہ حدود اندلس میں داخل ہو کر مسلمانوں کو قتل کرتے، لوٹتے، اور چلتے بنتے، ۲۲۴ھ میں سلطان نے عبداللہ البلنسی کو مقابلہ کے لئے بھیجا، اس نے اہل قسطلہ کو شکست فاش دی، دوسری جانب موسیٰ بن موسیٰ نے بادشاہ جلیقیہ کو زبردست شکست دی۔

شاہ قسطنطنیہ کی التماس

۲۲۵ھ میں طیوفلس شاہ قسطنطنیہ نے عبدالرحمٰن ثانی سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی التماس کی، عبدالرحمٰن نے اپنے وزیر یحییٰ الغزالی کو بیش بہا تحائف کے ساتھ طیوفلس کے پاس بھیجا، اور دونوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

تارکانِ وطن

عبدالرحمٰن کی داد و دہش، اندلس کی زرخیزی اور کشش نے بہت سے لوگوں کو مسکایا اور وہ دولت عباسیہ کا دامن چھوڑ کر اندلس میں گئے، اور یہیں کے ہو رہے، ان نوواردوں میں اہل علم بھی تھے اور اہل فن بھی، اندلس نے سب کے لئے اپنا آغوش کھول دیا، ان کی قدر افزائی کی، اور انہیں عروج و کامیابی کے وسائل بہم پہنچائے،

زریاب اندلس میں

انہی لوگوں میں مشہور موسیقار اور فنکار زریاب بھی تھا، اسے خود عبدالرحمٰن نے طلب کیا تھا، یہ موسیقی کے علاوہ فن نجوم، ہیئت، جغرافیہ اور انشا پردازی میں بھی کامل دستگاہ رکھتا تھا۔

عیسائیوں کی اہانت رسول

عبدالرحمٰن کے دور میں عیسائیوں نے ایک نہایت خطرناک تحریک شروع کی، یہ جوق در جوق سڑکوں پر اسلام اور داعی اسلام کو گالیاں دیتے ہوئے نکلتے تاکہ مسلمان مشتعل ہوں، حکومت ان پر ظلم کرے، اور عیسائی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو جائے،

لیکن عبدالرحمٰن کے تدبر اور مقامی رعایا کے صاحب اثر و نفوذ عیسائیوں کی مآل اندیشی کے باعث یہ تحریک پروان نہ چڑھ سکی، خود عیسائی مورخ اسٹینلی لین پول نے لکھا ہے کہ سمجھدار عیسائیوں نے اپنے ہم مذہبوں کو روکا اور کہا کہ "عرب ہمارے مذہب میں بالکل دخل نہیں دیتے، ہم ہر طرح سے خوشحال اور مطمئن ہیں، ان فوائد کے عوض محض حکومت کی تمنا میں اپنی مال و جان تلف کر دینا عقل و دانش سے بعید ہے"

سرکاری آمدنی میں اضافہ

عبدالرحمٰن ثانی کے دور میں اندلس کے مالیات پر بھی بڑا اچھا

اور خوشگوار اثر پڑا، اس کی تخت نشینی کے وقت کل آمدنی چھ لاکھ دینار سرخ تھی، لیکن آپ کے حسنِ انتظام کی بدولت یہ قسم دس لاکھ دینار سرخ تک پہنچ گئی،

۲۳۸ھ میں ۳۱ سال حکومت کرنے کے بعد عبدالرحمٰن ثانی کا انتقال ہو گیا۔

منچلا بادشاہ محمد ۲۳۸ھ میں سلطان محمد بن عبدالرحمٰن تخت نشین ہوا، یہ بڑا جیالا اور منچلا بادشاہ تھا، اس نے تخت پر بیٹھتے ہی موسیٰ ابن موسیٰ کی سرکردگی میں ایک فوج قسطلہ کی فتح کے لئے بھیجی، اور دوسری برشلونہ پر شانہ کی۔

یہ مہم جاری تھی کہ طلیطلہ کے عیسائیوں کے اکسانے سے جلیقیہ کے بادشاہ نے اندلس پر حملہ کر دیا، سلطان نے صورت حال کی نزاکت محسوس کر لی، خود فوج لے کر مقابلہ کے لئے بڑھا، وادی سلیطہ کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، عیسائیوں نے بری طرح محمد کی حسنِ تدبیر سے شکست کھائی۔

الفانسو کی شکست ۲۵۱ھ میں محمد کے بیٹے المنذر نے شاہ الفانسو سے مقابلہ کیا اور اسے زبردست شکست دی، بہت کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اور یہ سارا مال اس نے لا کر اپنے باپ کے قدموں پر ڈھیر کر دیا۔ اسی سال سلطان محمد نے بھی جلیقیہ پر دوبارہ فوج کشی کی، دشمن کو بہت کافی نقصان پہنچا کر دارالخلافہ واپس آیا،

سلطان محمد کی زندگی کا بڑا حصہ، داخلی اور خارجی جنگ و جدل میں بسر ہوا، اس سے جو وقت بچتا تھا اسے وہ اہل علم کی صحبت میں صرف کرتا تھا، ۲۷۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا،

المنذر محمد کے انتقال کے بعد المنذر تخت نشین ہوا، یہ باپ سے بھی زیادہ جیالا اور منچلا تھا، بڑے سے بڑے خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا چنانچہ ۲۷۵ھ میں ایک جنگ ہی کے دوران میں، جام شہادت نوش کیا،

عبداللہ ابن محمد عبداللہ نہایت ہی نکما اور ناکارہ بادشاہ ثابت ہوا، اس کا دورِ حکومت تمام تر بغاوت اور سازش سے عبارت ہے، یہ اپنے طرزِ عمل سے کسی کو بھی نہ خوش رکھ سکا، نہ عربوں کو نہ بربروں کو نہ عیسائی رعایا کو ۔۔۔ اس کے عہد حکومت

میں اندلس کی وسیع اور شاندار حکومت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی، بدنظمی کا دور دورہ ہو گیا، انتشار اور پراگندگی کی کارفرمائی ہر طرف نظر آنے لگی، رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ تاج و تخت کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی جسے یہ اپنی کہہ سکتے۔ اشبیلیہ کے گورنر نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اشبیلیہ قرطبہ سے چشمک زنی کرنے لگا، بربروں نے بھی انگڑائی لی، انہوں نے پرتگال کے جنوبی صوبے اور اندلسیہ کے مشہور شہر جیان پر قبضہ کر لیا، کئی مقامات پر عیسائیوں نے بھی سر اٹھایا، اور آزادی و خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا مسلمانوں کے خون سے سیراب ہونے والا یہ پودا، اب مرجھایا ہی چاہتا ہے، اندلس طوائف الملوکی کی نذر ہو جائے گا اور یا تو یہ چھوٹی چھوٹی اور کمزور ریاستوں میں بٹ جائے گا، ورنہ پھر عیسائی اس پر قبضہ کر لیں گے۔!

——— لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم!

Good

J Bukhari

J Bukhari

عبدالرحمن الناصر

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

قدرت کو ابھی یہ منظور نہ تھا کہ اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹے، اسی لئے عبدالرحمن ثالث جو عام طور پر عبدالرحمن الناصر لدین اللہ کے نام سے معروف ومشہور ہے جلوہ آرائے سریر مملکت ہوا۔

عبدالرحمن الناصر میں کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو، جو خوبیاں تھوڑی تھوڑی کر کے بہتوں میں تھیں وہ سب اس ایک ذات میں خدا نے جمع کر دی تھیں،

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

شاندار دور کا آغاز صرف تیس سال کی عمر میں عبدالرحمن اپنے باپ محمد کی وفات کے بعد تخت حکومت پر بیٹھا لیکن وہ کچھ اس سج دھج اور شان وتمکنت کے ساتھ تخت حکومت پر بیٹھا کہ دفعتاً حالات بدل گئے۔ باغیوں نے اطاعت قبول کر لی، سرکشوں نے سر جھکا دیئے۔ دشمنوں نے دوستی کا پیمان باندھا، مخالفوں نے وفاداری کا عہد کیا،

الناصر نے سب سے پہلے امرائے عرب کی خبر لی، اور انہیں اطاعت پر مجبور کیا، اس سے فارغ ہو کر وہ عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا کہ انہوں نے اپنی شر پسندی سے سارے ملک میں بے اطمینانی اور انار کی پھیلا رکھی تھی، اور بہت جلد انہیں اطاعت پر مجبور کر دیا۔

غلاموں کی فوج الناصر نے فوج میں اضافہ کیا، سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھائیں، انہیں انعامات سے نوازا، پھر غلاموں کی ایک خاص فوج تیار کی، اور اس سے بڑے بڑے کام لئے، جس نے سر اٹھایا اس کی فوراً سرکوبی کی، جس نے سازش کی اسے اسی وقت سزا ملی جس نے بغاوت کی تیاری کی اس کی قوت کو پارہ پارہ کر کے کچل دیا گیا۔ اس نے جلیقیہ اور

طلیطلہ کے مرحلے سر کرنے کے بعد اردونی ثانی (لیون کا حکمران۔ یملن فرانس میں ہے) کی تیاری، اس نے چند کلیدی مقامات کا حال سنا اور ۳۰۸ھ میں یہ خود مقابلہ پر پہنچا، اردونی کی مدد کے لئے فرانس وغیرہ کی فوجیں موجود تھیں، بڑا سخت معرکہ ہوا، لیکن عبدالرحمٰن نے زبردست کامیابی حاصل کی، اس نے دشمن کی فوج کو درہم برہم کر دیا، اور عیسائیوں کے فوجی استحکامات تباہ کرنے کے بعد شاہانہ فتح بجاتا اپنے دارالخلافہ قرطبہ واپس آگیا۔ خلیفۃ المسلمین ملقب میں

۳۱۱ھ میں شاہ بنبلونہ نے چند سرحدی قلعوں پر قبضہ کر لیا، الناصر بنبلونہ کے پایۂ تخت تک بڑھتا چلا گیا۔ شہر میں داخل ہوا، شہر پناہ کو منہدم کیا، اور کامیاب و کامران اپنے مستقر پر واپس آگیا

اعلان خلافت

اب تک اندلس کے فرماں روا، یا امیر کہلاتے یا سلطان، خلیفہ کا لقب خاندان عباسی کے لئے مخصوص تھا، لیکن الناصر نے پہلی مرتبہ یہ رسم توڑی اور خود خلیفۃ المسلمین ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

ادمیر سے زبردست مقابلہ

۳۲۷ھ میں الناصر اور ادمیر کے درمیان نہایت خوں ریز جنگ ہوئی، اس جنگ کی شدت اور ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں پچاس ہزار عرب کام آگئے، لیکن الناصر نے ادمیر کا پیچھا نہ چھوڑا، یہاں تک کہ وہ مقابلہ سے عاجز آگیا۔

سفارتیں

۳۳۶ھ میں قسطنطین شہنشاہ۔ قسطنطنیہ نے اپنے سفیر کی معرفت بیش بہا تحائف ارسال کئے اور پیمان دوستی مستحکم کرنے کی کوشش کی، کچھ مدت بعد، جرمنی اور فرانس کی طرف سے بھی سفارتیں آئیں، اور انہوں نے حکومت اندلس سے دوستی اور رفاقت کا عہد استوار کیا، یہ رنگ دیکھ کر اردونی اور شاہ برشلونہ نے بھی تعلقات دوستی استوار کرنے کی التجا کی جو قبول کر لی گئی، الناصر کی ہیبت اس کے کارناموں کی بنا پر معاصر یورپین فرماں رواؤں پر ایسی قائم ہو گئی کہ اکثر بڑے بڑے بادشاہوں نے سفارتیں بھیجیں اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی تمنا کا اظہار کیا۔

مغرب اقصیٰ کی فتح

عبدالرحمٰن الناصر اور افریقہ و مصر کی فاطمی حکومت کے بھی تعلقات ناخوشگوار تھے، یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھتی تھیں، اور اس فکر میں رہتی تھیں کہ دوسرے علاقے پر قابض ہو جائیں۔

چنانچہ خاندان بنی فاطمہ کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی اندلس کے قریب پہنچ گئیں، لیکن آگے نہ بڑھ سکیں، الناصر بھی تاک میں تھا، ۳۴۱ھ میں اس نے اپنے بیڑے ساحل افریقہ کی طرف روانہ کئے، اور قلعوں پر بہ جبر قبضہ کر لیا رفتہ رفتہ وہ افریقہ کے اس تمام علاقے پر قابض اور متصرف ہو گیا جو مغرب اقصیٰ کے نام سے مشہور ہے۔

مدینۃ الزہرا

عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بھی بہت شوق تھا، اس نے ایسی ایسی خوبصورت اور نادر روزگار عمارتیں تعمیر کرائیں، جن کی نظیر چشم فلک کی نظر سے نہ گذری ہو گی، اس کی عمارتوں کے کھنڈر اور آثار اب تک موجود ہیں اور دیکھنے والوں کو درس عبرت دے رہے ہیں۔

قرطبہ کی مشہور مسجد میں اس نے توسیع کرائی اور اسے پہلے سے کہیں زیادہ شاندار بنا دیا۔

الناصر کا بہت بڑا کارنامہ قصر الزہرا یا مدینۃ الزہرا کی تعمیر ہے۔ یہ اس نے اپنی محبوب کنیز الزہرا، کی فرمائش پر تعمیر کرایا تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود کی دیواروں میں پندرہ ہزار بلند دروازے نصب تھے، اس پر ایک کروڑ پچاس لاکھ دینار سرخ کی لاگت آئی ۳۲۵ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۳۵۰ھ میں اتمام کو پہنچی، دس ہزار معمار اور مزدور چار ہزار اونٹ اور خچر، روزانہ اس کے بنانے میں مصروف رہتے تھے، قصر زہرا، چار ہزار تین سو سولہ برجوں اور ستونوں پر قائم تھا ان ستونوں میں سے بعض ستون بادشاہان فرانس اور قسطنطنیہ وغیرہ نے تحفۃً بھیجے تھے اس قصر کے انتظام اور نگہداشت کے لئے تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم اور تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام قوم نصاریٰ کے متعین تھے، حرم سرا میں چھ ہزار عورتیں خدمت گذاری کے لئے رہا کرتی تھیں، حوضوں میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں علاوہ اور چیزوں کے ڈالی جاتی تھیں، عربوں نے اس محل کی تعمیر پر اپنا فن ختم کر دیا تھا، لیکن جب عیسائیوں نے اس دیس سے مسلمانوں کو نکالا تو جوش انتقام میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

عدلت پسندی الناصر بڑا انصاف دوست اور عدالت پرور فرماں روا تھا، اس نے عدلیہ کو بالکل آزاد کر رکھا تھا، اور اسے پورا حق تھا کہ وہ خود خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین پر اپنے احکام نافذ کرے، چنانچہ اس نے اپنے اس حق سے فائدہ بھی اٹھایا، اسی سلسلہ میں قاضی منذر کے کارنامے صفحاتِ تاریخ کے نہ مٹنے والے واقعات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

یادگار کارنامے خلفائے اندلس میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے طویل عمر پائی، یہ ۲۷۷ھ میں پیدا ہوا تھا، ۲ رمضان ۳۵۰ھ میں بہ عمر ۷۳ سال اپنے قصر الزہرا میں انتقال کیا۔

الناصر کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ عبداللہ بن محمد کے بعد تخت پر نہ بیٹھتا تو اندلس کی تاریخ اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی! ——— لیکن الناصر نے بگڑا ہوا کام بنا لیا!

ابو عاص المنصور

فتح یابی — خانہ جنگی — قتل و پیکار

الناصر کے بعد الحکم ثانی، تخت حکومت پر متمکن ہوا، الحکم بڑا علم دوست، علما کا قدر شناس بہادر، بہادروں کا دوست، مدبر اور مصلحت شناس و مآل اندیش فرمانروا تھا اس کی تخت نشینی کا جشن بھی دھوم دھام سے منایا گیا۔

سرحدی شورش حسب دستور الحکم کے تخت نشین ہوتے ہی، سرحدی عیسائیوں نے فتنہ و فساد اور شورش کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن الحکم ایک بیدار مغز فرمانروا تھا، وہ خود بنفس نفیس لشکر گراں لے کر پہنچا - اور اس نے باغیوں کی سرکوبی کی اور قرطبہ واپس آ گیا اس کے واپس آنے کے بعد بھی جلیقیہ کی طرف سے شورش کا سلسلہ جاری رہا، تو الحکم نے اپنے ایک سردار غالب کو فوج دے کر روانہ کیا، غالب کو اپنی فوج سے کئی گنا زیادہ عیسائی فوج کے مقابلہ میں لڑنا پڑا، لیکن جس خدا پر بھروسہ کر کے اس نے میدان میں قدم رکھا تھا، اس نے مدد کی، آس پاس کے دوسرے عیسائی بادشاہوں نے بھی سر اٹھایا، لیکن -

سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آ گیا!

اذمیر کے بیٹے شانجہ نے بھی دوسرے عیسائی رجواڑوں کی مدد سے بغاوت کی، اور الناصر کے پچھلے احسانات اور عنایات کو بالکل فراموش کر دیا، لیکن الحکم کی چوکسی نے اس بغاوت کو بھی ناکام کر دیا برشلونہ اور قسطانہ کی طرف سے بھی بغاوت ہوئی لیکن اسے بھی آسانی سے کچل دیا گیا۔

فتوحات اور پیش قدمی الحکم کی تخت نشینی کے چوتھے سال سے یعنی ۳۵۴ھ سے، پھر فتوحات اور پیش قدمی اور فوج کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا چنانچہ قلمریہ اور قطوبیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، ان دونوں شہروں میں مسلمانوں کی آبادی بھی بہت

زیادہ بڑھ گئی۔ اس کے بعد اسلامی لشکر البتہ (ALAVA) کی طرف فاتحانہ یلغار کرتا ہوا بڑھا، یہاں بھی جب دل خواہ کامیابی ہوئی، قلعۂ عزاج ( ) پر قبضہ کر لیا، اسی سال مجوسیوں (نارمنوں) نے بحری لوٹ مار مچائی، اور اندلس کے ساحلی شہروں پر یورش کر کے مسلمانوں کو لوٹا اور شہروں کو تاراج کیا، الحکم نے بحری ناکہ بندی کر کے نارمنوں کو بھگایا، اور آئندہ کے لئے ایسا انتظام کیا کہ اگر نارمن آئیں تو انہیں فوراً واقعی سزا دی جا سکے، الحکم کے اس اقدام نے ساحلی علاقوں کے مسلمانوں میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر دی۔

افریقہ کا بحران

فاطمی خلیفہ المعز نے جب یہ دیکھا کہ مغرب اقصیٰ میں امیہ اندلسی کا زور بڑھ رہا ہے، تو اس نے اپنے سپہ دار جوہر کو ایک عظیم لشکر کے ماتحت روانہ کیا کہ وہ جنگ کرے، اور امیہ اندلسی کا زور توڑ دے۔ جوہر نے اس فرض کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ طنجہ میں یعلی ابن محمد امیہ اندلسی کی طرف سے حکمران تھا، جوہر کی فوج سے جنگ کرتے ہوئے وہ ہلاک ہو گیا، پھر جوہر نے شہر فاس کو فتح کیا۔ حاکم شہر کو قتل کیا، ملک کو تاراج کر ڈالا اور مصر واپس چلا گیا، ۳۶۲ھ میں امیر غالب اس مہم کو سر کرنے کے لئے الحکم ثانی کی طرف سے پہنچا، اس نے فاس پر پھر قبضہ کر لیا، اور کامیاب و کامران قرطبہ واپس آیا۔

الحکم کا کتب خانہ

الحکم علم و فن سے بڑی دلچسپی تھی، اس کا دربار علموں اور فن کاروں کا مرکز بنا ہوا تھا، خود الحکم کو بھی علم ادب اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی تھی، ان علوم میں اس کا پایہ کسی بڑے سے بڑے عالم سے کم نہ تھا، اس نے بڑے بڑے محققین کو گراں قدر معاوضے دے کر اندلس بلایا، اس نے بڑے بڑے مصنفین کی کتابیں رقم خطیر خرچ کر کے اندلس میں شائع کیں، اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں، ان میں سے ہر کتاب اس نے پڑھی تھی، ہر کتاب پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹ موجود تھے۔

الحکم کو مذہب سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے قلمرو میں اگر کوئی شخص کسی خلاف شرع فعل کا ارتکاب کرتا تھا تو اسے فوراً سزا دی جاتی تھی، اس نے مدارس اور مساجد پر کروڑہا روپیہ خرچ کیا علاوہ

بیماری میں وہ اپنے وقار اور آداب شاہی کا بھی خیال کم کرتا تھا۔

۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ہشام ثانی کی تخت نشینی

الحکم کے انتقال کے وقت ہشام کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی چونکہ وہ نابالغ تھا لہٰذا اس کے سن شعور تک پہنچنے کی مدت کے لیے خود الحکم نے ایک "نجلسی کونسل" قائم کردی تھی، جو ہشام کی ماں ملکہ سلطانہ صبح، امیر مصحفی، اور محمد بن ابی عامر پر مشتمل تھی، یہی کونسل تمام امور مملکت انجام دیتی تھی،

ابو عامر۔ اور غالب مصحفی

ابو عامر کو خاک سے پاک کرنے میں امیر مصحفی اور امیر غالب کا بڑا حصہ تھا، ان دونوں کا عوام پر بھی بڑا اثر تھا، اور خواص پر بھی،

ابو عامر محسوس کر رہا تھا جب تک یہ دونوں کانٹے راستے سے نہ ہٹیں، اس وقت تک وہ صحیح معنی میں عروج نہیں حاصل کر سکتا، ترقی نہیں کر سکتا امور و نظم مملکت کا واحد مالک و مختار نہیں بن سکتا، اس نے بڑی چالاکی سے اپنے ان محسن سرداروں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا، اور یہ کام اتنی ہوشیاری سے انجام دیا کہ دونوں کو پتہ اس وقت چلا، جب وہ ہر قسم کے اقتدار و اختیار سے محروم ہو کے غربت اور بیچارگی کی زندگی ... نے پر مجبور ہو گئے تھے، ان دونوں سرداروں کو لڑانے کے بعد ابو عامر کے لئے راستہ صاف ہو گیا، اس نے باری باری سے ان دونوں کو محروم اقتدار کر دیا۔ ملکہ سلطانہ صبح پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ ابو عامر کی وفاداری، کارگزاری اور نمک حلالی کی ثناخواں ہو گئی، ہشام ابھی کمسن تھا، وہ بھی ابو عامر کا مطیع منقاد بن گیا۔

ابو عامر کی شخصیت

حصول اقتدار کے بعد ابو عامر منصور نے رفتہ رفتہ تمام حکام و عمال بدل دیئے اور ان کی جگہ اپنے آدمیوں کو مقرر کیا فوج میں بھی اس نے یکسر تبدیلی کی اور اپنے آدمیوں سے فوج کو بھر دیا۔ شاہی محل کے سابق ملازمین بھی برخاست کر دیئے، اور اب محل میں تمام تر اسی کے آدمی نظر آنے لگے۔

بر سر اقتدار آنے کے بعد ابو عامر منصور نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ابو مصحفی کی معزول کر کے جیل میں ڈال دیا اور ایک روایت کے مطابق زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ مصحفی اپنی زندگی کے دور اقتدار میں جدھر نکل جاتا تھا، لوگوں کا ہجوم اس کے دیدار کے لئے جمع ہو جاتا تھا، اب جب وہ جیل میں مرا تو ایک گمنام گوشہ میں چند دوستوں نے خاموشی سے لے جا کر دفن کر دیا۔

مصحفی کی ہلاکت کے بعد امیر غالب کو احساس ہوا کہ ابو عامر کیسا شخص ہے، ایک موقع پر اس نے ابو عامر پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بری طرح زخمی ہوا، لیکن بچ گیا۔ انجام ظاہر ہے جو غالب کی ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جب ابو عامر بالکل مطمئن ہو گیا اور اس کا طوطی بولنے لگا تو اس نے ملکہ سلطانہ صبح سے جبراً سارا خزانہ چھین لیا، ہشام کو اس نے مٹھی میں کر رکھا تھا، وہ ابو عامر کے سوا کسی کی بات نہ سنتا تھا نہ مانتا تھا۔ رفتہ رفتہ خود ہشام کا یہ حالت ہو گئی کہ وہ قیدی بن گیا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ ابو عامر کے احکام کی تعمیل بے چون و چرا کرے، اسے محل سے باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں تھی، اگر کبھی باہر نکلتا تھا، تو ابو عامر کے حکم سے نقاب ڈال کر۔

ابو عامر کے کارنامے

ان خامیوں اور خامکاریوں کے باوجود ابو عامر میں خوبیاں بھی تھیں، اس نے اگرچہ اپنی آمریت قائم کر رکھی تھی، لیکن سارے ملک میں امن وامان قائم کر دیا، باغیوں کی اس ... مرکوبی کی کہ وہ اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

عیسائی حکومتوں کی طرف سے جو شورشیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں ان کا استیصال کیا۔

ابو عامر منصور اب شہنشاہی لباس پہنتا تھا، مساجد کے خطبوں میں خلیفہ کے بعد اس کا نام لیا جاتا تھا۔ سکوں پر بھی المنصور کا نام آنے لگا۔

اپنی زندگی میں ابو عامر نے پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑیں، اور ہر جنگ میں کامیاب ہوا۔

ایک مرتبہ عیسائی لشکر، قرطبہ تک بڑھتا چلا آیا، ابو عامر نے سخت جنگ کی اور عیسائیوں کو بھگا کر دم لیا، ۳۷۲ھ میں المنصور یلغار کر کے جلیقیہ پہنچا، اور بہت سے مقامات تاراج کرتا ہوا

قرطبہ واپس آیا، ۳۸۷ھ میں جہاد کا اعلان کرکے جہاں البیرہ لبطہ (بازار) اور تدمیر ہوتا ہوا ابلنسیہ آیا، پھر ابوعامر بربل کے ملک میں داخل ہوا، اسے شکست فاش دی، ۳۸۸ھ میں متعدد عیسائی قلعے اور شہر فتح کرلئے، ۳۹۲ھ میں ایک بڑی فوج لے کر قسطلہ کی سرحد میں داخل ہوا، یہاں اس کے مقابلہ کے لئے اطراف و جوانب کے تمام عیسائی والی اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ موجود تھے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا، لیکن منصور نے ان سب کو بری طرح شکست دی۔

المنصور جسلم اور علما کا بھی بڑا قدردان تھا، ان کا ادب کرتا تھا، اور ان کی خدمت کرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا تھا۔

ابوعامر منصور نے عیسائیوں پر اتنی دہشت بٹھا رکھی تھی جس کی مثال ملنا مشکل ہے، ایک مرتبہ جب ایک خوں ریز جنگ کے بعد عرب اپنے مرکز پر واپس جا رہے تھے، ان کا ایک پرچم مقام مفتوحہ کے قریب ایک ٹیلہ پر گڑا رہ گیا، اگرچہ عرب فوج کوسوں دور نکل گئی تھی لیکن صرف پرچم کو ہوا میں لہراتا دیکھ کر کئی روز تک عیسائیوں نے شہر کے دروازے بند رکھے، کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ شہر سے باہر نکل کر دیکھتا کہ آخر بغیر فوج کے یہ پرچم کیسے یہاں لہرا رہا ہے؟

ابوعامر کا تعمیراتی ذوق ابوعامر منصور کو تعمیرات سے بھی بڑی دلچسپی تھی، ۳۸۷ھ میں اس نے ایک بہت بڑا قلعہ الزاہرہ کے نام سے بنوایا، یہ رفتہ رفتہ ایک خوبصورت اور خوشنما شہر بن گیا، عمدہ اور نفیس مکانات جن کے سنہرے گنبد آفتاب کی طرح روشن تھے، پرفضا سیرگاہوں کا جال بچھا ہوا تھا، بازاروں کی خوشنمائی دیکھنے والوں کی نظر اپنی طرف کھینچتی تھی، منصور نے وادی الکبیر کا شاندار پل بھی تعمیر کردیا۔ جس پر ایک لاکھ چالیس ہزار دینار خرچ صرف ہوئے، ۳۹۲ھ میں منصور کا انتقال ہوگیا، ہشام کے لئے یہ بڑا عمدہ موقع تھا کہ اب تمام اختیارات سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیتا، خود رعایا کی بھی یہی خواہش تھی اور خوش قسمتی سے منصور کا لڑکا بھی قرطبہ میں موجود نہیں تھا، لیکن ہشام اتنے دنوں کے تعطل سے اتنا ازکار رفتہ ہوگیا تھا کہ اس نے اس طرف توجہ نہیں کی،

عبدالملک بن منصور اور فوراً ابوعامر منصور کے بیٹے عبدالملک کو اپنا حاجب مقرر کردیا

اس کے اس طرزِ عمل سے اس کے حامی بڑے بد دل ہوئے لیکن مجبور تھے کیا کرتے ؛ عبد الملک بھی اپنے باپ کی طرح بڑا جیالا اور اولوالعزم شخص تھا۔ یہ بھی حکومت اور شاہی محل پر باپ کی طرح چھا گیا۔ اس نے ۳۹۴ھ میں جلیقیہ کے عیسائی بادشاہ کو بُری طرح شکست دی، اس کے پایۂ تخت لیون کو تاراج کیا، لیکن یہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہا محرم ۳۹۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

عبد الرحمٰن بن منصور اور ما بعد

عبد الملک کی وفات کے بعد اس کا بھائی عبد الرحمٰن بن منصور حاجب مقرر ہوا، یہ بھی ہشام کو انگلیوں پر نچاتا رہا لیکن یہ جتنا صاحب تدبیر، بہادر اور اولوالعزم تھا، اس سے کہیں زیادہ بے وقوف تھا، اس نے وہ پردہ بھی ہٹا دینا چاہا، جو اب تک وزارت اور خلافت کے درمیان حائل تھا اس نے ہشام کو مجبور کیا کہ وہ اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دے، ہشام نے تعمیل کر دی، یہ واقعہ ۳۹۹ھ ربیع الاول کا ہے اس بات نے عوام کو عبد الرحمٰن سے بہت برگشتہ کر دیا، ایک مرتبہ وہ ایک مہم پر فوج لے کر قرطبہ سے باہر گیا، یہاں بغاوت ہو گئی، اور اس بغاوت کا خاتمہ عبد الرحمٰن کے قتل پر ہوا (رجب ۳۹۹ھ) اس اثنا میں محمد بن عبد الجبار المہدی زبردستی ہشام کو ہٹا کر خلیفہ بن بیٹھا تھا، المہدی کی مدد بربروں نے کی تھی، اب وہ قتل کیلئے تمام، عربوں، بربروں اور عام رعایا میں آویزش کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر المہدی نے ہشام کو قید خانہ سے نکال کر پھر تخت خلافت پر متمکن کر دیا اور انجام کے خوف سے خود بھاگ کھڑا ہوا لیکن اب ایک دوسرا عرلیف تخت خلافت کا سلیمان پیدا ہو گیا تھا اس نے عیسائیوں کو سبز باغ دکھائے تھے کہ کامیابی کی صورت میں یہ سلوک کیا جائے گا، یہی کھیل المہدی بھی کھیل رہا تھا، وہ طلیطلہ بھاگ کر پہنچا، وہاں کے لوگوں نے خلاف توقع پذیرائی کی اس نے عیسائیوں کا ایک لشکر مسلمانوں سے لڑنے کے لئے تیار کیا، اور عیسائیوں سے بہت سے وعدے مراعات کے کر لئے، اور سلیمان کے مقابلہ کو نکلا، یہ واقعہ ۴۰۰ھ کا ہے۔ مقابلہ کی تاب نہ لا کر سلیمان بھاگ کھڑا ہوا، اب پھر المہدی کا دور شروع ہوا اس نے پھر ہشام کو قید کر لیا اور خلیفہ بن بیٹھا، لیکن اس مرتبہ یہ بُری طرح ناکام ہوا، ایک خواجہ سرا عنبر نے اسے قتل کر دیا، ہشام پھر

تخت خلافت پر بیٹھ گیا، لیکن اب حالات بدل چکے تھے، وہ عرب بربر خانہ جنگی کو نہ روک سکا، وہ بربروں کے سرگروہ سلیمان کو ——— جو عیسائیوں کی مدد کے بھروسہ پر مسلمانوں کو زبردست نقصان اور عیسائیوں کو زبردست فوائد پہنچا رہا تھا ——— راہ راست پر نہ لا سکا، آخر ۴۰۳ھ میں زبردست خونریزی کے بعد سلیمان غالب آیا، اور اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہشام کو قتل کر دیا۔

لیکن یہ حکومت سلیمان کو راس نہ آئی، اس کے خلاف بھی بغاوتیں شروع ہو گئیں، اور متعدد صوبوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ۴۰۷ھ میں طالقہ (اٹالیکا) کے میدان میں زبردست جنگ سلیمان اور علی ابن حمود (سردار بربر) والیٔ افریقہ کے درمیان زبردست جنگ ہوئی اس جنگ کا اختتام سلیمان کی شکست پر ہوا علی ابن حمود نے اسے قتل کر دیا اور خود مدعی خلافت بن بیٹھا!

دورِ انتشار

خانہ جنگیاں ــــ عیسائیوں کی حوصلہ مندیاں

علی بن حمود، الناصر الدین اللہ کا شاندار لقب اختیار کر کے تخت حکومت پر متمکن ہوا، رعایا خانہ جنگیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے عاجز آچکی تھی، اس نے خوشی خوشی اس کی بادشاہت قبول کر لی شروع میں اس نے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی، کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا تھا، لیکن جب اسے معلوم ہوا لوگوں کے دلوں میں خاندان امیہ کی یاد چٹکیاں لے رہی ہے اور کسی اموی شخص کو اس منصب پر فائز کرنا چاہتے ہیں تو اس نے اپنی پالیسی بدل دی اور ظلم و جور کا سلسلہ شروع کر دیا، بربروں نے بہت زیادہ طوفانِ بدتمیزی مچا رکھا تھا نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ آبرو، نہ مال، امن و امان کو ان بربروں نے پوری بربریت کے ساتھ تاراج کر رکھا تھا علی بن حمود نے بھی بربروں کی پشت پناہی شروع کر دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف بھی شورش ہوئی، اور ۴۰۸ھ میں یہ قتل کر دیا گیا، پھر اس کا بھائی القاسم تخت نشین ہوا، جو اشبیلیہ کا حاکم تھا، اس کا عہد بھی بربروں کی امن سوزی، بغاوت، شور اور خانہ جنگی میں ختم ہوا، اس کے خلاف اس کے بھتیجے یحییٰ نے بغاوت کی، یہ بھاگ گیا، وہ تخت پر بیٹھ گیا، یہ واقعہ ۴۱۲ھ کا ہے۔ اس کے بعد پھر ۴۱۳ھ میں نمودار ہوا اور ۴۲۷ھ میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس اثنا میں خاندان امیہ کے شہزادے وقتاً فوقتاً ذرا ذرا سی مدت کے لئے تخت نشین ہوتے لیکن حکومت ان سے بھی نہ سنبھلی یا قتل ہوئے یا روپوش۔

مرکز کا خاتمہ ان خانہ جنگیوں، اور ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کی حکومت مرکز سے محروم ہوگئی، اور چھوٹی چھوٹی کمزور، خود غرض اور غدار ریاستوں میں تقسیم ہوگئی، جس کے حاکم کے پاس ذرا بھی قوت تھی، وہ آزادی اور خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا،

چنانچہ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، مالقہ، الجزائر، سرقسطہ، امیریہ، افریقیہ وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔

۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء تک یہی کیفیت رہی، یہ چھوٹی چھوٹی اور کمزور حکومتیں آپس میں لڑتی رہیں اور عیسائی قوت حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا، بہت سے قلعے لے لئے، بہت سے حقوق اور مراعات حاصل کر لیے، بعض ریاستوں کو اپنا باج گزار بنالیا، اب یہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کے ادبار کا زمانہ شروع ہو چکا ہے اور عیسائی عروج و ترقی حاصل کر رہے ہیں!

عیسائی بڑی خاموشی اور ایک خاص نظم و انتظام کے ساتھ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے رہتے تھے، اور فوائد حاصل کرتے رہتے تھے۔

طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ

۴۷۸ھ میں القادر باللہ نے عیسائی اقتدار سے مرعوب ہو کر، اور بلنسیہ کی حکومت پر فائز رہنے کی امید میں طلیطلہ اذفونش چہارم کے حوالے کر دیا، طلیطلہ، کا شمار، قرطبہ کے بعد ہوتا تھا، اس خبر نے عربوں کے ہر گھر کو ماتم کدہ بنا دیا، اذفونش، جب طلیطلہ میں داخل ہوا، عیسائیوں کی مسرت جنون اور دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی، عیسائیوں نے مسلمانوں کے احسانات کا صلہ یہ دیا کہ پہلا فرمان جو نافذ کیا وہ یہ تھا کہ مسلمان جبراً عیسائی بنا لئے جائیں اور مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کر دیا جائے، شہر بربشتر پر عیسائیوں نے جب قبضہ کیا تو وعدہ کیا تھا مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی، لیکن قبضہ کرتے ہی اس عہد کو توڑ دیا اور عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دیا۔

یوسف بن تاشفین کی آمد

اسی سال اذفونش نے ایک بہت بڑا لشکر لے کر اشبیلیہ پر چڑھائی کی، یہ مسلمانوں کی تہذیب تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں کے فرماں روا نے، والی افریقیہ، یوسف بن تاشفین کو اپنی مدد کے لئے بلالیا، وہ محض حسبۃً للہ، جہاد کی نیت سے یہاں پہنچا۔ وادی زلاقہ میں بڑی خونریز جنگ ہوئی، عیسائیوں نے انجیل ہاتھ میں لے لے کر قسم کھائی تھی کہ میدانِ جنگ سے فرار نہ ہوں گے، لیکن انہیں فرار ہونا پڑا!

اُن کے ہزاروں آدمی ہلاک ہوئے، اُن کا سارا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا،

یوسف بن تاشفین کے خلوص کا تقاضا یہ تھا کہ اُس کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اگر اس کی صحیح قسم کی حوصلہ افزائی کی جاتی تو بہت ممکن تھا کہ اندلس پر پھر مسلمانوں کی ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم ہو جاتی، لیکن اب اس کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں بلکہ اسے گرفتار کر لینے کی سازشیں ہونے لگیں، لیکن وہ ایک زیرک آدمی تھا، اُس نے اپنی قربانی کا کوئی صلہ نہیں لیا اور خاموشی کے ساتھ اندلس کو، اس کی قسمت کے سپرد کر کے افریقہ واپس چلا گیا۔ اور اس کے جاتے ہی عیسائیوں کے حوصلے پھر بڑھ گئے اور انھوں نے ترکتازیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا!

ہا

ہ میں الجزائر

دیا، ۵۳۷ھ میں

سنبھالا اور موت

مرابطین — موحدین — بنو ہود

یوسف بن تاشفین کے جاتے ہی عیسائی پھر چونکے، اور جنگ و پیکار کی تیاریاں کرنے لگے اوونش اپنی سابقہ شکست سے اتنا برہم تھا کہ اس نے اعلان جنگ کئے بغیر عبدالعزیز رئیس مرسیہ پر حملہ کر دیا اور قلعہ الیط (الیڈو) پر قبضہ کر لیا۔ اب اذفونش کے حوصلے بڑھ گئے، ۴۸۰ھ میں وہ اشبیلیہ کی تسخیر کے لئے بڑھا، المعتمد جو افریقہ پہنچا، اور یوسف بن تاشفین سے استدعا کی کہ وہ اس کی مدد کے لئے چلے، وہ اندلس آیا اور عبدالعزیز کی رفاقت میں قلعہ الیط کو گھیر لیا، لیکن عبدالعزیز اور المعتمد آپس میں لڑ پڑے، وہ بددل ہو کر پھر افریقہ چلا آیا۔

پھر یوسف بن تاشفین

۴۸۴ھ میں یوسف بن تاشفین بارادہ تسخیر پھر اندلس وارد ہوا، طلیطلہ کے دروازے تک پہنچ گیا، شاید وہ اسے فتح بھی کر لیتا، لیکن عربوں نے غداری کی، کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی، عرب اس سے اس لئے بھڑکتے تھے کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا، تو اندلس کی انفرادی حیثیت ختم ہو جائے گی، اور وہ افریقہ کا ایک صوبہ ہو کر رہ جائے گا، یوسف خود تو پھر افریقہ واپس چلا گیا، اور اپنے مشہور سپہ سالار سیر ابن ابی بکر کو کار جہاد پر مامور کر گیا۔ سیر نے بڑی دلاوری کے ساتھ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا مگر عربوں نے نہ صرف اس کا ساتھ نہیں دیا بلکہ دراندازیاں کرتے رہے، چنانچہ اس نے یوسف کے حسب ایماء عربوں کو تنبیہ و تادیب کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلے وہ ابن ہود والی سرقسطہ کی مرکز توجہ ہوا، یہ عیسائیوں سے ملا ہوا تھا، سیر نے حکمت عملی اور بہادری سے کام لے کر اس قلعہ کو حسبتہً للہ بے سر کر لیا، پھر اس نے ابن طاہر کو شکست دی اور مرسیہ پر قابض ہو گیا، بعد ازاں بسہ انجیل ہاتھ میں بطلیموس اور المریہ فتح کر لیا، پھر اس نے اشبیلیہ پر اپنا جھنڈا گاڑا، آخر

1,2,3,4,5,6,7,8,9

میں المعتمد کو آمادہ بہ جنگ پاکر، اس سے لڑا، اس کے بیٹوں کو ایک ایک کر کے قتل کیا، قرطبہ پر قبضہ کیا۔ اور المعتمد کو گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا، المعتمد بھی اب عیسائیوں کا آلۂ کار بن چکا تھا المعتمد کے ساتھ اس کا لڑکا ابوالحسن عبداللہ اور اس کی بیوی اعتماد کو بھی افریقہ بھیج دیا گیا۔ یوسف نے المعتمد پر جیل میں بڑی سختیاں کیں جن کی تاب نہ لاکر وہ فوت ہوگیا۔

یوسف بن تاشفین کا انتقال

سنہ ۵۰۰ھ میں یوسف بن تاشفین کا انتقال ہوگیا، جانشینی اس کے بیٹے ابوالحسن علی کے حصہ میں آئی، یہ بھی بڑا بیدار مغز اور اولوالعزم انسان تھا، اندلس میں اپنے باپ کی طرح اس نے بھی مرابطین (یوسف بن تاشفین کے قبیلہ کا نام) کی فوجی پیش قدمی کامیابی ساتھ جاری رکھی۔

ساتھ ہی ساتھ عیسائیوں کی معاندانہ اور باغیانہ سرگرمیاں بھی جاری تھیں، چنانچہ اودونش اول ابن ادمیر والئی برشلونا نے ۵۰۳ھ میں المستعین ابن ہود کو شکست دے کر تمام ملک ارغون کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، لیکن علی کے گورنر تمیم نے اس کی پیش قدمی روک دی تمیم کے حملہ نے عیسائیوں کو اتنا ہراساں کردیا کہ پھر ۵۱۲ھ تک وہ سر اٹھانے کی ہمت نہ کرسکے اسی سال اودونش نے فرانس کے عیسائیوں کی مدد سے متعدد قلعے مسلمانوں سے چھین لئے۔ اور وقر کے قریب ابراہیم ابن یوسف ابن تاشفین کو زبردست شکست دی، اس جنگ میں بیس ہزار عرب کام آئے۔ علی یہ سنتے ہی ۵۱۳ھ میں اشبیلیہ اور قرطبہ ہوتا ہوا۔ سرقسطہ پہنچا اس کی دہشت سے عیسائی پھر دبک گئے، اس نے وہ تمام مقامات جو عیسائیوں نے مسلمانوں سے چھین لئے تھے۔ پھر بزور شمشیر واپس لے لئے، پھر اپنے بھائی تمیم سے ملتا ہوا افریقہ چلا آیا۔

تمت بالخیر

یوسف بن تاشفین کے مرنے کے بعد بھی اس کا نام اس کے بیٹوں نے جاری رکھا لیکن ـــــ موت سے کس کو رستگاری ہے؟

یہ دونوں بھائی بھی اپنا جاہ و جلال دکھا کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ۵۲۰ھ میں ابوالطاہر تمیم کا انتقال ہوگیا، علی نے اس کی جگہ اپنے بیٹے تاشفین کو، اندلس کا گورنر بنا دیا، ۵۳۷ھ میں

علی کا بھی انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کے بعد تاشفین افریقہ اور اندلس کا واحد فرمانروا بن گیا۔ تاشفین کا سارا عہد موحدین کی سرکوبی اور مقابلہ میں صرف ہوا، یہ ایک نئی طاقت افریقہ میں ابھر رہی تھی۔ شروع شروع میں تاشفین کو خاصی کامیابی باغیوں کے مقابلہ میں ہوئی، لیکن ۵۳۹ھ میں تلمسان کے قریب بری طرح ہارا، گھوڑے پر بیٹھ کر بھاگا، لیکن خندق میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق ابراہیم مالک تخت و تاج ہوا، لیکن خاندان موحدین کے گل سرسبد عبدالمومن نے ۵۴۱ھ میں فاس فتح کر لیا، پھر مراکش آیا، اسے فتح کیا، ابو اسحٰق ابراہیم گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

خاندان موحدین

یوسف بن تاشفین نے خاندان مرابطین کی حکومت سارے افریقہ اور اندلس پر قائم کر لی تھی، لیکن یہ حکومت ابراہیم پر ختم ہو گئی، اور ایک نیا خاندان —— موحدین —— برسر اقتدار آ گیا۔ مرابطین کے انحطاط و زوال نے پھر اندلس میں چھوٹی چھوٹی اور کمزور مسلمان ریاستیں قائم کرا دیں، جہاں جس کو موقع ملا اس نے خود مختاری کا جھنڈا لہرانا شروع کر دیا۔ لیکن موحدین نے جلد ہی اس ملک پر بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔

عیسائیوں کی فتحمندیاں

عیسائیوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع ملا، انہوں نے وہی پرانی چالیں چلیں جو ہمیشہ سے چلتے آئے تھے، یعنی مسلمانوں کو آپس میں لڑانا شروع کر دیا، پھر انہیں کمزور کر کے ان کے علاقوں پر اقتدار و تسلط حاصل کرنے لگے۔ چنانچہ المریہ پر جو بہت بڑا تجارتی مرکز تھا، انہوں نے قبضہ کر لیا، یہ واقعہ ۵۴۲ھ کا ہے۔ دوسرے آزاد اندلسی شہروں کے خود مختار فرمانروا یہ تماشہ دیکھتے رہے،

م عبدالمومن نے خود بھی اندلس کا قصد کیا اور وہاں [illegible] متعدد مقامات کے [illegible] ۵۵۵ھ میں

ابو سعید کو اپنا قائم مقام مقرر کیا، اور افریقہ چلا آیا۔

۵۵۸ھ میں عبدالمومن کا انتقال ہو گیا۔ ابو یعقوب یوسف تخت نشین ہوا، یہ ۵۶۶ھ میں افریقہ سے اندلس آیا، اشبیلیہ کو پایۂ تخت قرار دے کر یہیں رہ گیا، یہاں اس نے تھوڑا بہت فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن عیسائیوں کے سیلاب کو روکنے میں پوری سعی و کوشش کے باوجود زیادہ کامیاب نہ ہو سکا، ۵۸۰ھ میں اس نے وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا، ابو یوسف المنصور تخت نشین ہوا

ابو یوسف المنصور

ابو یوسف المنصور نے اندلس کے مغربی حصہ کو عیسائیوں کی ترکتازیوں سے محفوظ کیا، پھر اشبیلیہ ہوتا ہوا مراکش چلا گیا۔ لیکن دوسرے سال اسے پھر واپس آنا پڑا، کیونکہ عیسائیوں نے دب کر صلح کر لی لیکن ۵۹۱ھ میں بے سان و گمان زبردست حملہ مسلمانوں پر کر دیا۔ المنصور بالکل تیار تھا، زبردست جنگ ہوئی، عیسائیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اور مسلمان بھی سر سے کفن پہن کر میدان میں اترے تھے، دونوں اپنی جگہ سمجھ رہے تھے کہ یہ جنگ بڑی فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے، دونوں نے کوئی کسر اٹھا رکھی، عیسائیوں کو اپنی کثرت تعداد پر غرور تھا، لیکن جب وہ شکست کھا کر بھاگے تو اس طرح کہ ایک لاکھ چھیالیس ہزار عیسائی ہلاک ہوئے اور تیس ہزار قید ہوئے، ایک لاکھ پچاس ہزار خیمے، اسی ہزار گھوڑے، ایک لاکھ خچر، چار لاکھ بار بردار کے گدھے، اور ساٹھ ہزار مختلف اقسام کے زرہ بکتر اور بہت سا فر زر و جواہر مسلمانوں کے ہاتھ آئے المنصور نے بڑی فراخدلی کے ساتھ یہ سارا مال و زر اپنی فوج میں تقسیم کر دیا۔

۵۹۵ھ میں المنصور کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ جہاد میں بسر ہوتا تھا۔

المنصور کے بعد اس کا بیٹا، ابو عبداللہ الناصر تخت نشین ہوا، لیکن یہ خود سر اور کوتاہ اندیش تھا، اسی کی بے تدبیری اور گھمنڈ کے باعث جنگ العقاب میں مسلمانوں کو زبردست اور حوصلہ فرسا شکست سے دوچار ہونا پڑا، اس جنگ میں چھ لاکھ مسلمانوں کا پورا لشکر ضائع ہو گیا، مشکل سے چند ہزار نفوس اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے، اس جنگ کے اس ہوشربا اور لرزہ خیز انجام کا نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ کے قصبے کے قصبے ویران ہو گئے۔ ایک عرصہ دراز تک فوج فراہم نہ ہو سکی، اندلس کے حفظ و دفاع میں بڑی دشواریاں پیش آنے لگیں، اور عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے، ان میں ایک نئی امنگ اور ترنگ پیدا ہو گئی، ان کے مقاصد کی تکمیل کا موقع پیدا ہو گیا۔ اس شکست نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی، اور سچی بات یہ ہے کہ پھر اندلس نہ سنبھل سکا!

۶۱۰ھ میں ابو عبداللہ الناصر کا انتقال ہو گیا۔ یہ لاولد فوت ہوا تھا، لہٰذا اس کا بوڑھا چچا عبدالواحد تخت پر بیٹھا یہ بڑا کمزور اور بے حوصلہ انسان تھا، اس کے عہد میں سمجھنا چاہیئے، خاندان

موحدین کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ اندلس کے شہر پھر "آزاد" ہونے لگے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سی عیسائی حکومتیں باج گذار اور زلہ ربا مسلم حکومتیں قائم ہو گئیں۔ عبدالواحد کا ۶۲۱ھ میں بمقام مراکش انتقال کر گیا، خانہ جنگی اور باہمی حرب و پیکار کی بھی کیفیت مسلسل قائم رہی، عیسائی اس سے خوب فائدہ اٹھاتے رہے، نئے نئے مقامات پر قبضہ کرتے رہے،

مسلمانوں کا رعب ختم ہوتا جا رہا تھا اور عیسائیوں کی کامرانیوں سے ان میں حصولِ سلطنت کا نہ مٹنے والا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس تمام عرصے میں افریقہ اور اندلس میں کوئی مضبوط حکومت نہ قائم ہو سکی، عیسائی ایک کھلونے کی طرح ان چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کو اپنے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بناتے رہے۔

اس تمام مدت میں مسلمانوں کو ایک دن بھی امن و سکون کا میسر نہ آیا۔

۶۶۸ھ تک متعدد افراد اور متعدد خاندان برسرِ اقتدار آئے، لیکن ان کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ آپس میں لڑتے رہے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے، اور عیسائیوں کی قوت و طاقت بنتے رہے۔

بنو نصر کا عروج

پھر، ہم دیکھتے ہیں کہ خاندان بنو نصر نے عروج حاصل کیا، لیکن یہ بھی شعلۂ مستعجل ثابت ہوا، بنو نصر کے عروج کے بعد، محمد بن الاحمر، محمد ثانی، محمد ثالث، ابوسعید، ابوالولید، اسمٰعیل بن ابوسعید، محمد چہارم یوسف، محمد پنجم، محمد ششم اور آخر میں پھر محمد پنجم باری باری برسرِ حکومت آئے، انہوں نے عیسائیوں سے لڑائیاں بھی کیں، شکست بھی دی، اور کھائی بھی، جیتے کم، ہارے زیادہ دشمن سے لڑنے میں اتنے مستعد نہیں ثابت ہوئے جتنے اپنوں سے جنگ کرنے اور ان کا خون بہانے میں!

یہ دور ۷۹۳ھ تک قائم رہا۔

اس تمام عرصہ میں مسلمانوں نے کھویا بہت زیادہ، اور پایا بہت کم! ان کی قوت پارہ پارہ ہوتی چلی گئی، اور دشمن نئی زندگی حاصل کرتا رہا، آگے بڑھتا رہا۔

خانہ جنگی، بداعتمادی، انحطاط

محمد پنجم کے انتقال کے بعد ہمیں پھر نئے حکمرانوں کی ایک فہرست نظر آتی ہے وہ یہ ہے۔ یوسف ثانی محمد ہفتم، یوسف ثالث، محمد ہشتم، محمد الصغیر، وغیرہ،

مذکورہ لوگوں کا دور، ۸۷۰ھ تک قائم رہا، اس مدت میں جو بہت طویل ہے، ان چھوٹے چھوٹے آزاد اور خود مختار عرب فرمانرواؤں کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف بغاوتیں اور سازشیں کرتے رہے، ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے، انہوں نے عیسائیوں کی مدد کی مدد کر کے انہیں مسلم مقبوضات پر قابض کر دیا، ان کی طاقت و قوت کا لوہا مانا، ان کے خراج گذار بن جانے کی ہتک کو فخر اور مسرت کے ساتھ قبول کیا۔

اندلس کے بڑے حصہ پر عیسائی قبضہ

اب صورت حال یہ تھی کہ اندلس کے بہت بڑے حصہ پر یا تو عیسائی قابض ہو چکے تھے یا براہ راست قابض نہیں ہوئے تھے لیکن بالواسطہ وہی حکومت کر رہے تھے،

مسلمانوں کو قدرت نے بہت سے مواقع دیئے، لیکن ان مواقع سے انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا، ـــــ قدرت بھی آخر کب تک ان کا ساتھ دیتی؟

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

الوداع

اندلس سے مسلمانوں کی جلاوطنی

۸۷۰ھ میں ابوالحسن، تخت فرمانروائی پر متمکن ہوا۔

حالات کا سانچہ اب سے بہت مدت پہلے بدلنے لگا تھا، اور اب اس کی تبدیلی مکمل ہو چکی تھی۔!

قسطلہ کی حکومت فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا کے ہاتھ میں تھی، اُس نے آخری فرمانروائے غرناطہ (اندلس کی حکومت سمٹ کر یہیں تک رہ گئی تھی)، ابوالحسن کو لکھا ـــــــ "اگر صلح چاہتے ہو تو خراج دینا منظور کرو!"

ابوالحسن نے جواب دیا، غرناطہ کے دارالقرب (ٹکسال) میں سونے کے سکوں کے بجائے فولادی شمشیریں اور سنانیں عیسائیوں کے جگر چاک کرنے کی غرض سے تیار ہوتی ہیں۔"

ابوالحسن کا عیسائیوں پر حملہ

۸۸۶ھ میں ابوالحسن نے سرحد اندلوسیہ کے قلعہ صخرۃ پر حملہ کیا، فرڈی نینڈ کافی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔

بیٹے کی بغاوت

۸۸۷ھ میں عیسائیوں نے قلعہ الحمہ پر قبضہ کر لیا، اور جوش تعصب میں ہزاروں مسلمان عورتوں بچوں کو قتل کر ڈالا۔

ابوالحسن نے بڑی پامردی سے عیسائیوں کا مقابلہ کیا، لیکن خود اس کے بیٹے ابوعبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ غرناطہ کی چھوٹی سی حکومت دو حصوں میں بٹ گئی، ایک پر ابوعبداللہ حکمران تھا، دوسری پر ابوالحسن

الزغل کی تخت نشینی

۸۸۸ھ میں عیسائیوں سے جنگ کرتا ہوا، ابوعبداللہ گرفتار ہو گیا اس کی ساری فوج فرڈی نینڈ نے کاٹ ڈالی، غرناطہ کے مسلمان نادم ہو کر ابوالحسن کے پاس پہنچے، وہ نابینا اور مفلوج ہو چکا تھا اس نے اپنے بھائی الزغل کو حکومت سونپ دی تھی۔

سنہ ۸۹۰ھ میں عیسائیوں نے پھر یورش کی، اور متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا، اب غرناطہ کے سوا سارا اندلس ان کی تحویل میں تھا، اور غرناطہ بھی، بس یوں سمجھئے کہ عالم نزع میں دم توڑ رہا تھا، الزغل نے حالات کو روبراہ کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ ان کا سنبھالنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا، اسی اثناء میں فرڈی نینڈ نے ابوعبداللہ کو قید سے رہا کر کے مالقہ کی حکومت حوالہ کی، ابوعبداللہ نے رہا ہوتے ہی فرڈی نینڈ کے اشارہ سے جنگ درگری شروع کر دی، اپنے چچا الزغل کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑا ہو گیا، فرڈی نینڈ اس کی "مدد" کو اٹھ کھڑا ہوا وہ قلعہ پر قلعہ ابوعبداللہ کے لئے فتح کرتا رہا، الزغل کو شکست دیتا رہا، ابوعبداللہ مطمئن رہا کہ یہ سب فتح کر کے فرڈی نینڈ اس کے حوالہ کر دے گا۔

جنگ بسطہ ابوعبداللہ سے فرڈی نینڈ کا معاہدہ یہ تھا کہ جہاں کے لوگ اس کی بادشاہت تسلیم کر لیں گے، انہیں وہ نہیں چھیڑے گا، لیکن فرڈی نینڈ نے ایسے مقامات پر بھی چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔

آخر بسطہ کے مقام پر ایک زبردست جنگ ابوعبداللہ اور فرڈی نینڈ کے مابین ہوئی، اس کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ بسطہ پر فرڈی نینڈ نے یہ وعدہ کر کے قبضہ کر لیا کہ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔

فرڈی نینڈ کی بدعہدی ۱۰ محرم سنہ ۸۹۵ھ کو فرڈی نینڈ بسطہ میں داخل ہوا، اور اپنا معاہدہ اس طرح پورا کیا کہ مسلمانوں کی ساری جائداد و املاک عیسائیوں میں تقسیم کر دی، اور ان کے قتل عام کا حکم صادر کر دیا الزغل نے ابوعبداللہ کو زک دینے کے لئے فرڈی نینڈ کی رفاقت اختیار کر لی، فرڈی نینڈ نے وعدہ کر لیا کہ صوبہ المریہ اُسے عطا کر دیا جائے۔

اب الزغل اور ابوعبداللہ میں جنگ و پیکار کا سلسلہ شروع ہو گیا، فرڈی نینڈ کبھی ایک کی حوصلہ افزائی کرتا کبھی دوسرے کی، اس طرح جب یہ دونوں کمزور ہو گئے، تو اس نے تمام مواعید کو بالائے طاق رکھ کر

الزغل کو حکم دیا کہ وہ مراکش چلا جائے اور ابو عبداللہ کو ایک شدید محاصرے کے بعد ۸۹۷ھ میں
اس نے صلح پر مجبور کر دیا، حالانکہ غرناطہ کے مسلمان ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے، لیکن
ابو عبداللہ کے حوصلے پست ہو چکے تھے، وہ لڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

شرائط صلح جن شرائط پر ابو عبداللہ نے فرڈی نینڈ سے صلح کی وہ یہ تھے:۔

(۱) مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی، وہ جہاں چاہیں رہ سکیں گے۔

۲ - مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے گی۔

۳ - کوئی عیسائی مسجد میں نہ گھسنے پائے گا۔

۴ - مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔

۵ - مسلمان قاضی مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کیا کریں گے۔

۶ - مسلمان قیدی فوراً رہا کر دیئے جائیں گے۔

۷ - اگر کوئی مسلمان اندلس سے ترک اقامت کر کے افریقہ جانا چاہیے تو حکومت سرکاری خرچ پر اسے افریقہ بھیجے گی۔

۸ - جو عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں انہیں اسلام ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

۹ - اس جنگ میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے وہ بدستور ان کے قبضہ میں رہے گا۔

۱۰ - مسلمانوں کے گھروں پر عیسائی سپاہ متعین نہ کی جائے گی۔

۱۱ - موجودہ ٹیکس کے علاوہ کوئی جدید ٹیکس مسلمانوں پر عائد نہ کیا جائے گا۔

۱۲ - تین سال تک مسلمانوں سے کسی قسم کا ٹیکس نہ لیا جائے گا۔

۱۳ - ابو عبداللہ کے سپرد البشارات (ایلپوکسس) کی حکومت کر دی جائے گی۔

۱۴ - آج سے ساٹھ دن کے اندر اس معاہدے کے تمام شرائط پورے کر دیئے جائیں گے۔

۱۵ - روما کا پوپ اس معاہدہ کا گواہ اور ذمہ دار ہو گا۔

۱۶ - ساٹھ روز کے اندر غرناطہ وغیرہ کا سامان جنگ عیسائیوں کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

مسلمانوں سے فریب

چونکہ غرناطہ کی رائے عامہ اس معاہدہ کی اور صلح کی سخت مخالف تھی لہٰذا ابوعبداللہ نے چپ چپاتے، تاریخ معاہدہ سے قبل غرناطہ فرڈی نینڈ کے سپرد کر دیا۔

ابوعبداللہ خاموشی سے قصر الحمراء سے نکلا، اور غرناطہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا، بہ الحمراء وہ قلعہ تھا، جو نہ صرف غرناطہ کا، بلکہ دنیا کا ایک تعمیری عجوبہ تھا، فرڈی نینڈ اپنی ملکہ ازابیلا کے ساتھ اسی محل میں مقیم ہوا۔

ابوعبداللہ کو فرڈی نینڈ نے البشارات جیسی چھوٹی جگہ بھی نہ ٹھہرنے دیا، آخر وہ افریقہ آ گیا، اور یہیں سنہ ۹۴۰ھ میں قتل ہوا

مسلمانوں کا دور ابتلا

عیسائی فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہوئے، فرڈی نینڈ نے معاہدہ پر عمل اس طرح کیا کہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائی ہو جائیں مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ وہ پردہ ترک کر دیں مسجدوں پر تالے لگا دیئے گئے، اور نماز کی ممانعت کر دی گئی، اگر کوئی مسلمان ان ہدایات و احکام کی خلاف ورزی کرتا تھا، اسے قتل کر دیا جاتا تھا، بہت سے مسلمان عیسائی ہو گئے ——— کچھ سچ مچ، کچھ ظاہری طور پر ——— اکثر نے اس ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی، وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے، انہیں بری طرح قتل کیا گیا، ان کی عورتوں کی بے آبروئی کی گئی، سنہ ۱۰۰۰ھ میں مسلمانوں کو جبراً اندلس سے خارج کر دیا گیا، ہزاروں راستے کے مصائب کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، جو بچے وہ مرتے کھپتے، اور گرتے پڑتے فاس، تلمسان اور تونس وغیرہ جس طرف منہ اٹھا، اور جہاں جگہ ملی چلے گئے ——— وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مسلمان پھر اندلس کی سرزمین پر قدم نہ رکھ سکے!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

ایک نظر

مسلمانوں کے عہدِ حکومت پر

عربوں نے اندلس پر تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی!

جب انہوں نے اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا، تو یہ جہنم سے بدتر پایا، اور جب وہ وہاں سے رخصت ہوئے، تو یہ خطۂ ارض جنت الفردوس سے چشمک زنی کرتا تھا!

عرب جب اندلس میں پہنچے تو وہاں انسانیت دم توڑ رہی تھی، شرافت کا جنازہ نکل رہا تھا، اخلاق دیوالیہ ہو چکا تھا، اقدار انسانی کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی، مذہبی اختلافات نے لرزہ خیز مظالم کا لباس پہن لیا تھا، اقتصادی نظام نہایت ابتر تھا، غلاموں کے ساتھ اور کسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا جس کا آج تصور نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن جب مسلمان وہاں پہنچے، تو وہاں کی ہر چیز بدل گئی، وہاں کے مظلوموں نے اطمینان کا سانس لیا، وہاں کے یہودیوں نے عافیت کی زندگی بسر کی، وہاں کے عیسائیوں نے مساواتِ اسلامی کا نظارہ کیا، وہاں کے غلاموں نے برابری کے حقوق پائے، وہاں کے کسانوں اور کاشتکاروں نے عزت کی زندگی بسر کرنے کا حق حاصل کیا، وہاں کی بنجر سرزمین پر وہ پھل اُگائے گئے، وہ ترکاریاں پیدا کی گئیں، وہ غلہ بویا گیا جس کا نام بھی وہاں کے رہنے والوں نے کبھی نہیں سنا تھا، وہاں کے لوگ نیم وحشی تھے، لیکن عربوں نے انہیں تہذیب سکھائی، انہیں انسانیت کا درس دیا، انہیں عزت اور احترام کے معنی بتائے،

عیسائی اپنے دورِ حکومت میں یہودیوں کے ساتھ ننگِ انسانیت سلوک روا رکھتے تھے، مسلمانوں نے یہودیوں کو وہ تمام حقوق دیئے، جو ایک مہذب حکومت میں کسی شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں، مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں عیسائیوں کے مذہبی معاملات میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی، ان کے نجی معاملات میں بھی دخیل نہیں ہوئے، ان کی جان و مال پر بھی ڈاکہ نہیں ڈالا، ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا، ان کی بغاوتوں

کو معاف کیا، ان کی شرارتوں اور سازشوں سے درگزر کیا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بہتر اور شریفانہ برتاؤ کیا، اور جب وہ اس دیس سے رخصت ہوئے تو ان کے ساتھ اس سے بدتر سلوک کیا گیا جو مسلمانوں کے آنے سے پہلے عیسائی یہودیوں پر کیا کرتے تھے۔

مسلمان جب اندلس میں پہنچے تو وہ ایک ویرانہ تھا،

گلشن میں کہیں بوئے و مساز نہیں آتی

اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی

لیکن مسلمانوں نے اندلس کو لہلہاتے ہوئے کھیت، لالہ زار پارک میووں سے بھرپور باغ مرحمت کئے اندلس میں مسلمانوں کے داخلہ کے وقت ایک بھی قابل فخر اور قابل دید عمارت نہیں تھی لیکن مسلمانوں نے اندلس کی سرزمین پر ایسی یادگار زمانہ عمارتیں تعمیر کیں جن کی مثال دنیا اب تک نہیں پیش کر سکی۔ مسجد قرطبہ قصر الزہرا، قلعہ زاہرہ، الحمرا، اور دوسری بہت سی لاجواب عمارتیں۔ ان عمارتوں کے ساتھ جوش انتقام میں یہ سلوک کیا گیا کہ انہیں منہدم کر دیا گیا۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ لیکن ان کے آثار و نقوش آج بھی موجود ہیں اور زبان حال سے اپنے معماروں اور بانیوں کی فنی اور انسانی عظمت کا اعتراف کر رہے ہیں

اپنے دور حکومت میں مسلمانوں نے کسی عیسائی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا، لیکن حکومت کا چارج لیتے ہی عیسائیوں نے مسلمانوں کو جبر و جد کے ذریعہ عیسائی بنانا شروع کر دیا ——— آج وہاں سے اگرچہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے لیکن مسلمانوں کے آثار و نقوش، وہاں کے لوگوں میں اب بھی موجود ہیں اقبال نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشین

یورپ کے دوسرے خطوں کی طرح اندلس کی سرزمین بھی [illegible] امام، امور ریاست کا ماہر، متکلم اور وزیر

لیکن مسلمان جب وہاں پہنچے، تو ان کے ہاتھ میں صرف تاریخ، حدیث کا امام، فقہ کا استاد، اس کی کتاب

نے وہاں علم کی ترویج کی، وہاں کے لوگوں کو علم سکھ الاستیعاب آج بھی مدارس اسلامیہ اور حلقہ علماء میں

کیا ۔ انہوں نے وہاں ایسے ایسے کتب خانے قائم کئے، جن کی مثالی ترقی کے اس عہد جدید میں بھی ملنا بھی مشکل ہے، صرف الحکم کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں، جنہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں چھ مہینے کی مدت صرف ہوئی تھی!

فلسفہ، منطق، جغرافیہ، طب، ہیئت، نجوم، ہندسہ، زراعت، فلاحت، تعمیر اور دوسرے سینکڑوں فنون میں مسلمانوں نے جان ڈالی، انہیں اپنایا، ان میں اضافے کئے، جنہیں یورپ پہلے بھی مانتا تھا آج بھی مانتا ہے، اور قیامت تک مانتا رہے گا ——— غرض ———

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

جس کا ا
انہیں تہذیب سکھا
عیسائی اپنے دور حکومت
یہودیوں کو وہ تمام حقوق دیئے، جو ایک
اپنے دور حکومت میں عیسائیوں کے مذہبی معاملات پر
بھی دخیل نہیں ہوئے، ان کی جان و مال پر بھی ڈاکہ نہیں

اندلس کے علما اور فن کار

ایک مختصر لیکن مستند فہرست

اندلس پر آٹھ سو سال تک مسلمانوں نے رعب داب جاہ وجلال، اور وقار و تمکنت کے ساتھ حکومت کی، ان کی حکومت کے آثار و نقوش آج تک موجود ہیں اور اتنے جاذب توجہ ہیں کہ آج بھی دور دراز مقامات کے سیاح وہاں پہنچتے ہیں اور ان کے نظارہ سے اپنے ذوق مشاہدہ کو تسکین پہنچاتے ہیں!

مسلمانوں نے، صرف یہی نہیں کیا کہ وہاں حکومت کی ہو، وہاں نظم و انتظام قائم رکھا ہو، وہاں کے لوگوں کو تہذیب سکھائی ہو، وہاں کے لوگوں میں مدنیت اور شائستگی پیدا کی ہو، بلکہ انہوں نے یہ کیا کہ یورپ کی اس سرزمین پر جہاں علم کا نام لینا گناہ تھا، علم کی روشنی پھیلائی، اور ان کے قائم کئے ہوئے مدرسوں اور دانش کدوں سے ایسے ایسے ارباب علم وفن پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف یورپ کو، نہ صرف مشرق کو، بلکہ ساری دنیا کو، اپنے یگانہ علم وفن سے وہ فوائد پہنچائے، جن کا اعتراف آج بھی دنیا کر رہی ہے۔

ذیل میں ان مشہور اندلسی علما و فضلا کا مختصر سا تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔ جن کے نام سے علم کدے آج بھی گونج رہے ہیں!

۱- ابن عبد ربہ	۲۴۶-۳۲۸ھ	احادیث اور تاریخ کے فن میں بے مثل اور یگانہ،
۲- یحییٰ ابن یحییٰ ابن کثیر	۲۳۴ھ	فقہ و حدیث کا ماہر خصوصی
۳- ابن دراج	۳۴۷-۴۲۱ھ	زبردست شاعر
۴- ابن الفرضی	۳۵۱-۴۰۳ھ	فقیہ، محدث اور مصنف
۵- ابن زیدون	۳۹۴-۴۶۳ھ	نثر و نظم کا امام، امور ریاست کا ماہر، منتظم اور وزیر
۶- ابو عمر یوسف ابن عبد البر	۳۶۸-۴۶۳ھ	فن حدیث کا امام، فقہ کا استاد، اس کی کتاب "الاستیعاب" آج بھی مدارس اسلامیہ اور حلقۂ علماء میں

میں چوٹی کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

۷- ابن حیان — سنہ ۳۷۷-۴۶۹ھ — امام فن تاریخ، بہت بڑا مصنف،

۸- ابن حزم الظاہری — سنہ ۳۸۴-۴۵۶ھ — حافظ، محدث، فقیہ، واجب التعظیم، مجتہد، علم فلسفہ کا ماہر، اس کی کتاب "الملل والنحل" کتب حوالہ میں شمار کی جاتی ہے۔

۹- ابن جلجل — سنہ ۴۰۰ھ — فن طب کا امام، تشخیص امراض، اور خواص ادویہ میں یکتا۔ فن طب پر متعدد نادر روزگار کتابوں کا مصنف۔

۱۰- ابو الولید الباجی — سنہ ۴۰۳-۴۷۴ھ — ماہر فقہ وحدیث

۱۱- ابن البطلیوس — سنہ ۴۴۴-۵۲۰ھ — صرف، نحو، فقہ کا عالم اور مدرس،

۱۲- ابن اسحٰق ابن خفاجہ — سنہ ۴۵۰-۵۳۳ھ — نامور شاعر

۱۳- امیہ ابن ابی الصلت — سنہ ۴۶۰-۵۲۹ھ — ادیب حکیم، علوم وفنون قدیمہ وجدیدہ کا ماہر، شاعر بے بدل۔

۱۴- ابن العریف — سنہ ۴۸۰-۵۳۶ھ — فن حدیث وتصوف کا ماہر،

۱۵- ابن بشکوال — سنہ ۴۹۴-۵۷۸ھ — مورخ، محدث، ادیب،

۱۶- عبدالملک ابن ازہر — سنہ ۵۰۰ھ — قرآن، حدیث، فقہ، منطق کے علوم وفنون میں یکتا، فن طب کا امام، متعدد نادر کتابوں کا مصنف۔

۱۷- ابن باجہ — سنہ ۵۳۰ھ — علوم فلسفہ میں یگانہ عصر گذرا ہے، علوم قرآنی کا ماہر، فن طب کو اس کی ذات پر فخر تھا، فن موسیقی میں ایسی دستگاہ حاصل تھی کہ لوگ استاد ماننے لگے تھے، [illegible] میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، علوم طبیعات، اور علوم النفس کے دقیق ترین مباحث پر زبردست دسترس کا مالک، اس کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے افلاطون اور ارسطو کو دوبارہ زندہ کیا۔ علم ہیئت و نجوم، اور ہندسہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، اس کی تصنیف کردہ کتابیں آج بھی مذکورہ علوم و فنون پر بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ایک سو سے زیادہ عالمانہ کتابوں کا مصنف۔

۱۸- ابوبکر ابن زہر	سنہ ۵۰۷ھ تا ۵۹۶ھ	ادب، حدیث اور قرآنی علوم میں یکتا۔ بہت بڑا انشاپرداز بہت بڑا خطیب، بہت بڑا واعظ،
۱۹- ابن رشد	سنہ ۵۱۴ھ تا ۵۹۵ھ	یہ شخص غیر معمولی ذہن سا کا مالک تھا، خداداد ذہنی قوت اور حافظہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، فقہ اور حدیث کا یکتائے روزگار عالم تھا، فقہ میں اس کی کتاب "بدایۃ المجتہد" آج بھی دنیائے اسلام میں اپنا جواب نہیں رکھتی، یونانی زبان اور یونانی فلسفہ کا اپنے وقت میں سب سے بڑا ماہر، علم دین اور علم کلام میں بھی لاجواب تھا، بہت بڑا فلسفی، بہت بڑا حکیم، بہت بڑا فقیہہ، بہت بڑا عالم علم حیوانات، اور علم خواص الاشیاء پر بھی اس کی نظر بہت وسیع تھی، بڑا بیباک اور راست گو، علم کے بارے میں ذرا سی مداہنت کا بھی روادار نہیں تھا، اپنی علمی تحقیقات بے کم و کاست بیان کر دیتا تھا خواہ اس سے کوئی خوش ہو یا ناخوش، کچھ عرصہ تک یہ قرطبہ کا قاضی بھی رہا، جرمنی اور فرانس کی دانش گاہوں میں آج بھی ابن رشد کی عظمت کے آگے سر جھکایا جاتا ہے۔ فرانسیسی اور جرمنی زبان میں اس کی متعدد کتابوں کے ترجمے

شائع ہو چکے ہیں، جو اہلِ علم کے حلقہ میں بڑی وقعت اور عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسپین (اندلس) کے عیسائیوں کی مجنونانہ غارت گری نے جہاں مسلمانوں کی قائم کی ہوئی عمارتوں کو نقصان عظیم پہنچایا وہاں اسلامی کتب خانوں کو بھی نذرِ آتش کر دیا، ان ضائع ہونے والی کتابوں میں ابن رشد کی بھی بہت سی نادر اور نایاب کتابیں تھیں، پھر بھی جو بچ رہیں، ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے علم الہیات، علم ادویہ، علم اخلاق اور علم اشیاء پر بھی اس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن کا پایۂ استناد آج بھی مسلّم ہے، علم تشریح اعضاء پر بھی اس کی نظر بہت وسیع تھی، اس نے افلاطون کی کتاب "مقدریات" کی جو شرح کی ہے، اس نے سارے یورپ کو اس کے سامنے عقیدت خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۵۱۲ء میں پوپ لیودہم نے ایک قانون نافذ کیا، جس کی رو سے ابن رشد کی کتابوں کا پڑھنا ممنوع قرار دے دیا۔

۲۰۔ ابن خلدون ۷۳۳ھ-۸۰۹ھ — ابن خلدون کا نام کون نہیں جانتا، فن تاریخ کا امام، فلسفۂ تاریخ کا بانی۔

۲۱۔ المقری ۱۰۴۰ھ — بہت بڑا مورخ، اس نے مسلمانان اندلس کی ہشت صد سالہ تاریخ نہایت مستند پیمانہ پر "نفح الطیب" کے نام سے لکھی ہے۔ فن حدیث میں بھی بڑا درک رکھتا تھا متعدد بے بہا کتابوں کا مصنف ہے، اس نے اپنی حالت خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کے اندلس سے اخراج اور جلاوطنی کے بعد وہاں کی

سیاحت کی اور سارے حالات بے کم و کاست لکھ دیئے۔

بڑا مذہبی آدمی بھی تھا، حج کئے، اور مدینہ منورہ کی زیارت

بھی کی!

اوپر جن علمائے اندلس کا ذکر کیا گیا ہے، یہ ایک طویل فہرست کا مختصر سا حصہ ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے اندلس کو کیسے کیسے فائدے پہنچائے، اور وہاں کی بنجر زمینیں میں کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے؛ لیکن اندلس نے ان احسانات کو نہ مانا، مسلمانوں کو اپنے دیس سے نکال دیا اور ان کے علوم و فنون کو بھی آگ میں جلا دیا، صرف ایک دن، اور ایک جگہ اسّی ہزار کتابیں جلائی گئیں! ——

جو قومیں ملک کی رہباری رہنے فن سے سرکتی رہتی ہیں۔ لہذا ایمان کے ساتھ عمل کو بھی ساتھ رکھتی ہیں۔ ملک انہیں کو اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ اندلس کا رس اس کا شعور؟ بیچارے

جن (قوموں) کا ضمیر مر جاتا ہے وہ باوجود زندہ ہونے کے مردہ شمار ہوتی ہیں۔

16.4.70

حصہ ششم

افریقیہ اور مغرب اقصیٰ

۱۶۷

صفحات ملے۔

جنگ جمل و عمّم

نامۂ اعمال

۔۔لی فہرست

۳۔ فتنۂ ولی عہدی

آل فیصلہ۔ حجاز کا معاملہ۔

آرنلڈ کی رائے۔ ایک اور تبصرہ

ایک مثال۔

۱۔ حادثۂ کربلا

افریقہ اور مغرب اقصیٰ

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

۱؎ یعنی موسیو دیر

۲؎ اس نے ابوالفدا کی

کی تاریخ افریقہ ۱۸۵۷ء میں باترجمہ

۳؎ تمدن عرب

آغاز کار

مسلمانوں کا قافلہ سبک سیر و زمین گیر

ولایت افریقہ و مغرب اقصیٰ پر مسلمانوں کی یورش ۲۰ھ سے یعنی حضرت عمرؓ کے زمانہ سے شروع ہوگئی تھی، حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں (۲۷ھ) جو مہم بھیجی گئی، اس میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی شریک تھے، اور انہوں نے فرماں روائے افریقہ جرجر کو اپنے دست مبارک سے قتل کیا تھا، ۵۰ھ میں والی افریقہ کا نیا دارالحکومت قیروان تعمیر کیا، جو اب تک موجود ہے۔

ولایات افریقہ و مغرب

۸۳ھ میں موسیٰ بن نصیر والی افریقہ بنائے گئے، اب تک مصر اور افریقہ کا والی ایک ہی ہوتا تھا، ۸۶ھ میں یہ دونوں ولایتیں الگ الگ کر دی گئیں، اور افریقہ و مغرب اقصیٰ کی مستقل ولایت پر، تاریخ اسلام ایک محبوب اور مشہور ہیرو موسیٰ کے عہد میں افریقہ اور مغرب اقصیٰ کی فتح گویا مکمل ہوگئی، اسلام کی خوب اشاعت ہوئی، انسانیت ناآشنا بربروں نے جوق در جوق اسلام قبول کیا، اور اسلام کی خدمت اور چاکری میں لگ گئے۔

موسیٰ بن نصیر

موسیٰ نے افریقہ میں فتوحات کا محیر العقول تانا باندھ دیا۔ یہاں کی حکومتوں کو پامال کیا، ریاستوں کو سرنگوں کیا، قبائل کو مطیع کیا بربروں اور رومیوں پر اپنا سکہ بٹھا دیا بے اندازہ مال غنیمت حاصل کیا۔

بہت مختصر سی مدت میں موسیٰ نے اور اس کے بیٹوں نے، زغوان، — سجومہ — ہوارہ — زناقہ — کنامہ وغیرہ کو فتح کر لیا۔

بربری بڑے سرکش، اور موقع پرست تھے، بڑی آسانی سے مرتد ہو جاتے، اسلام قبول کر لیتے تو فتنہ و فساد میں مصروف رہتے، اور مرتد ہو جاتے تو کشت و خون اور قتل و غارت کو اپنا شعار بنا لیتے موسیٰ نے محسوس کیا، یہ اس لئے ہے کہ بربری اسلام کی روح، اور تعلیمات سے پورے طور پر واقف

نہیں ہیں، چنانچہ انہوں نے بربروں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا، اور قرآن کھلے کا بڑا اچھا بندوبست کر دیا، اور دوسری طرف سرکشوں اور باغیوں، منکروں اور کافروں کی سرکوبی کے لئے تیار ہو گئے۔

اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربر، اسلام کی مساوات، سادگی، اور وحدانیت سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے، اور اپنے اسلام پر اتنے ہی مستحکم ہو گئے، جتنے خود عرب تھے، باقی رہے سرکش اور جنگجو لوگ ان کا حسب موقع تدارک ہوتا رہا۔

بربر اب اس حد تک اسلام کے جاں نثار بن گئے تھے کہ اندلس کی مہم میں عربوں کے دوش بدوش طارق کی سرکردگی میں انہوں نے جنگ کی۔

حالات کا انقلاب

عہد بنو اُمیّہ، اور عہد بنو عباس کے دور میں، تقریباً پچاس سال تک افریقہ "خود کفیل" نہ بن سکا، یہاں کی بغاوتوں کو فرو کرنے، نظم و انتظام رکھنے، حالات کو ہموار کرنے، سرکشوں کو دبانے میں بے اندازہ روپیہ صرف ہوتا تھا، چنانچہ بجائے اس کے کہ افریقہ سے خراج وصول کیا جاتا، اس کی مالی امداد کی جاتی تھی۔

لیکن ہارون الرشید کے عہد میں افریقہ کو، تقریباً خود مختارانہ حیثیت حاصل ہو گئی، خاندان اغالبہ کی ولایت نے مستقل اور موروثی حیثیت اختیار کر لی، افریقہ نے خزانۂ خلافت سے از خود امداد لینا بند کر دی، بلکہ اپنی طرف سے "نذرانہ" پیش کرنے کی طرح ڈالدی، جو ہر سال بارگاہِ خلافت میں بھیج دیا جاتا تھا رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خاندان اغالبہ اور دولت عباسیہ کا تعلق برائے نام رہ گیا خطبۂ جمعہ میں خلیفۂ عباسی کے ساتھ والی اغلبی کا نام بھی لیا جاتا تھا، خلیفہ رسمی طور پر وہاں کے موروثی والی کو تسلیم کر لیتا تھا افریقہ کا شمار اگرچہ اس کے ممالک محروسہ میں تھا، لیکن حقیقتاً وہ بالکل آزاد تھا، جو چاہتا تھا، کرتا تھا، جو چاہتا کر سکتا تھا۔

چونکہ اب تک کی ولایت افریقہ کا ذکر مختصراً عہد اموی و عباسی کے ذکر میں آچکا ہے۔ لہٰذا تفصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے، ہم، افریقہ کے اس نئے دور سے ابتدا کرتے ہیں، یعنی عہد اغالبہ سے، اس کے

عہد عروج کی داستان خاص طور پر قابل ذکر ہے، اور یہ داستان متعدد حیثیات سے اس قابل ہے کہ نگاہ تعمق سے اس کا مطالعہ کیا جائے، تا کہ تاریخ سے وہ سبق اور فائدہ حاصل کیا جائے۔ جو اس کا مقصد وجود ہے۔

خاندان اغالبہ

کشور کشائی کی داستان

ابراہیم بن الاغلب، خلیفہ ہارون رشید کے حکم سے ۱۸۴ھ میں والی افریقہ بنایا گیا۔ ابراہیم اچھا شاعر، ادیب، فقیہہ، اور خطیب تھا، ساتھ ہی ساتھ صائب الرائے، شریف، باوضع، صاحب عزم و ہمت وجیہہ اور شکیل بھی تھا، فنونِ جنگ، اور جنگ کے داؤ پیچ سے خوب واقف تھا، پھر نہایت فصیح و بلیغ بھی رعایا پر مہربان، عہد کا پکا، باغیرت، صورت کا اچھا، سیرت کا بہتر، حافظ قرآن اور عالم بھی تھا۔

بربر[1] نے اس کی اطاعت آسانی سے قبول کر لی، اس کے زمانہ ولایت میں افریقہ کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔

امین الرشید کے عہد تک ابراہیم اپنے منصب پر فائز رہا، اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، نئی بستیاں بسائیں، نئے شہر تعمیر کئے، عدالت کا نظام استوار کیا، امن و امان قائم کیا۔ اسلام کی روح کو زندہ رکھا، سرکشوں کی سرکوبی کی، اور امن پسندوں کو نوازا، مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ افریقہ کو جو ترقی جو عروج، اور جو فروغ ابراہیم کے عہد میں حاصل ہوا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا، اس نے بڑے دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ حکومت کی، اس نے کسی پر ظلم نہیں کیا، اور کسی ظالم کو معاف نہیں کیا، رعایا کے ساتھ اس نے ایسا سلوک مرعی رکھا کہ کسی کو جائز شکایت کا موقع نہیں دیا۔

بارہ سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد ۲۰ شوال ۱۹۶ھ میں بعمر ۵۶ سال اس نے وفات پائی۔

---

[1] عرب مؤرخ، افریقہ کے ان قبائل کو بربری کہتے ہیں جو فتح افریقہ کے وقت مصر سے لے کر بحر اوقیانوس تک تمام شمالی افریقہ کے علاقے میں آباد تھے، ان کے متعلق علماء فن اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ یہ لوگ کس نسل سے ہیں؛ مگر ان کی قدامت اس سے ظاہر ہے کہ ۳۰۰۰ قبل مسیح کے مصری کتبوں اور تصویروں میں ان کے نام اور تصویریں پائی جاتی ہیں۔

اور اس کے بعد اس کا بیٹا، عبداللہ بن ابراہیم، تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ یہ بڑا ظالم، اور بد خو تھا، ۲۰۱ھ میں اس نے وفات پائی، اور اس کی جگہ اس کا بھائی زیادۃ اللہ اول بن ابراہیم مسند حکومت پر جلوہ فرما ہوا۔

زیادۃ اللہ بھی بڑا ضدی، خود رائے اور بد خو غلط شخص تھا، شراب پیتا تھا، اور نشہ کی حالت میں امرا اور حکام فوج کے احکام قتل صادر کیا کرتا تھا، اس وجہ سے فوج میں بھی بد دلی پھیلی، اور عوام میں بھی باغیوں اور سرکشوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا چنانچہ اس کے عہد میں متعدد بغاوتیں ہوئیں، جو شخص دوستوں کو بھی معاف نہ کرتا ہو وہ دشمنوں کے ساتھ کیسا شقی ہوگا، اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں جو لوگ گرفتار ہو کر آتے تھے، ان کے سر کاٹ لیتا تھا، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا، ہولناک اور لرزہ خیز مظالم میں اپنا کوئی جواب نہ رکھتا تھا۔

حوصلہ اور استقامت

اس کی اس شقاوت اور سفاکی کی بنا پر، متعدد بڑی بڑی بغاوتیں اس کے خلاف ہوئیں بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ جائے گا، متعدد مقامات اس کے ہاتھ سے چھٹ گئے، متعدد شہروں پر دشمن نے قبضہ کر لیا، صرف ایک چھوٹے سے علاقہ تک اس کی حکومت محدود رہ گئی، تونس سے جب منصور اس کے مقابلہ پر بڑھا، تو بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ قیروان بھی چند لمحہ کا مہمان ہے، اور یہ یا بھاگ جائے گا۔ یا قتل ہو جائے گا۔

لیکن اس نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں کی، اپنی منتشر اور پراگندہ قوتوں کو مجتمع کرتا رہا، حوصلہ اور استقامت سے کام لیتا رہا، میدان سے پیچھے نہیں ہٹا، ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا، اور آخر کار، ہر مرحلہ میں کامیاب ہوا، ہر بغاوت فرو کر دی، ہر دشمن کو زیر کیا، تباہ کیا، قتل کر دیا ——— خوش قسمتی کی یہ انتہا تھی۔

بہت بڑا کارنامہ

لیکن قسمت نے ایسے شخص کے ہاتھوں ایک بہت بڑا کارنامہ بھی مقدر کیا تھا۔

۲۱۲ھ میں زیادۃ اللہ نے صقلیہ پر فوج کشی کی، سو جہاز جمع کئے، اور ایک بڑا لشکر

قاضی اسد بن فرات کی سرکردگی میں روانہ کیا، جو بیک وقت میر سپاہ بھی تھے، اور قاضی القضاۃ بھی۔

قاضی اسد بن فرات کے مقدس قدم صقلیہ میں پہنچے اور پھر تقریباً تین سو سال تک مسلمان، اس خالص یورپین جزیرہ پر شان شوکت اور جاہ وتجمل کے ساتھ حکومت کرتے رہے قاضی صاحب کا یہ کارنامہ تمامتر زیادۃ اللہ کی اولوالعزمی کا نتیجہ ہے۔

عامر بن نافع

سنہ ۲۱۳ھ میں زیادۃ اللہ کا ایک بہت بڑا دشمن اور باغی، عامر بن نافع مرگیا، زیادۃ اللہ اس کی موت سے بہت خوش ہوا، اس نے کہا، — آج جنگ نے اپنے ہتیار ڈال دیئے!

لیکن جب عامر کی اولاد امان کی طالب ہوئی، تو خلاف عادت زیادۃ اللہ نے اسے پروانۂ امن عطا کر دیا۔

سنہ ۲۱۸ھ میں فضل بن ابو عنبر نے علم بغاوت تونس سے بلند کیا، اور زیادۃ اللہ کے رسالے کو شکست دے دی، زیادۃ اللہ کے حکم سے ابو فہر محمد بن عبداللہ نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا، اور شکست دی۔

سنہ ۲۱۹ھ میں زیادۃ اللہ پھر بہتر سے موم بن گیا، اس نے تونس کے سرکشوں اور باغیوں کو جنہوں نے فضل کا ساتھ دیا تھا، معاف کر دیا۔

لطیفہ

زیادۃ اللہ کی اس امان سے متاثر ہو کر، عبدالرحمٰن (باغیوں کا ساتھی) ایک قصیدۂ مدحیہ پڑھا، حریف شاعر یعقوب نے چند شعر سنائے، ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ تلوار کا زخم مندمل ہو سکتا ہے، زبان کا نہیں ہوتا۔

زیادۃ اللہ نے اس جنگ کی طرف توجہ نہ کی، مگر سوال کیا،

— تم اب تک طالب امان کیوں نہ ہوتے؟

وہ بولا۔

میں احمقوں کی قوم میں رہتا تھا، جو ایک دن کسی کو والی مقرر کرتے تھے، اور دوسرے دن

اسے معزول کر دیتے تھے۔ میں نے سوچا شاید کسی دن اپنی حماقت سے مجھے والی بنا لیں!"

زیادۃ اللہ ہنس پڑا، اور بات آئی گئی ہو گئی۔

احمد بن ابی محرز ۲۲۱ھ افریقہ کے قاضی احمد بن ابی محرز نے انتقال کیا، یہ بڑے زاہد شخص تھے، یہ زیادۃ اللہ سے اس کی ظلم آرائیوں کے سبب اس سے خفا رہتے تھے، چنانچہ مرتے وقت بھی انہوں نے یہ چاہا کہ زیادۃ اللہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھائے، لیکن زیادۃ اللہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی، اس نے نماز پڑھانے کے بعد کہا۔

"اے اہل قیروان اگر خدا کو واقعی تمہاری بہتری اور بہبودی منظور ہوتی، تو وہ ہرگز ابن ابی محرز کو تم سے الگ نہ کرتا!" وہ کہا کرتا تھا،

"مجھے قیامت کے دن اپنے گناہوں کی ذرا بھی پروا نہیں کیونکہ میرے اعمال نامہ میں چار نیکیاں ایسی ہیں جو میرے سب گناہوں کا کفارہ بن جائینگی"

پھر اس نے اپنی واقعی قابل فخر نیکیاں گنوادیں،

۱۔ جامع قیروان کی تعمیر،

۲۔ جسر (پل) ابی الزبیع کی تعمیر،

۳۔ سوسہ میں قلعہ کی تعمیر،

۴۔ احمد بن ابی محرز کا منصب قضا پر تقرر۔

اور کوئی شبہ نہیں اس کی یہ نیکیاں بہت بڑی تھیں

۱۴ رجب ۲۲۳ھ میں زیادۃ اللہ کا انتقال ہو گیا، وفات کے وقت اس کی عمر صرف ۵۱ سال کی تھی، اس کی حکومت کا زمانہ ۲۱ سال ۷ ماہ اور ۱۸ دن ہے ——

حجاج اور زیادۃ اللہ حجاج بن یوسف جیسے شقی اور سنگدل نے مرتے وقت بے لبسی کے عالم میں خدا سے اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اے اللہ لوگ مجھے تیری رحمت سے مایوس کرتے ہیں، لیکن میں نے تیری رحمت کا دامن

نہیں چھوڑا ہے ـــــــــــــ !"

حضرت حسن بصریؒ اس کے سیاہ کارناموں کی بنا پر اس کے انجام عقبیٰ کی پیش گوئی میں اس کی نجات کے حق
میں بھی کبھی نہیں جھکے، یہ روایت جب حضرت کے پاس پہنچی، تو سائل نے پوچھا ،

"کیا وہ جنت میں جائے گا ؟"

حضرت نے فرمایا ،

"شاید !"

کیا یہی بات زیادۃ اللہ کے لئے بھی نہیں کہی جا سکتی ؟

ابو عقال

بدعتوں کا خاتمہ اور استیصال

زیادۃ اللہ کے بعد، ابو عقال بن ابراہیم تخت حکومت پر بیٹھا، یہ اچھا آدمی تھا، اس نے لوگوں کے ساتھ سلوک کیا، فوج کو درست بنایا، بہت سی بدعتیں جو جاری ہو گئیں تھیں انہیں مٹایا، فوج کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا، عمال کے مشاہرے وسیع کئے، انعامات دیئے، صلے عطا کئے، رعایا پر عمال و حکام کی دست درازی کی روک تھام کی نبیذ کے استعمال سے خرید و فروخت اور کاروبار پر پابندی عائد کر دی۔

لیکن زیادہ دنوں نہ جیا، ربیع الآخر ۲۲۶ھ میں، بعمر ۵۳ سال، دو سال ۹ ماہ، اور چند روز حکومت کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ابو العباس کا دور

ابو عقال کا جانشین اس کا بیٹا، ابو العباس محمد بن اغلب ہوا، اس نے امور حکومت زیادہ تر اپنے بھائی احمد کے سپرد کر دیئے تھے، ۲۳۱ھ میں دونوں بھائیوں میں چل گئی - پھر صلح کافی خونریزی کے بعد ہوئی، سال بھر بعد ۲۳۲ھ میں محمد نے بد عہدی کی اسے قید کر کے پھر جلا وطن کر دیا، وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے عہد میں تیونس وغیرہ سے بھی علم بغاوت بلند ہوا، لیکن اس نے باغیوں کو زیر کر لیا، اور عبرت انگیز سزائیں دیں۔

محمد بن اغلب کے زمانہ میں متعدد بغاوتیں ہوئیں، لیکن اس نے انہیں دبا لے اور باغیوں کا قلع قمع کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

۳۶ سال کی عمر میں ۱۵ سال ۸ ماہ اور ۱۲ دن حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا، (۲۴۲ھ)

اس کے بعد اس کا بھتیجا ابو ابراہیم احمد بعد تک حکومت پر متمکن ہوا - یہ بیس سال کی عمر میں، تخت پر بیٹھا، یہ خوش اخلاق، نیک افعال، سخی، شجاع، رحمدل اور نرم خو فرماں روا تھا، عمر نے وفا نہ کی

۲۷ سال کی عمر میں ۱۳ ذی قعدہ ۲۴۹ھ میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد زیادۃ اللہ ثانی بن محمد بن اغلب بن ابراہیم تخت نشین ہوا، یہ صرف ایک سال سات دن حکومت کرنے کے بعد ذی قعدہ ۲۵۰ھ میں وفات پا گیا، پھر ابو الغرانیق اس کا جانشین ہوا یہ ۲۶۱ھ میں وفات پا گیا، اس کے دور کا کوئی خاص کارنامہ قابل ذکر نہیں ہے، اس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم ثانی تخت حکومت پر بیٹھا،

ابراہیم ثانی نے ۲۶۳ھ میں شہر رقادہ کی تعمیر کا کام شروع کیا، ۲۶۴ھ میں ایک بہت بڑا اور شاندار محل بنایا جس کا نام "قصر فتح" رکھا۔

صقلیہ میں مسلمانوں کے حملے جاری تھے، ان کے جاری رکھنے میں اس نے مدد دی، سرقوسہ ۹ مہینے کے زبردست محاصرہ کے بعد اس کے زمانہ میں فتح ہوا تھا۔

۲۶۶ھ میں افریقہ کو بہت بڑے قحط سے دوچار ہونا پڑا، ابراہیم کا دور حکومت بعض اعتبارات سے اور بعض واقعات کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا انہیں ہم ایک الگ باب میں بیان کریں گے۔

سفاک فرماں روا

خوں ریزی اور خوں آشامی کا دور

ابراہیم (ثانی) کے عہد کے چند خاص اشخاص و واقعات یہ ہیں۔

عباس بن ابن طولون

۲۶۷ھ میں احمد بن طولون کا بیٹا عباس اپنے باپ سے رو گرداں ہو کر افریقہ کی طرف بڑھا کہ اسے فتح کر لے، اس کے ساتھ آٹھ سو سوار اور دس ہزار پیادے تھے، پانچ ہزار اونٹ ساتھ تھے، پیادے انہی پر سوار تھے، مصر کے بیت المال سے جو دولت کثیرہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف آٹھ سو تھیلیاں سونے کے انباروں کی تھیں وہ اس لئے آیا تھا کہ بنو اغلب کو افریقہ سے نکال دے، اور خود فرمان کا مالک اور حاکم بن جائے،

ابراہیم کو جب اس یلغار کی اطلاع ملی تو وہ بھی کیل کانٹے سے لیس ہو گیا۔ اس نے احمد بن قرہب کو [illegible] ہزار سوار دے کر مقابلہ کے لئے روانہ کیا، وہ سب سے پہلے طرابلس پہنچا، یہاں اس نے [illegible] کی ایک فوج مرتب کی، اور عباس سے مقابلہ کے لئے لبدہ پہنچا، ابن قرہب نے لبدہ سے [illegible] آگے بڑھ کر عباس سے مقابلہ کیا لیکن احمد بن قرہب غالب نہیں آیا، البتہ امیر طرابلس ابو منصور نے اس کے چھکے چھڑا دیئے، اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا، اسی اثنا میں خود ابراہیم بھی ایک فوج لے کر پہنچا، لیکن عباس بن احمد بن طولون بازی ہار چکا تھا، ابراہیم نے اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔

بغاوت دراہم

ابراہیم ثانی کے دور کا دوسرا واقعہ "ثورة الدراہم" ہے، اس کی کہانی یہ ہے کہ ابراہیم نے صحیح معیار کے درہم مضروب کرائے، اور پرانے درہم منسوخ کر دیئے لوگوں کو یہ بات ناگوار گذری اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے، ابراہیم نے اس بغاوت کو سختی سے دبایا، بہت سے لوگوں کو قید بھی کر لیا، پھر لوگوں کے جذبات کا لحاظ کر کے نئے دینار چلائے جن کا نام عاشرہ رکھا کیونکہ ہر دینار دس درہم کی قیمت کے مساوی ہوتا تھا۔

انحراف و اطاعت

۲۸۰ھ میں ابراہیم کی زیادتیوں اور دراز دستیوں سے عاجز ہو کر اس کی اطاعت سے منحرف ہو گئے، تونس، جزیرہ ادریس باجہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، ابراہیم نے بڑی سختی کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کیا، لوگوں کے دل میں اس کے خلاف جو تلخی پیدا ہو گئی تھی وہ برابر قائم رہی۔

شیعیت کی دعوت

اسی سال کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ ایک شخص ابوعبداللہ حجاز سے مصر ہوتا ہوا قیروان آیا، اور یہیں پڑا، یہ درحقیقت خدمت اہل بیت اطہار کا داعی تھا، اس نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور بہت جلد ہر دلعزیزی حاصل کی، فرقہ کا سب سے بڑا بہادر، اور کثیر النفوس قبیلہ کتامہ خاص طور پر ابوعبداللہ سے متاثر ہوا، اب اس نے باقاعدہ لیکن خفیہ طور پر دعوت کا کام شروع کر دیا تھا، ابراہیم کے بے پناہ ظلم نے اس کے لئے زمین اور زیادہ ہموار کر دی، یہ امام معلم کے شمائل و مناقب اس طرح اور ایسے الفاظ میں بیان کرتا تھا کہ جو سنتا تھا اسی کا ہو رہتا تھا ــــ ابراہیم کو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کی جڑ کھوکھلی ہو رہی ہیں، وہ نہایت اطمینان کے ساتھ ظلم کی چکی چلا رہا تھا اور ابوعبداللہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی دعوت میں مصروف تھا۔

سفاکی کی مثالیں

ابراہیم شروع میں جتنا نیک نفس تھا، اتنا ہی اقتدار کے بعد [illegible] ستمگر [illegible] بن گیا۔

چند واقعات یہ ــــ

۱۔ ۲۶۸ھ میں اہل عتاب پر حملہ کیا، انہیں اور ان کے بچوں کو قتل کر ڈالا۔

۲۔ ۲۷۶ھ میں اس نے عبداللہ بن احمد کو منصب قضا سے معزول کر کے قید کر دیا، جیل میں زہر آلود کھانا کھلا کر ہلاک کر دیا۔

۳۔ اسی سال اپنے کاتب محمد بن حیون المعروف بہ ابن یزیدی سے خفا ہو کر اسے ایک تابوت میں بند کر دیا۔ اسی حالت میں اس نے جان دی۔

۴۔ ۲۷۷ھ میں اپنے حاجب النصر بن صمصامہ کو پانچ سو دُرّے لگوا کے پھر گردن مار دی۔

۵۔ ۲۷۹ھ میں صرف لوگوں کو مرتا دیکھ کر خوش ہونے کے لئے افریقہ کے بہت سے لوگوں کو قتل کرا دیا، اپنے حاجب کو جاہلوں سے پٹوا کر مروا ڈالا، نجومیوں کی بات بہت سنتا تھا، کسی نجومی نے کہہ دیا کہ تمہارا خادم تمہیں قتل کرے گا، پس پھر کیا تھا، خادموں کے پورے کے پورے صاف کر دیئے، پھر حبشیوں کو خادم بنایا، چند روز بعد شبہ میں انہیں بھی ہلاک کرا دیا،

۶۔ ۲۸۰ھ میں بلزمہ کے سات سو شرفا کو اقادہ لے آیا، اور یہاں ایک ایک کر کے سب کو قتل کر ڈالا،

۷۔ ۲۸۲ھ میں میمون حبشی کو حکم دیا کہ تونس جا کر بنو تمیم کو قتل کر ڈالے،

۸۔ ۲۸۳ھ میں اپنے برادر عم زاد ابو عباس محمد بن زیادۃ اللہ کو قتل کر دیا، حالانکہ انہوں نے کوئی سرکشی نہیں کی تھی،

۹۔ اپنے ایک بیٹے ابو الاغلب کو ہلاک کر دیا،

۱۰۔ ایک لونڈی سے وہ رومال گم ہو گیا جس سے وہ منہ پونچھا کرتا تھا، تلاش کے بعد وہ ایک غلام کے پاس ملا اس نے تین سو خادموں کو قتل کرا دیا۔

۱۱۔ اپنے آٹھ بھائیوں کو قتل کرا دیا، اور خوش ہوا۔

۱۲۔ اپنی سولہ بیٹیوں کو قتل کرا دیا، جلاد نے تامل کیا، تو کہا، اگر دیر کی تو پہلا نمبر تیرا ہو گا۔

۱۳۔ ایک مرتبہ بہت سے خادموں کو تنور میں ڈال کر سب کو دم بخت کر دیا۔

ابراہیم کا جامۂ پارسائی کہتے ہیں کہ ابراہیم شروع میں بہت اچھا آدمی تھا، بعد خلط سوداوی غالب آئی اور وہ نیم پاگل ہو گیا۔

۲۸۹ھ میں ابراہیم نے ابو عبداللہ کی دعوت کے پاؤں جمتے دیکھ کر، اپنے جور و ستم سے توبہ کی اور کوشش کی کہ عامۃ الناس کو راضی اور اکابر کو اپنی طرف مائل کر لے، اس نے تمام مظلوموں کو رہا کر دیا، منمانتوں سے دست بردار ہوا، گیہوں کے بجائے جو کھانا شروع کر دیئے، جاگیرداروں کو ایک سال کی مالگزاری

معاف کر دی، بہت سے غلاموں کو آزاد کر دیا، فقہائے قیروان کو بہت سا مال و اسباب ضعیفوں اور یتیموں میں تقسیم کرنے کے لئے دیا، پھر تخت سے دست بردار ہو کر اپنے بیٹے ابو عبداللہ کو حکومت سونپ دی، اسی سال اس کا صقلیہ میں انتقال ہو گیا۔

لیکن حالات جب بگڑ جاتے ہیں تب ان کا سدھرنا بہت مشکل اور دشوار ہو جاتا ہے یہی بات ہمیں افریقہ اور مغرب اقصیٰ کے اس دور حکومت میں بھی نظر آتی ہے، گاڑی جب اٹکی تو پھر آگے نہ بڑھ سکی، حالانکہ زور پورا لگایا گیا۔

1, 2, 3, 4, 5, 6, 7, 8, 9,

دَورِ فاطمی

خاندان اغالبہ کا خاتمہ

ابوعباس، زمین پر بیٹھتا تھا اور مظلوموں کی دادرسی کرتا تھا، اُس نے اہل علم و فضل کو اپنا ہم نشین بنایا، اُن سے ہر امر میں مشورہ کیا، صقلیہ کا گورنر اس کا بیٹا زیادۃ اللہ تھا، اس کی شکایت سنی تو واپس بلاکر قید کر دیا، اُس نے بہ حالت اسیری سازش کر کے ابوعباس کو قتل کرا دیا، پھر اپنے چچا کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا، پھر اپنے بھائی کی گردن کاٹی، پھر ان دونوں آدمیوں کو قتل کیا، جنہوں نے اس کے اشارہ پر ابوعباس کو قتل کیا تھا،

ابوعبداللہ کی کامیابیاں زیادۃ اللہ کی زیادتیوں نے اُس کے دوستوں کو بھی اس کا دشمن بنا دیا، ادھر ابوعبداللہ (خاندان فاطمی کا داعی) برابر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کمزور ہوتا گیا، وہ طاقتور ہوتا گیا، اور ۲۹۶ھ میں نوبت یہ پہنچی کہ افریقہ کے متعدد شہر سر کرتا ہوا، ابوعبداللہ زیادۃ اللہ کے سر پر پہنچ گیا، زیادۃ اللہ بہت سا مال و زر لے کر بھاگ کھڑا ہوا، اور ابوعبداللہ شہر رقادہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو گیا، پھر اس نے سلجماسہ کی جنگ جیتی، اور عبیداللہ کو قید سے چھڑا کر لے آیا، اور غایت درجہ ایثار و انکسار سے کام لے کر افریقہ کی حکومت اسے سونپ دی کہ اسی کے لئے وہ دعوت دے رہا تھا، اور خود اس کی چاکری پر قناعت کی، یہ واقعہ ۲۹۷ھ کا ہے، عبیداللہ مہدی کے لقب سے تخت نشین ہوا، اُس نے اپنے نام پر نیا دارالخلافہ مہدیہ تعمیر کرایا جو اپنی شان و شکوہ کے لحاظ سے یادگار شہر تھا۔

ابومسلم خراسانی اور ابوعبداللہ جو کارنامے ابومسلم خراسانی نے خاندان عباسی کو برسر اقتدار لانے کے لئے انجام دیئے تھے، تقریباً ویسے ہی کارنامے ابوعبداللہ داعی الدعاۃ نے عبیداللہ کو منصب امامت و خلافت اور تخت حکومت پر فائز کرنے کے لئے

م دیئے، اور تاریخ کی یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ جو حشر ابو مسلم خراسانی کا ہوا بالکل وہی حشر ابو عبداللہ
ہوا یعنی دونوں قتل کر دیئے گئے ——— انہی لوگوں کے ہاتھوں سے جن کے لئے انہوں نے
سب کچھ کیا تھا!

عبیداللہ المہدی کا دورِ حکومت

عبیداللہ المہدی نے اپنی طویل حکومت میں نیکیاں بھی کیں اور برائیاں بھی، اس نے اپنے مذہب کو جبر وجور کے ذریعہ رائج کرنے کی کوشش کی، جو لوگ اس کے مسلک، خیالات، پالیسی، اور پروگرام سے اختلاف رکھتے تھے، ان کے ساتھ یہ کوئی رعایت نہیں کرتا تھا، جب تک انہیں قتل نہ کرا لیتا چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ یہ سارے افریقہ مغرب اقصیٰ اور صقلیہ کا فرماں روا تنے واقعی بن گیا تھا، صقلیہ کی تمام وکمال ، اسی کے عہد میں، اسی کے ولاۃ کے ہاتھوں ہوئی،

۳۲۲ھ کے شروع میں عبیداللہ المہدی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ۲۴ برس اور دس ماہ حکومت کی،
۲۸۹ھ میں تاجر کا بھیس بدل کر مصر آیا، ۲۹۶ھ میں سلجماسہ پہنچا، ۲۹۷ھ میں رقادہ میں داخل ہوا، اور امام تسلیم کر لیا گیا، ۳۰۸ھ میں مہدیہ شہر تعمیر کیا، بسایا اور وہاں منتقل ہو گیا ——— رقادہ بنو غلب کا مرکز تھا۔

عبیداللہ کی حکومت کا دائرہ افریقہ، مغرب اقصیٰ، طرابلس، برقہ اور جزیرہ صقلیہ تک حاوی تھا، اسی کے ولی عہد نے مصر بھی فتح کر لیا، وفات کے وقت عبیداللہ کی عمر ۶۳ سال کی تھی، اس نے اپنے طویل دورِ حکومت میں اپنی تمام آرزوئیں پوری کر لیں۔

ربیع الاول ۳۲۲ھ میں ابوالقاسم بن عبیداللہ بادشاہ ہوا، اس نے القائم بامر اللہ کا لقب اختیار کیا، یہ ۱۲ سال ۷ مہینے حکومت کر کے ۱۳ شوال ۳۳۴ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا، اس کے عہدِ حکومت میں روم کے بہت سے شہر فتح ہوئے، کئی بڑی بڑی بغاوتیں بھی ہوئیں، مگر یہ ساری بغاوتوں پر غالب آیا، ۳۳۲ھ میں ابو یزید نے محقہ میں اس کی شیعیت کے خلاف خروج کیا، کامیابی حاصل کی، رقادہ تک پہنچ گیا، لیکن انجام کار شکست کھائی، اور قتل ہوا۔

بارہ سال حکومت کرنے کے بعد ابوالقاسم القائم بامر اللہ نے ۱۳ شوال کو وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا، اسمٰعیل جس کی کنیت ابوطاہر اور لقب منصور تھا اورنگ نشین حکومت ہوا یہ ۳۴۱ھ میں وفات پاگیا۔

فرماں رواؤں کی اس "آمد و رفت" نے بھی حالات کو ناسازگار کرنے میں بڑا حصہ لیا، اگر یہ تبدیلیاں کسی اچھے نظام کی حامل ہوتیں تو ایک بات تھی، لیکن ان سے حالات ہمیشہ اور زیادہ بگڑتے رہے ؂

فتح مصر و شام

قاہرہ کی تعمیر نو مسلم غلام جوہر کے ہاتھوں

ابوطاہر اسمٰعیل کے بعد ابوتمیم معد بن اسمٰعیل نے المعز لدین اللہ کے لقب سے تخت حکومت کو رونق بخشی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی،

المعز، بڑا خوش قسمت بادشاہ تھا جتنا زیادہ خوش قسمت تھا اس سے زیادہ اولوالعزم تھا، ناممکن کو ممکن کر دکھانا اس کی ہمت اور حزم کا ادنیٰ کرشمہ تھا

کافور اخشیدی کی وفات

امیر مصر کافور اخشیدی کی وفات کے بعد المعز نے اپنے نو مسلم غلام، جوہر کو، جو صقلیہ کا رہنے والا تھا، سپہ سالار بنا کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ، مصر فتح کرنے پر مامور کیا، اس نے ۱۷ شعبان ۳۵۸ھ کو منگل کے دن مصر فتح کر لیا، ——— یہ جوہر کا بہت بڑا کارنامہ تھا، اور المعز کے شاندار، یادگار، پائندہ اور مستحکم مستقبل کا آئینہ دار۔

جوہر کے کارنامے آقا کی نظر میں، اس سے قبل بھی کچھ کم لائق تحسین نہ تھے، اس نے ۳۴۷ھ میں شہر فاس فتح کر لیا، جو ادریسی یعنی خاندان ادریس کا مرکز تھا، اس کے علاوہ بھی اس نے کئی فتوحات حاصل کیں، اور نمایاں کارنامے انجام دے چکے تھے۔ فاس کے سقوط کے بعد خاندان بنو ادریس کے معزز افراد قرطبہ جا کر پناہ گزیں ہو گئے۔

فتح مصر کے بعد جوہر نے بے شمار تحائف اپنے آقا، المعز کی خدمت میں بھیجے، شہر قاہرہ کی تعمیر اسی کا زندہ جاوید کارنامہ ہے، نیز مصر کی مشہور درسگاہ جامعہ ازہر بھی اس کی حوصلہ مندیوں کا ایک نہ مٹنے والا نشان ہے۔

جوہر کی فرمائش پر، المعز مصر آیا اور پھر اس نے قاہرہ ہی کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا، اور

افریقہ کی گورنری ابوالفتوح یوسف صنہاجی کے سپرد کردی،

المعز کا دور ہر اعتبار سے شاندار اور یادگار تھا، رعایا کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا، وہ بہت بڑا مدبر اور موقعہ شناس تھا،

۳۶۵ھ میں، جمعہ کے دن ۲۲ برس پانچ مہینے حکومت کرنے کے بعد اس نے وفات پائی، پھر اس کا بیٹا عزیز باللہ، نزار جس کی کنیت ابومنصور تھی، تخت حکومت پر بیٹھا، اس کا عہد بھی شاندار فتوحات اور کامیابیوں کا عہد ہے، ۳۶۳ھ میں اس نے ایک بڑا لشکر لے کر شام کی طرف کوچ کیا، رملہ میں آترا، سپہ سالار افواج جوہر تھا اس معرکہ میں بھی کامیابی ہوئی، زبردست جنگ کے بعد شام، حکومت فاطمی کا ایک جزو بن گیا، ۳۸۶ھ میں اس نے وفات پائی، اور اس کا بیٹا ابوعلی الملقب بہ حاکم بامر اللہ تخت نشین ہوا، اس کا عہد بھی کامرانیوں کا عہد تھا، ۴۱۱ھ میں اس کا انتقال ہوا، اور اس کی جگہ الظاہر بادشاہ ہوا - اس کے فرماں روا ہونے کے بعد افریقہ کا علاقہ تقریباً ہاتھ سے نکل گیا، وہاں نئے نئے خاندان اٹھے متعدد خانہ جنگیاں ہوئیں فتنہ و فساد کا بازار گرم رہا، نارمنوں اور عیسائیوں کے حملے ہوئے، غرض شیرازہ زیادہ سے زیادہ ابتر ہوتا چلا گیا۔ ۴۳۱ھ سے، ۶۰۲ھ تک جب عبداللہ الناصر موحدین کو لے کر مہدیہ میں داخل ہوا، خلفشار کی یہی کیفیت رہی -

ان خانہ جنگیوں اور فتنہ انگیزیوں کا ایک سبب شیعہ سنی نزاع بھی تھی، دونوں میں سے ہر ایک اپنے دینی مسلک کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتا تھا کہ جی بھر کے لڑے، چنانچہ لڑائیاں ہوئیں، اور خوب ہوئیں حکومت کے خاندان بدلے اور بدلتے رہے ‌‌‌ ❖

افریقیہ کے حکمران

امرا والی بادشاہ

ذیل میں افریقیہ کے امیروں، والیوں اور بادشاہوں کی فہرست از ابتدا تا انتہا درج کی جاتی ہے جو عبرت و بصیرت کا اچھا خاصا مرقع ہے۔

عہد سلاطین بنو امیہ

۱۔ عقبہ بن نافع
۲۔ ابوالمہاجر
۳۔ عقبہ (دوسری مرتبہ)
۴۔ زہیر بن قیس
۵۔ حسان بن نعمان
۶۔ موسیٰ بن نصیر
۷۔ محمد بن یزید
۸۔ اسمٰعیل بن عبداللہ
۹۔ یزید بن ابو مسلم ثقفی
۱۰۔ محمد بن اوس انصاری
۱۱۔ بشر بن صفوان
۱۲۔ عبیدہ بن عبدالرحمٰن سلمی
۱۳۔ عبیداللہ ابن الحجاب
۱۴۔ کلثوم بن عیاض
۱۵۔ حنظلہ بن صفوان
۱۶۔ عبدالرحمٰن بن حبیب القرشی
۱۷۔ الیاس بن حبیب
۱۸۔ حبیب بن عبدالرحمٰن

والیان صفریہ

۱۹۔ عاصم
۲۰۔ عبدالملک بن ابو جعد (والی منجانب ابامیتہ)
۲۱۔ ابوالخطاب عبدالاعلیٰ بن سمح

عہد خلفائے عباسیہ

۲۲- محمد بن الاشعث خزاعی

۲۳- عیسیٰ بن موسیٰ الخراسانی

۲۴- اغلب بن سالم تمیمی

۲۵- حسن بن حرب کندی

۲۶- اغلب بن سالم (دوسری مرتبہ)

۲۷- عمر بن حفص المہلبی

۲۸- یزید بن حاتم المہلبی

۲۹- داؤد بن یزید

۳۰- روح بن حاتم المہلبی

۳۱- ہرثمہ بن اعین

۳۲- محمد بن مقاتل عکی

۳۳- تمام بن تمیم تمیمی

۳۴- محمد بن مقاتل (دوسری مرتبہ)

بنو اغلب

۳۵- ابراہیم بن اغلب

۳۶- عبدالرحمٰن بن ابراہیم

۳۷- زیادۃ اللہ بن ابراہیم

۳۸- اغلب بن ابراہیم

۳۹- محمد بن اغلب

۴۰- احمد بن محمد

۴۱- زیادۃ اللہ بن محمد

۴۲- محمد ابن احمد

۴۳- ابراہیم بن احمد

۴۴- عبداللہ ابن ابراہیم

۴۵- زیادۃ اللہ بن عبداللہ

خاندان فاطمی یعنی عبیدیہ

۴۶- ابو عبداللہ (داعی الدعاۃ)

۴۷- عبیداللہ المہدی (عبیدیہ اسی نام سے منسوب ہیں)

۴۸- ابوالقاسم ابن عبیداللہ

۴۹- اسمٰعیل ابن ابوالقاسم

صنہاجیہ

یہ پہلے عبیدیین کی دعوت کے مؤید تھے، انہی کی طرف سے والی مقرر ہوئے۔ پھر خود مختار ہو گئے۔

۵۰۔ بلکین بن زیری

۵۱۔ منصور بن بلکین

۵۲۔ بادیس بن منصور

۵۳۔ معز بن بادیس

۵۴۔ تمیم بن معز

۵۵۔ یحییٰ بن تمیم

۵۶۔ علی بن یحییٰ

۵۷۔ حسن بن علی

حصہ ہفتم

از صفحہ ۳۸۰

سسلی یا صقلیہ

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر، بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور
غلغلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے
ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصۂ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے،
اقبال

(۱)

فرماں روایان صقلیہ

دولت اغالبہ

۱- اسد بن فرات ۲۱۲ھ سے ۲۱۳ھ تک

۲- محمد بن ابی الجوار ۲۱۳ھ سے ۲۱۴ھ تک

۳- زبیر بن غوث ۲۱۴ھ سے ۲۱۷ھ تک

۴- محمد بن عبداللہ بن الاغلب ۲۱۷ھ سے ۲۲۱ھ تک

۵- ابوالاغلب ابراہیم ۲۲۱ھ سے ۲۳۶ھ تک

۶- عباس بن فضل ۲۳۷ھ سے ۲۴۷ھ تک

۷- احمد بن یعقوب ۲۴۷ھ

۸- خفاجہ بن سفیان ۲۴۸ھ سے ۲۵۵ھ تک

۹- محمد بن خفاجہ ۲۵۵ھ سے ۲۵۷ھ تک

۱۰- رباح بن یعقوب ۲۵۷ھ سے ۲۵۸ھ تک

۱۱- حسین بن رباح ۲۵۸ھ سے ۲۵۹ھ تک

۱۲- عبیداللہ بن محمد ۲۵۹ھ

۱۳- ابو مالک احمد ۲۵۹ھ سے ۲۶۴ھ تک

۱۴- جعفر بن محمد ۲۶۴ھ

۱۵- اغلب بن محمد ۲۶۴ھ سے ۲۶۵ھ تک

۱۶- ابوالاغلب بن ابراہیم ۲۶۵ھ

۱۷ - حسین بن رباح سنہ ۲۶۵ھ

۱۸ - حسن بن عباس سنہ ۲۶۵ سے سنہ ۲۶۷ھ تک

۱۹ - ابوالحسین محمد سنہ ۲۶۵ھ سے سنہ ۲۶۸ھ تک

۲۰ - علی بن محمد سنہ ۲۷۰ھ

۲۱ - حسین بن احمد سنہ ۲۷۰ھ سے سنہ ۲۷۱ھ تک

۲۲ - سوادہ بن محمد سنہ ۲۷۱ھ سے سنہ ۲۷۳ھ تک

۲۳ - ابومالک احمد سنہ ۲۷۴ھ سے سنہ ۲۷۸ھ تک

۲۴ - ابوالحسین محمد سنہ ۲۷۹ھ سے سنہ ۲۸۴ھ تک

۲۵ - حسین بن احمد سنہ ۲۸۴ھ سے سنہ ۲۸۵ھ تک

۲۶ - ابومالک احمد سنہ ۲۸۵ھ سے سنہ ۲۸۷ھ تک

۲۷ - ابوالعباس بن ابراہیم سنہ ۲۸۷ھ سے سنہ ۲۸۹ھ تک

۲۸ - ابراہیم بن احمد سنہ ۲۸۹ھ

۲۹ - ابومضر زیادۃ اللہ سنہ ۲۸۹ھ سے سنہ ۲۹۰ھ تک

۳۰ - محمد بن سرقوسی سنہ ۲۹۰ھ

۳۱ - علی بن محمد سنہ ۲۹۰ھ

۳۲ - احمد بن ابی الحسین سنہ ۲۹۰ھ سے سنہ ۲۹۶ھ تک

(۲)

فرماں روایان صقلیہ

(فاطمی خلافت کی زیر سیادت)

۱- علی بن محمد ۲۹۶ھ سے ۲۹۷ھ تک

۲- حسن بن احمد ۲۹۷ھ سے ۲۹۹ھ تک

۳- علی بن عمر ۲۹۹ھ

۴- احمد بن زیادۃ اللہ ۳۰۰ھ سے ۳۰۴ھ تک

۵- ابوسعید موسیٰ بن احمد ۳۰۴ھ

۶- سالم بن ابی راشد ۳۰۵ھ سے ۳۲۵ھ تک

۷- ابوالعباس خلیل ۳۲۶ھ سے ۳۲۷ھ تک

۸- ابوعطاف محمد ۳۲۷ھ سے ۳۳۶ھ تک

۹- ابوالغنائم حسن بن علی ۳۳۶ھ سے ۳۴۳ھ تک

۱۰- ابوالحسن احمد ۳۴۳ھ سے ۳۵۸ھ تک

۱۱- یعیش مولی الحسن ۳۵۸ھ سے ۳۵۹ھ تک

۱۲- احمد بن حسن ۳۵۹ھ

۱۳- ابوالقاسم بن حسن ۳۶۰ھ سے ۳۷۲ھ تک

۱۴- جابر بن ابوالقاسم ۳۷۲ھ سے ۳۷۳ھ تک

۱۵- جعفر بن محمد سنہ ۳۷۳ھ سے سنہ ۳۷۵ھ تک

۱۶- عبداللہ بن محمد سنہ ۳۷۵ھ سے سنہ ۳۷۹ھ تک

۱۷- ثقۃ الدولہ سنہ ۳۷۹ھ سے سنہ ۳۸۸ھ تک

۱۸- تاج الدولہ سنہ ۳۸۸ھ سے سنہ ۴۱۰ھ تک

۱۹- تائید الدولہ سنہ ۴۱۰ھ سے سنہ ۴۲۷ھ تک

۲۰- صمصام الدولہ سنہ ۴۲۷ھ سے سنہ ۴۳۱ھ تک

عہدِ انتشار سنہ ۴۳۴ھ

صقلیہ میں اسلامی حکومت کا خاتمہ، سنہ ۴۸۴ھ

سسلی کی کہانی

ایک مختصر سا تاریخی جائزہ

صقلیہ جسے اب سسلی CICILY کہتے ہیں، قدیم یونانی زبان میں سکیلیہ SIKELIA کے نام سے موسوم تھا، اس کو معرب کر کے عربوں نے صقلیہ بنالیا،

صقلیہ کے بارے میں ماہرین علم طبقات الارض کا خیال ہے یہ رُوئے زمین کا قدیم ترین خطہ ہے، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ صقلیہ کے ساحلی مشاہدات کی بنا پر ماہرین ارضیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جزیرہ بحر روم میں اُس وقت سے موجود ہے، جب کہ دُنیا ابھی انسانی وجود سے آشنا نہ ہوئی تھی۔

محلِ وقوع کے لحاظ سے بھی صقلیہ یا سسلی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، یہ یورپ اور افریقہ کا ہمیشہ سے نقطہ اتصال رہا ہے، یہ براعظم افریقہ، اور یورپ کے درمیان ایک پل کی حیثیت سے موجود رہا ہے، مشرق اسے اپنی طرف کھینچتا رہا، اور مغرب اپنی طرف، صقلیہ کی سرزمین سطح سمندر سے ۵۰۰ فیٹ سے لے کر ۱۹۰۰ فیٹ تک بلند ہے۔

خوبصورت جزیرہ ہمیشہ سے یہ جزیرہ بہت سرسبز اور شاداب ہے۔ یہاں کی گل پوش وادیاں، شیریں چشمے، گھنے جنگل، لہلہاتے ہوئے کھیت، سبزپوش پہاڑیاں پرشور ندیاں،

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کا ساں پیش کرتے ہیں، زرعی پیداوار کے لحاظ سے یہ جزیرہ ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے، چنانچہ رومیوں کے زمانہ میں اسے عام طور پر، خزانہ گندم کہا جاتا تھا، لوگوں کا خیال تھا، دنیا میں سب سے پہلے گیہوں یہیں پیدا ہوا تھا۔

اسے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

اپنی زرخیزی کے باعث صقلیہ ہمیشہ مختلف قوموں اور قوتوں کی تاخت و تاراج کا مرکز بنا رہا، ہر طاقت یہ چاہتی تھی کہ اسے اپنے زیر نگیں رکھے۔

یہاں کی اصل آبادی پر پہلے فینقی اقتدار کا دور آیا، پھر یونانیوں نے اپنی عظمت و جلال کا پرچم لہرایا، پھر رومی جاہ و دبدبہ کے ساتھ نقارۂ فرماں روائی بجاتے ہوئے نمودار ہوتے، پھر افریقہ کے راستے سے عربوں اور بربر مسلمانوں نے اس طرف پیش قدمی کی، اور بہت جلد اسے زیر نگین کر لیا۔

عربی زبان

جس طرح صقلیہ مختلف قوموں اور قوتوں کی آماج گاہ رہا، اسی طرح یہاں کی لسانی حیثیت بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہی، شروع میں اس جزیرہ کی مادری زبان کیا تھی؟ یہ کسی کو نہیں معلوم، پھر جب یونانیوں کا تسلط ہوا، تو وہاں یونانی رائج ہو گئی فنیقی دور میں یہاں کی زبان عبرانی تھی، رومیوں کے اقتدار نے لاطینی زبان کو فروغ دیا، پھر جب اسلام کا قافلہ اس دیس میں پہنچا تو جہاں اس نے یہاں کے باشندوں کو بہت سی نعمتیں عطا کیں، وہاں ایک نئی — عربی — زبان بھی عطا کی، اور رفتہ رفتہ یہی زبان صقلیہ کی سرکاری اور دفتری زبان بن گئی۔

بُت پرستی کا دور

صقلیہ میں بھی سب سے پہلے جو مذہب نمودار ہوا، وہ بُت پرستی تھا، یہودی یہاں موجود تھے، پھر عیسائیت نے قدم رنجہ فرمایا اور یہودیوں پر جتنے لرزہ خیز مظالم ہو سکتے تھے وہ روا رکھے، ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ کر لیا، انہیں ہر طرح سے دبایا اور ستایا، لیکن یہودی قوم بڑی سخت جان قوم ہے، ان مظالم کے باوجود وہ اپنے مذہب پر قائم رہی اور کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن پورے کرتی رہی، پوپ گریگوری نے اپنے متعدد خطوط میں اعتراف کیا ہے کہ یہودیوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، عیسائیت نے جہاں قدم جمائے، پہلا تختۂ مشق یہودیوں کو بنایا، دوسرے مقامات کی طرح صقلیہ میں بھی یہی ہوا۔

یہودیت اور عیسائیت نے اگرچہ ایک منظم مذہب کی حیثیت سے صقلیہ پر اپنا پرچم لہرایا، لیکن بت پرستی، کمزور اور محدود طور پر سہی، بہرحال قائم رہی، مذہب کے اس جھرمٹ میں اسلام جب

پہنچا، تو ایسا معلوم ہوا کہ آفتاب کے سامنے ستارے ماند پڑ گئے۔

خون ریز محاربات

صقلیہ کی تاریخ خون ریز محاربات سے لبریز ہے، اپنی دل آویزی کے باعث وہ ہمیشہ وقت کے اولوالعزم فرماں رواؤں کے ہاتھ کا کھلونا بنا رہا، وہ دنیا کے میدان میں ایک فٹ بال کی حیثیت رکھتا تھا، وقت کی بڑی بڑی طاقتیں اسے ٹھوکر لگاتی رہتی تھیں، کبھی وہ ادھر جا گرتا تھا کبھی ادھر، کبھی اس کے قبضہ میں آجاتا تھا، — کبھی اس کے قبضہ میں آجاتا تھا، کبھی اس کے تصرف میں اسی طرح وہ ہچکولے کھاتا رہا، اور ہر ہچکولے کے ساتھ اس کے قانون میں تبدیلی ہوتی رہی،

سب سے پہلے صقلیہ پر یونانیوں نے قبضہ کیا، سنہ ق م میں قرطاجنہ کا ہیرو ہنی بال اپنی فوج کی کمان کرتا ہوا، داخل ہوا، ۲۶۲ق م میں قرطاجنہ کو رومیوں نے شکست دی، اور صقلیہ کو اپنا صوبہ بنا کر ایک گورنر کے ماتحت کر دیا، ۳۲۳ء میں شہنشاہ قسطنطنیہ نے مذہب عیسوی قبول کر لیا، اس کے بعد سے یہاں عیسائیت کا فروغ شروع ہو گیا، ۵۳۵ء میں رومی اتنے زوال پذیر ہوئے کہ بیزنطینی حکومت صقلیہ پر قابض ہو گئی اور وہ کچھ نہ کر سکے، بیزنطینی حکومت کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔

ساتویں صدی عیسوی سے عربوں کے حملے صقلیہ پر شروع ہوئے، نویں صدی میں ان حملوں نے بہت زیادہ شدت اختیار کر لی، اور دسویں صدی کے اختتام سے پہلے سارے صقلیہ پر عرب حکومت قائم ہو گئی

قاضی اسد بن فرات کے فتوحات

والی افریقہ زیادۃ اللہ نے سنیچر کے روز ۱۵ ربیع الاول ۲۱۲ھ کو ایک لشکر قاضی اسد بن فرات کی سرکردگی میں صقلیہ کی طرف روانہ کیا۔

قاضی اسد امام مالک، امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد رشید تھے، اور افریقہ کے قاضی القضاۃ تھے لیکن جس طرح وہ مسند علم کی زینت تھے، اسی طرح وہ میدان جنگ کے سورما بھی تھے۔

لشکر افریقہ کے ساحلی شہر سوسہ کی طرف قیروان سے روانہ ہوا، قاضی اسد کی وجہ سے اس لشکر میں بہت سے عالمان دین اور اہل علم شریک ہو گئے، عام مسلمانوں نے اس لشکر کی مشایعت کی، اس موقع

پر بڑی اثر انگیز اور دلگداز تقریریں ہوئیں، پھر جہازوں نے لنگر اٹھایا، اور صقلیہ کی طرف روانہ ہو گئے، یہ بیڑا سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا، ان جہازوں پر دس ہزار پیادے اور سات سو سوار تھے یہ لشکر ۱۸ ربیع الاول ۲۱۲ھ کو شہر مازر میں لنگر انداز ہو گیا، شہر کے لوگوں نے مقابلہ نہیں کیا، اس لئے بلا مزاحمت قبضہ ہو گیا، پھر اسلامی لشکر نے یہاں سے کوچ کیا، اور مقام مرج میں پڑاؤ کیا، یہاں دشمن کی فوج مقابلہ کے لئے تیار کھڑی تھی،

شہنشاہ مائکل نے قسطنطنیہ سے ایک رومی بیڑا صقلیہ کی امداد کے لئے روانہ کیا، وینس کی حکومت نے بھی ساتھ دیا، اور اپنا ایک بڑا بیڑا جہازوں کا مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بھیج دیا، خود صقلیہ کا بیڑا پہلے سے تیار تھا، ان تینوں حکومتوں — قسطنطنیہ - وینس - صقلیہ — کی فوج ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی،

قاضی اسد بن فرات نے اس موقع پر ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی، سورۂ یٰسین کی تلاوت کی اور جھنڈا ہاتھ میں لے کر رجز خوانی کرتے ہوئے لشکر پر ٹوٹ پڑے، دس ہزار نفوس کا ڈیڑھ لاکھ افراد پر حملہ ایک مذاق معلوم ہوتا تھا، جب مسلمان آگے بڑھے تو رومیوں کو یقین ہو گیا کہ شکار خود جال کی طرف بڑھ رہا ہے، لیکن بہت جلد رومیوں کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا - اسلام کے سرفروشوں نے اس طرح ڈٹ کے مقابلہ کیا کہ رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، وہ اس مجاہدانہ حملہ کی تاب نہ لاسکے، اور تتر بتر ہونے لگے، اسد نے اس معرکہ میں بہت سے زخم کھائے، لیکن نہ ان کے جارحانہ حملوں میں فرق آیا، نہ انہوں نے جھنڈا چھوڑا۔

آخر کار رومی بھاگ کھڑے ہوئے، بہت سے ہلاک و مجروح ہوئے، اور بہت سے قیدی بنا لئے گئے بے اندازہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔

زیادۃ اللہ کو جب اس پہلے معرکہ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا، اس نے یہ نوید فتح خلیفہ مامون الرشید کو بھیجی، اور اس طرح ساری دنیائے اسلام میں یہ مژدۂ جانفزا پہنچ گیا، اس معرکہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ایک "مولوی" کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا، جو اگرچہ جنگ کا مرد میدان

نہ تھا، لیکن جب اس میدان میں کودا تو سب سے آگے نکل گیا!

مسلمانوں کی اس فتح نے رومیوں کا زور اور حوصلہ ختم کر دیا، صقلیہ کا گورنر بلاطہ صقلیہ سے بھاگ کھڑا ہوا، اس کے بھاگ جانے کے بعد صقلیہ کے دفاع اور حفاظت کے فرائض لطارقہ نے اپنے ذمہ لے لئے، اور جزیہ پر امان حاصل کر لی۔

سرقوسہ کا محاصرہ لیکن عیسائی اس صلح پر دل سے قائم نہیں رہے، در پردہ جنگ کی تیاریاں کرتے رہے، قاضی اسد ان حالات سے لاعلم نہ تھے انہوں نے سرقوسہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ نے طول کھینچا، اسی میدان میں قاضی اسد بن فرات دشمن کے ایک تیر سے زخمی ہو گئے، اس کاری زخم کی وہ تاب نہ لا سکے، چنانچہ ربیع الآخر ۲۱۳ھ میں وہ وفات پا گئے، اس حادثہ نے مسلمانوں کو شکستہ کر دیا تھا، قاضی اسد، اپنی فتح کی ہوئی سرزمین پر دفن ہوئے، قبر کے پاس حصول برکت و دعا کے لئے ایک مسجد تعمیر کر دی گئی۔

قاضی اسد کے جانشین امیر محمد بن ابی الجواری لشکر اسلامی کے سپہ سالار منتخب ہوئے، انہوں نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

ایک نئی مصیبت سرقوسہ کا محاصرہ جاری تھا کہ ایک نئی مصیبت سے سابقہ پڑا، بڑے زور کا طاعون پھوٹا، اور اس وبا نے ایک آفت مچا دی، سپاہی بددل ہو گئے، اور انہوں نے افریقہ واپس چلنے کا مطالبہ کیا، امیر محمد نے شروع شروع میں اس خیال کی مزاحمت کی، لیکن رائے عامہ کے سامنے ان کی نہ چلی، چنانچہ محاصرہ ترک کر کے افریقہ کے ارادہ سے مسلمانوں کا لشکر اپنے جہازوں میں بیٹھ گیا، ان جہازوں نے ابھی لنگر نہیں اٹھایا تھا کہ قسطنطنیہ سے بزنطینی حکومت کا ایک بہت بڑا بیڑہ بہت سے رومی سپاہیوں کو لے کر آتا ہوا نظر آیا، اس نے مسلمانوں کا راستہ روک لیا، یہ بیڑہ اس لئے آیا تھا کہ صقلیہ کو مسلمانوں سے خالی کرالے، پھر وہ یہ کیسے دیکھ سکتا تھا کہ مسلمان زندہ سلامت واپس چلے جائیں۔

اسلامی تاریخ کے نہایت محیر العقول کارنامہ کا یہاں سے آغاز ہوتا ہے۔

اب مسلمانوں کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے، ——— اطاعت یا مقابلہ! اسلام اور کفر کی اطاعت؟ ——— ناممکن!

امیر محمد نے کہا، مسلمانو، تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں! ذلت کی زندگی یا عزت کی موت!

نعرہ بلند ہوا،

ہمیں ذلت کی زندگی نہیں چاہیئے، عزت کی موت منظور ہے!

اور پھر دفعتہً، یہ مسلمان، اپنے جہازوں سے اتر پڑے، اور ان جہازوں میں آگ لگا دی! ان جہازوں کا ایک ایک تختہ انہوں نے جلا ڈالا! انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ عزت کی موت مریں گے، اور اپنے اس فیصلہ کو مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں فرار کا ہر راستہ مسدود کر دیا!

رومی لشکر اپنے جہازوں پر پہنچا، یہ ہولناک، لرزہ خیز اور نہایت حیرت انگیز منظر دیکھ رہا تھا! وہ اسے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دنیا میں ایسے دیوانے بھی ہو سکتے ہیں، جو یوں موت کو دعوت دیں اور زندگی کے ہاتھوں سے اپنا دامن کھینچ لیں!

رومی لشکر کے صف آرا ہونے سے پہلے پہلے مسلمانوں نے متعدد بستیوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا۔

قصریانہ کا معرکہ

رومیوں کے لشکر میں بہت سے بطریق اور راہب بھی تھے، عام سپاہی اور یہ سب میدان جنگ میں آ اترے۔ بزنطینی لشکر کا جاہ و جلال قابل دید تھا، لیکن مسلمان کفن سر سے باندھ کر آ اترے، اور اس جوش و خروش سے لڑے کہ حریف کے دانت کھٹے کر دیئے اور بہت سے کشتوں کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس معرکہ میں بہت سے قیدی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، ان میں کافی تعداد بطارکہ کی بھی تھی۔

اس ہزیمت نے بزنطینی لشکر کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ میدان میں جم کر لڑ سکے، چنانچہ وہ قصریانہ میں محصور ہو گیا، اسلامی لشکر نے دامن کوہ میں مکانات تعمیر کر لئے، وہیں بود و باش اختیار کر لی، خاندان اغلبیہ کے سکّے ڈھال لئے، اور سرزمین صقلیہ پر فرماں روائی کی طرح ڈال دی! ساتھ ہی ساتھ جھڑپوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

قصریانہ کی مہم ابھی اتمام کو نہیں پہنچی تھی کہ ۲۱۲ھ میں محمد بن ابی الجواری کا انتقال ہو گیا۔

المناک سانحہ یہ بہت بڑا سانحہ تھا، قاضی اسد بن فرات کا غم ابھی تازہ تھا کہ یہ اور دوسرا صدمہ پہنچا،

امیر محمد کے بعد اسلامی لشکر کی نگاہ انتخاب زہیر بن عوث پر پڑی، یہ ایک تجربہ کار افسر تھا، لیکن اس کے امارت کے منصب پر فائز ہوتے ہی حالات نے پلٹا کھایا، بزنطینی سپہ سالار، اسلامی لشکر کی صورت حالات سے پوری طور پر واقف تھا، وہ چالاکی کے ساتھ قصریانہ سے باہر نکل آیا، اور اسلامی لشکر کے پس پشت پڑاؤ کیا، جنگ ہوئی، اور زبردست رن پڑا، لیکن حالات اتنے بدل چکے تھے کہ بہترین سعی و کوشش بھی کارگر نہیں ہوئی، اسلامی لشکر کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، ایک ہزار کے قریب فدایان اسلام نے میدان جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔

مجبور ہو کر مسلمان محصور ہو گئے، دشمن نے نہایت شدت کے ساتھ محاصرہ کیا، مسلمانوں کے پاس جتنا سامان رسد تھا، سب ختم ہو گیا۔ کمک کسی طرف سے نہ پہنچ سکی، پھر بھی انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے، اطاعت نہیں قبول کی، دشمن سے امان نہیں طلب کی، وہ ایک نیک مقصد لے کر گھر سے نکلے تھے، انہیں اس راستہ میں موت بھی اتنی ہی عزیز تھی جتنی زندگی۔

ایک ایک کر کے اسلامی مقبوضات پر رومی قابض ہو گئے تھے، مسلمانوں نے ایک دوسرے مقام مینائو میں پناہ لی، لیکن یہاں بھی انہیں عافیت نہ حاصل ہوئی، دشمن پیچھے پیچھے آیا، اور اس نے شدت سے محاصرہ کر لیا۔

خدا کی قدرت عین اس وقت جب آس ٹوٹ چکی تھی، اور یاس کا غلبہ تھا، مسلمانوں کے چہرے اترے ہوئے تھے، اور دشمن کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، حالات نے پھر پلٹا کھایا، مسلمانوں کو دوہری کمک حاصل ہو گئی۔

ایک اندلس کا بیڑہ تھا دوسری زیادۃ اللہ کی بھیجی ہوئی فوج خلف موج تھی۔ یہ بیڑہ فرمانروائے اندلس عبد الرحمٰن ثانی کا بھیجا ہوا تھا، ابن عذاری نے اس کے جہازوں کی تعداد تین سو لکھی تھی، اس کا

امیر البحر اصبغ بن وکیل تھا، جو فرغلوش کے نام سے معروف تھا۔ بیڑا جمادی الآخر ۲۱۵ھ / ۸۳۰ء میں صقلیہ پہنچا، اسی زمانہ میں زیادۃ اللہ کی کمک بھی پہنچی جو بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی،

اب مسلمانوں نے پسپائی کے بجائے ہجوم و اقدام کا سلسلہ شروع کر دیا، انہوں نے نہ صرف مفتوحہ مقامات واپس لے لئے بلکہ نئے نئے مقامات فتح کرنے لگے، ان معرکوں میں غلولیہ کی فتح خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن فتوحات کا یہ سیل رواں یہاں پہنچکر رک گیا، کیونکہ پھر وبا پھوٹ پڑی، سالار فوج اصبغ بن وکیل بھی بیمار پڑے اور فوت ہو گئے۔

لیکن فتوحات کا یہ سلسلہ صرف عارضی طور پر رکا تھا، مسلمانوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا، اور صقلیہ کے بہت بڑے شہر اور بندرگاہ بلرم پر قبضہ کر لیا۔

بلرم کا ایک عرصۂ دراز تک مسلمانوں نے محاصرہ جاری رکھا، آخر دشمن نے امان طلب کی، شرط امان یہ تھی کہ بلرم کا گورنر مع اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کے جہاں چاہے چلا جائے، یہی رعایت فوج اور سا لیانِ شہر کو بھی دی گئی، کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا، عام اجازت تھی جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے۔

صقلیہ پر اسلامی پرچم
مسلمانوں کی جہانداری کے دلکش مناظر

بلرم کی فتح نے صقلیہ کو مستقل طور پر مسلمانوں کے زیر نگیں کر دیا، یہاں سے فوجی کارروائی کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، اور مملکت و سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے۔

فتح بلرم کے بعد زیادۃ اللہ نے اپنے بھتیجے اور خاندان اغلبیہ کے ایک نونہال، محمد بن عبداللہ بن الاغلب کو صقلیہ کا نائب السلطان بنا کر بھیجا، محمد بن عبداللہ ۲۱۷ھ کے آغاز میں صقلیہ پہنچ گیا۔ جو بظاہر نائب السلطان تھا لیکن حقیقتاً فرماں روا تھا، اس نے اپنا دارالحکومت بلرم ہی کو قرار دیا۔

مسٹر اسکاٹ کا بیان ہے کہ:۔

"مسلمانوں نے اپنی رسم کے مطابق ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے الگ الگ محلے مخصوص کرائے اور مختلف قسم کی تجارت کے لئے بازار جدا جدا کر دیئے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ پلرمو (بلرم) یورپ کا شہر نہیں ایشیا کا ہے، اٹلی اور یونانی بے ڈھنگے اور بدصورت لباس کی جگہ عمامے نظر آنے لگے، حرم سراؤں کی برقعہ پوش خواتین پرتکلف لباس پہنے خواجہ سراؤں کے ساتھ بازاروں میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں یا جھروکوں میں سے سرمگیں آنکھوں سے جھانکتی نظر آتی تھیں، ہر جگہ نہریں، فوارے، پل پھیل گئے کھجوروں کے درخت اتنے بڑھ گئے، کہ پلرمو کے مضافات وادئ نیل و فرات کی تصویر بن گئے۔ (شاندار) مکانات و محلات کو دیکھ کر دمشق و اشبیلیہ یاد آجاتے تھے۔ چند ماہ کے قبضے کے بعد یہ معلوم ہوتا تھا کہ پلرمو ہمیشہ سے مسلمانوں کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔ یہاں ایک ایسی سلطنت کی داغ بیل پڑی جس سے زمانۂ آئندہ میں دنیائے مسیحی کی سب سے بڑی سلطنتوں کی تہذیب متاثر اور مستفیض ہونے والی تھی ۔۔۔"

قصریانہ کا محاصرہ

محمد بن عبداللہ نے دو سال کی مدت نظم ونسق کو درست کرنے میں صرف کی، اور اس اثنا میں اپنے مقبوضہ مقامات کو گلزار بنا دیا۔

قصریانہ اب تک رومیوں کے قبضہ میں تھا، وہاں کے بے پناہ استحکامات پر رومی بالکل مطمئن تھے لیکن محمد بن عبداللہ نے پہلا کام یہی کیا کہ ۲۱۹ھ میں قصریانہ کا محاصرہ کر لیا،

محاصرہ کا یہ سلسلہ ایک عرصۂ دراز تک جاری رہا، کبھی کبھی محاصرہ اٹھا بھی لیا جاتا۔ پھر حالات دیکھ کر جاری کر دیا جاتا، آخر ۲۲۲ھ میں ابو الاغلب کے دور ولایت میں مسلمانوں نے مکمل طور پر اس شہر پر قبضہ کر لیا، یہ قبضہ بڑی خونریز جنگ کے بعد ہوا، اس معرکہ میں رومیوں کی قوت وشوکت کا جنازہ نکل گیا، رومی آخری اور فیصلہ کن جنگ کے لئے میدان میں اترے تھے، فوج بے شمار سامان جنگ وافر، رسد کی افراط، غرض کوئی دنیوی سہولت ایسی نہ تھی جو انہیں حاصل نہ ہو لیکن رومی مسلمانوں کے جوش اور عزم کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے، بُری طرح شکست کھائی، سارا سامان جنگ، سامان عیش وطرب سامان رسد، دولت ومال، مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور وہ کامیاب وکامران مال غنیمت سے لدے پھندے اپنے دارالحکومت بلرم واپس آ گئے۔

اس کے بعد بعض حالات ایسے پیش آئے کہ محمد بن عبداللہ ولایت صقلیہ سے دستبردار ہو گیا، اور اس کی جانشینی اس کے حقیقی بھائی، ابو الاغلب، ابراہیم بن عبداللہ بن الاغلب کے حصہ میں آئی۔

ابوالاغلب کا دورِ حکومت

شاندار ـــــــ یادگار

آخر ۲۲۱ھ میں ابوالاغلب افریقہ سے صقلیہ آیا، یہ محمد بن عبداللہ کی طرح نائب السلطنت نہیں تھا بلکہ خود مختار فرماں روا کی حیثیت سے آیا تھا،

بحری طاقت کی طرف توجہ اس نے صقلیہ میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے بحری طاقت کو مضبوط بنانے کی طرف توجہ کی، صقلیہ خود ایک جزیرہ تھا، آس پاس ہی متعدد جزائر تھے، بحری قزاقوں نے بھی آفت مچا رکھی تھی، ابواغلب نے سوچا اگر حکومت صقلیہ کی بحری طاقت مضبوط و مستحکم نہ ہوئی، تو یہ حکومت ہرگز قائم نہیں رہ سکے گی، اور مسلمانوں کا جاہ و حشم ختم ہو جائے گا،

بہت جلد ابواغلب نے اپنا ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کر لیا اور اس بیڑے سے پہلا کام یہ لیا کہ بحری قزاقوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی، اس نے ان لٹیروں کا تمام و کمال استیصال کر دیا۔

پھر ارد گرد کے جزائر پر توجہ کی اور ان پر کامیابی کے ساتھ قبضہ کر لیا، یہاں بھی رومیوں کو شکست کھاتے ہی بن پڑی۔ رفتہ رفتہ بحر روم پر اسلامی بیڑے کا استیلا قائم ہو گیا۔

قوصرہ کا کامیاب محاصرہ بھی ابواغلب ہی کے دور کی یادگار ہے۔

کوہ آتنا جو اٹلی کا مشہور آتش فشاں پہاڑ ہے) کے نواح میں متعدد قلعوں پر قبضہ کیا، کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔

دور فتوحات بیزنطی بیڑے اور اسلامی بیڑے میں متعدد معرکے ہوئے، پلہ مسلمانوں ہی کا بھاری رہا، جنوبی اٹلی کے شمالی ساحل کا نہایت مشہور شہر برنڈزی اور دوسرا بہت بڑا ساحلی شہر باری، بھی اسلامی علم کے زیر سایہ آگیا۔

بعدازاں اطالیہ (اٹلی) کے متعدد شہروں اور جزیرے پر مسلمان قابض ہو گئے۔ متعدد نو آبادیاں قائم کیں، ان فتوحات کا دور ۲۲۵ھ تک قائم رہا۔

۲۲۶ھ میں نوبت یہ پہنچی کہ بقول مسٹر اسکاٹ صقلیہ کا دو تہائی حصہ عربوں کے قبضہ میں آ گیا نیپلس کی حکومت سے معاہدۂ صلح ہوا، دونوں فریقوں نے اس معاہدہ کو شرافت کے ساتھ نباہا۔ مسلمانوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ وہ ایک طرف اٹلی کے صوبوں اور شہروں پر یلغار کر رہے تھے، دوسری طرف بحر اڈریاٹک کے ساحلی مقامات پر اپنا پھریرا لہرا رہے تھے، اٹلی کے مشرقی صوبوں پر کامیاب یلغار کے بعد وہ ڈلماشیا آسٹریا کے ساحل پر پہنچے اور یہاں انہوں نے ایک تہلکہ مچا دیا، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، جزائر برٹان پر بھی ان کی نظریں پڑنے لگیں، اور وہاں بھی ان کے فوجی دستے تاخت و تاراج کے لئے پہنچنے لگے،

اسکاٹ کا بیان و اعتراف

ان فتحمندیوں اور کامرانیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مسٹر اسکاٹ فرماتے ہیں :-

"مصر، اندلس، اور افریقہ سے جو صقلیہ کی تجارت بڑھی تو یہ معلوم ہوا کہ اس جزیرے کے دن پھرنے والے ہیں، اس قلیل مدت میں حکومت صقلیہ کے رعب داب میں بھی اتنا اضافہ ہو گیا کہ اس کے قدیم اور قدرتی دشمن والیان آمڑ و آبنات مسینا نے بڑی خوشامد سے ان کا حلیف بننے کی خواہش کی،

ابوالاغلب کے عہد کا ایک اور بہت بڑا، اور شاندار کارنامہ آبنائے مینا کی فتح ہے۔ یہ ساحل، یورپ اور افریقہ کی تجارت کا نقطۂ اتصال تھا۔ اس لئے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی" اس لئے رومی اس کے استحکام و دفاع پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ساحل پر ان کے جہازوں کا مکمل طور مسلح بیڑا، موجود تھا، تین طرف بلند و بالا پہاڑوں نے محاصرہ کر رکھا تھا، اندرون شہر میں، فوجی استحکامات پر اتنی زیادہ توجہ کی گئی تھی کہ بجا طور پر اسے ناقابل تسخیر سمجھ لیا گیا تھا۔

مسلمان ان مشکلات و موانع سے خوب واقف تھے، لیکن ان کے حوصلے بلند تھے، ان کے

عزائم میں کوئی فرق نہیں آیا، فضل بن جعفر ہمدانی کی سرکردگی میں حملہ ہوا، اور سخت خوں ریز جنگ کے بعد۔ یہاں مسلمانوں کا پرچم لہرانے لگا، مسلمانوں کی جنگی چال نے فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا مسلمانوں نے اپنی پوری فوجی قوت کے ساتھ جنگ جاری رکھی، رومی بھی بڑے زور شور سے لڑتے رہے مسلمانوں نے اپنے ایک فوجی دستے کو، حکم دیا کہ وہ چپکے چپکے عقب سے پہاڑ پر چڑھیں، اور وہاں سے شہر میں داخل ہو جائیں، عین اس وقت جب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، یہ دستہ عقب سے پہاڑیوں کی چڑھائی طے کرتا ہوا شہر میں پہنچا، اور نعرہ اللہ اکبر بلند کر کے شہر پر حملہ آور ہوا، اہل شہر میں سراسیگی پیدا ہو گئی، ادھر رومی فوجوں نے جب یہ سنا کہ مسلمان شہر میں گھس آئے، ان پر بھی دہشت، اور سراسیگی کی کیفیت طاری ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کی ایک نہ چلی، انہیں ہار ماننی پڑی، انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، اور جس دشمن کا قلع قمع کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترے تھے، اس کی اطاعت کا حلف اٹھانے اور ان سے امان طلب کرنے لگے۔

بینا کے سقوط نے رومیوں کے چھکے چھڑا دیئے، اور مسلمانوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی امنگ اور ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا۔ بینا بہت بڑا جنگی اور مرکزی شہر تھا۔ ۲۳۲ھ میں عربوں نے بینا فتح کر لیا جس سے وہ اطالیا اور صقلیہ کے درمیانی راستے پر کھڑے ہو گئے تھے!

ٹرنٹو پر قبضہ اس معرکہ کے سر کرنے کے بعد مسلمانوں نے اپنی فوجی پیش قدمی کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔

ایک حصہ فضل بن جعفر ہمدانی کی سرکردگی میں شمال کی طرف ترکتازیاں کرنے لگا، اور دوسرا ابو اغلب کی زیر ہدایت جنوبی حصہ کو اپنی جولانگاہ بنائے ہوئے تھا۔

۲۳۰ھ میں اٹلی کے شہر طارنت پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا، ۲۳۲ھ میں یہاں ایک مستقل اسلامی نوآبادی قائم کر دی۔

روم پر یلغار اسی زمانہ میں مجاہدین کی ایک ایسی جماعت نے جو "فری لانسر" تھی، جس کا تعلق نہ حکومت اغلبیہ سے تھا، نہ حکومت مصر سے اٹلی پر تاخت و تاراج

ہجوم و اقدام اور یورش و یلغار کا بے پناہ سلسلہ شروع کر دیا، اور باری کو اپنا صدر مقام بنا لیا، اور یہاں چھوٹی سی اسلامی حکومت قائم کر لی، البدین حکومت مصر کے توسط سے خلافت بغداد سے پروانۂ فرمانروائی حاصل کر لیا۔

اس جماعت نے اٹلی کے متعدد قلعوں، بستیوں، قصبوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا، یہاں تک کہ مجاہدین کے ایک گروہ نے شہر روم پر حملہ کیا، سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے گرجوں کو لوٹا اور کئی دوسرے مزاحم شہروں پر یورش کر کے انہیں تہس نہس کر دیا۔

مسٹر اسکاٹ نے اپنے قلم سے اس حادثہ پر یوں ماتم کیا ہے کہ

"اگر روم پر مسلمان قبضہ کر لیتے تو وہ مقام جو آج مذہب مسیحی کا مرکز بنا ہوا ہے مؤذنوں کی اذان سے گونجتا ہوتا۔ وہاں کے گرجاؤں میں عشائے ربانی کے بجائے مسلمانوں کی نماز ہوتی"

سنہ ۲۴۳ھ میں مسلمانوں نے ایک اور بہت بڑے شہر لینتی پر جو تجارتی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ قبضہ کر لیا۔ پھر ایک دوسرا شہر بغرس بھی ان کے قبضہ میں آگیا۔

رجب سنہ ۲۳۶ھ میں ابوالاغلب نے وفات پائی،

نیا ماحول

نیا تاج دار ــــــ نیا دور

ابوالاغلب کی وفات کے بعد مسلمانان صقلیہ کی مجلس شوریٰ نے عباس بن فضل کو اپنا والی بنالیا عباس نے سب سے زیادہ توجہ اپنے وورِ ولایت میں فتوحات پر مرکوز رکھی۔

دشمن کی مرعوبیت

سنہ ۲۴۱ھ میں اس نے قلعہ ابی ثور پر قبضہ کرلیا، کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا، پھر اس نے قصریانہ پر توجہ کی، قصریانہ اگرچہ فتح نہ ہوسکا لیکن مسلمانوں کے محاصرہ سے اسے شدید نقصان پہنچا رومی فوجوں نے محاصرہ کی شدت برداشت کرلی، لیکن یہ ہمت نہ پڑی کہ سامنے میدان میں آئیں،

عباس نے متعدد فوجی ٹکڑیوں کی متعدد اور مختلف مقامات پر یورش اور یلغار کے لئے بھیجا، ان میں سے اکثر کو کامیابی ہوئی، ہر جگہ میں رومی فوجوں کو سخت و شدید نقصان اٹھانا پڑا، اس کے عہد میں فوجی پیش قدمیوں کا سلسلہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ اس سے مسلمانوں کی ہیبت اور دہشت دلوں پر قائم ہوگئی۔

زبردست بحری لڑائی

سنہ ۲۴۲ھ میں خود عباس بلرم سے باہر نکلا اور دشمن کے متعدد مضبوط اور مستحکم قلعوں پر قبضہ کرلیا،

سنہ ۲۴۳ھ میں اس نے قصر جدید نامی ایک مقام پر بڑی سخت کشمکش اور جد و جہد کے بعد قبضہ کرلیا، یہاں بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور بہت سے قیدی دستیاب ہوئے۔

سنہ ۲۴۴ھ میں بحرِ روم میں ایک رومی بیڑہ مقابلہ کے لئے پہنچا، اسلامی بیڑہ پہلے سے تیار تھا زوردار لڑائی ہوئی آخرکار رومی بیڑے کو شکست ہوئی، رومیوں کے دس جہاز مع سواروں کے گرفتار کرلئے گئے۔

یادگار فتح

قصریانہ، رومیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہ صقلیہ کا پایہ تخت بھی تھا، یہاں مال و دولت کی افراط تھی، سامانِ تجارت بھرا ہوا تھا، ہیروں اور قیمتی پتھروں کے خزانے بھرے ہوئے تھے، روم کے شاہی خاندان کے بہت سے شاہزادے، اور شاہزادیاں اپنی املاک و جائداد، زر و مال کے ساتھ یہاں موجود تھیں۔

مسلمانوں نے متعدد بار قصریانہ پر حملہ کیا، محاصرہ کیا، یورش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اس لئے کہ یہاں کے استحکامات ناقابلِ تسخیر تھے۔ یہاں کے جنگی مورچے بڑے زبردست تھے، یہاں کی فصیلوں کو پار کرنا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایک رومی کی مدد سے یہ ناقابلِ تسخیر مورچہ سر ہو گیا، خود والی صقلیہ عباس نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر پوشیدہ راستہ سے اپنی فوجی مہم قصریانہ کے اندر پہنچا دی، موسم سخت تھا، جاڑے کی شدت تھی، کہر پڑ رہا تھا، رومی مطمئن تھے کہ مسلمان کسی طرف سے نہیں آ سکتے لیکن وہ تمام خطرات و مہالک کا مقابلہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں پورے اطمینان کے ساتھ دروازے پر پہنچ گئے، انہوں نے تلوار کی نوک سے دروازہ کھولا، اور اپنی فوج سمیت اچانک شہر میں داخل ہو گئے، بطارقہ اور فوج نے مقابلہ کیا، ڈٹ کے مقابلہ کیا، کشتوں کے پشتے لگ گئے، لیکن اب اسلامی لشکر کو پسپا نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ یہاں جانے کے لئے نہیں آیا تھا، وہ آیا کامیاب ہوا، اور آن کی آن میں اس نے سارے شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۵ شوال سنہ ۲۴۴ھ کا ہے۔

رومیوں کا سارا خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اس خزانہ کی دولت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ دولت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ صقلیہ کے بہت سے دولت مند اور اصحاب ثروت مسلمانوں کے خوف سے یہاں کے استحکام سے مطمئن ہو کر اپنی دولت سمیت یہاں آکر بس گئے تھے۔

مسلمانوں نے اس عظیم الشان فتح پر سجدۂ شکر ادا کیا۔

صقلیہ کی حکومت، نہ افریقیہ کے ماتحت تھی، نہ مصر کے، نہ خلافت بغداد کے، لیکن اس کثیر مال غنیمت میں سے ایک مقدار تحفہ کی صورت میں المتوکل باللہ خلیفۂ وقت کی خدمت میں، کنیزوں

اور غلاموں کے ایک گروہ کے ساتھ بھیج دیا گیا۔

فتح قصریانہ کے بعد جس جگہ مسلمانوں نے سجدۂ شکر ادا کیا تھا۔ وہیں ایک شاندار جامع مسجد کی تعمیر و تاسیس کا کام خدا کا نام لے کر شروع کر دیا۔

سقوط قصریانہ کے بعد

قصریانہ کے سقوط کے بعد رومیوں نے سرقوسہ کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا قسطنطنیہ کی رومی حکومت اب تک مسلمانوں کے ہجوم و اقدام کو روکنے کی مقدار بھر کوشش کر رہی تھی، لیکن قصریانہ کی فتح نے رومیوں میں ایک تہلکہ سا پیدا کر دیا۔ اب رومیوں نے طے کر لیا کہ سر دھڑ کی بازی لگا کر وہ مسلمانوں سے ان کے مقبوضات چھین لیں گے۔ اگر ان کا نام و نشان نہ مٹا سکے تو کم از کم انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیں گے، کہ وہ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں۔

قسطنطنیہ کی بزنطی حکومت نے تین سو جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑہ مدد کے لئے بھیجا، جو سرقوسہ کے ساحل پر آکر لنگر انداز ہوا۔

عباس کی اولوالعزمی نے اس بیڑے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس بیڑے کے آنے سے سرقوسہ کے رومیوں کو آس ہو گئی تھی کہ وہ اب بچ جائیں گے، اور پورے طور سے انتقام لے کر مسلمانوں کا استیصال کر سکیں گے لیکن عباس کی حوصلہ مندیوں نے ان کی آس کو یاس سے بدل دیا۔

اس معرکہ میں رومی بیڑہ بالکل تباہ ہو گیا، سو جہاز مسلمانوں نے گرفتار کر لئے، بہت سے رومی گرفتار ہو گئے، بہت سے جہاز تباہ ہو کر غرق ہو گئے۔ باقی ماندہ رومی جو ڈوبنے اور ہلاک ہونے سے بچ رہے، روتے پیٹتے با حال تباہ قسطنطنیہ واپس چلے گئے۔

بغاوت

مسلمانوں کے ان فتوحات نے ان کے پاؤں جما دیئے بہت سے قلعے ایسے تھے، جنہوں نے مجبور ہو کر امان طلب کی تھی اور مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہ جب مسلمانوں کو دوسری طرف متوجہ اور مصروف و مشغول دیکھتے تھے، تو علم بغاوت بلند کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیتے تھے، عباس کے پیش روؤں نے اور خود عباس نے پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ان باغیوں اور

موقعہ پرستوں کی سرکوبی کا سلسلہ بھی پوری شان و استقلال کے ساتھ جاری رکھا،

۲۴۶ھ میں جو پیش قدمیاں ہوئیں، ان میں بھی متعدد قلعوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا،

بیزنطی حکومت کی شرمندگی

بیزنطی حکومت نے اپنے بیڑے کی شکست سے شرمندہ ہو کر فوراً ہی ایک دوسرا بیڑہ پہلے سے زیادہ ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا، عباس نے بڑی پامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ بھی کیا اور بالآخر یہ بھی شکست کھا کر اور بے اندازہ نقصان اٹھا کر، رو بہ فرار ہوا۔

۲۴۷ھ کے وسط میں عباس کا انتقال ہو گیا۔

اس کا چچا احمد بن یعقوب والی منتخب کیا گیا۔ لیکن اس سے اور عباس کے بیٹے عبداللہ سے نہ بنی، چنانچہ یہ دست بردار ہو گیا اور عبداللہ بن عباس نے ولایت کی مسند پر قبضہ کر لیا، یہ اگرچہ اپنے باپ کی طرح اولوالعزم اور فوج کشی کا دلدادہ تھا، لیکن پانچ ماہ سے زیادہ یہ بھی برسر اقتدار نہ رہا، اور خاندان اغلبیہ کا ایک دوسرا فرد خفاجہ بن سفیان منصب ولایت پر فائز ہوا۔

خفاجہ کے عہد میں بھی پیش قدمی کا سلسلہ جاری رہا، ۲۱۲ھ برقرار نہ رہ سکا، ۲۶۲ھ میں امیر قسطنطنیہ سے مقابلہ کے لئے نکلا، لیکن خفاجہ کے بیٹے نے اول بار ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

سرقوسہ پر خفاجہ نے حملہ کیا، اور محاصرہ کر لیا، لیکن طرح کم نہیں تھی، اس لئے ایک بہت بڑے ۲۵۵ھ میں ایک مسلمان سپاہی خلفون بن ابی زیاد ہمدانی نے ... ... کم تنہا دیا، اور فرار ہو کر سرقوسہ چلا گیا، وہاں عیسائیوں نے خوب اس کی آؤ بھگت کی۔

خفاجہ کے بعد اس کا بیٹا محمد باپ کا قائم مقام اور جانشین بنا، محمد ہر اعتبار سے اس منصب کا اہل تھا، وہ دلیر تھا، بہادر تھا، جنگجو تھا، بڑی بڑی مہمیں سر کر چکا تھا۔

مالٹا پر مسلمانوں کا قبضہ

۲۵۶ھ میں، محمد بن خفاجہ نے، رومیوں کو پسپا کر کے ان کے محاصرہ سے مالٹا کو آزاد کرا لیا، اب مالٹا مسلمانوں کے تصرف

میں پورے طور پر آیا، خود مالٹا کے باشندوں نے رومیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو پسند کیا، اور ان کے زیر سایہ عافیت آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے۔

مسلمانوں نے داخلی طور پر اہل مالٹا کو پوری آزادی دے دی تھی، البتہ مرکزی طور پر، مالٹا صقلیہ کی اسلامی حکومت کا ایک جزو بن گیا۔

رجب ۲۵۷ھ میں محمد بن خفاجہ کو اس کے خواجہ سرا نے قتل کر دیا، اس کے بعد اہل لشکر کی مرضی سے، رباح بن یعقوب کو اپنا والی بنا لیا۔ محرم ۲۵۸ھ میں رباح نے انتقال کیا، اس کا جانشین اس کا لڑکا حسین بن رباح بنا۔

ان بے نظمیوں سے عیسائیوں نے فائدہ اٹھایا، اور باری اور سلرنو کو مسلمانوں سے چھین لیا۔

۲۵۹ھ میں حسین بن رباح معزول ہو گیا اور اس کی جگہ ابو مالک اس منصب پر سرفراز ہوا۔

رومی بیڑے کی آمد

ایک اور بڑا رومی

لیے آرہا ہے۔

موقعہ بر

شاندار دور

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ابو مالک کا عرف "حبشی" تھا، اس کا خاندان بھی افریقہ کے مستقل فرمانروا خاندان اغالبہ سے متعلق تھا، اس کی شخصیت افریقہ میں مانی ہوئی تھی، اسی لئے اس منصب پر یہ فائز کیا گیا۔

۲۶۱ھ میں افریقہ کی حکومت ابراہیم ثانی کے ہاتھ میں آئی، یہ بڑا اولوالعزم اور بیدار مغز فرمانروا ثابت ہوا، اس نے نہ صرف، افریقہ کی حکومت اسلامیہ کو مضبوط و مستحکم کیا، بلکہ صقلیہ کے ولاۃ کی بھی ہر طرح حوصلہ افزائی اور امداد و اعانت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دور میں صقلیہ کے حدود میں زیادہ سے زیادہ توسیع عمل میں آئی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ صقلیہ اپنے سارے حدود و ملحقات کے ساتھ، اسلامی علم کے زیر سایہ آگیا۔

ابو مالک نے اگرچہ کامیاب فوجی پیش قدمیوں کا سلسلہ منصب ولایت پر متمکن ہوتے ہی شروع کر دیا تھا، لیکن وہ اپنے منصب پر زیادہ عرصہ تک قائم اور برقرار نہ رہ سکا، ۲۶۴ھ میں امیر جعفر بن محمد افریقہ سے آیا اور اس نے اس منصب کی گراں بار ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

اس کی اولوالعزمی بھی اپنے پیش رووں سے کسی طرح کم نہیں تھی، اس لئے ایک بہت بڑے مہم کا بیڑہ اٹھایا، اگرچہ اس کام کی تکمیل اس کے ہاتھوں مقدر نہیں تھی، لیکن آغاز بھی کچھ کم شاندار نہ تھا۔

سرقوسہ کا شاندار محاصرہ | ابو جعفر نے متعدد رومی مقبوضات پر پیش قدمیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور بے مقدار وافر مال غنیمت حاصل کیا، رسد کا بھی بڑا ذخیرہ فراہم کر لیا، اور اپنے فوجی انتظامات کی طرف سے مطمئن ہو کر ایک بہت بڑا لشکر لے کر سرقوسہ کی طرف بڑھا، یہ بھی رومیوں کا سب سے بڑا فوجی مرکز تھا، اگر یہاں سے

ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے جاتے، تو پھر صقلیہ میں بے غل و غش مسلمان حکومت کر سکتے تھے، ابو جعفر کے پیش نظر یہی بات تھی۔

ابو جعفر نے سرقوسہ کا محاصرہ کر لیا، اس نے اس مرتبہ مسلمان انجنیروں اور فن کاروں کی ذہنی اور دماغی صلاحیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس نے منجنیقوں میں اصلاح کی، اب تک منجنیق سے جو چیزیں دشمن کے لشکر پر پھینکی جاتی تھیں، ان کے نشانے کچھ ہو تے تھے، لیکن یہ خط مستقیم پر گرنے لگے۔ اس کے علاوہ اور طرح طرح کے نوایجاد ہتھیار اور اوزار بھی اس لشکر میں لائے گئے۔ دشمن بھی پورے طور پر چوکس تھا، اسلامی لشکر شہر کی بیرونی آبادی سے ہٹ کر اندرون شہر میں پسپا ہو گیا، مسلمانوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا، اور فصیل سے باہر جانے کے شہری حصہ پر اس کے شاندار مکانات اور محلات پر قبضہ کر کے محاصرہ کا کام شروع کر دیا۔

بلرم سے مسلمانوں کا جو لشکر چلا تھا، وہ بحری اور بری دونوں قسم کی فوجوں پر مشتمل تھا، بحری فوجوں سے بحری راستوں کی مکمل ناکہ بندی کر لی، اور بری فوجوں نے خشکی کے راستوں کو اپنی نظر میں رکھا،

رومی بیڑے کی آمد اسی اثناء میں کہ محاصرہ جاری تھا، اطلاع ملی کہ قسطنطنیہ سے بہت بڑا رومی بیڑا اہالیان سرقوسہ کی حفاظت اور مسلمانان صقلیہ کی سرکوبی کے لیئے آ رہا ہے۔

اس خبر نے ایک طرف سرقوسہ کے رومی محصورین پر وجد کی کیفیت طاری کر دی، مسلمانوں کے محاصرہ سے وہ بڑی سخت مصیبت میں گھر گئے تھے، دوسری طرف مسلمانوں کے لئے یہ ایک کٹھن گھڑی تھی، انہیں محاصرہ بھی قائم رکھنا تھا، اور قسطنطنیہ کے بیڑے سے جو بجائے خود بہت بڑی طاقت تھا، برابر کا مقابلہ کرنا تھا۔

مسلمانوں کا کارنامہ لیکن مسلمان ان حالات سے ہراساں نہیں ہوئے، انہوں نے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ دونوں کام جاری رکھے، قسطنطنیہ کے بیڑے کو

زبردست شکست ہوئی، اس کی شکست کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سارے بیزنطی جہاز مسلمانوں نے گرفتار کر لئے۔

ایک انقلاب اب نہایت اطمینان کے ساتھ مسلمانوں نے محاصرہ اور زیادہ شدومد کے ساتھ جاری کر دیا۔

لیکن اسی اثنا میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا، جعفر لشکر کو محاصرہ کی حالت میں چھوڑ کر کسی ضرورت سے بلرم واپس آیا، یہاں اس کے غلاموں نے اسے قتل کر دیا، قتل کے بعد ۲۶۴ھ میں ایک محبوس اغلبی شہزادے اغلب بن محمد نے حکومت پر قبضہ کر لیا، عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے سرقوسہ کے محاصرہ کو خود اپنی کمان میں لے لیا، اور اپنے بیٹے احمد کو ایک بڑے لشکر کی کمان دے کر وہاں بھیج دیا۔

سرقوسہ کے رومی عیسائی پورے طور پر مقابلہ کے لئے تیار تھے، انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید!

شہر کی غیر مصافی آبادی کا بہت بڑا حصہ یہاں سے منتقل ہو گیا تھا، سارا شہر ایک بہت بڑی فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو گیا تھا، جو راہب یہاں رہ گئے تھے، وہ بھی اس لئے تھے کہ میدان جنگ میں لڑیں اور داد شجاعت دیں، جو ننیں یہاں مقیم تھیں وہ بھی اس لئے کہ مجاہد عیسائیوں کی حکومت اور چاکری کریں، پادری دعاؤں میں مصروف تھے، ننیں بھی فضا میں دست دعا بلند کئے ہوئے تھیں، یہ جنگ مذہبی جنگ بن گئی تھی، پادریوں نے سب کے دل پر یہ بات نقش کر دی تھی کہ خدا کے لئے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے، جو اس میں زخمی ہوگا، وہ ثواب کی دولت لوٹے گا، جو اس میں قتل ہوگا، حوریں اس کا استقبال کریں گی، جو زندہ رہ کر کامیاب و سرخرو ہوگا، وہ دولتِ دنیا سے مالا مال ہوگا، پادریوں کی اس یقین دلانی نے ایک ایک بچے میں مر مٹنے اور کٹ مرنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں عیسائی اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ اگر انہیں شکست ہوئی تو پھر اس علاقہ کا ایک ایک چپہ مسلمانوں کے زیرنگیں ہو جائے گا، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے اقتدار سے محروم ہو جائیں گے، قسطنطنیہ کی بیزنطی حکومت بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر یہ مرکز اس کے ہاتھ سے نکل

گیا تو کہیں ہس کا نقل پیش نہیں لگے گا اور قسطنطین اعظم کے تخت کبریائی کا مقابلہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

گھمسان کا رن مسلمانوں نے اس شدت کا محاصرہ کیا کہ باہر سے کسی چیز کا پہنچنا ناممکن ہو گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک گدھے کا کلہ بیس بیس اشرفیوں میں بکنے لگا، اور انتہا یہ ہوئی کہ محصورین نے اپنے مقتول عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کی ہڈیاں تک چبانا شروع کر دیں۔

مسلمانوں کا محاصرہ، اور محاصرہ کے ساتھ حملہ کا سلسلہ جاری تھا نو ماہ تک یہ محاصرہ جاری رہا محصورین نے بڑی ہمت اور استقلال سے مقابلہ کیا۔ جب مسلمانوں کے حملہ سے فصیل ٹوٹی تو یہ لوگ ذہر میں بجھی ہوئی تلواریں لے کر میدان میں کود پڑے مسلمان بھی تلواریں سونت کر شہر میں داخل ہو گئے، عیسائیوں میں سر مٹنے کا جو جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اس کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شرف شہادت حاصل کرنے کے لئے عیسائی سپاہیوں نے بہ آواز بلند آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینا شروع کر دیں مسلمان عام طور پر مفتوحہ مقامات کے باشندوں کو امان دینے کے عادی تھے، کچھ اس لئے کہ سرقوسہ میں جنگ آزماؤں کی غیر معمولی کثرت تھی، اور کچھ اس سب وشتم کے باعث انہوں نے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، نتیجہ یہ ہوا کہ چار ہزار کے قریب لوگ مقتول ہو گئے۔ بے اندازہ مال غنیمت حاصل ہوا، رمضان کے مبارک مہینہ میں (۲۶۴ھ) فتح سرقوسہ کا کام انجام کو پہنچا۔

یہاں کے فوجی استحکامات منہدم کر دیئے گئے، چونکہ یہاں عیسائی بالکل نہیں رہ گئے تھے، لہٰذا سارا شہر ویران ہو گیا، کچھ عرصہ تک اس کی یہی حالت رہی، لبعد میں مسلمان پھر آ کر یہاں بس گئے۔

قسطنطنیہ کی بیزنطی حکومت کے فرمانروا باسل نے پھر ایک بہت بڑا بیڑہ سرقوسہ کی واپسی کے لئے بھیجا، لیکن اسے بھی شکست وہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا چار جہاز جو سپاہیوں سے بھرے ہوئے تھے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے، باقی ماندہ جہاز بھاگ گئے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کن حالات میں بحری اور بری جنگ دشمن سے

دی، حالات خواہ کیسے ہی روح فرسا، ہمت شکن اور صعب و دشوار ہوں، لیکن جو لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں وہ کسی موقع پر بھی ہمت نہیں ہارتے وہ اپنی زندگی کو خدا کی امانت سمجھتے ہیں، اور خدا کی خوشنودی کے لئے کفن سر سے باندھ کر میدان میں آجاتے ہیں، اور نتیجہ صرف خدا پر چھوڑ دیتے ہیں ——— اور خدا انہیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔

دَورِ اختلال

بد نظمی ــــ بے رغبتی ــــ تعطل

سرقوسہ کا محاصرہ جب تک جاری رہا، اور وہاں کامل فتح نہیں حاصل ہو گئی، اس وقت تک نہ سلطانون نے، اغلب بن محمد کی خود ساختہ حکومت پر توجہ کی، نہ افریقیہ کی حکومت نے مداخلت کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس لئے کہ سب سے اہم کام یہ تھا کہ سرقوسہ کو دشمن کے ہاتھ سے لے لیا جائے اور وہاں سے اس کے آثار و نقوش مٹا دیئے جائیں۔

اس معرکہ میں کامیاب ہونے کے بعد اس خود ساختہ حکومت کی طرف توجہ کی گئی صقلیہ کے باشندوں نے یورش کر کے اغلب بن محمدؒ کو اور اس کے ساتھیوں کو، محرم ۲۶۵ھ میں گرفتار کر لیا، اور گرفتاری کے بعد یہ سب لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

لیکن اب اختلال و انتشار کی ایک عام کیفیت صقلیہ میں، اور خود افریقیہ میں بھی پیدا ہو گئی تھی اس لئے وہاں کا نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔

۲۶۵ھ میں ابوالاغلب صقلیہ کا والی ہو کر افریقیہ سے آیا، لیکن یہاں کے لوگ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا وہ افریقیہ واپس چلا گیا اور حسین بن رباح جو اس سے پہلے بھی ولایت صقلیہ کے منصب پر فائز رہ چکا تھا، پھر اس عہدہ پر مامور ہوا۔

حسین بن رباح نے پیش قدمیاں جاری رکھنے کی کوشش کی، لیکن کوئی خاص کامیابی اُسے نہیں ہوئی اس لئے کہ ہر طرف فتنہ و شورش کا بازار گرم تھا۔

حسین بن رباح کے عہد میں ایک مرتبہ پھر بزنطی بیڑہ قسطنطنیہ سے آیا، اسلامی بیڑے نے مقابلہ کیا لیکن غالب نہ آسکا، لیکن اس کے چند جہاز دشمن بیڑہ نے گرفتار کر لئے۔

۲۶۷ھ میں حسین بن رباح کی معزولی کے بعد حسن بن عباس نے ولایت کی ذمہ داریاں سنبھالیں،

پر بغیر کوئی کارنامہ دکھائے معزول ہوا، اس کے عہد میں رومیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور وہ مسلمانوں پر تاخت وتاراج کرنے لگے، ۲۶۸ھ ابوالحسین محمد بن فضل افریقیہ سے والی مقرر ہوکر آیا، یہ بلند حوصلہ انسان تھا، اس نے رومیوں کے جدید پایہ تخت طبرمین اور قطانیہ وغیرہ پر حملہ کیا، اور کامیاب رہا، اس اثناء میں رومیوں کے ایک لشکر جرار سے اسے نبرد آزما ہونا پڑا، یہ لشکر بھی مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا، تین ہزار لاشے چھوڑ کر میدان سے بھاگ کھڑا ہوا، قسطنطنیہ سے بیزنطی حکومت کا ایک بیڑہ پہنچا، اس نے شکست کھائی، اس جنگ کے بعد رومیوں کے جدید پایہ تخت کو مسلمانوں نے بالکل تہس نہس کردیا، یہ واقعہ ۲۶۹ھ کا ہے۔

۲۷۰ھ میں محمد بن فضل پھر اپنی فوجی تیاریاں مستحکم کررہا تھا کہ وہ معزول کردیا گیا، اور اس کی جگہ علی محمد بن، اور اس کے چند ماہ بعد حسین بن احمد کو یہ عہدہ ملا، شعبان ۲۷۱ھ میں اس نے وفات پائی پھر سوادہ بن محمد نے اس منصب پر قبضہ کیا، لیکن کامیاب یہ بھی نہ رہا، بلکہ ہوا یہ کہ اس کے عہد میں جنوبی افریقہ کے دو اسلامی شہروں ——— سبرینہ ——— اور منیتا پر پھر رومی قبضہ ہوگیا، اور وہاں بیزنطی علم لہرانے لگا، یہاں کے مسلمان صقلیہ آگئے، اور یہیں بس گئے۔

صقلیہ کے مسلمانوں نے اس والی کے خلاف بغاوت کرکے اسے گرفتار کرلیا، اور اس کی جگہ ابو مالک عرف حبشی نے حکومت ولایت سنبھال لی، ابو مالک اس سے پہلے بھی اس منصب پر فائز رہ چکا تھا، یہ واقعہ ۲۷۴ھ کا ہے۔

رومیوں کی حالت زار

ابو مالک نے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی، اس نے طبرمین، قطانیہ اور رمطہ وغیرہ پر فوجی مہمیں بھیجیں، جو مال غنیمت اور قیدیوں کو لے کر واپس آئیں، ۲۷۵ھ میں اس نے دوبارہ رومی علاقوں پر فوج کشی کی، اس معرکہ میں ۷ ہزار رومی ہلاک ہوئے، بحری معرکہ میں ۵ ہزار رومی سمندر کی سطح سے تہ میں پہنچ گئے۔

ابو مالک کے ان اقدامات نے رومیوں پر ایک دہشت طاری کردی، ابن عذاری کے بیان کے مطابق رومیوں نے بہت سے ایسے شہروں اور قلعوں کا انخلا کردیا، جو مسلمانوں کی سرحد کے قریب

واقع ہیں۔

ان کارناموں کا صلہ یہ ملا کہ ۲۸۲ھ میں ابومالک معزول کر دیا گیا، اور اس کی جگہ ابوالحسین محمد بن فضل والی مقرر ہوا۔ اس نے سوا تین سال کے لئے رومیوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا اس معاہدہ کی تحریک رومیوں سے ہوئی تھی، لیکن محمد بن فضل نے اسے خوشی خوشی اسلئے منظور کر لیا کہ اندرونی استقلال پر متوجہ ہو سکے لیکن اس کی یہ امید بر نہ آئی، حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اس کے سنبھالے سنبھل نہ سکے، وہ ۲۸۴ھ میں معزول ہوا، اور اس کی جگہ حسن بن احمد والی مقرر ہوا۔

اس کے دور میں عربوں اور بربروں میں نسلی اور قبائلی لڑائی چھڑ گئی، ۲۸۵ھ میں، یہ بھی معزول ہوا، اور سابق والی صقلیہ ابو مالک پھر بحال ہو گیا۔

لیکن بغاوت اور سرکشی کا فتنہ نہ دبا مسلمانوں کے دارالحکومت بلرم تک پھر باغی قابض ہو گئے ابو مالک بھاگ گیا ۲۸۷ھ میں خاندان اغالبہ کا ایک اور گل سرسبد ابوالعباس فرمان ولایت لیکر پہنچا ابوالعباس، بڑا جیالا، اور دلاور آدمی تھا، اس نے بڑی زبردست فوجی تیاریوں کے ساتھ باغیوں کا مقابلہ کیا، جن شہروں پر وہ قابض اور متصرف تھے، انہیں ان سے چھین لیا، بلرم بھی باغیوں کے قبضہ میں آ چکا تھا، اسے بھی واپس لے لیا، باغیوں کو عبرت انگیز سزائیں دیں، باغیوں کے کچھ سرغنہ بچ گئے ان میں سے بعض طبرمین جا کر رومیوں کے پاس پناہ گزیں ہوئے اور بعض قسطنطنیہ جا کر حکومت بزنطی کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرنے لگے۔

ابوالعباس نے اتنی سختی کے ساتھ باغیوں کی سرکوبی کی کہ اس کا رعب قائم ہو گیا، وہ جس مقصد عظیم کو لے کر آیا تھا اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوا، اس نے سارے صقلیہ میں امن و امان کی عام فضا پیدا کر دی، اگرچہ سخت خونریزی ہوئی مسلمانوں نے مسلمانوں کو قتل کیا، لیکن یہ مجبورانہ خونریزی تھی، اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار ہی نہیں رہ گیا تھا، وہ جانتا تھا - الفتنة اشد من القتل

——— اور فتنہ جب ابھرتا ہے تو پھر اس وقت تک فرو نہیں ہوتا جب تک کچل نہ دیا جائے، ہماری بہت سی کوتاہیوں اور بدبختیوں کا راز صرف

یہ ہے کہ فتنہ کی اہمیت کا وقت پر ہم نے اندازہ نہیں لگایا، اور جب اس کی شدت محسوس
کی تو وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ حالانکہ اگر بروقت اس کا انسداد کر دیا گیا ہوتا تو ہولناک
مصائب سے ہرگز واسطہ نہ پڑتا۔

سنبھالا

مقدس پوپ نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کرلی

گذشتہ ۲۰، ۲۲ سال کی مدت اسی اختلال و انتشار کی نذر ہوتی، لیکن ابو العباس ایک مرد آہنی ثابت ہوا، اس نے باغیوں کی سرکوبی کی، اور صقلیہ میں امن و امان بحال کر دیا۔

رومیوں کی حوصلہ مندیاں

امن و امان بحال کرنے اور اندرونی نظم و نسق درست کرنے کے بعد ابو العباس نے ان مقامات پر توجہ کی جن پر رومیوں نے مسلمانوں کے اختلال و انتشار سے فائدہ اٹھا کر قبضہ کر لیا تھا، ۲۶۵ھ سے لے کر ۲۷۲ھ تک عیسائیوں نے متعدد شہر ـــــ ریو، باری، سلرلو، سبرینہ، منیتا ـــــ مسلمانوں سے چھین لیے تھے۔

۲۸۸ھ میں ابو العباس نے ایک بہت بڑا بیڑہ آبنائے منیتا سے شہر ریو کی طرف بھیجا، جو جنوبی اٹلی میں واقع تھا۔

یہاں عیسائیوں کا بہت بڑا لشکر مقابلہ کے لیے موجود تھا، بڑے زور کا رن پڑا، رجب ۲۸۸ھ میں مسلمان ایک فاتح کی حیثیت سے پھر اس شہر میں داخل ہو گئے۔

کلیسائے رومہ

ابو العباس کی پیش قدمی کا سیل رواں رکا نہیں، بڑھتا ہی رہا، ـــــ!

چنانچہ وہ پیش قدمی کرتا ہوا کلیسائے رومہ کے مقدس حدود میں داخل ہوا، مسلمان سواروں کے گھوڑے، شہر روما کی شہر پناہ کے دروازے تک پہنچ گئے۔ وہ روما کا محاصرہ شروع ہی کر رہے تھے کہ مقدس پوپ نے حد لتے امان طلب کی،

ابو العباس نے پوپ یوحنا کی یہ گذارش منظور کر لی، البتہ جزیہ کی شرط پیش کی۔ پوپ نے یہ شرط بادل نخواستہ منظور کر لی اور ۲۵ ہزار رطل چاندی پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

یہ بڑی عجیب و غریب فتح تھی، دنیا نے عیسائیت کا سب سے بڑا مذہبی مرکز، اور مذہبی شخص مسلمانوں کے رحم و کرم پر تھا، لیکن مسلمانوں نے اپنی روایتی فراخ دلی اور رواداری کا مظاہرہ کیا کسی قسم کی بے حرمتی نہیں واقع ہونے پائی، پوپ نے جزیہ کی شرط منظور کرا کے مسلمانوں کا لشکر مینا واپس آگیا۔

پھر بیزنطی بیڑہ قسطنطنیہ کی بیزنطی حکومت بار بار مسلمانوں سے شکست کھاتی تھی، نقصان اٹھا کر پسپا ہوتی تھی، ہزاروں آدمیوں کا قتل و خون برداشت کرتی تھی، لیکن مقابلہ سے باز نہیں آتی تھی،

چنانچہ اس معرکہ کے سر کرنے کے بعد، جب مسلمانوں کا بیڑہ مسینا واپس آگیا، تو پھر ایک بیزنطی بیڑہ نمودار ہوا، پھر زور کا مقابلہ ہوا، اس مرتبہ بھی دشمن کو شکست ہوئی۔ تیس ۳۰ جہاز گرفتار کر لیے گئے۔ اور بہت سے دشمن کے سپاہی ہلاک ہو گئے۔

باپ بیٹے کی جگہ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک عجیب صورت حال رونما ہوئی، ابراہیم بن احمد فرمانروائے افریقہ، شروع میں بڑا بیدار مغز، منصف مزاج، اور رعایا پرور فرماں روا رہا، چند سال بعد مراق کے مرض میں مبتلا ہوا، اور ظالم و سفاک بن گیا بڑے بڑے امرا، فوجی عہدے دار اعیان و اشراف، حتیٰ کہ خود خاندان شاہی کے افراد، بلکہ انتہا یہ کہ خود اس کے بیٹے بھی جلاد کی تلوار سے محفوظ نہ رہے،

لیکن کچھ روز بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔

ابراہیم نے اپنی غلط روی کا احساس کیا، تلافی مافات کی کوشش کی، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا، داد و دہش کا سلسلہ قائم کر دیا، اور پھر اپنے بیٹے والی صقلیہ ابوالعباس کے حق میں ۲۸ سال حکومت کر کے تخت فرمانروائی سے دستبردار ہو گیا!

ابوالعباس، صقلیہ سے قیروان ——— پایۂ تخت افریقہ ——— پہنچا، اور تخت حکومت متمکن ہو گیا،

ابراہیم نے حج کے سفر کا پروگرام بنایا، پھر بعض وجوہ سے یہ ارادہ ملتوی کر دیا، اور صقلیہ کی مہم پر روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ ساز و سامانِ جنگ کی وافر مقدار لے گیا۔ نیز مال و زر سے بھری ہوئی تھیلیاں بھی اس کے ساتھ گئیں، ۲۰۹ھ/۹۰۱ء میں وہ شاہانہ جاہ و تجمل کے ساتھ بلرم میں داخل ہوا اور یہاں آتے ہی عدل و انصاف اور داد و دہش کا ایسا سلسلہ شروع کیا، کہ لوگوں کے قلوب مسخر کر لئے۔

جو کام اب تک صقلیہ کے ولاۃ نہیں کر سکے تھے، وہ ابراہیم نے کر دکھایا، اس نے صقلیہ کے پورے جزیرہ کو زیر نگیں کر لیا، ہر شہر، ہر قریہ، اور ہر چپہ کو رومیوں سے خالی کرا لیا، اس طرح بیزنطی حکومت کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے گل کر دیا۔

برطنیق پر قبضہ ابراہیم نے فوج کشی کا سلسلہ جاتے ہی شروع کر دیا، سب سے پہلے اس نے ایک رومی شہر برطنیق پر قبضہ کر لیا، یہاں کے باشندوں کو امان دی، اور ان سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا، پھر اسی سال ۲۸۹ھ/۹۰۱ء میں اس نے رومیوں کے سب سے بڑے، اور آخری مرکز، طبرمین پر چڑھائی کی، دشمن نے یہاں ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن شعبان ۲۸۹ھ میں یہاں بھی مسلمانوں کا کامل تسلط ہو گیا۔

اس حادثہ کا اثر قیصرِ روم پر اتنا زبردست ہوا کہ اس نے تاج شہریاری سر سے اتار کر پھینک دیا اور کئی روز تک حکام و عمال اور اعیان و اکابر کے اصرار کے باوجود سر پر نہیں رکھا۔

پھر اپنے پوتے ابو جعفر زیادۃ اللہ کی سرکردگی میں ایک لشکر میقش اور دوسرا لشکر اپنے بیٹے ابوالاغلب کی سربراہی میں دمنش بھیجا، دونوں کامیاب ہوئے، اور یہ شہر اسلامی پرچم کے تلے آ گئے۔

اس کے بعد اور جو چھوٹے چھوٹے علاقے رومیوں کے قبضہ میں تھے، وہ چھین لئے اور اب سارے صقلیہ میں ایک چپہ بھی ایسا نہیں تھا، جو رومیوں کا باج گذار یا ان کا مقبوضہ کہلایا جا سکے، صقلیہ کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک چپہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، یہ ابراہیم کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس نے وہ کام کر دکھایا، جو اب تک کسی سے انجام نہ پا سکا تھا۔

قاضی اسد بن فرات نے ۲۱۲ھ/۸۲۷ء میں صقلیہ پر کامیاب حملہ کیا گیا تھا، اب ۲۸۹ھ/۹۰۱ء میں اختتام

سالہا سال کی کوشش اور جدوجہد کے بعد ابراہیم کے ہاتھوں یہ پہلا جزیرہ مسلمانوں کے ممالک محروسہ میں شامل ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم نے پیچھے کی اس نے جنتی اپنی کی عزت توجہ کی۔ اسی سال وہ مبارک رمضان میں وہ کسنت ... پہنچا ... عمر اس پر پہنچا تھا۔ یہ ہم ابھی کمال کو نہیں پہنچی کہ وہ مرض اسہال میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا —— رحمہ اللہ!

ابوالعباس کا قتل

حالات و نتائج مابعد ـــــ دولت اغالبہ کا خاتمہ

ابراہیم کے بعد اس کا پوتا، ابو مضر زیادۃ اللہ، ولایت صقلیہ کے منصب پر فائز ہوا، اس کے عہد میں کلنہ کے لوگوں نے امان طلب کی، جزیہ کی شرط پر انہیں امان دے دی گئی اور محاصرہ اٹھا لیا گیا پھر ابو جعفر بلرم واپس آ گیا، یہاں آ کر وہ عیش و عشرت میں پڑ گیا، اس کی اطلاع اس کے باپ ابی العباس فرماں روائے افریقہ کو ہوئی، اس نے اسے معزول کر دیا، اور افریقہ بلا کر جیل خانہ میں ڈال دیا، اور اس کے بجائے محمد بن سرقوسی کو والی بنا کر صقلیہ بھیجا۔

اسی اثنا میں ابو جعفر نے جیل کے اندر سازش کی، اور کچھ لوگوں کو ملا کر اپنے باپ ابو العباس کو قتل کر دیا، اور خود تخت افریقہ کا مالک بن بیٹھا، تخت پر بیٹھتے ہی اس نے محمد بن سرقوس کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ علی بن محمد کو اس عہدہ کی سند عطا کی، لیکن چند ہی روز بعد اسے بھی معزول کیا، اور احمد بن ابی العین بن رباح کو یہ منصب عطا کر دیا۔

ابو جعفر زیادۃ اللہ کے حالات اس درجہ ابتر ہو چکے تھے کہ اس کا دور حکومت سراسر ناکامی کا دور ثابت ہوتا وہ اپنے اسلاف کی میراث پر قابض و متصرف نہ رہ سکا، اس کے عہد میں رعایا میں بد دلی پیدا ہوئی، امن و امان ختم ہو گیا، ظلم و سفاکی کا دور دورہ ہو گیا۔

فاطمی تحریک، اندر ہی اندر ایک عرصہ سے چل رہی تھی، کچھ تو اسے ابراہیم کی سفاکیوں کے زمانہ میں پاؤں جمانے کا موقعہ ملا تھا، باقی رہی سہی کسر ابو جعفر نے پوری کر دی۔

فاطمی تحریک کے داعی دعاۃ ابو عبداللہ، فرقہ اسمعیلیہ کے امام ابو عبیداللہ اور المہدی کو دعوت دی کہ میدان صاف ہے، وہ آئیں اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔

ابو جعفر نے اسمٰعیلیوں پر فتح کی صورت نہ دیکھ کر راہِ فرار اختیار کی طرابلس ہوتا ہوا مصر پہنچ

گیا - یہ واقعہ جمادی الآخر ۲۹۶ھ کا ہے، ابو جعفر اپنے ساتھ دولت و ثروت کا انبار لے گیا۔

اس طرح بڑی آسانی سے فاطمی خاندان، افریقہ کا فرماں روا بن گیا، افریقہ کے اس انقلاب حکومت کا چند روز تک صقلیہ پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور احمد وہاں بدستور منصب ولایت پر فائز رہا، لیکن چند ہی روز کے بعد حالات نے پلٹا کھایا، اور خود یہاں کے باشندوں نے فاطمی خاندان کو دعوت دی کہ وہ یہاں بھی اپنا پرچم لہرائے، چنانچہ، رجب ۲۹۶ھ میں صقلیہ بھی فاطمی ممالک محروسہ کا ایک جزو بن گیا! —— اس طرح سوا سو برس سے کچھ کم مدت تک حکومت کرنے کے بعد خاندان اغالبہ کا خاتمہ ہو گیا، یہ خاندان اگرچہ خلافت عباسیہ کا ماتحت نہیں تھا، لیکن حقیقت کیش ضرور تھا! اب افریقہ کا تعلق رسمی طور پر بھی خلافت بغداد سے باقی نہ رہا!

نیا خاندان

صقلیہ کا انتہائی دور عروج و اقبال

افریقہ پر فاطمیوں کے تسلط کے بعد صقلیہ کی طرف توجہ ہوئی، اور نئے امیر المومنین عبیداللہ نے علی بن محمد بن ابی الفوارس کو ۲۹۶ھ میں صقلیہ کی سند ولایت عطا کر دی، لیکن یہ زیادہ عرصہ تک اپنے منصب پر قائم نہ رہ سکا (یہ اغالبہ کے دور میں بھی والی صقلیہ رہ چکا تھا) چھٹی لے کر افریقہ پہنچا، وہاں گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بجائے حسن بن احمد پروانۂ ولایت دے کر بھیجا گیا۔ یہ ذی الحجہ ۲۹۷ھ کا واقعہ ہے۔

فاطمی قبضہ یہاں سے صقلیہ کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے یعنی رعایا سنی اور حکمران شیعہ!

حسن بن احمد کا برتاؤ بھی لوگوں کے ساتھ اچھا نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں، اور ایک مرتبہ۔۔۔ چنگاری بڑھتے بڑھتے، دہکتا ہوا انگارہ بن گئی حسن بن احمد کے خلاف ایک بڑے مجمع نے یورش کی، وہ بھاگ کھڑا ہوا، افریقہ کی شیعی حکومت نے عوام سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ عفو عام کا اعلان کر دیا، اور حسن بن احمد کے بجائے ۲۹۹ھ میں علی بن عمر البلوی کو اس منصب پر سرفراز کر کے بھیج دیا، یہ ایک بوڑھا شخص تھا، نہ امنگ تھی، نہ حوصلہ، نہ عزم، نہ ہمت، نہ ولولہ، نہ جذبہ، اس کے آتے ہی عوام جو پہلے سے بگڑے ہوئے تھے، اور زیادہ بگڑ گئے، اور اختلاف، مذہب کو بنیاد و اساس قرار دے کر بغاوت کر دی۔ وہ اپنی ناتجربہ کاری کے باعث اس بغاوت کا مقابلہ نہ کر سکا اور روپوش ہو گیا۔

اس کے روپوش ہوتے ہی عارضی طور پر صقلیہ میں دولت فاطمی کا پرچم سرنگوں ہو گیا۔

انتشار کے تین سال تین سال تک صقلیہ میں ایک قسم کی انارکی سی پھیلی رہی علی بن عمر البلوی کے

رکی ہوئی تھیں، سالم کے یہ اقدامات تمام تر جنوبی اٹلی کے علاقہ میں محدود رہے۔

سالم ۳۰۳ھ میں صقلیہ پہنچا اور ۳۱۱ھ سے اس نے پیش قدمی کا سلسلہ شروع کیا، شروع میں پیش قدمیاں چھوٹے پیمانہ پر اور چھوٹے مقامات تک محدود رہیں، اور بہت کامیاب رہیں، پھر ۳۱۲ھ میں اس نے بریانہ شہر پر قبضہ کر کے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا، پھر ایک دوسرے شہر واری پر حملہ کیا، یہاں مسلمانوں اور عیسائیوں میں بڑے معرکہ کا رن پڑا، چھ ہزار عیسائی ہلاک ہوئے اور دس ہزار کے قریب گرفتار کر لئے گئے، بے اندازہ مال غنیمت ہاتھ آیا،

۳۱۵ھ میں وترنیتو پر کامیاب حملہ کیا، ۳۱۶ھ میں نیپلس نے صلح کی درخواست کی پھر چند قلعے فتح کرنے کے بعد اسلامی فوجوں نے ایک اور بڑے اطالوی شہر اورنت پر جنگ کی یہاں کی جنگ کی شدت کے انداز حاصل کیا، ۳۱۳ھ میں شہر ترمولا پر جو اٹلی کے مشرقی ساحل پر واقع تھا، اسلامی پرچم لہرانے لگا، یہاں جو قیدی ہاتھ آئے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی اسی تعداد سے جنگ کی شدت اور وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

۳۱۳ھ میں ایک اطالوی حکومت قلوایہ نے مسلمانوں کی پیش قدمی کے سامنے سپر ڈال دی، اور جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

جنوا کی فتح

۳۲۲ھ میں اسلامی لشکر جنوا پر حملہ کرنے کے لئے، اس کے مضافات میں پہنچ گیا۔ (جنوا فرانس اور اٹلی کی سرحد پر واقع ہے، اور موجودہ عہد میں بھی اسی نام سے مشہور و معروف ہے) بعض وجوہ سے جنوا حملہ سے بچ گیا، لیکن اس کے نواح میں لوٹ مار کر کے اسلامی لشکر واپس آگیا۔

۳۲۲ھ میں فاطمی خلیفہ عبید اللہ کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو القاسم "القائم بامر اللہ" کے نام سے تختِ حکومت پر متمکن ہوا، اس کے عہد میں مصر، سردینیہ، کورسیکا، پر کامیاب حملے ہوئے، اور جنوا پر دوبارہ حملہ ہوا، شہر کی فصیلیں توڑ دی گئیں، اور اس پر اسلامی اقتدار قائم ہو گیا۔

سالم کے خلاف بغاوت

ان ظاہری کامیابیوں کے باوجود صقلیہ میں بے اطمینانی کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، سالم بھی بڑا سخت گیر اور سفاک شخص تھا،

رعایا کے ساتھ رحم و مروت کا سلوک کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا، اس کے عہد میں سیلاب آئے فصلیں برباد ہوئیں، وبائیں پھوٹیں، ہلاکت کا بازار گرم ہوا، لیکن اس نے رعایا کو کوئی سہولت نہیں دی اس کی سختی اور درشتی برابر قائم رہی، ٹیکسوں کی اس نے ایک پائی بھی نہیں چھوڑی،

نتیجہ یہ ہوا کہ صقلیہ کے ہنگامہ پسند اور شوریدہ سر لوگ اس کے خلاف بھی اٹھ کھڑے ہوئے لیکن قائم بامر اللہ نے دانشمندی سے کام لیا، اس نے سالم کو معزول کرکے ابوالعباس خلیل کو ۳۲۶ھ میں والی بنا کر صقلیہ بھیج دیا۔

خلیل بر سر اقتدار ہونے سے پہلے ایک صوفی تھا، جسے مسجد و خانقاہ کے سوا کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا، بر سر اقتدار ہونے کے بعد وہ اس طرح مسند ولایت پر جم کر بیٹھا جیسے وہ اسی کام کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔

خلیل نے صقلیہ پہنچنے کے بعد لوگوں کی اس طرح دلداری کی، اور ان کے ساتھ انصاف و معدلت کا ایسا برتاؤ کیا کہ لوگ اس پر فریفتہ ہو گئے۔

سالم معزول ہونے کے باوجود اب تک صقلیہ میں ہی موجود تھا، اس نے خلیل کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع کر دیا، اس نے مشہور کیا کہ خلیل کا یہ برتاؤ محض نمائشی ہے، ورنہ درحقیقت وہ اس لئے آیا ہے کہ باشندگان صقلیہ سے ان کی گذشتہ بغاوتوں کا زبردست انتقام لے، بات لگتی ہوئی تھی دل میں بیٹھ گئی، اور وہ پھر ایک نئے انقلاب کی تیاریاں کرنے لگے۔

جرجنت ــــــ بلرم کے بعد صقلیہ کا دوسرا بڑا شہر تھا، یہاں کے لوگ سالم کی شر انگیزیوں میں اس کے شریک بن گئے۔ اور ۳۲۶ھ میں انہوں نے علم بغاوت بلند کر دیا، خلیل نے شہر کا محاصرہ کر لیا، محاصرہ نے طول کھینچا تو جرجنت کے لوگ ایک غیر مسلم ــــــ بیزنطی ــــــ حکومت سے مدد طلب کرنے پر تیار ہو گئے، بیزنطی حکومت نے مدد بھی کی، لیکن باغی کامیاب نہ ہو سکے، یہاں کے امرا اور اعیان کا طبقہ محاصرہ سے عاجز اور پریشان ہو کر اپنا مال و دولت لے کر خفیہ راستہ سے، قریب کے عیسائی شہروں میں منتقل ہو گیا، بعض جو ان میں سے کھرے مسلمان نہیں تھے، انہوں نے اسلام ترک

کر کے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا۔

عام باشندے بھی اب گھبرا چکے تھے، انہوں نے امان طلب کی، جو انہیں دے دی گئی، یہ واقعہ ۳۲۹ھ کا ہے، گویا تین سال تک یہ بغاوت جاری رہی۔

اسی زمانہ میں، افریقہ بھی ایک انقلاب کی زد میں آ گیا وہاں ایک خارجی ابو یزید نے سر اٹھایا، اور ایک معقول تعداد لوگوں کی فراہم کر کے فوج مرتب کی، اور بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

خلیل جب صقلیہ کی مہم سے فارغ ہوا، بغاوت کا مکمل طور پر استیصال ہو گیا، اور کامل امن و امان قائم ہو گیا تو اس نے عروج و ترقی کے دوسرے پروگراموں پر غور کرنا شروع کیا، لیکن افریقہ کی بغاوت کے سلسلہ میں یکایک اسے صقلیہ سے واپس طلب کر لیا گیا کیونکہ قائم بامر اللہ اس کی سوجھ بوجھ اور کاروانی کا بڑا قائل تھا ——— اس کی جگہ ابو عطاف محمد بن اشعث نے ۳۲۹ھ میں زمام ولایت سنبھالی۔ یہ ۳۳۶ھ تک اس منصب پر قائم رہا، لیکن کوئی کارنمایاں سرانجام نہ دے سکا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے زمانہ ولایت میں خود مرکز یعنی افریقہ ابو یزید کی بغاوت کے سبب انتشار اور پریشانی کا مرکز بنا ہوا تھا، نہ کمک پہنچ سکتی تھی، نہ مدد، اسی لئے صقلیہ کے عیسائیوں نے بھی سرکشی کا مظاہرہ شروع کر دیا، اور ٹیکس دینے سے یکسر انکار کر دیا، اور مسلمانوں کے خلاف بدامنی اور سرکشی کو اپنا شعار بنا لیا۔

۳۳۶ھ میں جب افریقہ کے حالات، ابو یزید کی شکست اور قتل کے بعد سازگار ہوئے، تو وہاں کے نئے خلیفہ اسمٰعیل المنصور من اللہ ——— جو اپنے باپ قائم بامر اللہ کی وفات کے بعد اورنگ نشین حکومت ہوا تھا ——— ایک کارآزمودہ اور جہاں دیدہ، فوجی شخصیت حسن بن علی الکلبی کو والی صقلیہ بنا کر بھیج دیا۔

الکلبی

صاحب شمشیر ـــــ صاحب تدبیر

الکلبی بڑا بالغ نظر، بیدار مغز اور دور اندیش شخص تھا، وہ جس طرح سیاست کا مرد میدان تھا، اسی طرح میدان رزم کا بھی بہت بڑا شہ سوار تھا ـــــ وہ صاحب شمشیر بھی تھا، صاحب تدبیر بھی!

کلبی کے برسر اقتدار آتے ہی حالات یکسر بدل گئے کلبی کے دور کی ایک اور خصوصیت قابل ذکر ہے، یعنی جس طرح افریقہ کی حکومت موروثی طور پر خاندان اغلب کے ہاتھ میں تھی، اور خلافت عباسیہ سے اس کا تعلق صرف برائے بیعت تھا، اسی طرح اب کلبی خاندان میں مستقل اور موروثی طور پر صقلیہ کی حکومت آگئی، اور افریقہ کی فاطمی حکومت سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا

حسن کلبی نے صقلیہ پہنچتے ہی (۳۳۶ھ) ایسے دبدبہ اور شان سے حکومت کا آغاز کیا کہ اگر صقلیہ کے ہنگامہ جو اور ہنگامہ پسند اور بغاوت سرشت مسلمانوں کو اپنے رعب جلال، اور دہشت سے پورے طور پر قبضہ میں کر لیا، دوسری طرف عیسائیوں کی یہ کیفیت ہوئی کہ انہوں نے یہ رنگ سرکشی سے توبہ کر لی، اور بے تامل گزشتہ تین سال کی مالگذاری خزانہ میں داخل کر دی

پیش قدمی کا آغاز

حسن بڑا اولوالعزم الشان تھا، اس کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اس پر قانع نہیں تھا، وہ کچھ اور بھی لینا چاہتا تھا، چنانچہ قیصر روم کے مقابلہ کے لئے ایک بڑا لشکر تیار کیا، المنصور نے بھی افریقہ سے فوجی امداد ... سوار، اور ۳۵۰۰ پیادوں کی صورت میں بھیجی، بحری فوج اس کے علاوہ تھی۔

اس لشکر گراں کو لے کر حسن اٹلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے شہر ریو کو اپنا مرکز قرار دے کر قلوریہ کے مختلف شہروں کی طرف فوجیں روانہ کر دیں، اور خود ایک لشکر جرار لے کر ایک دوسرے

اہم شہر جراجہ پر یلغار کردی، یہ شہر محاصرہ کی تاب نہ لاسکا، جزیرہ پریشانی ہو گیا، یہاں سے
کلبی رومیوں کے مقابلہ کے لئے متعدد قلعے سر کرتا ہوا ۳۴۰ھ میں ایک مختصر وقفہ کے بعد پھر
جہ پہنچا، یہاں رومیوں سے بڑے زور کی جنگ ہوئی مسلمانوں کے ہاتھ بہت سا مال غنیمت، اور
ان جنگ آیا، رومی بری طرح پسپا ہوئے، قیدیوں کی بھی بہت بڑی تعداد ہاتھ آئی۔

پھر وہ دوسرے شہروں ترمنس ——— اور عطر توقہ کی طرف بڑھا، یہاں بھی کامیابی
اس کے قدم چومے، ۳۴۱ھ میں قسطنطین ہفتم نے صلح کی درخواست کی، اور حسن کے سخت شرائط
ول کرنے کے بعد وہ اپنی درخواست منظور کرانے میں کامیاب ہو سکا۔

ابوالحسن

اسی سال المنصور کا افریقہ میں انتقال ہو گیا، چونکہ حسن کلبی افریقہ کی سیاست سے بڑا گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا وہ ۳۴۲ھ میں مال غنیمت
ایک بڑا ذخیرہ لے کر افریقہ پہنچا، اور اپنے لڑکے ابوالحسن احمد کو اپنا قائم مقام اور جانشین بنا
اب افریقہ کی حکومت منصور کے بیٹے المعزلدین اللہ کے ہاتھ میں تھی، ۳۴۳ھ میں حسن نے ابوالحسن
کے لئے، باقاعدہ فرمانِ ولایت حاصل کر کے صقلیہ بھیج دیا۔ اور خود اپنی مصروفیات کے باعث افریقہ
میں مقیم رہا، یہیں سے صقلیہ میں موروثی حکومت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

ناموربا پ کا ناموربیٹا

ابوالحسن، اپنے نامور باپ کا نامور بیٹا ثابت ہوا، اس نے صقلیہ میں نظم و ضبط بحال کیا، اور علمی و تمدنی سرگرمیوں
کی طرف متوجہ ہوا، ایک عرصۂ دراز کے بعد صقلیہ کو اس طرح کا امن و امان حاصل ہوا تھا۔

لیکن اسی اثنا میں جرمنی کے فرمانروا اوٹو گریٹ Othatha نے بعض مقامات
پر قبضہ کر کے پوپ کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا، اس طرح وہ شہنشاہ بھی بن گیا اور محافظ دین عیسوی بھی

عیسائیوں کے حوصلے

اوٹو کی اس کامیابی نے صقلیہ کے عیسائیوں میں پھر ایک نئی ترنگ پیدا کر دی، طبرمین کے عیسائیوں نے علم بغاوت بلند کیا حسن
اس کے لئے پہلے سے تیار تھا، اس نے فوراً وہاں کا محاصرہ کر لیا، اور سات مہینے کے طویل محاصرہ

کے بعد عیسائیوں کے تمام ذرائع و وسائل اس طرح مسدود کر دیئے کہ انہوں نے مجبور ہو کر امان طلب کی انہیں امان دے دی گئی۔ اور ابن حسن نے ایک اور کام یہ کیا کہ طبرمین کے عیسائیوں کی مسلسل شرارتوں اور بغاوتوں سے عاجز آکر طبرمین کو ایک اسلامی نو آبادی بنا دیا۔ یہ واقعہ ۳۵۱ھ کا ہے۔

عیسائیوں میں ہلچل طبرمین کی اس ذلت بخش شکست نے صقلیہ کے دوسرے عیسائیوں میں ہلچل پیدا کر دی، چنانچہ رمطہ کے باشندے بھی بغاوت کے لئے آمادہ ہو گئے، اور شاہ قسطنطنیہ سے امداد کے طالب ہوئے جن کا اسلامی لشکر نے محاصرہ کر رکھا تھا۔

ابوالحسن نے یہ ساری روداد المعز کو لکھ بھیجی، اس نے حسن کلبی کو پھر ایک بہت بڑا لشکر دے کر صقلیہ بھیجا کہ اس معرکہ کو وہی سر کرے، وہ رمضان ۳۵۲ھ میں صقلیہ پہنچ گئے۔

ایک ماہ بعد قسطنطنیہ کی بیزنطی حکومت کا بہت بڑا بیڑہ مسینا پہنچ گیا، یہاں کے عیسائی موقع کے منتظر تھے، انہوں نے شہر کے پھاٹک کھول دیئے، اور بیزنطی لشکر جہازوں سے اتر کر شہر میں داخل ہو گیا۔ یہ بیڑہ طبرمین کے عیسائیوں کا انتقام لینے آیا تھا، صقلیہ کے عیسائی جوق در جوق جنرل منویل کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے، عیسائیوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بہت مختصر مدت میں اتنا بڑا عیسائی لشکر جنرل منویل کی سرکردگی میں فراہم ہو گیا کہ صقلیہ کی تاریخ سے اتنے بڑے لشکر کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ رومی لشکر ایک لاکھ سپاہ پر مشتمل تھا۔

جنرل منویل جنرل منویل یہ لشکر گراں لے کر رمطہ کے محصورین کی مدد کے لئے مسینا میں چند روز قیام کے بعد چل کھڑا ہوا۔

حسن کلبی سابق والی صقلیہ کی سربراہی میں یہاں بھی ایک لشکر موجود تھا، جو ہر طرح رومیوں کے مقابلہ میں فروتر تھا، تعداد نفوس کے اعتبار سے بھی سامان جنگ کے اعتبار سے بھی، اور مال و دولت کے لحاظ سے بھی عیسائیوں کو اپنی کثرت تعداد پر ناز تھا، اپنے ساز و سامان جنگ پر ناز تھا، اپنے مال و دولت پر ناز تھا، صقلیہ کی اور رومی حکومت کے خدا و عیسائیوں کی جاسوسیوں پر ناز تھا، وہ بالکل مطمئن تھے، کہ فتح انہی کی ہوگی، اور حالات و قرائن بھی پکار پکار کر یہی کہہ رہے تھے۔

بہر حال، دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔ نماز فجر کے بعد لڑائی شروع ہوئی اور نماز عصر تک جاری رہی، رومیوں کی کمان جنرل منویل کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ اپنی فوج کا دل بڑھا رہا تھا۔ پہلے حملہ میں رومی تقریباً غالب آگئے۔ پسپا ہونے کے لئے مسلمانوں کے قدم اٹھ چکے تھے، اس کامیابی پر جنرل منویل طنزیہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا کہ قائد افواج ابن عمار نے نعرہ لگایا "خدایا میرے ساتھی مجھے دشمن کے حوالے کر رہے ہیں، لیکن تو ایسا نہ کرنا" اور یہ نعرہ لگاتے ہی اپنے مختصر سے دستے کے ساتھ وہ رومی افواج کے بحر ناپیدا کنار میں شناوری کرنے لگا، اس کا یہ حال دیکھ کر مسلمانوں کو بھی غیرت آئی، وہ پھر پلٹ پڑے، شروع شروع میں رومی ہنس ہنس کر یہ تماشہ دیکھتے رہے، لیکن جلد ہی اس کھیل کی سنجیدگی کا انہیں احساس ہو گیا۔ مسلمان دس رومیوں کو قتل کرتے تھے تو سو مقابلہ کے لئے آن موجود ہوتے تھے۔

عصر کے قریب، اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا، جنرل منویل ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور رومی جو تھک کر چور ہو چکے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور شہر رمطہ پر از سر نو مکمل قبضہ کر کے فیصلہ کر دیا کہ طبرمین کی طرح اسے بھی نو آبادی بنا دیا جائے، ورنہ اپنے محل وقوع کے باعث یہ مقام ہمیشہ رومیوں کی جولانگاہ بنا رہے گا، اور مقامی عیسائی ان کی مدد کر کے مسلمان حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بناتے رہیں گے۔

اس جنگ میں بہت سے قیدی ہاتھ آئے، بے اندازہ مال غنیمت حاصل ہوا، اس کے بعد ساحل ریگو پر بحری جنگ ہوئی، یہاں عیسائی رومیوں کو اور زیادہ ذلت بخش شکست ہوئی۔

خاندانی بادشاہت

یوں تو اغلبی حکومت کے آخری دور میں صقلیہ پر مسلمانوں کا کامل قبضہ ہو گیا تھا، لیکن وہ محض برائے نام تھا، نہ عیسائیوں کے حوصلے پست ہوئے تھے۔ نہ قسطنطین اعظم اپنے حق سے دستبردار ہوا تھا، نہ عیسائیوں کی اطاعت حقیقی اور واقعی تھی، لیکن اس جنگ نے یہ تینوں باتیں پوری کر دیں۔

قسطنطین اعظم نے سر جھکا لیا، باغی اور سرکش عیسائی مایوس ہو کر مطیع ہو گئے۔

اس طرح ۱۴۲ سال کی جنگ آزمائی کے بعد (۲۱۲ھ تا ۳۵۴ھ) یورپ کا یہ جزیرہ خالص اسلامی حصہ بن گیا،

اسی سال یعنی ۳۵۴ھ میں ابوالحسن احمد نے جنوبی اٹلی کے ان علاقوں پر از سر نو تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا جو سرکشی اور بغاوت کے مرکز بن گئے تھے۔

قیصر روم کا دست مصالحت

مسلسل شکستوں کے بعد جب بیزنطی حکومت صقلیہ سے مایوس ہوگئی تو وہ اپنے دعوے سے دستبردار ہوگئی، اور قیصر روم نے از خود دست مصالحت بڑھا کر، حکومت افریقہ سے دوستی کے تعلقات قائم کر لئے۔ اور باہمی تحائف کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔

المعز نے اخلاص کا ثبوت یوں دیا کہ طبرمین اور رمطہ کو جو پہلے عیسائی باشندوں پر مشتمل تھے، پھر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا (۳۵۹ھ) اور مسلمانوں کو وہاں سے نکال لیا، تاکہ مسلمانوں کا اخلاص مستحکم ہو جائے۔

۳۵۸ھ میں ابوالحسن، افریقہ واپس بلا لیا گیا، اور اس کے باپ کا آزاد کردہ غلام یعیش صقلیہ کا والی بنا دیا گیا۔ لیکن وہ حالات کو سنبھال نہ سکا، لہٰذا ۳۵۹ھ میں ابوالحسن احمد کلبی پھر ولایت پر مامور ہوا، لیکن ابھی اس نے اپنے منصب کا چارج نہیں لیا تھا کہ اس کی وفات ہوگئی، اور اس کا بھائی ابوالقاسم ۳۶۰ھ میں اس منصب پر فائز ہوا،

۳۶۱ھ میں دولت فاطمیہ کا قبضہ، مصر و شام پر بھی ہوگیا، اور المعز قیروان سے اپنے نو تعمیر دارالخلافہ قاہرہ پہنچ گیا۔ اس نے ابوالقاسم کلبی کو صقلیہ کا خود مختار فرماں روا تسلیم کر لیا۔

۳۶۵ھ میں جرمن کے فرماں روا اوتو دوم نے عیسائیوں کو بھڑکایا اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن مسلمانوں نے ان کی سرکوبی کرکے انہیں پھر سے مطیع کر لیا۔

اس کے بعد اس نے جنوبی اٹلی کے متعدد مقامات پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کر دیا، ترنتو پر قبضہ کر لیا، (۳۶۶ھ) نیز شہر غرنیلیہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اسلامی نوآبادیوں پر اوتھو کا قبضہ

اوتھو دوم نے اٹلی کی بعض اسلامی نوآبادیوں پر قبضہ کر لیا، ۳۷۱ھ میں مسلمانوں سے اس کا زبردست مقابلہ ہوا، مسلمان جیت گئے، اوتھو بری طرح زخمی ہوا، اور زخموں کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو گیا، اس جنگ میں مسلمانوں کا میر سپاہ اور والی صقلیہ ابوالقاسم بھی کام آیا، اس کے بعد اس کا بیٹا جابر اپنے باپ کی وراثت یعنی صقلیہ کی مسند حکومت پر متمکن ہوا، لیکن وہ فوج کو راضی نہ رکھ سکا، لہٰذا خلیفہ العزیز باللہ ابو منصور نزار بن سعد نے جو المعز کا بیٹا تھا، اور ۳۶۵ھ میں اس کی وفات کے بعد خلیفہ بنا تھا — اسے معزول کر کے جعفر بن محمد کلبی کو یہ امانت سونپ دی۔ یہ جابر کا چچازاد بھائی تھا،

جعفر کامیاب ثابت ہوا، اس نے امن و امان بھی بحال کر لیا اور صقلیہ کے علمی و تمدنی عروج و ارتقا کی طرف توجہ کی، اس کا عہد ہر اعتبار سے ایک کامیاب دور کہا جاتا ہے۔ اس کے حسن تدبیر اور مآل اندیشی نے بہت سے مشکلات کو حل کیا، اور بہت سی دشواریوں پر غالب آئیں وہ اہل علم کا بھی بہت قدردان تھا، اس نے مجموعی حیثیت سے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی، جس نے صقلیہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

۳۷۵ھ میں جعفر کا انتقال ہو گیا، اس کی جگہ اس کا بھائی عبداللہ بن محمد کلبی تخت حکومت پر بیٹھا، اس نے بھی بڑی کامیابی سے حکومت کی، اس کے اور جعفر کے عہد میں امن و امان قائم رہا، اور صقلیہ نے تمدنی اور علمی اعتبار سے کافی ترقی کی، ۳۷۹ھ میں اس کی وفات ہوئی، اور اس کے بعد اس کا بیٹا اختر الدولہ ابوالفتوح یوسف بن عبداللہ کلبی مسند آرائے حکومت ہوا۔

ثقۃ الدولہ کا دور حکومت

ثقۃ الدولہ، بڑا اولوالعزم فرماں روا ثابت ہوا، اس نے سب سے پہلے اٹلی کی عیسائی ریاستوں پر حملہ کر کے انہیں زیر نگیں کر لیا، اس طرح اطالیہ کے مسلمان امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگے، مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ثقۃ الدولہ نے تمام اطالوی ریاستوں کو مطیع کر لیا اور اوتھو دوم کی شکست کے بعد عیسائی ممالک کے فرماں رواؤں کی جو کانفرنس مسلمانوں کے استیصال کے لئے ہوئی تھی۔ اسے ایک خواب پریشاں بنا دیا۔

پھر اس نے صقلیہ کے عمرانی تمدنی، ثقافتی، تجارتی اور علمی حالات پر توجہ کی اس کا عہد تمدنی ترقی کا مستقل باب ہے، علم و ادب کو اس کے دور میں بڑا فروغ حاصل ہوا، صنعت و حرفت نے بڑی ترقی کی، زراعت اور تجارت عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچ گئی، ملک میں فارغ البالی، مرفہ حالی، اور امن و امان کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی،

۳۸۸ھ میں ثقۃ الدولہ مرض فالج میں مبتلا ہو کر اپنے بیٹے جعفر کے حق میں تخت حکومت سے دستبردار ہو کر مصر واپس چلا گیا۔ جعفر تاج الدولہ کے لقب سے تخت حکومت پر متمکن ہوا، یہ بھی اپنے باپ کی طرح ایک کامیاب اور خوش قسمت حکمران ثابت ہوا، اس نے ایک عرصہ دراز تک حکومت کی اس کے دور حکومت کا قدر مشترک "ترقی" ـــــ کے سوا کچھ نہیں ہے، ہر شعبۂ حیات میں ترقی! زندگی کے ہر میدان میں ترقی ـــــ ترقی ہی ترقی!

تاج الدولہ کی حماقت

۴۰۵ھ میں اس کے بھائی علی نے خروج کیا، تاج الدولہ اپنے بھائی پر غالب آیا، جب وہ گرفتار ہو کر اس کے سامنے آیا تو اسے قتل کر دیا، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، چونکہ بربر اور موالی کی ایک بڑی تعداد نے اس کا ساتھ دیا تھا، اس لیے صقلیہ کے تمام بربروں کو افریقہ جلاوطن کر دیا اور تمام موالیوں کو تہ تیغ کر دیا، فوج میں موالیوں اور بربروں کی کافی تعداد تھی، اب فوجی چھاؤنیاں سنسان ہو گئیں، اور اب جو نئی فوج ترتیب پائی، اس میں باشندگان صقلیہ کا عنصر غالب تھا، اور یہ لوگ ہمیشہ کے سرکش اور ہنگامہ پسند تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان غلط کاریوں کی سزا تاج الدولہ کو بھگتنی پڑی، اس کے خلاف، ۴۱۰ھ میں شورش ہوئی، یہ اتنی بڑھی کہ کسی کے روکے نہ رک سکی، آخر اسے تخت حکومت سے دستبردار ہونا پڑا، اور اس کی جگہ اس کا بھائی احمد الاکحل، تائید الدولہ کے لقب سے زیب آرائے سریر حکومت ہوا، تائید الدولہ کو خود صقلیہ کے باشندوں نے منتخب کیا تھا، لہٰذا اس کے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی امن امان قائم ہو گیا، بعد میں فاطمی خلیفہ منصور الحاکم بامر اللہ نے ـــــ جو ۳۸۶ھ میں اپنے باپ العزیز کی وفات کے بعد تخت حکومت پر فائز ہوا تھا ـــــ بھی رسمی طور پر اس کی تصدیق کر دی۔

قلوریہ پر نارمنوں کا قبضہ

تائیدالدولہ نے پیش قدمیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا اس نے اٹلی پر صقلیہ سے متعدد مہمیں بھیجیں، اور یہ تمام مہمیں کامیاب ہوئیں۔

۴۱۰ھ میں نارمنوں نے سر اٹھایا، انہوں نے اٹلی کی بعض اسلامی نوآبادیوں پر قبضہ کرلیا، رفتہ رفتہ پورا صوبہ قلوریہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، تائیدالدولہ، داخلی ریشہ دوانیوں کے انسداد میں مصروف تھا، اس لئے وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کرسکا، قلوریہ پر سے جب اسلامی پرچم ہٹ گیا تو وہاں نارمنوں نے ظلم و تشدد کا لامتناہی سلسلہ مسلمانوں پر شروع کردیا، بہت سے مسلمان صقلیہ اور افریقہ ہجرت کرگئے، جو وہاں رہ گئے، انہیں یا اُن کی اولاد کو اسلام سے دستکش ہونا پڑا،

تائیدالدولہ اندرونی معاملات میں ایسا اُلجھا رہا کہ وہ بیرونی معاملات پر توجہ نہ کرسکا، اور اندرونی معاملات بھی اُلجھتے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۲۷ھ میں وہ قتل کردیا گیا۔

اس کے قتل ہوتے ہی پھر اختلال کی گرم بازاری شروع ہوگئی۔

۴۲۷ھ سے ۴۳۱ھ تک تائیدالدولہ کا بھائی حسین بن ثقتہ الدولہ صمصام الدولہ کے لقب سے تختِ حکومت پر بیٹھا، یہ سب سے ناکارہ ثابت ہوا، اس کے عہد میں صقلیہ کا ہر شہر آزاد ہوگیا، اور مرکزی حکومت بالکل ختم ہوگئی۔

ان حالات سے دشمنوں نے بھی پورا فائدہ اٹھایا، ۴۱۹ھ میں بزنطی حکومت نے مسینا پر قبضہ کرلیا

انتشار و اختلال

تمت بالخیر

۷۰ سال تک حکومت کرنے کے بعد خاندان کلبیہ کا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا صقلیہ سے خاتمہ ہو گیا، ۱۳۱ھ میں صمصام الدولہ معزول ہوا، پھر قتل کر دیا گیا، اور اس کے بعد انتشار و پراگندگی کا نہ ختم ہونے والا دور شروع ہو گیا، اس طرح جہاں خاندان کلبیہ ختم ہوا وہاں صقلیہ کے حدود سے اسلام کے رخصت ہونے کے سامان بھی خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے لگے۔

کلبی خاندان نے صقلیہ کو صقلیہ بنا دیا تھا، اس صد سالہ دور میں صقلیہ نے ہر اعتبار سے لائق رشک ترقی کی، تمدنی، تعلیمی، علمی، ادبی، معاشرتی، تجارتی، صنعتی، حرفتی، زرعی، فوجی، انتظامی، ہر شعبہ میں ارتقا کا عمل جاری رہا۔

اگرچہ اس دور میں بھی بغاوتیں ہوئیں، لیکن، ایسی نہیں کہ وہ حکومت کی بنیادیں متزلزل کر دیتیں، لیکن صمصام الدولہ کے قتل کے بعد حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں، اور چند ہی سال بعد، یہ خطہ مسلمانوں سے یکسر خالی ہو گیا۔

عیسائیوں کی کامیابیاں ۴۴۲ھ تک مسینا کے علاوہ سرقوسا اور بعض دوسرے اہم مقامات زیادہ تر خود مسلمانوں کی غداریوں اور خود غرضیوں کے باعث عیسائیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ اور وہاں بزنطی پرچم پھر لہرانے لگا۔

صقلیہ کے انتشار و پراگندگی اور اختلال کا یہ عالم تھا کہ یہاں کم و بیش پانچ حکومتیں قائم ہو گئیں، ان میں سے ہر ایک آزاد اور خود مختار تھی، خود ہی مرکز تھی، خود ہی محور!

خانہ جنگی کا دور پھر خانہ جنگی کا دور شروع ہوا جو کئی سال تک جاری رہا، ابن ثمنہ نامی ایک شخص نے جو سرقوسہ کا سلطان حاکم تھا، مرکزی حکومت قائم کرنے کی کوشش

کی، کامیاب بھی ہوا لیکن شرابی اور بدخو تھا، اپنی بیوی کی جان کا گاہک اس کی درشت کلامی کے باعث ہوگیا، اس کا بھائی اس کی پشت پناہی پر آمادہ ہوگیا، ابن ثمنہ نے شکست کھائی، اور بھاگ کر راجر اول (نارمنوں کے سردار تھا) کے پاس پہنچا، اور اسے ترغیب دی کہ وہ صقلیہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلے راجر مسلمانوں سے مرعوب تھا، ہمت نہ پڑی، لیکن ابن ثمنہ نے اسے بتایا کہ صقلیہ خود اپنی آگ میں جل رہا ہے وہاں نہ فوج ہے، نہ حکومت، چلیئے تخت انتظار کر رہا ہے، چنانچہ ۴۴۴ھ میں وہ کلیریہ سے ابن ثمنہ کی رہبری میں صقلیہ روانہ ہوگیا۔

مسلمانوں کی غداریاں

سب سے پہلے وہ میسینا پہنچا، یہاں کے عیسائی اس کے منتظر ہی تھے، پھر وہ قصریانہ پہنچا، یہاں بھی بغیر خون ریزی کے وہ قابض ہوگیا، کیونکہ کوئی مقابلہ کرنے والا تھا ہی نہیں، بہت سے قلعے بھی محافظوں سے خالی پڑے تھے، وہ بھی قبضہ میں آگئے، نارمن بڑے سفاک طبع اور خون آشام تھے، انہوں نے مسلمانوں پر بڑے بڑے مظالم توڑے، ان کے کھیت جلا دیئے، باغ لوٹ لئے، انہیں ذلیل کیا، مسٹر اشاعت فرماتے ہیں:-

"عیسائیوں نے مسلمانوں سے انتقام لے لیا!"

مسلمانوں کی ہجرت

نارمنوں اور عیسائیوں کے لشکر نے اٹلی کی اسلامی آبادیوں پر بھی چھاپے مارنے شروع کر دیئے اور مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہوگئی، صقلیہ کی حالت اور زیادہ ابتر ہوگئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسلمان اٹلی اور صقلیہ سے ہجرت کر کے افریقہ چلے گئے، جو رہ گئے، ان کے لئے اپنے مذہب پر قائم رہنا مشکل ہوگیا۔

بیچارہ ابن البعباع

۴۶۱ھ میں صقلیہ کے ایک صاحب اثر مسلمان سردار ابن البعباع نے کوشش کی کہ حالات سنبھل جائیں، اس نے حکومت قائم کرلی اور نارمنوں کے حملوں کا منہ توڑ جواب دینے لگا۔

ابن البعباع شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور صقلیہ کو ایک مرتبہ پھر اس بہت بڑے طوفان سے صحیح سلامت نکال لے جاتا، لیکن ــــ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد!

مصر کی فاطمی حکومت نے عین اس وقت جب ابن العباح صقلیہ کے حالات درست کرنے میں لگا ہوا تھا اور نارمنوں کو منہ توڑ جواب دے رہا تھا، اور صقلیہ کو بچالے جانے کی تدبیریں کر رہا تھا، اس سے مطالبہ کیا کہ وہ مصر کی خلافت کو نیا اور پرانا خراج ادا کرے۔

معذرت مسترد

ابن العباح نے تمام حالات لکھ کر موجودہ وقت میں خراج دینے سے معذرت کی اس نے کہا اس وقت تو میں خود امداد کا مستحق ہوں، لیکن مصر کی حکومت نے یہ معذرت قبول نہ کی، اپنے مطالبہ پر اڑی رہی، جب صقلیہ کی طرف سے اُسے خراج نہ ملا، تو اس نے نارمن فرماں روا کی حکومت میں صقلیہ کو ایک "تحفہ" کے طور پر پیش کر دیا۔ پیغام میں لکھا تھا کہ

"صقلیہ حکومت مصر کی جانب سے نارمنوں کی حکومت میں پیش کیا جاتا ہے، وہ فوج کشی کر کے ابن العباح کی حکومت کا تختہ اُلٹ دے"۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں

نارمنوں اور عیسائیوں کو دھڑکا لگا ہوا تھا، کہیں صقلیہ کی تاخت و تاراج کا یہ نتیجہ نہ نکلے کہ مصر اور افریقہ کی زبردست حکومتوں سے جنگ چھڑ جائے، اس پیام نے اس دہشت کو ختم کر دیا، اس اندیشہ کو دور کر دیا، چنانچہ نارمنوں کا جنگی بیڑہ صقلیہ کے دارالحکومت بلرم کی فصیل تک پہنچ گیا۔

مسلمانوں کی ہمت

مسلمان اگرچہ بے بس تھے، مصر ان کے خلاف تھا، افریقہ سے مدد نہیں مل سکتی تھی، اندلس سے مدد پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا، خود صقلیہ کی حکومت پاش پاش ہو چکی تھی، اس کا مشہور عالم بحری بیڑہ ٹوٹ چکا تھا، اس کی شان و عظمت ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔

دوسری طرف بلرم کی جنگ، ایک مقدس جنگ بن چکی تھی، یہاں وہ مسلمان فرماں روائی کر رہے تھے جن سے عیسائی پرخاش رکھتے تھے، جنہوں نے بارہا عیسائیوں کو ذلت بخش شکستیں دی تھیں، عیسائیوں نے اپنے اختلافات فراموش کر دیئے، اس سعادت میں حصہ لینے کے لئے وہ جوق در جوق مختلف شہروں

پہنچنے لگے۔

لیکن بلرم میں مسلمان آباد تھے ——— مسلمان!

مسلمانوں نے ہر طرح کی بے کسی اور بے بسی کے باوجود محاصرین سے مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ پانچ ماہ کی طویل مدت گزر گئی۔ عیسائی بد دل ہو کر محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ بلرم عیسائیوں نے غداری کی اور نارمنوں کو فصیل کے کمزور حصہ سے آگاہ کر دیا، اس اطلاع سے نارمنوں نے فائدہ اٹھایا، اور اپنی پوری فوج گراں کے ساتھ بلرم میں داخل ہو گئے۔

بلرم کی تسخیر سارے صقلیہ کی تسخیر تھی ——— یہ صقلیہ کا دارالحکومت تھا۔

نارمنوں کی تاخت و تاراج

یہاں سے نارمن لشکر بندرگاہ مازر اور طرابنش کی طرف بڑھا، یہاں بھی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر وہ کامیاب ہو گیا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں مقابلہ کی سکت ہی نہیں رہی تھی نہ قوت اور نہ ان کے پاس فوج تھی حکومت۔ پھر وہ مقابلہ کس برتے پر کرتے؟

۴۸۳ھ میں چند چھوٹے چھوٹے مقامات کے سوا سارے صقلیہ پر نارمن جھنڈا لہرانے لگا، اور مسلمانوں کی حکومت کا باضابطہ خاتمہ ہو گیا، صقلیہ کی حکومت پر راجر اس کے بھائی رابرٹ نے مستقل فرمانروائی کا حق تسلیم کر لیا۔

نارمنوں کا تمام مقبوضات پر قبضہ

چند سال تک نارمن اپنی تنظیمی جد و جہد میں مصروف رہے، پھر ۴۸۰ھ میں انہوں نے جبرتین اور ریقوسہ پر بھی مکمل قبضہ کر لیا۔

۴۸۱ھ میں جرجنت پر بھی نارمنوں کا قبضہ ہو گیا، ۴۸۴ھ میں قصریانہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا پھر فنوس اور نوطس کی باری آئی، یہاں بھی مسلمان محکوم ہو گئے، اور نارمن حکمرانی کرنے لگے۔ اور سال صقلیہ کے مسلمان ۲۰۰ سال حکومت کرنے کے بعد عیسائی رعایا بن گئے ——— سچ ہے ———

تلک الایام نداولھا بین الناس

مسلمانوں کا صقلیہ سے اخراج

نارمنوں نے مسلمانوں سے اس شرط پر حکومت لی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے پائے گی، ان کے مذہب میں مداخلت نہیں کی جائے گی، ان کے شخصی معاملات قاضی طے کرے گا، اور اسی کا فیصلہ نافذ ہوگا ان کی مسجدیں اور عبادت گاہیں قائم کی جائیں گی، ان کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے گا، شہری باشندے کی حیثیت سے جو حقوق عیسائیوں کو حاصل ہوں گے، وہی انہیں حاصل رہیں گے۔ اس کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی، ان کی املاک جائیداد پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ہوا یہ کہ حکومت پر قبضہ کرتے ہی نارمنوں نے اپنے سارے وعدے فراموش کر دیئے۔ انہوں نے چن چن کر مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے نکالا، ان کے معابد اور مساجد ڈھا دیئے، سر راہ ان کی عورتوں کی ان کی نظروں کے سامنے بے آبروئی کی گئی، ان کے مکانات، کھیت، باغات، محلات چھین لیے گئے جو لکھ لٹ تھے وہ فقیر بے نوا بن گئے، جو دولت مند تھے وہ نادار بن گئے۔ جو جاہ و جلال کے مالک تھے وہ ایک پارچہ نان کے محتاج ہو گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جن سے ممکن ہو سکا انہوں نے ہجرت کی اور صقلیہ کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئے۔ اور جو ہجرت نہ کر سکے، وہ ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا کام اب حمالی یا سپہ گری رہ گیا، وہ فوج میں اس لئے داخل کئے جاتے تھے کہ مسلمانوں سے لڑیں مسلمانوں کا خون بہائیں، اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا غلام بنائیں، ان حالات میں اگر ایک بہت بڑی تعداد نے اسلام ترک کر کے مذہب عیسوی قبول کر لیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں نے پوپ کو جزیہ دینے پر مجبور کر دیا تھا، اور ایک یہ دور تھا کہ مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام — ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو!

خدا تھا ——— لیکن اس نے اپنے نام لیواؤں کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا، اس لئے نہیں کہ وہ اسلام کا عروج نہیں چاہتا تھا ——— اس لئے کہ مسلمان مسلمان نہیں رہے تھے۔

یہ وہ مسلمان تھے جنہوں نے بے سر و سامانی کے عالم میں سارے صقلیہ کو فتح کر لیا تھا، اپنے سے کئی گنا فوجوں کو عبرت انگیز شکستیں دی تھیں، بڑی سے بڑی طاقت کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر اب کہ یہ سارے جزیرہ صقلیہ کے مالک تھے، خزانہ ان کا تھا، فوج ان کی تھی حکومت ان کی تھی، یہ کیسا انقلاب آیا کہ یہ غلام ہونے پر، مذہب ترک کرنے پر، اور ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے؟ —— ؟ —— ؟ !

یہ انقلاب تھا خود غرضی کا، نفس پرستی کا، غداری کا، مسلمان مسلمان کا گلا کاٹنے لگے مسلمانوں کی جنگیں خدا کے لئے نہ رہ گئیں، حصول اقتدار، حصولِ طاقت، اور حصولِ جاہ و عظمت کے لیے رہ گئیں!

پھر خدا ان کا ساتھ کیوں دیتا؟ —— وہ تو اپنے اصول کا اتنا سخت ہے کہ اُس نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ اور ان کے صحابہ کرام کو بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہ رکھا، جب مسلمان خدا کے لئے لڑے، اپنے سے کئی گنا فوج پر غالب آئے، جب مالِ غنیمت نے ان کا دامن کھینچا، جیتی ہوئی جنگ ہار گئے۔ —— کیا جنگ اُحد، اور جنگِ حنین بدر کی تفصیل اس کے علاوہ کچھ اور ہے؟ ——

؟ ——

حاجہ بجاد ۶ م ۱۳

حصہ ہشتم

از صفحہ ۴۳۹

سلطنتِ عثمانیہ

(۱)

ترکِ عثمانی

بہ ملکِ خویش عثمانی امیر ست
دلش آگاہ و چشم او بصیر ست
نہ پنداری کہ رست از بندِ افرنگ
ہنوز اندر طلسمِ او اسیر ست

•

خنک مرداں کہ سحرِ او شکستند
بہ پیمانِ فرنگی دل نہ بستند
مشو نومید و باخود آشنا باش
کہ مرداں پیش ازیں بودند و ہستند

•

بہ ترکاں آرزوئے تازہ دادند
بنائے کارشاں دیگر نہادند
ولیکن کو مسلمانے کہ بیند
نقاب از روئے تقدیرے کشادند

فہرست ملوک وسلاطین وخلفا

۱- عثمان خان	۱۲۸۸ء تا	۱۳۲۶ء
۲- اورخان	۱۳۲۶ء تا	۱۳۵۹ء
۳- مراد اوّل	۱۳۵۹ء تا	۱۳۸۹ء
۴- بایزید اوّل	۱۳۸۹ء تا	۱۴۰۲ء
۵- محمد اوّل	۱۴۰۲ء تا	۱۴۲۱ء
۶- مراد ثانی	۱۴۲۱ء تا	۱۴۵۱ء
۷- محمد فاتح	۱۴۵۱ء تا	۱۴۸۱ء
۸- بایزید ثانی	۱۴۸۱ء تا	۱۵۱۲ء
۹- سلیم اوّل	۱۵۱۲ء تا	۱۵۲۰ء
۱۰- سلیمان اعظم	۱۵۲۰ء تا	۱۵۶۶ء
۱۱- سلیم ثانی	۱۵۶۶ء تا	۱۵۷۴ء
۱۲- مراد ثالث	۱۵۷۴ء تا	۱۵۹۵ء
۱۳- محمد سوم	۱۵۹۵ء تا	۱۶۰۳ء
۱۴- احمد اوّل	۱۶۰۳ء تا	۱۶۱۷ء
۱۵- مصطفیٰ اوّل	۱۶۱۷ء تا	۱۶۱۷ء
۱۶- عثمان ثانی	۱۶۱۷ء تا	۱۶۲۲ء
۱۷- مراد چہارم	۱۶۲۳ء تا	

۱۸۔ ابراہیم سنہ ۱۶۴۰ء تا سنہ ۱۶۴۸ء

۱۹۔ محمد چہارم سنہ ۱۶۴۸ء تا سنہ ۱۶۸۷ء

۲۰۔ سلیمان ثانی سنہ ۱۶۸۷ء تا سنہ ۱۶۹۱ء

۲۱۔ احمد ثانی سنہ ۱۶۹۱ء تا سنہ ۱۶۹۵ء

۲۲۔ مصطفےٰ ثانی سنہ ۱۶۹۵ء تا سنہ ۱۷۰۳ء

۲۳۔ احمد سوم سنہ ۱۷۰۳ء تا سنہ ۱۷۳۰ء

۲۴۔ محمود اول سنہ ۱۷۳۰ء تا سنہ ۱۷۵۴ء

۲۵۔ عثمان سوم سنہ ۱۷۵۴ء تا سنہ ۱۷۵۷ء

۲۶۔ مصطفےٰ سوم سنہ ۱۷۵۷ء تا سنہ ۱۷۷۳ء

۲۷۔ عبدالحمید اول سنہ ۱۷۷۳ء تا سنہ ۱۷۷۹ء

۲۸۔ سلیم سوم سنہ ۱۷۷۹ء تا سنہ ۱۸۰۷ء

۲۹۔ مصطفےٰ چہارم سنہ ۱۸۰۷ء تا سنہ ۱۸۰۸ء

۳۰۔ محمود ثانی سنہ ۱۸۰۸ء تا ۳۹

۳۱۔ عبدالمجید خاں سنہ ۱۸۳۹ء تا سنہ ۱۸۶۱

۳۲۔ عبدالعزیز سنہ ۱۸۶۱ء تا سنہ ۱۸۷۶ء

۳۳۔ مراد پنجم ۱۸۷۶ء

۳۴۔ عبدالحمید ثانی سنہ ۱۸۷۶ء

۳۵۔ انور پاشا سنہ ۱۹۱۸ء تا

۳۶۔ مصطفےٰ کمال سنہ ۱۹۳۶ء

احوال وسوانح

۱۲۸۸ء میں ارطغرل کی وفات ہوئی۔ اس کا بڑا بیٹا عثمان خان جانشین ہوا، ترکی حکومت کا دوسرا نام سلطنت عثمانیہ اسی عثمان خان کی مناسبت سے مشہور ہے۔

عثمان اگرچہ جاگیردار سے بادشاہ ہو گیا تھا، لیکن اس کی زندگی بڑی سادہ تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کی زندگی ایک مومن قانت کی زندگی تھی، قوت وطاقت کے نشہ نے اس میں تمرد اور سرکشی نہیں پیدا کی، اس کی فروتنی کچھ اور بڑھ گئی، وہ بڑا عادل اور انصاف دوست تھا۔ اس کے ایوان عدالت میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی، دولت جمع کرنے سے اسے نفرت تھی، ساری دولت وہ غریبوں، یتیموں اور مستحقوں پر دریا دلی کے ساتھ خرچ کر دیتا تھا۔

فتح بروصہ کے بعد عثمان نے بہ حالت علالت اپنے چھوٹے بیٹے اورخان کو اپنا جانشین مقرر کیا، اسے وصیت کی کہ رعایا کے ساتھ بلا تفریق و امتیاز عدل کا برتاؤ کرے، یہ بھی وصیت کی کہ اسے بروصہ میں دفن کیا جائے، اورخان نے باپ کی وصیتوں پر عمل کیا، اور بروصہ میں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا، وفات کے بعد، عثمان کا ترکہ، ایک عمامہ، چند گھوڑے اور اسلحہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

اورخان اورخان نے تخت سلطنت پر قدم رکھنے کے بعد اپنے بڑے بھائی علاء الدین کو اپنا وزیر مقرر کیا، اور داد حکومت دینے لگا، اورخان بھی باپ کی طرح بہادر شجاع اور فیاض تھا۔

۱۳۵۸ء میں اورخان کا بڑا اور چہیتا بیٹا، شکار کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ اس نے اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا، اورخان کو اس حادثہ کا بہت غم ہوا۔ ضبط کرے۔

سال یعنی ۱۳۵۹ء میں وہ بھی غم کی تاب نہ لاکر وفات پا گیا۔ خاندان عثمانی کا یہ پہلا فرد تھا جس نے جاگیردار کی حیثیت سے سلطان کی حیثیت اختیار کی اور اس شان سے کہ آج تک تاریخ اس کی تعریف میں تر زبان ہے۔

مراد اوّل

یہ بڑا اولوالعزم اور منچلا بادشاہ تھا، اس میں باپ اور دادا کی تمام خصوصیتیں موجود تھیں، اور کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو صرف اسی کا حصہ تھیں شجاعت، دلاوری، فیاضی اور حسنِ سلوک میں تو یکتا تھا ہی، تدبر اور فراست میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، اس نے اپنے دورِ حکومت میں سلطنت عثمانیہ میں محیر العقول توسیع کرلی، رقبہ، آبادی، مالیات ہر اعتبار سے اس کی حکومت میں سلطنت عثمانیہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

اپنے آباؤ اجداد کی طرح اسے بھی دھن تھی کہ یورپ کی سرزمین کو کوکبہ شہریاری سے پامال کرے عثمان خان کی تمنا بالکل پوری نہ ہوتی، اورخان تھریس اور گیلی پولی تک پہنچ گیا، اور مراد اول کی حوصلہ مندی نے اسے یورپ میں مستقل فرماں روا کی حیثیت دے دی۔

مراد کے تدبر اور فراست، دانائی اور دور اندیشی کا اک زمانہ قائل ہے، ایک مشہور اسے محمد فاتح پر بھی ترجیح دیتا ہے، ۱۳۸۹ء میں ایک سردار نے اظہارِ اطاعت کرتے ہوئے دھو میدانِ جنگ میں خنجر مارا، اور قتل کر دیا!

بایزید اوّل

بایزید نے اس جنگ میں جو مراد اور متحدہ عیسائی افواج کے درمیان ہوئی نمایاں حصہ لیا تھا، باپ کی شہادت کے بعد وہی وارثِ تاج و نگین قرار پا بڑی آن اور شان سے حکومت کی یورپ میں تہلکہ مچا دیا، فتوحات کا نہ رکنے والا سلسلہ بہادری اور دلیری میں اپنا جواب آپ تھا، یہ اپنے آبا کی طرح فیاض نہیں خسیس تھا، فوج بددل رہتی تھی مگر سر اٹھانے کی ہمت بھی نہیں تھی، ۱۴۰۳ء میں بہ حالتِ قید اس دنیا سے رخصت ہوا، تیمور لنگ شکست دی تھی، اور خوش ہوا تھا لیکن اس کی موت پر اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ نکلے۔

محمد اول

بایزید کے انتقال کے بعد، اس کے تین لڑکے سلطنت کے دعوے دار بنے، محمد سب میں چھوٹا تھا، لیکن اپنی دانشمندی حکمتِ عملی اور تدبیر سے وہی سب پر غالب آیا۔ پھر اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، اس نے جنگ و پیکار کے بجائے سلطنت کے استحکام پر زیادہ توجہ کی، کسی سے صلح کر کے کسی سے جنگ کر کے کسی کا ساتھ دے کر، ان چند ہی سال میں عثمانی سلطنت کو پھر اسی درجہ پر پہنچا دیا، جہاں وہ بایزید کی شکست سے پہلے تھی۔

محمد کے زمانے میں فتوحات کا صفحہ سادہ دکھائی دیتا ہے، لیکن تعمیری کام اس نے کافی کیئے، ۱۴۲۱ء میں اس نے وفات پائی ۱۴۱۳ء میں تخت پر بیٹھا تھا، گویا صرف آٹھ سال حکومت کی

مراد ثانی

مراد ثانی نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی فتوحات کا ایک شاندار سلسلہ شروع کر دیا اس نے کئی مرتبہ عیسائیوں کے متحدہ محاذوں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب رہا۔ شاہ ہنگری پولینڈ نے جنگ کو ہلال وصلیب کی جنگ بنا دیا، اور سارے یورپ کو مقابلہ میں کھینچ لایا لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔

مراد کی بےنفسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دو مرتبہ اپنے بیٹے کے حق میں تختِ حکومت سے دستبردار ہو کر خانہ نشین ہوا۔ لیکن ہر مرتبہ اسے عیسائیوں کی عہد شکنیوں کے باعث گوشۂ عزلت سے نکل کر میدان جنگ میں آنا پڑا۔

۱۴۵۱ء میں مراد نے وفات پائی۔

محمد فاتح

مراد کے بعد محمد فاتح، ۱۴۵۱ء میں تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس کا دورِ حکومت اتراک عثمانی کی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک ہے۔ قسطنطنیہ کو فتح کر لینے کی تمنا عثمان خان کے وقت سے لے کر مراد تک ہر فرماں روا کے دل میں مچلتی رہی۔ لیکن یہ سعادت محمد ہی کے حصہ میں تھی، اس نے یورپ میں اپنی فتمندیوں سے ہلچل ڈال دی، اس نے ہنگری کے دروازے پر دستک دی، اس نے اطالیہ کے صحن میں قدم رکھا۔ اس نے وینس کی جمہوریہ سے لڑائی لڑی، اور قریب قریب فاتحانہ طور پر اس سے شرائط صلح طے کرائے۔

۱۴۸۱ء میں یہ نامور فاتح اور مخلص مسلمان اس دنیا سے رخصت ہو گیا، فتح و اقدام کے اس کے اور بھی بہت سے ارادے تھے، لیکن اب ان کی تکمیل دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔

بایزید ثانی

محمد فاتح کی وفات کے بعد ۱۴۸۱ء میں اس کا بیٹا بایزید ثانی تخت پر متمکن ہوا، اس کا عہد فتوحات کے لحاظ سے قابل ذکر نہیں ہے۔ ۱۵۱۲ء میں اپنے بیٹے سلیم کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا، اور صرف تین روز بعد وفات پا گیا۔

سلیم اول

سلیم نہایت دلاور، جنگ جو، خود سر، آشفتہ مزاج، بہادر، اور شجاع تھا، اس کے عہد میں فتوحات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اس نے عرب حکومتوں کو زیرنگیں کیا، ایران کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ممالیک کا خاتمہ کیا اور خاندان عثمانی کو خلافت اسلامیہ کے منصب پر فائز کیا، سلیم میں دینداری بھی تھی، بہادروں کے اوصاف بھی، لیکن مستقل مزاج، آتش خو، مخالفت نہیں برداشت کر سکتا تھا، بڑے بڑے امرا، وزرا کو کھڑے کھڑے قتل کرا دیتا تھا، دشمن ہر حالت میں دشمن رہتا تھا، صلح و معاہدے کے بعد بھی اس کی دشمنی قائم رہتی تھی، اور وہ موقع پا کر وعدہ خلافی اور عہد شکنی میں کوئی تامل نہیں کرتا تھا — بایزید جتنا نرم خو تھا، یہ اتنا ہی سخت تھا۔

ایک مرتبہ وہ آدرنہ کے ارادہ سے قسطنطنیہ سے روانہ ہوا، مزاج پہلے ہی ناساز تھا، راستہ میں حالت اور بگڑ گئی، ۲۲ ستمبر ۱۵۲۰ء کو ایک دیہات میں اس کا انتقال ہو گیا، انتقال کے وقت ۵۴ سال کی عمر تھی،

سلیمان اعظم

سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) دنیا کے ان چند بڑے لوگوں میں تھا جو وقت کا دھارا بدل دیتے ہیں، جو اپنے کارناموں سے ساری دنیا کو محو حیرت کر دیتے ہیں، جو دنیا کی قسمت بدل دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں، سلیمان کے مرتبہ اور پایہ کا کوئی شخص، خاندان عثمانی میں پیدا نہیں ہوا، اس کی ملک گیری، فتحمندی اور کج کلاہی کے سامنے ایک دنیا نے سر جھکایا، اس میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں، اور کون آدمی ہے، جو کوتاہیوں اور کمزوریوں سے مبرا ہو، لیکن اس کے حسنات اس

ت سے بہت زیادہ تھے، اُس نے ترکی قوم پر احسان کیا، اُسے دُنیا کی سب سے زیادہ باوقار اور
شکوہ قوم بنا دیا، اس نے مسلمانوں پر احسان کیا، ان کا سکہ ساری دُنیا پر بٹھا دیا، وہ شکست اور
میت کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ اب زوال کی طرح بڑھتا تھا، اور چھاتا چلا جاتا تھا، دُنیا
ومت میں یہ یارا نہ تھا کہ اس کی پیش قدمی کو روک لیتی۔

لیکن ترقی کی فراوانی، زوال کا پیش خیمہ ہوتی ہے، سلیمان کے کاموں کو سنبھالنے والا اس کے
کوئی نہ پیدا ہوا، جس طرح عالمگیر کی اقبال مندی، اس کے مرتے ہی زوال سے ہمکنار ہوئی، اسی طرح
مان کے بعد اس کے جانشین نہ اُس کے نام کو قائم رکھ سکے، نہ اُس کے کام کو، سلیمان اخلاق،
عت، انصاف، رحم دلی، مروت اور فراست کا مجموعہ تھا، ہر خوبی اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی،
پنی رعایا کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا تھا، مسلم اور غیر مسلم اس کی نظر میں یکساں تھے۔
۵ ستمبر ۱۵۶۶ء کو سلیمان نے میدان جنگ میں وفات پائی، سلیمان کے عہد حکومت میں سلطنت ترکیہ
رقبہ چالیس ہزار مربع میل پر مشتمل تھا، ۔۔۔ سلطان کا یہ فخر کوئی بے جا فخر نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتو
رماں روا، تین بر اعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے![1]"

سلیم ثانی

۱۵۶۶ء میں سلیمان اعظم کی وفات کے بعد سلیم ثانی تخت نشین ہوا، یہ بادہ خوار مست
بے فکر اور سراپا، نااہل تھا، اس کے عہد میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، نہ رقبہ
ے اعتبار سے نہ مالی اعتبار سے، اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ترکی سلطنت کا زوال اسی کے
ہد سے شروع ہوا۔ ۱۵۷۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا

مراد سوم

۱۵۷۴ء میں سلطان مراد سوم تخت نشین حکومت ہوا، یہ ایک صوفی مشرب انسان تھا،
فنونِ جنگ کا نہ ماہر تھا نہ کوئی خاص دلچسپی رکھتا تھا، اس کے عہد میں فتوحات کا
سلسلہ سست رفتاری کے ساتھ جاری رہا، بغاوتیں اور شرارتیں بھی خوب ہوئیں، ۱۵۹۵ء میں اس
انتقال ہو گیا، اس کا باپ سلیم شراب کا عادی تھا، اس نے اورنگ نشین ہوتے ہی امتناع شراب کا
بارہ جاری کر دیا، جس کا رواج اب سلطنت میں بہت زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔

---

[1] فن لے FINLAY بحوالہ دولت عثمانیہ ج ا

محمد سوم ۱۵۹۵ء میں محمد سوم نے عنانِ حکومت سنبھالی، عادات و اطوار میں یہ بھی اپنے باپ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا، نہ فتوحات کا شوق نہ میدانِ جنگ سے دلچسپی، نہ کاروبارِ حکومت سے شغف، محل کا ایک گوشہ اور عیش و عشرت

۱۶۰۳ء میں ایک بدشگونی سے سہم کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

احمد اوّل بالکل نوعمری کے عالم میں احمد اول ۱۶۰۳ء میں اورنگ نشین ہوا، اور ۲۸ سال کی عمر میں (۱۶۱۷ء) وفات پا گیا، اس کا عہد حکومت بھی داستانِ زوال کی ایک کڑی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

مصطفےٰ اوّل یہ ۱۶۱۷ء میں تخت پر بیٹھا چونکہ احمد کے لڑکے کمسن تھے، لہٰذا بھائی کو تخت ملا، لیکن نااہلی کی بنا پر تین ماہ کے بعد معزول کر دیا گیا، ۱۶۲۲ء میں پھر تخت پر بٹھایا گیا، لیکن اس مرتبہ پہلے سے زیادہ نااہل ثابت ہوا، ۱۶۲۳ء میں پھر معزول کر دیا گیا۔

عثمان ثانی مصطفےٰ اوّل کی معزولی کے بعد احمد کا لڑکا عثمان ثانی سلطان بنا، لیکن یہ بھی حالات کو نہ سنبھال سکا، ۱۶۲۲ء میں جب مصطفےٰ اوّل دوبارہ تخت نشین بنا تو یہ قتل کر دیا گیا۔

مراد چہارم یہ بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اور ۲۸ سال کی عمر میں وفات پا گیا نوعمری کے زمانہ میں اس کی ماں، والدہ سلطانہ ماہ پیکر نظم مملکت کی نگران رہی وہ بڑی منتظم اور سلیقہ شعار خاتون ثابت ہوئی، بلوغ کے بعد مراد نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی اور بڑے دبدبے سے حکومت کی، یہ بڑا سخت گیر تھا، اس کی سخت گیری سے نقصان کم، فائدہ زیادہ ہوا، ینی چری کی بغاوت اس نے ختم کر دی، دوسرے سرکشوں کو بھی سرنگوں کیا۔

ابراہیم مراد چہارم کی وفات کے بعد اس کا بھائی ابراہیم (۱۶۴۰ء) تخت نشین ہوا، یہ مراد سے زیادہ سخت گیر تھا، ساتھ ہی ساتھ بے تدبیر بھی، مراد کی سخت گیری، حکومت رعایا اور قوم کے لئے تھی، ابراہیم کی سخت گیری کا مقصد صرف حصولِ دولت، اور عیش و عشرت تھا

لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر لینا، نیلام کرانا، پھر اپنے مصرف میں لے آنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا رعایا پر نئے نئے محاصل صرف اپنے ذاتی مصارف کے لئے عائد کرنا بھی اس نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا سارا وقت محل کی خوب صورت اور خوش اندام کنیزوں کے جھرمٹ میں بسر کرتا تھا، نہ کاروبار مملکت سے کوئی دلچسپی تھی، نہ سیاسیاتِ عالم سے، اس نے علانیہ سرکاری عہدوں اور منصبوں کو فروخت بلکہ نیلام کرنا شروع کر دیا، اہلیت، قابلیت، استعداد اور استحقاق ہر چیز پر نیلام کی بولی ہوتی تھی، جو جس منصب کے لئے زیادہ سے زیادہ روپیہ پیش کر سکتا تھا، وہ اس کا مستحق تھا۔ آخر رعایا کے تمام طبقات نے مجبور ہو کر بالاتفاق اسے ۱۶۴۸ء میں معزول کر دیا، اور چند روز بعد قتل کر دیا۔ اس کے عہد میں کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے جو ذکر کے قابل ہو۔

محمد چہارم الحجری میں (۱۶۴۸ء) میں تخت نشین ہوا، ۴۰ سال کے قریب حکومت کی، خود نہایت نا اہل تھا، لیکن ماں کی دانشمندی سے اس نے محمد کوپریلی اور اس کی وفات کے بعد احمد کوپریلی کو وزیر اعظم بنایا، یہ دونوں باپ بیٹے بڑے بہادر، وفادار، دور اندیش معاملہ فہم اور منتظم تھے، انہوں نے اپنی قابلیت اور سوجھ بوجھ سے حکومت کی تمام خرابیاں دور کر دیں، عدل و انصاف کی چھنی ہوئی نعمت ان کے زمانہ میں پھر مل گئی، رعایا کو آسودگی ملی، اطمینان نصیب ہوا، کاروبار پھر چمک اٹھا، ملازمین سرکاری کو یکسوئی حاصل ہوئی، اعتماد کار کا جذبہ پیدا ہوا، دل و جان سے فرائض کی ادائی میں منہمک ہو گئے۔ لیکن احمد کوپریلی کے بعد محمد نے اپنے داماد، قرہ مصطفےٰ کو وزیر اعظم بنایا اور احمد کے چھوٹے بھائی مصطفےٰ کوپریلی کو نظر انداز کر دیا، جو ہر اعتبار سے جانشینی کا اہل تھا، قرہ نے برسر اقتدار ہونے کے بعد سلطنت کو پھر اس پستی میں لا ڈالا، جو گزشتہ چند پشتوں سے ترکی حکومت کا حصہ بن چکی تھی، اس کی بے تدبیری، ہٹ دھرمی اور خود غرضی کے باعث، باہر شکستیں ہوئیں، اور اندرونی طور پر نظام حکومت بگڑا۔ رعایا اور عمال حکومت میں پھر خرابیاں پیدا ہوئیں، محمد اور احمد نے خون پانی ایک کر کے جو ڈھانچہ قائم کیا تھا، قرہ نے اپنی نا اہلیت اور نالائقی کے باعث اسے پھر زمین کے برابر کر دیا!

۱۶۸۷ء میں محمد معزول کیا گیا اور ۱۶۹۲ء میں بہ حالت نظر بندی وفات پا گیا۔

سلیمان ثانی یہ ۱۶۸۷ء میں تخت نشین ہوا، اور ۱۶۹۱ء میں وفات پا گیا۔ اس کا عہد بھی ناکامیوں اور حسرت سنجیوں کا عہد ہے، اس نے ایک عقلمندی یہ کی کہ مصطفےٰ کوپریلی کو اپنا وزیراعظم بنایا، یہ محمد کا بیٹا اور احمد کا بھائی تھا، اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو باپ اور بھائی میں پائی جاتی تھیں، اس نے بڑی تیزی سے اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا، اس کی دیانت و امانت مسلم تھی، اسی لئے لوگ اسے "صالح" کہنے لگے تھے، بہت جلد اس نے اندرونی خرابیاں بڑی حد تک دور کر لیں۔

احمد ثانی یہ ۱۶۹۱ء سے ۱۶۹۷ء تک فرماں روائے ترکیہ رہا، اس کے عہد میں جنگ و پیکار کا سلسلہ محدود پیمانہ پر جاری رہا، لیکن کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی،

مصطفےٰ ثانی یہ ۱۶۹۵ء میں تخت نشین ہوا، اپنے پیش رو کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے بہتر تھا، اس نے قلمدانِ وزارت کو بر ملی خاندان کے ایک ہونہار فرد حسین کو تفویض کیا، یہ بھی بڑا دانشمند اور مخلص شخص تھا، اس نے حالات کو سدھارنے کی بڑی کوشش کی، اور بڑی حد تک سدھار ہی لئے۔ لیکن ڈھانچہ اتنا بگڑ چکا تھا، اور حالات اتنے نامساعد ہو چکے تھے کہ ان دونوں کی متفقہ کوششیں بھی کوئی ترقی اور عروج کی صورت نہ پیدا کر سکیں، ۱۷۰۳ء میں مصطفےٰ ثانی معزول کیا گیا، اور کچھ روز بعد وفات پا گیا۔

احمد سوم ۱۷۰۳ء سے ۱۷۳۰ء تک یہ فرماں روائی کرتا رہا، اس کے عہد میں معرکے بھی ہوئے، جنگیں بھی پیش آئیں، اصلاح احوال کی طرف توجہ بھی کی گئی، لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۱۷۳۰ء میں فوج نے اس کے خلاف بغاوت کی، تخت سے دستبردار ہو کر نظر بند ہو گیا، وہیں چند سال بعد انتقال ہو گیا۔

محمود اول ۱۷۳۰ء سے ۱۷۵۴ء تک یہ تخت حکومت پر متمکن رہا، اس کے عہد میں بہت سی شورشیں ہوئیں، کئی معرکے کے رن پڑے، شکستیں زیادہ ہوئیں، کامیابیاں کم، دسمبر ۱۷۵۴ء

میں مختصر سی علالت کے بعد محمود کا انتقال ہو گیا۔

عثمان سوم ۱۷۵۴ء میں محمود اول کی وفات کے بعد، اس کا بھائی عثمان سوم مالک تاج و نگین ہوا، ۱۷۵۷ء کے آخر میں یہ بیمار پڑا اور مر گیا۔ اس کے عہد میں خانہ جنگی اور جنگ زرگری کا سلسلہ تو جاری رہا، لیکن اس کو نہ کوئی خاص نقصان پہنچا نہ فائدہ

مصطفےٰ سوم یہ ۱۷۵۷ء میں مالک تاج و دیہیم ہوا اور ۱۷۷۳ء میں دنیائے فانی سے عالم بقا کا رخ کیا۔ اس کے عہد میں شروع شروع میں کچھ ترقیاں ہوئیں باقی سارا وقت جنگ، شورش، بغاوت، طوائف الملوکی، سرکشی، اور بدامنی کی نذر ہوا۔

مصطفےٰ سوم کے زمانہ میں روس نے بار بار عہد شکنی کی، اور جنگ چھڑی، ترکوں نے ہر مرتبہ ڈٹ کر مقابلہ کیا کبھی ہارے کبھی جیتے، ہارے تو بری طرح، اور جیتے تو اس شان سے کہ بقول حالی ہمیر، بگڑے روسیوں کی ——— چولہے پر چڑھی ہوئی ہنڈیوں پر بھی قبضہ کر لیا ——— !

روس نے ہر یورش میں یہی نہیں کہ جنگ برپا کی ہو، بلکہ اس نے کھیتوں، بے گناہوں عورتوں اور بچوں تک کو معاف نہیں کیا، قتل عام، لوٹ مار، غارت گری، یہی روسی سپاہیوں کی خصوصیت تھی۔

عبدالحمید اول عبدالحمید، مصطفےٰ ثالث کا بھائی تھا، ۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۹ء تک اس نے حکومت کی، اس کا دور حکومت بھی فتنہ سامانی، شورش اور تباہی کا دور تھا، دشمنوں کی ہر چہار طرف سے یورش تھی، مغربی حکومتیں ترکوں کو نیست و نابود کر دینے کا تہیہ کر چکی تھیں، اور روس کی زارینہ کیتھرائن نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک قسطنطنیہ پر قبضہ نہیں ہو جائے گا، قرار نہیں لیا جائے گا۔ یورپ کی دوسری حکومتیں بھی انگلستان، فرانس، آسٹریا وغیرہ درپردہ اور علانیہ حسب موقع روس کا ساتھ دیتی رہیں،

سلیم ثالث سلیم، عبدالحمید کا بھتیجا تھا، یہ ۱۷۸۹ء میں تخت حکومت پر بیٹھا اور ۱۸۰۷ء میں اس نے وفات پائی، یہ بڑا ذہین،

دانشمند اور سیاست داں اور زیرک فرماں روا تھا، اُسے ورثہ میں پریشانیوں، تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا، لیکن اس نے استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا، نہ ہراساں ہوا، نہ دلگیر اس کے عہد کو اگر انقلاب، پیکار، اور اصلاحات کا عہد کہا جاتے تو بجا ہوگا، جس طرح اس کے اوصاف میں تضاد تھا، اسی طرح اس کے احوال و معاملات میں بھی یکسانیت نہ تھی، اُسے مختلف متضاد اور متنوع حالات سے سابقہ پڑا اور یہ عزیمت کے ساتھ اُن سے دوچار ہوتا رہا، نہ ہمت ہارا، نہ دل برداشتہ ہوا،

ینی چری سلیم کی اصلاحات سے بہت ناخوش تھے، آخر انہوں نے پھر بغاوت کی، ۱۸۰۷ء میں وہ معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، اور ایک سال کے بعد بہ حالت نظر بندی قتل کر دیا گیا۔

مصطفےٰ چہارم یہ صرف سال سوا سال برسر حکومت رہا، باغیوں کا آلۂ کار تھا، اور باغی ہر چہار طرف چھائے ہوئے تھے: یہ حالت دیکھ کر چند دیرینہ وفاداران سلیم نے از سر نو تنظیم کی، اور طاقت حاصل کر کے مصطفےٰ کو معزول کرایا، اور سلیم کے بیٹے محمود کو تخت نشین کر دیا،

محمود ثانی سلطنت عثمانیہ کے اولوالعزم اور مدبر فرمانرواؤں میں محمود ثانی ایک مرتبۂ خاص رکھتا ہے، اسے وراثت میں شورش، طوائف الملوکی، بغاوت، بدامنی اور بدانتظامی ملی تھی، اس میں اتنی لچک تھی کہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو نئے سانچہ میں ڈھال لیتا تھا، یہی لچک اس کی فیروزمندیوں، خوش بختیوں اور کامیابیوں کی ضامن تھی، زندگی کے آخری دور میں اسے روح فرسا شکستوں، شکستوں اور ابتلاؤں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اپنے دور حکومت میں اس نے جو کارنامے انجام دیئے تھے، وہ ایسے نہیں تھے، جو اس کی عظمت پر پردہ ڈال سکیں عظمت کا انحصار کامیابی اور ناکامی پر نہیں ہوتا صرف کردار اور سیرت پر ہوتا ہے، اور اس اعتبار سے اس کے ایک بلند پایہ انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں،

اندرونی اصلاحات کے اعتبار سے بھی محمود ثانی کا دور حکومت بہت شاندار ہے، اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ینی چری کا بالکلیہ استیصال کر دیا ینی چری نظام توڑ دیا، سرکش اور متمرد ینی چری

سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، سرکاری دفاتر سے اس محکمہ کو اڑا دیا، اور اسی طرح ترکیہ کو ایک ایسی مصیبت عظمیٰ سے نجات دی، جس نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔

حربی اصلاحات کے لحاظ سے بھی محمود ثانی کا دور، بے مثال ہے اس نے پوری جرأت سے کام لے کر یہ کارنامہ انجام دیا، اور ترکی فوجوں کو لباس، انداز جنگ، طریق تنظیم، اور آن بان میں یورپ کی ترقی یافتہ فوجوں کا ہمسر بنا دیا، اس اعتبار سے بھی اسے اولیت حاصل ہے، اگرچہ اس کے پیش رو بھی اس سلسلہ میں کچھ آگے بڑھے، لیکن وہ دو چار قدم سے زیادہ نہ چل سکے، تھک کر رہ گئے، لیکن محمود نے اپنی اولوالعزمی سے یہ ساری منزل بڑی سرعت کے ساتھ طے کر لی،

یورپ کی حاسد حکومتوں نے محمود کو ایک پل بھی چین نہ لینے دیا آسٹریا، پرشیا (جرمنی) اور فرانس سے تو اس کی ان بن رہتی تھی، سب سے بڑا اور سب سے طاقتور دشمن روس بھی نکل کر بار بار میدان میں آیا، اس کی ترک تازیوں نے محمود کو ایک لحہ بھی سکون کا نہ میسر ہونے دیا، جنگ اور صلح، جنگ اور صلح، بس ترکی اور روس کے تعلقات کی داستان صرف ان چند الفاظ میں پوشیدہ ہے، روس سے ابھی جنگ زرگری، تصادم اور کشمکش کا سلسلہ جاری تھا کہ برطانیہ عظمیٰ سے بھی صبر وضبط ناممکن ہو گیا، اور وہ بھی میدان میں کود پڑا۔

محمود کے لئے سب سے زیادہ روح فرسا اور جان لیوا یونان کی بغاوت ہوئی یونان کے عیسائیوں کے ساتھ نہ صرف محمود کا بلکہ تمام سلاطین اتراک کا برتاؤ نہایت شریفانہ اور عادلانہ رہا تھا، لیکن انقلاب فرانس سے متاثر ہو کر یونان نے آزادی اور استقلال کا پرچم ہاتھ میں لیا، اور بغاوت برپا کر دی، روس، برطانیہ اور فرانس نے علانیہ یونان کا ساتھ دیا، ان ممالک کے نہ صرف رضاکار، یونانی فوجوں میں داخل ہوتے بلکہ بڑے بڑے سپہ دار، اور سپہ سالار بھی یونانی فوج کے باقاعدہ ملازم بن گئے تھے تاکہ یونان کو آزاد کرائیں، اور ترکوں کو یورپ سے نکال باہر کریں، اس بغاوت اور ان لڑائیوں میں بے گناہ غیر جنگجو، اور امن پسند دیہاتی اور شہری ترک مردوں، عورتوں اور بچوں تک پر جو ہولناک اور سفاکانہ مظالم کئے گئے، جس طرح انہیں سمندر میں دھکیلا گیا، دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر مارا گیا، ماں کے سامنے کمسن لڑکوں اور لڑکیوں

کو ذبح کیا گیا، انہیں پڑھ کر تقسیم ہند کے وقت کے وہ خوں ریز اور لرزہ خیز فسادات یاد آجاتے ہیں، جنہوں نے انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا تھا۔

محمود ثانی ۱۸۰۸ء میں تخت پر بیٹھا اور ۱۸۳۹ء میں وفات پا گیا۔

عبدالمجید

لائق باپ کا لائق بیٹا ــــــ حوصلہ مند باپ کا اولو العزم جانشین

عبدالمجید کے عہد میں جنگ و پیکار کا سلسلہ رہا تو لیکن کم، بغاوت اور شورش کی بھی یہی کیفیت رہی تقریباً ۱۲ سال کی مدت اسے سکون و عافیت کی ملی، یہ مدت اس نے عیش و عشرت اور نغمہ و چنگ اور رقص و آہنگ کی مصروفیت میں نہیں بسر کی، وہ کام کیا، جس کی تکمیل کی حسرت عبدالمجید اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تھا، اس نے پوری یکسوئی، ہمت، استقلال اور عزیمت کے ساتھ اصلاحات کا پروگرام ہاتھ میں لیا، اور ایک ایک کر کے ہر اس چیز کی اصلاح کر ڈالی جو اس کے بس میں تھی اس مرتبہ ایک تعجب انگیز بات یہ تھی کہ اصلاح کی مخالفت عوام کی طرف سے نہیں ہوئی، بلکہ اس کا خیر مقدم کیا گیا، شاید اس لئے کہ اصلاحات کے سب سے بڑے دشمن ینی چری اب اس دنیا میں نہ تھے، شاید اس لئے بھی کہ اب ترکوں میں تعلیم عام ہو رہی تھی، اور وہ حکومت کے اقدامات کا اصل مفہوم سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے لگے تھے۔

یہ نامور، فرماں روا ۱۸۳۹ء میں سلطنت عثمانیہ کے تاج و تخت کا مالک بنا اور ۱۸۶۱ء میں، اس دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کے کارناموں اور جذبۂ اصلاح کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جدید ترکی کے معمار بھی اس کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں، اور انشراح قلب کے ساتھ مدح و توصیف سے بھی گریز نہیں کرتے، خالدہ ادیب خانم نے اپنی مشہور کتاب "ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش" میں اس کی اصلاحات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

عبدالعزیز

شخصی حکومتوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ ایک بناتا ہے ایک بگاڑتا ہے نہ بنانے والے کا ہاتھ کوئی پکڑ سکتا ہے، نہ بگاڑنے والے کو روک سکتا ہے، شخصی

حکومت مطلق العنان ہوتی ہے، اور وہ کسی ضبط و نظم اور آئین کی خوگر نہیں ہوتی، وہ اپنے سوا کسی اور کے سامنے جواب دہ بھی نہیں ہوتی،

یہ سارے مفاسد عبدالعزیز کے دور میں پورے طور پر نمایاں ہوئے، عبدالعزیز نے سلطنت عثمانیہ کے مجد و وقار، اور ساکھ کو جو نقصان پہنچایا وہ کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کی فضول خرچی، اس کی بے راہ روی، اس کی بے اعتدالی، دشمنوں سے اس کا ساز باز، غداروں سے اس کی دوستی، روس سے اس کی مرعوبیت، دول یورپ سے اس کی مداہنت، یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کی کم مائگی میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا،

۱۸۶۱ء میں یہ تخت نشین ہوا، اور ۱۸۷۶ء میں معزول کر دیا گیا، چند روز بعد اس نے خودکشی کر لی، لیکن اس عرصہ میں اس نے خزانۂ حکومت کو جو زبردست نقصان پہنچا دیا، وہ ہر اعتبار سے ناقابلِ تلافی ثابت ہوا۔

مراد پنجم

مراد پنجم کے عہد حکومت کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں ہے، باپ کی خودکشی نے اسے اختلالِ دماغی میں مبتلا کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تخت نشینی کے تین ماہ بعد ڈاکٹروں کی رائے، اور شیخ الاسلام کے فتوے کے مطابق معزول کر دیا گیا۔

عبدالحمید ثانی

مستبد، خون آشام مطلق العنان، ! ——— عبدالحمید ثانی کی سیرت اور کردار کا جلوہ صرف مذکورہ بالا الفاظ کے مفہوم و معنیٰ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

عبدالحمید کے دور میں ترکوں کے اندر ایک نئی لہر اٹھی، دستوریت کی، انہوں نے شخصی حکومت کی کمزوریوں اور لغویتوں کو محسوس کر لیا، وہ مستعد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ اپنا ملک میں دستور رائج کر کے رہیں گے، اس سلسلہ میں انہیں دشواریاں پیش آئیں، لیکن ان کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا، وہ بدستور اپنا کام کرتے رہے، خفیہ بھی اور علانیہ بھی، !

۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۹ء تک عبدالحمید ثانی ترکوں پر مسلط رہا، یہ طویل دور بہت عبرت خیز، سبق آموز

اور حیرت انگیز داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔

انور پاشا

عبدالحمید ثانی کی معزولی کے بعد شہزادہ محمود شاہ، سلطان محمد پنجم کے نام سے وارث تاج و تخت ہوا، لیکن اب یہاں سے سلاطین عثمانی کی مکمل بے دست و پائی کا دور شروع ہوتا ہے، لہٰذا ہم ان کا ذکر نظر انداز کر کے ترکیہ جدید کی دو اہم ترین شخصیتوں کے ذکر پر اس سلسلہ کو ختم کر دیں گے۔

۱- غازی انور پاشا

۲- غازی کمال پاشا،

انور پاشا نے ترکی کی افراتفری کے دور میں، جو ۱۹۱۴ء تک قائم رہا، بڑا اہم حصہ لیا، انہوں نے اس گرتی ہوئی عمارت کو، اپنے تدبر، شجاعت، اور موقع شناسی سے بار بار سنبھالا دیا، وہ میدانِ جنگ کے ہیرو بھی تھے، اور مسند قیادت کے تاجدار بھی،

انور پاشا نوجوان ترکوں کا نمائندہ تھا۔

جدید ترکیہ کا خالق تھا

زوال پذیر سلطنت عثمانیہ کا ناخدا تھا

مخلص مسلمان، اور کھرا ترک تھا۔

دستور جدید نافذ ہونے کے بعد جب اس کے خلاف غرضمندوں نے شورش کی تو انور سامنے آیا، جب ترکیہ کی کٹھ پتلی وزارت نے اپنے محکوم ممالک، اور انگلستان و روس، وغیرہ کے ذلت بخش شرائط قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، وہ پستول لے کر پہنچ گیا، اور اس نے یہ کام نہ ہونے دیا، جب طرابلس پر اطالیہ نے فریب جھوٹ، بدعہدی اور قوت و طاقت کے بل پر اچانک قبضہ کر لیا اور وہاں کے مسلمانوں پر ظلم وسفاکی کا لرزہ خیز دور شروع کیا، تو وہ انور پاشا تھا جو شمشیر بے نیام بن کر وہاں پہنچا، اس نے عربوں، ترکوں اور بربروں کی تنظیم کی، اور اطالیہ کو ناکوں چنے چبوا دیئے، جب ادرنہ پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا، اور ترک سپاہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی، ترک حکومت اس فیصلہ کو تسلیم کر لینے پر آمادہ نظر آتی، اور فرنگی

اتحادی ترکوں کی کمزوری اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے آگے بڑھے، تو صرف انور کی ایک ذات تھی، جس نے یہ طے شدہ باتیں نہ ہونے دیں، اگر انور ترکوں میں ایک نئی زندگی نہ پیدا کر دیتا تو یہ ساری باتیں عالم وجود میں آکر رہتیں،

حقیقت یہ ہے کہ ترکیہ جدید کی تعمیر میں انور پاشا کا سب سے زیادہ حصہ ہے، وہ انقلابیوں کا تاجدار تو تھا ہی لیکن قدامت پسند بھی، اس کے اخلاص، صداقت، اور دیانت فکر وعمل کے قائل تھے۔

ان خوبیوں کے باوجود انور پاشا بدنصیب بھی تھا، اس کی قوم حصول انقلاب کے بعد اس کی خدمات سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکی، لیکن اس نے آخر وقت تک جب وہ ترکستانی مسلمانوں کی طرف سے روس کے درندہ صفت سپاہیوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو رہا تھا، اپنے کام اور مشن کو جاری رکھا، اور وہ شہید ہو گیا۔ لیکن اس کے زندہ جاوید کارنامے رہتی دنیا تک دنیا میں موجود رہیں گے۔

انور پاشا کے کارناموں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب جو ترکوں کے بدترین دشمن ہو گئے تھے، وہ بھی انور پاشا کی عظمت کے دل و جان سے معترف تھے، فرنگی دشمنوں نے بھی اس کی شجاعت اور تدبر کا لوہا مانا، غیر ترک مسلمان بھی انور کے نام پر عقیدت کے پھول ہمیشہ نچھاور کرتے رہے، یہی اس کی عظمت اور بڑائی کی سب سے بڑی دلیل ہے!

مصطفےٰ کمال پاشا

جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) میں ترکوں کی شکست کے بعد انجمن اتحاد ترقی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ترکوں کی مسلسل شکستوں نے ان میں ہراس اور نا امیدی کے جذبات پیدا کر دیئے، ان سے نہ صرف یورپ میں مقبوضات چھن گئے، بلکہ ان کے اصل علاقوں پر بھی دھاوا ہوا، انہیں ذلت بخش شرائط صلح منظور کرنے پر مجبور کیا گیا۔

لیکن جس طرح جنگ بلقان وطرابلس کے زمانہ میں انور نے ترکی حکومت کو ذلت بخش شرائط نہ منظور کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسی طرح جنگ عظیم کی شکست کے بعد مصطفےٰ کمال نے سابق کمزور، اور اتحادیوں سے مرعوب حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ اگر کام نہیں کر سکتی تو اپنی جگہ خالی کر دے، اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تھا

یونان، سمرنا کا مالک بن بیٹھا، دوسری حکومتیں اور کئی علاقوں پر قابض و متصرف ہو گئی تھیں، لیکن مصطفےٰ کمال نے جب تلوار سنبھالی تو سب کو بھاگنا پڑا، ترکی آزادی تسلیم کرنی پڑی،

مصطفےٰ کمال نے ایک آمر (ڈکٹیٹر) کی حیثیت سے حکومت شروع کی، اور اسی حیثیت کے ساتھ وہ دُنیا سے رخصت ہوا، مزاج کا بہ بھی بہت سخت تھا، چنانچہ اس نے اپنے بہترین ساتھیوں کو جن کے خدمات کسی طرح اس سے کم نہیں تھے، جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا، رؤف پاشا، عصمت انونو خالدہ ادیب خانم اور دوسرے ترک ہیرو مصطفےٰ کی استبداد پسند طبیعت کے باعث ترک وطن پر مجبور ہوئے پھر بھی اپنے دور حکومت میں مصطفےٰ کمال نے ترکوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، ان میں قناعت پیدا کر دی، انہیں اس پر راضی کر لیا کہ اپنے مقبوضات کا غم نہ کریں، اور اپنے اہل وطن میں آزادی خوشحالی اور سکون و عافیت کی زندگی بسر کریں،

۱۹۳۶ء میں طویل علالت کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا نے وفات پائی، مولانا ظفر علی خاں نے مرثیہ کہا اور اس شعر کی صداقت سے انکار کون کر سکتا ہے۔

کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صفِ ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا

دورِ عروج و کشور کشائی

چنگیز کے تاتاری لشکر کی ترک تازیوں اور سفاکیوں کی بدولت جب خوارزم کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تو اس کے بہت سے قبائل اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے، انہی میں ارطغرل کا قبیلہ تھا ارطغرل اپنے قبیلہ کو لے کر ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا، اور سلطان علاء الدین سلجوقی کے حدود مملکت میں داخل ہو گیا۔

زندگی کا نیا دور

علاء الدین سلجوقی ارطغرل کی شجاعت شہامت، جان نثاری اور دلاوری سے بہت متاثر ہوا، اس نے بازنطینی (عیسائی) سرحد سے ملے ہوئے ایک علاقہ کو بطور جاگیر مرحمت فرمایا، یہاں ارطغرل کو بہادری کے جوہر دکھانے کا اور زیادہ موقع ملا، بارہا بازنطینی قلعداروں سے معرکے ہوئے، گھمسان کے رن پڑے اور ہر مرتبہ ارطغرل کامیاب رہا، ارطغرل کی ان کارناموں نے اس کے بہت سے نئے رفیق پیدا کر دیئے، ایشیائے کوچک میں جو ترک پہلے سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ وہ بھی اس کے دامان معرفت میں پناہ گزیں ہوئے۔

ارطغرل اب صرف ایک جاگیردار ہی نہیں تھا، بلکہ علاء الدین کا سپہ سالار بھی تھا، اس نے علاء الدین کی طرف سے بازنطینیوں اور تاتاریوں سے کئی زبردست لڑائیاں لڑیں قسمت نے ہر مرتبہ ساتھ دیا، اور وہ فاتح و غانم واپس آیا۔

سلطنت کی داغ بیل

۱۲۸۸ء میں عثمان خان کو قدرت نے خود بخود بادشاہ اور فرمانروا بننے کا موقع بہم پہنچا دیا، اپنے باپ کی طرح وہ بھی سلطان قونیہ (سلطنت سلجوقی) کا ایک اطاعت شعار جاگیردار تھا، لیکن باپ کی وفات کے پہلے ہی سال، اس نے بازنط

سے ایک زبردست جنگ کے بعد قلعہ قراجہ حصار چھین لیا، یہ بہت بڑی اور خلاف توقع کامیابی تھی سلطان علاء الدین سلجوقی اس کارنامہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے یہ سارا علاقہ عثمان کو دے دیا، اور راہ نوازش خسروانہ اسے بک کا خطاب مرحمت فرمایا، صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہ اجازت بھی اسے دے دی کہ وہ اپنے حدود میں اپنا سکہ چلائے، اور جمعہ کے خطبہ میں امام اس کا نام لے،

حسن اتفاق عثمان کی زندگی اسی ڈھرے پر بسر ہو رہی تھی کہ تاتاریوں کی ایک یورش نے اس کے عروج کا مزید سامان مہیا کر دیا، تاتاریوں کو مسلمانوں سے ان کی تہذیب و تمدن سے ان کی طاقت اور عروج سے کد تھی، وہ رہ رہ کر مسلمان مملکتوں پر حملے کرتے تھے، اور جہاں کامیاب ہوتے تھے، ہر چیز کو غارت کر کے رکھ دیتے تھے، ۱۳۰۰ء میں تاتاریوں نے بڑی تیاریوں اور اہتمام کے ساتھ ایشیائے کوچک پر حملہ کیا، اس جنگ میں سلطان علاء الدین مارا گیا، اس کا جانشین غیاث الدین ہوا، لیکن وہ بھی تاتاریوں کے ہاتھ سے قتل ہوا، غیاث الدین اور علاء الدین کے بعد سلطنت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا، اور اس طرح عثمان کی آزادی، اور خود مختاری پر خود بخود مہر لگ گئی،

دو راستے اب عثمان خان کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے تھے کہ وہ اپنے رہوار عروج کو جس طرف چاہے موڑ دے،

ایک راستہ یہ تھا کہ مسلمان حکومتوں کے زیر کرنے اور ان پر قبضہ جمانے کی ترکیب سوچتا، دوسرا یہ تھا کہ مسلمانوں سے قطع نظر کر کے وہ بازنطینی مورچوں کو فتح کرنے میں دست و بازو اور ذہن و دماغ کی ساری قوتیں صرف کر دیتا، اس نے یہی دوسرا راستہ اختیار کیا۔ تائید غیبی اس کے ساتھ تھی، پہلے اس نے اندرونی اصلاح و احوال کی طرف توجہ کی، پھر وہ اپنے اصل حریف پر متوجہ ہوا۔

پہلی فتح عظیم ۱۳۰۱ء میں عثمان نے حکومت قسطنطنیہ کی زبردست افواج کو شکست دے کر نائکومیڈیا پر قبضہ کر لیا، پھر جوں جوں بڑھاپے تو چند سال کے مختصر سے وقفہ میں اس کے فتوحات کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا، ۱۳۱۷ء میں عثمان نے بازنطینی سامراج کے ایک بہت بڑے اور اہم مرکز بروصہ کا محاصرہ کر لیا، ۱۳۲۶ء میں عاجز آ کر محاصرین نے ہتھیار ڈال دیئے اور عثمان

بیٹا اورخان باپ کی علالت کے باعث تن تنہا ایک فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے اپنی فوج گراں کے ساتھ بروصہ میں داخل ہوا۔

ایک اور فتح

۱۳۳۷ء میں اورخاں کی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی نے بازنطینیوں سے ایک اور بڑا شہر ناک چھین لیا، بازنطینی سلطنت کا یہ بہت بڑا مرکز تھا، اس شہر کے چھن جانے سے جہاں مسلمانوں کے عروج کے دروازے کھل گئے، وہاں بازنطینی سلطنت ڈگمگانے لگی۔

گیلی پولی پر قبضہ

۱۳۵۲ء میں کنٹاکوزین نے ایک نازک موقع پر، اورخاں سے مدد طلب کی، وہ دوستوں کی طرف دست اعانت بڑھانے میں کبھی تامل نہ کرتا تھا، بیس ہزار فوج مدد کو بھیج دی، کنٹاکوزین نے احسان مندی کا ثبوت دیتے ہوئے قلعہ زنپ پیش کر دیا، جس پر اورخان کے بڑے لڑکے سلیمان پاشا نے قبضہ کر لیا، یہ پہلا یورپین قلعہ تھا جس پر مسلمان ترکوں نے قبضہ کر لیا، کچھ روز بعد تھریس میں سخت زلزلہ آیا جس سے بہت سے شہروں کی شہر پناہیں منہدم ہو گئیں، انہی میں گیلی پولی بھی تھا، یہ زنپ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع تھا، اور دردانیال کے مغربی ساحل پر اپنا فوجی وعسکری حیثیت سے بہت ممتاز مانا جاتا تھا، سلیمان پاشا نے موقع غنیمت سمجھ کر گیلی پولی پر قبضہ کر لیا، یونانی مزاحمت نہ کر سکے، ایسے سراسیمہ ہوئے کہ بھاگ کھڑے ہوئے، سلیمان نے گیلی پولی کے استحکام پر توجہ کی پھر وہاں بڑی تعداد میں ترکوں اور عربوں کو لا کر بسا دیا،

فتح ادرنہ

تھریس کے مختلف چھوٹے موٹے مقامات کو فتح کرنے کے بعد، مراد نے ۱۳۶۲ء میں عیسائیوں سے ایک بہت اہم مقام ادرنہ چھین لیا، اس طرح تھریس کا سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین ہو گیا۔ مراد کی اس کامیابی نے عیسائیوں کو چوکنا کر دیا، وہ بری طرح افتراق باہمی اور اختلاف مذہبی میں مبتلا تھے، لیکن اب انہوں نے متحد اور منظم ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یورپ کی سرزمین سے ترکوں کو نکال ڈالیں گے۔ پوپ اربن پنجم نے، سرویا، بوسینا، ہنگری، اور ولاچیا کے عیسائی فرماں رواؤں کو ترغیب جنگ دی، اور یہ سب اتحادی بن کر بیس ہزار فوج لے کر تھریس میں پہنچے کہ ترکوں کو نکال باہر کریں۔

حیرت انگیز شجاعت مراد اناطولیہ میں تھا کہ اُسے عیسائی فرمانرواؤں کے ہجوم و اقدام کی اطلاع ملی، وہ فوراً کیل کانٹے سے لیس ہو کر چل پڑا، لیکن قبل اس کے کہ وہ موقع واردات پر پہنچے اس کا ایک سپہ سالار لالہ شاہین ایک مختصر سی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور ایک رات جبکہ عیسائی افسر اور سپاہی مسلمانوں کی طرف سے بے فکر اور غافل ہو کر، راگ رنگ، رقص و نغمہ اور شراب و کباب کی دلچسپیوں میں منہمک تھے، قضائے مبرم بن کر پہنچا اور تقریباً سب کو کاٹ کر رکھ دیا جو چند نفوس بچے وہ دریا میں کود پڑے اور ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ہنگری کا بادشاہ بذات خود موجود تھا، لیکن بمشکل جان بچا کر بھاگا، حالانکہ مسلمان تعداد میں عیسائی افواج کے نصف بھی نہیں تھے۔ اس طرح یورپ میں بلقانی ریاستوں میں، سلاتی اقوام سے براہ راست مسلمانوں کی آویزش ہوئی، اور وہ کامیاب ہوئے، مراد نے اس واقعہ کے چند سال بعد بروصہ کے بجائے حالات و مصالح کے مطابق ادرنہ کو پایۂ تخت بنا لیا، تاکہ یورپ کی طرف اقدام و ہجوم میں آسانی ہو،

قسطنطنیہ کی باج گزاری اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ شاہ قسطنطنیہ نے سلطنت عثمانی کا باج گذار بننا منظور کر لیا، یہ معاہدہ کیا کہ آئندہ جب کبھی سلطان مراد کسی سے جنگ آزما ہوگا تو اس کی مدد کرے گا۔ لیکن شہنشاہ قسطنطنیہ اس معاہدے پر قائم نہ رہا، وہ اس معاہدہ کو اپنی مستقل توہین سمجھ رہا تھا، ۱۳۶۹ء میں اس نے روم کا سفر کیا، اور پوپ کے دربار میں حاضر ہو کر یونانی کلیسا سے اپنی برأت اور بیزاری کا اظہار کیا، اپنے "گناہوں" سے توبہ کی، کلیسائے رومہ کی بالادستی اور عظمت کا اعتراف کیا، لیکن وہ پوپ کو اس پر آمادہ نہ کر سکا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اعلان جہاد کرے، کیونکہ پوپ اب تک اس کی ذہنی اور روحی تطہیر کا قائل نہیں ہوا تھا،

سلسلۂ فتوحات ۱۳۶۹ء میں مراد نے بلغاریا کی طرف پیش قدمی کی، ۱۳۷۱ء میں اس کے سپہدار لالہ شاہین نے صوفیا کے جوار میں سروی اور بلغاری افواج کا مقابلہ کیا، انہیں شکست دی اور کوہ بلقان تک کا سارا بلغاری علاقہ تصرف میں لے لیا، ۱۳۷۵ء میں مراد کی فوجیں مقدونیا پر حملہ آور ہوئیں، اور پھر پیش قدمی کرتی ہوئی قدیم سرویا، البانیہ

ر بوسینا میں داخل ہوئیں، شاہ سرویا لازار نے شکست کے بعد پیمانِ اطاعت باندھا، بلغاریہ کے فرمانروا
یمان نے صلح کی التجا کی اور اپنی لڑکی شادی کے لئے پیش کی، ۱۳۸۵ء میں مراد نے صوفیا فتح کر لیا، سلیمان
اپنی ملکہ اور اہلِ خاندان کے ساتھ قدم بوس ہو کر رحم کی درخواست کی، ۱۳۸۶ء میں اس نے شدید
جنگ کے بعد نیش پر قبضہ کر لیا، سرویا نے تابِ مقاومت نہ دیکھ کر خراج دینے کی شرط پر صلح کر لی۔

متحدہ یورش ۱۳۸۸ء میں ایک مرتبہ پھر شکست یافتہ ہزیمت خوردہ اور پیمان صلح باندھنے
الی حکومتوں نے کچھ نئے حلیف اور ساتھی پیدا کر کے مراد اول پر حملہ کرنے اور ترکوں کو یورپ سے
نکالنے پر کمر باندھی، اس معرکہ میں سرویا، بوسینا، بلغاریہ، البانیہ، ولاچیا، ہنگری اور پولینڈ نے پورے
زور و قوت کے ساتھ حصہ لیا، ابھی مراد بروصہ سے مقابلہ کے لئے نہیں پہنچا تھا، کہ بوسینا میں بیس
ہزار افراد کی عثمانی فوج پر اس متحدہ فوج نے حملہ کر کے پندرہ ہزار کو قتل کر دیا، لیکن مراد کے ایک سپہ سالار
علی پاشا نے اپنے آقا کے حکم کے مطابق یلغار کی، شاہ بلغاریہ بھاگ کھڑا ہوا، یہی حشر شاہ سرویا کا ہوا
بلغاریہ اور سرویا کے متعدد علاقوں پر ترکوں نے قبضہ کر لیا، ۱۳۸۹ء میں کسووا کے میدان میں عیسائیوں
کی افواج متحدہ اور ترکوں سے آخری معرکہ ہوا، اس میں اگرچہ دھوکہ سے ایک سروی نے مراد کو خنجر
مار کر ہلاک کر دیا، لیکن مرنے سے قبل سلطان نے سروی بادشاہ لازار کو قتل کیا، اور جب مسلمانوں نے پورے
طور پر عیسائیوں کو شکست دے لی، تب وہ جاں بحق ہوا۔

وفادار عیسائی عیسائیوں کی متحدہ افواج کو شکست دینے کے بعد، بایزید نے سرویا کی خود مختاری
تسلیم کر کے اسے باج گذار بنا لیا، لازار کو مراد مرنے سے پہلے قتل کرا چکا تھا
اب اس کا جانشین اسٹیفن تھا، اس نے اپنی بہن، شہزادی، ڈیسپینا کو بایزید کے حبالۂ نکاح میں دے دیا
اور زندگی بھر نہایت وفاداری کے ساتھ بایزید کا حقِ رفاقت ادا کرتا رہا، بڑے بڑے معرکوں اور تیغوں
کے ہجوم میں بھی یہ ثابت قدم رہا، اور اپنی وفاداری پر اس نے داغ نہ آنے دیا۔

فتوحات کا سیلاب بایزید کا دورِ حکومت (آخری ایام سے قطع نظر) فتوحات مسلسل کا
عہد ہے، اس نے جدھر کا رخ کیا، کامیاب رہا، شکست اور ہزیمت



ایسے الفاظ تھے جن سے وہ بالکل ناآشنا تھا۔

اس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کو گر کر صلح کرنے پر مجبور کر دیا، اس نے ایشیائے کوچک کی باقی ماندہ ریاستوں میں سے اکثر پر قبضہ کر لیا، اس نے سمرنا پر حملہ کیا، اس نے اپنے بہنوئی امیر کرمانیہ کی سلطنت کو بہ جبر ممالک محروسہ میں شامل کر لیا، اس نے ولاچیا کو باج گذار بنا لیا، ۱۳۹۳ء میں اس کے بیٹے سلیمان نے اس کے حکم سے بلغاریہ کے پایہ تخت پر قبضہ کر لیا،

بلغاریہ کا حشر اس قبضہ نے بلغاریہ کی ساری حیثیت ختم کر دی، شاہی خاندان نابود ہو گیا، پھر بایزید نے ہنگری کی سرحد پر واقع کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا، جتنی چھوٹی چھوٹی ترکی ریاستیں تھیں ان پر بھی بایزید کا پرچم لہرانے لگا، آخر میں قطمونی باقی رہ گئی تھی اسے بھی لے لیا۔

افواج متحدہ عیسائی، ترکوں کی اس یلغار سے کافی پریشان ہو چکے تھے، آخر شاہ ہنگری نے دوسری عیسائی بادشاہتوں کی مدد سے عیسائیوں کی افواج متحدہ کے ساتھ آخری جنگ لڑنے کی ٹھانی، اس فوج میں فرانس کے امرا اور سپاہی بھی شریک تھے، کیونکہ اس جنگ نے مذہبی تقدس کا رنگ اختیار کر لیا تھا، پاپائے روما کی ہمدردیاں بھی ہنگری اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ تھیں، جرمنی کے امرا بھی بڑے جوش و خروش اور شوق سے ترکوں کو مارنے آئے تھے، ولاچیا۔ اگرچہ صلح تھی، لیکن وہ بھی صلح جو اتحادی محاذ کا ایک رکن بن گیا، عیسائی مورخین کا بیان ہے کہ عیسائی لشکر ایک لاکھ سے کم نہ تھا۔

ابتدا میں عیسائیوں کو فتح ہوئی، چند مقامات پر انہوں نے (بایزید کی عدم موجودگی میں) قبضہ بھی کر لیا، لیکن بایزید کے آتے ہی پانسہ پلٹا، اور اس متحدہ فوج کا بری طرح خاتمہ ہو گیا۔

یونان اور قسطنطنیہ پھر یونان کی طرف بایزید متوجہ ہوا، اور مختلف و متعدد شہروں پر بڑی آسانی سے قبضہ کر لیا، پھر قسطنطنیہ کا از سر نو محاصرہ کیا، اور زیادہ سخت شرائط پر اسے باج گذار بنا کر واپس ہوا۔



سالونیکا اور سرویا کی فتح ۱۴۳۰ء میں مراد نے بازنطینی سلطنت کے مشہور شہر سالونیکا کو بزور شمشیر فتح کر لیا، ۱۴۳۸ء میں نئے شاہ سرویا کی شرارت اور سازش کا جواب مراد نے اس طرح دیا کہ جنگ کی اور تمام و کمال سرویا پر قبضہ کر لیا،

تاریخی معرکہ ۱۴۴۰ء میں شاہ پولینڈ لاڈسلاس ہنگری کے تخت کا بھی مالک قرار پایا، ایک فوجی سردار ہونیاڈے نے شاہ مذکور کو یقین دلایا کہ وہ مسلمانوں کو شکست دے دے گا، اسی زمانہ میں مراد کا ایک سپہ‌سالار مرید پاشا ٹرانسلوینیا میں ایک قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، ہونیاڈے مقابلہ میں آیا، اس نے ترکوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی اس جنگ میں بیس ہزار ترک مارے گئے، ہونیاڈے نے مرید پاشا اور ان کے لڑکے کو اپنے سامنے ہلاک کرا دیا، جب دسترخوان پر بیٹھا تو تمام ترک قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ان کی آہ اور کراہ میں اسے بڑی لذت ملتی تھی، اس کے بعد مراد نے ۸۰ ہزار کی ایک فوج شہاب الدین کی سرکردگی میں بھیجی اسے بھی ہونیاڈے نے شکست دی، ترکوں کی ان شکستوں سے عیسائیوں کو یقین ہو گیا کہ اب یورپ سے وہ نکالے جا سکتے ہیں، چنانچہ ہنگری، پولینڈ، ولاچیا، بوسینا اور سرویا نے پھر ایک اتحادی محاذ بنایا، فرانس اور جرمنی نے بھی جنگجو سورماؤں کی بڑی تعداد نذر کی، یورپ کے ہر ملک سے سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد آکر شریک ہوئی، پوپ کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنا ایک نمائندہ کو مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا، اور بہت بڑی رقم بھیجی، کیونکہ یہ اسلام اور صلیب کی جنگ تھی، وینس اور جنوا کی حکومتوں نے بھی بحری بیڑے سے مدد کی،

مراد کے پاس کوئی بحری بیڑہ نہیں تھا وہ ایشیائے کوچک میں باغیوں سے برسرپیکار تھا عیسائی سپاہ نے ۱۴۴۳ء میں دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے اور نیش کے مقام پر ترکوں کو پھر شکست دی یہ رنگ دیکھ کر مراد نے صلح کی کوشش کی ۱۴۴۴ء میں زیجیڈین کے مقام پر صلح نامہ ترتیب پایا، جس کی رو سے سرویا آزاد ہو گیا، یہ صلح دس سال کے لئے تھی، اس معاہدہ پر عمل کرنے کی قسم مراد نے قرآن لے کر اور لاڈسلاس نے انجیل لے کر کھائی تھی لیکن اس معاہدہ کو ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ موقع

دیکھ کر عیسائیوں نے عہد شکنی کی۔ بعض لوگوں نے حلف کا ذکر کیا تو پوپ کے نمائندے جولین نے کہا۔ "غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہیئے!"[1] پھر اس نے بعض غیر مطمئن لوگوں کو تشفی دیتے ہوئے کہا — "پوپ کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں، اور اگر اب بھی کچھ پس وپیش ہے، تو اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں"[2]

اب یہ فوج جوش سے بھری ہوئی سلطنت عثمانیہ کو پارہ پارہ کر دینے کی غرض سے آگے بڑھی اور ترکوں کی متعدد چوکیوں، قلعوں اور مورچوں پر قبضہ کر لیا، ترکوں کو چٹانوں سے گرا گرا کر ہلاک کر دیا، یہاں تک کہ وارنا کا محاصرہ کر لیا،

معاہدہ کے بعد مراد نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، اور اپنے ۱۴ سالہ بیٹے محمد کو تخت نشین کر کے خانہ نشین ہو گیا تھا، لیکن یہ بدعہدی دیکھ کر مراد نے پھر میدان جنگ کا رخ کیا، بڑی حکمت عملی سے اپنی فوجیں لے کر ایشیائے کوچک سے یورپ پہنچا اور وارنا سے تھوڑی دور اپنے خیمے نصب کرا لیے،

جنگ شروع ہوئی، عیسائیوں کو اپنی فتح کا پورا الیقین تھا، ان کا ساز و سامان اسلحہ، سپاہیوں کی کثرت، ہر چیز ان کے اس یقین کو مستحکم کر رہی تھی، مراد کو خدا پر بھروسہ تھا، اور وہ زیر لب دعا کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا شروع میں عیسائیوں کی فتح ہوئی پھر "ینی چری" نے مراد کی سرکردگی میں ایسا حملہ کیا کہ عیسائیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، لاڈسلاس شہنشاہ پولینڈ و ہنگری کو ایک ترک نے بڑھ کر قتل کر دیا، پاپائے روم کا نائب جولین بھی ہلاک ہوا، اور ہونیاڈے کو بھی فرار پر قرار کرنا پڑا۔

سروِیا اور بوسینا اس جنگ کے بعد سرویا اور بوسینا پر پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

فتح قسطنطنیہ قسطنطنیہ کی اہمیت اور اسے فتح کر لینے کا خیال ہمیشہ سے مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں رہا ہے قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ ۴۸ھ میں ہوا، اس میں متعدد صحابہ کرام بھی شریک تھے، جن میں حضرت ابو ایوب انصاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امویوں اور

---

[1] کریسی جلد ۱ صفحہ ۱۰۸ بحوالہ دولت عثمانیہ [2] جلد اول جلد ۴ صفحہ ۴۴ بحوالہ دولت عثمانیہ

عباسیوں کے دور میں بھی قسطنطنیہ پر چڑھائی ہوئی، لیکن ہر مرتبہ معاملہ ٹل گیا۔

پھر عثمان خان اور اس کے جانشینوں نے بھی اس کی کوشش کی، حملے کئے، محاصرے جاری رکھے، لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح محاصرہ اٹھا لینا پڑا، شاید اس لئے کہ یہ سعادت محمد فاتح کے مقدر میں لکھی تھی، شاہ قسطنطنیہ کی شرارتوں سے تنگ آ کر محمد نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ قسطنطنیہ کو فتح کئے بغیر دم نہ لے گا لیکن اس شہر کا فتح کر لینا کچھ آسان نہ تھا، قدرت نے بڑی فیاضی سے حفظ و دفاع کی سہولتیں اسے بہم پہنچائی تھیں، اس مثلث نما شہر کے دو حصے سمندر سے گھرے ہوئے تھے، لہٰذا ادھر سے گویا اطمینان تھا، ترک اگرچہ آبنائے باسفورس پر قابض تھے لیکن کسی بڑے بحری بیڑے کے مالک نہ تھے، صرف مغرب کی طرف خشکی کے راستے حملہ کیا جا سکتا تھا لیکن اسے بادشاہ نے بہت زیادہ مستحکم کر لیا تھا —— کئی کئی فصیلیں لمبی چوڑی خندقیں کیل کانٹے سے لیس مسلح سپاہی۔

اپریل ۱۴۵۳ء میں محمد نے قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع کیا، محاصرہ کے دوران میں جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا، ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ترکوں نے زور دار اور فیصلہ کن حملہ کیا، شاہ قسطنطنیہ نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا، یونانی سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور اس کثرت تعداد پر انہیں ناز بھی تھا، اور اس پر بھی کوئی شبہ نہیں یونانی بڑی بے جگری سے لڑے، لیکن ترکوں کے کامیاب حملوں کو نہ روک سکے، ان کی ٹکڑیاں فصیل کی دیواروں سے چڑھنے لگیں، ترک توپچی قیامت کی گولہ باری کرنے لگے، آخر شاہ قسطنطین لڑتے ہوئے مارا گیا، یونانی بے بس ہو گئے، اور شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا، محمد سینٹ صوفیہ کے گرجے پر پہنچا، حکم دیا اذان دی جائے اور پھر وہ خدائے مالک الملک کے سامنے سربسجود ہو گیا۔

محمد اسی فتحمندی کے بعد "محمد فاتح" کے نام سے مشہور ہو گیا،

کچھ اور فتوحات

۱۴۵۹ء میں سربیا باقاعدہ سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، اس کی کوئی آزادانہ اور خود مختارانہ حیثیت باقی نہیں رہی، اس طرح ۱۴۶۲ء میں بوسنیا بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک جزو بن گیا، ۱۴۶۰ء میں موریا اور کرمانیہ پر بھی ترکوں کا مکمل تسلط قائم ہو گیا۔

کریمیا کی فتح

۱۴۷۵ء میں محمد فاتح کے سپہ سالار، صدر اعظم احمد کدک نے جنگی بیڑے کی مدد سے چالیس ہزار فوج کے ساتھ کریمیا بھی فتح کر لیا، جو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے ترکوں کے لئے گراں مایہ حیثیت رکھتا تھا،

البانیہ کا سقوط

البانیہ سے بھی بار بار معاہدے ہوتے، لیکن وہ مستحکم نہ ثابت ہو سکے، آخر ۱۴۷۶ء میں محمد فاتح کی فوجیں البانیہ پر بھی قابض ہو گئیں۔

فتح عظیم

احمد کدک پاشا، محمد فاتح کا جیالا اور منچلا سپہ سالار سرکشوں کی تادیب اور باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا، وہ دولت عثمانیہ کی توسیع کے لئے سراپا جہد و عمل بنا ہوا تھا، ۱۴۸۰ء میں اس نے اٹلی کے دروازے، اوٹرانٹو پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد اطالیہ براہ راست ترکوں کی زد میں آگیا۔

ہرزی گووینا

یورپ کی متعدد ریاستوں کو زیر کر کے ترکوں نے ان پر قبضہ نہیں کیا، بلکہ صرف باج گذار بنانے پر اکتفا کیا، لیکن اگر بعد میں ان کی طرف سے عہد شکنی، غداری اور شرارت کا ظہور ہوتا تو پھر انہیں ممالک محروسہ میں شامل کر لیا گیا، ہرزی گووینا سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱-۱۵۱۲ء) کے عہد میں مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا،

اسمٰعیل صفوی سے جنگ

ایران کا بادشاہ شاہ اسمٰعیل صفوی، بڑا دلیر، بہادر اور حوصلہ مند بادشاہ تھا، لیکن اپنے مذہب یعنی شیعیت میں بہت متشدد تھا، یہی حال سلیم اول (۱۵۱۲-۱۵۲۰ء) کا تھا، یہ بھی اپنے مذہب یعنی سنیت میں بہت متشدد تھا، وہ اہل تسنن پر سختیاں کرتا تھا، یہ شیعہ آبادی کا دشمن جان بن گیا تھا، سلطنت عثمانیہ کے خلاف سازشیں کرتا تھا، یہ ایران کو زک دینے کے منصوبے بناتا رہتا تھا ۱۵۱۴ء میں بارہ سو میل کا پہاڑی اور دشوار گذار راستہ طے کر کے، فتح کو تسلیاں دیتا ایران کی سرحد پر پہنچ گیا، تبریز کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی اس جنگ میں ایران کو شکست ہوئی ۲۵ ہزار ایرانی کھیت رہے، خود شاہ اسمٰعیل بڑی مشکل سے زخمی حالت میں جان بچا کر بھاگا۔

دیار بکر اور کردستان

سلیم اول نے دیار بکر اور کردستان کو مکمل طور پر فتح کرلیا، اب تک یہ ایران کے حدود مملکت میں شامل تھے، اب ان کا شمار عثمانی سلف کے مقبوضات میں ہونے لگا۔

شام کی فتح

۱۵۱۶ء میں سلطان سلیم اول نے شام پر حملہ کیا، حلب کے قریب مرج عراق کے میدان میں پہلا معرکہ پیش آیا، شام پر ممالک کا قبضہ تھا، یہ جنگ اگرچہ زوردار تھی لیکن صرف ایک گھنٹہ میں ختم ہوگئی، پانسہ ترکوں کے ہاتھ رہا۔

چند اور فتوحات

شام کے بعد حلب نے بغیر لڑے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے، دمشق، بیت المقدس، حمص وغیرہ نے بغیر لڑے جھگڑے اطاعت قبول کرلی۔

مصر پر قبضہ

مصر پر اب طومان بے کا قبضہ تھا، یہ بھی خاندان ملوک کا ایک فرد تھا، لیکن بڑا نڈر، بیباک، بہادر، جفاکش اور حوصلہ مند، سلیم اول کی فتوحات سے یہ ذرا بھی مرعوب و متاثر نہیں ہوا، برابر آخری جنگ کی تیاریاں کرتا رہا، سلیم اپنی فوجوں کو لے کر جنوری ۱۵۱۷ء میں مصر کے دروازے پر پہنچ گیا، بڑی خونریز لڑائی ہوئی، ملوک اس بہادری سے لڑے کہ دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن بالآخر انہیں شکست ہوئی، شکست کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ترک ممالیک کے مقابلہ میں زیادہ بہادر تھے، اگر دست بدست جنگ ہوتی تو شاید ممالیک کا پلہ بھاری رہتا، لیکن اس جنگ کا فیصلہ توپ اور بندوق سے ہوا اور ممالیک کے پاس نہ توپ تھی نہ بندوق اس لئے نہیں کہ یہ کوئی نادر چیز تھی، اس لئے کہ اس کا استعمال یہ شجاعت اور تہور کے خلاف سمجھتے تھے

حجاز مقدس

حجاز مقدس پر مصر کے ممالیک کا قبضہ تھا، جب مصر ہار گیا، اور ترکی حکومت کا مقبوضہ بن گیا تو قدرتاً حجاز اور یمن کی حکومت بھی ترکوں کے ہاتھ میں آگئی، اور وہ "خادم الحرمین الشریفین" بھی بن گئے، حجاز اور یمن کے باشندوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی، بے تامل سلطان کے نام پر بیعت کرلی۔

خلافت اسلامیہ پر قبضہ شام، مصر، حجاز اور یمن پر سلیم کا قبضہ ہوجانے کے بعد اب اسلامی ممالک میں کوئی اس کا حریف اور مدمقابل نہیں رہ گیا، بغداد کی خلافت تباہ ہوچکی تھی، عباسی خلیفہ ممالیک کی تحویل میں تھا، وہ اس کے نام سے فائدہ اٹھاتے تھے، حکومت خود کرتے تھے، سلیم نے مناسب سمجھا کہ خلافت پر بھی قبضہ کرلے، اس کا عندیہ دیکھ کر خلیفہ المتوکل نے اپنے تمام حقوق و اختیارات اسے سونپ دیئے، مقامات مقدسہ، اور حرمین شریفین کی کنجیاں حوالہ کردیں، جو تبرکات تھے وہ بھی سونپ دیئے،

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

بلغراد پر قبضہ سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد ہنگری کی آویزش سے تنگ آکر یورش کی، ۱۵۲۱ء میں اس نے بلغراد کو فتح کرلیا، اس فتح سے جمہوریہ وینس اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ اس نے پھر سے باج گزار بننا منظور کرلیا، اور خراج کی رقم بھی دوچند کردی۔

روڈس کی فتح روڈس میں صلیبیہ کے جاں بازوں کے باقیات الصالحات رہتے تھے۔ یہ مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے، سلطنت عثمانیہ کا استیصال ان کی زندگی کا مقصد تھا، اپنے جہازوں پر بیٹھ کر یہ بحرپیمائی اور ترک تازیاں کرتے تھے، سلیمان نے فیصلہ کرلیا کہ ان کا قلع قمع کیا جائے، چنانچہ وہ ۲۸ جولائی ۱۵۲۲ء کو روڈس کے ساحل پر آترا، پہلی اگست کو محاصرہ شروع کیا، اور ۲۵ دسمبر کو قبضہ کرلیا،

ہنگری مسلمانوں کے قبضہ میں ہنگری بھی ان ممالک میں تھا، جو سلطنت عثمانیہ سے خار کھاتے تھے، وہ دولت علیہ کے دشمنوں سے ہمیشہ ساز باز کرتا رہتا تھا، چنانچہ اس نے ترکوں کے خلاف ایران سے ایک معاہدہ کرلیا،

سلیمان یہ بات برداشت نہ کرسکا، فوج گراں لے کر روانہ ہوا، ۲۸۔ اگست ۱۵۲۶ء کو زبردست اور فیصلہ کن جنگ ہوئی، شاہ لوئی بھاگتا ہوا غرق دریا ہوا، پھر بڑی شان وشکوہ سے ہنگری کے پایۂ تخت

(بغ)داد میں سلیمان داخل ہوا، بادشاہ لاولد مرا تھا، ایک امیر کو بادشاہ بنایا اور قسطنطنیہ واپس چلا گیا۔

۱۵۲۹ء میں سلیمان نے ویانا (آسٹریا) کا بھی محاصرہ کیا، لیکن اندرونی چپقلش کی وجہ سے محاصرہ اٹھا کر واپس چلا گیا، ورنہ حالات ایسے تھے کہ ویانا پر قبضہ ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا،

موصل اور بغداد پر تسلط

۱۵۳۴ء میں سلیمان نے ایران کی طرف پھر کوچ کیا، نبرد آزما ہوتا ہوا موصل اور بغداد پہنچا، یہ دونوں ایران کے صوبے تھے (ا)ن پر قبضہ کیا، اور سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا،

عدن مقبوضات عثمانی میں

۱۵۵۴ء میں سلیمان نے پھر ایران پر حملہ کیا، اور کئی شہروں پر قبضہ کر لیا، اسی سلسلہ میں اس نے آرمینیا اور مسوپٹامیا کے بعض بڑے علاقوں پر بھی تسلط جما لیا، پھر اپنی بحری قوت کو کام میں لایا اور عدن پر مستقل قبضہ کر لیا، سلیمان نے بحری طاقت پر بہت زیادہ توجہ کی تھی، اور رفتہ رفتہ یہ طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسپین اور (و)ینس کے بحری بیڑے بھی عثمانی بیڑے سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

تونس اور قبرص کی فتح

سلطان سلیم ثانی (۱۵۶۶ء—۱۵۷۴ء) کے عہد میں قبرص پر ترکوں نے ۱۵۷۰ء میں حملہ کیا، سات ہفتہ کے محاصرہ کے بعد قبرص کے پایۂ تخت نکوسیا پر قبضہ ہو گیا، پھر دوسرے قلعے بھی سر ہو گئے، اور سارے قبرص پر ترکوں کا عمل دخل ہو گیا، ۱۵۷۴ء میں (سن)ان پاشا نے، اسپینیوں کا استیصال کر کے تونس کے پورے صوبہ پر قبضہ کر لیا، اور اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا،

جارجیا پر قبضہ

۱۵۷۶ء میں شاہ طہماسپ کے انتقال کے بعد، ترکی فوجیں جارجیا پر حملہ آور ہوئیں، ایران اور جارجیا میں دوستی کا معاہدہ تھا، مصطفیٰ پاشا نے جارجیا کے پایۂ تخت طفلس پر قبضہ کر لیا، پھر بڑی آسانی سے سارا جارجیا اس کے تصرف میں آ گیا،

ایران سے منفعت بخش صلح

۱۵۹۰ء میں دولت ایران، اور سلطنت عثمانیہ سے جو آویزش تھی وہ ختم ہو گئی، اور پیمان صلح بندھا، اس

عہد نامہ کی رو سے جارجیا، شروان، لورستان، تبریز، اور آذربائیجان کا ایک حصہ مراد ثالث کے ممالک محروسہ میں شامل تسلیم کر لیا گیا۔

بغداد پر از سر نو قبضہ ۱۶۳۸ء میں سلطان مراد چہارم (۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء) بنفس نفیس فتح بغداد کے لئے آگے بڑھا، جس پر حالات سے فائدہ اٹھا کر، شاہ عباس صفوی شہنشاہ ایران نے قبضہ کر لیا تھا، سلطان کے محاصرہ کا ایرانی فوجوں نے شدت کے ساتھ مقابلہ کیا، پھر جب جنگ چھڑی تو افواج عثمانی کا بھی بڑی پامردی اور دلیری سے مقابلہ کیا، لیکن جون ۱۶۳۹ء میں بالآخر ایرانیوں کی شکست ہوئی، اور عثمانی فوجیں فاتحانہ یلغار کرتی ہوئی بغداد میں داخل ہو گئیں، بغداد فتح کر کے جب سلطان قسطنطنیہ پہنچا تو عوام نے اس کا بڑا یادگار اور شاندار استقبال کیا۔

کریٹ پر ترکی قبضہ جزیرہ کریٹ ہر اعتبار سے ترکوں کے لئے ضروری تھا، وہ اس مورچہ کو سر کرنے کے لئے کئی بار آگے بڑھے، لیکن منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، کریٹ کا محاصرہ کئی سال سے جاری تھا، آخر ۱۶۶۹ء میں بہ عہد سلطان محمد چہارم ترکی فوجیں اس پر قابض ہو گئیں، اور یہ مکمل طور پر سلطنت عثمانیہ کا ایک جزو بن گیا، کچھ عرصہ بعد جمہوریہ وینس اور سلطنت عثمانیہ میں ایک معاہدہ ہوا اور وینس نے بادل ناخواستہ اور باچشم پرنم کریٹ کی مفارقت گوارا کر لی

روس سے جنگ اور صلح نومبر ۱۷۱۰ء میں زار روس پیٹر کی شرارتوں اور بدعہدیوں سے مجبور ہو کر ترکی نے اعلان جنگ کیا، تاکہ اس کی نذیم حیثیت مسلم ہو جائے، زار خود فوج لے کر بڑھا، لیکن ترکوں نے اس طرح گھیر لیا کہ وہ نرغہ میں آگیا، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، اس کا یہ حال زار دیکھ کر اس کی ملکہ کیتھرائن آگے بڑھی اور اس نے ترک سردار محمد پاشا سے صلح کی استدعا کی، محمد پاشا کی عالی ظرفی نے مجبور دشمن کی جان لینا یا اسے گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا، وہ صلح پر راضی ہو گیا، لیکن صلحنامہ اس طرح لکھا کہ روسی ہمیشہ یہ محسوس کریں کہ وہ درحقیقت شکست کھا چکے تھے، چنانچہ معاہدہ کی ابتدائی سطریں یہ تھیں

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتحمند اسلامی فوج نے زار روس کو اس کی تمام فوجوں کے

ساتھ دریائے پرتھ کے قریب گھیر لیا ہے اور زار نے صلح کی درخواست کی ہے اور اسی کی درخواست پر مندرجہ ذیل دفعات (صلح) مرتب اور منظور کی جاتی ہیں ــــــ!"

اس معاہدہ نے ترکوں کی ساکھ بڑھا دی، اور اس کی مختلف دفعات کی رو سے انہوں نے من مانی باتیں روس سے منظور کرالیں۔

آسٹریا کی شکست

۱۷۳۷ء میں آسٹریا نے بدعہدی کی، صلحناموں کو ردی کا پرزہ قرار دیا، اور ترکی علاقوں پر تاخت و تاراج کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا ترک اگرچہ بہت پریشان تھے، اندرونی بغاوتیں اور سازشیں الشبائی رقیبوں کی سرکشی، ایران سے آویزش، خود دار السلطنت کے اندر ینی چری کی شورشیں، لیکن وہ نامساعد حالات میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے، آسٹریا کو جب انہوں نے جنگ آزما دیکھا تو پیچھے نہ ہٹے اور جنگ کا جواب جنگ سے دینا شروع کر دیا، اور آخر کار انہوں نے آسٹریا کو یادگار اور ناقابل فراموش شکست دی کہ وہ گڑگڑا کر صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔

روس اور آسٹریا کی صلح

جب تک روس کو یہ یقین تھا کہ وہ ترکوں پر غالب آجائے گا، اس وقت تک اس نے صلح کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا زار کے سپہ سالار نے یقین دلا دیا تھا کہ اس سے بہتر موقعہ ترکوں کو یورپ سے باہر نکالنے کا اور نہیں مل سکتا، زارینہ سپہ سالار کی ہم خیال تھی، اور جنگ شدت کے ساتھ جاری تھی۔

لیکن روس کی کامیابی مشروط تھی آسٹریا کے تحالف اور رفاقت پر بغیر آسٹریا کے تعاون کے یہ کڑی منزل وہ سر نہیں کر سکتا تھا، اور آسٹریا نے بھی اگرچہ روس کے نقش قدم پر چل کر انتہائی عیاری اور فریب کاری کے ساتھ ترکوں سے جنگ شروع کر دی تھی، لیکن وہ بری طرح ہارا، اور صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا، ترکوں نے صلح کی درخواست کبھی نہیں ٹھکرائی، وہ رضا مند ہو گئے۔ آسٹریا نے اتنی عجلت کے ساتھ صلح کی، کہ وہ روس سے صلاح و مشورہ بھی نہ کر سکا، بہرحال آسٹریا کے صلح کر لینے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ روس جنگ جاری رکھ سکے، چنانچہ آسے بھی بادل نخواستہ صلح کی درخواست کرنی پڑی اور حسب معمول گڑگڑا کر صلح کرنے

پر مجبور ہونا پڑا۔

دردانیال پر جنگ

فروری ۱۹۱۵ء کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے دردانیال پر گولہ باری شروع کی مسٹر چرچل کی رائے تو یہ تھی کہ دردانیال پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ چھین لیا جائے اور ترکی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے لیکن ترک ابھی زندہ تھے۔ انہوں نے ایسی گولہ باری کی کہ اتحادی جہازوں کو بھاگنا پڑا، اس معرکہ میں پچاس ہزار سپاہی اتحادیوں کے ہلاک ہوئے، دشمن کے بہت سے جہاز غرقاب ہو گئے۔ اور بہت سے مجروح۔

گیلی پولی کا معرکہ

دردانیال کی مہم میں ناکام ہونے کے بعد خشکی کے راستہ سے اتحادیوں نے ترکی پر حملہ کیا، میدان جنگ گیلی پولی قرار پایا (مئی ۱۹۱۵ء)، اتحادیوں نے کئی سپہ سالار بدلے لیکن کامیابی نہ ہوئی، یہیں مصطفےٰ کمال پاشا کے جوہر چمکے اور مصطفےٰ کمال کے استقلال اور بے پناہ گولہ باری نے اتحادیوں کو خستہ اور مضمحل کر دیا، جنگ کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ آخر کار اتحادی ہزاروں کشتے میدان جنگ میں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، مشہور امیر البحر لارڈ کچنر نے بھی اس محاذ کا معائنہ کیا، لیکن وہ بھی گیلی پولی کی تسخیر سے مایوس رہے۔

دردانیال اور گیلی پولی کے معرکوں نے ثابت کر دیا کہ کمزور اور بے دست و پا ہونے کے باوجود ترک دم خم رکھتے ہیں، زندہ رہنے کا گر بھی جانتے ہیں اور مرنے کا فن بھی۔

لیکن یہ کامیابیاں حالات کی نامساعدت کے باعث زیادہ نتیجہ خیز نہ ثابت ہوسکیں، ترکوں کو آخر کار شکست ماننی پڑی۔

اصلاحات

عثمان خاں کے دور میں سلطنت چونکہ بالکل ابتدائی حالت میں تھی، لہٰذا انتظامات بھی معمولی تھے، مثلاً کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی، بوقتِ ضرورت اعلانِ جنگ سنتے ہی رضاکار سپاہی آموجود ہوتے تھے، لڑائی لڑتے تھے، اور لڑائی کے بعد مالِ غنیمت لے کر پھر اپنے گھر چلے جاتے تھے۔

لیکن سرورخاں کے بھائی علاء الدین نے جو پہلا وزیر تھا، فوج میں انقلابی اصلاحات نافذ کئے، اس نے پیادوں، سواروں، اور رضاکاروں کی باقاعدہ ترتیب رکھی، اس نے باقا[redacted] اور تنخواہ دار فوج ملازم رکھی (یعنی چری) فوج ترتیب دی، جس نے آگے چل کر دولتِ عثمانیہ کے عروج وزوال میں بڑا حصہ لیا،

اوقاف کی ابتدا

مراد اول نے فوجی جاگیروں کا بندوبست کیا، شاہی جاگیر الگ قائم کی مسجدوں مدرسوں، اور دوسرے مذہبی اداروں کے لئے بہت سی زمینیں وقف کردیں تاکہ ان کی آمدنی سے ان خیر وبرکت کے اداروں کے مصارف باقاعدہ چلتے رہیں اور ان میں کسی قسم کا رخنہ اور خلل نہ پڑنے پائے۔

قانون نامہ

محمد فاتح کے دور میں نظمِ مملکت کے اصول وضوابط پر زیادہ ترجیح ہوئی، اس کا "قانون نامہ" گویا سلطنت عثمانیہ کا دستورِ اساسی ہے، اس نے متعدد نئے منصب قائم کئے، مثلاً قضاۃ عسکر، دفتردار (خازن) نشانجی (معتمد سلطنت) خواجہ (اتالیق شہزادگان) مفتی، رئیس آفندی، (چیف سکریٹری) آغا، سنجق بیگ۔

جاگیری نظام میں اصلاح

سلیمان اعظم نے نظام جاگیری کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کی، اس نے ایک قانون بنا دیا تھا کہ بڑی جاگیر چھوٹی نہیں بنائی جاسکتی تھی

جاگیر کی تقسیم اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتی، جب تک باب عالی سے اجازت نہ حاصل کی جائے، کوئی جاگیر وصیت نامہ کے ذریعہ کسی کو منتقل نہیں کی جاسکتی تھی، لاولد جاگیر سلطنت کی ملک ہو جاتی تھی۔

قانون رعایا سلطان سلیمان اعظم نے غیر مسلم رعایا کیلئے ایک ضابطۂ آئین ترتیب دیا، اور اسے غیر معمولی سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچا ئیں۔

عام قوانین فوج داری، پولیس اور دوسرے عام قوانین کی ترتیب و تہذیب پر بھی سلیمان نے خاص توجہ کی، اور ملا ابراہیم حلبی سے ایک مجموعہ قوانین تیار کرایا۔

بحری اصلاحات سلطان عبدالحمید (۱۷۷۴ء-۱۷۸۹ء) کے عہد میں اس کے وزیر بحریہ حسن پاشا الجزائری نے بحریہ کی اصلاح کی، اس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تعمیر کرائے، دوسرے اسلامی ممالک سے ماہر جہاز راں بلائے، اور ان کے خدمات سے فائدہ اٹھایا، اس نے یہ انتظام کیا کہ ماہر جہاز رانوں کی ایک معقول تعداد ہر وقت پایۂ تخت قسطنطنیہ میں ہنگامی ضروریات کے سلسلہ میں موجود رہا کرے اس نے یہ کوشش کی کہ جہاز رانوں کے لئے قسطنطنیہ میں مکین تعمیر کی جائیں، تاکہ انہیں قیام کی آسانی ہو۔

اصلاحات کا شاندار دور سلطان سلیم ثانی (۱۷۸۹ء-۱۸۰۷ء) کا عہد حکومت متعدد اعتبارات سے قابلِ ذکر ہے، لیکن اصلاحات کے اعتبار سے اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہوتے ہوتے اس کے عہد میں حالات کی ابتری، امرا کی خود سری، حکام کی مطلق العنانی "ینی چری" اور سپاہی کی، سرکشی، انتہائے عروج کو پہنچ چکی تھی، سلیم نے ان سب حالات کا جائزہ لیا اور طے کر لیا کہ جو کچھ وہ کر سکتا ہے کرے گا، اور یہ واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں اس کے کارنامے بڑے شاندار ہیں۔

اصلاحات کا عام دور سلیم نے سب سے پہلے جاگیری نظام کو یک قلم منسوخ کیا اور طے کیا کہ آئندہ سے ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانہ میں داخل کی جائے، حقیقت یہ ہے کہ جاگیری نظام نے بہت زیادہ ابتری اور خلفشار پیدا کر دیا تھا، اس نے پاشاؤں کے بڑھتے ہوئے اختیارات بھی تقریباً سلب کر لئے، ان اختیارات سے وہ ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی ہو گئے تھے، اور اپنے اپنے حلقوں میں بادشاہ عالی جاہ بن بیٹھے تھے۔ مال گزاری ٹھیکہ کے ذریعہ وصول کی جاتی

تھی سلیم نے یہ قاعدہ بھی توڑ دیا، اور یہ کام سرکاری عمال کے ذمہ کیا گیا کہ وہ مال گزاری وصول کریں، اور خزانہ عامرہ میں داخل کریں، صدراعظم کے لامحدود اختیارات پر بھی پابندی عائد کی گئی، اور اُسے اس امر کا پابند بنایا گیا کہ وہ تمام اہم معاملات میں دیوان (مجلس مشورت) سے صلاح لے،

مدارس و مکاتب سلیم اس حقیقت کا رمز شناس تھا کہ جب تک جہالت رہے گی، مملکت کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوں گی، چنانچہ اُس نے تعلیم کی ترویج و توسیع پر سب سے زیادہ توجہ کی، اور مدارس و مکاتب کا ایک جال اپنی مملکت میں بچھا دیا،

علمی تراجم سلیم کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے یہ بات بھی محسوس کر لی تھی کہ علم کسی کی جاگیر نہیں ہوتا، اور اگر ہے تو صرف مسلمان کی گم شدہ میراث ہے، جیسا کہ حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے الحکمۃ ضالۃ المؤمن، چنانچہ اس نے دوسری زبانوں سے علوم و فنون کے تراجم پر بھی توجہ کی، چنانچہ فرانسیسی زبان سے متعدد کتابوں کے ترکی ترجمے شائع ہوئے اور ان کی سرکاری طور پر اشاعت کی گئی،

فوجی اصلاحات ینی چری، اور سپاہ کے دستے، بے شک جنگ میں سرفروشی دکھاتے تھے لیکن امن کے زمانہ میں وہ بغاوت اور سرکشی کو بھی اپنا شعار بنا لیتے تھے، قدامت پرست اتنے تھے کہ نہ کسی اصلاح کے قبول کرنے پر آمادہ تھے، نہ جدید طرز جنگ سیکھنے پر آمادہ ہوتے تھے اگر اختیار کیا جاتا تھا تو بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے، اور خون کی ندیاں بہا دیتے تھے۔

سلیم نے انہیں چھیڑنے کے بجائے، عمر آغا کی سرکردگی میں ایک نئی فوج قائم کی جو بالکل جدید یورپین طرز پر مرتب کی گئی تھی، اگرچہ ینی چری نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ لیکن وہ اپنے عزم پر ڈٹا رہا،

فرنچ توپچی اور انجینئر فرانس کے سفیر نے بطور نذر کے سلیم کی خدمت میں چند فرنچ توپچیوں اور انجینئروں کو پیش کیا کہ ان کی خدمات سے وہ فائدہ اٹھائے، سلطان نے ممنونیت کے ساتھ یہ پیش کش قبول کر لی اور اس سے تھوڑا بہت فائدہ بھی اٹھایا،

بحریہ اصلاح بحریہ کے اصلاحی پروگرام کو بھی شدت سے روبہ عمل لایا گیا، نئے جنگی جہاز یورپین طرز پر تعمیر ہوئے، فرانس اور سویڈن کے انجنیئر بلوائے گئے۔ اور ان کے خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا،

اصلاحات محمودی سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء – ۱۸۳۹ء) کا دور حکومت انقلاب انگیز اور عہد آفرین اصلاحات کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے، اس نے ینی چری کے کامل استیصال کے بعد، ساری توجہ اصلاحات کے نفاذ پر صرف کر دی، اس نے قدیم طرز کی تمام فوجوں کو برخاست کر دیا، اور جدید اسلوب پر فوجوں کی از سر نو تنظیم کی،

بادشاہوں کے اختیارات بادشاہوں کے اختیارات بہت بڑھے ہوئے تھے، اپنے علاقہ میں ملزم کو قتل کی سزا تک دے سکتے تھے، محمود نے یہ اختیار چھین لئے، اور ایک فرمان کے ذریعہ اعلان کیا کہ کوئی شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مقدمہ کی سماعت بغیر قتل نہیں کیا جا سکتا!

اپیل کا حق بادشاہوں کو سزائے موت تک کا اختیار حاصل تھا، محمود نے صرف یہ اختیارات ہی نہیں چھینے بلکہ ہر ملزم کو اپیل کا حق بھی دیا، اس نے یہ اصول طے کیا کہ پہلے قاضی عسکر کے حضور میں اپیل کرے، اگر وہاں سے مسترد ہو جائے تو پھر ملاحظۃ السلطانی میں اپیل کی جائے، یہاں سے اگر مسترد ہو تو سزائے قتل کا نفاذ ہو سکتا ہے۔

اوقاف کا انتظام ترکیہ میں اگرچہ اوقاف کافی تھے، لیکن ان کا انتظام نہایت ناقص تھا، محمود نے اس طرف توجہ کی، اور بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کا سدباب یوں کیا کہ جملہ اوقاف کی نگرانی حکومت کے ذمہ قرار دے دی۔

عمامہ کے بجائے ٹوپی سلطان محمود نے لباس کی طرف بھی توجہ کی، اور اس سلسلہ میں اصلاحی قدم اٹھایا، اس نے عمامہ کے بجائے ترکی ٹوپی رائج کی، فوج کے لئے مغربی طرز کا لباس ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد منظور کیا،

سلطان عبدالمجید خاں (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء) نے اپنے دورِ حکومت میں بہت سے دو

اصلاحات جیل

اور نتائج کے اعتبار سے دور رس اصلاحات

اصلاح جیل سے متعلق بھی تھی، اپنے فرمان میں سلطان نے اعلان کیا

”قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی، اور

نئے ضابطے مرتب کئے جائیں گے، علاوہ ان سزاؤں کے منتخب

کی رو سے مقرر ہوں گی، اور تمام ایذائیں یکسر قلم منسوخ کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا،

کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی ی تحریر کا حق تسلیم کر لیا گیا، پریس کو زیادہ

مجلس تعلیم عامہ

اب تک تعلیم کا انتظام باقاعدہ طور سے ستوا

ہاتھ میں تھا، اور وہی اس سلسلہ میں لطیف موقع پاتے ہی عبدالحمید ثانی نے دستور

عبدالمجید خاں نے یہ صورت بھی بدل دی، ۱۸۴۶ء کے ایک فرمان کی رو سے ی، مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا۔

جن کے ذمہ ایک یونیورسٹی کی تشکیل و قیام کی ذمہ داری بھی تھی تعلیم، آزاد پسند طبیعت نے صرف اس پر ہی

سپرد کر دیا گیا، نیز مسجدوں میں جو مکتب قائم تھے ان کی تنظیم بھی کی، دستور کو جلاوطن کر دیتا، اس نے

یں دے گیا۔

جنگی اصلاحیں

عبدالمجید خاں نے اور بہت سے امور کی ضبط نہ کر سکے وہ میدان میں آ گئے۔

پیمانہ تو بت آفریں طبیعت کی اہت. بنا ڈالی جس کا مقصد جدید

فوج کی بھرتی کا ایک ۱۸۰۰ء) فوج کا خاتمہ کیا جائے۔

نظام اسلامی فرقوں کے نمائندے بھی شریک

کرتی تھی،

یہ اور ناگہانی منصور نزاع کے لئے مجبر

بحریہ اصلاحات اسٹیٹ

سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱ء - ۱۸۷۶ء) کے عہد میں ایک کونسل آف اسٹیٹ ک
قیام عمل میں آیا، (۱۸۶۸ء) یہ مجلس دوگونہ اختیارات کی حامل تھی
کے خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا، بھی حاصل تھے، آد
سلطان محمود میں مسلمان اور عیسائی دونوں تھے۔

اصلاحات محمودی

اصلاح زیر کے عہد میں ایک عدالت عالیہ بھی پہلی مرتبہ قائم ہوئی، جسے انصا
کال استیفال کے بعد، ساری توجہ اصلاحات میں زیادہ سے زیادہ وسیع تر اختیارات حاصل تھے، عدالت عالیہ ک
برخاست کر دیا، اور جدید اسلوب پر ادا برابر برابر تھی!
تو ۱۸۴۰ء میں ایک ضابطہ فوجداری بنا تھا لیکن وہ بہمہ وجوہ مکمل

پاشاؤں کے اختیارات

ں تھا، پھر ۱۸۵۰ء میں ایک ضابطہ تجارت بھی تشکیل کیا گیا، لیکن
چھین لئے، اور ایک فرمان کے ذریعہ
بغیر قتل نہیں کیا جاسکتا! میں ایک جدید ضابطہ دیوانی جس کا نام "مجلہ" تھا نافذ کیا گیا، جس
پاشاؤں کو ہوا کی ضروریات کے مطابق مدون کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اپیل کا حق

ہی نہیں سلطان عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ء - ۱۹۰۹ء) بڑا مستعد فرماں روا تھا، لیکن مدحت
پہلے قاضی عسکر کے حضور میں اپیل کر پاشا وزیر اعظم بھی ایک آہنی عزم کا انسان تھا اس نے سلطان کی تخت
کی جاتے، یہاں سے اگر مسترد ہو تو لے لیا تھا کہ وہ دستور اساسی جلد از جلد نافذ کرے گا۔
ترکوں نے نفاذ دستور کے راستے میں روڑے اٹکائے، لیکن مدحت کو ہر دلعزیزی

اوقاف کا انتظام

ا حنویت استدلال اور منطق پر مبنی تھا، پھر اس مطالبہ کی پشت پناہی
کہ جملہ اوقاف کی نگرانی حکومت ہو کر با دل نخواستہ دسمبر ۱۸۷۶ء میں دستور اساسی کا اعلان ہوا، اس
بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا، گھر گھر چراغاں ہوا مدحت پاشا زندہ

عمامہ کے بجائے ٹوپی

فوج کے لئے مغربی طرز کا لباس

پارلیمنٹ کا قیام دستور اساسی کی رُو سے ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا، جس کے دو ایوان تھے۔

۱- ایوان زیریں

۲- ایوانِ بالا-

آخر الذکر کے نمائندے نامزد ہوتے تھے، اور اوّل الذکر کے منتخب۔

کابینہ کا قیام ایک کابینہ کا قیام عمل میں آیا جسے پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا،

اعلانِ آزادی نیز آزادی اجتماع، آزادی تقریر اور آزادیٔ تحریر کا حق تسلیم کر لیا گیا، پریس کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کا وعدہ کیا گیا۔

فریب ہی فریب لیکن، یہ سب فریب ہی فریب تھا، موقع پاتے ہی عبدالحمید ثانی نے دستور منسوخ کر دیا، پارلیمنٹ برخاست کر دی، مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا۔

انجمن اتحاد و ترقی عبدالحمید ثانی رحمۃ اللہ (۱۸۷۶ء-۱۹۰۹ء) کی استبداد پسند طبیعت نے صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ مدحت پاشا جیسے مدبر، دستور کو جلاوطن کر دیتی، اس نے مدحت پاشا کو گرفتار کر کے طائف بھیج دیا، اور وہاں پھانسی پر چڑھا دیا۔

مدحت کے قتل کے بعد نوجوان ترک اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو زیادہ ضبط نہ کر سکے وہ میدان میں آ گئے۔

انہوں نے انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک مضبوط فعال اور کارگزار جماعت بنا ڈالی، جس کا مقصد وحید یہ تھا کہ ملک میں دستوری نظام حکومت رائج کیا جائے، اور شخصی مطلق العنانی کا خاتمہ کیا جائے۔

۱۹۰۷ء میں عثمانی انقلابیوں کا ایک اجتماع پیرس میں ہوا، اس میں غیر مسلم فرقوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اس میں

۱- عبدالحمید کی معزولی

۲- سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ

۳- کامل مساوات، مذہب اور نسل سے بالا ہو کر،

کا اصول بالاتفاق طے تھا۔

خفیہ جلسے ترکیہ کے اندر اور باہر اس انجمن کے ممبر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ممبروں میں خواتین کی بہت بڑی تعداد تھی اور یہ سب بڑے جوش و خروش سے حصول مقصد کی سعی و کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

حلف نامہ انجمن کے ہر ممبر کو حلف لینا پڑتا تھا کہ وہ اپنی جان انہیں کے اغراض و مقاصد پر قربان کر دیگا اگر مصلحت ملی کا تقاضہ ہوا تو بھائی بہن کے قتل سے دریغ نہیں کرے گا، یہ قسم قرآن اور تلوار ہاتھ میں لے کر کھانا پڑتی تھی۔

استبداد خون آشام عبدالحمید بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا، وہ اپنے نظام جاسوسی پر پورا بھروسہ کرتا تھا، اور کوئی شبہ نہیں اس کے جاسوس ہر ممکن طریقہ سے ضروری اور خفیہ اطلاعات بہم پہنچاتے رہتے تھے، اس نے انجمن کو توڑنے اور ارکان انجمن کو مرعوب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، قتل تو ایک بہت معمولی اور عام سزا بن گئی تھی،

انقلاب کا کوچ جولائی ۱۹۰۸ء میں انجمن کی طرف سے باقاعدہ عملی طور پر تحریک انقلاب شروع کی گئی، حکومت کی کوئی سختی بھی اس بڑھتی ہوئی رو کو نہ روک سکی، جیسے جیسے سختی کی گئی، حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔

اعلان دستور آخر جب عبدالحمید نے اپنی زندگی اور اپنی سلطنت کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی، اور اس کے حامیوں اور ساتھیوں نے بھی منہ موڑ لیا تو ہر طرف سے مایوس اور بے بس ہو کر اس نے اپنی مجلس وزراء کے مشورہ سے متاثر ہو کر ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو دستور کا پھر سے اعلان کر دیا۔

انور پاشا کے الفاظ اس مسرت انگیز موقع پر انور پاشا نے کہا،

"آخر کار استبداد کا خاتمہ ہو گیا، اب ہماری حکومت ہے، اب آج سے ہم سب بھائی بھائی ہیں، اب نہ کوئی بلغاری ہے، نہ یونانی، نہ رومانی ہے، نہ جمہوری، نہ ترک، اس نیلے آسمان کے نیچے ہم سب برابر ہیں، اور صرف

عثمانی ہونے پر فخر کرتے ہیں

شرارت ایک طرف تو انجمن کی کامیابی پر یورپ چراغ پا ہو رہا تھا، دوسری طرف خود عبدالحمید پیچ و تاب کھا رہا تھا، آخر اس نے پھر چپقلش برپا کی۔ لیکن اب دستوری پارٹی (انجمن اتحاد و ترقی) اتنی طاقت حاصل کر چکی تھی کہ اسے دبایا نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ ۲۷ - اپریل ۱۹۰۹ء کو مجلس ملی نے سلطان کو معزول کر دیا اور وہ با حسرت و یاس سالونیکا چلا گیا، جہاں نظر بندی کے عالم میں ۱۹۱۸ء میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بھائی ارشاد محمد پنجم کے نام سے تخت نشین ہوا

اصلاحات کمالی مصطفےٰ کمال پاشا نے جنگ عظیم کے اختتام کے بعد جب ترکی کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لی، تو دور رس اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا جس نے ساری دنیا کو چونکا کر دیا،

جمہوریت اور عزل خلافت پہلا کام یہ کیا کہ خلیفۃ المسلمین (عبدالحمید خاں) کو جلاوطن کر دیا اور ملک میں جمہوریت کی داغ بیل ڈالی،

کئی سو برس تک ترکوں نے خلافت کا بار اٹھایا، اب انہوں نے محسوس کیا کہ اس ذمہ داری کو وہ انجام نہیں دے سکیں گے، لیکن اس سلسلہ میں انہوں نے عالم اسلام سے کچھ مشورہ نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترکیہ سے باہر جو کروڑوں مسلمان ترکوں کے لئے سر ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے، بہت برہم ہوئے،

تحریک خلافت ہندوستان میں مولانا محمد علی شوکت علی نے تحریک خلافت کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ خلافت اسلامیہ ترکیہ کو مصائب سے محفوظ رکھنے میں مدد دیں، لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کے اس غیر متوقع فیصلہ نے مسلمانان ہند و پاکستان، تحریک خلافت اور اسلامی ہند کی قیادت کو بڑا صدمہ پہنچایا۔

پتلون دوسرا کام مصطفےٰ کمال نے یہ کیا کہ سابق لباس بالکل ترک کر دیا اس کے بجائے پتلون اور ہیٹ کو حکماً رواج دیا۔

تیسرا کام مصطفےٰ کمال نے یہ کیا کہ ایک فرمان کے ذریعہ پردہ بھی ممنوع اور قابل سزا فعل قرار دیا، ترک کمال کے آہنی پنجہ کی گرفت میں اس طرح آ چکے تھے، کہ وہ اس حکم

کی تعمیل ہی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

لاطینی رسم الخط ترکی زبان بے شک اپنا ایک الگ اور مستقل وجود رکھتی تھی، لیکن اس کا رسم الخط عربی تھا، مصطفےٰ کمال پاشا نے برسر اقتدار ہونے کے بعد لاطینی رومن رسم الخط نافذ کیا، اور عربی حروف کو عتق، بے مروتی اور احسان فراموشی کے ساتھ جلاوطن کر دیا۔

ترکی زبان اور اذان ایک اور فیصلہ مصطفےٰ کمال نے یہ کیا کہ قدیم ترکی زبان کا احیا تعصب اور عصبیت کے ساتھ شروع کر دیا، عربی الفاظ چھانٹ چھانٹ کر نکالے جانے لگے، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ترکی الفاظ ان کی جگہ پہلائے جانے لگے، یہ اصلاح بھی ترکوں کو چار و ناچار قبول کرنی پڑی، پھر دوسرا قدم کمال نے یہ اٹھایا کہ اذان اور بعض روایات کے مطابق نماز بھی کے لئے حکم صادر کیا کہ وہ ترکی زبان ہی میں دی جائے، خطبہ جمعہ تک تو خیر کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اس اقدام نے اگرچہ رواج حاصل کر لیا، لیکن ترکوں کو بھی اس فیصلہ سے روحانی صدمہ ہوا، ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں جب نئے صدر حکومت محمد جلال بایار نے اذان پھر سے عربی میں دینے کی اجازت دی تو جس دن پہلی مرتبہ مسجدوں میں اذان دی گئی تو ترکوں کا ۱۹۰۰ء میں یہ حال تھا کہ وہ ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ بہت سے ترک وفور مسرت سے بے قابو ہو کر رونے لگے۔

مسجد ایا صوفیہ سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تھا تو ایا صوفیہ میں شکرانہ کی نماز ادا کی تھی، اس دن سے اس نے قسطنطنیہ کی سب سے بڑی اور شاندار مسجد کی حیثیت اختیار کر لی، لیکن مصطفےٰ کمال نے اس کی یہ حیثیت یک لخت بدل دی اور اسے نیشنل میوزیم میں تبدیل کر دیا۔

سیکولر حکومت اب تو ترکی حکومت میں عیسائیوں کا کوئی سوال نہیں رہ گیا تھا، کیونکہ انہوں نے آزادی اور خود مختاری حاصل کر کے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں لیکن مصطفےٰ کمال نے پھر بھی یہ ضروری سمجھا کر ترکی حکومت کو "سیکولر حکومت" بنا دیا۔

علم و تعلیم

اپنے دورِ حکومت میں عثمان خان اوّل کو بہت سی چیزوں ...
یہ کمی اس کے ہونہار بیٹے اور جانشین اورخان نے پوری کی۔
علم و فضل و کمال کا شہر بنا دیا تھا: اس دور میں بروصہ نے اتنی شہ...
ممالکِ عرب کے طالبانِ علم کشاں کشاں دور و دراز سفر کی صعوبتیں ...
و بامراد ہوتے پھر شاداں و فرحاں اپنے وطن واپس چلے جاتے

پہلا دار العلم

سلطنتِ عثمانیہ کا پہلا مدرسہ وہ تھا جو اور...
قائم کیا گیا تھا۔

سلطان محمد (۱۴۱۳ء) نے بھی اپنے دورِ حکومت میں بر...
دور دور سے طالبانِ علم کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔

مولانا جامی کی امداد

محمد فاتح سلاطینِ عثمانیہ میں علم دو...
وہ خود بھی بہت سی زبانوں ...
یونانی زبانوں پر اسے پوری دسترس تھی —— "وہ ہر سال گراں قدر ...
اور مولانا جامی (ایران) کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔"[1] علاوہ ازیں ...
اور مدارس قائم کئے۔

مشاہیرِ یونان و روما کا ترجمہ

آخری بازنطینی ... اور ...

...ہو فنون کی ترویج کی سعی کرتا تھا، اسی سلطان کے
...مت کا کام شروع ہوگیا، اگرچہ مفتیِ اعظم نے
...کومت ہاتھ میں لی اس کا وزیرِ اعظم راغب پاشا
...تھا، خدمتِ خلق سے بڑی دلچسپی تھی، عوام
...حصہ لیتا تھا، اس نے سلطنت کے اندر متعدد
...التعلق تھا، لہٰذا خزانہ حکومت سے قطع نظر
...ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ عوام کے لئے
...کے
...ہوا، اس [illegible] بھی ہیں
...ش شکست ہوئی،
...لئے موجود تھی، باپ
...بیٹے مراد جی کو قتل کر
...ں کا چھینا ہوا علاقہ بھی
...اپ کو اپنا سردار اور آقا مانتا
...اور سلیمان نے بار بار مراد اوّل
...سرِ ندامت جھکا کر حاضر ہوتے، سلطان
...اور مدرس عثمان خان، بڑا فیاض اور
...اور فتنہ فشاں تھا، اس کی یہ خصوصیت اس کے جانشینوں

[1] "ترکی" از لین پول صفحہ ۱۰۲ بحوالہ دولتِ عثمانیہ

کی تعمیل ہی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

نقطین اور پیتھوڈ ایمس کے سوانح حیات اور کارنامے

لاطینی رسم الخط

ترکی زبان بے ہُ اس کے حکم سے یونانی سوانح نگار نے پلیٹارک

تھا، مصطفےٰ کمال ر معروف کتاب جو مشاہیر یونان و روما کے

نافذ کیا، اور عربی حروف کو منسوخ، بلے مرتبیں ترجمہ کی گئی۔ ؎

ترکی زبان اور اذان

ایک تاریخ نے ہر محلہ میں اور ہر بڑے گاؤں میں مکاتب کا ایک

اوزار بچھا دیا تھا، اعلیٰ تعلیم کے مدارس بھی اس نے کثرت سے قائم

جانے لگے، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ترکی ا ی بڑی جائدادیں وقف کیں، ان میں صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعات

قبول کرنی پڑی، پھر دوسرا قدم کمال نے ، اقلیدس اور ہیئت کی تعلیم دی جاتی تھی، ناسخ طلبہ کو "دانشمند"

حکم صادر کیا کہ وہ ترکی زبان میں دی جا تا کر بحریث سمجھنا چاہیئے۔

اگرچہ رواج حاصل کر لیا، لیکن ترکوں ا سلیمان اعظم (سنہ $\frac{1520}{1566}$ ء) علم کا بڑا قدر دان تھا، علما کی سرپرستی

جب نئے صدر حکومت جلال بایار نے خاص طور پر کرتا تھا، اس نے علما کی تعلیمی تنظیم کی طرف توجہ کی،

مسجدوں میں اذان دی گئی تو ترکوں کا ، اور سارے طبقۂ علماء کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا، ایک

سے ترک و فور مسرت سے بے قابو ہو صورت میں بھی ضبط نہیں کی جا سکتی۔

مسجد ایا صوفیہ

سلطان محمد ف سنہ چہارم (سنہ $\frac{1648}{1687}$ ء) علما کا بڑا قدر دان تھا، علما کی ہم نشینی

تھی، اس ا سے بہت دلچسپی تھی، مورخین کی بھی قدر کرتا تھا، ان کی حوصلہ افزائی

اختیار کر لی، لیکن مصطفےٰ کمال نے ایوز تھا، ان کی کتابیں پڑھتا تھا، اور جہاں کہیں ترمیم و اصلاح کی

سیکولر حکومت

اب نم ، سے تخفیف و اضافہ کرتا تھا، اگرچہ یہ شکار کا بے حد شائق تھا،

نے سرپرستی، اور علما و فضلا کی ہم نشینی میں حارج نہ ہو سکا۔

لیکن مصطفےٰ کمال نے پھر بھی یہ ضروری (سنہ $\frac{1703}{1730}$ ء) اگرچہ ایک ناکام فرماں روا تھا۔ لیکن علم اور اصحاب علم

کا بھی، بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، وہ علما کی صحبت کو پسند کرتا تھا

مدرسوں اور مکتبوں کی توسیع و تعمیر سے دلچسپی لیتا تھا علوم و فنون کی ترویج کی سعی کرتا تھا، اسی سلطان کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ایک پریس قائم ہوا، اور یہاں طبع و اشاعت کا کام شروع ہو گیا، اگرچہ مفتی اعظم نے یہ شرط لگا دی تھی کہ "قرآن مجید نہیں چھاپا جا سکتا"۔

کتب خانے

۱۷۵۷ء میں مصطفیٰ سوم نے عنان حکومت ہاتھ میں لی اس کا وزیر اعظم راغب پاشا بڑا بیدار مغز، اور اولوالعزم شخص تھا، خدمت خلق سے بڑی دلچسپی تھی، عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق کاموں میں جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا، اس نے سلطنت کے اندر متعدد شفاخانے تعمیر کرا کے اچھی عمارتیں بنوائیں چونکہ علم سے بھی گہرا تعلق تھا، لہٰذا خزانہ حکومت سے قطع نظر کر کے ... خالص سے ایک کتب خانہ قائم کیا، اس کتب خانہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ عوام کے لئے

ہے

... خانہ قائم ہوا، اس ... میں

... خانہ میں ... شکست ہوئی،

... مارش کے لئے موجود تھی، باپ

... اپنے بیٹے صاد و جی کو قتل کر

بلکہ اس کا چھینا ہوا علاقہ بھی

... آپ کو اپنا سردار اور آقا مانتا

... بیں تھیں۔

... ار اور سلیمان نے بار بار مراد اول ... اور ...

سے شکست کھائی لیکن جب یہ سر ندامت جھکا کر حاضر ہوتے، سلطان

داد و دہش

سلطنت عثمانیہ کا بانی اور مؤسس عثمان خان، بڑا فیاض اور دریا دل انسان تھا، اس کی یہ خصوصیت اس کے جانشینوں

اگرچہ رفتہ رفتہ [illegible]

جب سے صدر جمہوریہ [illegible]

مسجدوں میں اذان دی گئی [illegible]

سے ترک وفورِ مسرت سے بے قابو [illegible]

مسجد ایا صوفیہ

سلطان محمد فاتح [illegible] چہارم

تھی، اسرائیل بہت دلچسپی بھی

اختیار کرلی لیکن مصطفےٰ کمال نے [illegible]

ما، ان کی کتابیں پڑھتا

سیکولر حکومت

اب تک [illegible] سے تخفیف و اضافہ کرتا تھا۔

[illegible]

رہ پرستی، اور علما و فضلا کی ہم نشینی

لیکن مصطفےٰ کمال نے پھر بھی یہ ضرور [illegible]

(۱۷۰۳ء - ۱۷۳۰ء) اگرچہ ایک ناکام فرماں روا

بھی، بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، وہ عثمانی

رعایا پروری، خطا بخشی اور داد و دہش

امیر کرمانیہ کو سلطنت عثمانیہ سے کد سی تھی، وہ ہمیشہ اس سلطنت کے خلاف سرگرم کار رہا، اگرچہ عثمانی فرماں روا اس کے مسلمان ہونے کے باعث حتی الامکان آویزش اور تصادم کے امکانات کو حتی الامکان برابر ٹالتے رہے۔

نفیسہ کی شادی

مراد اول نے امیر کرمانیہ علاء الدین سے تعلقات دوستی مستحکم کرنے کے خیال سے اپنی لڑکی شہزادی نفیسہ کی شادی کردی، پھر بھی امیر کی ستورہ نیتی میں فرق نہیں آیا، ۱۳۷۷ء میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی، اسی جنگ میں علاء الدین کو ذلت بخش شکست ہوئی، لیکن جب سزا کا وقت آیا، تو مراد کی لڑکی نفیسہ باچشم پرآب شوہر کی سفارش کے لئے موجود تھی، باپ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا، چنانچہ جس نے بغاوت کے جرم میں اپنے بیٹے صاود جی کو قتل کر دیا تھا، اس نے بیٹی کی التجا پر داماد کو معاف کردیا، نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کا چھینا ہوا علاقہ بھی واپس کردیا، علاء الدین نے سر ندامت جھکایا اور برملا کہا "آج سے میں آپ کو اپنا سردار اور آقا مانتا ہوں۔"

سرویا اور بلغاریہ

سرویا اور بلغاریہ کے بادشاہوں لازار اور سلیمان نے بار بار مراد اول سے شکست کھائی لیکن جب یہ سر ندامت جھکا کر حاضر ہوتے، سلطان نے معاف کردیا!

رعایا پروری اور داد و دہش

سلطنت عثمانیہ کا بانی اور مؤسس عثمان خان، بڑا فیاض اور دریا دل انسان تھا، اس کی یہ خصوصیت اس کے جانشینوں

اور بیٹوں میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔

پہلا لنگر خانہ چنانچہ اورخان نے جو عثمان خان کا لائق ترین جانشین تھا، ناقابل فاقہ مست اور بے روز لوگوں کے لئے ایک لنگر خانہ قائم کیا، جہاں صبح و شام انہیں بغیر کسی زحمت کے آذوقہ میسر ہوتا رہتا تھا۔

سلطان محمد (۱۴۱۳ - ۱۴۲۱ء) نے بھی بروصہ میں محتاجوں اور غریبوں کے لئے ایک لنگر خانہ کھولا تھا جہاں سے دونوں وقت انہیں کھانا ملتا تھا۔

صدقات دینی سلیمان اعظم (۱۵۲۰ - ۱۵۶۶ء) نے مخصوص اوقات کے علاوہ اپنے خاص گودام سے حرمین شریفین میں غلہ بھیجنا شروع کر دیا، اس نے مصر کے کئی دیہات، بیت المال سے خرید کر ان کے اناج کو اہل حرمین کے لئے وقف کر دیا، علاوہ ازیں مصر میں زمینوں سے جو رقم لی جاتی تھی، اس کے لئے سلیمان اعظم نے یہ انتظام کیا کہ بجائے اس کے کہ وہ خزانہ عامرہ میں داخل ہوا سے مصر کے علما اور مشائخ پر صرف کرنا شروع کیا، ان سب باتوں پر بالا وہ اپنی جیب خاص سے بھی بڑی بڑی رقمیں اچھے اور نیک کاموں پر صرف کرتا رہتا تھا!

رواداری غیرمسلموں کے ساتھ

سلاطین عثمانیہ جہاں اور خوبیوں اور خصوصیتوں کے اعتبار سے یگانہ تھے، وہاں ان میں ایک اور صفت بھی تھی، وہ تھی رواداری، وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہرگز اسے پسند نہیں کرتے تھے، کہ دین و مذہب کے معاملہ میں کسی پر جبر کریں، وہ اس قرآنی ارشاد کے رمز آشنا تھے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی } دین کے معاملہ میں جبر و جدر روا نہیں (کیونکہ) ہدایت گمراہی سے تمیز ہو چکی ہے!

اب یہ ہر شخص کا خود معاملہ ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے، خواہ گمراہی، خواہ ہدایت!

اورخاں کی عیسائی بیوی

۱۳۴۵ء میں اورخاں نے بازنطینی سلطنت کے ایک امیرالامراء کنتا کوزین کی بغیر کسی طمع و حیلہ کے مدد کی، اس نے اپنی حسین لڑکی تھیوڈورا اسے خود اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق اورخاں سے شادی کر دی، اورخاں نے شادی کے بعد شہزادی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر خوشی سے قائم رہ سکتی ہے۔ کیونکہ از روئے مذہب مسلمان اہل کتاب عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں، چنانچہ اورخاں نے شہزادی تھیوڈورا سے کبھی یہ فرمائش نہیں کی کہ وہ اسلام قبول کر لے۔

دشمن کی شہادت

مراد اول کی ساری زندگی عیسائیوں سے لڑتے، عیسائی فرمانرواؤں سے جنگ کرتے گذری، لیکن اس نے عام عیسائیوں پر کبھی کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھی، ان کے مذہبی معاملات میں کبھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں، ۱۳۸۵ء میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو ایک خط

میں لکھا تھا کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی عطا کر دی تھی اور شاید — یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۶۶ء اور ۱۳۸۹ء کے درمیان بطریق اعظم کے دور میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی[1]

فتح قسطنطنیہ کے بعد عثمانی ترکوں کو بازنطینی حکومت سے مسلسل آویزش رہی، قسطنطنیہ کے بادشاہوں نے ہمیشہ اس کی کوشش کی، ترک یورپ سے نکال دیئے جائیں انہوں نے اندرونی سازشوں اور علانیہ جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا، لیکن ۱۴۵۳ء میں جب بے انتہا جانی و مالی قربانی کے بعد محمد نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے عیسائیوں سے کوئی انتقام نہیں لیا، داخلہ کے وقت تھوڑا بہت کشت و خون ضرور ہوا، لیکن داخلہ کے بعد ترکوں کی تلوار نیام میں پہنچ گئی حالانکہ عیسائی فاتح مسلمانوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ ڈالنے کے عادی تھے — داخلہ کے انتہائی چند گھنٹوں کے بعد کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی، اور وہ اس میں کامیاب رہا —[1]

امن عام قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخلہ کے بعد سلطان محمد نے امن عام کا اعلان کر دیا، جو عیسائی خوف و دہشت کے باعث شہر سے فرار ہو گئے تھے، ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا، اور ترغیب دی کہ آئیں بسیں اور اپنے اپنے کام میں لگ جائیں، پھر اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو پھر سے اس کے منصب پر بحال کیا اور کلیسا کی سرپرستی قبول کرنے کا اعلان کیا اور ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، نیز کلیسا کے عہدے دار تمام محاصل سے مستثنیٰ کر دیئے گئے — اسی فرمان کی رو سے عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی مکمل آزادی دی گئی، نیز یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ اپنے قومی معاملات و مسائل اپنی قومی عدالتوں کے ذریعہ طے کر لیا کریں، علاوہ ازیں عیسائیوں کے قانون نکاح اور قانون وراثت میں کوئی مداخلت نہیں کی،

---

[1] ہر برن گبنس صفحہ ۷۸، بحوالہ دولت عثمانیہ جلد اول،

"ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ بطریق کی عزت قائم رکھی بلکہ عدالت کے رجس میں فریقین عیسائی ہوں) اختیارات بھی دے دیئے"

اسی طرح لارڈ ایورسلے نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:

"محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومتوں کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی ——!"

ڈیوک نوٹاراس

——"ڈیوک نوٹارس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا، جب گرفتار کر کے لایا گیا، تو محمد نے اسے معاف کر دیا بلکہ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لئے گیا، جو ملال اور غم (شکست) کے باعث بیمار پڑ گئی تھی، نہایت نرمی اور احترام سے جس طرح کوئی لڑکا ماں کو سمجھاتے اسے تسلی و تشفی دی، کئی اسیر جنگ افسروں کا زر فدیہ اس نے خود ادا کیا![1]

روڈس کے صلیبی سورما

۱۵۲۲ء میں سلیمان اعظم نے روڈس کو فتح کر لیا، یہاں کے عیسائی جنگجوؤں کی، جو محاربات صلیبی کی یادگار تھے اور مسلمانوں کو ہمیشہ تنگ کیا کرتے تھے، اجازت دے دی کہ وہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحہ اور ہر قسم کے سامان کو لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں، جاتے وقت وہ اپنے ہی جہاز استعمال کر سکتے ہیں،

یہ تو ہوا جنگ کرنے والوں کا حال، عام باشندوں کو سلطان نے کامل مذہبی آزادی عطا کر دی، اعلان کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا، اور —— پانچ سال تک ان سے کسی قسم کا محصول (ٹیکس) بھی نہیں لیا جاتے گا

اسلام کے دامن میں پناہ

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء – ۱۵۶۶ء) نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ اتنی زیادہ رعایت برتی اور ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ عیسائی فرمانرواؤں کی عیسائی رعایا بھاگ بھاگ کر مسلمانوں کے دامن میں آ کر پناہ ڈھونڈھتی تھی، سلطنت عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے مذہبی غلاموں (   ) کے فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سرحدی

---

[1] لارڈ ایورسلے ص ۹۸ بحوالہ دولت عثمانیہ

عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے، اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے، لارڈ کریسی سلیمان اعظم کے ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے۔

"میں نے گروہ در گروہ ہنگری دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں، مویشی اور سامان کاشت لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، جہاں وہ جانتے تھے عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہیں کیا جاتا تھا۔"[1]

عیسائیوں سے خاص رعایت

نومبر ۱۶۸۹ء میں سلطنت عثمانیہ کی وزارت عظمیٰ مصطفےٰ کو پریلی کے ہاتھ میں آئی، یہ بڑا دیندار، منتظم، صالح، اور مدبر انسان تھا، اس نے زوال پذیر سلطنت کی تمام اندرونی خرابیوں کو تیزی کے ساتھ دور کیا، رعایا میں اعتماد اور اطمینان پیدا کیا، عیسائیوں کے ساتھ اس نے خاص طور پر حسن سلوک کا مظاہرہ کیا، اس نے ان حاکموں کو سخت سزائیں دیں، جن کے بارے میں شبہ بھی ہو گیا کہ یہ عیسائیوں کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرتے ہیں، جزیہ کے علاوہ ہر محصول سے انہیں آزاد کر دیا، اور جزیہ کی رقم بھی اتنی معمولی رکھی جو غریب سے غریب آدمی کو بھی گراں نہیں گزر سکتی تھی، ادھر کچھ عرصہ سے عیسائیوں کو نئے گرجا اور کلیسا بنانے کی اجازت حاصل کرنے میں سخت دشواریاں لاحق ہوتی تھیں، مصطفےٰ کوپریلی نے ایک فرمان کے ذریعہ انہیں عام اجازت دے دی کہ وہ جتنے گرجے اور کلیسا چاہیں بنائیں، کلیسا کے ارباب اقتدار لرزہ خیز سختیاں کرتے تھے ان سہولتوں نے انہیں مسلمانوں کا دل سے ممنون کر دیا، اور وہ ان کی ترقی جاہ و اقبال کی دعائیں کرنے لگے،

خصوصی مراعات

۱۶۹۷ء میں حسین کوپریلی کو سلطان مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵ء ۱۱۰۶ھ) نے اپنا وزیر اعظم بنایا، یہ بھی اقلیتوں اور غیر مسلموں کے ساتھ بہت حسن سلوک سے پیش آتا تھا، اس نے بوسینا عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا، رومیلیا کی عیسائی رعایا کے ذمہ جو محصول باقی چلا آ رہا تھا اسے یک قلم معاف کر دیا، جس سے عیسائیوں کے دل میں مسلمانوں کی عظمت پیدا

[1] کریسی ج ۱ ص ۳۸ - ۲۶ ۳ بحوالہ دولت عثمانیہ۔

ہو گئی۔

یونانیوں کے ساتھ مراعات

یونانی عیسائیوں کے ساتھ ترکوں کا برتاؤ سراسر رفق و محبت رواداری اور عالی ظرفی کا تھا، ترکی حکومت نے "ترجمان باب عالی" کے نام سے ایک بہت بااختیار اور معزز منصب قائم کیا اور اس پر (۱۶۶۹ء) ایک یونانی عیسائی کو فائز کیا، یہ بڑا اہم سیاسی منصب تھا، رفتہ رفتہ یہ منصب وزارت خارجہ کا اہم ترین منصب بن گیا، اور ہمیشہ اس عہدۂ عالی پر یونانی ہی مقرر ہوتے رہے، اس طرح سلطنت عثمانیہ کے معاملات خارجہ کی کنجی انہی عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، پھر کچھ مدت بعد ایک اور منصب اسی طرح کا محکمہ بحریہ میں قائم کیا گیا، اور یہ بھی ایک یونانی ہی کو تفویض ہوا۔

رعایا۔ یا معاون

ترک عیسائیوں کے جذبات کا بہت زیادہ پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ رعایا کا لفظ ایک حد تک حقارت کا لفظ سمجھا جاتا تھا، لہٰذا انہوں نے اس لفظ ہی کو بدل دیا، اور ان عیسائیوں (یونانیوں) کو رعایا کے بجائے معاون کہنے اور لکھنے لگے!

غلط اور مہلک رواداری

ترک اپنی رواداری اور عالی ظرفی میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے، انہوں نے اپنی عیسائی رعایا کو اجازت دے دی تھی، کہ وہ ترکی میں رہ کر جس یورپین حکومت کی چاہے رعایا بن جائے، اس رعایت سے عیسائیوں نے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا، یہ دھڑلے سے قوانین ملکی کی خلاف ورزی کرتے تھے، اور تعزیر و عقوبت سے محفوظ رہتے تھے، یہ ترکوں کے دوش بدوش، پہلو بہ پہلو رہتے تھے، اور ان تمام حقوق سے متمتع ہوتے تھے، جو کسی ترک کو حاصل ہو سکتے تھے۔ لیکن "غیر ملکی" ہونے کے باعث فائدہ ترکوں سے زیادہ اٹھاتے تھے، یہ تجارت کرتے تھے، مگر محصول نہیں دیتے تھے، یہ تجارتی قوانین کی خلاف ورزی کرتے تھے، لیکن پولیس انہیں گرفتار بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ جس یورپین حکومت کی ترکی میں رہ کر یہ "رعایا" تھے اس کا سفیر یا قونصل انہیں بچانے کے لئے آموجود ہوتا تھا، انگریز مورخ فن لے حیرت کے ساتھ ان مراعات کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے "یہ ہر سزا سے محفوظ تھے۔!"

قاتلوں کے ساتھ سلوک

۱۸۲۱ء میں یونانیوں نے اچانک ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کی، اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا ترکی قلعوں کے جن دستوں نے ہتھیار ڈال دیئے، ان کے ساتھ دست و پا ترکی دستوں کو اماں دے کر داخل ہوتے انہیں نقض عہد کر کے بے دردی سفاکی کے ساتھ قتل کر ڈالا، عورتوں اور بچوں تک کو ذبح کرنے میں تامل نہیں کیا، اس بغاوت کو دبانے کے لئے محمد علی کا ہونہار بیٹا ابراہیم پاشا آگے بڑھا، اور اس نے انہیں کچل کر رکھ دیا ۱۸۲۵ء میں وہ نوارینو میں داخل ہوا، یہ وہ جگہ تھی، جہاں یونانیوں نے بری طرح بدعہدی کر کے مسلمانوں کو قتل کیا تھا، ان کی عورتوں اور بچوں تک کی جان لے لی تھی، اب وہ سہم رہے تھے کہ دیکھئے ترک فاتح ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے، لیکن ابراہیم پاشا مسلمان تھا، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ جانتا تھا، کہ بدعہدی سب سے بڑا گناہ ہے، چنانچہ اس نے

> معاہدے کے مطابق پورے یونانی دستہ کو فرانسیسی اور آسٹروی جہازوں پر روانہ کر دیا، مسلمانوں کا ایک گروہ جسے نوارینو کے قتل عام کی یاد اب تک بے چین کئے ہوئے تھی، انتقام کی فکر میں اکٹھا ہو گیا، مگر ابراہیم نے پیش بندی کر کے عیسائیوں کی حفاظت کی تدبیر پہلے سے کر لی تھی، سوار فوج کے ایک دستہ نے ترکوں کو قریب آنے سے روکے رکھا، اور نہتے یونانی، عرب پیدل فوج کی سایہ میں جہازوں تک پہنچا دیئے گئے۔

جزیہ کی وصولی

سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء - ۱۸۳۹ء) نے غیر مسلموں کے ساتھ خاص طور پر مراعات ملحوظ رکھیں، اسے جب یہ شکایت پہنچی کہ جزیہ کی وصولی میں بعض اوقات اس کے حکام و عمال، ذمیوں (عیسائیوں) پر سختی روا رکھتے ہیں، تو اس نے قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے وصولی جزیہ کا کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس کے ارکان یہ تھے۔

۱۔ قاضی،

۲۔ صوبہ کا گورنر

۳۔عیسائی سردار

اس طرح جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں کسی تعدی اور زیادتی کا امکان باقی نہ رہ گیا۔

مزید حقوق و مراعات

سلطان عبدالمجید خاں (۱۲۳۹ھ/۱۸۴۱ء) نے اپنے دورِ حکومت میں عیسائیوں کو مزید حقوق و مراعات عطا کئے، ایک فرمان کے ذریعہ (۱۸۵۶ء) انہوں نے اعلان کیا۔

"ان تمام حقوق کی جو نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کو دیئے گئے ہیں، از سرِ نو توثیق کی جاتی ہے، نیز ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظرِ ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انہیں ترقی دی جائے گی، اس غرض سے بطریق کے زیرِ صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے بابِ عالی میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح نے جو حقوق بطریق کو دیئے تھے ان میں اضافہ کیا جائے گا، اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لئے پورا ہوا کرے گا ــــــ"۔

نئے گرجے اور کلیسا

سلطان عبدالمجید نے اپنے فرمان میں یہ اعلان کیا کہ:۔

"موجودہ کلیساؤں (او رعیسائی) مدرسوں، شفاخانوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے، لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہو، اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کر لے، تو جدید تعمیر کا نقشہ بابِ عالی میں پیش کیا جائے گا، اور اگر کوئی (خاص) وجہ مانع نہ ہوگی، تو سلطان نقشہ ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا"۔

زبان کا مسئلہ

ترکی حکومت اپنی رعایا کے ساتھ اس کی شورہ پشتی، بغاوت پسندی اور غداری کے باوجود اسے ہر قسم کی مذہبی، سیاسی اور سماجی سہولتیں دی تھیں، ترکوں

نے اپنی مختلف اللسان رعایا پر کبھی صرف ترکی زبان ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اسے اپنی زبان کے برتنے اور اسے ترقی دینے کی پوری پوری اجازت دی۔

چنانچہ سلطان عبدالمجید خان نے اپنے فرمان اصلاحات میں بالفاظ واضح اعلان کیا۔

"ایک ضابطۂ تجارت وضابطۂ فوجداری، نیز وہ تمام قواعد وضوابط جو مخلوط عدالتوں سے متعلق ہیں حتی الامکان جلد از جلد شائع کر دیئے جائیں گے، اور سلطنت عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں، ان سب میں ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا۔"

عیسائی اور فوجی خدمت

اسی فرمان میں سلطان عبدالحمید نے مفتی اعظم سے صلاح ومشورہ کے بعد یہ بات بھی صاف کرا دی کہ:۔

"چونکہ محاصل کے عائد کرنے میں مساوات برتی جائے گی، اس لئے انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقہ کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں، لیکن انہیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم پیش کر کے فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کی اجازت ملے گی۔"!

قیصد المثال کارنامہ

۱۸۶۰ء میں دروزی اور مارونی فرقوں میں خونریز فساد برپا ہو گیا، اول الذکر مسلمان تھے، ثانی الذکر عیسائی، مارونی فرقہ کے لوگوں نے قتل وغارت کی ابتدا کی، لیکن جب دروزی ترکی بترکی جواب دینے لگے، تو وہ بیزح اٹھے، مارونی فرقہ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کو خوب قتل کیا اور لوٹا، اسی طرح دروزیوں نے بھی عیسائیوں کو بے تامل موت کے گھاٹ اتارا اور برباد کیا، چونکہ مارونی کمزور تھے اور دروزی تگڑے، اس لئے نتیجۃً زیادہ نقصان مارونی عیسائیوں کو — جانی ومالی — برداشت کرنا پڑا۔

لبنان حکومت ترکیہ کا ایک زیر نگین صوبہ تھا، یہاں کی ترک پولیس اور فوج بھی تھی، وہ بھی مارونی فرقہ کے ظلم وتعدی اور شرارت سے نالاں تھی اس نے دروزیوں کو روکنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، بلکہ ایک حد تک چشم پوشی سے کام لیا۔

امیر سید عبدالقادر جزائری

لیکن عیسائیوں کا یہ قتل اور ان کی یہ مظلومیت، ایک سچا مسلمان امیر عبدالقادر جزائری نہ دیکھ سکا، یہ الجزائر کا مجاہد، جسے فرانس نے جلاوطن کر دیا تھا، اور جو شام کے ایک گوشہ میں عزلت کی زندگی بسر کر رہا تھا، عیسائیوں کو بچانے کے لئے میدان میں کود پڑا۔ ایک فرنچ مورخ کے الفاظ ہیں:۔

• دمشق میں اگر عبدالقادر نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت نہ دکھائی دیتی، یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت شدت کے ساتھ جنگ کی، دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا، آگ کے شعلے پہلی ہی مرتبہ بھڑکے تھے، اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان اپنے آپ کو ڈال دیا، ایک چھوٹے سے (رضاکار) دستے کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انہیں رہنے کو دے دیا، جو ہزاروں کی تعداد میں آ آ کر پناہ گزیں ہونے لگے اس نے عیسائیوں کے سکونتی مقام پر پہرہ بندی کر دی، اس شخص نے جو مسلمان اور اولاد پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور ان خونخوار ٹولیوں کو پسپا کیا جو اسلام اور ترکی کے لئے باعث ننگ تھیں، عبدالقادر نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان بد قسمتوں پر پوشاک کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کیا جنہیں اس نے موت کے پنجہ سے رہائی دی تھی ـــــــ

پھر اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائیوں کو محفوظ مقام پہنچایا جہاں انہیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، اس کا یہ ایثار، اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ بہادری ایک لمحہ کے لئے بھی کم نہ ہوئی انکی زندگی کا یہ صفحہ اتنا شاندار ہے جس کے آگے ایک مہدی کا کارنامہ بھی مدھم پڑ جاتا ہے ـــــــ"[1]

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ از ڈاکٹر علی کیثر صفحہ ۲۵۶

ترکوں کا فیصلہ حکومت ترکیہ بھی خاموش نہ بیٹھی ساری یورپ میں احتجاج شروع ہوا، اور ترکی حکومت نے وہ کیا جو اسے کرنا چاہیئے تھا، خود اپنے وزیر خارجہ فواد پاشا کی بھیجا جنہوں نے وہاں پہنچتے ہی حالات پر قابو پا لیا، ان کے حکم سے غفلت اور چشم پوشی کے جرم میں ایک سو گیارہ ترک سپاہی گولی سے مارے گئے۔ ۵۷ بڑے بڑے دروزی پھانسی پر لٹکائے گئے۔ احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی، بہت سے دروزی جلاوطن کر دیئے گئے۔ خورشید پاشا حاکم بیروت کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی، عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لئے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش رقم باب عالی نے منظور کی۔

عیسائی جج ۱۸۶۸ء میں سلطان عبد العزیز نے ایک عدالت عالیہ قائم کی جس کے ججوں میں عیسائی اور مسلمان برابر تھے۔

اشاعتِ اسلام

بازنطینی سرحدوں کو فتح کر کے جب مسلمان بت پرستوں مشرکوں اور عیسائیوں کے حدود مملکت میں داخل ہوئے تو انہیں تبلیغ اسلام کا خیال بھی پیدا ہوا ان کے کردار، سیرت، وضعداری، اصول پرستی، جذبۂ اسلامی اسلام کے لئے ایثار و فدویت کے مظاہروں نے غیر مسلموں کے لئے قدرتاً اسلام میں ایک کشش پیدا کر دی اور وہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے سلار ڈولور سلے ترکی سلطنت نامی لکھتا ہے :-

عیسائی کا بیان

یہ عیسائی کسی جبر سے اسلام نہیں لائے کیونکہ تاریخ میں نہ تو جنگی قیدیوں کے قتل عام کا کوئی ذکر ہے، نہ بہ حیثیت غلام انہیں فروخت کرنے کا، اصل میں ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے جو ان کے محافظ تھے، انہیں چھوڑ دیا تھا [۱]

قبول اسلام

سنہ ۱۳۳۰ء میں جب اورخان نے ناسیا فتح کیا، تو وہاں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی اور تعدی روا نہیں رکھی، نہ انہیں قبول اسلام پر مجبور کیا، بلکہ بڑی آشتی کے ساتھ انہیں اجازت دے دی کہ اگر وہ ترک وطن کرنا چاہیں تو اپنا سارا مال و اسباب لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں، لیکن مسلمانوں کے کردار سیرت سے وہ اس درجہ متاثر ہو چکے تھے کہ ترک وطن کا خیال بھی دل میں نہیں لائے، عافیت اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے، اور بالآخر بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لیا ۔

۱۔ ترکی سلطنت" بحوالہ دولت عثمانیہ" ج ۱

تعمیرات

سلطنت عثمانیہ اتراک کا بانی عثمان خان بڑا پکا اور دیندار مسلمان تھا، فیاضی، رحم، عدل احسن سلوک اور مساوات عامہ اس کی سرشت تھی، تبلیغ اسلام سے بھی اسے بڑی دلچسپی تھی، وہ خود بھی نو مسلم تھا اور چاہتا تھا جو نعمت اسلام کی صورت میں اسے ملی ہے، وہ جہاں تک ہو سکے عام ہو جائے۔

پہلی مسجد اپنے دور حکومت کے آغاز میں عثمان خان نے، اس کی شہر میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی کہنا چاہیئے، یہ پہلی مسجد تھی جو سلطنت عثمانیہ میں تعمیر ہوئی،

تعمیرات عامہ اورخان اگرچہ جنگجو باپ کا سپاہی بیٹا تھا، فتوحات سے بھی دلچسپی تھی، اور جنگ کے میدان کی طرف شوق سے بڑھتا تھا، لیکن اسے سکون و عافیت کے دن بھی ملے، یہ دن اس نے عیش و عشرت میں برباد نہیں کئے، بلکہ رفاہ عام کے کاموں پر صرف کئے اس نے ملک میں امن و امان قائم کرنے کے بعد، تعمیرات عامہ پر اپنی توجہ مبذول کی، شاندار مسجدیں تعمیر کیں عالی شان مدرسوں کی بنا ڈالی، مسافروں کے لئے سرائیں بنوائیں، مریضوں اور بیماروں کے لئے دارالعلاج اور دارالشفا قائم کئے، بروصہ کی مسجد، ہسپتال، اور مدرسہ اپنی نظیر آپ تھے۔

مسجد خضرا محمد اول (۱۴۱۳ء-۱۴۲۱ء) نے بروصہ میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی جس کا نام مسجد خضرا رکھا ——" یہ مسجد اسلامی طرز تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ تسلیم کی جاتی ہے —— !

مراد اول نے بھی ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا، لیکن بایزید نے اس طرف توجہ نہ کی اور کام ادھورا رہ گیا، لیکن برسر حکومت ہونے کے بعد محمد نے اس طرف توجہ کی اور اس مسجد کو بھی

مکمل کر دیا۔

ابن عربی کا مقبرہ سلطان سلیم اول (۱۵۱۲ء - ۱۵۲۰ء) جب فاتحانہ یلغار کرتا ہوا دمشق میں داخل ہوا تو یہاں پہنچکر اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے مزار پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر کیا، وہاں کے مجاوروں، اور فقیروں کے لیئے ایک لنگرخانہ بھی قائم کیا اور اس سلسلہ میں تمام ضروری اخراجات کے لئے کافی جائداد وقف کر دی۔

تعمیر جدید سلطان سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء - ۱۵۶۶ء) کو تعمیرات کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اُس نے قسطنطنیہ بغداد، قونیہ، دمشق اور دوسرے شہروں میں نہایت خوبصورت اور عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں، بہت سی مسجدوں کی بنا ڈالی، بہت سی مسجدیں ایسی تھیں جو مرور زمانہ سے قریب بہ انہدام ہو چکی تھیں، ان کی اصلاح و تعمیر نو کا کام کیا۔

نہر اور پل سلیمان اعظم نے اپنے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر تعمیر کرائی، جس سے عوام کو بہت فائدہ پہنچا، اور وہ اس کے ممنون ہوئے، نیز مکہ معظمہ کی متعدد پرانی نہروں کو بھی اُس نے پھر سے درست کرایا، مملکت عثمانیہ کے اکثر بڑے شہروں میں اُس نے ہسپتال تعمیر کئے پل بنوائے، اور لوگوں کے رفاہ و فلاح کی طرف بڑی توجہ کی۔

چھاؤنیاں اور بازار سلطان مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵ء - ۱۷۰۳ء) کے عہد میں بہت سے بازار قائم ہوئے چھاؤنیاں تعمیر ہوئیں، مدرسوں کی بنیاد ڈالی گئی اور مسجدیں بنائی گئیں، سلطان کا وزیر مصطفےٰ کوپریلی بڑا دانشمند خداترس شخص تھا، اس کے دینی شغف نے، ان عمارتوں کی طرف اسے متوجہ کیا اور بڑے انہماک سے اس کام کو اس نے انجام دیا۔

جامع نور عثمانی سلطان محمود اول ــــــ (۱۷۳۰ء - ۱۷۵۴ء) کا دور حکومت بھی اگرچہ کچھ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا، لیکن رفاہ عام کے کاموں سے اسے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی، علم اور علم کدوں کو بھی وہ اپنے ملک کے لئے ضروری سمجھتا تھا، دینداری کا جذبہ بھی تھا عبادت گاہوں پر بھی اس کی خاص توجہ مبذول رہتی تھی، ترکیہ کی مشہور اور دل آویز مسجد جامع نور عثمانی کا خیال

اس کے ذہن میں آیا تھا، اور اس نے بڑی عقیدت اور جوش کے ساتھ اس کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا، عمارتوں کا اُسے اتنا زیادہ شوق تھا کہ صرف دارالسلطنت ہی میں نہیں مختلف دور دراز صوبوں میں بھی اُس نے کئی عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں،

کتب خانے سلطان محمود اول ہی نے کتابوں کی فراہمی اور کتب خانوں کے قیام کی طرف بھی توجہ کی، چنانچہ اس نے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں چار عظیم الشان کتب خانے قائم کئے جہاں تشنگانِ علم دُور دُور سے آتے تھے اور اپنی پیاس بجھا کر واپس جاتے تھے، ترکوں کی شہرت اس اعتبار سے ہے کہ وہ تلوار کے دھنی ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم کی سرپرستی، توسیع اور ترویج میں بھی ان کے کارنامے اتنے درخشاں ہیں، جو رہتی دنیا تک قائم رہیں گے، اور جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا

خونِ ناحق

تخت و تاج، مال و دولت اور جاہ و حشمت کے لئے جنگ و پیکار اور قتل و خون ریزی، ایک معمولی قصہ ہے، تاریخ کے ہر دور میں اس طرح کی عبرت انگیز اور سبق آموز مثالیں ملتی ہیں۔

بھائی کا قتل

لیکن خاندان عثمانی میں اس طرح کا پہلا قتل، جتنا سفاکانہ اور بے دردانہ تھا، اتنا ہی حیرت اور عبرت خیز بھی،

جنگ کسووا بڑی فیصلہ کن جنگ تھی، اس میں مراد نے اپنا، اور عیسائیوں کی متحدہ فوج نے اپنا اسارا زور لگا دیا، اس لڑائی میں مراد کا چھوٹا لڑکا یعقوب بھی شریک تھا اس نے باپ کی آنکھوں کے سامنے اور بھائی (بایزید اول) کے پہلو بہ پہلو، شجاعت اور دلیری کی نہایت شاندار اور روشن مثال قائم کر دی تھی، پیش قدمی کرتا ہوا، وہ دشمن کی طرف بڑھ جاتا، اور بے جگری سے لڑنے لگتا اس نے اپنی زندگی مسلمانوں کے ناموس اور سلطنت عثمانیہ کے حفظ و بقاء کے لئے وقف کر دی تھی،

مراد کے قتل کے بعد میدان جنگ سے جب بایزید فاتح و غانم واپس آیا، تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لائق اور ہونہار بھائی یعقوب کو بغیر کسی خطا اور قصور کے محض اس وہم میں قتل کرا دیا کہ کہیں یہ بھی صاوجی کی طرح آگے چل کر جرم بغاوت کا ارتکاب نہ کرے ۔۔۔۔۔۔ تاج و تخت کی خاطر عثمانی خاندان میں یہ پہلا قتل تھا! لیکن آخری نہیں!

بہنوئی اور بھانجوں کا قتل

بایزید نے جب علاء الدین کو شکست دی، تو اسے اور اس کے دونوں لڑکوں محمد اور علی کو تیمور تاش پاشا کی حراست میں دے دیا، وہ آقا کا اتنا بڑا وفادار تھا کہ اس نے تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بایزید نے تیمور تاش

کو کوئی سزا نہ دی۔

قتل معصوم مراد کے بعد اس کا بیٹا محمد فاتح ۱۴۵۱ء میں تخت حکومت پر متمکن ہوا، اس موقع پر اس نے فوج کو انعامات سے نوازا اور اہل شہر پر لطف و کرم کی بارش کی، تخت حکومت پر متمکن ہونے کے بعد مبارک سلامت کا دور شروع ہوا، مبارکباد کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں مراد کی وہ بیوی بھی تھی، جو سردیا کی شہزادی تھی، اور عین اس وقت جب وہ تخت نشینی کی تہنیت پیش کر رہی تھی، اس کا تنہا شیرخوار اور معصوم بچہ محمد کے حکم سے ہلاک کیا جا رہا تھا، تاکہ یہ فتنہ آگے چل کر دیا نہ بن سکے۔

برادرکشی کے اصول کا محمد اس درجہ قائل تھا کہ مرنے سے کچھ پہلے اس نے جو قانون نامہ مرتب کر دیا (جس کی حیثیت ایک طرح سے وصیت نامہ کی بھی تھی) اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ——— میرے جانشینوں میں جو تخت پر بیٹھیں وہ دنیا کے امن و امان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں!

وصیت پر عمل محمد فاتح کی وصیت پر سلیم اول (۱۵۱۲ء۔۱۵۲۰ء) نے بڑی سعادتمندی سے عمل کیا، اپنے دونوں بڑے بھائیوں احمد اور کرکوکی بے دردی کے ساتھ جان لی سلیم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے دو بھائی، جو باپ کی زندگی ہی میں اور اس کی تخت نشینی سے پہلے وفات پا چکے تھے، اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، ان معصوم اور بے گناہ بھتیجوں کو بھی اس نے بے تامل قتل کر دیا۔

عہد شکنی سلطان سلیم نے قاہرہ میں داخل ہونے کے بعد اعلان کیا کہ جو مملوک ہتھیار ڈال دیں گے ان کی جان بخشی کی جائے، ممالیک نے اس اعلان پر اعتبار کیا، ہتھیار ڈال دیئے، لیکن سلطان نے فوراً عہد شکنی کی، اور جو ملا اسے قتل کر دیا، حتیٰ کہ جن آٹھ سو ممتاز شہریوں نے اپنے تئیں سلطان کے رحم و کرم کے حوالہ کر دیا تھا، وہ بھی قتل کر دیئے گئے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ مصر کے قتل عام میں پچاس ہزار آدمی ہلاک کیے گئے۔

بیٹے کا قاتل

سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) خاندان عثمانیہ کا گل سرسبد تھا، سراپا خیر و برکت، عدل و انصاف اس کی سرشت تھی۔ نیکی اور مروت کا وہ پتلا تھا لیکن اپنی ایک روسی بیوی کے بہکانے سے اپنے لائق، ہونہار، بہادر اور دانشمند نوجوان بیٹے، مصطفےٰ کو قتل کرا دیا، محض اس اندیشہ سے کہ کہیں یہ بغاوت نہ کرے۔

برادر کشی کا ریکارڈ

سلطان مراد سوم ۱۵۷۴ء میں تخت نشین ہوا، تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے جس کارخیر سے اپنے دور حکومت کا آغاز کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے پانچ بھائیوں کو بے تامل قتل کرا دیا،

پیروی آبا

محمد سوم (۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء) نے بھی پیروی آبا کی یعنی تخت حکومت پر جلوہ فرما ہونے کے بعد اپنے بھائیوں کو قتل کرا دیا!

مرنے سے پہلے

وفات سے صرف دو سال پہلے محمد سوم نے اپنے لائق، شجاع، اور محبوب عوام بیٹے محمود کو قتل کرا دیا، محض اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ باپ کو قتل کر کے خود مالک تاج و تخت نہ ہو جائے۔

سازش، بغاوت، شورش

مراد اول کی فیروزمندیاں عروج پر تھیں، وہ ایشیائے کوچک میں سرگرم عمل تھا، یورپ میں ترکی سپاہ کا سپہ سالار اس نے اپنے بیٹے صاوجی کو مقرر کر رکھا تھا، صاوجی نے بغاوت کا اعلان کر دیا، لیکن یہ کوئی کمزور باپ نہیں تھا، مراد سلطان تھا، وہ فوراً پہنچا، صاوجی کے ساتھی اور عامی سپاہیوں کو معافی کا پروانہ عطا کیا، صاوجی کو قتل کرا دیا۔ ——— باغی کی سزا، خواہ وہ شہزادہ ہو یا کوئی عامی!

نیا دعوے دار سلطنت مراد ثانی کی تخت نشینی کے وقت صرف ۱۸ سال کی عمر تھی، مراد کی نو عمری کے باعث دشمنوں اور حریفوں نے جوڑ توڑ شروع کر دیئے، چنانچہ شاہ قسطنطنیہ نے مصطفےٰ ثانی ایک شخص کو تخت عثمانی کا دعوے دار بنا کر کھڑا کیا، اُسے فوجی مدد دی، اور اس سے وعدہ لیا کہ کامیابی کی صورت میں وہ گیلی پولی اُسے واپس کرے گا، لیکن مراد نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا، شکست دی، اور قتل کر دیا۔

مصطفےٰ کی بغاوت مراد ثانی نے شاہ قسطنطنیہ کی بدعہدی اور شرارت و سازش سے عاجز آکر ۱۴۲۲ء میں پھر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، اس مرتبہ کامیابی کی پوری امید تھی کہ ایشیائے کوچک میں اس کا چھوٹا بھائی مصطفےٰ علم بغاوت کو کھڑا ہو گیا، محاصرہ چھوڑ کر مراد اُدھر پہنچا، مصطفےٰ کی فوج کو شکست ہوئی، وہ گرفتار کر لیا گیا، پھر گرفتار کرنے والوں نے اُسے قتل کر دیا۔

فوجیوں کی سرکشی ینی چری، اور سپاہی، فوجیں اب سلطنت عثمانیہ کی اصل حکمران تھیں، گذشتہ کچھ عرصے سے ان فوجوں کا اثر و اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ عنان زمام

حکومت ان کے ہاتھ میں آگئی تھی، سلاطین کی معزولی، وزرا کا قتل، حکام کا تقرر اور تنزل، سب کچھ ان کے ہاتھ میں تھا، جب چاہتے تھے اضافۂ تنخواہ اور انعام کا مطالبہ کرتے تھے اور وزرا سے تامل پر سارے شہر کو لوٹ لیتے تھے، ہر سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر منہ مانگا انعام لیتے تھے، محل سرا کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے، اور کمزور سلاطین بے چون وچرا ان کے مطالبات تسلیم کر لیتے تھے، نہ تسلیم کرتے، تو خود ان کی خیر نہیں تھی،

۱۶۳۲ء میں بہ عہد مراد چہارم نے پھر یہی حرکتیں کیں، قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر کئی وزرا کے قتل کا مطالبہ کیا، مراد نے اسی وقت تو ان کی بات مان لی، لیکن دل میں فیصلہ کر لیا کہ ان کا زور توڑ کر رہے گا، چنانچہ چند روز بعد اس نے دیوان (مجلس مشورت) منعقد کیا، اور صورت حال اس کے سامنے پیش کی، ایک قاضی نے کہا "ان تمام باتوں کا علاج صرف تلوار کی دھار ہے!" یہ بات مراد کے جی میں بیٹھ گئی، اس نے خفیہ طور پر ینی چری اور سپاہی کے وفادار دستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور پھر ان کی سرکوبی شروع کر دی جس پر ذرا غداری اور بے وفائی کا شبہ ہوا اس کی جان لے لی، نتیجہ یہ ہوا، کہ سلطان کا رعب قائم ہو گیا، بغاوت دب گئی، اور حالات معمول پر آگئے۔

پطرونا خلیل کی سرکشی

سلاطین ترکیہ جیسے جیسے کمزور ہوتے گئے، ویسے ویسے بغاوت، سرکشی اور شورش عام ہوتی گئی، اگر کوئی جیدار سلطان ہوتا تھا، وہ استیصال کر دیتا تھا، کمزور ہوتا تھا وہ سر جھکا دیتا تھا۔

۱۷۳۰ء میں جب محمود اول تخت نشین ہوا، پھر بغاوت ہوئی اور بڑے زور کی ہوئی، باغیوں کا سردار پطرونا خلیل تھا اس نے دوران بغاوت میں بہت سے سرکاری عہدے داروں کو برطرف کرایا اور جس منصب پر اپنے جس منظور نظر کو چاہا مقرر کرا دیا،

آخر محمود اول نے حکمت عملی سے خلیل اور اس کے ۱۲ ساتھیوں کو دیوان میں بلا کر اپنے سامنے قتل کرایا، پھر اس کے سات ہزار ساتھیوں کو بے تامل ہلاک کرا دیا، دو ماہ کی شورش کے بعد، یہ بغاوت ایسی دبی کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا

یونان کی ہولناک بغاوت

یونان اگرچہ سلطنت عثمانیہ کا ماتحت اور محکوم تھا، لیکن ترکوں نے جس رواداری کا یونانیوں کے ساتھ برتاؤ کیا تھا، اور جس انسانیت کے ساتھ ان پر حکومت کی تھی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے، یونانیوں کو مذہبی آزادی اس درجہ حاصل تھی کہ آئرلینڈ کے کیتھولک ان پر رشک کیا کرتے تھے، یورپین مورخین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یورپ کی کسی قوم پر محاصل کا بار اتنا ہلکا نہ تھا جتنا ترکیہ کے محکوم یونانیوں پر، فن لے (...) نے لکھا ہے کہ یونانیوں کو بلدیاتی نظام میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے، نیز آزادیٔ تقریر اتنی حاصل تھی کہ نپولین کے عہد میں فرانسیسی بھی اتنی آزادیٔ تقریر نہ حاصل کر سکے، اپنے قصبوں کے انتظامی معاملات میں انہیں اتنا ہی اختیار تھا، جتنا فرانس کے باشندوں کو۔

ان مراعات اور سہولتوں کے باوجود یونانیوں نے بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا، خفیہ انجمنیں بنائیں، اور زیر زمین تحریک شروع کر دی، روس، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کی درپردہ اور علانیہ امداد حاصل کی، اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا،

۱۸۲۱ء میں عدلڈیویا کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا، بغاوت کا آغاز ترک شہریوں اور سپاہیوں کے قتل عام سے ہوا، یہ بغاوت پوری اندرونی تیاریوں کے ساتھ لیکن اچانک رونما ہوئی کہ جب قسطنطنیہ میں یہ خبر پہنچی تو ارباب حکومت کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا، کہ اصل معاملہ کیا ہے؛ جون ۱۸۲۱ء میں ترکوں نے اس بغاوت کو کچل دیا،

ایک اور بغاوت

عدلڈیویا کی بغاوت ابھی پورے طور پر سرد نہیں ہوئی تھی کہ موریا اور جزائر انان میں بغاوت کے سر بہ فلک شعلے بھڑک اٹھے، یہاں کے عیسائی بقول مؤرخ میبریٹ یہ عزم لے کر اٹھے تھے کہ ——— ترک اب زندہ نہیں رہ سکیں گے ——— نہ موریا میں نہ دنیا کے کسی گوشہ میں — ! اپریل ۱۸۲۱ء میں یہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا، اور ۲۵ ہزار ترک موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، یہ بغاوت اتنی تیزی کے ساتھ بڑھی کہ قبل اس کے کہ باب عالی کوئی اقدام کر سکے، ایک ماہ کے اندر اندر موریا کے عثمانی تسلط و اقتدار کا یکسر خاتمہ ہو گیا۔ رجن

ترکوں کو امان دی گئی تھی انہیں بھی پوری بے دردی کے ساتھ، نوکِ خنجر کے سپرد کر دیا گیا،

شقاوت کی انتہا

یونانیوں کی سفاکیوں اور درندگی کی خبروں سے مشتعل ہو کر قسطنطنیہ کے مسلمانوں نے وہاں کے عیسائیوں پر دستِ تعدی دراز کیا، شیخ الاسلام نے اس کی سخت و شدید مخالفت کی اور کہا، ناکردہ گناہوں سے گناہ کا بدلہ نہیں لیا جا سکتا، مسلمانوں اس فتوے پر شیخ الاسلام کے خلاف مظاہرہ کیا، وہ مستعفی ہو گئے، اور اپنے اہل و عیال کو لے کر ایک کشتی میں بیٹھے اور حج کو چلے گئے۔ جزائر آرچپیلاگو کے قریب یونانیوں نے ان کے جہاز کو گرفتار کر لیا، شیخ الاسلام کی آنکھوں کے سامنے، پہلے ان کی لڑکیوں کو ذبح کیا، پھر خاندان والوں کی گردنیں، پھر رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں دے دے کر خود انہیں ہلاک کر دیا، محسن کشی، اور احسان فراموشی کی اتنی بڑی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی۔

فن لے کا بیان

مورخ فن لے (Finlay) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

"معذور و مجبور، بوڑھے مرد، اونچے طبقہ کی عورتیں خوبصورت لونڈیاں اور غلام کم سن اور معصوم بچے جہاز کے عرشہ پر گائے بیل کی طرح ذبح کر دیئے گئے!"

ترکوں کو شکست

یونانی بغاوت کے استیصال کے لئے جو ترکی فوج پہنچی، وہ باغیوں کا مقابلہ نہ کر سکی ہار گئی، پھر باغیوں نے دو ایک ترکی قلعوں کا محاصرہ کر لیا، دستوں نے عاجز آ کر اور فاقہ کشی سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالے، ان سے عہد کیا گیا کہ انہیں مصر یا ٹیونس روانہ کر دیا جائے گا، لیکن ہتھیار ڈالتے ہی نقضِ عہد کیا گیا اور ان کا قتلِ عام شروع ہو گیا، صرف ایک گھنٹہ کی مدت میں تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کر ڈالا،

چشم دید کیفیت

ایک نامی پادری جو اس موقع پر موجود تھا۔ اپنا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتا ہے

عورتیں بندوق کی گولیوں، اور تلواروں کے زخم سے مجروح ہو کر سمندر کی

طرف بھاگتی تھیں، لیکن انہیں عمداً گولیوں کا نشانہ بنالیا جاتا تھا، مائیں شیر خوار بچوں کو سینہ سے لگائے اپنی برہنگی کو چھپانے کی غرض سے کیونکہ ان کے کپڑے چھین لئے گئے تھے، سمندر میں کود پڑتی تھیں، لیکن جب وہ پانی میں چھپنے کی کوشش کرتی تھیں یہ سنگدل رائفل بردار انہیں گولیوں پر دھر لیتے تھے، شیر خوار بچوں کو ماؤں سے چھین کر چٹانوں سے ٹکراتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، تین چار سال کے بچے زندہ سمندر میں پھینک دیئے جاتے"

...وت کا استیصال

چونکہ مغربی حکومتیں یونانیوں کی پشت پناہ تھیں اس لئے بغاوت کا پہلا عارضی طور پر تلخ کے بجائے بہت شیریں ملا، ۱۸۲۴ء تک یہ ...ت جاری رہی اور اس عرصہ میں نہ صرف موریا، بلکہ تجلی کی سرحد تک کے تمام علاقے، جن میں ایتھنز بھی ...ل تھا، خود مختاری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ۱۸۲۴ء میں محمد علی پاشا والی مصر کے لڑکے ابراہیم پاشا ...اغیوں کی سرکوبی کا ذمہ لیا، ۱۸۲۵ء میں اُس نے سارا موریا فتح کر لیا، کورنتھ اور ایتھنز پر بھی اس ...بضہ ہو گیا، ہر مرحلہ پر خواہ وہ بحری ہو یا بری ابراہیم پاشا نے یونانیوں کو شکست دی،

...نی چری بغاوت اور ینی چری کا خاتمہ

محمود ثانی (۱۸۰۸ء—۱۸۳۹ء) جب تخت حکومت پر بیٹھا تو اُسے تخت پر بیٹھتے ہی ینی ...ری بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، ینی چری باغیوں نے محمود سے اپنے سارے مطالبات منظور کرا لئے، اُسے ...بعد کیا کہ ایک فرمان کے ذریعہ تمام اصلاحات منسوخ کر دیے، کئی سال تک حکومت کا سارا کاروبار حاصل انہی ...ی چری باغیوں کے ہاتھ میں رہا، محمود یہ حالت مجبوری ــــ کچھ کر رہا تھا لیکن دل میں تہیہ کر چکا ...تھا کہ موقع ملتے ہی ان کا قلع قمع کر کے رکھ دے گا، چنانچہ یونان کی بغاوت کے استیصال کے بعد (۱۸۲۶ء) ...س نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی، عوام ینی چری سے متنفر ہو چلے تھے، علما ان کی دراز دستیوں ...سے عاجز تھے، حکام و عمال ان کے نام سے کانپتے تھے، امرائے دولت ان سے بیزار ہو چکے تھے، ان کے ...ظلم، بربریت اور خون آشامی نے سب کو ان کے خلاف کر دیا تھا، لیکن یہ سب سے بڑی طاقت تھے، اس

۴ ... فوجوں میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا ۱۸۲۶ء میں

لیئے کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ خلیفہ تک بے بس تھا،

محمود نے اندر اندر تیاریاں کیں، ۱۴ ہزار وفادار توپچیوں کو تیار رکھا، مفتی اعظم سے فتویٰ لے لیا۔ پھر ایک فرمان جاری کیا کہ ینی چری جدید اصول جنگ سیکھیں، وہ تو بغاوت کا موقع ڈھونڈ ھتے ہی تھے فوراً مسلح ہو کر میدان میں آگئے، محمود کے توپچیوں نے ایسی گولہ باری کی کہ انہیں بھون کر رکھ دیا ینی چری اگرچہ بہادری کے ساتھ لڑے لیکن بری طرح مارے گئے کوئی بھی نہ بچ سکا، ینی چری کے استیصال کے بعد ایک بہت بڑے فتنہ سے ترکی حکومت کو نجات مل گئی۔

محمد علی پاشا کی بغاوت محمد علی پاشا ایک البانی ترک تھا، معمولی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے اعلیٰ مناصب تک پہنچا سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء-۱۸۳۹ء) نے اسے معر کا والی بنا دیا، اس نے شروع میں وفادارانہ طور پر اپنے فرائض انجام دیئے لیکن ۱۸۲۶ء میں جب اس کے بیٹے ابراہیم پاشا نے یونانی باغیوں کی سرکوبی کی اور پھر انگریزی بیڑے سے شکست کھا کر معر واپس پہنچا، تو محمد علی نے مطالبہ کیا کہ شام اور دمشق بھی اس کو ولایت میں دے دیئے جائیں، نیز کریٹ بھی، محمود نے کریٹ کا جزیرہ تو دے دیا، لیکن شام اور دمشق دینے سے انکار کر دیا، محمد علی باغی ہو گیا، اس نے سلطنت عثمانیہ کی کمزوری، اور ترک افسروں کی غداری اور رشوت خوری سے فائدہ اٹھایا اور طاقت کے زور پر ان مقامات کو فتح کر لیا۔

ادبار و زوال کی داستان

کوئی حکومت خواہ کتنے ہی دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ پردۂ وجود پر نمودار ہو، یہ ممکن نہیں کہ وہ ادبار و زوال سے روشناس نہ ہو عثمانیوں نے اگرچہ کئی پشتوں تک بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی لیکن ادبار و انحطاط اور زوال سے وہ بھی نا آشنا نہ رہے، یہ دوسری بات ہے کہ یہ زوال و ادبار زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔

تیمور اور بایزید

بایزید اول یورپ میں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ رہا تھا اور ایشیا میں تیمور لنگ کا ٹڈی دل فتح و کامرانی کے مزے لوٹ رہا تھا، تیمور کے دل میں بایزید کی عزت تھی کہ وہ یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کا نام اونچا کر رہا تھا، اسی لئے وہ قوت و حشمت کے باوجود اس سے الجھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

لیکن جو بات ہونے والی ہو وہ ہو کر رہتی ہے، بایزید تیمور کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، وہ اس سے الجھنے کے مواقع پیدا کرتا تھا، تیمور نے ۵۰ سال کی عمر میں ۲۹ حکومتوں کو اور کئی شاہی خانوادوں کو تابعدار کر دیا تھا۔ وہ فنونِ جنگ، اور فنونِ سیاست کا ماہر تھا، بایزید کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔

بایزید کی شکست اور گرفتاری

سن ۱۴۰۲ء میں بایزید اور تیمور کی آویزش شروع ہوئی اس نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس پر قبضہ کر لیا؛ پھر وہ انگورہ پہنچا، یہاں معرکہ آرا اور فیصلہ کن جنگ ہوئی کیونکہ سب نے تھے، ترقی کے سپاہیوں نے جنگ لڑی تھی، یہاں خود بایزید موجود تھا، یہ جنگ سن ۱۴۰۲ء میں

ہمت اور بہادری کے ساتھ لڑا، لیکن ہار گیا، اس کے ہزار ہا آدمی قتل ہوئے خود گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا، تیمور عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا، دوران گفتگو میں ملامت کی کہ اس نے خواہ مخواہ جنگ چھیڑی، بایزید نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا، لیکن تیمور نے اسے رہا نہیں کیا، اور اسی غم میں وہ صرف آٹھ ماہ کے بعد، اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا، بایزید کی وفات کے بعد تیمور نے اس کے تمام ایشیائی مقبوضات، سابق مالکوں اور فرماں رواؤں کو واپس کر دیئے، اور اس طرح بظاہر دولت عثمانیہ کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

مسلمانوں کا قتل عام مراد ثالث (۱۵۷۴ء–۱۵۹۵ء) کا عہد ترکی حکومت کے عہد زوال کا آغاز ہے۔

۱۵۹۴ء میں مولڈاویا، ولاچیا اور ٹرانسلوینیا نے سرکشی، بد عہدی اور بغاوت کا مظاہرہ کیا، ان سب نے آسٹریا کی حکومت سے ساز باز کی اور ترکیہ سے یکسر تعلق منقطع کر کے اپنی اپنی مملکتوں کے تمام مسلمان باشندوں کو بے دریغ تہ تیغ کر دیا۔

عباس صفوی کا حملہ سلطان محمد سوم (۱۵۹۵ء–۱۶۰۳ء) کا عہد ایک زوال آشنا فرمان کا دور تھا، ۱۶۰۱ء میں شاہ عباس صفوی فرمانروائے ایران نے سلطنت عثمانیہ کے ایرانی مقبوضات پر حملہ کیا اور گزشتہ زمانے میں ایران کے جو صوبے اور رقبے ایران کے ہاتھ سے نکل کر ترکی قبضہ میں چلے گئے تھے، ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا،

ذلت بخش معاہدہ ۱۶۰۶ء میں، بہ عہد سلطان احمد اول (۱۶۰۳ء–۱۶۱۷ء) صلحنامہ سیتیوا تورک پر دستخط ہوئے، جس کی رو سے ٹرانسلوینیا سلطنت عثمانیہ کی گرفت سے عملاً آزاد ہو گیا، نیز سلطنت آسٹریا جو خراج دیا کرتی تھی، اس کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا، خلیفۃ المسلمین نے آسٹریا کے بادشاہ کو شہنشاہ تسلیم کر لیا، اب تک باب عالی سے جو سفرا ویانا بھیجے جاتے تھے وہ معمولی تھے، اب یہ طے پایا کہ وہ سنجق بے کے مرتبہ سے کم نہ ہوں، یہ پہلا موقعہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ نے گر کر اور اپنی حیثیت سے گر کر ایک عہد نامے پر دستخط کئے، یہ کمزوری اور زوال

کی ایسی نشانی تھی جو چھپائے نہیں چھپ سکتی تھی،

بغداد پر ایران کا قبضہ سنہ ۱۶۲۳ء میں شاہ عباس صفوی فرماں روائے ایران نے بغداد کے ترکی کوتوال کی غداری سے فائدہ اٹھا کر، بغداد پر قبضہ کر لیا۔

زبردست شکست اب تک ترکوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، یورپ ان کے نام سے لرزتا اور کانپتا تھا، جب کبھی مقابلہ کی نوبت آئی اسے زبردست اور ذلت بخش شکست سے دوچار ہونا پڑا، سنہ ۱۶۶۴ء میں بعہد محمد چہارم عثمانی فوجوں کی کثرت تعداد کے باوجود آسٹریا کے مقابلہ میں زبردست اور ذلت بخش شکست اٹھانی پڑی، پھر سنہ ۱۶۸۳ء میں دوبارہ محمد سوم کے داماد قرہ مصطفےٰ نے آسٹریا سے جنگ کی، اس جنگ میں بھی ترکوں کو ذلت بخش شکست سے دوچار ہونا پڑا، یہ شکست اس لئے اور زیادہ افسوسناک تھی کہ ترک کثرتِ تعداد کے لحاظ سے حریف پر فائق تھے، عیسائی سپاہی تعداد میں بہت کم تھے، پھر بھی ترک بری طرح ہارے، ان کے ہزاروں آدمی مار ڈالے گئے، سامانِ جنگ ضائع ہوا، اور بہت سے مال و منال پر دشمن نے قبضہ کر لیا، ترکوں کی اس شکست نے یورپ کو ان کی طرف سے مطمئن کر دیا، اس کے دل میں جو دہشت ان کی بیٹھی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی، اسے یقین ہو گیا کہ اگر ترک پھر کبھی سر اٹھائیں گے۔ تو انہیں اس سے زیادہ سبق آموز اور عبرت انگیز شکست بآسانی دی جا سکے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ترکوں کی اس شکست کا راز کیا تھا یا وہ کیوں ہارے؟ انہیں کیوں ایسی شکست سے دوچار ہونا پڑا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ترکوں کی بہادری، شجاعت، دلیری، سرفروشی، جذبہ حب وطن، ایثار و قربانی ان میں سے کسی چیز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

لیکن اس کے باوجود ان کی شکست کا راز یہ تھا کہ زمانہ آگے بڑھ رہا تھا، ترقی کر رہا، ایجاد و اختراع کی منزل میں داخل ہو چکا تھا، اور وہ قدامت کی دنیا میں آرام سے بیٹھے ہوئے تھے، ترقی اور ایجاد کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے۔

اس عرصہ میں فنِ جنگ نے ترقی کر لی تھی، اسلحہ کی شناخت میں تبدیلی ہو گئی تھی، بہت سے نئے ہتھیار عالم وجود میں آ گئے تھے، بہت سے نئے طریقے برتے جانے لگے تھے، انداز جنگ اور طریق حرب میں بہت سی ترمیمیں اور تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، لیکن ترک ان سب سے غافل تھے، وہ قدیم طرز جنگ کے ماہر تھے، اور اسی کو مشکل کشا کہہ رہے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ میدان میں حریف کے نئے ساز و سامان جنگ طریق حرب اور انداز مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا، تو وہ بہادری اور شجاعت میں یکتا ہونے کے باوجود ہار گئے۔

یاد کیجئے، ابھی اسی کتاب میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ ممالیک بہت بہادر تھے، ترکوں سے بھی زیادہ، زیادہ نہیں تو کم کسی طرح بھی نہیں، لیکن جب ترکوں نے مصر کے لئے جنگ کی تو ممالیک ہار گئے۔ اور ترک جیت گئے، اس شکست کی توجیہ ایک سردار نے یوں کی تھی کہ ترک بندوق اور توپ بھی استعمال کرتے تھے، اور ممالیک ان چیزوں کا استعمال بہادری کے خلاف سمجھتے تھے۔

خود ہمارے زمانہ میں دوسری جنگِ عظیم برپا ہوئی، فرانس میجنو لائن MAGINOT کے زبردست حصار کے باوجود جرمنی سے بری طرح ہارا، انگلستان اپنے شاندار روایات کے باوجود جرمنی کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکا روس اپنی برتری کی شہرت دوام کے باوجود پیچھے ہٹا تو ہٹتا ہی چلا گیا، کیوں؟

اس لئے کہ جرمنی کا جدید انداز جنگ، اور نئے اسلحہ ان کے لئے ناقابل مزاحمت ثابت ہوئے، امریکہ دور سے تماشہ دیکھ رہا تھا، حالات کا جائزہ لے رہا تھا، اپنا احتساب کر رہا تھا جب اس نے راز معلوم کر لیا، تو سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ میدان جنگ میں کودا تو جرمن اور جاپان کے مقابلہ کے لئے ہر اعتبار سے جدید تر تھا، وہ جیت گیا، جرمنی اور جاپان ہار گئے ______

ناقابل تلافی نقصان

ویانا کی شکست نے ترکوں کا بھرم ختم کر دیا۔

۱۶۸۶ء میں بلغراد کے علاوہ ہنگری کے تمام قلعے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے، صوبہ کروشیا پر تقریباً ڈیڑھ صدی سے ترک قابض تھے، وہ بھی جاتا رہا، اسی

سال ہنگری کا پایۂ تخت بودا بھی ترکوں سے چھین لیا گیا، ٹرانسلوینیا اگرچہ تقریباً آزاد تھا، لیکن ترکی سیادت کا معترف تھا اب یہ بات بھی جاتی رہی، اس نے آسٹریا کی اطاعت کا حلقہ گردن میں ڈال لیا اور ترکی سلطنت سوا کفِ افسوس ملنے کے کچھ نہ کر سکی۔

ٹیونس اور الجزائر کی آزادی

اسی سلطان محمد چہارم (۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۷ء) کے عہد میں ٹیونس اور الجزائر نے بھی اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا اور سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور اس آزادی کو کئی سو برس تک قائم رکھا پھر ۱۸۳۰ء میں الجزائر کو اور ۱۸۸۱ء میں ٹیونس کو فرانس نے فتح کر لیا، جب سے اب تک یہ دونوں اسی کے محکوم ہیں!

سقوط بلغراد

۱۶۸۸ء میں بہ عہد سلطان سلیمان ثانی عیسائیوں نے متحدہ مورچہ بنا کر بلغراد پر حملہ کیا، یہ ہنگری کا دروازہ تھا، اور ترکوں کے استقلال و استحکام کے لئے اس کی بہت ضرورت تھی، اس لئے ترک اس کے حفظ و دفاع پر خاص توجہ کرتے تھے، لیکن ترک کمانداروں کی غداری کے باعث حفظ و دفاع کا کام جاری نہ رکھا جا سکا اور دشمن فوجیں بڑی آسانی کے ساتھ بلغراد پر قابض ہو گئیں،

ناقابل فراموش شکست

۱۶۹۷ء میں سلطان مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵ء تا ۱۷۰۳ء) خود فوج کی کمان کرتا ہوا بلغراد سے ہنگری میں داخل ہوا، مقابلہ ایک مقام پر کرنا پڑا، جو جذبہ مصطفےٰ کے دل میں کام کر رہا تھا وہی اگر سپاہیوں اور سرداروں میں بھی ہوتا۔ تو شاید ترکوں کے دورِ عروج کا پھر یہاں سے آغاز ہوتا، لیکن عین اس وقت جب دشمن سر پر کھڑا تھا اور ایک ہولناک اور فیصلہ کن جنگ درپیش تھی، ترکی دستے آپس میں لڑ رہے تھے، اینی چری دستے اطاعت سے انکار کر رہے تھے، اور خود اپنے افسروں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر رہے تھے، یہ رنگ دیکھ کر دشمن ٹوٹ پڑا، اس نے ترکوں کو کاٹ کر رکھ دیا، مصطفےٰ بدقت بچ کر قسطنطنیہ واپس پہنچا، اس جنگ میں ۲۶ ہزار ترک میدان جنگ میں ہلاک ہوئے اور دس ہزار دریا کو عبور کرتے ہوئے ڈوب گئے، صدرِ اعظم

چار وزیر اور بہت سے فوجی افسر میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے اور جانبازی کے جوہر دکھاتے ہوئے کام آئے۔

آسٹریا سے جنگ اور شکست

۱۷۱۶ء میں پھر ترکیہ اور آسٹریا میں جنگ ہوئی، اس جنگ میں اگرچہ ترکوں کی فتحیابی کے امکانات زیادہ تھے، لیکن ان کی تاخیر عمل آسٹریا کی فوجوں کو آگے بڑھنے اور اقدام کرنے کا موقعہ دے دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ترکوں کو ہزیمت برداشت کرنی پڑی، ہزاروں ترک یہاں مارے گئے، مالِ غنیمت میں ایک سو چالیس توپیں بھی دشمن کے ہاتھ آئیں،

بلغراد پر شکست

۱۷۱۷ء میں صدر اعظم خلیل پاشا تھے۔ یہ عہد سلطان احمد سوم (۱۷۰۳ء - ۱۷۳۰ء) آسٹریا کے مقابلہ کے لئے کوچ کیا، جو بلغراد کو گھیرے ہوئی تھی، یہاں بھی آسٹروی فوج غالب آئی، بیس ہزار ترک ہلاک ہوئے، ایک سو تیس توپیں اور سامان جنگ کا بہت بڑا ذخیرہ بھی دشمن کے قبضہ میں چلا گیا، دشمن نے پورے طور پر بلغراد پر قبضہ کر لیا،

روس سے لڑائی

مئی ۱۷۳۶ء میں روس نے معاہدوں اور صلحناموں کو بالائے طاق رکھ کر ترکی علاقوں پر اس کی اندرونی کشمکش اور چپقلش سے فائدہ اٹھا کر بغیر کسی اعلان جنگ کے حملہ شروع کر دیا، آخر مجبور ہو کر حکومت عثمانیہ کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا،

روس چونکہ ایک عرصہ سے درپردہ جنگ کی تیاریاں کر تا رہا تھا، اور پوری تیاریوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کودا تھا، لہٰذا، وہ سیل رواں کی طرح بڑھنے لگا، ترکوں نے ہر جگہ مدافعت کی، لیکن وہ اس ریلے کو سہہ نہ سکے،

روس نے کریمیا پر حملہ کر کے اسے بالکل تاراج کر دیا، مسجدیں ڈھا دیں، کتب خانے جلا دیئے، عمارتیں نذر آتش کر دیں، بوڑھوں، بچوں، بیماروں اور عورتوں تک پر رحم نہ کیا، جو ملا اسے موت کے گھاٹ اتارا، تمام قدیم یادگاریں تہس نہس کر دیں انگریزی مؤرخ لارڈ کریسی کا بیان ہے کہ:-

"روسی فخر کرتے ہیں کہ اس حملہ میں انہوں نے چھ ہزار مکانات ۳۸ مسجد میں

دو گرجے اور ۵۰ چکیاں جلا ڈالیں!

نکلیف دہ صلحنامہ سلطان عبدالحمید اول (۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۹ء) جب تخت نشین مملکت ہوا، تو روس سے جنگ جاری تھی، اپریل ۱۷۷۴ء میں ترکوں کو شکست ہوئی اور کینارجی کے مقام پر ایک نیا عہدنامہ ترتیب پایا جس کی رُو سے کریمیا آزاد ہو گیا پھر جس پر کچھ عرصہ بعد روس نے مکمل قبضہ کر لیا اور کئی دوسرے ترکی مقبوضات رُوس کے قبضہ میں آ گئے۔ اب تک باب عالی نے زار روس کو بادشاہ نہیں تسلیم کیا تھا، صرف مانا تھا، اب معاہدہ کے بعد اسے بادشاہ ماننا پڑا، اس معاہدہ کی رُو سے یہ بھی معاہدہ طے پایا کہ رُوس ترکی عیسائیوں کی ترکی حکومت سے نمائندگی کرنے کا حق رکھتا ہے، اس کے مفاسد آگے چل کر بہت زیادہ نقصان رساں ثابت ہوئے،

روسیوں کے لرزہ خیز مظالم ۱۷۹۰ء میں بہ عہد سلطان سلیم ثانی، روسیوں نے پھر ترکی علاقوں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کر دیا، ملکہ کیتھرائن قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا ایسا عزم کر چکی تھی کہ اس نے اپنے ایک پوتے کا نام قسطنطین رکھا، اسے یونانی زبان کی تعلیم دی، اور اسے پہلے بازنطینی فرماں روا کی حیثیت سے آگے بڑھانے کا منصوبہ تیار کیا اسمٰعیل کے مقام پر ترکوں اور روسیوں کی جنگ ہوئی، یہ بڑا اہم قلعہ تھا، اور بغیر اسے سر کئے بلغاریہ کے حدود میں داخلہ ناممکن تھا، روسیوں نے مہینوں اس کا محاصرہ جاری رکھا، ترکی دستہ اپنی کم مائگی، اور قلت تعداد کے باوجود بہادری کے ساتھ مدافعت کرتا رہا، آخر روسیوں کا سیل بے پناہ قلعہ میں داخل ہو گیا، ترکوں نے ایک ایک گلی اور ایک ایک سڑک پر مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں ۲۴ ہزار ترک قتل کئے گئے ان میں سے ایک ایک آدمی آخر وقت تک لڑتا رہا،

رُوس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اب انگلستان اور فرانس بھی خائف ہو رہے تھے، چنانچہ انہوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کی کوشش کی، چنانچہ جنوری ۱۷۹۲ء کو یاسی کے مقام پر صلحنامہ ترتیب پایا۔ جس کی رُو سے ترکیہ کے کچھ مقبوضات جن میں یونان بھی شامل تھا، اسے واپس کر دیئے گئے۔

نپولین کا طوفان

سلطان سلیم (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء) کا دور متعدد حیثیتوں سے اہم ہے، خاص طور پر ایران سے کہ دوستی، صلح اور عہد کے باوجود نپولین کے برسر اقتدار ہونے کے بعد اس نے بڑی بے تکلفی سے ترکی مقبوضات پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، اس نے مصر، اسکندریہ اور دوسرے مقامات پر مکمل قبضہ کر لیا، آخر باب عالی نے ستمبر ۱۷۹۸ء میں فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، اب جنگ نے اور شدت اختیار کر لی، اس نے شام پر یورش کی، اور اس پر قبضہ کر لیا، ترکی سپاہ کو امان دینے کے باوجود قتل کر دیا، نپولین نے عکہ پر بھی زوردار حملہ کیا لیکن ترکوں کی مقاومت کے آگے بے بس ہو گیا، اور ناکام و نامراد واپس ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں عثمانی سلطنت پھر مصر پر نپولین کی غیر حاضری میں قابض ہو گئی۔ ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو گئی، اور نپولین نے بھی مصر پر سلطنت عثمانیہ کی سیادت اور بالادستی قبول کر لی،

روس سے پھر جنگ

دسمبر ۱۸۰۶ء میں روس سے پھر جنگ چھڑ گئی، وہ حسب عادت بغیر اعلان جنگ کے حملہ آور ہوا، باب عالی نے بھی اعلان جنگ کر دیا

اس مرتبہ نئی بات یہ تھی کہ برطانیہ نے روس کا (فرانس کی دشمنی کے باعث) ساتھ دیا، اور سلطنت عثمانیہ کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فوراً روس سے صلح کر لے، ترکوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، چنانچہ فروری ۱۸۰۷ء میں انگریزی بیڑہ دردانیال میں داخل ہو گیا، لیکن آخر کار اُسے واپس جانا پڑا۔ کیونکہ ترکوں کی گولہ باری کی تاب وہ نہ لا سکا،

یونان کی آزادی

یونانیوں نے ۱۸۲۰ء میں بغاوت کی، ۱۸۲۶ء میں ابراہیم پاشا نے یونانی بغاوت کا سر کچل دیا، اور تمام مفتوحہ مقامات واپس لے لئے۔

اس واقعہ نے یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا، اور ساری یورپین حکومتیں یونان کی مدد کو اٹھ کھڑی ہوئیں، انگریز امیر البحر ڈرنگٹن اپنے بحری بیڑے کو لے کر آگے بڑھا، اور اس نے اکتوبر ۱۸۲۷ء میں خلیج نوارینو میں مصری بیڑے پر تباہ کن حملہ کر دیا، ترک انگریزوں کے اچانک اور نہایت منظم اور طاقتور حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے، سارا ترکی بیڑہ تباہ ہو گیا، ہزاروں مسلمان ہلاک ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی باغیوں کی سرکوبی اور

یونانی بغاوت کے استیصال کے باوجود ترک نقصان میں رہے، اور یونان ایک خود مختار مملکت بن گیا۔

محمد علی پاشا کی کامیابی محمد علی پاشا اپنی ضد پر آزاد ہوا تھا، اس نے شام و دمشق پر قبضہ بھی کر لیا تھا، آخر ترکی حکومت نے فرانس اور برطانیہ کی رفاقت سے اس سے جنگ کی شام اور دمشق کا علاقہ چھین لیا اور مصر پر اس کی پاشائی نسلاً بعد نسلٍ منظور کر لی، (۲ ستمبر ۱۸۴۱ء)

بد معاملگی، بد انتظامی، مفلسی سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱ء–۱۸۷۶ء) کا عہد، بڑا منحوس ثابت ہوا۔ یہ نہایت بد معاملہ و غیر منتظم ثابت ہوا۔ اس نے سلطنت عثمانیہ کی مالی ساکھ ختم کر دی، غیر ملکوں کے ساہوکاروں سے قرضے لئے ان کا سود بھی ادا کرتے وقت بھی بغلیں جھانکنے لگتا تھا، کیونکہ خزانہ خالی تھا اندرون ملک میں جو تمسکات اور ہنڈیاں جاری کرتا تھا، وقت پر روپیہ دینے کے بجائے پھر توسیع کر دیتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اندر اور باہر جگہ جگہ ترکی حکومت کی قلاشی اور مفلسی اور مالی بدحالی کا ڈھنڈورہ پٹنے لگا۔

۱۸۶۵ء میں عثمانی بنک نے بارہ فی صد نفع پر لندن اور پیرس میں حصے فروخت کرنا شروع کئے لیکن حکومت کی ساکھ ختم ہو چکی تھی، بہت کم رقم فراہم ہوتی، پھر ۱۸۶۶ء میں یہ طے ہوا کہ عثمانی بنک سلطنت کے بعض خاص قرضوں کا سود ہر سہ ماہی پر ادا کرتا ہے، اس کے معاوضہ میں بعض متعین آمدنیاں بنک کے حوالہ کر دی گئیں،

رومانیا کا قیام و استحکام ۱۸۶۷ء میں ولاچیا اور مولڈاویا نے متحد ہو کر نئی ریاست رومانیا قائم کر لی، ۱۸۶۸ء میں ایک جرمن شہزادہ چارلس یہاں کا فرماں روا منتخب کر لیا گیا، دول مغربی نے اس اقدام کی تائید کی عبدالعزیز کی حکومت اتنی کمزور تھی کہ کچھ نہ کر سکی،

سرویا بھی گیا سرویا نے جو نام نہاد سیادت ترکیہ کی قبول کر رکھی تھی، ۱۸۶۷ء میں وہ اس کا بھی منکر ہو گیا، عبدالعزیز کی حکومت، اس کے تمرّد کو نہ بدل سکی، چنانچہ

ترکی فوجیں بلغراد سے واپس بلالی گئیں، سرویا آزاد ہوگیا، اور اس کے فرمانروا نے باقاعدہ بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا۔

قبرص کی جدائی

اپریل ۱۸۷۷ء میں روس نے پھر اعلان جنگ کردیا، دول مغرب کی مداخلت سے یہ جنگ ختم ہوئی، برلن میں بسمارک کی زیر صدارت صلح کانفرنس منعقد ہوئی جس کی رو سے جزیرہ قبرص برطانیہ کے حوالہ کردیا گیا، صرف معمولی سا خراج طے پایا، نیز بلغاریا، رومانیا، مانٹی نیگرو، وغیرہ کی آزادی تسلیم شدہ حقیقت بن گئی، اس عہدنامہ نے یورپ میں واقعی سلطنت کا قریب قریب خاتمہ کردیا، یونان بھی خود مختار ہوگیا

مصر پر انگریزی قبضہ

۱۸۷۷ء میں انگریزوں نے اپنی شرارتوں، سازشوں، حکمت عملیوں فریب کاریوں، اور قوت وطاقت کے بل پر مصر کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا، خدیو مصر پہلے ہی سے غداری پر آمادہ تھا، انگریزوں کو بہت کم جوکھم اٹھانی پڑی، د

نئی مصیبت

اگرچہ دستوری اعلان نے ترکی عوام میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا، لیکن، اس کی مخالفت کے لئے خفیہ اور علانیہ جو قوتیں کام کر رہی تھیں اور مفاد پرستوں کا گروہ جس طرح برسرعمل تھا، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان سب نے مل کر ترکیہ کی ترقی روک دی اور اسے ادبار وہلاکت کے غار میں دھکیل دیا۔

مفاد پرست گروہ

وہ مفاد پرست گروہ جو ترکیہ کی ترقی میں روڑا اٹکا رہے تھے یہ تھے
۱۔عیسائی ——— یہ ترکیہ میں رہتے ہوئے، ترکی قومیت اختیار کرنے، اور ترکی زبان سیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔

۲۔غیر ترک مسلمان ——— یہی کیفیت ان کی بھی تھی، یہ البانی اور عرب مسلمان، ترکیہ میں مستقل بود وباش اختیار کرچکنے کے باوجود اپنی انفرادیت پر مصر تھے اور کسی قیمت پر آمادہ نہیں تھے کہ "ترک" بن جائیں۔

۳۔ متوسلین بارگاہ ـــــــــ یہ وہ لوگ تھے جن کو خلیفۃ المسلمین کی بارگاہ سے انعام واکرام کی بارش ہوا کرتی تھی، اب یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا؛

۴۔ قدامت پرست ـــــــــ یہ گروہ وہ تھا جس میں بوڑھے فوجی امرا، خواص اور علما شامل تھے، یہ جدید کے نہ معنی جانتے تھے، نہ ماننا چاہتے تھے، اور موقع کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ لہذا انہوں نے شورش، اور افراتفری کا مستقل طوفان برپا کر رکھا تھا۔

۵۔ فرنگی حکومتیں ـــــــــ جو ترکوں کے ہر ترقی پسند اقدام کی مخالف تھیں۔

طرابلس پر اٹلی کا قبضہ

ان حالات سے یورپین دشمنوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا، ترکی مقبوضات کے حصے بخرے کرنے کی کھچڑی تو اندر ہی اندر ہمیشہ پکا کرتی تھی لیکن اب انہوں نے، اپنے منصوبوں کو عمل میں لانے کی عملی تیاریاں بھی شروع کر دیں،

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اچانک بغیر کسی وجہ کے، بغیر اعلان جنگ کے پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دی، اس جنگ کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا، یعنی اطالیہ نے طرابلس پر قبضہ کر لیا، انور پاشا چھپ چھپا کر طرابلس پہنچے اور انہوں نے ترکی حکومت کی امداد کے بغیر وہاں کے مسلمانوں کو منظم کر کے اطالیہ کا مقابلہ کیا، اور اسے ناکوں چنے چبوا دیئے، لیکن ترکیہ کو اندرونی تباہ کاریاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ نہ انور پاشا جنگ جاری رکھ سکے، نہ ترکی حکومت اطالیہ کو پیچھے ہٹا سکی، ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلحنامہ توران پر دستخط ہوئے، اور ترکی حکومت نے طرابلس پر اطالیہ کا باقاعدہ قبضہ تسلیم کر لیا۔

قصہ کوتہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود!

حالانکہ اٹلی نے طرابلس کے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے تھے ان کا تقاضا یہ تھا کہ ہر قیمت پر اس سے جنگ جاری رکھی جاتی، لیکن قسمت!

البانیہ کی آزادی

حالات اس قدر جلد جلد پلٹا کھا رہے تھے کہ ایک مشکل دور ہوتی تھی تو دوسری سامنے آ جاتی تھی، ایک طرف بلقانی ریاستوں نے جنگ و پیکا

سازش اور شرارت اور سرکشی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، دوسری طرف البانیہ نے علم بغاوت بلند کر دیا، آزادی حاصل کرلی، اور بین الاقوامی طور پر اس کی آزادی تسلیم بھی کرلی گئی، ترک مجبور ہو گئے اور اپنے ایک اچھے اور بڑے صوبہ سے بادل ناخواستہ بعد حسرت و یاس انہیں دست بردار ہو جانا پڑا۔

جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء)

اگست ۱۹۱۴ء میں اس جنگ سے ترکی حکومت الگ رہنا چاہتی تھی، لیکن اسے شریک ہونے پر مجبور کیا گیا، جب وہ شرکت پر مجبور ہو گئی، تو روس، برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دینے کے بجائے اس نے جرمنی کا ساتھ دیا، جس نے کبھی ترکیہ کے حصے بخرے کرنے اور قسطنطنیہ کو اس سے چھین لینے کی اسکیم نہیں بنائی تھی۔

عراق انگریزوں کے قبضہ میں

جنگ شروع ہونے کے بعد ترک اس بوجھ کو نہ سنبھال سکے، حالات ان کے بالکل مخالف تھے، نومبر ۱۹۱۴ء میں انگریزی فوج ہندوستانی پلٹنوں کے ساتھ شط العرب میں اتری، ۲۲ نومبر کو بصرہ فتح کر لیا، ستمبر ۱۹۱۵ء میں قسط العمارہ فتح کیا، مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔

شام و حجاز

۱۹۱۶ء کے وسط میں "متحدہ عرب حکومت" کے دام ہمرنگ زمین میں آکر حسین شریف مکہ نے بغاوت کر دی، انگریز ایک عرصہ سے اسے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، پھر شریف نے بادشاہ حجاز ہونے کا اعلان کیا، جسے انگریزوں نے فوراً تسلیم کر لیا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوجیں فاتحانہ شان سے فلسطین میں داخل ہوئیں، ۱۹۱۸ء میں فرانس نے شام اور لبنان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

اتحادی قسطنطنیہ میں

پھر اتحادی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہو گئیں، اور ترک ان کا خیر مقدم کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے،

سمرنا پر یونانی قبضہ

۱۹۱۹ء میں ختم جنگِ عظیم ہونے کے بعد کہ ابھی معاہدۂ صلح تکمیل نہیں پایا تھا، یونان نے سمرنا پر قبضہ کر لیا، اور وہاں کی بربریت

ساتھ وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور عورتوں کی عصمت دری!

صلح نامہ جرمنی اور ترکی کی شکست کے بعد اتحادی صلحنامہ مرتب کرنے بیٹھے، اور جتنی دھاندلی بے انصافی اور دھاندلی اس کرۂ ارض پر ممکن ہے اس کا مظاہرہ انہوں نے کر ڈالا جرمنی کے بھی حصے بخرے کر ڈالے، اور ترکی کے بھی، جرمنی سے سار چھین لیا، ڈانزک لے لیا، اس کے افریقی مقبوضات پر قبضہ کر لیا، اس کے حدود سلطنت محدود کر دیئے، تاوان کا ناقابل برداشت بوجھ اس پر لاد دیا، پولینڈ کو اس کے کئی علاقے دے دیئے، غرض ——————

اسی طرح اتحادیوں نے ترکوں کو بھی قیمہ قیمہ کر دیا، جو کچھ خود لے سکتے تھے وہ لے لیا جو دوسروں کو دے سکتے تھے، وہ دے دیا، روس چونکہ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب سے اختتام جنگ سے پیشتر دوچار ہو چکا تھا، لہذا قسطنطنیہ کسی کو نہ دیا جا سکا، اور آپس کی پھوٹ کے ڈر سے کوئی نیا ملک بھی نہیں پیدا ہوا۔

شکست کا پھل اکمال و ہٹلر جرمنی اور ترکی کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئیں، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال، اور جرمنی میں ہٹلر نمودار ہوا۔

حصہ نہم

سندھ

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

معروضات

ہندوستان پر مسلمانوں نے کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ یہ بہت بڑی مدت ہے اور اس طویل مدت کے کارنامے کتنے ہی اختصار سے بیان کئے جائیں پھر بھی وہ تفصیل طلب ہیں۔ اور ممکن نہیں کہ تاریخ کے نتیجہ خیز واقعات و عوامل کو سرسری طور پر بیان کئے بغیر ہم آگے بڑھ سکیں۔

دو راستے

ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کے قافلے دو راستوں سے آئے، (۱) پہلا قافلہ عربوں کا تھا جو پہلی صدی ہجری میں سندھ کے راستے سے ہندوستان میں فتح و نصرت کا پرچم لہراتا ہوا داخل ہوا۔

(۲) دوسرا راستہ درہ خیبر کا ہے یہ وہ راستہ ہے جہاں سے محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، ظہیر الدین بابر، نصیر الدین ہمایوں اور دیگر ملوک و سلاطین اپنی جلالت شان اور صولت و سطوت کا ڈنکا بجاتے ہوئے آئے۔

عربوں کی خصوصیت

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سندھ کے راستے سے جو اسلام آیا وہ عربوں کے ساتھ اسلام اپنی تمام تابناکیوں اور رعنائیوں کے ساتھ آیا۔ عرب حکومت ملتان سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسے جو زمانہ ملا وہ اگرچہ ہر اعتبار سے پرآشوب تھا لیکن اسلام کے قدم اس دیس میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے، اسلامی تمدن، تہذیب، ثقافت، معاشرت اور معاملات زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگی۔ عربوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جہاں جاتے تھے اپنی تہذیب اور کردار کے نقوش اتنے گہرے قائم کر دیتے تھے کہ خود بخود ان کا مذہب عوام کا مذہب بن جاتا تھا۔ ان کی تہذیب، قومی تہذیب کا رنگ اختیار کرتی تھی۔ ان کی زبان ہر فرد و بشر کی زبان بن جاتی تھی۔ سندھ پر عربوں کا تسلط تین صدیوں تک رہا۔ لیکن وہاں

کی غالب ترین اکثریت مسلمان ہوگئی۔ سندھ کی زبان پر عربیت کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ایک سندھی ہندو آج تک پہاڑ کو جبل کہتا ہے۔ سندھی زبان کا رسم الخط تقریباً عربی ہے۔ اور یہ رسم الخط سندھ کے ان ہندوؤں کو بھی جو ترک وطن کر کے بھارت جا چکے ہیں اتنا عزیز ہے کہ بمبئی اور دوسرے مقامات سے ان کے جو اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں وہ اسی رسم الخط میں ہوتے ہیں۔

ایک بہت اہم نکتہ

درۂ خیبر کے راستے سے افغان و ترک آئے ان کے حدود مملکت عربوں کے مقابلے میں بہت وسیع تھے۔ ان کا سکہ پشاور، لاہور اور دلی ہی میں نہیں بلکہ بہار، اڑیسہ، بنگال، آسام، مدراس، اودھ اور دوسرے مقامات پر بھی چلتا تھا۔ انہوں نے بہت سے شاندار اور پُر رونق شہر بسائے۔ لکھنؤ، الہ آباد، اکبر آباد (آگرہ)، فرخ آباد، بریلی، فیض آباد، تغلق آباد، فیروز آباد، عظیم آباد (پٹنہ) اور دوسرے بہت سے شہر آباد کئے۔ انہوں نے منقسم اور متفرق ہندوستان کو تاریخ میں پہلی مرتبہ متحدہ ہندوستان کی صورت میں تشکیل کیا۔ انہوں نے نہ صرف شمالی ہند، نہ صرف راجپوتانہ، نہ صرف مغربی ہند بلکہ جنوبی ہند تک میں مستقل اور جداگانہ مملکتیں قائم کیں۔ دلی کی مرکزی حکومت اپنی جگہ تھی لیکن دوسرے مقامات پر مسلمان صوبہ داروں اور گورنروں نے جو آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ وہ بھی اپنی جگہ فارغ البالی، رونق، آبادی اور ترقی کے اعتبار سے یکتا اور یگانہ تھیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح سندھ میں عربوں کی حکومت باد حوادث کے تھپیڑے کھا کر ایک مختصر سی مدت میں ختم ہوگئی۔ ان کی حکومت نذر حوادث نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک ہزار سال تک ہندوستان پر شان اور دبدبہ کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

ملکی اور غیر ملکی کا فرق

ایک فرق جسے میں بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور بھی پیش نظر رہنا چاہیئے۔

سندھ کے عرب حکمران "غیر ملکی تھے" ان کا تعلق دمشق کی خلافت سے مستقل طور پر تھا۔ محمد بن قاسم اگر خلافت اموی کا نمائندہ نہ ہوتا بلکہ اپنے طور پر ملک سندھ کا بادشاہ بن گیا ہوتا

نہ وہ اس بیکسی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتا۔ نہ عربوں کی حکومت میں تنزل آتا اور یہ اس قدر جلد ختم ہوتی۔

اس کے برعکس شمالی ہند کے ترک مغل اور پٹھان حکمران غیر ملکی نہیں تھے اپنا ملک چھوڑ کر وہ ہندوستان کے مستقل باشندے بن گئے یہیں پیدا ہوتے تھے، یہیں حکومت کرتے تھے، یہیں مرتے تھے ___ ہندوستان سے باہر کی کسی حکومت کے نہ وہ محکوم تھے نہ ماتحت۔ انہیں لوگوں میں وہ ملوک اور سلاطین بھی تھے جن کے کارنامے تاریخ کا ناقابل فراموش واقعہ بن چکے ہیں۔ بابر کی دلاوری، ہمایوں کی مہربانی، اکبر کی فراست، جہانگیر کی موقعہ شناسی، شاہجہان کی بصیرت، عالمگیر کی شجاعت پھر سلاطین مغلیہ کے ماسوا دوسرے ملوک و سلاطین نے بھی خواہ وہ کسی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اپنے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جنہیں دنیا کبھی فراموش نہ کر پائے گی لیکن کتنی عجیب بات ہے۔ ان کے ہزار سالہ عہد حکومت میں اسلام کو وہ عروج اور فروغ حاصل نہ ہو سکا جو عربوں کے چند سالہ عہد حکومت میں حاصل ہو گیا۔ شمالی ہند میں اسلام کی ترویج جو کچھ اور جس حد تک بھی ہوئی وہ نتیجہ تھی صوفیائے کرام، اور مشائخ عظام کے روحانی تصرفات کا۔ اسلام کی اس تبلیغ میں ملوک و سلاطین کی سیرت و کردار کو کچھ بھی دخل نہ تھا۔ ورنہ یہ کیا بات ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فیصدی ہو گئی اور دہلی میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ لکھنؤ میں مسلمان کبھی اکثریت نہ حاصل کر سکے۔ آگرہ اور الہ آباد میں مسلمانوں کا تناسب آبادی ہندوؤں سے ہمیشہ کم رہا۔ احمد نگر، گولکنڈہ بیجاپور، حیدرآباد، میسور، ارکاٹ، پٹنہ وغیرہ مسلمانوں کے کوکب جلال کے مرکز بنے رہے؛ لیکن مسلمان آبادی کے اعتبار سے ہمیشہ کم رہے ___ کیوں؟

سوال کا جواب

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ عربوں کے پیش نظر توسیع مملکت نہ تھی تبلیغ اسلام تھی۔ اور دوسرے ملوک و سلاطین اسلام سے اتنا شغف نہ رکھتے تھے جتنا توسیع مملکت سے۔ قدرتاً وہی ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی ایک طرف اسلام پھیلا دوسری طرف حکومت۔

انقلاب احوال

حالات بدلتے رہتے ہیں۔ حکومتیں مٹتی رہتی ہیں ـــــ سیاست کی دنیا میں انقلابات آتے رہتے ہیں۔ یہ وہ ناگزیر حالات ہیں جن سے دنیا کی ہر قوم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ہندوستان پر پہلے گونڈ اور بھیل حکمران تھے پھر آریہ آئے، اور اس طرح تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ پھر یہ ورق بھی الٹا اور ہندوستان پر مسلمانوں کا ڈنکہ بجنے لگا ایک ہزار سال تک جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد وہ بھی زوال سے ہمکنار ہوئے اور انگریز اس دیس کے حاکم بن گئے۔ ڈیڑھ سو سال تک خدائی اور خداوندی کرنے کے بعد انہیں بھی پسپا ہونا پڑا اور اب حکومت اس کی ہے جس کی اکثریت ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر سندھ کے فرمانروا بھی مغلوں، پٹھانوں اور ترکوں کی طرح حکومت کرتے ہوتے تو کیا آج پاکستان بن سکتا تھا ـــ ؟

تاریخ ہند کے دو ٹکڑے

اس طرح تاریخ ہند پر اگر غور کیا جائے تو واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اس تاریخ کے دو حصے ہیں ایک وہ جو سندھ سے شروع ہوتا ہے اور پنجاب تک پہنچتا ہے۔

دوسرا وہ جو درۂ خیبر سے شروع ہوتا ہے اور راس کماری تک پہنچتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان دونوں حصوں کی تاریخ الگ الگ بیان کروں۔ لہٰذا میں سندھ سے اپنے قلمی سفر کا آغاز کرتا ہوں۔

سندھ کے گورنر

1 - یزید بن ابی کبشہ
2 - عامر بن عبداللہ
3 - حبیب بن مہلب
4 - عمر بن مسلم باہلی
5 - جنید بن عبدالرحمٰن
6 - تمیم بن زید عتبی
7 - حکم بن عوانہ
8 - عمر بن محمد بن قاسم
9 - یزید بن عرار
10 - موسیٰ بن کعب
11 - عیینہ بن موسیٰ تمیمی
12 - عمر بن حفص بن عثمان
13 - ہشام بن عمر
14 - معبد بن خلیل تمیمی
15 - روح بن حاتم
16 - بسطام بن عمر
17 - نصر بن محمد بن اشعث خزاعی
18 - محمد بن سلیمان ہاشمی
19 - زبیر بن عباس
20 - مصبح بن عمر تغلبی

۲۱ - نصر بن محمد
۲۲ - لیث بن طریف
۲۳ - سالم یونسی
۲۴ - اسحاق بن سلیمان ہاشمی
۲۵ - یوسف بن اسحاق ہاشمی
۲۶ - طیغو ابن عبداللہ حمیری
۲۷ - جابر بن اشعث طائی
۲۸ - سعید بن سلیم بن قتیبہ
۲۹ - عیسیٰ بن جعفر بن منصور عباسی
۳۰ - عبدالرحمٰن
۳۱ - ایوب بن جعفر بن سلیمان
۳۲ - داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی
۳۳ - بشر بن داؤد مہلبی
۳۴ - موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی
۳۵ - عمران بن موسیٰ
۳۶ - عنبسہ بن اسحاق ضبی
۳۷ - ہارون بن ابی خالد
۳۸ - عمر بن عبدالعزیز ہباری
۳۹ - عبداللہ بن عمر ہباری
۴۰ - عمر بن عبداللہ ہباری

سندھ کے حکمراں خاندان

۱۔ عہد محمد بن قاسم و مابعد

۲۔ خاندان ہباری

۳۔ اسماعیلی دورِ حکومت

۴۔ سومرہ

سندھ

تعارف ——— حدود اربعہ ——— تاریخ

سندھ دُنیا کے قدیم ترین خطوں میں سے ہے یہاں کے آثار قدیمہ اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ سن عیسوی کی ابتداء سے کئی ہزار سال پہلے بھی یہ خطہ تہذیب تمدن کا گہوارہ تھا۔ اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے نقوش سکوں، برتنوں اور عمارتوں کی صورت میں اب تک موجود ہیں۔

زمانہ کے تغیرات اس سرزمین پر بھی کارفرما رہے۔ آریوں سے پہلے اس سرزمین پر کون قوم آباد تھی؟ اس بارے میں اب تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آریوں نے یہاں آکر دریائے سندھ کے کنارے ڈیرہ ڈالا اُن کی زبان میں دریا کو سندھو کہتے تھے چنانچہ نہ صرف دریا بلکہ یہ پورا علاقہ سندھو کے نام سے مشہور ہوا۔ جو بعد میں سندھ بنا یہی سندھ پھر ہند کہلایا پھر یہ اِند ——— اِند سے اِندیا اور اندیا سے انڈیا ہو گیا۔ آریہ پنجاب کی سرحد سے بھی آگے نکل گئے لیکن سندھ کا نام قائم رہا۔ پھر جب انہوں نے گنگا پر پہنچ کر دم لیا تو اس ملک کا نام آریہ ورت رکھ دیا۔

سندھ کے وسیع حدود

سندھ کے حدود اربعہ میں ہر نئی حکومت تبدیلی کرتی رہی یہاں کا آخری ہندو راجہ داہر تھا جسے شکست دے کر عربوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ داہر کے زمانہ میں موجودہ صوبہ سرحد۔ پنجاب۔ افغانستان کا کچھ حصہ بلوچستان، ریاست کچھ اور جودھپور کی سرحد تک مع اپنے موجودہ رقبہ کے شامل تھا۔ سندھ کا موجودہ رقبہ ۵۴۸۴۴ میل ہے۔ سندھ کے دو حصے ہیں۔ ایک زیریں، دوسرا بالائی۔ انہیں شمالی اور

جنوبی سندھ بھی کہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی بیالیس لاکھ کے قریب تھی جس میں ۷۵ فی صدی کے قریب مسلمان اور بقیہ ۲۵ فی صدی میں دوسری قومیں شامل تھیں۔ سندھ کی شادابی، زرخیزی اور رونق میں دریائے سندھ کو زبردست دخل ہے۔ سندھ کی خاص پیداوار گیہوں اور روئی ہے۔ یہاں کا موسم بہت سخت ہے سردی میں بھی اور گرمی میں بھی۔ کراچی کا موسم نسبتاً معتدل حیدرآباد کی آب و ہوا بہت اچھی ہے جیکب آباد میں سب سے زیادہ گرمی پڑتی ہے، اونٹ، گھوڑے گائے اور بیل اچھی نسل کے ہوتے ہیں۔

داہر کے زمانے میں اس ملک کا حدود اربعہ یہ تھا۔

۱- شمال مشرق کی طرف سندھ کی سرحد کشمیر سے ملی ہوتی تھی۔

۲- جنوب مغرب کی طرف مکران کا صوبہ حد فاصل کا کام دیتا تھا۔

۳- مغرب کی جانب کوہستان کرمان اور فلات واقع تھا۔

۴- جنوب میں بحر عرب کے مشرقی جانب ریگستان اور ہندوستان تھا۔

سندھ کی قدیم تقسیم

داہر کے زمانے میں سندھ کے پانچ صوبے تھے۔

۱- برہمن آباد

۲- سیوستان

۳- اسکلندہ

۴- ملتان

۵- ادور

یہاں کی عام آبادی داہر کے زمانے میں زیادہ تر بدھ مت کی پیرو تھی۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ زیادہ تر برہمنوں پر مشتمل تھا۔

راجہ داہر

۶۶۰ء میں (۴۰ھ) راجہ چچ جاہ و جلال، شان و شکوہ اور رعب و داب سے
…س سال حکومت کرنے کے بعد رخصت ہو گیا، چچ کے بعد اس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا یہ
…مذہب کا پیرو تھا اگرچہ سندھی عوام بدھ تھے لیکن برسر اقتدار طبقہ برہمنوں اور ہندوؤں پر
…ل تھا چندر نے جبر و جور کے ذریعہ اس طبقہ کو بھی بدھ بنانے کی مہم شروع کر دی۔ اس کے زمانے
…ھائی خانہ جنگیاں ہوئیں لیکن یہ زیادہ دنوں یہ زندہ نہ رہا صرف آٹھ سال تک حکومت کرنے کے
مر گیا۔ ۶۶۸ء میں (۴۸ھ) میں چچ کا چھوٹا لڑکا داہر تخت نشین ہو گیا۔

…ہن سے داہر کی شادی

تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد داہر نے اپنی بہن رانی بائی سے
شادی کر لی۔ اس شادی نے خاندان میں بدمزگی پیدا کر دی
…ن اس شادی کی کہانی بہت ہی دلچسپ اور بڑی عجیب و غریب ہے۔

داہر نے ایک منجم کو اپنی بہن کا ہاتھ دکھایا۔ ہاتھ دیکھ کر اس نے کہا کہ تمہاری بہن تو بڑی
…یب ور لڑکی ہے۔ جو اس سے شادی کرے گا وہ بھی بڑا بختاور ہو گا اور سارے سندھ پر حکومت
…ے گا۔ وزیر نے راجہ کو بہن سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ راجہ نے تھوڑے تأمل کے بعد یہ مشورہ
…ل کر لیا۔ بڑے بھائی کو یہ خبر ہوئی تو وہ فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ لیکن کچھ کر نہ سکا۔

…اغی عرب کی مدد

۸۰ھ میں ایک راجہ زمل نے بغاوت کی اور متعدد مقامات…

پر قبضہ کر لیا، اتفاق سے کچھ باغی عرب اپنے ملک سے فرار ہو کر یہاں پناہ گزین کی حیثیت سے مقیم ہو گئے داہر نے ان عربوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے ایک عرب سردار محمد علافی نے پانچ سو سپاہی لئے اور شب خون مارا۔ رَمل کی فوج اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکی، ہزاروں آدمی مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ رمل کی شکست نے داہر کے رعب اور دبدبے میں بہت اضافہ کر دیا۔ وہ شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔

کج اندیشی

۶۸۰ء (۹۲ھ) تک بڑے کرّو فر کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اب تک کبھی داخلی یا خارجی مصیبت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ لیکن کج اندیشی اور حماقت کے باعث وہ خلافت امویہ سے اُلجھ پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن قاسم ایک فوج گراں لے کر سندھ پر حملہ آور ہوا۔ ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں راجہ داہر جنگ کرتا ہوا مارا گیا اور سندھ کے پورے علاقہ پر عربوں کا اقتدار، اور تسلط قائم ہو گیا

داہر کا مغرورانہ رویّہ

یوں تو خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی اطراف سندھ پر مسلمانوں کے حملے ہوئے۔ لیکن وہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ سندھ پر اصلی اور باقاعدہ حملہ حجاج بن یوسفؒ کے زمانے میں ہوا۔

عرب تاجر دنیا کے مختلف ممالک میں کاروبار اور تجارت کے سلسلے میں جایا کرتے تھے یہ تاجر اپنے ساتھ مالِ تجارت بھی لے کر جاتے تھے اور دولت ایمان بھی، یہ جہاں جاتے تھے، اپنی سیرت، اپنے کردار، اپنے اخلاق، اور اپنی اسلامیت کا ایسا گہرا نقش قائم کر دیتے تھے کہ جو لوگ تہذیبی، ذہنی اور مذہبی اعتبار سے ان سے بالکل الگ ہوتے تھے وہ بھی ان کا احترام کرنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے تھے۔

لنکا میں ایک عرب تاجر کا انتقال ہوا اس کے گھر کی عورتوں اور بچوں کو وہاں کے راجہ نے عزت و احترام کے ساتھ ایک جہاز میں بٹھایا اور روانہ کر دیا وہ جہاز جب سندھ کی بندرگاہ دیبل میں پہنچا تو بحری قزاقوں نے اسے لوٹ لیا اور جہاز کے مسافروں کو گرفتار کر لیا۔ ان گرفتار شدگان میں قبیلہ یربوع کی ایک عورت بھی تھی۔ وہ چلائی

"اے حجاج مدد"

یہ خبر جب حجاج کو پہنچی تو اس کی عربی حمیت جوش میں آئی - اس نے راجہ داہر کو ایک خط لکھا اور تلافیٔ مافات پر آمادہ کیا - داہر پندار و نخوت کے مرض میں مبتلا تھا - اس نے سوچا حجاج میرا کچھ نہیں کر سکتا اور غرور کے عالم میں جواب دیا -

" یہ قزاق میرے بس سے باہر ہیں میں کچھ نہیں کر سکتا، حجاج کو اختیار ہے جو چاہے کر لے "

حجاج کی برہمی

یہ جواب جب حجاج تک پہنچا تو اس کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ داہر کو قرار واقعی سزا دے گا - اور جس سرزمین پر مسلمانوں کی جان اور آبرو کا تحفظ نہیں ہو سکتا اس سرزمین پر اسلام کا پرچم لہرائے گا

حجاج کا فیصلہ؛ تلوار

حجاج کا قطعاً یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ سندھ پر یا کسی دوسرے خطۂ ارض پر حملہ کر کے اسے خلافت اسلامیہ کے ممالک محروسہ میں شامل کر لے - اس کی زندگی کا صرف اک ہی مقصد تھا کہ داخلی امن و امان قائم رکھے - ذاتی طور پر وہ بڑا سنگدل سفاک اور بے رحم انسان تھا - اس نے اکابر مسلمین کے ساتھ جو سلوک کیا، اور عامۃ مسلمین کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ تاریخ کا ایک دلگداز اور لرزہ خیز واقعہ ہے - لیکن اس نے کبھی غیر مسلموں پر نہ ظلم کیا نہ ان سے لڑائی کا پروگرام بنایا، نہ اس کی یہ پالیسی تھی کہ اپنے حدود مملکت سے باہر نکل کر دوسری قوموں اور ملکوں پر حملہ آور ہو - خود خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک کی پالیسی بھی یہی تھی ——— لیکن ولید اور حجاج دونوں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی مسند پر بیٹھے ہوئے بے گناہ اور معصوم عرب، عورتوں اور بچوں کی تباہی و بربادی کا تماشہ دیکھتے رہیں

داہر کے ہاں سے جب حجاج کی سفارت ناکام واپس آئی تو اس نے طے کر لیا کہ اس تنازعہ کا آخری اور قطعی فیصلہ تلوار کرے گی - داہر میں اگر ذرا بھی وسعت قلب، رواداری اور انصاف کا مادہ ہوتا تو بحری قزاقوں کو سزا دے کر اپنی سلطنت کو بھی بچا سکتا تھا اور اپنے نام کو بھی لیکن اس نے یہ کچھ نہ کیا آخر کار اس کی سلطنت بھی ختم ہو گئی اور نام بھی مٹ گیا -

مسلمان کبھی بھی جارحانہ پیش دستی کے مرتکب نہیں ہوئے انہوں نے کبھی بھی اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا کہ خواہ مخواہ کسی غیر مسلم حکومت کو چھیڑا ہو یا اس کی آزادی مجروح کی ہو۔ انہوں نے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مہلت دی، ڈھیل دی، صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا، تب انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی!

۔ بخارا۔ یہاں کے لوگ
ی تاکہ دشمن

محمد بن ق

تاریخ کا سب سے نوعمر اور بہت بڑا فاتح

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن — نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

دنیا کی تاریخ کشور کشاؤں اور سپہ سالاروں کے کارناموں سے لبریز ہے۔ یہ وقت کے وہ مردان کار تھے جنہوں نے اک عمر فنون جنگ میں مہارت پیدا کرنے میں صرف کی جب یہ میدان میں پہنچے تو انہوں نے تلوار نیام سے باہر نکالی اور جو سامنے آیا اس کی گردن کاٹ کر رکھ دی۔ انہوں نے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو پامال کیا۔ انہوں نے سربفلک عمارتوں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا، ان کا جوش انتقام بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو ہلاک کرنے کے بعد بھی قائم رہا۔ انہوں نے پررونق اور آباد بستیوں کو ویرانہ بنا دیا۔ انہوں نے انسانی خون سے ہولی کھیلی ——— جنگ کے میدان میں پہنچنے کے بعد یہ فراموش کر دیا کہ رحم، انسانیت اور معدلت بھی کسی چیز کا نام ہے ان کا صرف اک قانون تھا۔

طاقت ———!

ان کی طاقت سے جو ٹکرایا پاش پاش ہو گیا۔ انہوں نے بے قصوروں کو ستایا مظلوموں پر اور زیادہ ظلم کیا ——— ان کی خوں آشامی، درندگی، بربریت، اور بہیمیت سے انسان تو انسان جانور بھی کانپ اٹھے۔ انہوں نے انسانی سروں کے مینار بنائے۔ انہوں نے بے محابہ قتل عام کیا لیکن ان کی سفاکی بڑھتی ہی گئی اس میں ذرہ بھر تبدیلی نہ ہوئی۔

مسلمان کبھی ہم ۔ بین تاریخ ایک اور بہت بڑے فاتح کو پیش کرتی ہے
جرم کا ار ۔ سب سے زعمر سپہ سالار
کی ہے محمد بن قاسم ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا

محمد بن قاسم کا کردار

محمد بن قاسم نے سندھ کا سارا علاقہ فتح کر لیا لیکن اس نے کبھی بے گناہ کو قتل نہیں کیا کسی شخص کو اپنے جذبۂ انتقام کا نشانہ نہیں بنایا اس نے داہر تک پر کوئی ظلم نہیں کیا جس نے اماں مانگی اسے اماں دی ۔ جو عنایت اور بخشش کا سزاوار ثابت ہوا اس پر لطف و کرم کی بارش کر دی ۔ مجرموں اور گناہ گاروں کے ساتھ اس نے رحم اور شفقت کا برتاؤ کیا ۔ بدھ مت کے پیروؤں اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کے ساتھ یکساں رواداری کا برتاؤ کیا ۔ اس نے کسی کا مذہب بدلنے کی کوشش نہیں کی ۔ نہ لالچ دیا نہ ڈرایا دھمکایا اس کے کردار و سیرت کا یہ شاندار رنگ دیکھ کر لوگ خود بخود اسلام کی طرف کھنچنے لگے ۔ اس لئے نہ کسی کی جاگیر چھینی نہ تخت و تاج ۔ اس نے محکوموں پر اعتماد کیا ، مذہبی اختلاف کے باوجود انہیں نوازا ، سرفراز کیا ، اور بام عروج پر پہنچا دیا ۔

یہ تھا محمد بن قاسم ۔

محمد بن قاسم کا کوچ

حجاج بن یوسف ثقفی کا حکم پا کر محمد بن قاسم ایک لشکر لے کر جو چھ ہزار افراد پر مشتمل تھا سندھ کی طرف عازم ہوا محمد بن قاسم خشکی کے راستے سے سندھ کی طرف بڑھا ۔ جہازوں پر ساز و سامان جنگ بار کیا اور دیبل روانہ کر دیا محمد بن قاسم چھ ماہ تک شیراز میں مقیم رہا ۔ وہاں سے مکران آیا پھر آگے بڑھتا ہوا موجودہ ریاست لس بیلہ کے پایۂ تخت ارمن بیلہ پر حملہ آور ہوا ۔ یہاں سے وہ دیبل پہنچا یہ سندھ کی سب سے زیادہ کار آمد اور مشہور بندرگاہ تھی ، ایران ، عراق ، عرب اور افریقہ کے جہاز یہیں لنگر انداز ہوا کرتے تھے ۔ دیبل بدھوں کا بہت بڑا اور مشہور عبادت کدہ تھا ۔ اس میں یہاں لوگوں نے بہت سی مورتیاں

تھیں لیکن سب سے بڑی مورتی مہاتما بدھ کی تھی ۹۲ھ میں محمد بن قاسم یہاں پہنچا۔ یہاں کے لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا۔ اپنے لشکر کے سامنے مسلمانوں نے ایک خندق کھود دی تاکہ دشمن یک بیک حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

دیبل کی فتح دیبل کا محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا جب وہاں کے باشندوں پر خواب و خور حرام ہو گیا تو تنگ آ کر وہ باہر نکلے۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ سندھیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی لیکن وہ عربوں کے ریلے کو روک نہ سکے ایک ڈلاور مسلمان اسلامی جھنڈا لے کر فصیل پر چڑھ گیا پُر زور انداز میں "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ یہ منظر دیکھ کر مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا وہ دیوانہ وار فصیل کی طرف لپکے۔ اور فصیل پر چڑھ کر شہر میں کود ے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ تین دن تک شہر کے اندر بھی جنگ جاری رہی۔ آخر رعایا نے امان طلب کی لڑنے والوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور حاکم شہر روپوش ہو گیا۔

سندھ میں پہلی مسجد دیبل کی فتح کے بعد فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ یہاں سے پچھتر میل کے فاصلے پر ایک مقام نیرون تھا۔ محمد بن قاسم اپنی فوج لے کر آگے بڑھا مگر نیرون کا حاکم بدھ تھا۔ اس نے محمد بن قاسم سے صلح کر لی اور اس طرح اپنی جان بھی بچا لی اور اپنا منصب بھی۔ محمد بن قاسم نے اس کی بہت عزت افزائی کی۔ یہاں مسلمانوں نے ایک مسجد کی بنا ڈالی، جہاں باقاعدگی کے ساتھ فرائض پنجگانہ ادا کئے جانے لگے، پھر وہ نیرون کے حاکم کو رہنما بنا کر سیوستان کی طرف بڑھا۔ یہاں کا حاکم ہندو تھا اور رعایا بدھ۔ رعایا خونریزی اور جنگ و پیکار سے متنفر اور حاکم شہر لڑنے مرنے پر آمادہ۔ محمد بن قاسم نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ منجنیق سے سنگ باری شروع کر دی، ایک ہفتے کے بعد حاکم شہر نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ شہریوں نے اطاعت قبول کر لی اور مسلمان قلعہ پر قابض ہو گئے۔

اسلامی رواداری کا عجیب واقعہ سیوستان کے انتظامات درست کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے چند اور مقامات کو فتح کیا اور سیسبی[1] کے قلعہ کی طرف

---

[1] سیبی (جسے اس زمانے میں سیوی یا سیسم کہتے تھے) اب سندھ کے بجائے بلوچستان کا ایک حصہ ہے۔

بڑھا۔ راستہ میں ایک مقام ہلیان ملا یہاں کا فرمانروا کاکا اپنے لوگوں سمیت مطیع ہو گیا محمد بن قاسم نے کاکا کو خلعت سے سرفراز کیا۔ اپنے برابر کرسی پر جگہ دی۔ ریشمی لباس پہنا کر اس کے سر پر پگڑی باندھی۔ اس عزت افزائی نے کاکا اور اس کے ساتھیوں کے جذبۂ رفاقت کو دوچند کر دیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ سیبی پر حملہ آور ہوا۔ سیوستان کا حاکم بجے رائے یہیں پناہ گزین تھا۔ دو روز تک زور دار لڑائی ہوئی۔ پھر بجے رائے جنگ میں ہلاک ہو گیا۔ رعایا نے امان مانگی اور اطاعت قبول کر لی۔ لوگوں نے ایک ہزار درہم خراج دینا منظور کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے چند اور مقامات فتح کئے۔ پھر اسے حجاج کی طرف سے ہدایت ملی کہ وہ داہر سے فیصلہ کن لڑائی کا آغاز کر دے۔ محمد بن قاسم خود بھی یہی سوچ رہا تھا اس لئے کہ جب تک راجہ داہر سے قطعی اور فیصلہ کن معرکہ آرائی نہ ہو لے اس وقت تک سندھ کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جن قلعوں اور شہروں کو اس نے فتح کیا تھا وہاں پر اس وقت تک اسے استحکام و استقلال حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک سندھ کی مرکزی حکومت بھی اس کے ہاتھ میں نہ آ جاتی خود راجہ داہر بھی دور بیٹھا حالات کا مشاہدہ و معائنہ کر رہا تھا۔ اور خود بھی اس کا متمنی تھا کہ جنگ ہو اور جلد ہو تا کہ ان سرپھرے عربوں کا استیصال کر کے وہ یہ ثابت کر دے، کہ سندھ اسی کا ہے اور اسی کا رہے گا۔

داہر کی خوش فہمی

دراصل وہ عربوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ محمد بن قاسم کی فتوحات کی خبریں اسے ملیں لیکن وہ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ وہ اسے جنگی چال سمجھ رہا تھا کہ شروع میں عربوں سے تعرض نہ کرے۔ انہیں اندر بڑھ آنے دے اور جب وہ اپنے مرکز سے دور ہو جائیں تو ان پر بھرپور وار کرے اور ان کا خاتمہ کر دے۔

داہر اور محمد بن قاسم

اسلامی تواضع ——— کافرانہ تکبر

محمد بن قاسمؒ کا مقصد وحید سندھ کو فتح کرنا اور داہر کو شکست دینا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے وہ طریقے اختیار نہیں کئے۔ جو عام طور پر آج کل استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ مسلمان تھا اور اسلام کے احکام و ہدایات سے سر مو انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور وہ جانتا تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اسے کیا کرنا چاہیئے۔ داہر نے اپنی کوتاہ اندیشی اور حماقت سے محمد بن قاسم کو مشتعل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا لیکن محمد بن قاسم نے جواب میں کوئی حرکت ایسی نہیں کی جس سے اسلام کے وقار پر حرف آتا۔ حدود سندھ میں داخل ہونے کے بعد اسے مزاحمت اور مقاومت کا قدم قدم پر مقابلہ کرنا پڑا اور یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل تھی کہ یہ سب کچھ داہر کے اشارے اور احکامات سے ہو رہا ہے بلکہ اس میں اس کا حکم اور مرضی شامل ہے۔ پھر بھی جادۂ صواب سے اس کا قدم نہیں ڈگمگایا۔ اس نے کسی سے انتقام نہیں لیا کسی پر ظلم نہیں کیا کسی کا حق نہیں چھینا۔ کسی کے ساتھ غیر مہذب اور ناشائستہ سلوک نہیں کیا۔

دلچسپ موازنہ جس شہر میں وہ داخل ہوا لوگ سہم گئے کہ ایک فاتح آیا ہے ظلم کی چکی میں سب کو پیس ڈالے گا، لیکن جب اس کا جمال جہاں آرا دیکھا، تو وہ غیر اپنوں سے بہتر نظر آیا، اپنے ظلم کرتے تھے، زیادتی کرتے تھے، ناانصافی کرتے تھے، جبر و جور سے کام لیتے تھے، مذہب اور عقیدے کے معاملے میں بھی تلوار کو فیصلہ کن دلیل سمجھتے تھے، لیکن یہ اجنبی

شخص، یہ بدلیسی، یہ فاتح، یہ تلوار کا دھنی اور قوت و طاقت کا مالک کیسا عجیب غریب آدمی تھا جو مفتوحوں سے پیار کرتا تھا۔ انہیں گلے لگاتا تھا، ان سے محبت بھری باتیں کرتا تھا۔ ان کی داستانِ غم سنتا تھا۔ اور اسکا مداوا کرتا تھا، ان کی مصیبت میں کام آتا تھا، ان کے عقیدے اور مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتا تھا ——— کسی کو نیچ نہیں سمجھتا تھا، سب کے ساتھ مساوات، اخوت اور شرافت کا برتاؤ کرتا تھا۔ کسی کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ سب پر اعتماد کرتا تھا۔ دلیر اور دلاور ایسا تھا کہ ہزاروں کے مجمع میں تن تنہا کود جاتا تھا۔ رحم دل اور بامروت اتنا تھا کہ کسی کا دل نہ دکھاتا تھا خلق اور انکسار کا یہ عالم کہ لوگ اسے پوجنے لگے تھے —— سچ ہے!

داہر کے لشکر کی شکست

نیرون سے باہر نکل کر محمد بن قاسم داہر سے مقابلہ کرنے کے لئے بڑھا۔ راستے میں متعدد قلعے اور شہر اس نے فتح کر لئے۔ راجہ داہر کے باجگزاروں اور عاملوں کو اپنا مطیع اور منقاد بنا لیا۔ داہر کو جب ان واقعات کی اطلاع ملی تو غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ اور اس نے ایک بہت بڑا لشکر محمد بن قاسم کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ محمد بن قاسم ابھی دریائے سندھ کے پار نہیں اترا تھا کہ داہر کا لشکر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ان دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا —— انجام کار داہر کا لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا اور محمد بن قاسم کے آگے بڑھنے کا راستہ صاف ہو گیا۔

اتمام حجت کا فیصلہ

دریائے سندھ کے کنارے پر لشکر سے جو جنگ ہوئی تھی وہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ داہر میدانِ جنگ میں کود پڑا ہے، اب نہ اتمام حجت کی ضرورت تھی نہ الٹی میٹم کی، محمد بن قاسم اگر جنگ شروع کر دیتا تو اخلاقی اور عرفی اعتبار سے اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے اتمام حجت کر لینا ضروری سمجھا اور داہر کے پاس ایک سفارت بھیجی۔

محمد بن قاسم کی سفارت

ایک شامی سردار کے ساتھ ایک سندھی نو مسلم کو جس کا نام مولانا اسلامی تھا، اس نے داہر کے پاس

بیٹھا۔ داہر جاہ و جلال کا پیکر بنا تخت پندار پر متمکن تھا۔ یہ دونوں بے خوف اور بے جھجک ہو کر دربار میں پہنچے۔ دربار کا معمول یہ تھا کہ ہر آنے والا بادشاہ کے سامنے سجدہ کرتا اور سر جھکا کر تعظیم بجالاتا۔ لیکن جن لوگوں کے سر ایک خدا کے سامنے جھک چکے ہوں، وہ مخلوق خدا کے سامنے نہیں جھکتے۔

داہر نے حیرت اور تعجب کے ساتھ محمد بن قاسم کے سفیروں کو دیکھا۔ اسے اس بات پر اور زیادہ حیرت تھی کہ یہ شخص جو مولانا اسلامی کے نام سے کھڑا تھا دیبل کے ایک معزز ہندو گھرانے کا فرد تھا

داہر نے کہا۔

"کیا تم دربار کے رسم و رواج، آداب شاہی اور ہمارے جاہ و جلال کی حقیقت سے ناواقف ہو؟"

مولانا اسلامی نے کہا۔

"جب تک میں ہندومت کا پیرو تھا آپ کی رعایا کی حیثیت رکھتا تھا۔۔۔ دربار کے رسم و رواج پر عمل کرنا اور آداب شاہی بجا لانا میرا فرض منصبی تھا۔۔۔ لیکن اب میں مسلمان ہوں اور خدا کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔"

داہر نے پیچ و تاب کھا کر کہا۔

"اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔"

مولانا اسلامی نے بے پرواہی اور دلیری کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ اگر مجھے قتل کر دیں تو ایک آدمی کا قتل عرب فوج اور اسلامی مملکت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔۔۔ لیکن یاد رکھیے میرا خون بالا بالا نہ جائے گا، مسلمان پورا پورا انتقام لیں گے۔"

داہر نے برہم ہو کر کہا۔

"یہ باتیں چھوڑو۔۔۔ بتاؤ تم کیا پیام لے کر آئے ہو"

مولانا نے اسلامی فوج کے ترجمان کی حیثیت سے جواب دیا۔

"اطاعت یا جنگ!"

یہ الفاظ سنکر داہر سکتہ میں آگیا۔

وہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ہندو خاندان کا فرد مسلمان بن جانے کے بعد اس طرح اس سے دوبدو گفتگو کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے وزیر سے مشورہ کیا۔ وزیر نے کہا۔

وزیر کا مشورہ داہر کا فیصلہ

"موت ان عربوں کو کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ اطاعت کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ ہم جنگ کریں گے اور چن چن کر ایک ایک عرب سپاہی کو قتل کر دیں گے یہ لوگ بچ کر نہیں جا سکتے۔"

پھر داہر نے پناہ گزیں اور باغی عرب سردار، علافی سے رائے لی اور پوچھا "تم کیا کہتے ہو؟" مطلب یہ کہ عربوں اور ہندوؤں کی جنگ میں تم کس کا ساتھ دو گے؟ اپنے ہم مذہبوں کا یا اپنے محسن ہندو بادشاہ کا؟

علافی نے بے تامّل کہا۔

"میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کے پہلو بہ پہلو لڑوں گا، میدان جنگ سے منہ نہیں پھیروں گا"

اس جواب سے داہر کا حوصلہ اور بلند ہو گیا اس نے کچھ برہمی اور آشفتہ مزاجی کے ساتھ سفارت کو مخاطب کیا۔

"ہم تمہاری کوئی شرط منظور نہیں کر سکتے ——— تلوار ہی ہمارا فیصلہ کرے گی"

داہر کی تیاریاں

سفارت، داہر کا انکاری جواب لے کر محمدؒ بن قاسم کے پاس واپس آگئی، سفارت کے رخصت ہونے کے بعد راجہ داہر نے اپنے سرداروں، وزیر اعظم اور عرب سردار علافی سے کہا۔

"اب جنگ ہمارے دروازے پر آگئی ہے۔ دشمن خواہ کتنا ہی کم مایہ ہو اسے حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے ہماری فوجی تیاریوں کا ابھی سے آغاز ہو جانا چاہیئے اور پوری تیاری کے ساتھ میدان جنگ میں اترنا چاہیئے"

سب نے راجہ داہر کی رائے سے اتفاق کیا۔

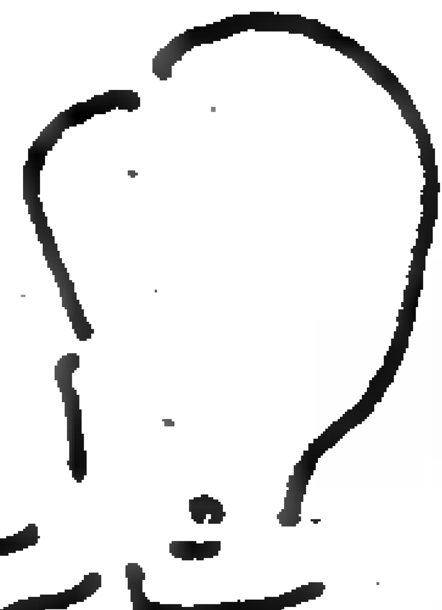
زور شور کے ساتھ جنگی تیاریاں داہر کے لشکر میں شروع ہو گئیں اور چند ہی روز کے اندر

داہر اپنے لاؤ لشکر سمیت دریائے سندھ کے قریب آیا اور وہاں اطمینان سے خیمہ زن ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے پاس بھی داہر کے صاف انکار کے بعد اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ مقابلہ کی تیاریاں کرے چنانچہ اس نے حجاج کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں اپنی سفارت اور داہر کی گفتگو کا بھی حوالہ دیا پھر اجازت طلب کی کہ داہر سے آخری لڑائی لڑنے کا اذن مرحمت ہو۔

حجاج نے کوفہ اور سندھ کا اتنا اچھا انتظام کر رکھا تھا کہ صرف تین دن کی قلیل مدت میں خط ادھر سے ادھر پہنچ جاتا تھا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے اس عریضہ کا جواب چند ہی روز میں موصول ہو گیا۔

حجاج نے جنگ کی اجازت دے دی تھی۔



داہر کی شکست اور قتل

کاروانِ اسلام کا منزل بہ منزل کوچ

چونکہ محمد بن قاسم کی طرف سے حملہ کا آغاز نہیں ہوا تھا، داہر بھی اپنی جگہ بہت مطمئن تھا وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ شاید محمد بن قاسم صرف دھمکی سے کام نکالنا چاہتا ہے، اس کا اصل مقصد جنگ و پیکار نہیں ہے، اُسے اپنی طرف سے یہ اطمینان بھی تھا کہ اس کے پاس جو قوت و طاقت ہے اس کا مقابلہ محمد بن قاسم کسی طرح نہیں کر سکتا، اور اب تک اس کے پہل نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اس سے مرعوب ہو چکا ہے اور جنگ کا آغاز کر دے، غرض محمد بن قاسم کی طرف سے مطمئن ہو کر داہر عیش و عشرت، راگ رنگ، سیر و تفریح اور صید و شکار میں مصروف ہو گیا، اس کا دن ان دلچسپیوں میں بسر ہوتا تھا، اور رات رقص و نغمہ کی محفلوں میں گذرتی تھی

دوستانہ مشورہ داہر کی ان رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں کو دیکھ کر اس کے ایک وزیر نے از راہِ نصیحت و مشورہ عرض کیا۔

"دشمن ہمارے سر پہ پہنچ چکا ہے، وہ ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے، اور آپ بجائے اس کے کہ اس کا مقابلہ کریں، تفریح اور دلچسپی میں وقت صرف کر رہے ہیں"!

داہر نے وزیر کی بات توجہ سے سنی اور کہا۔

"تمہاری کیا صلاح ہے؟ میں کیا کروں"؟

وزیر نے عرض کیا:۔

میری سمجھ میں تو تین باتیں آتی ہیں"

۱- یا تو ایسا کیجئے کہ اپنے بال بچوں کو، اندرون ہند میں بھیج دیں، پھر یکسو ہوکر پوری قوت اور زور شور کے ساتھ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے۔

۲- ورنہ پھر یہ کیجئے کہ بھروسہ کے لوگوں کو لے کر ریگستان کی طرف نکل چلئے، وہاں کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنائیے۔ اور پھر دشمن سے جنگ کیجئے۔

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ آپ راجہ جسیم کے پاس چلے جائیے اس کے دل میں آپ کی عزت اور وقعت ہے، وہ ضرور آپ کا ساتھ دے گا، آپ کی مدد کرے گا"!

راجہ داہر نے وزیر کی باتیں سننے کے بعد اس کی تجویز ماننے سے صاف انکار کر دیا، اس نے کہا

"میرے لئے اس سے بڑھ کر عار کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ میں کسی سے مدد مانگوں،"!

وزیر نے دریافت کیا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے"؟

داہر نے جواب دیا۔

"مجھے اپنی قوت اور دشمن کی طاقت کا پورا اندازہ ہے، میں مقابلہ کروں گا اور اسے اپنے دیس سے نکال باہر کروں گا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے، زندہ رہوں گا تو فاتح بن کر، ورنہ پھر موت میرے لئے بہتر ہے"۔

راستہ کا پتھر محمد بن قاسم کے سامنے اس وقت سب سے اہم سوال یہ تھا کہ دریا سے پار کیونکر اترا جائے؟

داہر اور اس کے سرداروں کی طرف سے پوری کوشش اس امر کی ہو رہی تھی کہ دریا کا پار کرنا ناممکن بنا دیا جائے، قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں، محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے سے پہلے دو مرحلے طے کرنا تھے، ایک تو یہ اقدام سے پہلے ایسے انتظامات کر لئے جائیں کہ پیچھے سے کوئی حملہ نہ کر سکے، رسد کی فراہمی کا سلسلہ غیر منقطع طور پر جاری رہے، اور دریا کو اس طرح

پار کیا جائے کہ دشمن کی مزاحمت مجاہدوں کی پیش قدمی میں حارج نہ ہونے پائے، اس سلسلہ میں بن قاسم نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنی احتیاطی تدبیروں سے دشمن کے لئے عقب سے حملہ آ ہونا ناممکن بنا دیا، پھر رسد کی فراہمی کے لئے راستہ کھلا رکھنے کے قابلِ اطمینان انتظامات کئے، کاموں سے فارغ ہونے کے بعد دریا پار کرنے کے لئے اس نے کشتیوں کا پل بنایا، اسی پل کے مجاہدین ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر بہ حفاظت اور بہ اطمینان پہنچ گئے۔

داہر کی حواس باختگی

محمد بن قاسم کے سپاہی جب دریا پار کر کے دوسری طرف پہنچے راجہ راسل کے سپاہیوں نے حملہ کر کے ان کی پیش قدمی چاہی۔ راجہ راسل کو داہر نے خاص طور پر اس لئے بھیجا تھا کہ وہ محمد بن قاسم کو دریا نہ پار کر دے، محمد بن قاسم کے سپاہیوں نے ایسی بے جگری سے تیر اندازی کی کہ راسل کے سپاہی تا نہ لا سکے، اور بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمان سپاہی تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھے اور بہت دور بڑھتے چلے گئے۔

جنگ، فرار، اور تعاقب کا واقعہ رات کی تاریکی میں شروع ہوا تھا اور رات ابھی ختم ہوئی تھی کہ اتمام تک پہنچ گیا، راجہ داہر اطمینان اور بے فکری کی نیند سو رہا تھا، صبح جب بیدار ہوا تو راجہ کا ایک مصاحب بدحال ہانپتا بار یاب ہوا، داہر نے اس سے بڑی امید ساتھ پوچھا،

"کہو کیا خبر لائے ہو"

داہر کو امید تھی کہ وہ کوئی خوشخبری سنے گا، لیکن خوش خبری کے بجائے اس کے کان نے یہ خبر بد سنی

"مسلمانوں نے دریا پار کر لیا، راسل کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا!"

صبح صبح اٹھتے ہی ایسی فالِ بد سن کر داہر کو بہت غصہ آیا، اس وقت اس کے بس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس نے اس شخص کو فوراً قتل کر دیا جس نے یہ خبر بد سنائی تھی، راجہ کے

ں کی گردن تو کاٹ لی گئی، لیکن اس قتل نے راجہ کے دوستوں کو بھی اس سے بدگمان کر دیا۔ ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ یہی سلوک ہمارے ساتھ بھی کل ہو سکتا ہے!

مسلمان مسلمان سے نہیں لڑ سکتا

یہ وقت بڑا نازک اور کٹھن تھا! داہر کے حواس گم تھے! اور اسے اس کا وہم گمان بھی نہیں تھا کہ راجہ راسل اتنی آسانی سے اور اس قدر جلد شکست کھا جائے گا!

اس نے سوچا، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، میں نے باقی عربوں کو اسی لئے پناہ دی تھی کہ وہ میرے کام آئیں گے، اب ان کی وفاداری کا امتحان ہے، یہ سوچ کر اس نے عرب سردار علافی کو بلایا، اسے تمام حالات بتائے، اور اپیل کی کہ وہ اس کا ساتھ دے، راجہ کی باتیں سن کر علافی نے کہا "میں اپنے قول پر اب بھی قائم ہوں، راجہ کی آن، شان اور جان کے لئے میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بڑے فخر کے ساتھ نثار کر دوں گا، لیکن مسلمانوں سے لڑوں، یہ نہیں کر سکتا، دنیا کے لئے میں اپنی عاقبت بگاڑنا نہیں چاہتا"!

یہ جواب اگرچہ غیر متوقع تھا، لیکن داہر نے اس موقع پر کسی قسم کی برہمی کا اظہار نہیں کیا، اس نے کہا،

"میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم عربوں سے لڑو، اگر تم اسے اپنے مذہب کے خلاف سمجھتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن کم از کم ایسا تو کرو کہ میرے ساتھ رہو، مجھے عربوں کے داؤں پیچ سے واقف کرتے رہو، اور صلاح و مشورہ کی حد تک میری پوری پوری رفاقت کرو"۔

علافی اس بات پر راضی ہو گیا۔

ایک اور بدشگونی

بہرحال اب مقابلہ کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا! —— راجہ داہر نے اپنے ایک بیٹے کی زیر کمان، ایک آزمودہ کار فوج جنگ کے لئے بھیجی، ایک جھیل کے پاس، دونوں فوجوں میں آمنا سامنا ہوا، محمد بن قاسم ابھی پیچھے تھا، وہاں جو فوج تھی اس کی کمان عبداللہ ثقفی کے ہاتھ میں تھی، عربوں نے ایسا زبردست حملہ کیا، اور اس طرح

جی توڑ کر دشمن سے لڑے، کہ بہت جلد اس جنگ کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ ہندو عربوں کی یورش کی تاب نہ لا سکے، انہیں پسپا ہونا پڑا، داہر کا لڑکا اس جنگ میں ہلاک ہو گیا، شہزادہ کی ہلاکت نے فوج پر اور زیادہ بُرا اثر کیا، اس کی ہمت ٹوٹ گئی، اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔

راسل کی پشیمانی اور کفارۂ گناہ

محمد بن قاسم کے سیل فتوحات کو دیکھ کر، سندھ کے متعدد راجاؤں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اب داہر کی قسمت کا پانسا پلٹ چکا ہے، اب سندھ پر مسلمان حکومت کریں گے چنانچہ کئی راجہ بطیب خاطر اپنے مذہب پر قائم رہ کر محمد بن قاسم کے مطیع بن گئے، محمد بن قاسم نے بھی ان کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، ان کے اقتدار، اور اختیار میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، ان کے اعزاز اور وقار میں ذرا بھی کمی نہ آنے دی، ان کی دولت و ثروت میں کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت بھی نہ دی، اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وفاداری اور زیادہ مستحکم ہو گئی، اور وہ دل و جان سے داہر کا ساتھ چھوڑ کر محمد بن قاسم کے معاون اور مددگار بن گئے، بلکہ انہوں نے خط لکھ کر، اور ایلچی بھیج بھیج کر محمد بن قاسم کے ہاتھوں اپنے آپ کو گرفتار کرایا، تاکہ ان کے ہم قوم یہ نہ سمجھیں کہ انہوں نے غداری کی ہے۔ ایک بہت با اثر راجہ موکا، اسی طرح گرفتار ہو کر عربوں کا دوست بنا تھا، اب راسل نے بھی، اسی تدبیر پر عمل کیا، اس نے خود اپنے تئیں گرفتار کرایا اور جب محمد بن قاسم کے سامنے پہنچا تو اپنے گزشتہ طرز عمل پر ندامت کا اظہار کیا، محمد بن قاسم نے اس کی دلجوئی اور خاطر مدارات میں بڑی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا۔

داہر کے دل کا چور

راجہ موکا، اور راجہ راسل کے مشورہ سے عرب فوج آگے بڑھی، اور ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈال دیا، سامنے جھیل تھی۔ اور جھیل کے اس طرف داہر کا لشکر، راسل کی فراست نے یہ دشواری بھی حل کر دی کہ جھیل سے کس طرح اترا جائے راسل نے اگر جھیل سے پار اترنے کی سہل ترکیب نہ بتائی ہوتی، تو بڑے چکر کا اور دشوار گذار راستہ اختیار کرنا پڑتا، جس میں خطرات بہت زیادہ تھے، اب عرب فوجیں راوڑ کے بالکل سامنے تھیں، یہ

وہ مقام تھا، جہاں داہر اپنے لشکر گراں، اور اہل وعیال سمیت مقیم تھا، مسلمان جس جگہ ٹھہرے ہوئے تھے اس کا نام جے پور تھا، فوجی اعتبار سے یہ مقام بڑی اہمیت کا حامل تھا، راور بالکل مد پر تھا، اور مسلمان یہاں سے بڑی پھرتی کے ساتھ داہر کی شاہ رگ پر حملہ کرسکتے تھے، داہر کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمان جے پور تک آگئے ہیں تو وہ بہت برہم ہوا، اور خوفزدہ بھی، اس نے اپنے بال بچوں کو قلعہ میں بھیج دیا۔ اور خود عرب فوج سے صرف ۳ میل کے فاصلے پر آکر خیمہ زن ہوگیا۔

دونوں کا فوجی تناسب

یکم رمضان ۹۳ھ کو، داہر کی فوجوں سے جنگ شروع ہوئی دس رمضان کو اس طرح ختم ہوئی کہ داہر ہلاک ہوگیا، اس کی فوج راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئی، بہت سے آدمی قتل ہوئے، بہت سے گرفتار

جانبین کی فوجی تعداد کا اگر اندازہ لگایا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی، داہر کی فوج ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھی، اور مسلمانوں کی فوج ساڑھے پندرہ ہزار آدمیوں کا مجموعہ تھی، داہر کے پاس ساز وسامانِ جنگ حد سے زیادہ تھا، عربوں کی فوج داہر کے مقابلہ میں اس اعتبار سے کافی فرومایہ تھی، لیکن ایک فرق تھا

داہر کے سپاہی زندگی کے ہر قیمت پر طالب تھے، اور عرب مجاہد زندگی کو ہیچ سمجھتے تھے، اُن کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہیں تھی کہ اپنے دین و مذہب پر گردن کٹا دیں، جان قربان کردیں۔

ہاتھیوں کی سرکوبی

داہر کی فوج میں ہاتھیوں کی بھی کثرت تھی، یہ سدھے ہوئے ہاتھی تھے، اور اس لئے میدانِ جنگ میں لائے گئے تھے کہ دشمن کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں، خود راجہ داہر بھی سفید رنگ کے ہاتھی پر، ایک زریں عماری میں بیٹھا تھا، آس پاس خوش جمال باندیوں کے پرے کھڑے تھے، یہ باندیاں شراب کے جام، اور پان کے بیڑے راجہ کی خدمت میں پیش کرتی جاتی تھیں۔

شروع شروع میں تو ہاتھیوں کا کوئی توڑ عربوں کی سمجھ میں نہیں آیا، لیکن محمد بن قاسم کی فراست نے یہ مشکل حل کردی، اس نے بارودی آتش بازیاں ہاتھیوں پر چھوڑنا شروع کیں ہاتھی اس حربہ

کی تاب نہ لاسکے، اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

داہر کا قتل داہر جس ہاتھی پر سوار تھا ایک آتشیں گولہ اس پر بھی پڑا، کھال جل گئی، سوزش سے گھبرا کر وہ اُلٹے پاؤں بھاگا، لاکھ لاکھ اُسے روکنے کی کوشش کی گئی مگر اُس نے میدانِ جنگ کا رُخ نہ کیا۔

داہر ذاتی طور پر بڑا بہادر آدمی تھا، وہ غصہ میں ہاتھی سے اُتر پڑا، اور پا پیادہ تلوار لے کر لڑنے لگا، اسے اس رنگ میں دیکھ کر اس کے سپاہی بھی جانبازی کے جوہر دکھانے لگے، لیکن عربوں کے آگے ایک نہ چلی، لڑتے لڑتے ایک عرب کے ہاتھ سے داہر قتل ہوا، راجہ کا قتل اتنا بڑا سانحہ تھا کہ فوج کے چھکے چھوٹ گئے، وہ بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔

داہر کی رانی داہر کی شکست کے بعد اس کا بیٹا جے سنگھ راور میں جنگی تیاریاں کرنے لگا، لیکن اس کے وزیر نے مشورہ دیا کہ بہترین تیاری برہمن آباد میں ہوسکتی ہے، وہاں کا خزانہ بھرپور ہے، رعایا مطیع ہے، اناج کی بھی کمی نہیں، اور یہاں سے فاصلہ پر بھی ہے۔

بات جے سنگھ کی سمجھ میں آگئی، وہ راور کا بہت سامان اسباب لے کر برہمن آباد چلا گیا، اپنے ساتھ راجہ کی رانی (یعنی اسکی اپنی بہن جس سے اُس نے زبردستی شادی کرلی تھی) کو بھی ساتھ لے جانا چاہا، لیکن وہ نہ گئی، اور راور میں رہ کر جنگی تیاریاں زور شور سے کرنے لگی، جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو رانی کی فوج نے محمد بن قاسم کے لشکر پر حملہ کردیا، یہاں سے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا، جب داہر کی فوج مقابلہ نہ کرسکی، تو اس سے کب ممکن تھا کہ مسلمانوں کو شکست دیتی۔

رانی ستی ہوگئی جب رانی نے دیکھا کہ اس کی تدبیریں اُلٹی پڑیں مسلمان غالب آرہے ہیں تو وہ مایوس ہوگئی، اس نے اپنی سکھیوں کو جمع کیا، اور کہا میں اپنے شوہر (بھائی) کے بعد اب زندہ رہنا نہیں چاہتی، ستی ہونا چاہتی ہوں، سکھیوں نے تائید کی اور خود بھی ستی ہوجانے کا ارادہ ظاہر کیا، چنانچہ چتا تیار کی گئی اور رانی اپنی سکھیوں سمیت چتا میں بیٹھ کر ستی ہوگئی۔

راور کی فتح

رانی کے ستی ہو جانے کے بعد، رعایا اور فوج میں بہت زیادہ بددلی پیدا ہو گئی، مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور آخری حملہ کر کے راور فتح کر لیا۔ اگرچہ جے سنگھ یہاں سے بہت کچھ لے گیا تھا، پھر بھی بہت کچھ باقی تھا، محمد بن قاسم نے یہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ راجہ داہر کا سر اور بہت سے تمغے حجاج کے پاس بھیج دیئے۔ حجاج نے یہ چیزیں خلیفہ ولید بن الملک کے پاس دمشق روانہ کر دیں،

فتوحات کا مقدمہ

اب محمد بن قاسم کی فوجیں برہمن آباد کی طرف تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

لیکن برہمن آباد اس وقت تک پہنچنا ناممکن تھا جب تک بہرور اور دہلیلہ کے قلعے نہ فتح کر لئے جاتے، یہ راستے میں پڑتے تھے، اور ان سے گذرے بغیر برہمن آباد پہنچنا ناممکن تھا۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ان دونوں قلعوں کو سر کر لیا جائے، ان قلعوں کے رہنے والوں نے بڑے مکمل طور پر جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں، محمد بن قاسم نے محاصرہ کر لیا، قلعہ والے محاصرہ سے عاجز ہو کر باہر نکل کر لڑے اور ہارے، ان قلعوں میں بہت سا مالِ غنیمت ملا جس کا پانچواں حصہ حسبِ معمول کوفہ اور وہاں سے دمشق بھیج دیا گیا۔

سی ساکر وزیر

سی ساکر بڑا دانش مند وزیر تھا!

جب تک داہر زندہ رہا سی ساکر اس کا معتمد رہا، داہر کے بعد اس کے بیٹے کو صلاح و مشورہ دیتا رہا، اب تک کی ساری لڑائیاں سی ساکر کے صلاح و مشورہ کا نتیجہ تھیں۔

لیکن اب سی ساکر بھی ہمت ہار گیا،

اس نے محمد بن قاسم سے امان طلب کی، محمد بن قاسم نے اُسے امان دے دی!

سی ساکر محمد بن قاسم کے حضور میں حاضر ہوا، یہاں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اعزاز و اکرام کا مظاہرہ کیا گیا، خاطر اور دلجوئی کی گئی! مسلمانوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ اس کی جنگ آزمائیوں کے واقعات جانتے ہیں، مسلمانوں کے اس برتاؤ سے سی ساکر بہت متاثر

ہوا، وہ حالات سے مجبور ہو کر مسلمانوں کا مطیع بنا تھا۔ لیکن مسلمانوں کا طرزِ عمل دیکھ کر دل سے ان کا درم ناخریدہ غلام بن گیا۔

ایک عجیب تحفہ محمد بن قاسم سے امان حاصل کرنے کے بعد سی ساکر نے ایک عجیب و غریب تحفہ اس کی خدمت میں پیش کیا۔

وہ عورتیں ——— جو لنکا سے چل کر دیبل پر گرفتار کر لی گئی تھیں!

یہ وہی عورتیں تھیں جن کے ناموس اور حرمت کی خاطر جنگ شروع ہوئی تھی!

محمد بن قاسم نے اس تحفہ کو بڑی مسرت اور شکر گزاری کے ساتھ قبول کیا، ان عورتوں کو ان کے وطن بھیج دیا، اور خود حسبِ معمول اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مصروف و منہمک ہو گیا!

سی ساکر ڈرتا ڈرتا مسلمانوں کے لشکر میں آیا تھا، لیکن یہاں اس کی توقع سے زیادہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور تالیفِ قلب کا برتاؤ کیا گیا، یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے اُسے اپنا مشیرِ خاص بنا لیا، بغیر اس کے مشورہ کے وہ کوئی قدم نہیں اُٹھاتا تھا، اور سی ساکر کا بھی یہ حال تھا کہ اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر کے وہ خلوصِ قلب، سچائی اور وفاداری کے ساتھ مسلمانوں کا ساتھ دے رہا تھا! وہ مسلمانوں کے انصاف، پاسِ عہد اور معدلت پروری سے بہت متاثر تھا!

یہاں کئی ماہ تک مسلمان لشکر سستایا، پھر اس نے برہمن آباد کا رُخ کیا!

برہمن آباد کی فتح

رواداری، عالی ظرفی، دینی اور سیاسی آزادی کے مظاہرے



دوسری جنگ عظیم میں ہم میں سے اکثر لوگوں نے اخبارات میں بار بار یہ خبریں پڑھی ہوں گی کہ جب اطالوی فوجوں اور برطانوی فوجوں سے مصر و افریقہ کے علاقہ میں مڈبھیڑ ہوئی، تو صورت حال یہ تھی کہ ادھر اطالویوں نے برطانوی سپاہیوں کا لشکر دیکھا، ادھر اطمینان سے ہتھیار ڈالے اور گرفتار ہو گئے، جنگ میں جرمنوں اور اتحادیوں میں تو بڑا زبردست معرکہ قدم قدم پر ہوا، لیکن اطالوی صرف ایک ہی جنگی تکنیک سے واقف تھے، اور وہ تھی

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است!

اس لئے کہ اطالوی سپاہیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اتحادی افواج قاہرہ سے سربر نہیں ہو سکتے، جب شکست یقینی ہے تو پھر گردن کٹانے سے حاصل!

نہ لڑنے کا فیصلہ تقریباً یہی منظر ہم سندھ میں دیکھتے ہیں، ———!

راجہ داہر اور دوسرے امراء و راجگان سندھ کی اپنی قوت و طاقت پر بڑا غرّہ تھا، وہ عربوں کی خاطر میں نہیں لاتے تھے، انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ عرب اپنا لشکر لے کر آ رہے ہیں تو اُن کی تعداد اور ساز و سامان جنگ سے کُلی معلومات حاصل کر کے انہوں نے خندۂ حقارت کے ساتھ، دل ہی دل میں، اور کبھی کبھی بزبان حال بھی، پورے تمرد کے ساتھ کہا۔

"آپ نے دو بار ـــــــ شاید ان کی موت انہیں کھینچ کر اس سرزمین میں لا رہی ہے!"

لیکن جب یہ کم تعداد، قلیل الاسلحہ اور بے سروسامان فوج، سندھ کی سرزمین پر وارد ہوئی اور اس نے پے بہ پے فتوحات حاصل کرنا شروع کئے، قلعے سر ہونے لگے، فصیلیں ٹوٹنے لگیں، فوجیں ہارنے لگیں، رعایا امان چاہنے لگی، ادھر جنگی سور ما بھاگنے لگے، تو ان لوگوں کی آنکھیں کھلیں، انہیں اپنے غلط اندازے کا احساس ہوا، اور آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے بھی وہی جنگی تکنیک اختیار کرنی شروع کی، جو ابھی ہم شیرازِ املایہ کے ذکر میں پڑھ آئے ہیں،

سپر اندازی کا فیصلہ

برہمن آباد کے لوگوں کا ولولہ ابھی تازہ تھا، جے سنگھ کے جانے کے بعد بھی اس ولولہ کی گرمی اور سرگرمی میں فرق نہیں آیا تھا، لیکن چند ہی روز میں اندازہ ہو گیا

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

انہوں نے بہت جلد یہ اندازہ کر لیا کہ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں جان و مال کے زیاں کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے، چنانچہ معززین شہر نے ایک مجلس مشاورت میں طے کیا کہ جنگ جاری رکھنے سے جان کا خطرہ ہے، لہٰذا عاقلانہ صورت یہ ہے کہ محمد بن قاسم سے معاہدہ کر لیا جائے، چنانچہ محمد بن قاسم کو پیام بھیجا گیا کہ ہم باہر بظاہر جنگ کے لئے نکلیں گے لیکن جلد پسپا ہو جائیں گے، پسپا ہوتے وقت قلعہ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیں گے، آپ شوق سے تشریف لے آئیے،

محمد بن قاسم تک جب یہ پیام پہنچا، اس نے موکاسے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا کہ شہر کے تمام غیر جنگجو افراد کو امان دی جاتی ہے، جو ہتھیار لے کر مقابلہ کو آئے گا، اسے ضرور قرار واقعی سزا دی جائے گی، برہمن آباد کے لوگ اپنی پیش کش پر قائم رہے، وہ جنگ کے لئے نکلے، اور بہت جلد پسپا ہو گئے، ان کی پسپائی کے بعد بھی قلعہ کا دروازہ کھلا رہ گیا، محمد بن قاسم کی فوج شہر میں داخل ہو گئی، اور نعرہ اللہ اکبر بلند کر کے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔

فوج کا شہر میں داخلہ

جب کوئی فوج فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتی ہے تو ممکن نہیں کہ وہ لوٹ مار نہ کرے، عورتوں کی بے حرمتی نہ کرے گھروں میں نہ گھسے، جنگجو اور غیر جنگجو سب کو بلا استثنا دہشت زدہ نہ کرے، شہری آزادی نہ سلب کرلے، ـــــ خواہ یہ داخلہ زور و قوت سے ہوا ہو، یا صلح اور معاہدہ سے، دوسری جنگِ عظیم میں پیرس اور ٹوکیو اور سنگاپور میں علی الترتیب جب جرمن، امریکی اور برطانوی فوجیں داخل ہوئیں، تو انہوں نے جو کچھ کیا وہ ایک عرصۂ دراز تک سرمۂ اہل نظر رہے گا؛

کیا محمد بن قاسم کی فوج نے بھی وہی کیا جس کا اس سے اندیشہ تھا؟

واقعات کا جواب نفی میں ہے　　جیسے ہی اسلامی فوجیں برہمن آباد میں پہنچیں، محمد بن قاسم نے فرمان نافذ کر دیا، مقابلہ صرف ان سے کیا جائے جو لڑنا چاہتے ہوں، جو نہ لڑنا چاہتے ہوں، ان سے ذرا بھی تعرض نہ کیا جائے۔ اس حکم کی بسر و چشم تعمیل ہوئی، پُر امن شہریوں کے جان و مال کو کسی نے نہیں چھیڑا، جن میں اب بھی لڑنے کا ولولہ تھا، انہیں تھوڑی سی کوشش کے بعد گرفتار کر لیا گیا، ان گرفتار شدگان میں بھی جنہوں نے اطاعت قبول کر لی، نہ صرف ان کی جان بخشی کی گئی، بلکہ ان کی دولت و اسباب اور املاک و جاگیر بھی واپس کر دی گئی۔

رانی لاڈی کا انجام

داہر کی رانی لاڈی، اب تک یہیں مقیم تھی، بلکہ برہمن آباد کی جنگ جاری ہی اسی کی وجہ سے تھی، اس نے بھاگے ہوئے سپاہیوں کو مجتمع کیا، اور لشکر تیار کر کے جنگ جاری رکھی، لیکن اب مسلمان برہمن آباد پر قابض تھے، رانی کے سپاہی ہمت ہار چکے تھے، چھ ہزار کے قریب سپاہی قتل ہو چکے تھے، باقی ماندہ گرفتار ہو گئے تھے، ان گرفتار ہونے والوں میں بہت سوں کو رہائی مل گئی، کیونکہ انہوں نے اطاعت قبول کر لی،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برہمن آباد کی فتح کے بعد رانی لاڈی کا کیا حشر ہوا؟ ـــــ

ـــــ اس سلسلہ میں جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں وہ یہ ہیں کہ رانی لاڈی گرفتار کر لی گئی،

اسے عزت و آبرو کے ساتھ محل میں رکھا گیا، پھر محمد بن قاسم نے اسے آزاد کیا، اور حجاج بن یوسف کی اجازت اور دربار خلافت سے استمزاج کے بعد اس سے شادی کرلی، اس کے بطن سے محمد بن قاسم کا ایک لڑکا بھی پیدا ہوا،

(۲) رانی لاڈی نے برہمن آباد کی فتح کے بعد چتا تیار کرائی، اور اپنی چند لونڈیوں اور زر و جواہر کے ساتھ چتا میں بیٹھ کر جل مری۔

پہلی روایت تمام تاریخوں میں موجود ہے، دوسری چچ نامہ کی ہے، مورخین کا ایک گروہ اس کی تائید میں ہے، دوسرا اس کی، اس لئے یہ مسئلہ گنجلک ہو کر رہ گیا ہے کہ آیا واقعی لاڈی چتا میں جل مری، یا اس کی شادی محمد بن قاسم سے ہوگئی؛ لیکن مورخین کی غالب اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس کی شادی محمد بن قاسم سے ہوگئی تھی!

نظم و اصلاح برہمن آباد پر قابض ہونے کے بعد محمد بن قاسم امور مالی و ملکی کے نظم و ضبط کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے وہی کیا، جو عام طور پر دریا دل اور وسیع القلب عرب فاتح کیا کرتے تھے، اس نے ان سندھیوں کو جو مسلمان ہو گئے تھے، وہی حقوق دیئے، جو عربوں کو حاصل تھے، ——— کامل مساوات!

جو لوگ اپنے دھرم پر قائم رہے، ان پر کوئی زیادتی نہیں کی گئی، نہ انہیں ترک مذہب پر مجبور کیا گیا، بلکہ انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی جملہ سہولتیں فراہم کی گئیں، البتہ ان پر جزیہ عائد کردیا، جزیہ کی شرح بہت معمولی تھی، اتنی معمولی کہ ایک فقیر پر بھی وہ گراں نہیں گزر سکتی تھی، مالداروں اور دولت مندوں سے فی کس ۴۸ درہم سالانہ وصول کئے جاتے تھے، اوسط درجہ کے لوگوں سے ۲۴ درہم سالانہ وصول کیا جاتا تھا، کم حیثیت کے لوگوں سے صرف تین درہم سالانہ، فقیروں اور غریبوں اور معذوروں سے جزیہ بالکل نہیں لیا جاتا تھا، اس جگہ پر یہ بات بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ایک درہم ہمارے سکہ کی ایک چونی سے کچھ کم ہی مالیت رکھتا ہے۔

رواداری احکام محمد بن قاسم نے شرافت اور وسعت قلب کا ریکارڈ قائم کردیا،

اس کے اس رویہ کو دیکھ کر بہت سے وہ لوگ جو اب تک اپنے دھرم پر قائم تھے خوشی سے بغیر کسی جبر اور دباؤ کے مسلمان ہو گئے، لیکن جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے، ان کے ساتھ بھی عالی ظرفی اور انسانیت کا سلوک کیا گیا،

محمد بن قاسم نے:

(۱) کسی غیر مسلم کی جائیداد پر جبراً قبضہ اور تسلط نہیں کیا۔

(۲) برہمنوں کو سابق حکومت میں جو حقوق و مراعات حاصل تھے، وہ بغیر کسی کمی کے علیٰ حالہ قائم رکھے گئے۔

(۳) علاوہ ازیں سرکاری خزانہ سے مزید ایک رقم خطیر، برہمنوں کو وظائف کی شکل میں جاری کی گئی۔

(۴) جن شہریوں کے مال واسباب کو دوران جنگ میں نقصان پہنچا تھا، انہیں تلافی اور تاوان کے طور پر ایک لاکھ بیس ہزار درہم عطا کئے گئے، تاکہ وہ اپنی حالت درست کر سکیں،

(۵) قلعہ کی حفاظت و نگہداشت کے لئے جو فوجی دستے مختلف دروازوں پر مقرر کئے گئے، ان کا افسر برہمنوں کو بنایا گیا، ان میں سے ہر برہمن کو ایک ایک گھوڑا ساز و براق سمیت عطا ہوا، نیز ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے پہنائے گئے، اور مزید عزت افزائی یوں کی گئی کہ ان میں سے ہر ایک کو دربار میں بیٹھنے کے لئے کرسی بھی دی گئی،

(۶) مال گزاری وصول کرنے کا کام بھی انہی برہمنوں کو سپرد کیا گیا،

(۷) مال گزاری وصول کرنے والے برہمنوں کو محمد بن قاسم نے ہدایت کی کہ خبردار رعایا کے کسی فرد پر ٹیکس اور محصول وصول کرنے کے سلسلہ میں ظلم و جور سے کام نہ لیا جائے اور نہ اتنا محصول عائد کیا جائے، جو قوت و طاقت سے زیادہ ہو،

(۸) جن برہمنوں کو سرکاری مناصب پر فائز کیا گیا، انہیں یہ خدمت شخصی طور پر نہیں بلکہ موروثی طور پر تفویض کی گئی تاکہ ان کے دل میں اپنے منصب کے بارے میں شبہ نہ پیدا ہو

کہ یہ عزت دشمنی اور عار دشمنی ہے ،

جوق در جوق

اس رواداری ، عادلانہ اور شریفانہ طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ برہمن جو سختی سے اپنے دھرم پر قائم تھے ، قریہ قریہ ، دیہات دیہات اور بستی بستی گھوم کر عوام کو تلقین کرنے لگے کہ وہ اس نئی مسلم حکومت کی اطاعت کریں ، اس کی وفاداری کا دم بھریں ، اس کے احکام تسلیم کریں ، اور اس کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہوں !

یہ برہمن اپنے ہم مذہبوں کا دورِ حکومت بھی دیکھ چکے تھے ، وہاں ظلم تعدی اور دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا ، جہاں لوگوں کے حقوق مارے جاتے تھے ، انہیں لوٹا جاتا تھا ، رشوت کی گرم بازاری تھی ، سفارش کا دور دورہ تھا ، اور اب مسلمانوں کا دورِ حکومت دیکھ رہے تھے ، یہ مسلمان اگرچہ ایک دوسرے مذہب کے حامل تھے ، لیکن یہ روادار تھے ، عادل تھے ، شریف اور پاک باز تھے ، کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے ، کسی مظلوم کی دستگیری میں تامل نہیں کرتے تھے ، ظالم کا سر کچلتے تھے ، مظلوم کی دادرسی کرتے تھے ، چاہے وہ ظالم کتنا ہی بڑا ہوتا ، اور وہ مظلوم کتنا ہی حقیر و کم مایہ ہو ! —— ایک نے زندگی کا رس چوس لیا تھا ، اگرچہ وہ ہم مذہب تھا ، دوسرے نے آبِ حیات عطا کر دیا تھا ، اگرچہ اس کا مذہب دوسرا تھا !

رعایا سے ذاتی رابطہ

محمد بن قاسم نے برہمنوں کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا تھا اس پر مطمئن نہیں ہوا ، اس نے غیر مسلم رعایا سے ذاتی ربط و تعلق بھی قائم کیا ، اس نے شہر اور دیہات کے باا ثر اور معزز افراد کو اپنے حضور میں طلب کیا ، ان سے حسنِ اخلاق اور متانت سے پیش آیا ، انہیں اطمینان دلایا کہ وہ حکومت کے باعزت شہری ہیں ، ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی ، ان کی فریاد سنی جائے گی ، ان کی شکایات کا ازالہ کیا جائے گا ، اور مملکت سے متعلق وہ جو مشورہ دیں گے اس پر بھی سنجیدگی اور ہمدردی سے غور کیا جائے گا ، اور اگر وہ قابلِ قبول ہوگا تو اس پر عمل بھی کیا جائے گا ۔

بت پرستی کی اجازت

برہمن آباد میں ایک بہت بڑا مندر تھا ، جو زیارت گاہ خاص و عام

تھا، شہر پر قبضہ ہونے کے بعد اس پر پہرہ لگ گیا وحشت کے باعث عوام نے آنا جانا بند کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچاری بھوکوں مرنے لگے، محمد بن قاسم کی رحمدلی اور رواداری کی بھنک ان کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، وہ ایک جمعیت بنا کر اس کے دروازے پر پہنچے، اور اپنا حالِ زار بیان کیا، بت پرستی کا معاملہ تھا اس لئے محمد بن قاسم نے خود کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا، حجاج کو خط لکھ کر استصواب کیا، حجاج نے فوراً جواب دیا کہ جب وہاں کے ہندو جزیہ قبول کر کے ہمارے حفظ و اماں میں آگئے، تو ہم ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے، وہ چاہے بت پرستی کریں یا مظاہر پرستی کریں، انہیں اس کام سے نہ روکو، مندر کے دروازے کھول دو اور صرف ان کی جان و مال کے تحفظ سے کام رکھو، اس کی پروا نہ کرو کہ وہ کسے پوجتے ہیں، اور کس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔

بودھ مت کے پیرو

سندھ میں ہندو بھی تھے، اور بودھ بھی، ہندوؤں کی تعداد نسبتہً کم تھی اور بودھوں کی زیادہ، لیکن اقتدار، اختیار اور دولت ہندوؤں ہی کے پاس تھی، بودھ ان چیزوں سے محروم تھے، وہ ہندوؤں کے محکوم تھے، اور ہندو جی بھر کے ان پر ظلم کرتے تھے،

جب محمد بن قاسم نے ہندوؤں کے ساتھ یہ روادارانہ اور فیاضانہ برتاؤ روا رکھا تو سندھ کے بودھوں میں بھی حرکت پیدا ہوئی، وہ بھی ایک وفد کی صورت میں محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوگئے، انہیں اپنے مذہبی معاملات کی بجا آوری کے سلسلہ میں تمام مراعات اور سہولتیں حاصل ہوگئیں، جو ہندوؤں کو تھیں!

سیاسی آزادی

محمد بن قاسم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ سندھ کے غیر مسلموں کو مذہبی آزادی عطا کی ہو، اس نے بڑی اولوالعزمی سے سیاسی آزادی بھی عطا کی، چنانچہ برہمن آباد میں اس نے جتنے عہدے دار مامور کئے تھے، ان سب کو الگ کر دیا، اور مقامی یا شہریوں یعنی غیر مسلموں کو نظم و انتظام کا سارا کام سونپ دیا

ان غیر مسلم افسروں کو اس نے رانا کا خطاب دیا ــــــــ تاکہ ان کے دل میں محکومیت اور مظلومیت ، احساس کمتری کا جذبہ نہ پیدا کر دے!

مسلمانوں کی اس رواداری کا اس ظلم اور بہیمیت سے اگر موازنہ کیا جائے، جو مسلمانوں پر غالب آنے والے غیر مسلموں نے روا رکھی تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن مسلمان کبھی اس جادۂ صواب سے منحرف نہیں ہوئے۔

شہر اروڑ پر مسلمانوں کا قبضہ

محمد بن قاسم کو نمایاں فتوحات حاصل ہو رہے تھے، وہ استحکام کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہا تھا، ایک مرتبہ بڑھنے کے بعد، پھر اسے پیچھے قدم ہٹانے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی،

اگرچہ محمد بن قاسم خود بھی بہت دانا و بینا، مدبر اور موقع شناس سپہ سالار تھا، لیکن تمام امور مہمہ میں وہ حجاج سے مشورہ اور ہدایت بھی طلب کیا کرتا تھا، اور حجاج اتنی دور بیٹھ کر اپنی صائب رائے سے اسے سرفراز کیا کرتا تھا:

حجاج کا خط برہمن آباد کا نظم ونسق درست کر کے محمد بن قاسم آگے بڑھا، ایک منزل آگے جا کر اطمینان سے خیمہ زن ہو گیا، یہاں جمعیت خاطر سے بیٹھ کر اس نے حجاج بن یوسف ثقفی کو ایک طویل خط لکھا، اور جملہ حالات سے اسے مطلع کر دیا، حجاج نے ڈاک کا انتظام بہت اچھا کر رکھا تھا، اتنا دور و دراز کا فاصلہ چند دنوں کے اندر طے ہو جاتا تھا، محمد کا خط پاتے ہی حجاج نے جواب لکھا، جواب بھی خاصا طویل تھا، خاص خاص باتیں یہ تھیں:

(۱) اروڑ اور ملتان کی طرف فوراً پیش قدمی شروع کر دو۔

(۲) نافرمانوں کو فوراً قتل کر دو۔

(۳) ضروری امور میں ہمیشہ مشورہ لیا کرو۔

(۴) رعایا (غیر مسلم) کے ساتھ ہمیشہ لطف وعنایت کا برتاؤ کرو،

(۵) دشمن بھی اگر سر اطاعت خم کر دے تو اس سے اچھا برتاؤ کرو،

احتیاطی پیش بندیاں چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد نے آگے روانہ ہونے سے پہلے تمام

انتظامات اور حالات کا جائزہ لیا، نظم و انتظام کا معائنہ کیا، دیوانی امور کے قضایا کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی، امن و امان قائم رکھنے کے لئے تجربہ کار اور معتمد سرداروں کو مامور کر دیا اس کا انتظام بھی کر دیا کہ آگے بڑھنے کے بعد ایسا نہ ہو کہ دشمن پس پشت سے آکر حملہ آور ہو، اور ساری کی کرائی محنت برباد ہو جائے نظم و انتظام کے معاملہ میں ہندوؤں اور بدھوں پر اتنا ہی اعتماد کیا گیا، جتنا مسلمانوں پر عام طور پر فاتحین تو مفتوحہ ممالک میں سخت گیری کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تاکہ ان پر رعب بیٹھے، اور وحشت قائم ہو، محمد نے ایک نیا تجربہ کیا، اس نے لطف و کرم کا برتاؤ کیا، تاکہ لوگ اس سے محبت کریں اور اس کی عظمت کے سامنے سر جھکائیں اور اس کا بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکے کہ وہ ناکام ہوا، واقعی غیر مسلم رعایا اس سے محبت کرنے لگی، اُن کے دلوں میں اس کی عظمت بیٹھ گئی، اور وہ حاضر و غائب اس کی پرستش کرنے لگی!

گوپی کی شرارت

اب محمد بن قاسم کی فوجیں شان و شوکت کے ساتھ ارور کی طرف بڑھ رہی تھیں، راستے میں جو دیہات یا بستیاں نظر آئیں، وہاں کے لوگ خواہ برہمن ہوں یا بودھ آتے تھے، عقیدت اور اطاعت کا وعدہ کرتے تھے، وہ بھی ان کی دل دہی کرتا تھا، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا تھا، انہیں ہر قسم کی آزادی دیتا تھا ان کے ملّی یا مذہبی کاموں میں نہ کسی قسم کی مداخلت کرتا تھا، نہ انہیں کسی جائز شکایت کا موقع رہنے دیتا تھا۔

سندھ کا اصل پایۂ تخت بھی شہر ارور تھا، یہ سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا، داہر ہلاک ہو چکا تھا لیکن اس کا تخت حکومت خالی نہیں تھا، اس وقت داہر کا لڑکا گوپی، تخت نشین حکومت تھا، اس نے ایک طرف تو شہر والوں کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے، ہلاک نہیں ہوا ہے تاکہ ان کی ہمت بندھی رہے اور وہ گھبرائیں نہیں، دوسری طرف اس نے تعدے سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

رانی لاڈی کے کلمات

محمد نے ارور کے پاس آکر قلعہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن قلعہ والے اس خیالِ خام میں مگن تھے کہ بس اب داہر فوج لے کر آتا ہی ہوگا، وہ فصیل پر آتے، اور اس قسم کی باتیں کر کے چلے جاتے، یہ اطلاع جب محمد کو ملی تو اس نے سوچا یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لڑائی شروع ہوئی تو مفت میں مارے جائیں گے، اس نے اپنی بیوی یعنی رانی لاڈی کو ایک مزینہ اونٹ پر سوار کر کے فصیل کے پاس بھیجا، یہ وہ وقت تھا کہ قلعہ کے کچھ سردار فصیل پر کھڑے ہوئے مسلمانوں کو دھمکیاں دے رہے تھے، انہوں نے ایک عورت کو اونٹ پر اپنی طرف آتے دیکھا تو خاموش ہو کر دیکھنے لگے کہ اب پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ؛ یہ کون عورت ہے ؛ رانی لاڈی نے قریب پہنچ کر اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا، اور کہا،

"مجھے پہچانتے ہو میں کون ہوں ؟"

کون تھا جو رانی لاڈی کو نہ پہچانتا ہوگا ؛ جواب میں سب نے خاموشی سے گردن جھکا لی رانی سامنے کھڑی تھی کون اس سے کہتا تو رانی نہیں ہے ؟ —— رانی نے کہا۔

"تم لوگ خام خیالی میں مبتلا ہو، میں راجہ داہر کی رانی ہوں، اور تمہیں خبر دیتی ہوں کہ راجہ ہلاک ہو چکا، اس کی گردن کاٹی جا چکی، اور وہ عراق بھی بھیج دی گئی، اللہ کی مرضی یہی تھی اور اس کی مرضی پوری ہو کر رہی، تم لوگ خواہ مخواہ قسمت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو، اور یہ اچھا نہیں کر رہے، اس کا انجام بڑا دردناک اور تکلیف دہ ہوگا لہٰذا خواہ مخواہ لڑنے اور بے گناہوں کا خون بہانے کی کوشش نہ کرو ——!"

یہ کہہ کر رانی چپ ہو گئی، اس تقریر سے امرائے داہر نے اندازہ لگایا کہ رانی مسلمان ہو چکی ہے، انہوں نے کہا،

"تو راجہ کو چھوڑ کر محمد بن قاسم سے آملی ہے، راجہ آتا ہی ہوگا وہ تیری خبر بھی لے گا۔"

محمد بن قاسم کو جب یہ اطلاع ملی کہ قلعہ والے رانی کے ساتھ ناشائستہ اور غیر مہذب برتاؤ کر رہے ہیں تو اس نے رانی کو واپس بلوا لیا، اور کہا،

"شاید خدا ہی نے ان بدقسمتوں کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے، پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

یہ کہہ کر جنگی تیاریاں زور شور کے ساتھ شروع کر دیں،

محاصرہ سخت ہو گیا

اب محمد بن قاسم کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ قلعہ کی قسمت جنگ کے حوالہ کر دے، چنانچہ محاصرہ میں اور زیادہ شدت اختیار کر لی گئی، محاصرہ کی اس شدت نے قلعہ والوں کے حواس پراگندہ کر دیئے، راجہ داہر کے انتظار سے بھی وہ مایوس ہو گئے تھے، اب ان کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا، جنگ ———— !

لیکن طویل اور سخت محاصرہ نے ان کی کمر توڑ دی تھی، ادھر گوپی بھی یہ رنگ دیکھ کر اپنے بال بچوں سمیت ایک روز رات کی تاریکی میں ایک دوسرے شہر چلا گیا، اس سے قلعہ والوں کی ہمت اور زیادہ پست ہو گئی، پھر ایک بات اور بھی تھی، آبادی کی اکثریت بودھ مت کی پیرو تھی اور حکومت برہمن طبقہ کے ہاتھ میں تھی، حکمران طبقہ کی اس بزدلی کو دیکھ کر آبادی میں اور زیادہ ہراس پیدا ہوا کہ ہم صرف آلۂ کار بنائے جاتے ہیں، ہماری حفاظت وصیانت کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔

اماں کی استدعا

یہ رنگ دیکھ کر قلعہ والوں نے محمد بن قاسم کی روائتی رواداری، اور فراخ حوصلگی سے کام لینا چاہا، انہوں نے ایک وفد مرتب کیا اور سپہ سالار عسکر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، اطاعت کا اقرار کیا، اور قلعہ حوالہ کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

محمد بن قاسم نے یہ استدعا قبول کر لی، اس نے حکم دیا، تم لوگ لڑائی سے باز آجاؤ، قلعہ

سے باہر نکل آؤ اور کنجیاں ہمارے حوالہ کر دو، قلعہ والوں میں مزاحمت کی تاب و طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی، انہوں نے بسر و چشم ان احکامات کی تعمیل کی۔

معابد کی تقدیس

بلاذری کے بیان کے مطابق ارور ایک بہت بڑا شہر تھا اور ایک پہاڑی پر آباد تھا، محاصرہ کی سختیوں کی تاب نہ لا کر جب اہلِ قلعہ نے امان طلب کی، تو حسبِ معمول محمد بن قاسم نے انہیں امان دے دی شرائط صلح حسب ذیل تھے:۔

۱۔ تمام شہریوں کو امان دی جاتی ہے، کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا،

۲۔ شہریوں کے بودھ (دہار۔ بودھ عبادت گاہیں) قائم رہیں گی!

شرائط صلح کو منظور کرتے ہوئے سپہ سالار لشکر اسلام نے، ارور کے بودھوں سے واضح اور صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"میں تمہارے دہار کو بھی ویسا ہی مقدس سمجھتا ہوں، جتنا عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں کے معبدوں کو۔"!

شہر میں داخلہ

شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد، محمد بن قاسم کی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں، عجیب منظر تھا، اہلِ شہر سہمے ہوئے تھے، دل ہی دل میں پناہ مانگ رہے تھے، نہ جانے اب کیا ہو؟ نہ جانے یہ فوجی کیا کریں؟ اور فوجیوں کا یہ حال تھا کہ تلواریں میانوں میں تھیں اور وہ شہر کی سڑکوں کو طے کر رہے تھے، کیا مجال ہے کسی کو لوٹا یا ستایا ہو، یا کسی مکان میں گھسے ہوں!

عفوِ عام کا اعلان

شہر میں داخل ہونے کے بعد رانی لاڈی کی ایما سے محمد بن قاسم نے عفوِ عام کا اعلان کر دیا، صرف وہ لوگ اس عفو سے مستثنیٰ رکھے جو برسرِ فساد یا آمادۂ جنگ ہوں، کچھ لوگ جو اس الزام میں ماخوذ ہوئے، وہ سپہ سالار کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے ان کے قتل کا حکم صادر کر دیا، ان

لوگوں میں سے جن کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا، ایک برہمن آگے بڑھا، اور کہا، میں سپہ سالار کے علم میں ایک خاص بات لانا چاہتا ہوں، اور وہ بات صرف اسی کے سامنے کہہ سکتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اور میرے متعلقین کو امان دی جائے، اس کی یہ بات مان لی گئی، اپنی شرط منوانے کے بعد اس نے کچھ عجیب حرکتیں کیں، پھر بے تحاشا ناچنے لگا، ناچتا جاتا تھا اور کہتا جاتا "آج تک کسی نے ایسا تماشا نہ دیکھا ہوگا"

پاسِ عہد کا نادر نمونہ

دربار والے اس کی یہ حرکت دیکھ کر بہت برہم ہوئے، انہوں نے کہا یہ مسخرا ہے، دھوکہ دے کر اپنی جان بچانا چاہتا ہے اسے فوراً قتل کر دینا چاہیئے، محمد بن قاسم نے کہا میں اسے امان دے چکا ہوں، لیکن اگر تم لوگ مجھ سے متفق نہیں ہو تو میں یہ ساری روداد حجاج کو لکھ بھیجتا ہوں، جو فیصلہ وہ کریں گے وہ بہرحال سب کے لئے قابل قبول ہوگا، اس اثنا میں یہ برہمن اپنے (بائیس ۲۲) متعلقین کے ساتھ نظر بند رہے گا۔ حجاج اور خلیفہ کو محمد بن قاسم نے سارا ماجرا لکھ بھیجا، حجاج نے اور خلیفہ نے اپنے اپنے دربار کے علماء سے فتویٰ لیا، تمام علما نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ وہ برہمن آزاد ہو چکا اب اس کی جان نہیں لی جا سکتی، کیونکہ پاسِ عہد ہر حالت میں واجب و لازم ہے، اس فیصلہ کی اطلاع محمد بن قاسم کو دی گئی، اس نے اسی وقت برہمن اور اس کے جملہ متعلقین کو پروانہ رہائی عطا کر دیا!

اس واقعہ نے محمد بن قاسم کی دھاک اور زیادہ بٹھا دی، لوگوں کو یقین ہو گیا، واقعی مسلمان بات کے دھنی، قول کے پورے، اور عہد کے پکے ہیں، وہ وقت اور مصلحت کے قائل نہیں جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں، اور سچائی کے ساتھ عمل کرتے ہیں،

گوپی کا حشر

گوپی ارور سے بھاگ کر اپنے ایک عزیز راجہ کے ہاں پہنچا، پہنچا تو اس نے خوب خاطر مدارات کی، پھر اپنی آوارہ مزاج بہن کی لگائی بجھائی میں آکر بیچارے کو قتل کر دینے کی ٹھان لی، لیکن کسی طرح گوپی کو بھی اس

واقعہ کا علم ہو گیا، اور وہ اپنی جان بچا کر بھاگا،

انتظامات معدلت

ارور کو فتح کرنے کے بعد، محمد بن قاسم نے یہاں کے انتظامات کی طرف توجہ کی، دیوانی کے معاملات کے لئے اس نے ایک مجلس مقرر کر دی، رعایا پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دی، رعایا کے افراد کو آزاد کیا، انہیں عہدے دیئے، عزت افزائی کی، جاگیریں عطا کیں، مندروں کے بارے میں حکم صادر کیا کہ وہ حسبِ معمول آباد رہ سکتے ہیں، وہاں عبادت کی جا سکتی ہے، ان کی بے حرمتی نہیں کی جا سکتی، تمام رعایا پر جزیہ لگا دیا گیا، لیکن اسی رعایت کے ساتھ جو مسلمانوں کی خاص رعایت تھی،

اروربہت بڑا شہر تھا، یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی، بعد میں عظیم دریائی یورشوں کی تاب نہ لاکر یہ شہر تقریباً ویران ہو گیا۔ اور اس کی جگہ سندھ کے موجودہ شہر روہڑی نے لے لی، ارور کی زیادہ تر آبادی یہیں منتقل ہو گئی، اور رفتہ رفتہ ارور ایک معمولی سا گاؤں رہ گیا۔

ارور کی فتح سے ایک بہت بڑا مرحلہ سر ہو گیا، یہ سندھ کا پایہ تخت تھا، اس کی فتح نے بہت سی مشکلات ختم کر دیں، لیکن ابھی کام ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک منزل طے ہوئی تھی دوسری ابھی باقی تھی ——— ملتان ——— حجاج کا حکم تھا ملتان بھی فتح کیا جائے اور اب محمد بن قاسم کا لشکر اسی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہا تھا

ملتان پر مسلمانوں کا قبضہ

محمد بن قاسم کا عسکر فتح و ظفر برابر آگے بڑھ رہا تھا، بہت کم مواقع آئے، جہاں کسی سخت و شدید مزاحمت سے مقابلہ پڑا ہو، زیادہ تر اطاعت و انقیاد کے مظاہرے ہوتے مزاحمت اور مقابلہ کے کچلنے میں اس نے کوئی تامل نہیں کیا، اور اطاعت و انقیاد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رواداری، وسیع القلبی، اور عالی ظرفی کا برتاؤ کیا، وہ امن پسندوں کا دوست تھا، اور فتنہ انگیزوں کا دشمن

محمد بن قاسم کی ایک خصوصیت عام طور پر دنیا میں ہمیشہ سے اب تک یہ ہوتا آرہا ہے کہ فتح و غلبہ کے بعد حکمراں طاقت، معززین کو ذلیل کر دیتی ہے، اور ذلیلوں کو ابھارتی ہے، جو سر بلند ہوتا ہے انہیں حقارت کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے، جو پست و زبوں ہوتے ہیں ان کے مدارج بلند کر دیئے جاتے ہیں جو کھاتے پیتے خوشحال اور دولت مند لوگ ہوتے ہیں انہیں فقر و فاقہ پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو ہیچ میرز، ناکارہ اور حقیر ہوتے ہیں، انہیں اوج ثریا پر پہنچا دیا جاتا ہے۔

لیکن محمد بن قاسم نے ایسا نہیں کیا!

اس نے کامیابی کے ہر مرحلہ پر، اس کا لحاظ رکھا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے کسی کو ذلیل نہ کیا جائے، جو انقلاب کی زد پر آئے، ایسا نہ ہو کہ وہ عافیت سے محروم ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ اس نے برہمنوں اور بدھوں کو اچھے اور اونچے مناصب پر فائز کیا، پنڈتوں اور پروہتوں کے اوقاف و عطایا قائم رکھے، مندروں اور وہاروں کے معاملات

میں مداخلت نہیں کی، غیر مسلموں کو "پرسنل لا" کے سلسلہ میں مکمل اختیارات دے دیئے، انہیں مشیر و وزیر بنایا اور زیادہ سے زیادہ ان کی دلجوئی، اور خاطر و مدارات کی،

مبارک مشیر" کا خطاب

اروڑ کی فتح کے بعد جب محمد بن قاسم کا لشکر آگے بڑھا تو وہ متعدد مقامات کو فتح کرتا، قلعوں کو سر کرتا، شہروں پر غلبہ حاصل کرتا، دریائے ستلج کے کنارے ایک قلعہ پر پہنچا جس کا نام بابیہ تھا۔ یہاں کا حکمران "کسکا" تھا، یہ شخص داہر کا چچا زاد بھائی تھا، اور پرانے شاہی خاندان کا ایک سربرآوردہ شخص تھا، داہر کے پہلو بہ پہلو محمد بن قاسم سے مقابلہ میں یہ شریک تھا، جب داہر کو شکست ہوئی، اور وہ قتل ہوا تو یہ بھاگ کر یہاں آیا، تخت حکومت حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی، حاکم مطلق بن بیٹھا۔

جب عربوں کا لشکر سر پر پہنچا تو گھبرایا، داہر کا انجام دیکھ چکا تھا، اپنے آپ کو اس انجام سے بچانے کے لئے ایک وفد اس نے بھیج کر مسلمانوں سے لطف و کرم کی التجا کی، دوران گفتگو میں محمد بن قاسم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ "کسکا" واقعی شاہی خاندان کا ایک فرد ہے، اس نے "کسکا" سے ملنے کی خواہش ظاہر کی "کسکا" ڈرا ہوا اور سہما ہوا، محمد بن قاسم کے حضور میں حاضر ہوا، یہاں اس کی توقع سے زیادہ عزت افزائی کی گئی، شاید تالیف قلب کے لئے محمد بن قاسم نے،

۱۔ "کسکا" کو دربار میں بیٹھنے کے لئے کرسی عطا کی۔

۲۔ اُسے وزارت مال کا منصب سونپا،

۳۔ اور "مبارک مشیر" کا خطاب دیا،

۴۔ کسکا صاحب علم و دانش آدمی تھا، جلد ہی محمد بن قاسم کی نظر پر چڑھ گیا، ہر معاملہ میں اس سے صلاح و مشورہ کیا جانے لگا، بابیہ کا انتظام تمام تر اسے سونپ دیا گیا، اور دوسرے تمام مقامی افسروں اور حاکموں پر اسے ترجیح دی گئی،

کسکا کی وفاداری

محمد بن قاسم کے لطف و مدارا کا اثر یہ ہوا کہ "کسکا" دل وجان سے مسلمانوں کا مطیع و منقاد بن گیا، چنانچہ جب مسلمان فوجیں بابیہ سے آگے اسکلندہ کی طرف بڑھیں تو اسلامی لشکر کی سربراہی دو آدمیوں کے سپرد ہوئی، ایک مسلمان تھا اور دوسرا یہی غیر مسلم کسکا، ——— اور کسکا کے جوش و وفاداری کا یہ عالم تھا کہ جب اسکلندہ والوں نے جنگ و پیکار پر آمادگی ظاہر کی تو کسکا اتنا انتظار بھی نہ کرسکا۔ کہ رسمی اور اصولی طور پر محمد بن قاسم سے اجازت لے لیتا، فوراً فوجیں آگے بڑھادیں، اور لڑنے لگا،

یہاں بڑی خونریز لڑائی ہوئی، دونوں تدمقابل فوجیں بڑے زور شور اور جوش وخروش کے ساتھ لڑیں، دونوں نے تہوّر اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

ایک اور فتح

لیکن جب غنیم نے دیکھا کہ مسلمانوں سے سر برہونا مشکل ہے تو وہ قلعہ بند ہو گئے، مسلمانوں نے بھی محاصرہ کرلیا، اور ایسی ناکہ بندی کی کہ کسی چیز کا اندر سے باہر آنا یا باہر سے اندر جانا بالکل مسدود ہو گیا، دشمن نے قلعہ کے پھاٹک بند کرلئے تھے، اور فصیل پر سے مسلمان لشکر پر برابر منجنیق کے ذریعہ پتھروں کی بارش کر رہا تھا، مسلمان بھی مقابلہ میں ڈٹے رہے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے مقابلہ میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی بلکہ سات روز تک، مختلف مواقع اور دشواریوں کا ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے۔

کوئی شبہ نہیں، اسکلندہ کے فرماں روا نے بڑی بہادری اور استقلال سے مقابلہ کیا، سندھ میں ایسی پرخروش جنگ اب تک کوئی نہیں ہوئی تھی، لیکن مسلمانوں نے بھی دشمن پر یہ بات واضح کردی کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، انہوں نے دشمن پر ثابت کردیا کہ سپہ گری۔ ہمت دلاوری اور بہادری میں وہ دشمن سے بدرجہا فائق ہیں۔ آخر سات روز کی خونریز جنگ کے بعد جب سنگھ راتے، حاکم اسکلندہ بالکل مایوس ہو گیا تو بال بچوں سمیت ایک رات کو روبہ فرار لایا، اب شہر والوں کے چھکے چھوٹ گئے، فوج بے سردار بھلا ایک باقاعدہ اور منظم فوج کے

مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتی ہے، چنانچہ اُنہوں نے اطاعت پر آمادگی ظاہر کی مسلمانوں نے عام شہریوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا، قلعہ کے فوجی، جو اس جنگ میں ہلاک ہوئے، ان کی تعداد تقریباً یہاں ہزاروں مؤرخوں نے تسلیم کی ہے، یہ کافی بڑی تعداد ہے، اور اس سے جنگ کی شدت اور سختی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے،

سکہ کی فتح پر بحث

اسلامی لشکر، پھر آگے بڑھا! سامنے سکہ کا قلعہ تھا، ——— اس جنگ پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں گے

اب تک ہم محمد بن قاسم کے محامد و محاسن کا تذکرہ کرتے آئے اب تھوڑی سی نکتہ چینی بھی کریں گے سچ اشخاص و افراد کو نہیں دیکھتا، واقعات و حقائق کو دیکھتا ہے، اور مؤرخ صرف واقعات و حقائق سے بحث کرتا ہے، وہ نہ کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن، واقعات و حقائق جس کے موافق آجائیں وہ اس کا دوست ہے، اور جس کے مخالف پڑیں، اس کے بارے میں اسے اس کا مخالف تصور کر لیا جاتا ہے۔

سکہ کا راجہ بڑا دبنگ اور دلاور تھا، اس کے کانوں میں اگرچہ مسلمانوں کے فتوحات کی خبریں پڑ چکی تھیں، لیکن اسے اپنی ہمت، قوت اور طاقت پر ناز تھا، وہ مقابلہ میں ڈٹ گیا، اور مسلمانوں نے اس کے شوق پیکار کو دیکھ کر فیصلہ کن لڑائی لڑنے کا مصمم اور ناقابل فتح ارادہ کر لیا،

جنگ شروع ہوئی، اور کامل ۱۷ دن تک جاری رہی، اس مدت کا ہر ہر لمحہ طرفین نے پوری قوت کے ساتھ اس کام میں صرف کیا ——— اور اس مدت میں کسی نے کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔

مسلمان بہرحال اس دیس میں اجنبی تھے، اُنہیں ہر قسم کی دشواریاں لاحق تھیں، سپاہ وہی تھی جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے، اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا، سامان جنگ جو کچھ

بھی تھا، وہ بھی وہی تھا، جو ان کے ساتھ آیا تھا، یہاں کسی دوکان سے اسے خریدا نہیں جا سکتا، وسائل و ذرائع جتنے بھی تھے، ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے، جو یہاں کے اصلی باشندے تھے پشت ہا پشت سے یہاں رہتے چلے آئے تھے، یہاں کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے واقف تھے پھر یہ لوگ اس شق؛ یا اس فوج کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، جس کا مقصد انہیں محکوم بنانا ہو لہٰذا ان کی کوشش یہی تھی کہ جس طرح بنے دشمن فوج کو مغلوب کر لیں، پھر ان کے اور مسلمانوں کے اقدار میں بھی اختلاف تھا، یہ جنگ میں سب کچھ جائز سمجھتے تھے اور جنگ کی شدت میں بھی وہ اپنے مخصوص و معلوم اصولوں سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

سکہ کی جنگ میں، شروع میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، جو عام اصول انسانی کے منافی ہوتی، لیکن جیسے جیسے جنگ بڑھتی گئی، مدت طویل ہوتی گئی، مزاحمت زور پکڑتی گئی، مسلمان استقلال دکھاتے گئے، ویسے ویسے دشمن کے مزاج میں بے رحمی آتی گئی، مسلمانوں کو بہر حال جنگ لڑنی تھی، جنگ فتح کرنی تھی، یا خود اپنی جان قربان کر دینی تھی، وہ ہر بات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے، چنانچہ اس جنگ میں ۲۵ بڑے بڑے مسلمان سرداروں نے جام شہادت نوش کیا، اور دو سو پندرہ مسلمان سپاہی نعمت شہادت سے فیضیاب ہوئے، یہ تعداد بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں نے اسلامی حروب کی تاریخ پڑھی ہے، وہ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ مسلمان ہمیشہ کم سے کم نقصان اٹھا کر جیتے، اور دشمن ہمیشہ زیادہ سے زیادہ نقصان اٹھا کر ہارا، یہ تاریخ یہاں بھی دہرائی گئی دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے بہت کم آدمی کام آئے دشمن کے ہزارہا آدمی مارے گئے، مسلمان صرف چند سو، پھر بھی یہ تناسب گزشتہ جنگوں کے مقابلہ میں زیادہ تھا، اور مسلمانوں کو اس کا صدمہ تھا، ان کا قلب اس صدمہ سے مجروح تھا

سکہ کی بربادی

بہر حال ۱۷ روز تک جنگ اپنی خوں فشانی اور ہلاکت خیزی کے ساتھ جاری رہی، لیکن مسلمانوں کے استقلال و عزیمت نے سنگھ رائے کی ہمت پسپا کر دی، اسے یقین ہو گیا کہ وہ جیت نہیں سکتا، شکست و ہزیمت اس کے حصہ میں ہی

آنے لگی۔ یہ دیکھ کر اس نے بھی وہی کیا، جو اس سے پہلے ہندو راجہ عالم یاس میں کرتے آئے تھے، یعنی، ایک رات موقع دیکھ کر، وہ اپنے بال بچوں اور متعلقین سمیت بھاگ کھڑا ہوا، اور سکّہ کے باشندوں کو محمد بن قاسم کے رحم و کرم پر چھوڑتا گیا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

اسلامی لشکر نے بڑی قربانی کے بعد سکّہ کو فتح کیا تھا،

اب سکّہ ان کے قبضہ میں تھا، سکّہ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، اپنی گذشتہ غلطیوں پر نادم تھا اور عفوِ تقصیر کا خواہاں،

محمد بن قاسم نے پُرامن اہالیانِ شہر کو تو کچھ نہیں کہا، ان کی جان بھی محفوظ رہی، اور مال کو بھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا، لیکن فوجی لوگ نہ بچ سکے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے، بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ مسلمانوں کو قتل کیا تھا، اب بھی یہ ہتھیار بند تھے، یہ کسی رحم و رعایت کے مستحق نہ تھے، ان کے ساتھ رعایت کرتے، اور رحم کے برتاؤ کرنے کے ... یہ سمجھتے کہ مسلمان کمزور سمجھ لئے جاتے!

یہاں تک تو ٹھیک ہے، لیکن مسلمان فوجی اتنے برہم اور از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ انہوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ملکیت بچ گئے، لیکن مکان نہ بچ سکا، بلاذری نے اس شہر کے کھنڈر دیکھے ہیں اور ان کا تذکرہ کیا ہے۔

ایک دلچسپ موازنہ

دُنیا کے عام ملوک و سلاطین کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے، تو محمد بن قاسم نے اس موقع پر نہ صرف یہ کہ کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ رحم و مروت سے کام لیا، اسے چاہیئے تھا کہ تمام باشندگان شہر کو بلا استثنا موت کے گھاٹ اُتار دیتا، اسے چاہیئے تھا کہ شہر کے دولت مندوں، اور اوسط درجہ کے لوگوں کا تمام مال و اسباب چھین لیتا، اور انہیں بیک بینی و دوگوش ان کے گھروں سے نکال دیتا، اسے چاہیئے تھا کہ وہ بوڑھوں، بیماروں اور معذوروں پر بھی کوئی رحم نہ کرتا ان کی گردن مارتا اور گردن

مارنے کے بعد ان کی کھال کھنچوا لینا ——— یہ سب باتیں ہر ممالکت ملوکیت کی رو سے جائز تھیں، اور ایسا کرنے کا اُسے پورا پورا حق تھا، اس معیار سے اگر ہم محمد بن قاسم کے اقدام کو دیکھیں تو ماننا پڑے گا کہ اس نے مفتوحین کے ساتھ بہت زیادہ نرمی اور ملاطفت کا اظہار کیا، لیکن نہیں ہم اس معیار سے نہیں پرکھ سکتے، ہمارا معیار دوسرا ہے، وہ ہے اسلامی معیار، اور اس معیار سے اگر حالات کا جائزہ لیں تو یہ کہنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں کہ سکّہ کی بربادی کسی طرح بھی جائز اور مستحسن نہ تھی اسے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا، اسے اپنی فوج کو ہر قیمت پر اس اقدام سے روکنا چاہیئے تھا۔

بہرحال سندھ کے سارے دورِ حکومت میں اگر محمد بن قاسم کے کسی واقعہ پر انگلی رکھی جا سکتی ہے، تو وہ صرف یہی ایک واقعہ ہے، ورنہ جس نے اپنے دورِ حکومت میں، یہاں کے غیر مسلموں اور مفتوحوں کے ساتھ برتاؤ روا رکھا، اس نے یہاں کے بُت پرستوں کو مجبور کر دیا کہ اس کا بُت بنائیں اور اس کی پرستش شروع کر دیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک اس رحم و کرم اور ایسی رواداری کا مظاہرہ ایک انسان کر ہی نہیں سکتا تھا، یہ حرکتیں صرف کسی مافوق الانسان ہی سے سرزد ہو سکتی تھیں، اور وہ سوا دیوتا کے اور کون ہو سکتا ہے؟

انتظاماتِ مملکت

فتح کے بعد ایک بہت اہم مسئلہ فاتح کے لئے یہ ہوتا ہے کہ نیا انتظام دا آئین رو بہ کار لائے، محمد بن قاسم اور دوسرے فاتحوں میں فرق تھا، وہ جو چاہتے تھے، کر سکتے تھے اور کرتے بھی تھے، لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، کچھ اپنی طبیعت کے اعتبار سے، کچھ مسلمان ہونے کی حیثیت سے، لہٰذا یہ کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا تھا، جو اسلام کے وقار اور روایات کے منافی ہو۔

چنانچہ اس نے یہاں بھی ویسے ہی عادلانہ اور روادارانہ انتظامات کئے، جیسے وہ دوسرے مقامات پر کرتا آ رہا تھا، یعنی غیر مسلموں کو مکمل مذہبی اور سماجی آزادی عطا کی، ان پر جو ٹیکس لگایا اس میں یہ رعایت ملحوظ خاطر رکھی کہ ان کی حیثیت اور استطاعت سے زیادہ نہ ہو، اتنا ہو کہ

وہ آسانی کے ساتھ اسے ادا کر سکیں عاملوں کو تاکید کر دی کہ جزیہ اور ٹیکس کی وصولی میں کسی قسم کی زیادتی، اور سفاکی سے کام نہ لیں، ورنہ موجب عتاب ہوں گے۔

ملتان کی طرف میدان کے بندوبست سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے دریائے چناب پار کیا، جو سکہ اور ملتان کے درمیان سرگرم خرام تھا، جیسے ہی مسلمان فوج، گھاٹ پر اتری، سپہ سالار عسکر نے اسلحہ بندی کا، اور مقابلہ کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دیا، فوج ابھی تیار ہی ہو رہی تھی کہ سکہ کا معزول حاکم، ملتانیوں کی ایک فوج گراں لے کر مقابلہ کے لئے نمودار ہوا، سکہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسے جو روز بد دیکھنا پڑا تھا وہ اسے یاد تھا، اس تلخ یاد نے اس کے سمند غیرت پر تازیانہ کا کام کیا، وہ بڑے جوش و خروش سے لڑا، اس کا جوش و خروش، سرفروشی اور فدائیت کا جذبہ دیکھ کر ملتانی بھی خون کا آخری قطرہ نثار کرنے پر تیار ہو گئے، پہلا حملہ دشمن نے اس تیور کے ساتھ، اور ایسے بھرپور طریقہ سے کیا کہ اندیشہ ہونے لگا، کہیں مسلمانوں کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں اور وہ راہ فرار لانے پر مجبور نہ ہو جائیں، لیکن وہ اس زبردست حملہ کو استقلال اور عزیمت کے ساتھ سہ لے گئے، سارا دن گزر گیا۔ مگر یہ خون ریز جنگ ختم نہیں ہوئی، ہر مرحلہ پر اس کی شدت پہلے کے مقابلہ میں کچھ اور بڑھ جاتی تھی، اس جنگ میں بھی مسلمانوں کے کئی مشہور اور نمایاں سردار شہید ہوئے، لیکن اس سانحہ سے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوتے، اور زیادہ جوش اور صبر کے ساتھ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے، انہوں نے ایسا دو ٹوک اور زبردست حملہ کیا کہ دشمن اس کی تاب نہ لا سکا، بھاگ کھڑا ہوا، بھاگتے بھاگتے اس نے اسی قدیم جنگی تکنیک پر عمل کیا، یعنی سامنے سے بھاگا، اور قلعہ میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا، دوسرے روز پھر الماہی رن پڑا، پھر ہندو فوجیں قلعہ سے باہر نکلیں، اور پٹ کر قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئیں، لیکن جب تیسری صبح جب سورج چمکا، تو سامنے نہ آئیں ان کا میدان میں مقابلہ کرنے کا ولولہ سرد ہو چکا تھا۔

قلعہ کا محاصرہ غنیم فوج کو قلعہ میں پناہ گزیں اور میدان میں آ کر لڑنے کی ہمت کھوتا ہوا دیکھ کر مسلمان ایک قدم آگے بڑھے، انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، محاصرہ بڑا شدید تھا، اور تقریباً پون مہینہ تک پوری شدت اور سختی کے ساتھ جاری رہا،

اس محاصرہ نے حسب طول کھینچا، اور غنیم کی فوج قلعہ سے باہر نکل کر صف آرا ہونے اور مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، تو مسلمان فوج میں اضطراب کی ایک لہر پیدا ہو گئی، کیونکہ یہ فوج اپنے مرکز سے اس قدر دور ہٹ آئی تھی کہ نہ رسد پابندی کے ساتھ پل سکتی تھی، نہ عقب پورے طور پر محفوظ تھا، رسد کے نہ مل سکنے کا انجام یہ ہوا کہ فوج میں قحط کی سی کیفیت پیدا ہوئی، ضروریات زندگی کی ہر چیز زیادہ سے زیادہ گراں اور نایاب ہو گئی، اس قحط کی سنگینی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گدھے گھوڑوں سے زیادہ قیمتی ہو گئے اور جب کچھ کھانے کو نہ ملا تو یہی گدھے ذبح کر کر کھائے جانے لگے۔

جوابی کارروائی ہر روز جو طلوع ہوتا تھا مسلمانوں کے لئے ابتلا و مصیبت کا پیام بن کر طلوع ہوتا تھا، وہ بہادر تھے، لڑنے کے لئے تیار تھے، ان میں بڑے سے بڑے اور طاقت ور سے طاقت ور دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت تھی،

لیکن دشمن ناپید تھا،

وہ سامنے نہیں آتا تھا، اطمینان سے قلعہ میں پناہ گزیں تھا،

اسے زندگی کی ہر سہولت حاصل تھی، وہ تلے تلکے سے کھاتا تھا، کھلاتا تھا، رنگ رلیوں اور خرمستیوں میں مصروف تھا، اسے یقین ہو چلا تھا کہ مسلمان اس تحفظ کی تاب نہ لا سکیں گے، اور مجبور ہو کر واپس چلے جائیں گے، اور بظاہر حالات ایسے تھے کہ اس کا یہ خیال بعید از امکان بھی نہ تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ ملتان کے لوگ، جو پانی پیتے تھے، اس کا سرچشمہ ایک نالہ تھا، نالہ سے نکل کر یہ پانی ایک جھیل میں جمع ہوتا تھا، اور یہی ہر خاص و عام کی تشنہ کامی

قید کرنا تھا ،

مسلمان جب اس کے راز سے واقف ہوئے تو انہوں نے پانی کے رُخ میں تبدیلی کر دی ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جھیل خشک ہوگئی ، اس میں خاک اُڑنے لگی ، اب تک مسلمان بھوک کے مر رہے تھے ، اب اہل قلعہ پیاسے مرنے لگے ، بھوک کا بہرحال کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے ، لیکن پیاس تھوڑے ہی وقفہ میں بیدم کر کے تاب و طاقت چھین لیتی ہے ، قلعہ میں پانی کا جو قحط پڑا تو شور ، فریاد و الغیاث کی آوازیں باہر تک آنے لگیں —— اب غنیم کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ قلعہ کی عافیت گاہ سے باہر نکلے ، اور کھلے میدان میں مقابلہ کر کے نتیجہ قسمت کے حوالے کر دے ، آخر مجبور ہو کر اسے یہی کرنا پڑا ،

کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ غنیم کی فوج قلعہ سے باہر نکل کر آتی ، مقابلہ کرتی اور نقصان اٹھا کر واپس چلی جاتی ، ایک روز مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ آج قلعہ میں داخل ہو کر رہیں گے ، ایک گھر کے بھیدی کی مدد سے فصیل کے کمزور ترین حصہ پر مسلسل حملہ کیا گیا ، ایک جگہ سے رخنہ پیدا ہوا ، مسلمان بے جگری کے ساتھ بڑھے ، یہ دیکھ کر دشمن کی فوج بھی بپھری ہوئی قلعہ سے نکلی ، اور خوں ریز جنگ کا آغاز ہو گیا غنیم کی فوج یہ جان رہی تھی کہ اب روز کی طرح قلعہ میں سلامتی کے ساتھ جانا ناممکن ہے ، کیونکہ فصیل میں رخنہ پیدا ہو چکا ہے ، اگر ہم واپس گئے تو مسلمان ضرور اس راستہ سے قلعہ میں داخل ہو جائیں گے اور سرافگندگی کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ ہوگا ، لہٰذا وہ خوب جی توڑ کے لڑے ، لیکن قسمت اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ قلعہ کا فرماں روا ، جو داہر کا بھتیجا تھا ، کمک کی امید میں کشمیر بھاگ گیا ، فوج جس نے مقابلہ کیا تھا ، بُری طرح ہاری ، اس جنگ میں تقریباً چھ ہزار دشمن کے سپاہی ہلاک ہوئے ، اب مسلمان فوج قلعہ میں تھی ، اور یہاں بھی اس بات کا التزام رہا کہ کسی امن پسند شہری کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچنے پائے ، نہ اس کی جان کو ، نہ مال کو ،

مالِ غنیمت

اس جنگ میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی کافی ملا، اور تمام مال، سواروں اور پیادوں میں حسبِ مراتب تقسیم کر دیا گیا۔

لیکن اس مالِ غنیمت کے سوا، ایک اور ذریعہ سے بھی مسلمانوں کو بہت بڑی رقم ملی، یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس نے مع نفع کے تمام مصارفِ جنگ جو اب تک ہوئے تھے، بیت المال کو ادا کر دیئے۔

ہوا یہ کہ فتح کے بعد ایک برہمن کی نشان دہی سے اتنے بڑے دفینہ کا ایک مندر میں سراغ ملا جس کی کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی تھی، یہ برہمن اب اپنی قوم کے روشن مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا، اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ حکمران قوم کی وفاداری اور اطاعت کا ایسا ثبوت دے کہ اس کی عزت وحرمت کو نہ صرف کوئی نقصان نہ پہنچے، بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو جائے، اس کی نشان دہی پر محمد بن قاسم خود تن تنہا برہمن کے ساتھ گیا، یہ ایک قدیم خزانہ تھا۔ یہاں سے دوسو تیس من خالص سونا برآمد ہوا اور تیرہ ہزار دوسو من خاک زر، تانبے کے مٹکوں میں بھری ہوئی ملی۔ اس کے علاوہ ایک سونے کا بت بھی تھا، جو سرتاسر سونے کا بنا ہوا تھا، محمد بن قاسم نے یہ ساری رقم اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ، فوراً دیبل کے راستہ عراق حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس بھیج دیا، محمد بن قاسم کو مصارفِ جنگ کے سلسلہ میں چھ کروڑ درہم دیئے گئے تھے، اس نے بارہ کروڑ درہم خزانۂ خلافت میں داخل کرائے اور ان سب پر مستزاد، راجہ داہر کا سر،

حجاج کی مسرت

محمد بن قاسم کے اس کارنامہ سے حجاج بن یوسف بہت متاثر اور مسرور ہوا، وہ خلیفہ سے یہ وعدہ کر چکا تھا کہ سندھ کی مہم میں جو رقم خرچ ہو گی، وہ فتح سندھ کے بعد خزانۂ عامرہ میں داخل کر دی جائے گی، لیکن محمد بن قاسم نے محکوموں کے ساتھ رعایت، مروت، حسنِ سلوک اور عدل ورواداری کا ایسا حالیہ بنا لیا تھا کہ اب تک غنیمت کے سلسلہ میں وہ کوئی بڑی رقم نہیں دے سکا تھا، حجاج، محمد بن قاسم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ

غیر مسلموں پر ظلم کر کے ان سے ادھا دھند روپیہ وصول کرے اور اُسے بھیجے، اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ خلیفہ سے جو وعدہ کر چکا تھا اُسے پورا نہ کرے، درحقیقت وہ عجیب ذہنی کشمکش اور خلجان میں مبتلا تھا، اور اس دشواری کے حل کی کوئی صورت سے نظر نہیں آرہی تھی، مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، اور مایوسی کے ساتھ پریشانی اور اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا،

لیکن بالکل اتفاقی طور پر محمد بن قاسم کو جو خزانہ زر ملا، اُس نے حجاج کی ساری کلفت دُور کر دی، اُس نے داد و تحسین کا ایک لمبا چوڑا خط، محمد بن قاسم کو لکھا، اور خلیفہ کے حضور میں سرخ رو ہوا۔

درحقیقت یہ رقم غیر معمولی بہت اہم کہ [illegible] کا چکر تھی۔

حُسن نیت کا پھل

جب وہ سندھ کی طرف اپنی فوج لے کر بڑھا ہے، اس وقت اسے معلوم ہو چکا تھا کہ حجاج خلیفہ سے کیا وعدہ کر چکا ہے، وہ یہ بھی جانتا تھا اگر حجاج نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو پھر اس کی خیر نہیں، اس کا سارا جلال و جبروت خاک میں ملجائے گا، خلیفہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا، اور وہ حقیر و ذلیل ہو گا، حجاج جیسے شخص کے حقیر و ذلیل ہونے کے بعد خود محمد بن قاسم کے لئے بھی اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ اپنے منصب بلند پر فائز رہ سکے گا، جو چچا کا حشر ہوتا وہی خود اس کا بھی ہوتا،

لیکن یہ جاننے کے باوجود اور تقریباً سارا سندھ فتح کر لینے کے بعد بھی اُس نے یہ گوارا نہ کیا کہ غیر مسلموں پر ظلم و تعدی کرے، ان کا مال و اسباب لے لے، ان کی دولت و ثروت پر ڈاکہ ڈالے، انہیں کنگال کر دے، اور خلافت کا خزانہ بھر دے —— یہ بات صریحی طور پر اسلامی تعلیم کے خلاف تھی، اور وہ کسی حیثیت پر اس کے لئے تیار نہیں تھا، کہ اپنے لئے یا اپنے چچا کے لئے اسلام کے ایک مستحکم اور قابل اصول کو پامال کرے، اس نے اپنی اور اپنے چچا کی ضرورت کے لئے ہر خطرہ قبول کر لیا، لیکن اپنے آپ کو اور اپنے چچا کو سُرخ رو کرنے کے لئے یہ گوارا نہ کیا کہ اسلام نے غیر مسلموں پر جو ٹیکس (جزیہ) عائد کر دیا ہے

اس سے زیادہ کچھ وصول کرے، اس کے اس حسن نیت کا پھل، اتنے بڑے دفینہ کی صورت میں مل گیا

فتح ملتان کے بعد محمد بن قاسم نے حسب معمول پہلا کام یہ کیا کہ جزیہ کی تشخیص کے بعد لوگوں کے دل میں ہراس پیدا ہو گیا، اسے اپنے حسن اخلاق، اور حسن سلوک سے دور کیا، انہیں یاد کرادیا کہ مسلمان جس دیس پر قبضہ کرتے ہیں، وہاں وہ شیروں اور بھیڑیوں کی طرح نہیں رہتے ہیں، دوستوں اور بھائیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ کبھی پر ظلم نہیں کرتے سب کے ساتھ مساوات روا رکھتے ہیں، اور عالی ظرفی کا برتاؤ کرتے ہیں، پھر مقامی لوگوں کی تالیف قلب کے بعد اس نے دوسرا کام یہ کیا، کہ آس پاس کے قلعوں پر قبضہ کر لیا

یہ قلعدار ملتان، سکہ اور دوسرے مقامات کی مزاحمت اور مقاومت کا حشر دیکھ چکے تھے، یہ رائے قائم کرنے میں انہیں دیر نہ لگی کہ مسلمانوں سے دوستی کر لینا زندگی اور عزت کی ضمانت ہے، اور ان سے خواہ مخواہ کی دشمنی مول لینا، عافیت اور اطمینان کے لئے پیام موت ہے

چنانچہ بہت کم ایسا ہوا کہ آس پاس کے قلعوں کو فتح کرنے میں کہیں بڑی، یا خوں ریز جنگ کی نوبت آئی ہو، زیادہ تر تو ایسا ہوا کہ محمد بن قاسم کی فوج کو دیکھ کر، قلعہ والوں نے خود ہی پھاٹک کھول دیئے، اور وفد بھیجکر نرم اور باعزت شرائط پر مفاہمت کر لی بہت کم ایسا ہوا کہ کہیں جنگ کی نوبت آئی ہو، اگر آئی بھی تو بہت معمولی، یعنی چند ہی جھڑپوں کے بعد حقیقت کا احساس ہوا، لہٰذا ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کر لی!

ملتان کی فتح کے بعد بھی ابھی کئی منزلیں باقی تھیں اور اب محمد بن قاسم ان منزلوں کی طرف بڑھنے کا پروگرام بنانے لگا

ایک دور کا خاتمہ

محمد بن قاسم کا زوال و انجام

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نئے حوصلے

فتح ملتان نے، جہاں ہندوؤں کے حوصلے پست کر دیئے تھے، وہاں مسلمانوں کے حوصلے بہت بڑھ بھی گئے تھے! سندھ کا وہ سارا علاقہ جو راجہ داہر کے قبضہ اور تصرف میں تھا اب مسلمانوں کے زیرنگیں تھا، اور یہ علاقہ کوئی معمولی علاقہ نہ تھا، ایک پوری مملکت تھی، شمال میں کشمیر کی سرحد تک مسلمانوں کے قدم پہنچ چکے تھے، جنوب میں بحر عرب کا سینہ مسلمانوں کی کشتیاں چیر رہی تھیں، مغرب میں بلوچستان اور مکران کے کوہستان اور ریگ زار پر مسلمانوں کا پرچم لہرا رہا تھا، مشرق میں دریائے راوی کی موجیں قبضہ میں آچکی تھیں، آس پاس کے دوسرے راجہ مہاراجہ بھی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال چکے تھے۔

ان حالات میں محمد بن قاسم نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ داہر کے مقبوضات پر قانع ہو جاتے اس کی طبع بلند اکسا رہی تھی کہ آگے بڑھے اور جہاں تک جا سکتا ہے چلا جائے اور جہاں پہنچے وہ اسلام کا پیام ان لوگوں تک پہنچائے جو فکر و عقیدہ کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں، مظاہر پرستی اور اصنام پرستی کو اپنا شعار بنا چکے ہیں، خدائے واحد کو بھول چکے ہیں، اور نہیں جانتے کہ اس کے سامنے سر عبودیت کس طرح خم کریں۔

اب پھر ایک نئی منزل سامنے تھی

اور اس منزل کی طرف کوچ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں،

ذرائع پیدا کئے جا رہے تھے، وسائل بہم پہنچائے جا رہے تھے، سر و سامان فراہم کیا جا رہا تھا

حجاج کی وفات یکایک شوال ۹۵ھ میں اطلاع ملی کہ حجاج بن یوسف ثقفی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جو شخص لوگوں کی زندگیوں سے کھیلا کرتا تھا جس نے بے دریغ ہزارہا، انسانوں کو، بلا امتیاز جرم و ثواب موت کے گھاٹ اتارا، بغیر کسی الزام کے جیل میں بند رکھا، بغیر کسی وجہ کے، مورد عتاب قرار دیا، اور طرح طرح کی اذیتوں اور مصیبتوں کا آماجگاہ بنایا۔

جب وقت آیا تو پوری بے بسی کے ساتھ دوسرے عام لوگوں کی طرح وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا، نہ سامان امارت کام آیا، نہ اقتدار و اختیار کے اسلحہ نے مدد کی، نہ دولت و ثروت کام آئی، نہ خلیفۂ وقت کی خوشنودی اور عنایت نے مشکل حل کی،

دنیا میں اسی طرح ہوتا آیا ہے، اور اسی طرح ہوتا رہے گا۔

انتظار اور تعطل لیکن محمد بن قاسم کے لئے حجاج کی موت ایک بہت بڑا سانحہ تھی، صرف اس لئے نہیں کہ وہ اس کا بھتیجا اور داماد تھا، اس لئے بھی کہ سندھ، عراق کے ماتحت تھا، اب عراق کی ولایت جس کے حصہ میں آئے گی، سندھ پر بھی اس کا فرمان چلے گا اور وہ نہ جانے کون ہو؟ اس کی پالیسی کیا ہو؟ کس حکمت عملی کو وہ اپنا شعار بنائے، حجاج سے تو معاملہ نبھتا چلا آرہا تھا، وہ ان تمام کارروائیوں میں برابر کا شریک تھا، جو محمد بن قاسم نے سندھ میں کی تھیں، لیکن اب ایک کتاب واقعات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سر بمہر کر کے بند کر دی گئی، اور دوسری کتاب حوادث کھل گئی، اس کتاب کے کس ورق میں کیا لکھا ہے؟ اس کا جواب صرف مستقبل ہی دے سکتا تھا، لہٰذا اپنے مقام پر محمد بن قاسم کی پریشانی بالکل بجا تھی، وہ قدم آگے بڑھانے سے پہلے بار بار سوچ لینا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا چنانچہ سب سے پہلا کام جو محمد بن قاسم نے کیا وہ یہ تھا کہ پیش قدمیاں روک دیں

ی کی حالت میں خاموش بیٹھ گیا، البتہ

دہ کے پروگرام معطل کر دیئے اور انتظار و تعطل

کا سلسلہ جاری رہا

س پاس کے چھوٹے موٹے علاقوں پر تصرف اور تسلط

ت کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا

حجاج کی

لد بن عبدالملک نے اسے دنیا سے

تھا کہ خلیفہ

ل آشام سلیمان بن عبدالملک

ی کو خیرباد کہا۔

عبدالملک بن مروان کے دو بیٹے تھے،

(۱) ولید بن عبدالملک،

(۲) سلیمان بن عبدالملک۔

مرنے سے پہلے عبدالملک نے، اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان بیعت لی
نی عبدالملک کے بعد تخت خلافت پر ولید متمکن ہو، اور جب ولید کا انتقال ہو تو
س کا بھائی سلیمان سریر آرائے خلافت ہو، ماننے کو تو یہ بات ولید نے مان لی لیکن
ل کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا۔ وہ اس فیصلہ کو رد کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے لگا
لے مقابلے میں بھائی کی کوئی حیثیت نہ تھی، اب ولید کی خواہش یہ تھی کہ سلیمان کی
فسخ کرا دے، اور اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولیعہد بنا کر، اس کی ولایت عہد پر لوگوں
بیعت لے لے۔

عبدالملک کی حکومت دو ستونوں پر قائم تھی۔

(۱) موسیٰ بن نصیر، افریقہ کا حاکم اعلیٰ، اندلس کا فاتح،

(۲) حجاج بن یوسف ——— یہ عراق کا گورنر تھا اور حدود عرب سے باہر
اس نے فتوحات و مہمات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا،

حجاج کے دست و بازو محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم تھے۔ محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا
تھا اور قتیبہ بن مسلم ترکستان پر اموی خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا۔

جب سلیمان کی بیعت فسخ کرنے اور عبدالعزیز کی بیعت لینے کے لئے ولید نے اپنے صلاح کاروں سے رائے لی تو موسیٰ بن نصیر، حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم نے بلا تامل اپنے آقا کی تائید کی، اور سلیمان کی بیعت فسخ کر کے عبدالعزیز کی بیعت کر لینے پر راضی ہو گئے،

سلیمان کی بے بسی

ولید کے اس فیصلہ سے ظاہر ہے سلیمان کسی طرح مطمئن نہیں ہو سکتا تھا! وہ دل ہی دل میں سخت ناخوش تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، لیکن جتنا زیادہ وہ ناخوش تھا، اتنا ہی زیادہ وہ بے بس بھی تھا، ساری دنیا اس کی مخالف تھی، دربار خلافت میں کوئی شخص بھی ایسا نظر نہیں آرہا تھا جو اس کی مدد کرتا، اس کے کام آتا، اس کی یہ مشکل حل کر دیتا،

وہ دیکھ رہا تھا کہ لوگ کدھر جا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں، لیکن نہ ان کا دامن پکڑ کر کھینچ سکتا تھا، نہ ان کے آگے کھڑا ہو کر انہیں اس روی سے منع کر سکتا تھا!

وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے ولید کے بعد، اپنی حکومت، اپنے اقتدار، اپنی بادشاہی کے جو خاکے دل ہی دل میں بنائے تھے، وہ ولید کی ایک جنبش ہی سے مٹتے چلے جا رہے ہیں، وہ پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوئے، باد مخالف کے ایک ہلکے سے جھونکے نے انہیں نابود کر دیا،

لیکن وہ بے بس تھا، آہ سرد بھرنے اور دل ہی دل میں کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کی یہ مجال بھی نہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا راز دار بنا کر دل کے جلے پھپھولے پھوڑ لیتا، کسی کو اپنا سمجھتا اور اس سے صلاح و مشورہ کر لیتا! حالات نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ اسے یقین تھا جس روز ولید کے دربار میں اس کی ولایت عہد منسوخ ہو گی، اور عبدالعزیز کی بیعت کا حکم صادر ہو گا، تو سب سے پہلے جو اس تنسیخ کی تائید کرے گا، اور ایک نئے ولیعہد کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت کرے گا،

یہ خود ہوگا

یکا یک اور خلافِ توقع لیکن، ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جس کا خاکہ پہلے سے تیار کر لیا جاتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ وہی انگریزی کی کہاوت ۔

وہی حضرت علیؓ کا مقولہ

عرفت ربی بفسخ العزائم ———— میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا!

ولید بن عبدالملک نے اپنے ارادہ کو ابھی عملی جامہ نہیں پہنا پایا تھا کہ خود اس کا وقت آ گیا! اور وہ قبل اس کے عبدالعزیز کے لئے تخت خلافت کا انتظام کرتا، خود اس دنیا سے رخصت ہو گیا!

ولید کی زندگی میں عبدالعزیز کی بیعت اگر ہو جاتی، جب تو پھر اس کے اقتدار اور فرماں فرمائی کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا، لیکن ولید کے مرجانے کے بعد اب کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ سلیمان سے کہتا، آپ کی بیعت فسخ کرتے ہیں، اور عبدالعزیز کو امیرالمومنین اور خلیفۃ المسلمین بناتے ہیں! اس صورت حال سے سلیمان نے پورا فائدہ اٹھایا، اور بغیر کسی دشواری کے، بغیر کسی خوں ریزی کے، بغیر کسی زحمت اور پریشانی کے تخت خلافت پر متمکن ہو گیا! جو لوگ ابھی چند روز پہلے تک یہ اسکیمیں بنا رہے تھے کہ اس کی بیعت فسخ کر کے عبدالعزیز کی بیعت کر لیں گے، وہی اب بڑھ بڑھ کر سلیمان کے آگے دست بیعت بڑھانے لگے اور عبدالعزیز کی وہی پوزیشن ہو گئی جو ابھی چند دن پہلے تک سلیمان کی تھی!

انتقام کی آگ سلیمان بن عبدالملک تخت حکومت پر متمکن ہو گیا لیکن غیظ و غضب سے بھرا ہوا تھا، تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے کسی مخالف کو زندہ نہیں چھوڑے گا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور عظیم المرتبت ہو بنو امیہ کے خاندان میں متعدد ایسے نفوس پیدا ہوئے ظلم و ستم جن کا شعار تھا، جنہوں نے بے قصوروں اور بے گناہوں کا خون بہایا، جنہوں نے اپنے مخالفوں کی گردنیں کاٹیں، محمد نے بھی اپنی ذات کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں تفرقہ پیدا کرنا نہ چاہا، وہ بھی سلیمان کے انتقام کی بھینٹ چڑھ گیا۔

حجاج خوش قسمت تھا کہ سلیمان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے، اس دنیا سے رخصت ہو گیا، ورنہ اگر وہ زندہ رہتا تو شاید اس کا حشر موسیٰ، محمد اور قتیبہ سے بھی کہیں زیادہ عبرت انگیز ہوتا، لیکن وہ اب سلیمان کی زد سے نکل چکا تھا! وہ احکم الحاکمین کے حضور میں پہنچ چکا تھا!

خاندان حجاج کا حشر سلیمان بن عبدالملک نے عراق کی ولایت (گورنری) یزید بن مہلب کو سونپی، یزید کو حجاج سے سخت عداوت تھی، اب موقع آیا کہ وہ عداوت نکالے اور بدلہ لے، اس نے محکمہ خراج، صالح بن عبدالملک کو سونپ دیا، یہ خارجی شخص تھا، اور خوارج کے استیصال میں حجاج نے جو کچھ کیا تھا، اُسے دنیا جانتی ہے خود صالح کا بھائی آدم خارجیت کے جرم میں حجاج کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا، صالح کو یہ سب باتیں یاد تھیں، اور وہ ان کا بدلہ لینے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا، چنانچہ، اب کہ اقتدار اور حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں تھی، سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خاندان حجاج کے افراد کی پکڑ دھکڑ اور بتحریبہ استیصال کا کام شروع کر دیا

محمد بن قاسم کی گرفتاری محمد بن قاسم بھی اسی خاندان کا ایک فرد تھا، سندھ فتح کر کے، اور فتح سندھ کے مصارف، مال غنیمت سے ادا کر

کے اس نے عوام و خواص کی نظروں میں عظمت اور منزلت حاصل کر لی تھی، لیکن یہی چیز تھی جو دشمنوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی، اور اب پورا موقع تھا کہ اس کی حسرت نکالی جائے۔

چنانچہ سب سے پہلے اسے سندھ کی گورنری سے معزول کیا گیا، ایک شخص یزید بن ابی کبشہ سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، اس نے اپنے پیش رو سے چارج اس طرح لیا کہ اسے گرفتار کر لیا، لباس و خرہ اتار لیا، ٹاٹ کا بنا ہوا لباس پہننے کے لئے عطا کیا، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں، پاؤں بیڑی سے بوجھل کر دیئے، پھر اس بے گناہ قیدی کو عراق روانہ کر دیا، عراق پہنچنے کے بعد وہ واسط کے قید خانہ میں رکھا گیا۔

جیل خانہ کی زندگی محمد بن قاسم تخت حکومت سے اتار کر جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مقید کر دیا گیا!

جیل میں اسے کسی قسم کی سہولت نہ حاصل تھی، اس زمانہ میں جیل بدترین قسم کا تعذیب کدہ ہوتا تھا۔ کوئی شخص جیل بھیجا اس لئے جاتا تھا کہ اسے رونگٹے کھڑے کر دینے والی سزائیں دی جائیں،

یعقوبی کی روایت کے مطابق جیل میں محمد بن قاسم کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، وہ صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ ان شدائد اور مصائب کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر ایک روز قید ہی کی حالت میں جیل کی چار دیواری کے اندر وفات پا گیا،

یہ بڑا عبرت انگیز سانحہ تھا ——————

آج محمد بن قاسم کی قید، اور پھر وفات پر وہ لوگ خون کے آنسو رو رہے تھے جنہیں اس نے محکوم بنایا تھا، اور وہ لوگ خوش تھے، جن کے لئے محکوم بنایا تھا!

محمد بن قاسم کی یاد یوں تو کون حساس قلب تھا، جو اس ہونہار بہادر، اور یکتائے زمانہ فاتح کی اس بیکسانہ موت پر خون کے آنسو نہ بہاتا، لیکن سندھ پر

اس کا خاص طور پر سوگ منایا گیا، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے سندھ میں اپنے عدل، اور شرافت، انسانیت اور وفاداری، خلق اور احسان کا ایسا مظاہرہ کیا تھا جس کی یاد دل سے کسی طرح نہ نکلتی تھی، اس کی خبر وفات جب سندھ میں پہنچی تو لوگوں نے دل سے افسوس کیا، بعض مقامات کے لوگوں نے اس کے بت بنائے، اور اس طرح اپنی عقیدت اور تعلق خاطر کا ثبوت دیا۔

لیکن یہ فخر شاید صرف سلیمان ہی کے لئے ازل سے مقسوم ہو چکا تھا کہ ان لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے گا، جن کی بے لوثی اور وفاداری نے، جن کے تہور اور شجاعت نے جن کی شمشیر آبدار اور خنجر براں نے، اس خاندان کے عروج و استحکام میں غیر معمولی اور غیر فانی حصہ لیا!

موسیٰ، محمد، مسلم

موسیٰ بن نصیر اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے افریقہ اور اندلس کا شہنشاہ اعظم بن سکتا تھا، اس نے اپنی قوت بازو سے افریقہ فتح کیا تھا، اندلس پر قبضہ کیا تھا، یہ علاقہ اتنا دور دراز تھا کہ اموی فوجیں یہاں نہیں پہنچ سکتی تھیں، اور اگر پہنچ جاتیں، تو زندہ سلامت نہیں واپس آ سکتی تھیں۔

لیکن موسیٰ نے بغاوت پر گرفتاری ذلت اور قید کو ترجیح دی، وہ شہنشاہ بن سکتا تھا، نہ بنا، سلیمان کا ایک قیدی بن گیا! اور قیدی بھی کیسا جس کی اس بڑھاپے میں ذلت کی جاتی تھی، جس کے سامنے اس کے بیٹے کا کٹا ہوا سر پیش کیا جاتا تھا، جس کی ساری دولت اور املاک چھین لی گئی تھی

اسی طرح محمد بن قاسم بھی، بغیر کسی پریشانی کے سندھ کا مالک و مختار بن سکتا تھا، یہ سارا علاقہ اسی نے فتح کیا تھا، اور اس شان سے فتح کیا تھا کہ یہاں کے لوگ اسے دیوتا اور اوتار سمجھنے لگے تھے، اس کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگے تھے، عساکر خلافت یہاں قدم نہیں رکھ سکتے تھے، اور اگر کسی طرح آ جاتے تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو راجہ داہر

کی فوجوں کا ہوا تھا،

بالکل یہی صورت قتیبہ بن مسلم کی تھی

وہ بہت بڑا فاتح، بہت بڑا جرنیل بہت بڑا سپاہی تھا!

ترکستان اس کے زیرنگین تھا، چین کے دروازے تک وہ پہنچ چکا تھا، اگر وہ واقعی بغاوت کرتا تو بغیر کسی زحمت کے اپنی بادشاہت منوا سکتا تھا، لیکن وہ بھی سیدھا مسلمان تھا۔

بہت سے لوگوں نے مرثیے کہے، اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا، یوں تو بہت سے شاعروں نے اس کے فضائل وسعت قلب اور مجاہد و محاسن کا اچھے اور شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے لیکن ایک شاعر نے ایسی بات کی ہے، جو واقعہ کے مطابق ہے۔ اس لئے دل پر ایک گہرا نقش قائم کردیتی ہے، وہ کہتا ہے۔

"(صرف) سترہ سال کی عمر میں محمد بن قاسم نے سرداری حاصل کر لی، حالانکہ یہ وہ سن ہے کہ،

اس عمر کے لڑکے کھیل کود میں منہمک رہتے ہیں"

واقعی، عمر کے جس زمانہ میں کوئی نوجوان کھیل کود، تفریح اور لہو ولعب میں گذارا کرتے تھے، محمد بن قاسم نے ریعان شباب کا وہ زمانہ ان لغویتوں میں صرف کرنے کے بجائے اسلام کے مفتوحات کا سلسلہ بڑھانے میں صرف کیا،

مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک کا یہ اقدام صرف، ہوس انتقام کی تسکین پر مبنی تھا ــــ اس طرح اس نے اپنی آتش انتقام تو بجھا لی، لیکن ملت اسلامیہ کو بڑی گراں مایہ شخصیتوں سے محروم کر دیا، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم جیسے لوگ مادر گیتی روز روز نہیں پیدا کرتی!

بدامنی کا آغاز ایسا معلوم ہوتا ہے، سلیمان بن عبدالملک صرف اس لئے تخت حکومت پر بیٹھا تھا کہ انتقام لے، اور مرجائے

وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہے۔ صفر ۹۹ھ میں سلیمان کا انتقال ہوگیا۔ اس مختصر مدت میں کوئی کام نہ ہو سکا، جتنے کام بگڑ سکتے تھے بگاڑ دیے، اس نے سندھ کا گورنر یزید بن ابی کبشہ کو مقرر کیا تھا، لیکن یہ بھی زیادہ دنوں زندہ نہ رہا، صرف ۱۸ دن تک مسند حکومت پر متمکن رہا، پھر وفات پا گیا۔ ایک تو محمد بن قاسم کی معزولی نے سندھ کے لوگوں میں بددلی اور مایوسی پیدا کر دی تھی، پھر جو نیا گورنر گیا وہ بھی اپنی کارگزاری کا نمونہ دکھانے سے پہلے مر گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ میں افراتفری اور بدامنی کے آثار پیدا ہو گئے کہ ملک میں امن و امان صرف کوئی مضبوط و مستحکم حکومت ہی قائم کر سکتی ہے، کمزور اور بار بار بدلنے والے حکام و عمال سے بدامنی کے فروغ میں تو مدد مل سکتی ہے لیکن حکومت کو استحکام نہیں حاصل ہو سکتا، یہی سندھ میں ہوا۔

خائن گورنر

یزید بن ابی کبشہ کی وفات کے بعد سندھ کی بدامنی جب بہت زیادہ بڑھ گئی تو حبیب بن مہلب یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، اس نے آ کر حالات پر قابو پانے کی کوشش کی، باغیوں کو اطاعت پر مجبور کیا، سرکشوں کو سرافگندگی کا درس دیا، اور بڑی حد تک حالات پر قابو پا لیا، لیکن اس کے اور محمد بن قاسم کے کردار میں زمین و آسمان کا فرق تھا، جہاں محمد بن قاسم کا یہ حال تھا کہ وہ مال غنیمت سے خلافت کا خزانہ بھر رہا تھا، وہاں حبیب کا یہ عالم تھا کہ وہ مال غنیمت پر تصرف کر رہا تھا، اسے اندیشہ بھی کیا ہو سکتا تھا، بھائی عراق کا حاکم، سرپرست، دمشق کا خلیفہ، لیکن یہ اطمینان، جلد ہی ختم ہو گیا، حالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا۔

خاندان مہلب

صفر ۹۹ھ میں سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا، اب مسند خلافت پر ایک مختصر مدت کے لئے وہ شخص متمکن ہوا جس کے عہد کو بجا طور پر خلافت راشدہ کے آثار سے تشبیہ دی جاتی ہے، یعنی عمر بن عبدالعزیز آپ نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ان تمام لوگوں کو مناصب سے برطرف کر دیا جو

کے بارے میں بددیانتی اور خیانت کا شبہ بھی تھا، اس سلسلہ میں عراق کی ولایت، یزید بن مہلب کے ہاتھ سے، اور سندھ کی گورنری حبیب بن مہلب کے ہاتھ سے جاتی رہی بلکہ حبیب کو خیانت کے جرم میں جیل بھی بھیج دیا گیا، اور اس کی جگہ دربار خلافت سے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا، وہاں جا کر اس نے، انتظامات کو سنبھالنے کی پرزور کوشش کی۔

لیکن حالات پے بہ پے بدل رہے تھے،

معاویہ بن یزید بن مہلب کا حشر

۱۰۱ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی وفات پا گئے آپ کی جگہ مسند خلافت پر یزید بن عبدالملک بیٹھا، اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں، جو عبدالملک بن مروان کی اولاد میں ورثہ کے طور پر کی جاتی تھیں، یعنی خودرائی۔ سفاکی، شقاوت، جور وستم،

اس کے زمانہ میں خاندان مہلب کسی طرح جیل سے بھاگ نکلا اور مشرقی ممالک پر قابض ہو گیا، عساکر خلافت مقابلہ پر پہنچے، اس خاندان کے بہت سے لوگ ہلاک ہوئے، باقی ماندہ گرفتار کر لیے گئے، جو لوگ ہلاک ہوں، ان میں یزید بن مہلب کا لڑکا معاویہ بھی تھا، یہی وہ شخص تھا جس نے محمد بن قاسم کو ہتکڑی بیڑی میں جکڑ کر جیل میں رکھا تھا، اور وہاں اسے عبرتناک مشقتوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیا تھا،

یزید بن عبدالملک بڑے طنطنہ سے تخت حکومت پر بیٹھا تھا، لیکن قدرت اور مشیت کا مقابلہ کرنے کی طاقت سے وہ بھی عام لوگوں کی طرح محروم تھا:

ہشام بن عبدالملک

۱۰۵ھ کے آخر میں یزید بن عبدالملک بھی وفات پا گیا، اس کی جگہ اس کا ایک اور بھائی ہشام سریر آرائے خلافت ہوا جس کی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی داستانیں ہم آغانی کے صفحات پر پڑھ سکتے ہیں، اب یہاں سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے

دوسرے دور کا آغاز

جنید : ایک اولوالعزم سپاہی اور افسر

ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت سے سندھ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے

ہشام نے ابن ہبیرہ کو معزول کر کے خالد قسری کو عراق کی گورنری سونپی، اس طرح سندھ خالد قسری کی ماتحتی میں آگیا، خالد نے کچھ روز تک تو انقلاب و تغیر کی پالیسی پر عمل نہیں کیا، پھر اس نے جنید نامی ایک شخص کو سندھ کی گورنری سونپ دی۔

داہر کے لڑکے اور جنید کا مقابلہ جنید کی سب سے پہلی جھڑپ راجہ داہر کے لڑکے جے سنگھ سے ہوئی جو مسلمان ہو گیا تھا، اور جسے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے برہمن آباد کی حکومت عطا کر دی تھی، جے سنگھ سمجھ رہا تھا، جنید کی نیت اچھی نہیں ہے، اور جنید کو جے سنگھ کی نیت میں کھوٹ نظر آتا تھا، دونوں ایک دوسرے سے بدگمان تھے، اس لئے دونوں ایک دوسرے سے چوکنے رہتے تھے، جنید کو معلوم تھا کہ حالات کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ وہ یک بیک جے سنگھ سے لڑ جائے، اور جے سنگھ کو اپنی جگہ یقین تھا کہ جنید موقع پاتے ہی چیتے کی طرح حملہ کرے گا، جنید کا مقصد یہ تھا کہ جے سنگھ کی اطاعت سے مطمئن ہو کر، سرزمین سندھ سے آگے قدم بڑھائے اور فتوحات کا نیا سلسلہ شروع کرے، جے سنگھ کو یہ بدگمانی تھی کہ اگر جنید کی قوت و طاقت میں اضافہ ہوا تو خود اس کی خیر نہیں، یہ اندرونی کشمکش جب زیادہ بڑھی تو آخر

چار و ناچار دونوں کو برسرِ جنگ ہونا پڑا، جنگ اگرچہ بہت بڑی نہیں تھی لیکن اس کے خوں ریز ہونے میں شبہ نہیں، جلد ہی جے سنگھ کو شکست ہو گئی، وہ بھاگا لیکن موت اس کا تعاقب کر رہی تھی، بھاگ نہ سکا ہلاک ہو گیا،

جنید کی شخصیت

اس مرحلہ سے فارغ ہو کر جنید نے ایک مقام کیرج فتح کیا، یہاں گھمسان کا رن پڑا تھا لیکن کامیابی مسلمانوں ہی کو ہوئی، یہاں سے نبٹ کر وہ مارواڑ اور گجرات کی طرف گامزن ہوا،

محمد بن قاسم کے بعد جنید کی صورت میں ایک مضبوط، اور صائب الرائے فرماں روا سندھ کو ملا تھا، جنید کی سیرت اور کردار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا، وہ بڑا اولوالعزم اور باہمت آدمی تھا، اس نے صرف چار سال سندھ پر حکومت کی، یہ مدت ملکی نظم و انتظام کے اعتبار سے کچھ بہت زیادہ نہیں ہوتی، اس مدت میں اس نے ایک طرف تو سندھ کا امن و امان قائم رکھا، دوسری طرف سندھ کی سرحدی ریاستوں کو مطیع و منقاد بنایا، اور اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ گجرات اور مارواڑ تک بڑھتا چلا گیا، اس نے بھڑوچ کو بھی فتح کر لیا، جو اب بھی صوبہ بمبئی کا ایک اچھا ترقی یافتہ شہر ہے۔

جنید نے گجرات کے راجہ سے جنگ کی اور اس جنگ میں کامیاب ہوا، گجرات کے پایۂ تخت پر اس نے قبضہ کر لیا، منڈل (گزہ میدم گام) پر بھی ہندو فوجوں سے اس کی جھڑپ ہوئی، یہاں کی کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا، جنید کی حوصلہ مندی، اور اولوالعزمی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی فوجیں اجین اور مالوہ میں فاتح اور کشورکشا کی حیثیت سے داخل ہوئیں، دشمن مقابلہ پر آیا اور مارا گیا، یا پیٹھ دکھائی اور روپوش ہو گیا، یہیاں کے گوجر بڑے طاقتور تھے، اس طاقت کو بھی جنید نے توڑ کر، اور سرنگوں کر کے رکھ دیا، اور پھر وہ سر نہ اٹھا سکے،

مال غنیمت کی کثرت

ان جنگی کامیابیوں میں ایک بہت بڑی کامیابی جنید کو یہ بھی ہوئی کہ اسے بے اندازہ مال غنیمت ہاتھ آیا، جو دولت اس کے قبضہ میں آئی بڑی فیاضی اور دریا دلی سے، اسے دوستوں، بہی خواہوں، نیازمندوں اور سپاہیوں میں تقسیم کی، اس تقسیم کے بعد اس نے خزانۂ خلافت میں آٹھ کروڑ درہم داخل کئے، چھ لاکھ دشمن کے سپاہیوں کو گرفتار کیا، شاعروں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے، دوستوں نے اس کے گن گائے، جو لوگ زیر بار احسان تھے انہوں نے اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے، ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ اسے مال غنیمت بہت زیادہ حاصل ہوا، اس مال غنیمت کا بڑا حصہ، اس نے ازراہ جود و احسان لوگوں میں تقسیم کیا، اور اس کے بعد بھی اس کے پاس جو دولت فاضل رہی وہ خزانۂ خلافت میں داخل کر دیا جس کی میزان آٹھ کروڑ درہم سے کم نہیں، اس سے فتوحات کی وسعت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مستحق لوگوں کو کس کس طرح نوازا جاتا تھا،

ریاست چمبہ پر حملہ

ان فتوحات سے یکسو ہونے کے بعد جنید نے دریائے بیاس کے مغربی جانب (موجودہ ریاست) چمبہ کی طرف یلغار کرتا بڑھا، راجہ نے مقابلہ کی ٹھان لی، اور میدان میں آ ہی گیا، اسی راجہ نے کئی مرتبہ مسلمانوں سے شکست کھائی، لیکن اس کے عزم جنگ میں کوئی فرق نہ آیا، ہارتا تھا، پھر لڑتا تھا، ایک جگہ سے شکست کھا کر بھاگتا تھا اور پھر یکایک کبھی دوسرے مقام پر نمودار ہو جاتا تھا،

جنید جب چمبہ کے قلعہ کے پاس میدانی جنگ ختم کر کے پہنچا تو اہل قلعہ نے دروازے بند کر لیا اور اطمینان سے قلعہ بند ہو گئے، جنید نے فوراً محاصرہ کا حکم دے دیا، محاصرہ کے دوران میں کوئی باقاعدہ جنگ تو لڑی نہیں جا سکتی تھی، لیکن یہ ضرور تھا کہ سنگ باری اور آتش زنی کا سلسلہ جاری تھا، مسلمان لشکر کی طرف سے روغن نفت کی پچکاریوں کے ذریعہ

بھر ا۔ کر دی۔ اس روغن کی خاصیت یہ تھی کہ یہ آتش افروز تھا، جہاں گرتا تھا، آگ لگا دیتا تھا، پھر اس کا بجھانا اور اس پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا تھا، یہ روغن عربوں ہی کی ایجاد تھا۔ اور وہی اس کے فرو کرنے کا نسخہ جانتے تھے، اس روغن نے بہت سے معرکوں میں مسلمانوں کو حریف پر غالب ہونے کا موقعہ دیا۔

غدار عربوں کو موت کی سزا

مسلمان لشکر کی طرف سے بار بار نفت سے بھری پچکاریاں دشمن پر پھینکی جاتی تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ بے اثر رہتی تھیں، آگ بھڑکنے نہیں پاتی تھی، کہ بجھ جاتی تھی۔

جنید کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا بات ہے، ہوتے ہوتے اس نے اندازہ لگایا کہ قلعہ میں ضرور کوئی عرب ہے جس کی امداد سے یہ آگ بھڑکنے سے پہلے فرو کر دی جاتی ہے لیکن اگر کوئی عرب وہاں ہے، تو بھی نہ اس وقت اسے سزا دی جا سکتی تھی، نہ اس کی سرکوبی ممکن تھی، کیونکہ وہ زد سے باہر تھا! اس واقعہ سے جنید برہم اور مشتعل ہوا کہ اس نے محاصرہ کی سختیوں میں اور زیادہ اضافہ کر دیا، آخر جب قلعہ والے کسی طرح اس مشکل سے جبر بر نہ ہو سکے تو انہوں نے اطاعت کا پیام بھیجا، جنید نے صلح کی التماس منظور کر لی، اور غیر جنگجو لوگوں سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا، البتہ قلعہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے تفتیش کی کہ یہ آگ کس طرح بجھ جاتی تھی، آخر تحقیق و تفتیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بات ثابت ہو گئی، کہ یہ حرکت دو عربوں کی تھی، وہی اس آگ کو فرو کر دیا کرتے تھے!

جنید نے ان غیر مسلموں کو تو معاف کر دیا جو آپ تک اس سے برسر جنگ تھے، لیکن ان عربوں کو نہ معاف کر سکا، جو اپنی قوم کے لئے باعث ننگ تھے، اور دشمن سے مل کر عربی وقار کو نقصان پہنچا رہے تھے، چنانچہ جب یہ دونوں عرب گرفتار کر کے اس کے سامنے لائے گئے تو اس نے فوراً انہیں سزائے موت سنا دی!



خراسان کی نظامت

۱۱۱ھ تک جنید، سندھ کی گورنری پر فائز رہا، پھر وہ ایک اور بلند منصب، خراسان کی نظامت پر فائز کر دیا گیا ———— یہ گراں بار ذمہ داری اس نے تقریباً چھ سال ۱۱۶ھ تک خوبی اور خوش اسلوبی، نیک نامی اور شہرت کے ساتھ انجام دی،

جنید کا حشر

لیکن ان تمام کارناموں اور ناقابل فراموش خدمتوں کے باوجود انجام جنید کا بھی بہت ہی افسوسناک ہوا،

خراسان کی نظامت کے زمانہ میں جنید نے یزید بن مہلب کی خوش جمال اور خوش سلیقہ لڑکی عاقلہ سے شادی کر لی، خلیفہ اس بات پر بھڑک گیا، کیونکہ خاندان مہلب اس کا معتوب تھا، اور یہ بات وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس کے معتوب ہوں، ان سے وہ لوگ رشتہ اور پیوند کے تعلقات قائم کریں، جن کا شمار مقربان بارگاہ میں ہوتا تھا، چنانچہ اس جرم میں اس کے تمام روشن کارنامے پس پشت ڈال دیئے گئے اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے حکم سے معزول کر دیا گیا،

کچھ روز بعد وہ بیمار پڑا، یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی، اور آخر اس کا انتقال ہو گیا،

بدامنی کا دور

نئے نئے تغیرات ــــ تعمیر و تخریب ــــ بنو امیہ کا خاتمہ

جنید کے تبادلہ کے بعد سندھ کی ولایت تمیم بن زید عتبی کے سپرد ہوئی (سنہ ۱۱۱ھ) تمیم کا انتخاب "قابلیت اور اہلیت کی بنا پر عمل میں نہیں آیا تھا، صرف اس لئے اسے یہ منصب سونپا گیا تھا، کہ خالد قسری کی نگاہ کرم سے ممتاز تھا! چونکہ حکومت کی اہلیت سے محروم تھا، اس لئے نالائقی نے بہت سے گل کھلائے، فوج بددل ہو گئی، امرائے فوج بگڑ بیٹھے، رعایا میں ابتری پیدا ہو گئی، نظم و انتظام درہم برہم ہو گیا، حکومت کا رعب اٹھ گیا، اور رفتہ رفتہ غیر اسلامی عصبیتیں ابھریں، اور باغیانہ جنگی تک کی نوبت پہنچ گئی، تمیم کو اپنی کمزوری کا احساس تھا، مقابلہ کی ہمت نہ پڑی، بھاگ کھڑا ہوا، لیکن موت پیچھے پیچھے آ رہی تھی، سوچا تھا بھاگ کر عراق پہنچ جائے گا، لیکن راستہ ہی میں موت نے آ دبوچا،

حالات کی ابتری تمیم کے فرار، اور موت کے بعد اتنی ابتری پھیلی اور ایسا خلفشار مچا کہ جو لوگ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ حصول جاہ و منصب کے لئے ترک مذہب پر آمادہ ہوئے تھے، وہ مرتد ہو گئے، دشمن اگرچہ شکست کھا چکا تھا، موقع غنیمت دیکھ کر اپنی عظمت رفتہ کے حصول میں جدوجہد کرنے لگا، حالات اتنے متنازعہ ہو گئے کہ جو عرب یہاں مستقل بود و باش اختیار کر چکے تھے، وہ سندھ سے ترک اقامت اور ہجرت پر اپنے تئیں مجبور پانے لگے، جو لوگ التجا کر کے مسلمانوں کا غلبہ

دیکھ کر باج گزار بنے تھے، انہوں نے باج اور خراج ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا، بلکہ جنگ، و پیکار پر آمادہ ہو گئے، اس زمانہ میں ملتان نے سندھ سے تعلق منقطع کر لیا، اور اپنی انفرادیت بحال کر لی،

حکم کا تقرر

خالد قسری کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ بہت پریشان ہوا، اس نے فوراً حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کی اور حکم بن عوانہ کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا

حکم اور تمیم میں بہت، فرق تھا ایلے حوصلگی میں اگر چہ دونوں یکساں تھے، لیکن نظم و انتظام کے اعتبار سے حکم تمیم پر بھاری تھا فہم و فراست اور دانش و تدبر کے اعتبار سے بھی اپنے پیش رو پر بہ مدارج فوقیت رکھتا تھا، مصالح کو پیش نظر رکھتا تھا، پھر کوئی قدم اٹھاتا تھا، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگرچہ حکم نے ہجوم اور پیش قدمی کی پالیسی اپنی بے حوصلگی کی وجہ سے اختیار کرنے کی جرأت نہیں کی تھی، لیکن داخلی امن و امان، اور تحفظ و دفاع پر، پوری توجہ کی، اور حالات کو بڑی حد تک سنبھال لیا، حکم کو عمر بن محمد بن قاسم پر بڑا بھروسہ تھا، یہ محمد بن قاسم کا نوعمر لڑکا تھا، لیکن بالکل اپنے باپ کا چربہ تھا، طبیعت، فطرت، خصلت اور مزاج بالکل باپ کا سا پایا تھا، وہی بہادری، وہی شرافت، وہی حسن انتظام، جو محمد بن قاسم کا طرۂ امتیاز تھا، پورے طور پر عمر میں بھی موجود تھا، اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ حکم کے عہد کی تمام احتیاطیں، اور پیش بندیاں نتیجہ تھیں عمر کے دماغ اور عمل کا!

افسوسناک نتائج

تمیم کے دور میں، جو بدنظمی اور بے رعبی پیدا ہوئی تھی، اس کے دو نتیجے نکلے،

ایک تو یہ کہ جو عرب اپنے وطن مالوفہ سے ترک اقامت کر کے یہاں آئے تھے، وہ پھر مجبور ہو گئے، کہ موجودہ حالات کے باعث دوبارہ ترک اقامت کریں، اور جہاں سے

آگئے تھے، وہاں پھر واپس چلے جائیں ——— چنانچہ بہت سے لوگوں نے ایسا کیا دوسرے یہ کہ جو لوگ اپنی عزیمت اور استقلال کے سبب ترکِ اقامت پر آمادہ نہیں ہوئے، بلکہ ہر طرح کے ناساعد اور ناخوشگوار حالات میں اپنی جگہ پر چٹان کی طرح جمے بیٹھے رہے، وہ سخت غیر محفوظ حالات میں تھے، ان کی جان و مال کو ہر وقت اندیشہ تھا، اس لئے کہ وہ ہر چہار طرف سے دشمن کے نرغہ میں تھے ——— ہر وقت اس کا امکان تھا کہ کسی دشمن کی طرف سے یورش ہو، اور وہ بالکل تباہ و برباد ہو جائیں

صلاح و مشورہ

یہ سوچ کر حکم نے اپنے صلاح کاروں، خاص طور پر عمر سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ کون سا ایسا اقدام کیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ سندھ سے عربوں کا انخلا بند ہو جائے، اور جو لوگ جا چکے ہیں، وہ پھر اگر ممکن ہو تو واپس آجائیں، جو نہیں گئے ہیں، وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس نہ کریں

کافی غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد یہ بات طے پائی کہ خالص عرب آبادیاں بسانے کا کام شروع کیا جائے۔

شہر محفوظ

یہ اسکیم جب باہمی صلاح و مشورہ سے منظور ہو گئی، تو حکم نے دریائے سندھ کے دہانہ پر ایک نئے شہر کی داغ بیل ڈالی، یہ شہر دریائے سندھ کے جانب مشرق تعمیر کیا گیا، اس کی مضبوطی اور استحکام کی طرف خاص توجہ کی گئی کہ دشمن کے قدم کسی طرح یہاں نہ پہنچ سکیں،

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس شہر کا نام کیا رکھا جائے؟ حکم نے اپنے ساتھیوں سے اس سلسلہ میں رائے لی، بہت سے لوگوں نے مختلف نام بتائے لیکن حکم کو کوئی نام پسند نہیں آیا، آخر اس نے خود ہی "محفوظ" نام رکھا، چنانچہ یہی نام طے پا گیا اور تاریخ کے صفحات پر اب تک موجود ہے، ورنہ اس کی مادی حیثیت تھوڑے ہی دنوں بعد ختم ہو گئی۔

منصورہ کی بنا

محفوظ تھیں اب مسلمان ہی مسلمان تھے، اور ہر طرح سے محفوظ تھے اب بے امنی، شر انگیزی، اور فتنہ خیزی کی طرف توجہ کی گئی چنانچہ حکم کے حکم سے عمر بن محمد (بن قاسم) آگے بڑھا، اور اس نے ایک مختصر سی مدت میں امن و امان قائم کر دیا، اس نے دلیری اور بہادری کے ساتھ تمام ناساعد حالات کا مقابلہ کیا اس نے سرکشوں کو سرنگوں کیا، باغیوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا، دشمنوں کو ایسا زچ کیا کہ وہ مجبور ہو گئے کہ پھر پیمان دوستی باندھنے کی التجا کریں، جو لوگ کمزور طبیعت کے تھے، ان میں مستقبل کی طرف سے ہراس کے بجائے اطمینان پیدا کیا، اور سارے سندھ پر ایسا دبدبہ قائم کر دیا کہ وہی ملک جو بدامنی اور شورش و بغاوت کا گہوارہ بنا ہوا تھا، پھر سے امن کا شائق اور قانون کا مطیع ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں شورش اور بدامنی کا دور آیا ہی نہ تھا!

عمر جب فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ واپس ہوا تو اس نے ان غیر معمولی اور ناقابل فراموش کامیابیوں اور فتحمندیوں کی یادگار میں دریائے سندھ کے کنارے ایک نیا شہر تعمیر کیا جس کا نام فتحمندی اور فیروزمندی کی رعایت سے اس نے "منصورہ" تجویز کیا اور یہی نام چل پڑا۔

یہ عمر بن محمد بن قاسم کے حسن عمل اور حسن نیت کی برکت تھی کہ کچھ عرصہ بعد شہر منصورہ صرف ایک شہر نہیں، بلکہ سندھ کا پایۂ تخت بن گیا، یہ اس کی فتح و نصرت کی ایسی یادگار تھی جو آج تک تاریخ کے سینہ میں محفوظ ہے اور جب تک تاریخ کے اوراق محفوظ ہیں منصورہ کا نام بھی زندہ رہے گا،

خالد قسری کا عزل

حالات کو پلٹا کھاتے دیر نہیں لگتی، بلکہ کبھی کبھی تو اس طرح منقلب ہوتے ہیں کہ پہلے سے ان کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

خالد قسری بہت بڑا شخص تھا۔ جاہ و جلال میں، رعب و دبدبہ میں، سیاست اور فراست میں، خطابت اور فصاحت میں، مذہب سے بیزاری اور آقا پرستی میں ظلم اور سفاکی میں، سیاسی جوڑ توڑ اور سازش میں، سفاکی اور خوں آشامی میں، موقع پرستی اور ابن الوقتی میں، کسی طرح وہ حجاج بن یوسف سے کم نہ تھا، بلکہ بعض ارباب نظر کی رائے میں تو وہ حجاج سے بھی بڑھا ہوا تھا، لیکن حالات جب بگڑے تو اس کی یہ خصوصیتیں کام نہ آسکیں، ۱۲۱ھ کے نصف آخر میں وہ معزول کر دیا گیا،

خالد قسری کی معزولی پیش خیمہ تھی اس کے مقرر کئے ہوئے حکام و عمال میں سے اکثر کے زوال، قتل، ہلاکت اور بربادی کا — شخصی حکومتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالد قسری کے معزول ہوتے ہی جو دوسرا شخص اس کی جگہ پر حاکم اعلیٰ اور مختار کار ہو کر آیا، اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ان لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جو خالد کے آوردے یا خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ سب سے پہلی زد جس شخص پر پڑی، وہ خود حکم تھا!

حکم اس فکر میں تھا کہ کچھ کر دکھائے تاکہ موجودہ والیٔ عراق خوش ہو جائے، لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہو سکا ۱۲۱ھ میں سندھیوں کی ایک مسلم جماعت سے اس کی جنگ ہوئی، اور اسی جنگ نے حکم کی زندگی کا خاتمہ کر دیا!

حق بہ حقدار رسید حکم کے بعد سندھ کی ولایت کے امیدوار اور دعوے دار کئی لوگ تھے، لیکن عمر بن محمد بن قاسم، اور یزید بن عرار کا استحقاق تقریباً یکساں تھا، لہٰذا یہ بات طے تھی کہ انہی دونوں میں سے کوئی شخص سندھ کا والی مقرر کیا جائے گا!

گورنر عراق نے دونوں نام ہشام کو لکھ بھیجے، ہشام نے محمد بن قاسم کے بیٹے عمر کو ترجیح دی اور والیٔ عراق کو لکھ بھیجا کہ اگر محمد بن قاسم کا بیٹا جوان ہو چکا ہو اور

اس بارگاں کے سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہو تو یہ منصب اُسے تفویض کیا جاسکتا ہے خلیفہ کا اشارہ کافی تھا، فوراً عمر اس منصب پر مقرر کر دیا گیا، اُس نے برسر اقتدار آتے ہی یزید کو نذر زنداں کر دیا،

مشکلاتِ راہ

عمر بننے کو تو سندھ کا گورنر بن گیا لیکن مشکلات راہ کا سلسلہ ابھی باقی تھا، بغاوت خانہ جنگی، اور سرکشی کا سلسلہ اگرچہ بظاہر ختم ہو چکا تھا لیکن یہ چنگاری اندر ہی اندر سلگ رہی تھی؛ چنانچہ حکم کے مرتے ہی اور عمر کے برسر اقتدار آتے ہی ایک مرتبہ پھر بغاوت اور شورش کی آگ بھڑکی اور اس زور شور سے بھڑکی کہ منصورہ دشمن کے محاصرہ میں آگیا، اور عمر باوجود جلالت قدر اور تہور و شجاعت اپنے تئیں بے بس اور کمزور محسوس کرنے لگا، لیکن اسی اثناء میں والی عراق کی بھیجی ہوئی کمک پہنچ گئی، یہ صرف چار ہزار نفوس تھے، اور دشمن ہر طرح زیادہ تھا، لیکن اس بر وقت اور با موقع امداد نے عمر کے حوصلے بڑھا دیئے، اس لئے اتنے جوش و خروش کے ساتھ دشمن پر شب خون اور حملوں کا سلسلہ جاری کیا کہ آخر اسے راہِ فرار اختیار کرنے بن پڑی، وہ کسی طرح بھی جم کر نہ لڑ سکا،

اسی واقعہ نے عمر کی دہشت اور سطوت قائم کر دی، جو اب تک اس سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے، وہ یہ سوچنے، اور سوچ کر صلح کرنے پر مجبور ہو گئے اور اگر پانسہ اُلٹا پڑا تو کیا ہو گا۔

عمر کے کارنامے

عمر نے حکم کے ماتحت اور نائب کی حیثیت سے بھی، اور بعد میں سندھ کے مستقل گورنر کی حیثیت سے بھی، جو کارنامے انجام دیئے وہ بڑے روشن اور تابناک تھے، اپنے باپ کی طرح اسے بھی کام کرنے اور یکسوئی کے ساتھ نظم و انتظام قائم کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، لیکن جو تھوڑی بہت مدت کام کرنے کی ملی، اس میں بھی اس نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنا بہادر اور دانا شخص ہے، اس نے

باغیوں کا زور ختم کر دیا، اس نے سرکشوں اور شورش پسندوں میں یہ ہمت باقی نہ رکھی کہ وہ مقابلہ کا خیال تک دل میں لا سکیں، اس نے کم ہمت اور بے حوصلہ لوگوں میں ایک نئی اُمنگ اور ترنگ پیدا کر دی۔ اس نے داخلی نظم ونسق کی طرف توجہ کی، اور ہر طرح کے مشکلات اور موانع کے باوجود اس کام کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے ڈالا،

محمد بن قاسم کی طرح عمر نے بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جو ایک مسلمان کے شایانِ شان نہ ہو۔ کسی شخص کا اپنے منصب سے معزول ہو جانا، یا الگ کر دیا جانا ایک دوسری بات ہے، اور عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھانا قطعاً دوسری بات ہے، عمر نے بڑے اچھے اور روشن کارنامے انجام دیئے۔ اور اپنے منصب سے کبھی کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا

شخصیت اور جمہوریت ۱۲۵ھ کے شروع میں ہشام بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا،

جمہوری حکومت اور شخصی حکومت میں بھی بہت بڑا فرق ہے، جمہوری حکومت کسی بڑے سے بڑے شخص کی موت سے بھی درہم برہم نہیں ہوتی، اس کا کام اسی یکسانی کے ساتھ چلتا رہتا ہے، جیسا چل رہا تھا، لیکن شخصی حکومت میں جب ایک بادشاہ مرتا ہے تو اس کا قائم کیا ہوا انتظام بھی مر جاتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بہتر اور برتر کیوں نہ ہو، اس کے تمام حکام و عمال بھی برطرف کر دیئے جاتے ہیں، انہیں موردِ عتاب قرار دیا جاتا ہے، جو زیادہ معتوب ہوتے ہیں، ان کی جان و مال کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، ہشام جب تک زندہ تھا، اس کا نظام بھی زندہ تھا، اس کے حکام و عمال بھی زندہ تھے لیکن جب وہ مر گیا تو اس کا نظام بھی موت کے پنجہ میں پھنس گیا اور اس کے حکام و عمال بھی زندہ رہنے کے وسیلے تلاش کرنے لگے،

عمر بن محمد بن قاسم کی معزولی حالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا۔

ہشام کی وفات کے بعد اس کے تمام ولاۃ اور حکام و امرا معزول کر دیئے گئے،

انہی معزول ہونے والوں میں محمد بن قاسم کا جواں سال اور جواں ہمت بیٹا عمر بھی تھا:

اس کے پاس بھی پروانۂ عزل پہنچا اور اسے اپنے منصب سے ہٹنا پڑا،

عمر اس اعتبار سے خوش قسمت تھا کہ اسے صرف عزل کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا، اپنے باپ محمد بن قاسم کی طرح وہ جیل میں نہیں ڈالا گیا۔ نہ وہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کیا گیا ——— حالانکہ جیسا اب تک ہوتا آیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ نہ خلاف توقع ہوتا نہ تعجب انگیز!

یزید بن عرار کا تقرر عمر کی معزولی کے بعد جو شخص سندھ کا گورنر بنایا گیا، وہ اس کا حریف یزید بن عرار تھا، اس سے پہلے بھی یزید نے قسمت آزمائی کی تھی، لیکن عمر بازی جیت لے گیا تھا، اور اس کے حصّہ میں صرف جیل کی زندگی آئی تھی، اب وہ کامیاب تھا، اور عمر ناکام

یزید کے ہاتھوں عمر کے بچ جانے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اسے اطمینان، یکسوئی، دلجمعی اور فارغ خاطر کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا،

یہ بڑا نازک زمانہ تھا، حکومت بنو امیہ کا یہ دمِ واپسیں تھا، اس کی قوّت ہشام کے بعد بالکل ختم ہو چکی تھی، حالات تیزی سے بدل رہے تھے، حکمران تیزی سے اپنی جگہیں خالی کر رہے تھے، ۱۲۵ھ میں ہشام رہگیرائے عالم جاودانی ہوا، اب تختِ خلافت ولید کے حصّہ میں آیا، یہ بیچارہ ۱۲۶ھ میں ہلاک ہو گیا، اب یزید بن ولید بن عبدالملک کی باری تھی، یہ بھی بڑے کروفر سے اورنگ نشین ہوا۔ لیکن موت نے مہلت نہ دی، صرف چھ ماہ تک حکومت کی اور مر گیا، اب اس کا بھائی ابراہیم بن ولید مسند آرائے خلافت ہوا تھا، لیکن اسی خاندان کے ایک شخص مروان الحمار نے ابراہیم کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا، اور خود خلیفۃ المسلمین اور امیرالمومنین

بن بیٹھا، اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن ۱۳۲ھ میں نہ صرف اس کا بلکہ سرے سے حکومت بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور اب مسند خلافت پر عباسی متمکن ہو گئے!

انقلاب و تغیّر کی داستان

بنو اُمیہ کا خاتمہ بنو عباس کے عروج کا سبب بنا، یا تو خاندان بنو عباس کے لوگ بنو امیہ کی ستم رانیوں اور دراز دستیوں کے خوف سے روپوش رہتے تھے، یا اب وہی لوگ مسندِ خلافت پر متمکّن ہوئے، اور اموی خاندان کے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے اِدھر اُدھر روپوش ہونے لگے ——— دُنیا کی تاریخ میں اختیار و اقتدار کی عمر بس اتنی ہے، یہ ڈھلتی پھرتی چھاؤں مستقل طور پر کسی کے ساتھ نہیں رہتی، آج اس کے دامن سے وابستہ ہے، کل اس کی کلاہِ افتخار کا طرّہ بن گئی،

نیا بندوبست

ہم کسی دوسری جگہ امویوں اور عباسیوں کی داستان عروج و زوال بیان کر چکے ہیں، یہاں از سرِ نو اس داستان کو چھیڑنا مقصود نہیں، لیکن ربطِ کلام کو جاری اور باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ بیچ بیچ میں اس داستان کے ٹکڑے پیوند کے طور پر کہیں کہیں لگا دیئے جائیں۔

بنو عباس نے جب عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو سب سے پہلے انہوں نے دو باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ کی، ایک تو یہ کہ امویوں کے جملہ مقبوضات تصرّف میں لائے جائیں، دوسرے امویوں کے تمام حکّام و عمّال برطرف کر دیئے جائیں، اور ان کی جگہ ایسے لوگ برسرِ اقتدار کئے جائیں جو فکر و خیال، ذہن و عقیدہ، اور دل و دماغ کے اعتبار سے یکسر جدید ہوں!

اس طرح کے تغیرات شخصی حکومتوں میں ہر بادشاہ کے مرنے اور نئے بادشاہ کے

تخت نشین ہونے کے وقت عمل میں لائے جاتے ہیں، لیکن جب ایک حکومت بدل جائے اور اس کے بجائے ایک بالکل جداگانہ طبیعت اور مزاج اور پالیسی کی حکومت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو، جب تو اس قسم کے تغیرات ضروری اور لابدی ہو جاتے ہیں، بادشاہتوں میں اگر نئے دور میں پرانا ڈھچر چلتا رہے تو کچھ ایسا فرق نہیں آتا، لیکن مملکتوں اور حکومتوں میں جب تبدیلی ہوتی ہے، تو قطعی اور لازمی طور پر "گزشتہ" ختم کر دیا جاتا ہے اور جدید رو بہ عمل آتا ہے!

باغی گورنر کی سندھ پر

چنانچہ امویوں کے خاتمہ اور عباسیوں کے نمود کے بعد بھی یہی ہوا۔

بعض وقت ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں، جو اسباب و علل کے اعتبار سے ناقابل یقین ہوتے ہیں، لیکن واقعات کو جھٹلانا ممکن نہیں اس لئے مجبوراً انہیں ماننا پڑتا ہے۔

اُموی حکومت سے درپردہ اور علی الاعلان جو لوگ برسرِ پرخاش تھے، ان میں ایک شخص منصور بن جمہور کلبی بھی تھا، جب حالات اپنے لئے ناسازگار پائے تو سندھ چلا آیا، سندھ اس لئے آیا کہ یہاں کا والی یزید بن عرار اس کے عزیزوں میں تھا، امید تھی یہ پذیرائی کرے گا، اور اگر ضرورت ہو گی تو پناہ بھی دے گا، لیکن منصور کی فطرت، طینت اور سرشت سے یزید خوب واقف تھا، اس نے بجائے پذیرائی کرنے اور پناہ دینے کے ملنے ہی سے انکار کر دیا، جہاں ہو وہیں ٹھہرے رہو، میرے پاس نہ آنا،

یہ بات منصور کو بہت کھلی، اس نے بے سروسامان ہونے کے باوجود ایک اجنبی سرزمین پر چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کر دیں، اور رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصہ جتھا تیار کر لیا اور پورے عزم و استقلال کے ساتھ یزید سے لڑنے چل کھڑا ہوا۔ یزید کو اس پر

ہنسی آئی کہ منصور اس سے مقابلہ کرنے نکلا ہے، وہ جانتا تھا منصور کی بضاعت اور حیثیت کیا ہے، لیکن کمزور سے کمزور آدمی بھی اگر تلوار کھینچ کر کھڑا ہو جائے تو اسے اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کمزور ہے، چنانچہ بڑھا، اس کے مقابلے کے لئے نکلا، لیکن بے دلی کے ساتھ، ادھر منصور جان کی بازی لگا کر اس جنگ کو جیتنے کا تہیہ کر چکا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ منصور جیت گیا اور یزید کو شکست قبول کرنی پڑی، منصور یزید سے اتنا برہم اور متنفر ہو چکا تھا کہ اس نے نہ صرف یہ کہ اس کی جان بخشی نہیں کی، بلکہ بے دردی اور شقاوت کے ساتھ اسے زندہ دیوار میں چنوا دیا، یزید کی ہلاکت کے بعد منصور کے لئے میدان صاف تھا، وہ بڑے اطمینان کے ساتھ یزید کا جانشین بن گیا اور داد حکومت دینے لگا، اس نے تیزی اور مستعدی کے ساتھ نظم و انتظام پر توجہ کی، اور اس مقصد میں آسانی کے ساتھ کامیاب ہو گیا،

جنگ اور نتیجۂ جنگ

خاندان بنو عباس کو وارث تخت خلافت ثابت کرنے والا، اور اسے بالآخر اس منصب پر فائز کرنے والا صرف ایک شخص تھا، جسے تاریخ ابو مسلم خراسانی کے نام سے جانتی ہے ۱۳۶ھ میں ابو مسلم خراسانی نے عباسی خلیفہ سفاح کی طرف سے خراسان اور ممالک شرقیہ پر قبضہ اور تسلط کا اعلان کر دیا، ہر مقام پر اپنے کسی معتمد علیہ کو بھیجا اور اس نے وہاں پہنچتے ہی نئے بندوبست اور انتظام و انصرام کی داغ بیل ڈال دی، سندھ کی طرف اب تک اس نے کوئی توجہ نہیں کی تھی، اب اس طرف بھی متوجہ ہوا، اور ایک شخص مفلس کو فوجی مدد دے کر روانہ کر دیا جائے، اور وہاں خلیفہ سفاح کے گز اور سکّہ کو جاری کر دے، مفلس اس مقصد کو سامنے رکھ کر حدود سندھ میں داخل ہوا، دیبل کے مقام پر وہاں کے حاکم منظور بن جمہور کلبی سے جو منصور کا چھیتا بھائی تھا ایک زور دار جنگ ہوئی، اس جنگ میں مفلس غالب آیا اور منظور ہلاک ہو گیا، منصور کو بھائی کی ہلاکت کا بہت غم ہوا، وہ

جوش کے ساتھ مغلس سے لڑنے کی تیاری کرنے لگا منصورہ کے پاس ان دونوں کی جنگ ہوئی، اب کی پانسہ اُلٹا پڑا، یعنی منصور جیت گیا، اور عباسی نمائندہ مغلس ہار گیا، منصور بھائی کے غم میں اتنا از خود رفتہ اور دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے ـــــ جیسے ہی مغلس گرفتار کر کے اس کے حضور میں پیش کیا گیا ـــــ فوراً اس کے قتل کا حکم صادر کیا اور اپنے سامنے اس کی جان لے لی۔

کامیاب سازش

لیکن عباسی حکومت کے نمائندہ کا خون بالا بالا نہیں جا سکتا تھا ابو مسلم خراسانی کو جب اس واقعۂ ہائلہ کی اطلاع ملی تو اس نے بہت پیچ و تاب کھایا، اور خلیفہ کی اجازت سے موسیٰ بن کعب کو سندھ کا والی نامزد کر کے روانہ کر دیا،

موسیٰ بن کعب صرف ایک سپاہی نہیں تھا، وہ کارآزمودہ سیاست دان اور مدبر بھی تھا وہ بیس ہزار کا لشکر جرار لے کر سرزمین سندھ پر آ پہنچا لیکن اس نے آتے ہی جنگ نہیں شروع کر دی، حالات کا جائزہ لیا، ایک طرف رعایا کو پرچاتا اور دوسری طرف اصل حریف و مقابل سے دو دو ہاتھ کر لینے کا منصوبہ بناتا رہا۔

ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب موسیٰ منصورہ کے سامنے خیمہ زن ہوا تو وہاں کی فوج بھی اس سے سازباز کر چکی تھی، اور رعایا بھی، منصور کو اس سازش کی کوئی اطلاع نہیں تھی، وہ جنگ کرنے کے لئے نکلا، مقابلہ ہوا، اور ہار گیا، اس نے چاہا کہ منصورہ میں جا کر قلعہ بند ہو جائے، لیکن اگرچہ اس میں اور منصورہ کے پھاٹک میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا، لیکن یہ مختصر سی دوری بھی ہفت خواں سے زیادہ سخت و صعب ہو گئی اب اسے سازش کا پتہ چلا، اس نے ہمت اب بھی نہیں ہاری، ہندوستان کی طرف چل کھڑا ہوا کہ اگر صحیح سلامت وہاں پہنچ گیا تو پھر کبھی دوسرے موقع پر قسمت آزمائی کریگا لیکن حریف شاطر اسے کیوں نکل جانے دیتا، اس نے تعاقب جاری رکھا اور بالآخر اس

کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کے بھائی منظور کا ہوا تھا

موسیٰ کی سیرت موسیٰ فاتح کی حیثیت سے منصورہ میں داخل ہوا تھا، اس نے امن و امان اور نظم و انتظام کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ کی، اور اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا، اس نے شہر کی توسیع و تعمیر کی طرف توجہ کی جس سے آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا، اس نے منصورہ کی مسجد کی توسیع و تعمیر کا فرض ادا کیا، اور اس طرح اسے بھی ایک نئی حیثیت دے دی، بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ موسیٰ کامیاب اور اچھا فرمانروا ثابت ہوا، اس نے رعایا پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ اس کی صلاح و فلاح کی کوشش کی، اس نے حتی الامکان کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا، قضایا کے فیصلہ میں وہ احتیاط برتتا تھا، اور اس کا خیال رکھتا تھا کہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے، وہ اگرچہ ایک نئی حکومت کا نمائندہ تھا، اور محول نظام کے مطابق اسے زور و ظلم کے ذریعہ اپنی دہشت لوگوں کے قلوب پر بٹھانی چاہیئے تھی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس بات کی کوشش کی، اگر اس کا رعب و اثر قائم ہو، تو اس کی بنیاد دہشت پر نہ ہو بلکہ حسن انتظام اور حسن سلوک پر ہو،

مہلک حماقت سنہ ۲۲۱ھ میں نیک نامی کا توشہ لے کر موسیٰ اس دنیا سے مختصر سی علالت کے بعد رخصت ہو گیا، اس کی جگہ اس کے بیٹے عینیہ کو ملی۔

عینیہ کو قسمت نے بڑا اچھا موقع دیا تھا، اگر وہ چاہتا تو اس سے فائدہ اٹھا کر خود بھی عافیت اور راحت حاصل کرتا، رعایا کو بھی آرام اور امن کی دولت دیتا، لیکن وہ اچھے باپ کا بُرا بیٹا تھا، اس میں باپ کی خوبی اور صلاحیتیں نہیں تھیں، وہ حد درجہ ناعاقبت اندیش، کج فہم، خود رائے، اور نااہل تھا، اس کے عہد میں وطنی اور علاقائی عصبیت پھر قوت اور زور کے ساتھ ابھری، وہ اسے دبا نہ سکا، اس نے بہت سے بااثر لوگوں

کو قتل کر دیا، اور اس حرکت سے جب لوگوں میں بے اطمینانی پھیلی، تو اور زیادہ حماقت انگیز اور بیہودہ حرکتوں کا ارتکاب کرنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا میں اس کے خلاف عام بددلی اور بیزاری پیدا ہو گئی۔

دوسری سب سے بڑی اور مہلک حماقت اس سے یہ ہوئی کہ بے اطمینانی، بدگمانی اور خلفشار کی اس فضا میں اسے خود مختار بادشاہ بن جانے کا شوق پیدا ہوا، وہ مرکز خلافت کی اطاعت سے منحرف ہو گیا اور سندھ کا غیر مسنون فرماں روا بن بیٹھا، اور اپنے دل میں مطمئن ہو گیا کہ اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا،

ابن حفص

کسی عامل یا والی کی بغاوت اور سرکشی وہی حکومت برداشت کر سکتی ہے جو ہر اعتبار سے کمزور اور فرومایہ ہو، جس میں زندہ رہنے کی سکت نہ رہ گئی ہو اور جو لب گور پہنچ چکی ہو، عباسی حکومت ابھی ابھی اُبھری تھی، اس میں قوت تھی، طاقت تھی، ولولہ تھا، اُمنگ تھی، عینیہ کی بغاوت اور سرکشی کی اطلاع جب مرکز خلافت میں پہنچی تو فوراً اس کے تدارک کا انتظام کیا گیا، اور ابن حفص کو سندھ کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے روانہ کیا گیا، یہ ابن حفص بڑا جہاندیدہ کارآزمودہ اور صائب الرائے تھا، اس کی بہادری اور مردانگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔

پہلے تو عینیہ نے ابن حفص سے لڑائی کی ٹھانی لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ بازی کسی طرح سر نہیں ہو سکتی، کیونکہ فوج بھی ساتھ دینے سے جی چرا رہی تھی، اور رعایا بھی بیزار تھی، جس فرماں روا سے فوج اور رعایا دونوں بیزار ہوں اس کے نصیب میں شکست و ہزیمت کے سوا کیا آ سکتا ہے؟

آخر جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو عفو اور صلح کا خواہاں ہوا، ابن حفص نے اسے گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دیا، لیکن راستہ میں کسی طرح بچ نکلا، ابھی آزادی کی

ہوا میں زیادہ دیر تک سانس نہیں لینے پایا تھا کہ پیام اجل آ پہنچا اور وہ ہلاک کر دیا گیا!

حضرت عبداللہ الاشتر

ابن حفص نے بہت شان اور رعب و داب کے ساتھ حکومت کی، وہ کئی برس تک سندھ کا گورنر رہا، لیکن رعایا کو، اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی، وہ عدل و نظم دونوں کا خیال رکھتا تھا، طبعاً سفاک اور ظالم نہیں تھا۔ لہٰذا رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا تھا،

ابن حفص سے ایک غلطی ضرور ہوئی، یعنی اس نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ مفتوحہ اور مقبوضہ سندھ پر عدل اور رواداری کے ساتھ حکومت کرتا رہے، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی، لیکن اس کی یہ بات خلافت کو پسند نہ آئی اور اسے الگ کرنے کے منصوبے تیار ہونے لگے، اسی اثنا میں خاندان رسولؐ کے ایک محترم فرد، عبداللہ الاشتر سندھ میں پہنچے، ابن حفص ان سے سادات کا احترام کرتا تھا، اس نے نہ صرف یہ کہ ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اعزاز و اجلال کے ساتھ ایک پڑوسی ہندو راجہ کا مہمان بنا دیا۔ اس طرح حضرت عبداللہ الاشتر کی جان تو بچ گئی لیکن یہ بات خلیفہ منصور کے کان تک پہنچی، وہ ابن حفص کے کمالات سے بھی واقف تھا، اس لئے اس سے بگاڑنا بھی نہیں چاہتا، اس نے حکمتِ عملی سے کام لیا، ایک شخص ہشام کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیج دیا، اور ابن حفص کا وہاں سے تبادلہ کر کے افریقہ کا گورنر بنا دیا، ابن حفص کو یہ حکم ماننا پڑا!

حضرت عبداللہ کی شہادت

ہشام کو چلتے وقت منصور نے ہدایت کی کہ جس طرح بھی بنے وہ حضرت عبداللہ الاشتر کو گرفتار کر کے قتل کر دے، اور اگر ہندو راجہ مزاحم ہو تو اس سے بھی فیصلہ کن جنگ لڑنے میں تامل نہ کرے۔

ہشام سندھ پہنچا، لیکن عبداللہ کے بارے میں تامل مثول سے کام لیتا رہا، کیونکہ

ابن حفص کی طرح وہ بھی خاندان رسالت کا پروانہ تھا، لیکن اس کا بھائی سفیح دوسری طبیعت کا تھا، اس نے موقع پا کر ایک مرتبہ حضرت عبداللہ کو جب وہ صرف دس سواروں کے ہمراہ شکار کو نکلے تھے شہید کر دیا، حضرت بہت بہادری سے لڑے لیکن فوج کے پورے دستہ سے کہاں تک لڑتے؟ اس واقعہ کا ہشام کو بہت صدمہ ہوا، لیکن بھائی کو خلیفہ منصور کے اثر سے کچھ نہ کہہ سکا، ۱۵۱ھ کا یہ واقعہ ہے، کچھ دنوں بعد حضرت عبداللہ کے صاحبزادے محمد، اور ان کی والدہ محترمہ کو خلیفہ کے حسب طلب بغداد بھیج دیا گیا، منصور نے اس لٹےہوئے قافلہ کو اپنے پاس نہ رکھا، اہل بیت اطہار کے پاس مدینہ منورہ روانہ کر دیا، اس کا اصل مقصد حاصل ہو چکا تھا، لہٰذا اب اس نے مناسب نہ سمجھا کہ دکھیاری خاتون اور یتیم بچہ کو ستائے،

ملتان کا الحاق ماسبق صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ خانہ جنگی اور داخلی افراتفری کے زمانہ میں سندھ کی سالمیت ختم ہو گئی تھی، اور ملتان نے سندھ سے کٹ کر اپنا جداگانہ وجود پھر سے قائم کر لیا تھا، یہ بات ان تمام والیوں کو کھٹکتی رہی جو محمد بن قاسم کے بعد یہاں مامور ہو کر آئے، لیکن ہشام نے اس سلسلہ میں کامیاب عملی اقدام کیا، اور ملتان فتح کر لیا، ملتان فتح کرنے میں کافی دشواری پیش آئی، کیونکہ وہاں کے لوگ لڑنے مرنے کے لئے تیار تھے، لیکن بالآخر یہ معرکہ سر ہو گیا، بہت سے قیدی گرفتار ہوئے اور کافی مال غنیمت ہاتھ آیا، آس پاس کے چند اور مقامات جو موقع محل دیکھ کر بغاوت اور سرکشی کو اپنا شعار بنا بیٹھے تھے، زیر ہو گئے، اس طرح اندرونی استحکام و دفاع کے مقصد میں ہشام نے کامیابی حاصل کر لی، اور اطمینان سے حکومت کرنے لگا، فتح ملتان کا ایک اچھا ثمر یہ ملا کہ ہندوستان کا راستہ کھل گیا، اور یہاں سے مختلف اطراف میں فوجیں بھیجنے میں سہولت حاصل ہو گئی!

بھروچ پر حملہ اور فتح بھروچ (رجواب صوبہ بمبئی کا ایک حصہ ہے) ابھی مسلمانوں کے

زیر نگیں آگیا،

یہاں کے راجہ نے بھی داہر کی طرح اکڑ دکھائی، ہشام کو موقع ہاتھ آگیا، وہ ایک مضبوط فوج لے کر بڑھا اور بھروچ کی مشہور بندرگاہ گندھار پر ایک خونریز جنگ کے بعد قابض ہو گیا، عربوں کا بحری تفوق ایک ایسی حقیقت تھی، جس کا انکار صرف شکست اور ہزیمت ہی کی صورت میں رونما ہوا کرتا تھا۔

عام طور پر معمول یہ تھا کہ فتح کے بعد فاتح مفتوحہ مقام پر زیادہ قیام نہیں کرتا تھا مفتوحہ علاقہ اپنے کسی ماتحت کے سپرد کرتا تھا، اور خود اپنے مرکز پر واپس آجاتا تھا، لیکن ہشام گندھار میں کافی عرصہ تک مقیم رہا، اس نے منصورہ کا رخ بھی نہیں کیا، جب حالات سدھر گئے، انتظام درست ہو گیا، معاملات رو براہ ہو گئے، تب وہ وہاں سے رخصت ہو کر منصورہ واپس آیا۔

ہشام نے بڑی کامیابی کے ساتھ سندھ پر حکومت کی، اس نے اپنے حسن انتظام فراست اور معاملہ فہمی سے ایک طرف تو سندھ کے عوام کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا، دوسری طرف مرکز خلافت کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حوصلہ مند بھی تھا، اس نے ملتان کا الحاق کر کے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، باغیوں اور سرکشوں کا اس نے زور توڑ دیا تھا، خلیفہ منصور بھی اس کے ان کارناموں سے بہت خوش تھا، اس نے براہ راست معاملات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے سندھ سے ایک وفد طلب کیا جو برہمنوں اور پنڈتوں نیز اصحاب علم پر مشتمل تھا، اس وفد سے منصور نے تفتیش کی، معلومات حاصل کئے، وفد والوں نے بھی ہشام تغلبی کے حسن انتظام، عدل و فراست اور معاملہ فہمی و رواداری کی بے حد تعریف کی، خلیفہ منصور ہشام کے کارناموں سے اتنا متاثر اور مسرور ہوا کہ اس نے سندھ کی گورنری کے ساتھ

ساتھ کرمان کی ولایت بھی اسے سونپ دی۔

۱۵۷ھ میں ہشام وطن واپس گیا، سب سے پہلے وہ خلیفہ کے حضور میں باریاب ہوا اس نے خلیفہ کی خدمت میں ایسے بیش بہا اور نادر تحائف پیش کیے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکتا اور فرد تھے، خلیفہ بہت خوش ہوا، خلیفہ اس سے اتنا خوش تھا کہ اس کے خلاف سازش کرنے کی کسی میں ہمت نہیں پڑی، حالانکہ یہ دور صرف سازشوں ہی کا تھا، لوگوں کا عروج وزوال ترقی اور تنزل سب چیزیں سازش ہی کے ماتحت بروئے کار آتی تھیں، لیکن ہشام کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ خلیفہ منصور کے سامنے باغی مجلسوں اور صحبتوں میں ممکن نہ تھا کہ ہشام کے خلاف لب کشائی کی جا سکے،

لیکن اس اقبال مندی اور عروج وکامرانی کے باوجود عمر کا پیمانہ جلد لبریز ہو گیا وہیں بیمار پڑا، اور تھوڑی مدت بیمار رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا، نہ جانے کیا کیا امیدیں ہوں گی، حوصلے ہوں گے، آئندہ کے فتوحات کے پروگرام ہوں گے، لیکن موت کی آمد نے سارا معاملہ ختم کر دیا، اس کے ساتھ اس کی حوصلہ مندیاں اور فیروز مندیاں بھی دفن ہو گئیں،

۱۵۷ھ میں ہشام تغلبی نے وفات پائی، اس کے بعد تابڑ توڑ سندھ کے والی بدلتے رہے، اس اثنا میں کئی والی آئے اور گئے، بغداد کے مرکز خلافت میں بھی تغیر ہوا، منصور کا انتقال ہو گیا، پھر مہدی تخت نشین ہوا، وہ بھی وفات پا گیا، ہادی سریر آرائے خلافت ہوا، یہاں تک کہ اس نے بھی وفات پائی اور ہارون الرشید مسند خلافت پر متمکن ہوا، یہ آٹھ نو سال کی مدت منصورہ اور بغداد کے انقلابات ہی کی نذر ہوتی رہی، یہ زمانہ اگرچہ یکسر بے اطمینانی اور پریشانی میں بسر ہوا، لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا

کہ اس عرصہ میں کامیابی نہیں ہوئی، یا کوئی نمایاں کام انجام نہیں پاسکا،

تبلیغی جدوجہد خلیفہ مہدی نے اپنے دورِ خلافت میں اکثر بادشاہوں، راجوں اور مہاراجوں اور فرماں رواؤں کو خطوط لکھ کر قبولِ اسلام کی دعوت دی، یہ دعوت نامے لے کر جو لوگ گئے، وہ اسلام کے رمز شناس اور تعلیمات و فقہ اسلام کے ماہر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دعوت نامے بے اثر اور بے نتیجہ نہیں رہے، تقریباً ۱۵ فرمانرواؤں نے اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل کی، ان میں کئی راجہ بھی تھے، ایک سندھ کا راجہ تھا، دوسرا ہندوستان کا ایک مہاراجہ تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ راجہ پورس کے خاندان کا ایک فرد تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ راجہ صوبہ سرحد یعنی پشاور کا فرماں روا تھا)!

۱۵۷ھ سے ۱۶۴ھ تک سندھ کے والی بار بار نااہلی، بدانتظامی، اور نالائقی کے باعث بدلے گئے، عاملی عصبیت میں بھی اضافہ ہوا، حجازیوں اور یمنیوں کی رقابت نے بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر لی، جس سے سندھ کا داخلی امن و امان خطرہ میں پڑ گیا، والی چونکہ نااہل اور بدانتظام ہوتے تھے، اس لئے اس شورش کا سدِباب کرنے میں بھی ناکام رہے، یہ اتنی خطرناک اور مہلک چیز تھی، کہ اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا جاتا، تو یہ اپنی لپیٹ میں سارے عالمِ اسلام کو لے لیتی، خلیفہ مہدی نے اس طرف توجہ کی اور ۱۶۴ھ میں اپنے ایک معتمد اور وفادار غلام لیث بن ظریف کو سندھ کی ولایت پر مامور کیا اور تاکید کی کہ سندھ کے انتظامات بحال کرنے کی جدوجہد کرے، داخلی شورش کا خاتمہ کرے اور قبائلی عصبیت جو جڑ پکڑتی جاری ہے اس کا سدِباب کرے تاکہ امن و امان میں پھر کوئی عنصر حارج نہ ہو سکے،

لیث اپنے آقا خلیفہ مہدی کا صرف ایک اطاعت شعار اور وفادار غلام ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک اچھا سپاہی، ایک دور اندیش سیاست داں، ایک معاملہ فہم مدبر بھی تھا، شروع میں تو وہ وہاں کے حالات پر قابو نہ پا سکا، اور کافی زحمتوں اور پریشانیوں سے دو چار رہا، لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی، ۱۶۵ھ میں اس نے خلیفہ مہدی کو صورت حالات کی سنگینی سے مطلع کیا، خلیفہ اگرچہ حج کے لئے چل پڑا تھا، لیکن راستہ ہی (بصرہ) میں اس نے ایک فوج مرتب کی، اور اسے لیث کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ جب یہ فوج لیث کے پاس پہنچ گئی تو اس کے ہاتھ مضبوط ہو گئے، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ہر قیمت پر اس فتنہ کا استیصال کر کے رہے گا،

لیث بن ظریف نے پہلے تو اس کی کوشش کی تھی کہ نرمی اور ملاطفت سے کام چل جائے، لیکن جب دیکھا کہ یوں کام نہیں چلتا اور کمک کے لئے مہدی نے ایک فوج بھی بھیج دی ہے تو اس نے فوراً مارشل لا نافذ کر دیا اور بڑی سختی سے اس فتنہ کو کچل دیا، جس کی طرف سے ذرا سرکشی یا بغاوت کا ظہور ہوا، اس کی گردن اڑا دی گئی اس نے اس کی پروا نہیں کی کہ بغاوت کرنے والے اور زد میں آنے والے لوگ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، قبائلی ذہنیت کے ماتحت برسر پیکار ہیں، یا دین اور دھرم کے نام پر ہتھیار اٹھا رہے ہیں، جو بھی سامنے آیا اس کا مقابلہ کیا گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

لیث کی اس سختی اور انتظام نے بہت جلد حالات پر قابو پا لیا، بالکل امن وامان قائم ہو گیا، ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہاں کبھی قسم کی شورش اور فتنہ کا ظہور ہی نہیں ہوا تھا، لیث کی پالیسی کا باغی مقابلہ نہ کر سکے، یا تو انہوں نے توبہ کی اور اطاعت کا حلقہ گلے میں ڈالا، یا پھر ترک اقامت کر کے کہیں اور روپوش ہو گئے،

ہارون الرشید نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد ایک شخص سالم یونس کو ولایت سندھ پر مامور کیا،

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔!

شخصی حکومتوں میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، نیا بادشاہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اپنے سے پہلے کے لوگوں کے کارناموں اور صلاحیتوں کو دیکھ کر کوئی لائحہ عمل تیار کرے، وہ تخت پر بیٹھتے ہی اس فکر میں ہو جاتا ہے کہ جس طرح بھی بنے اپنے حوالیوں موالیوں کو نوازے اور انہیں بام عروج پر پہنچا دے، خواہ اس سلسلہ میں کوئی اہل ترین شخص محروم ہو جائے، اور کوئی نااہل ترین شخص فائز المرام ہو جائے!

سالم کو چونکہ لیث بن طریف کی قائم کی ہوئی با امن حکومت ملی تھی، اس لئے وہ اطمینان سے حکومت کرتا رہا، لیکن ۱۷۴ھ میں اسحاق کو یہ منصب ملا، انہیں موت نے مہلت نہ دی۔

اب ایک شخص طیفور کو ہارون نے یہ منصب سونپا

طیفور، حمیری (یمنی) قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کے آتے ہی حمیریوں (یمنیوں) کی ہمت بڑھ گئی، انہوں نے سوچا، اب ولایت اس شخص کے ہاتھ میں ہے، جو ہمارا ابن عم ہے ہمارا عزیز ہے، ہمارا خاص آدمی ہے، ان کے اندر پھر ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوا، انہوں نے پھر شورش اور سرکشی پر کمر باندھی اور نزاریوں (حجازیوں) پر ظلم و تعدی کا سلسلہ شروع کر دیا!

بدقسمتی سے صورتِ حال یہ تھی کہ نزاریوں (حجازیوں) کی تعداد بہت زیادہ تھی! اور حمیری (یمنی) بہت کم تھے، لہٰذا نزاریوں کے دل میں خیال پیدا ہوا، ہم جب تعداد میں زیادہ ہیں تو ایسے والی کو کیوں قبول کریں، جو ایک دوسرے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے؟ اس

نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا، ایک طرف کثرتِ تعداد تھی، دوسری طرف حکومت کا غرہ! نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی عصبیت کی آگ پھر زور شور سے بھڑک اٹھی، نزاریوں اور حمیریوں میں خوں ریز جنگ شروع ہو گئی، طیفور کی عصبیت بھی رنگ لائی، وہ بھی حمیریوں کا ساتھ دینے لگا اور نزاریوں کو دبانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہو گیا، حالات زیادہ سے زیادہ نازک ہو گئے!

خلیفہ ہارون کو جب ان حالات کی اطلاع ملی، تو اس نے ایک شخص جابر بن اشعث کو یہ منصب سونپا، اور سندھ کے ساتھ ساتھ مکران کی ولایت بھی اسے بخش دی، لیکن اس نوازش بے پایاں کے باوجود جابر سے بھی یہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہو سکا، آگ بھڑک چکی تھی، اور بڑھتی چلی جا رہی تھی، جابر کی تدبیر اس آگ کو سرد نہ کر سکی، مرکز خلافت سے، جو سہولتیں اسے حاصل تھیں، ان کے باوجود وہ سربر نہ ہو سکا، اور اس فتنہ کو کسی طرح دبانے میں کامیاب نہ ہو سکا،

اب ہارون نے ایک اور تجربہ کیا، اس نے سعید کو یہ ذمہ داری عطا کی، وہ اتنا سہل انکار تھا کہ اپنے بھائی کثیر کو نائب بنا کر بھیج دیا، کثیر بجائے اس کے وہاں کا انتظام درست کرتا، قبائلی عصبیت کو ختم کرتا رنگ رلیوں میں پڑ گیا، ایک اور شخص عیسیٰ بن جعفر والی بنایا گیا، لیکن اس نے بھی نقل و حرکت میں اپنی توہین سمجھی، خود تو اپنی جگہ بیٹھا رہا اور محمد بن عدی کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیج دیا، محمد بن عدی نالائقی اور نااہلیت میں سب سے بازی لے گیا، اس کے عہد میں خانہ جنگی اور داخلی شورش بہت زیادہ بڑھ گئی، بلکہ اس کی بے دقوفی اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت یہ عصبیت کی آگ جو اب تک منصورہ اور سندھ میں بھڑک رہی تھی، لیکن ابھی یہاں سے باہر اس نے قدم نہیں نکالا تھا، اب ملتان تک پہنچ گئی خلیفہ نے تنگ آ کر اسے ہٹایا تو عبدالرحمٰن کو آگے بڑھایا، لیکن یہ بھی کچھ نہ کر سکا، بے بسی

کے ساتھ حالات کو اور زیادہ ابتر ہوتے دیکھتا رہا، آخر یہ بھی معزول ہوا، اور ایوب بن جعفر کے دوش ناتواں پر یہ بارگراں رکھا گیا، لیکن حالات جب بگڑتے ہیں تو آسانی سے نہیں سدھرتے، بلکہ اور زیادہ بگڑتے چلے جاتے ہیں، ایوب بھی اس آگ کو فرو نہ کر سکا،

یہ مسئلہ اب خلیفہ ہارون الرشید کے لئے ناقابل برداشت درد سر بن گیا تھا، آخر کامل غور و خوض کے بعد اس نے آل مہلب میں سے ایک نہایت موزوں اور مناسب شخص داؤد بن یزید کا انتخاب کیا، اور اسے سندھ، مکران کی ولایت پر مامور کر کے بھیج دیا، یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے،!

داؤد کا شاندار دور

داؤد خاندان مہلب کا ایک فرد تھا، اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو ایک مدبر حکمران میں ہونی چاہئیں سخت مزاج بھی تھا اور نرم دل بھی، عفو و رحمت کے لطف سے بھی آشنا تھا، اور تعزیر و انتقام سے کام لینا بھی جانتا تھا، اس نے طویل مدت تک حکمرانی کی، اور ہر اعتبار سے اس کا دور شاندار اور یکتا رہا۔

شروع میں داؤد نے بھی وہی رویہ اختیار کیا جو اس کے بعض پیش رو اختیار کر چکے تھے، یعنی خود تو اپنی جگہ بیٹھا رہا، اپنے بھائی مغیرہ کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا، لیکن مغیرہ سے یہ بارگراں نہ اٹھ سکا، وہ سندھ پہنچا، ملاطفت اور درشتی، فوجی قوت اور سیاست ہر طرح اس نے کام نکالنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا، نزاری (حجازی) اپنی کثرت تعداد کی بنا پر بہت سر اٹھا رہے تھے، انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یمنیوں کو (قحطانی) نکال باہر کر دیں گے، اور سارے ملک (سندھ) پر اپنا تسلط قائم کر لیں گے، مغیرہ کو انہی نزاریوں سے سر بر ہونا تھا، آخر نوبت جنگ تک پہنچی اور مغیرہ بری طرح ہارا،

داؤد کو جب مغیرہ کی شکست کی خبر ملی، تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا، اور کافی فوجی تیاریوں کے ساتھ سندھ میں داخل ہوا، اس نے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ اب سختی کے بغیر کام نہیں چلے گا

چنانچہ اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی نزاریوں (حجازیوں) کی دار و گیر کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کو راہ اطاعت سے ذرا منحرف پایا، اس کا سر قلم کر دیا۔ اسے ایسی سزا دی جو دوسروں کے لئے دہشت ناک اور عبرت انگیز ثابت ہوئی،

داؤد کے کارنامے

منصورہ جو سندھ کا پایۂ تخت تھا، اور جو گویا نزاریوں کے قبضہ اور تصرف میں تھا، میدانِ جنگ بنا، یہاں بڑی خونریز جنگ ہوئی، نزاریوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، بیس روز تک جنگ جاری رہی، مگر کسی طرح بھی ہر طرح کے شدید اور مہلک نقصانات اٹھانے کے باوجود نزاری نہ اطاعت پر مائل ہوئے، نہ صلح و مفاہمت پر، آخر بہت دشواری کے بعد داؤد کامیاب ہوا، اس نے منصورہ فتح کر لیا، منصورہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے نزاریوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا، اس نے نزاریوں کے گھر کھود ڈالے، ان کے محلوں کو زمین کے برابر کر دیا، ان پر آب و آذوقہ بند کر دیا، انہیں مجبور کیا کہ وہ یہاں سے نقل مکان اور ترک اقامت ہی کو آخری چارۂ کار تصور کریں، اور ایسا ہی ہوا بھی، ان حملوں اور شدتوں کی تاب نزاری نہ لا سکے اور وہاں سے جلاوطن ہو گئے، نزاریوں کے جاتے ہی حالات درست ہوئے اور آئے دن کی چپقلش اور ہنگامہ آرائی کا خاتمہ ہو گیا، یا تو یہ کیفیت تھی کہ کوئی دن شورش اور فتنہ سے خالی نہیں جاتا تھا یا یہ حال ہوا کہ لوگ فتنہ اور شورش کا نام بھول گئے، بہت دنوں کے بعد امن اور عافیت کی نعمت انہیں ملی تھی، اس سے انہوں نے فائدہ بھی اٹھایا، اور اس کی قدر بھی کی،

ٹھکر کا انجام

منصورہ کا انتظام درست کر کے اور پایۂ تخت کی طرف سے مطمئن ہو کر داؤد نے اطراف سندھ اور اندرون سندھ کی طرف توجہ کی، اندرون سندھ میں بھی نزاری موجود تھے، اور جہاں بھی تھے برابر فتنہ اور شورش کی آگ

بھڑکانے میں لگے رہتے تھے، انہوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ نہ خود چین سے بیٹھینگے نہ سندھ کے حاکم اور والی کو اطمینان سے حکومت کرنے دیں گے، یہ دُوسرے عرب قبائل کا نہ اقتدار برداشت کرسکتے تھے، نہ اثر و نفوذ، یہ صرف اپنی بڑائی کے قائل تھے اور خود ہی انتظام و انصرام مملکت کے ذمہ دار رہنا چاہتے تھے، داؤد نے ہر جگہ ان کی سرکوبی کی، ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور اس وقت تک دم نہیں لیا، جب تک ان کا فتنہ بالکل ختم نہیں ہو گیا۔ ان معرکہ آرائیوں میں کوئی شبہ نہیں۔ بہت سے لیعنی ہزار ہا ہزار عرب (نزاری) ہلاک ہوئے، اور یہ ایک رلی منیاع تھا، لیکن مُلک کا امن و امان ہر حالت میں مقدم تھا نرمی اور ملاطفت سے یہ اور زیادہ شیر بنتے تھے، سختی اور درشتی کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے، مقابلہ جب ہوتا ہے، تو پھر دو میں سے ایک کو ہارنا اور مغلوب ہونا ہی پڑتا ہے، چنانچہ انہوں نے داؤد سے ٹکر لی، اور اس ٹکر کا انجام یہ ہوا کہ بُری طرح ہارے اور زیادہ سے زیادہ جانی و مالی نقصان اُٹھایا،

داؤد کی حکمت عملی

داؤد کے اس طرزِ عمل نے نہ صرف مُلک کا داخلی امن و امان بحال کر دیا، بلکہ اُس کی دہشت بھی ان تمام لوگوں پر بیٹھ گئی، جو فتنہ و شورش سے دلچسپی رکھتے تھے، نہ صرف ان لوگوں پر۔ بلکہ ان حکمرانوں اور راجوں پر بھی جو اطراف سندھ میں بدستور اطمینان و عافیت کے ساتھ حکومت کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ محسوس کرلیا کہ اب تک وہ حسبِ موقع جو چھیڑ چھاڑ سندھ کی مسلم حکومت کے ساتھ کیا کرتے تھے اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ مادی و سیاسی حاصل کر لیتے تھے، لیکن اب داؤد کے دور میں اس کی قوت و طاقت کا مظاہرہ (جو اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں کے ساتھ ہوا تھا) دیکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑجائیں، اور یہ خود مختاری اور آزادی ہی افسانۂ پارینہ بن جائے، یہ سوچ کر انہوں نے ایک طرف تو چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ یک لخت بند کر دیا، دوسری طرف کوشش کی کہ سندھ کی اسلامی

حکومت سے ان کے دوستانہ تعلقات و روابط مستحکم ہوں، اب وہ یہ خواب نہیں دیکھ رہے تھے کہ سندھ پر قابض ہو جائیں گے، اب وہ یہ امید کر رہے تھے کہ اگر کبھی کوئی نازک گھڑی آئی اور وہ کسی مصیبت میں پھنسے تو تعلقات اچھے اور دوستانہ ہونے کی صورت میں وہ داؤد کی امداد و اعانت پر بھروسہ کر سکیں گے،

داؤد کی شخصیت داؤد کے حسن انتظام اور اعتماد خاص و عام کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کی جان کے تحفظ اور سلامتی کے معاملہ میں بھی اس سے مدد لی جاتی تھی، خلیفہ ہارون الرشید بڑا آزاد خیال اور وسیع المشرب آدمی تھا، اس کے دربار میں جہاں ابن بختیشوع جیسا طبیب کامل موجود تھا جس کا مذہب عیسائی تھا، اور جو بغداد کے بیمارستان کا گویا ڈائرکٹر جنرل تھا، وہاں گنگا اور منکہ نامی وید بھی تھے، سندھ سے جنہیں داؤد نے بھیجا تھا، اور جو ہندو مذہب پر عامل ہونے کے باوجود خلیفہ ہارون الرشید کے منظور نظر اور مقرب بارگاہ تھے، اس لئے کہ وہ علم فضل، کمال و ہنر، قابلیت اور اہلیت کا قدردان تھا، اور ان معاملات میں جتنا خود اسلام روادار ہے، اتنا ہی ہارون الرشید بھی تھا،!

داؤد اگرچہ سندھ میں بیٹھا تھا، لیکن اس کی شخصیت بغداد میں بھی ہر طرح جوڑ توڑ سازش اور دراندازی کے باوجود اتنی معزز اور محترم تھی، جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا، ہر طرح کے اقتدار کے باوجود نہ کبھی اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ مرکز خلافت سے بغاوت کرے، اور من مانی کارروائیاں کرنے لگے، نہ کبھی اس نے یہ سوچا کہ اپنے اختیار سے جتنا زیادہ سے زیادہ اور ناجائز سے ناجائز فائدہ حاصل کر سکتا ہے کر لے، اور اپنے گھر کو سیم و زر سے بھر لے، اس نے کبھی بھی اپنے معیار کو پست نہیں ہونے دیا، اپنی شخصیت اور کردار پر آنچ نہیں آنے دی،

داؤد کی خصوصیت داؤد کو ہارون نے سندھ کی ولایت عطا کی تھی، پھر ہارون کے

بعد امین اور مامون میں خانہ جنگی شروع ہوئی یہ بڑا کٹھن اور نازک دور تھا، داؤد نے بڑے حزم و احتیاط، وقار اور دور اندیشی کے ساتھ اس زمانہ کو گذارا، پھر امین کے قتل کے بعد مامون کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آئی، اور اس نے عام دستور زمانہ کے مطابق بہت ردو بدل عمالِ حکومت میں کیا، کسی کی ترقی کسی کی تنزلی، کسی کی علیحدگی، لیکن ہم دیکھتے ہیں اس زمانہ میں بھی داؤد کے وقار پر کوئی حرف نہیں آیا، وہ بدستور اپنے منصب پر فائز رہا، اور سندھ کے نظم ونسق میں اصلاح وتعمیر کی اس نے جد وجہد شروع کی تھی، کامیابی کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا رہا، وہ اگرچہ بادشاہ نہیں تھا، صرف گورنر تھا، اسے علم تھا، یہ عہدہ ہر وقت ختم ہو سکتا ہے، لیکن نہ اس میں بد دیانتی پیدا ہوئی، نہ بد دلی، وہ یکسوئی، انہماک اور دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا، یہی وجہ ہے کہ جتنی عزت اس کی سندھ میں تھی، اتنی ہی بغداد میں بھی تھی۔

بشر بن داؤد

۲۰۵ھ میں تقریباً بیس سال تک شان اور جلال کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد داؤد کا انتقال ہو گیا

داؤد نے اس انداز میں حکومت کی تھی کہ اس کے بعد خلیفہ مامون نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کے بیٹے بشر کو باپ کی جگہ عنایت فرمائے، چنانچہ بشر اس منصب پر فائز ہو گیا اور حکومت کرنے لگا،

چند سال تک یعنی ۲۱۲ھ تک بشر کا اندازِ حکومت کم از کم مرکزِ خلافت کے لئے موجب تشویش نہیں ہوا، لیکن پھر اس نے بغاوت کر دی، اب یہ ناممکن تھا کہ خلافت اپنے ایک مقبوضہ کو یوں ہی اپنے ہاتھ سے کھو دیتی، چنانچہ ۲۱۳ھ میں مامون کے حکم سے غسان بشر کی سرکوبی کے لئے سندھ پہنچا، بشر نے جنگ نہیں کی: اطاعت قبول کر لی،

۲۱۶ھ میں غسان بغداد واپس پہنچا، بشر بھی ساتھ تھا، لیکن غسان کی سفارش بارگاہ خلافت میں مقبول ہوئی، اور بشر سے نہ کسی قسم کی باز پرس ہوئی نہ سزا دی گئی، بلکہ اسے

انعامات اور نوازشوں سے مالا مال کیا گیا،

موسیٰ برمکی عسان کے واپس آجانے کے بعد موسیٰ برمکی سندھ کا والی ہوا، اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ تھا کہ ایک پڑوسی راجہ بالا کا سرِ غرور جھکایا، یہ بڑا بد دماغ اور مغرور راجہ تھا، عسان نے بھی اس نے چھیڑ چھاڑ کی تھی، لیکن وہ ٹال گیا، موسیٰ نے اسی وقت یہ بات دل میں رکھ لی تھی، بر سرِ اقتدار ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے راجہ سے جنگ کی، اور اسے اس کے غرور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا،

موسیٰ کا شاندار دور موسیٰ برمکی اگرچہ ایک نومسلم خاندان کا فرد تھا، لیکن اسلام کی ثقافت نے اس پر کچھ اس طرح صیقل کر دی تھی کہ وہ بہت جلد ایک خوبصورت اور ترشا ہوا ہیرا بن گیا، اس نے اپنی ذمہ داریاں بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیں کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا، مرکزِ خلافت سے وفادارانہ تعلقات استوار رکھے، داخلی امن دامان بھی قائم رکھا، اور عوام پر سختی بھی نہیں کی، لیکن اگر کسی نے سر اٹھایا تو اس نے اسے پامال کرنے میں دیر بھی نہیں لگائی، اس کے عہد میں دربارِ خلافت میں دس لاکھ درہم خراج سندھ کی طرف سے بھیجا جاتا تھا، یہ بہت بڑی رقم تھی اور مخصوص انتظام کا کرشمہ تھی، اس میں کبھی زیادتی، ظلم اور جور کا دخل نہیں تھا، موسیٰ برمکی کے زمانہ میں سندھ کی برآمد بھی بڑھ گئی، کئی چیزیں باہر برآمد ہوتی تھیں اور اس طرح اقتصادی بہتری کا ایک نیا اور کامیاب دور شروع ہو گیا تھا

عمران بن موسیٰ ۲۲۱ھ میں موسیٰ وفات پاگیا، اب تختِ خلافت پر معتصم باللہ متمکن تھا، کیونکہ ۲۱۸ھ میں مامون الرشید بھی سفرِ آخرت کر چکا تھا، معتصم موسیٰ سے خوش تھا، اس نے موسیٰ کے بیٹے عمران برمکی کو ولایت سندھ سونپ دی،

باپ کی طرح عمران بھی فرض شناس، دُور اندیش، معاملہ فہم اور کار گذار آدمی تھا،
اس کے برسر اقتدار ہونے وقت حسب معمول پھر بغاوتیں اور شورشیں شروع ہو گئیں، جاٹوں نے
سر اٹھایا، بُری طرح پسپا ہوئے، اور حلقۂ اطاعت گلے میں ڈال لینے پر مجبور ہو گئے، اسی
زمانہ میں نزاریوں نے بھی اپنی بکھری ہوئی فوجوں کو مجتمع کرنے کی چپکے چپکے کوششیں شروع
کر دیں، داؤد نے انہیں کچل دیا تھا، اور بظاہر یہ ختم ہو گئے تھے، لیکن انہیں اپنی بربادی
اور تباہی کا احساس تھا، موقع کے منتظر تھے، اور اس تاک میں تھے کہ اپنا بکھرا ہوا شیرازہ
کسی طرح پھر سے مجتمع کریں، تاکہ سندھ پر حکمرانی اور بادشاہت کا دیرینہ خواب شرمندۂ
تعبیر ہو سکے، لیکن چونکہ عمران بڑا چوکس فرماں روا تھا اس لئے کوئی خطرناک صورت اس کی
زندگی میں رونما نہ ہو سکی، اور وسیع پیمانہ پر کشت و خون یا ہنگامہ آرائی اور شورش کی
نوبت نہ آسکی، اور مملکت کسی داخلی بدنظمی یا نظم و نسق کی ابتری میں مبتلا نہ ہو سکی!

عمران کا قتل

سنہ ۶۲۶ھ میں نیک نامی کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد عمران اس دنیا سے
رخصت ہو گیا، اس کے بعد دربار خلافت نے عتبہ نامی ایک شخص کا تقرر
کیا، یہ بھی معاملہ فہم اور دُور اندیش شخص تھا، اس نے خوبی اور اہتمام کے ساتھ اپنے دورِ حکومت
کا آغاز کیا، اور اس فہم سے اپنے دورِ حکومت کا انتظام کیا کہ لوگ مطمئن ہو گئے اور کاروبار
حکومت عافیت کے ساتھ چلتا رہا،

عتبہ نے اور تو سب کچھ کر لیا لیکن وہ نزاریوں سے مرعوب ہو گیا، مرعوب ہونے کی ایک
وجہ یہ بھی تھی کہ نزاریوں کے ایک بااثر شخص عمر ہباری نے عمران کو قتل کیا تھا، یہ نزاریوں
کا سردار تھا، اور اتنی قوت حاصل کر چکا تھا کہ نیا والی (عتبہ) اس پر ہاتھ ڈالنے کی
جسارت نہ کر سکا، حالانکہ اگر یہ بھی جنید یا داؤد کی طرح کاروبار مملکت میں مداہنت کا عادی
نہ ہوتا تو یہ عمر کو قتل بھی کر سکتا تھا اور نزاریوں (حجازیوں) کا زور بھی توڑ سکتا تھا،
پھر بھی عتبہ کے دور میں نزاری اتنی قوت نہ حاصل کر سکے کہ وہ کوئی فیصلہ کن اقدام

کر سکتے۔

۲۳۲ھ میں متوکل نے مسند خلافت پر قدم رنجہ فرمایا، اس نے دوسرے کئی اور والیوں کے ساتھ عتبہ کو بھی کچھ عرصہ بعد معزول کر دیا۔ ۲۳۵ھ میں اس کی جگہ ہارون بن خالد کو دی گئی،

ہارون کا قتل ہارون بن خالد ۲۳۵ھ میں ولایت سندھ پر مامور ہوا اور ۲۴۰ھ میں قتل کر دیا گیا، گویا اس نے صرف ۵-۶ سال حکومت کی قتل اسی شخص کے سبب ہوا جسے خون کی چاٹ پڑ چکی تھی، یعنی عمر ہباری،

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ نزاریوں کے ساتھ سختی اور تشدد کا جو برتاؤ داؤد نے روا رکھا تھا، وہ فی الوقت تو کامیاب ہوا، لیکن اس نے منافرت کی ایسی داغ بیل ڈال دی، جس نے رفتہ رفتہ تناور درخت کی صورت اختیار کر لی، خوش قسمتی سے نزاریوں کو سردار بھی ایسا ملا، جس میں غیر معمولی تنظیمی صلاحیت تھی، جو بظاہر خاموش تھا، لیکن یہ خاموشی وہ تھی جو طوفان سے پہلے سمندر میں نظر آتی ہے، اور اسی وقت ٹوٹتی ہے جب طوفان آ چکتا ہے!

عمر ہباری کی دہشت اور جلالت شان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر چہ اقتدار و اختیار حکومت سے محروم تھا، لیکن علانیہ حکومت کے خلاف سرگرم عمل رہتا تھا، امن و امان اور فتنہ و فساد کی کنجی اس کے ہاتھ میں تھی، جب جو چاہے کر سکتا تھا، لیکن داؤد کے بعد کسی والی کی مجال نہیں ہوئی کہ اس پر ہاتھ ڈال سکتا، یا اُسے سرزنش کر سکتا، یا اس کے خلاف کوئی تادیبی اقدام کر سکتا، بلکہ صورت حال یہ تھی کہ سندھ کے گورنر اس کے نام سے دہلتے تھے، اور اس کی حرکتوں کو اپنی کمزوری اور دہشت کی بنا پر نظر انداز کر دیتے تھے،

لیکن ہارون بن خالد نے اس پالیسی سے جو گویا طے شدہ پالیسی بن گئی تھی، انحراف کیا، اور عمر ہباری سے بگاڑ پیدا کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حکومت روز بروز

متنزلزل ہوتی گئی، اور آخر ایک دن وہ بھی اسی طرح قتل کر دیا گیا جس طرح اس سے قبل وہ کئی لوگوں پر ہاتھ صاف کر چکا تھا،

نفسیاتی موقعہ

ہارون بن خالد کا قتل ایسے نفسیاتی موقعہ پر ہوا کہ عمر ہباری کے لئے حالات اور زیادہ سازگار ہو گئے

یہ وہ زمانہ تھا جب خلیفہ متوکل، بغداد میں ہزار گونہ مصائب اور افکار میں مبتلا تھا، ہر روز نت نئی بغاوتوں اور سازشوں کی خبریں آتی رہتی تھیں، ابھی ایک بغاوت فرو نہیں ہوئی کہ دوسری شروع ہو گئی، ایک مشکل دور نہیں ہوئی کہ دوسری پیدا ہو گئی، ان داخلی اور خارجی حالات نے متوکل کو بہت زیادہ حواس باختہ اور پریشان و مضطرب کر رکھا تھا، اسی اثنا میں عمر ہباری کا معروضہ دربار خلافت میں پیش ہوا، اس معروضہ میں عمر نے کہا تھا، کہ سندھ کے حالات جو روز بروز ابتر ہوتے جاتے ہیں، نگاہِ تعمق سے دیکھا جائے تو اس ابتری کا ایک ہی سبب ہے، وہ یہ کہ آنے والے والی یہاں کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں یہاں کے احوال و واقعات سے ناواقف ہوتے ہیں، انہیں واقفیت پیدا کرنے اور مانوس ہونے، اور تجربہ حاصل کرنے میں بہت دیر لگتی ہے، جب تک وہ اس منزل پر پہنچیں حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں، میں چونکہ یہیں کا باشندہ بن چکا ہوں، یہاں کے حالات سے پورے طور پر واقف ہوں، جانتا ہوں کس موقع پر کیا کرنا چاہیئے، لہٰذا اگر ولایت سندھ کی ذمہ داری مجھے سونپی جائے تو یہ عین مقتضائے انصاف و دانش ہوگا

پھر عمر نے خلیفہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ عدل سے حکومت کرے گا، مرکزِ خلافت سے وابستہ رہے گا، اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے تکدرِ طبع کا باعث ہو

یہ معروضہ ایسے وقت میں پہنچا کہ متوکل نے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھا کہ اسے فوراً منظور کر لے، متوکل نے سوچا اس طرح دو فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ سندھ میں

حجازیوں اور یمنیوں کے مابین آئے دن جو معرکہ کارزار گرم رہتا ہے اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، دوسرے ایک ایسے شخص کو اگر سربراہ بنایا گیا جو خود ہی بغاوت، اور فتنہ وفساد کا موجب رہا کرتا تھا، تو یقیناً وہ اپنی نیک نامی اسی میں تصور کرے گا کہ اپنی کچھ کارگزاری دکھائے، اور امن وامان قائم کر کے ثابت کر دے کہ اس کا انتخاب غلط نہیں تھا

سلطنت منصورہ

نیا دور

سنہ ۲۷۰ھ میں عمر ہباری نے ولایت سندھ کی مسند پر قبضہ کر لیا، اب یہاں سے سندھ کے نظم و انتظام مملکت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، یہ نئی سلطنت تاریخ میں "سلطنت منصورہ" یا "مملکت خاندان ہباری" کے نام سے موسوم ہے، ہباری اس اعتبار سے کہ عمر، قبیلہ قریش کی ایک شاخ ابو اسد جس شخص کی اولاد میں تھا اس کا نام "ہبار" تھا اور "منصورہ" اس اعتبار سے کہ اس کا دارالامارہ منصورہ شہر تھا،

عمر نے خلیفہ متوکل سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے پورا کیا، جب تک وہ زندہ رہا، دربار خلافت سے وابستہ رہا، اس کا احترام کرتا رہا، اس کی اطاعت کرتا رہا، اس سے الحاق تسلیم کرتا رہا، مرکز خلافت کی طرف سے جب بھی امارت میں تبدیلی ہوتی تھی، تو امیر کا زیر اطاعت علاقوں میں سندھ کا نام بھی ہوتا تھا، مساجد میں جمعہ کے روز جو خطبے پڑھے جاتے تھے، ان میں بھی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا اور اسی کے لئے درازیٔ عمر و اقبال کی دعائیں مانگی جاتی تھیں،

غرض خارجی پالیسی کا جہاں تک تعلق تھا، عمر نے وہی پالیسی قائم رکھی، جو چلی آرہی تھی حالانکہ وہ اس منصب پر کسی کی سفارش یا درباروداری اور خوشامد کے بل پر مامور نہیں ہوا تھا، بلکہ اپنی قوتِ بازو کے بل پر یہ منصب بلند حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا، وہ چاہتا تو خلیفہ کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھا کر سندھ کا بلا شرکت غیرے فرماں روا بادشاہ بن سکتا تھا،

نظم و انتظام مملکت

داخلی اعتبار سے دیکھئے تو بھی عمر کا دور ہر اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے، وہ تقریباً تیس سال تک اس منصب

کی گراں بار ذمہ داریوں کو انجام دیتا رہا، لیکن اس طویل مدت میں نہ اُس کے خلاف کوئی بغاوت یا شورش رونما ہوئی، نہ مرکز خلافت کو اس سے کسی قسم کی شکایت پیدا ہوئی یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کی پالیسی داخلی اور خارجی ہر اعتبار سے کامیاب رہی، اور یہی اس کے تدبر، فراست اور معاملہ فہمی کا شاہکار ہے ۔ ——— پھر جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ یہ تیس برس اُس نے ایسے دور میں کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ گزار لیے، جسے بجا طور پر عہد فتنہ کہا جا سکتا ہے، تو اس کی صلاحیت اور استعداد کار کا اور زیادہ اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے،

عمر نے تخت نشین ولایت ہونے کے بعد سارے سندھ پر قبضہ کر لیا، قبضہ کرنے میں اُسے تھوڑی بہت مزاحمتوں سے ضرور سابقہ پڑا، لیکن یہ مزاحمتیں ایسی نہیں تھیں، جو اس جیسے اولوالعزم اور جہاں دیدہ آدمی کے راستہ میں روک بن سکتیں، وہ آسانی کے ساتھ ان پر غالب آیا اور اس نے اپنی سلطنت کی بنیاد اس طرح مستحکم کر لی کہ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک اس کا خاندان جاہ و دبدبہ کے ساتھ حکومت کرتا رہا اور کوئی اس کا حریف پیدا نہ ہو سکا، حالانکہ ممالک شرقیہ آماجگاہ انقلابات و حوادث بنے ہوئے تھے، کوئی ملک ایسا نہ تھا، جو فتنہ و شر سے محفوظ و مامون ہو، کوئی حکومت ایسی نہ تھی جسے شورش اور بغاوت کا بار بار سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہو، کوئی فرماں روا ایسا نہیں تھا، جسے یکسوئی طبع اور استقلال مزاج حاصل ہو

لیکن طوفانوں اور ہنگاموں کے اس طویل دور میں عمر ہباری اُسی شان سے اپنی مسند پر جلوہ فرما نظر آتا ہے ۔ جو اس کی خصوصیت بن چکی تھی، مسند ولایت پر بیٹھتے وقت جو اولوالعزمی اُسے حاصل تھی، اس میں آخر وقت تک کوئی فرق نہیں آیا،

غیر مسلموں سے حسن سلوک

عمر کے دور میں ایک خصوصیت اور تھی جس میں کوئی فرق نہیں آیا

غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور الفاظ کا وہی برتاؤ رہا جس نے ان کا دل موہ لیا، ان کے مذہبی معاملات میں کبھی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی۔ ان کی شخصی آزادی میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔ انہیں تبدیل مذہب پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا، ان کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا گیا جو ان کی دل شکنی کا موجب ہوتا، حالانکہ جب کبھی ان کا داؤں چلا انہوں نے اپنی طرف سے حالات کو بگاڑنے میں تامل نہیں کیا، عمر کی اس پالیسی کا ایک نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغیر کسی سعی و کوشش کے تبلیغ اسلام انجام پاتی رہی، نہ صرف عوام کے افراد اس دین کی طرف مائل ہوتے اور اسے قبول کرتے رہے، بلکہ اطراف کے بعض راجہ بھی اسلام کی حقانیت کے اعتراف پر مجبور ہوئے اور انہوں نے بالآخر یہ دین قبول کر لیا، ان سارے واقعات میں کہیں بھی ہمیں یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ کسی پر کسی طرح کی تعدی کی گئی ہو، یا سختی اور تشدد کا مظاہرہ کیا گیا ہو!

عربوں نے اپنے دورِ حکومت میں کہیں بھی جبری تبدیلی مذہب کو اپنا اصول نہیں بنایا خواہ وہ افریقہ ہو یا چین یا اندلس، یا سندھ یا کوئی اور مقام، یہ بات ان کی فطرت اور سرشت کے خلاف تھی!

باپ کے بعد بیٹا

۲۷۰ھ کے قریب عمر کا انتقال ہو گیا، اس کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ولایت ہوا جس کا نام عبداللہ بن عمر ہباری تھا!

عبداللہ کو اپنے باپ سے ورثہ میں تمام اچھائیاں ملیں، عنانِ اختیار واقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد وہ ان تمام مشکلات پر آسانی کے ساتھ غالب آیا جو ہمیشہ ایک نئے فرمانروا کو پیش آیا کرتی تھیں، ایک شخص نے منصورہ پر بغاوت کر کے قبضہ کر لیا، لیکن عبداللہ نے منصورہ چھین لیا، اب تک وہ بانیہ میں زیادہ تر مقیم رہتا تھا، لیکن اب وہ مستقل طور پر منصورہ میں رہنے لگا، عبداللہ کے عہدِ حکومت میں بھی ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس نے بیدار مغزی اور دوراندیشی کے ساتھ حکومت کی، اس نے بغاوت کو کچلنے میں

جہاں کوئی تامل نہیں کیا۔ وہاں عوام اور رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے، ان کی دلجوئی کر
ان کے شکایات رفع کرنے اور ان کا دل ہاتھ میں لینے کا بھی کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔
جن لوگوں کو وراثت میں مضبوط اور مستحکم حکومتیں ملتی ہیں، انہیں بھی برسر اقتدار آنے
کے بعد، نت نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اگر ان میں صلاحیت نہیں ہوتی، تو
فوراً روبہ زوال ہو جاتی ہیں، تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ باپ سے بیٹے کو بنی
بنائی اور مستحکم ترین حکومت ملی، لیکن اس نے اپنی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں میں سلطنت
کے استحکام کو ختم کر دیا، عبداللہ اگر باپ کے خصوصیات کا حامل نہ ہوتا تو سندھ کی حکومت
پر قابض و متصرف نہیں رہ سکتا تھا۔

رواداری کے دو واقعات

ابھی گذشتہ صفحات میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ حبر
دور میں تبلیغ اسلام خود بخود ہوتی رہی جس میں کسی
کے جبر و اکراہ کو دخل نہیں تھا، بلکہ اس کا سبب صرف طبع سلیم کی مناسبت اور حق کی تلاش
اس سلسلہ میں ہم صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کریں گے، ان میں سے ایک عمر
کے عہد سے تعلق رکھتا ہے، اور دوسرا اس کے بیٹے عبداللہ کے دور سے!

۲۵۹ھ میں اطراف سندھ کا ایک راجہ برضا و رغبت مسلمان ہوا، جوش عقیدت میں
اس نے ایک سونے کی زنجیر جس پر یاقوت اور زمرد کی پچکاری کی گئی تھی، خلیفہ معتمد علی اللہ
کے حضور میں اس استدعا کے ساتھ نذر گزاری کہ اسے خانۂ کعبہ میں بھیج دیا جائے، خلیفہ
نے اس کی یہ استدعا قبول کر لی اور فرمان صادر کیا کہ اسے خانۂ کعبہ میں آویزاں کر دیا جائے
اس واقعہ سے ہمارے گذشتہ بیان کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے
اب ہم دوسرے واقعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو عبداللہ ابن عمر کے دور حکومت
میں پیش آیا تھا۔
عبداللہ جس سال تخت نشین ہوا تھا (۲۷۰ھ) اسی سال کا واقعہ ہے کہ سندھ

...راجہ نے جس کا نام "مہروک" تھا عبداللہ سے استدعا کی کہ اسلام کے تعلیمات وہدایت
...لاصہ اسی کی سندھی زبان میں اسے لکھ کر بھیج دیا جائے، تاکہ وہ براہ راست اس دین
...واقفیت حاصل کر سکے، عبداللہ نے ایک عراقی نژاد شخص کو اس کام پر مامور کیا، اس
...ایک قصیدہ میں تمام کام کی باتیں نظم کر دیں، عبداللہ نے یہ قصیدہ راجہ کے پاس بھیج دیا
...جہ قصیدہ سے بہت متاثر ہوا، اس نے عبداللہ سے درخواست کی کہ قصیدہ گو کو اس
...پاس بھیج دیا جائے، عبداللہ نے یہ بات بھی مان لی، راجہ نے سے تین سال تک اپنے
...ں رکھا، اس کی بڑی قدر و منزلت کی، اسے انعام و اکرام سے نوازا اور اسے مقرب
...رگاہ بنا لیا، تین سال کے بعد جب وہ واپس آیا تو عبداللہ نے اس سے راجہ کے بارے
...یں دریافت کیا کہ تم نے اسے اور اس کے دینی رجحان کو کیسا پایا،

عراقی نے جواب دیا، راجہ اسلام کی تعلیمات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے اسلام
...ول کر لیا، جب میں دربار سے چلا ہوں، اس وقت تک وہ صدق دل سے اسلام پر
...مل تھا، تنہائی میں پابندی سے نماز پڑھتا تھا، اپنے اسلام کا اعلان اس ڈر سے نہیں کرتا
...جب رعایا کو یہ بات معلوم ہوگی تو وہ برہم ہو جائے گی اور اس کا راج پاٹ
...چھن جائے گا۔

...راقی کا بیان استنباط

عراقی کے اس بیان پر اگر ہم غور کریں اور اس کی تحلیل و تجزیہ کریں تو دو باتیں صاف طور پر نظر آتی ہیں،

ایک تو یہ کہ اگر قبول اسلام میں کسی قسم کا جبر ممکن ہوتا تو راجہ تو راجہ پر جبراً بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ راجہ دل سے اسلام قبول کر لیتا ہے لیکن اس کا اخفا کرتا ہے، اعلان و اظہار نہیں کرتا، اس لئے کہ کہیں رعایا برہم نہ ہو جائے،

دوسرے یہ کہ یہ واقعہ عبداللہ بن عمر کو معلوم ہوتا ہے، عبداللہ بڑی آسانی سے راجہ مہروک سے کہہ سکتا تھا کہ تم اپنے قبول اسلام کا اعلان کر دو، رعایا اگر برسر پرخاش

ہوتی تو میں اس سے سمجھ لوں گا، میرے پاس جو فوج ہے آخر وہ کس مرض کی دوا ہے، وہ اسی لئے تو ہے کہ کفار کی سرکوبی کرے، لیکن عبداللہ ایسا نہیں کرتا، وہ یہ دا تو سنتا ہے، اس سے متاثر بھی ہوتا ہے، لیکن راجہ سے اشارۃً بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ قبول اسلام کا اعلان کردے۔ اس لئے کہ اس طرح جبر اور جور کا شائبہ تھا۔ اور عبداللہ اسے پسند نہیں کرتا تھا کہ جبر و جور سے تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں کام لیا جائے!

عراقی کا ایک اہم بیان

آگے چل کر عراقی نے جو واقعہ بنایا اس سے راجہ کا اخلاص اور زیادہ مبرہن ہو جاتا ہے، عراقی نے کہا،

راجہ نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں سندھی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھوں، میں نے یہ فرمائش قبول کر لی، میں جو کچھ روزانہ لکھتا وہ راجہ کو سنا دیتا، راجہ سنتا متاثر ہوتا اور تعریف کرتا،

ایک روز سورۃ یٰسین کی تفسیر کے سلسلہ میں اس آیت پر پہنچا،

قال من یحیی العظام وھی رمیم!

ترجمہ:-

جب اس آیت کی میں نے تفسیر بیان کی تو راجہ مبہوت و ششدر رہ گیا، وہ جواہرات سے مرصع تخت پر جاہ و جلال کے ساتھ متمکن تھا، لیکن یہ آیت اور اس کی تفسیر سن کر وہ اثر انگیز لہجہ میں بولا،

"پھر سے کہو!"

میں نے وہ تفسیر پھر دہرا دی!

تفسیر کے الفاظ سنتے ہی راجہ تخت سے اتر پڑا، اور زمین پر اپنا رخسار رکھ دیا، زمین پر ابھی پانی چھڑکا گیا تھا، اور وہ تر تھی، رخسار گرد آلود ہو گیا، لیکن راجہ نے پروا بھی نہ کی، وہ گویا ہوا،

"بیشک یہی رب ہے، یہی خدا ہے، یہی اس قابل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے،

یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا!"

عہد عبداللہ بن عمر کا یہ واقعہ خود اپنی شہادت آپ ہے کیا اس سے یہ بات

بھی طرح صاف اور منقح نہیں ہو جاتی کہ "ان الدین عند اللہ الاسلام" ماننے کے

باوجود مسلمانوں کا عمل ہمیشہ "لا اکراہ فی الدین" پر رہا؟ بے شک مسلمان اسے مانتے رہے

اور عقیدہ کے طور پر ہمیشہ مانتے رہے کہ خدا کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین ایک ہی ہے

اور وہ صرف اسلام ہے، ساتھ ہی ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے انہوں نے یہ کبھی گوارا

نہ کیا کہ اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور کریں، یہ بات انہوں نے ہر شخص کے ضمیر اور ایقان

پر چھوڑ دی کہ وہ خود ہی فیصلہ کرے کون سا دین اسے پسند ہے، اور کس دین کو وہ اپنی

روحانی ترقی اور عروج کے لئے بہتر اور مناسب سمجھتا ہے؟ صرف یہی ایک واقعہ یہ بات

ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ دوسرے مقامات کی طرح سندھ میں بھی اسلام بزور شمشیر

نہیں پھیلا، بلکہ اس نے خود اپنی تبلیغ کی، اور یہ تبلیغ مبنی تھی حق و صداقت پر!

مندروں میں قربانیاں بودھوں اور ہندوؤں کو اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں کس درجہ آزادی حاصل تھی، اس کا اندازہ ان واقعات

سے ہوتا ہے جو مسعودی، ابن حوقل اور دوسرے مورخوں نے اور سیاحوں نے اپنی کتابوں

میں لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جگہ جگہ مندر قائم تھے، ان مندروں میں نہ صرف یہ کہ

بھجن گائے جاتے تھے، پوجا پاٹ ہوتی تھی بلکہ ہر طرح کے چڑھاوے بتوں کے سامنے چڑھائے

جاتے تھے، ہر طرح کی قربانیاں بتوں کی خوشنودی کے لئے کی جاتی تھیں، لیکن اسلامی حکومت

ان معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی، بلکہ ہر طرح اس کا لحاظ رکھتی تھی کہ اپنے

مذہبی مراسم کی بجا آوری کے سلسلہ میں انہیں کسی قسم کی زحمت یا تکلیف سے دوچار نہ

ہونا پڑے۔

کم و بیش تیس سال تک عبداللہ بن عمر نے حکومت کی، پھر اس کا انتقال ہو گیا، اور اسکی جگہ اس کا بیٹا عمر بن عبداللہ مباری مسند ولایت پر متمکن ہوا! یہ ہر اعتبار سے اپنے دادا اور باپ سے بڑھا ہوا تھا، اس کے کارنامے اتنے وقیع ہیں کہ ان کے لئے ہمیں الگ سے گفتگو کرنی پڑے گی!

ابوالمنذر کا یادگار دور حکومت

۲۱۲؁ھ میں عمر بن عبداللہ مسند آرائے ہوا، کنیت ابوالمنذر تھی، یہ بڑا دانا بینا اور صاحب فہم و ذکا تھا: اسے اگرچہ ایک موروثی سلطنت ملی تھی، جو عام طور پر صرف اس لیے ملتی ہے کہ پہلے کی جمع جتھا غارت کر دی جائے، رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں میں وقت ضائع کیا جائے نظم و انصرام مملکت سے یکسر بے پروائی برتی جائے ظلم اور سفاکی کو عام کر دیا جائے، لیکن ابوالمنذر نے ایسا نہیں کیا، وہ تخت پر ایسی چوکسی اور ہوشیاری کے ساتھ بیٹھا جیسے کوئی بالکل نومشق جو بڑی عرق ریزی، جدوجہد اور حرب و پیکار کے بعد فرماں روا بننے کے بعد چوکسی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرتا ہے، اس نے سب سے پہلے عدل و انتظام کے شعبوں کی طرف توجہ کی، مسند قضا پر ایسے لوگوں کو مامور کیا جن کی دیانت اور غیر جانبداری شک و شبہ سے بالا تھی؛ اس نے خزانہ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دی، جو معاملات کے تصفیہ میں اگرچہ سخت اور درشت تھے، لیکن ناانصاف اور خود غرض نہیں تھے، اس نے بیک وقت عوام، خواص اور حکام و عمال کی اصلاح کی طرف توجہ کی، اور اس کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے ہیں ذرا بھی مداہنت یا رواداری سے کام نہیں لیا سختی کے موقع پر پوری سختی کی، نرمی کے موقع پر زیادہ سے زیادہ نرمی برتی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی دہشت بھی لوگوں کے دلوں پر قائم ہو گئی، اور محبت بھی عوام کے دلوں پر قائم ہو گئی، دہشت اس لئے کہ خطاکار کا سزا پانا ضروری تھا، اور محبت اس لئے کہ مصیبت میں دستگیری کرنا اس کا شعار تھا!

فلاح و فروغ

ابوالمتذر کے اس طرزِ عمل اور بیدار مغزی نے سارے ملک کی کایا پلٹ دی، زراعت اور صنعت میں خاص طور پر ترقی ہوئی، ہر طرف سرسبزی اور شادابی کے منظر نظر آتے تھے، اناج خوب اُگتا تھا، ہر فصل اس کثرت سے ہوتی تھی کہ قحط کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں بھی کوئی دشواری نہیں پیش آتی تھی، کچھ رفاہِ عام کی بدولت کچھ لوگوں کی خوشحالی اور بارونق کاری کے باعث اور زیادہ تر حکومت کے نظم و انصرام کی وجہ سے وہ بُرائیاں بالکل دور ہو گئی تھیں جو کسی سماج کے لئے زہرِ قاتل کا درجہ رکھتی ہیں، چوری، ڈکیتی، استحصال بالجبر، رشوت اور خود غرضی کے جرائم تقریباً مفقود ہو گئے تھے، لوگ اس طرح آرام و عافیت سے رہ رہے تھے، کہ وہ تقریباً اس بات کو فراموش کر بیٹھے تھے کہ گذشتہ دنوں میں بار بار انہیں نئے نئے حوادث اور انقلابات کی زد میں آکر نقصان اُٹھانا پڑا ہے، اور سچی بات بھی یہ ہے کہ جب آدمی مصیبت میں ہوتا ہے تو خوشحالی کی باتیں فراموش ہو جاتی ہیں، اور جب عیش و اطمینان کی زندگی میسر ہوتی ہے تو عہدِ عسرت اور تکلیف ایک افسانہ بن جاتا ہے، منصورہ اور سندھ کے لوگوں کو امن و امان کی دولت ملی، تو انہیں یاد بھی نہ رہا کہ ماضی میں وہ کیا کیا کچھ کھو چکے ہیں۔

عسکری استحکام

کسی بادشاہ یا فرماں روا کو جب رعایا کا اتحاد حاصل ہوتا ہے، خوش نظمی اور فارغ البالی کے باعث جب رعایا مطمئن ہوتی ہو، داخلی شورش اور بغاوت کا اندیشہ باقی نہیں رہ جاتا تو سب سے پہلے جو چیز ذہن میں آتی ہے وہ توسیعِ مملکت کی تمنا ہوتی ہے، یہ تمنا اکثر کسی اخلاقی اور دینی جذبہ کے بغیر ہوتی ہو تو بڑھتے بڑھتے یہ چنگیز اور ہلاکو بن جاتی ہے، اور اگر دینی اور اخلاقی حدود کے اندر ہے تو پھر یہ راعی اور رعایا دونوں کے لئے موجبِ راحت و آسائش بن جاتی ہے، ابوالمتذر نے، گھر کی طرف سے مطمئن ہو کر سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی،

وہ فوجی عسکری نظام کی تجدید و تنظیم! داخلی شورشوں کی وجہ سے یہ نظام کچھ ابتر سا ہو چلا تھا لیکن ابوالمنذر نے اس میں پھر سے جان ڈالی، اور عسکری تنظیم کر کے اپنی حکومت کو اس درجہ مضبوط اور مستحکم کر لیا کہ جارحانہ اور دفاعی دونوں پہلوؤں سے وہ ناقابل تسخیر بن گیا اگر کوئی راجہ حملہ آور ہونے کی جرأت کرتا تو اس کی سرکوبی کا بھی اچھا انتظام تھا، اور اگر کسی کی سرکشی یا غزوہ کے باعث فوج لے کر اس پر چڑھائی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جب بھی فتح ایک یقینی چیز تھی، یہ دونوں چیزیں بہت ضروری تھیں اور ان کی طرف سے مطمئن ہونے بغیر اپنے حدود مملکت سے قدم باہر نکالنا خودکشی کے مترادف تھا، ابوالمنذر نے اس حماقت کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو مسلح اور منظم کر لیا

ایک غیر مسلم ریاست

ملتان اور منصورہ کے درمیان ایک ہندو ریاست الور ابوالمنذر کے باپ عبداللہ کے زمانہ میں بھی موجود تھی، عبداللہ نے اس لئے اسے نہیں چھیڑا کہ اس کی طرف سے کسی ایسی حرکت کا صدور نہیں ہوا تھا، جس کے لئے فوجی تنبیہہ اور سرزنش ضروری ہوتی۔ لیکن ابوالمنذر کے دور میں یہ صورت حال قائم نہ رہی راجہ الور نے چھیڑ خانیاں شروع کیں، ابوالمنذر نے بھی بلا انتظار مزید چڑھائی کر دی، اور اسے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا، مسعودی نے الور کو ابوالمنذر کا ایک "پرگنہ" بتایا ہے۔ ابوالمنذر کے حدود سلطنت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلطنت کے محکوم دیہاتوں کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہنچ گئی تھی اور ان سب علاقوں کا انتظام اتنا مکمل تھا کہ کہیں سے بھی شورش یا بغاوت کی چنگاری بھڑکنے کی اطلاع شاذ و نادر بھی نہیں آتی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ دور و نزدیک ہر جگہ المنذر کی فوجی تیاریاں روز روشن کی طرح آشکار تھیں، سب جانتے تھے اس کا نظام عسکری بہت مکمل ہے، اس سے ٹکر لینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ منصورہ میں ہر وقت پانچ ہزار سوار، اسی ہاتھی اور چالیس ہزار پیادے کیل کانٹے سے مسلح رہتے تھے، ہاتھی بہت سدھے ہوئے تھے، ان سے جنگ میں بھی خوب کام لیا جاتا

تھا، اور دشمن کی صفوں کو اُلٹنے میں یہ بڑا کام دیتے تھے، جنگی ہاتھیوں کے علاوہ عام ہاتھی بھی سدھا لئے جاتے تھے، اور ان سے روزمرہ کے کام لئے جاتے تھے، مثلاً بوجھ اٹھانا

ابوالمنذر کے دور میں بھی یہ خصوصیت قائم رہی کہ سندھ کی سرکاری زبان بدستور عربی ہی تھی، اگرچہ سندھی زبان جو عوام کی زبان تھی نظر انداز نہیں کی گئی تھی، عرب حکام و امراء بھی یہ زبان شوق سے سیکھتے تھے، اور اس کی بول چال سے حسب ضرورت واقف تھے، لیکن علمی اور سرکاری زبان عربی ہی تھی

تجارت اور کاروبار کسی ملک کی فلاح و رفاہ کے لئے اس کا تجارتی اور کاروباری ہونا ضروری ہے، باہر سے مالِ تجارت اگر وہاں نہ آئے تو ایسی اقتصادی بدحالی شروع ہو سکتی ہے، جو اس کے تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی ہے ابوالمنذر کو اس بات کا احساس تھا، ان کے زمانہ میں نہ صرف منصورہ ایک بڑا تجارتی شہر بن گیا تھا، بلکہ سندھ کے مختلف اقطاع، تجارتی منڈی کی حیثیت سے فروغ حاصل کر رہے تھے۔ کشتیوں اور اونٹوں پر لاکر دوسرے مقامات کا مالِ تجارت سندھ میں فروخت ہوتا تھا۔ اسی طرح سندھ کی بعض چیزیں دوسرے مقامات پر جاتی تھیں، اور فروخت ہوتی تھیں، اس تجارتی آمد و رفت نے ملک کی اقتصادی حالت سنوارنے میں بہت مدد دی،

منصورہ کا ذکر ابن مہلبل کی زبان سے منصورہ کی بنا محمد بن قاسم کے لڑکے عمر بن محمد بن قاسم نے رکھی تھی۔ اس نے اسے آباد کیا اور بسایا تھا، جب سے اب تک یہ سندھ کا پایہ تخت رہا تھا، اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بڑے خوبصورت، دل آویز اور وسیع شہر کی حیثیت حاصل کر لی تھی، جن مؤرخ سیاحوں نے منصورہ دیکھا ہے، ان کے تاثرات کی روشنی میں اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو ذہن کے سامنے ایک بڑی دلکش تصویر منصورہ کی اُبھر آتی ہے

ابن مہلبل نے ۳۳۱ھ میں منصورہ کی زیارت کی تھی، اس نے ملتان کے حالات بھی بیان

کے رہتے، لیکن چونکہ ملتان اب بجائے خود ایک حکومت بن چکا تھا، لہٰذا اس کا ذکر نظر انداز کر کے صرف منصورہ کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں، منصورہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے،

"منصورہ زیریں سندھ کا ایک بہت مشہور اور خیر و برکت والا شہر ہے یہ ملک کا پایہ تخت ہے۔ حاکم اسی جگہ قیام کرتے ہیں، یہاں ایک ندی ہے جو دریائے سندھ سے جدا ہو کر شہر کے ہر چہار طرف گھومتی ہے، جس کے باعث اس کی شکل جزیرہ کی سی ہو گئی ہے۔ البتہ یہاں گرمی بہت پڑتی ہے، اور مچھر بھی بکثرت ہوتے ہیں! یہاں کے پھل بھی مشہور ہیں، یہاں کا لیموں سیب کے برابر ہوتا ہے اور آم شفتالو کی طرح، یہاں کا دریا دریائے سندھ دجلہ سے بڑا پاٹ رکھتا ہے، مشرق سے جنوب کی طرف جا کر مغرب کو گھوم جاتا ہے، اور بحر عرب سے جا ملتا ہے"

منصورہ کی داستان اصطخری کی زبان سے

ابو اسحاق اصطخری نے بھی سندھ اور منصورہ کا ذکر (۳۴۰ھ) کیا ہے :-

"شہر منصورہ سندھ کا پایہ تخت ہے، یہ طول و عرض میں میل دو میل ہے سے دریائے سندھ کی ایک شاخ گھیرے ہوئے ہے جس کے باعث یہ ایک جزیرہ نما کی شکل میں ہو گیا ہے - یہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے، یہاں کا فرماں روا ایک قریشی ہے جو ہبار بن اسود کے خاندان سے ہے، البتہ خطبہ اب تک خلیفہ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا ہے، منصورہ ایک گرم شہر ہے، یہاں کھجور کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں، البتہ انگور، سیب، امرود اور شفتالو وغیرہ نہیں ہوتے، ہاں گنا خوب ہوتا ہے، یہاں کا لیموں سیب کے برابر ہوتا ہے، یہ ایک کھٹا پھل ہے، شفتالو کے برابر

ایک اور پھل ہوتا ہے جس کا نام آم ہے، یہ پھل بڑے ارزاں ہوتے ہیں،
یہ شہر بہت سرسبز و شاداب ہے!"

سندھی بودھ مت کے پیرو

ہم کسی جگہ بتا چکے ہیں کہ سندھ میں جو غیر مسلم تھے، وہ زیادہ تر بدھوں پر مشتمل تھے، یہ عجیب بات تھی، یہاں کی حکومت برہمنوں کے ہاتھ میں تھی، اور رعایا بدھوں پر مشتمل تھی،

مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں نہ برہمنوں کو ستایا نہ بودھوں کو دونوں کو رواداری کی نعمت عطا کی، دونوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا خیال تک دل میں نہیں آنے دیا، اسی طرز عمل کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام خوب پھیلا، لوگوں نے جوق در جوق اسلام قبول کیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ سندھ بالکل ایک اسلامی ملک بن گیا تھا، اور یہاں غیر مسلم ختم ہو گئے تھے، غیر مسلم اب تک تھے اور امن و عافیت کی زندگی اسلامی حکومت کے زیر سایہ بسر کر رہے تھے، اور مسلمان حکمرانوں کو دعا دے رہے تھے کہ انہوں نے انہیں خود انہی کے ہم قوم اور ہم مذہب ظالموں کے پھندے سے چھڑایا اور ایک نئی زندگی عطا کی،

اصطخری نے سندھ کے بودھوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، اس کا ہم خاص طور پر ذکر کرنا چاہتے ہیں:-

"قامہل سندھ کا آخری اور ہندوستان کا پہلا شہر ہے یہاں سے لوگ چیمور جاتے ہیں، قامہل سے چیمور تک ہند کے شہر ہیں (جانب جنوب) اور شمال کی جانب قامہل سے مکران تک عرض میں اور یہاں سے ملتان تک طول میں کل سندھ کے شہر ہیں، سندھ کے شہروں میں غیر مسلم زیادہ تر بودھ ہیں، ایک اور قوم بھی ہے جسے "مید" کہتے ہیں، بودھ کا ملک (ضلع) ذرا زیادہ وسیع ہے، وہ طوران، مکران، ملتان اور منصورہ کے شہروں کے درمیان دریائے سندھ کے مغربی جانب پھیلا ہوا ہے، یہ بودھ لوگ اونٹ والے کہلاتے ہیں اس

ملک کا پایہ تخت جو تجارت کا مرکز ہے قندبیل ہے، یہاں کے لوگ دیہاتیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے پاس جنگل اور جھاڑیاں نہیں رجن سے یہ متمتع ہوتے ہیں۔"

ہندو مسلم اتحاد "ہندو مسلم اتحاد!" ــــــ نعرہ کے طور پر چاہے ادھر کچھ دنوں سے سننے میں آرہا ہو، لیکن مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت اور کشور کشائی میں اس جذبہ کو بہت زیادہ ترقی دی، مذہبی اختلاف کو اپنی جگہ پر محدود رکھ کر دوسرے عام مسائل حیات میں انہوں نے باہمی ربط وتعلق پورے طور پر قائم رکھا، اور کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں کیا، چنانچہ ابھی جو داستان ہم پڑھ چکے ہیں اسی کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے:

بانیہ اور قامہل کے درمیان میدان ہے۔ قامہل سے کھمبات تک بھی میدان ہی میدان ہے، پھر یہاں سے چیمور تک پے در پے اور متصل گاؤں ہیں، اور ہندوستان کی آبادیاں ہیں، یہاں کپڑے استعمال کرنے اور زلف رکھنے میں ہندو اور مسلمان ایک ہی طرح ہیں، ان کا لباس ازار اور کرتہ ہے، کیونکہ یہ ملک بہت گرم ہے، اسی طرح ملتان والوں کا بھی یہی لباس ہے، (اور ہندو مسلمان دونوں مشترک طور پر اس لباس کو اختیار کرتے ہیں) سندھیوں کی زبان عربی اور سندھی ہے، مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے، تاجر قمیص اور لنگی پہنتے ہیں جیسا کہ تمام فارس اور عراق والوں کا عام لباس ہے، مکران کا حاکم عیسیٰ بن معدان ہے جسے لوگ اپنی دیسی زبان میں "مہراج" کہتے ہیں، قندبیل کے درمیان بہت سے گاؤں ہیں یہاں مسلمان اور بودھ دونوں آباد ہیں۔"

مکران کی داستان اسی طرح مکران کے بارے میں ہمیں اصطخری نے بتایا ہے:۔

"مکران عموماً بنجر ملک ہے، ریگستانی میدان زیادہ ہے، مقصورہ اور مکران

کے درمیان دریائے سندھ کی شاخیں یا تالاب ہیں، یہاں جاٹ لوگوں کا قبضہ ہے، اور جو جس پانی پر قابض ہو جاتا ہے وہ اس کا مخصوص ہو جاتا ہے، یہاں کے لوگ زیادہ تر مچھلی اور آبی پرندوں پر گذارہ کرتے ہیں، اور دور میدانوں میں رہتے ہیں، ان کا حال (شام کے) کردوں جیسا ہے"!

اس بیان سے جہاں سندھ کے عام حالات معلوم ہوتے ہیں، وہاں اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس زمانہ میں سندھ میں چھ ریاستیں موجود تھیں ان چھ ریاستوں میں ایک بودھ ریاست (قندابیل) بھی تھی، جہاں بودھ راجہ حکمرانی کرتا تھا اور بے غل وغش داد حکومت دے رہا تھا۔

ابن حوقل کے تاثرات

ابن مہلبل اور اصطخری کے بعد اب ہم ایک تیسرے سیاح ابن حوقل (۳۶۶ھ) کی زبان سے سندھ کی داستان سنیں گے:۔

"منصورہ اور مکران کے درمیان دریائے سندھ کا پانی نشیبی تالابوں یا پہاڑی نالوں کے ہے، جن پر سندھ کے جاٹ قابض ہیں، ان میں سے جو قبیلہ بھی پہلے قابض ہو جاتے وہی تالاب یا نالہ کا مالک بن جاتا ہے، جیسا کہ بربر (افریقہ) کے لوگوں کا حال ہے، ان کی غذا مچھلی اور آبی جانور ہیں، یہ بڑی بڑی مچھلیاں بھی استعمال کرتے ہیں اور وہ جاٹ جو بنا بازی میں دیر سے رہتے ہیں وہ کردوں[1] کی طرح دودھ دہی اور جوار کی روٹیوں پر گزر بسر کرتے ہیں!"

پھر آگے چل کر یہ منصورہ کا بیان اس طرح کرتا ہے:۔

"سندھ کا پایۂ تخت منصورہ ہے، اس کو سندھی زبان میں برہمن آباد بھی کہتے

---

[1] دروز ملک شام کا ایک قبیلہ!

ہیں منصورہ طول و عرض میں ایک مربع میل ہے، جسے دریائے سندھ کی شاخ گھیرے ہوئے ہے، جس سے یہ جزیرہ نما بن گیا ہے، یہاں کے باشندے زیادہ تر مسلمان ہیں اور بادشاہ ایک قریشی جو ہبار بن اسود کے خاندان کا ایک فرد ہے، جس کے بزرگوں نے اس ملک پر قبضہ کر کے ایسی حکومت کی کہ مسلمانوں میں محبوب بنے اور غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے، یہ علاقہ خود مختار ہے، لیکن خطبہ بنی عباس (خلیفہ بغداد) کے نام کا پڑھا جاتا ہے، منصورہ ایک گرم شہر ہے، یہاں ارزانی اور شادابی بہت ہے، یہاں کا لباس عراق والوں کا ایسا ہوتا ہے، اور شاہی لباس یہاں کے راجوں کی طرح جو بال رکھتے ہیں اور کانوں میں بالا استعمال کرتے ہیں۔

سندھ کے بڑے شہروں میں ایک شہر اور ہے، یہ طول و عرض میں ملتان کے برابر ہے، بہت دولت مند اور خوشحال شہر ہے، تجارت کی گرم بازاری بھی رہتی ہے، یہاں چیزیں بہت ارزاں اور سستی فروخت ہوتی ہیں۔

دیبل کا ذکر

سندھ کا ایک اور بڑا شہر دیبل ہے، دریائے سندھ اس کے مشرق کی جانب ہے، یہ سمندر پر آباد ہے، یہ تجارت کا مرکز اور صوبہ کی بندرگاہ ہے، یہاں زراعت بہت کم ہوتی ہے، ایک خشک شہر ہے، صرف تجارتی اہمیت اسے حاصل ہے۔

سندھ کے بدھ

ابن حوقل سندھ کے بودھوں کا ذکر ذرا تفصیل سے کرتا ہے:۔ بودھ کا علاقہ ملتان کی سرحد تک ہے، اور یہ سب سندھ میں داخل ہے، سندھ کے شہر کفار (بودھ مذہب) کے ہیں، ایک اور کافر قوم بھی ہے جسے مید کہتے ہیں، بودھ قوم طوران، مکران اور ملتان کے درمیان پھیلی ہوتی ہے، بودھ لوگ اونٹ والے ہیں، وہ کو ان والے فربہ اونٹ

جنہیں خراسان اور فارس کے لوگ بہت پسند کرتے ہیں، یہیں ہوتے ہیں وہ شہر جہاں بودھ لوگ تجارت کرتے اور ضروریاتِ زندگی کی چیزیں خرید فروخت کرتے ہیں قندابیل ہے"!

محکوم مسلمان مسلمان خواہ حاکم ہوں یا محکوم، طاقتور ہوں یا کمزور، اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں اپنے دیس سے قدم باہر نکال کر جب وہ کسی نئے دیس میں پہنچے تو وہاں انہوں نے اپنے کردار، اور سیرت کی بلندی کے ایسے نمونے پیش کئے کہ محکوم، کم تعداد اور غیر مسلح ہونے کے باوجود، اکثریت ان سے عقیدت رکھنے، حکومت ان کی عزت کرنے اور امراء ورؤسا ان کے آگے سر عقیدت خم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں،

ہندوستان میں سندھ اور ملتان کا صرف ایک علاقہ ایسا تھا، جہاں مسلمان حکمران تھے۔ اور بادشاہت کی زندگی بسر کر رہے تھے، باقی اس طویل وعریض ملک کے دوسرے مقامات پر بدستور ہندوؤں کی حکومت تھی، اور وہ داد حکومت دے رہے تھے لیکن ان ممالک میں بھی سیاح، تاجر اور مسافر کی حیثیت سے مسلمانوں کے قدم پہنچ چکے تھے،

ابن حوقل کا مشاہدہ آیئے دیکھیں ابن حوقل نے ان محکوم اور زیر دست مسلمانوں کو ہندوؤں کی اکثریت اور ہندوؤں کی حکومت میں کیسا پایا

وہ کہتا ہے:-

"کھمبات سے چیمور تک ولبھ رائے کا ملک ہے، ان ملکوں میں گو آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی ہے لیکن مسلمان بھی یہاں بستے ہیں، ان پر راجہ کی طرف سے جو حاکم مقرر ہوتا ہے وہ مسلمان ہی ہوتا ہے، جو راجہ کا نائب سمجھا جاتا ہے، میں نے ہر مقام پر دیکھا کہ جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہے، جیسے خزر، سریر، ننانہ، دگانہ شاں (افریقہ) کوغہ وغیرہ ان تمام شہروں میں مسلمان

کسی غیر مسلم کو حاکم تسلیم نہیں کرتے، نہ کسی کی شہادت قبول کرتے ہیں؛ اگرچہ ان مسلمانوں کی تعداد کتنی ہی کم ہو، میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان مسلمانوں کی عزت وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، اسی لئے جب غیر مسلموں کی طرف سے یہ گواہی دیتے ہیں تو ان کی گواہی کو خصم (فریق مخالف بھی) قبول کر لیتا ہے اور بسا اوقات خصم کی جگہ پر جب مسلمان کھڑا ہوجاتا ہے تو اسی کے قول پر حاکم فیصلہ کر دیتا ہے!

ولبھ رائے کے ملک میں جو بہت وسیع ہے، مسلمانوں کے لئے مسجدیں بھی ہیں جن میں کھلے بندوں اذانیں ہوتی ہیں، جمعہ کی نماز بھی پڑھی جاتی ہے، اور منبر پر خطبہ بھی دیا جاتا ہے،

سندھ سے چیمور جاتے ہیں ہندوستان کا سب سے پہلا شہر تامہل ہے، کیونکہ چیمور سے تامہل تک سب ملک ہندوستان کے ہیں، تامہل، سندان چیمور اور کھمبات میں جامع مسجدیں ہیں اور بلا روک ٹوک مسلمانوں کے احکام یہاں جاری کئے جاتے ہیں،

یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا لباس ایک ہے، بال بھی ایک ہی طرح کے رکھتے ہیں، ان کا لباس ازار اور کرتہ ہے، تاجران کا لباس قمیص اور چادر (لنگی) ہے۔

بدھ ریاست کا تذکرہ

ابن حوقل کے عہد میں ملتان سمیت سات ریاستیں اطراف سندھ میں تھیں، ان میں ہمیں ایک ریاست بودھوں کی بھی نظر آتی ہے ۳۰۳ھ سے ۴۱۶ھ تک کے طویل دور میں اس ریاست کو کسی قسم کا گزند نہیں

پہنچا، اس کی سالمیت کچھ مجروح نہیں ہوئی،

بشاری مقدس کا بیان

اب ہم صاحب احسن التقاسیم بشاری مقدس (۳۷۵ھ) کے مشاہدات سفر سے فائدہ اٹھائیں گے، اس نے بھی سندھ کو دیکھا ہے، ہندوستان میں گھوما ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں کی ماتحتی میں، اور غیر مسلموں کو مسلمانوں کی ماتحتی میں زندگی بسر کرتے پایا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، وہ بہت اہم ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ ایک قیمتی اور گراں بہا سرمایہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ اپنے تاثرات اور مشاہدات کے سلسلہ میں جو کچھ کہتا ہے، اس سے ہمیں کچھ نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، یہ باتیں نئی بھی ہیں اور دلچسپ بھی ——

وہ ہمیں بتاتا ہے :-

"شہر منصورہ میں چار دروازے ہیں -

۱- باب البحر

۲- باب طوران

۳- باب سندان

۴- باب ملتان

اس شہر کے لوگ ہوشیار اور ذہین ہوتے ہیں، ان میں مروت اور اسلام کا بڑا حصہ ہے، علم اور تجارت کا یہ مرکز ہے، یہاں کی ہوا گرم ہے، سردی کم پڑتی ہے، بارش خوب ہوتی ہے گرمی زیادہ ہوتی ہے، لوگ پانی دریائے سندھ سے پیتے ہیں "

اب اسی کی زبان سے ایک غیر مسلم ریاست میں ماتحت اور محکوم مسلمانوں کی داستان عفت و وقعت سنیئے :-

" دیبنہ منصورہ سے بڑا شہر ہے یہاں تر و تازہ اور پاکیزہ باغ بکثرت ہیں

جو سطح زمین پر پھیلے ہوئے ہیں دریا بھی بکثرت ہیں، بارش بھی خوب ہوتی ہے یہ شہر مجموعہ خوبی ہے یہاں کے درخت لمبے لمبے ہوتے ہیں اور پھل اچھے، لوگوں کے چہرہ سے امارت ٹپکتی ہے، نرخ بھی ارزاں ہیں، تمام شہر بادام اور اخروٹ کے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے، کیلے اور نرمیووں کی بڑی کثرت ہے، ہوا مرطوب ہے، گرمی بھی خوب پڑتی ہے، غیر مسلموں کی آبادی بہت زیادہ ہے مسلمان بہت کم ہیں پھر بھی ان کے لئے ایک الگ حاکم ہے، جو ان پر اسلامی طریقہ سے حکومت کرتا ہے۔

"قنوج بڑا شہر ہے، اس کے ساتھ بیرون فصیل بھی آبادی ہے، اس شہر میں گوشت بکثرت اور ارزاں ملتا ہے، پانی بھی میٹھا ہے، باغوں سے یہ شہر گھرا ہوا ہے، کیلے سستے، صورتیں اچھی، پانی لذیذ، شہر وسیع اور فائد مند منڈی ہے، یہاں آٹا کم ملتا ہے، باشندوں کی عام خوراک چاول ہے، اگر مسلمان روٹی کھاتے ہیں، جامع مسجد فصیل کے باہر ہے، ہمارے بڑے علما یہاں موجود ہیں،

یہاں غیر مسلموں کی آبادی بہت ہے اور مسلمانوں کی کم، لیکن مسلمانوں کے لئے ایک الگ حاکم ہے، یہ حاکم راجہ کے ماتحت ہوتا ہے، اس کا خطاب "ہنرمند" ہوتا ہے، یہ مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہے، اور آپس کے تنازعہ کا فیصلہ اس کے ذمہ ہوتا ہے، غیر مسلم حاکموں کے پاس مسلمانوں کے مقدمات نہیں جاتے،"

مسلمانوں کی رواداری کی انتہا اب ذرا اس کی جھلک بھی دیکھتے چلئے کہ مسلمانوں کی ماتحتی میں جو ہندو رہتے تھے، ان کا کیا حال تھا؟

—— تاکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجائیں!

آیئے اس سیاح کے منہ سے ہم یہ داستان بھی سُنیں جس سے ابھی ابھی پچھلی داستان سن چکے ہیں، وہ ہمیں بتاتا ہے :-

"ملتان منصورہ سے زیادہ آباد ہے، یہ بڑا آسودہ شہر ہے، یہاں کے لوگوں کی اخلاقی حالت بہت اچھی ہے، یہاں کے بادشاہ عادل ہوتے ہیں ملتان کا بادشاہ مصر کے فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھتا ہے، وہ طاقت ور اور عادل بادشاہ ہے، ملتان والے شیعہ ہیں، یوں تو اس ملک میں بکثرت مندر ہیں، جہاں مختلف قسم کی مورتیاں ہیں، مگر زیادہ مشہور دو مندر ہیں

۱- بھیروا کا مندر،

یہاں دیوداسیوں کی کثرت ہے، ان کی بدکاری کی آمدنی کا ایک حصہ پجاری لے لیتا ہے، جو شخص یہ چاہتا ہے کہ میری لڑکی کی عزت ہو، وہ اس کو دیوداسیوں میں شامل کر کے مندر کے لئے وقف کر دیتا ہے —— اس مندر کے لئے دوسرے اوقاف بھی ہیں —— !

میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ مرتد ہو کر ہندو ہو گیا تھا، اور اس مندر کے بُت کی پوجا کرتا تھا، —— پھر مسلمان ہو گیا!

۲- ملتان کا مندر،

یہ مندر ایک محل ہے جو بازار کے آباد ترین علاقہ میں واقع ہے،

ناقابلِ تردید شواہد

اس بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ :-

۱- مرتد کو غایت رواداری سے قتل نہیں کیا جاتا تھا،

۲- مندروں کی حفاظت کی جاتی تھی، ان کے اوقاف قائم رہتے تھے، پوجا پاٹ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی تھی

۳- اگرچہ یہی بشاری مقدس ملتان کے ذکر میں ایک جگہ لکھتا ہے :-

"تمام بازار میں کسی عورت کو بناؤ سنگار کئے ہوئے نہ دیکھ سکو گے ۔ نہ کوئی کھلے طور پر ان سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے گا"

لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مندر میں دیوداسیاں بدکاری کراتی تھیں، پجاری ان کی آمدنی کا ایک حصہ رکھ لیتا تھا، مگر حکومت اسلامی اس اندرونی معاملہ میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

۴- مندروں پر چڑھاوے چڑھانے کی ہندوؤں کو عام اجازت تھی

۵- جتنے مندر ہندوؤں کے فتح کے وقت موجود تھے، وہ سب ہندوؤں کے پاس رہنے دیئے گئے اور وہ وہاں آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض مذہبی انجام دیتے رہے،

ان شواہد کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ مسلمانوں کی حکومت تلوار کے زور پر قائم تھی تو اس کی بات کون مانے گا؟

امر واقعہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان (خاص طور پر عرب کے مسلمان) جہاں بھی گئے اپنے کردار وعمل کی روشنی میں وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس دعوت سے خواہ کتنا ہی بغض اور نفرت کا شروع شروع میں اظہار ہوا ہو لیکن چونکہ یہ حق اور صداقت پر مبنی تھی، اس لئے زیادہ مزاحمت نہ کی جا سکی، بالآخر طبع سلیم رکھنے والوں نے یہ دعوت قبول کی، اور اسلام کے جھنڈے تلے آنے پر مجبور ہو گئے

خلافت فاطمیہ

ملتان میں اسماعیلی حکومت کا قیام

سندھ کے متعلق ہم اس سے پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے زمانہ میں، بلکہ مسلمانوں سے بھی پہلے اس کا رقبہ وہ نہیں جو اب ہے، بلکہ یہ ایک وسیع مملکت کا نام تھا، ملتان جو اب صوبہ پنجاب کا ایک شہر ہے، اسی سندھ میں شامل تھا، اور محمد بن قاسم کی فتح کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ملتان ایک مستقل مملکت بن گیا، جس کا سندھ کی حکومت سے جو خلافت اسلامیہ کی تابع تھی، کوئی تعلق نہیں رہ گیا، یہاں بنو منبعہ کا خاندان حکمران تھا، تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۳۷۲ھ تک یہی خاندان یہاں حکومت کرتا رہا، مسعودی، اصطخری، ابن حوقل ابن رستہ سب نے یہاں بنو منبعہ کی آزاد اور خود مختار حکومت کا ذکر اپنے مشاہدات سیاحت میں کیا ہے بشاری مقدسی نے اس علاقہ کا سفر کیا تو اس نے بنو منبعہ کے بجائے اسماعیلیوں کی حکومت بتائی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریباً ۳۷۲ھ میں ملتان کی حکومت اسماعیلیوں کے ہاتھ میں آئی، یہ پہلی حکومت تھی جو شیعہ جماعت کے ایک طبقہ کے ہاتھ میں آئی، یہ لوگ فاطمی خلافت کا خطبہ پڑھتے تھے اور خلافت عباسیہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے،

فرقہ اسماعیلیہ اسماعیلی فرقہ درحقیقت شیعہ فرقہ کی ایک شاخ ہے، اس میں چونکہ قوت عمل زیادہ تھی اس لئے بہت مختصر مدت میں اس نے ایسے تاریخی کارنامے انجام دیئے جو صفحۂ دہر پر ہمیشہ یادگار رہیں گے، عبیداللہ المہدی افریقہ اور مصر میں سلطنت اسماعیلیہ کے

بانی ہیں، انہوں نے نہایت نامساعد حالات میں رائے عامہ کو رفتہ رفتہ اپنا ہم نوا بنایا اور آہستہ آہستہ اپنی دعوت اتنی مستحکم کرلی کہ خلافتِ فاطمیہ کے نام سے ایک مستقل حکومت قائم ہوگئی، یہ حکومت کوئی بے مایہ اور کمزور حکومت نہیں تھی، یہ اگرچہ مشکلات ومصائب میں گھری تھی، لیکن اس نے ایسے تعمیری اور تاریخی کارنامے انجام دیئے، جو ناقابل فراموش ہیں، مصر کا مشہور شہر قاہرہ اس خاندان کے دورِ حکومت کی یادگار ہے، قاہرہ کی مشہور بین الاقوامی یونیورسٹی جامعۃ ازہر اس خاندان کی تعلیمی سرگرمیوں کا زندہ جاوید کارنامہ ہے، شروع میں تو قاسم کی حکومت اگرچہ صرف افریقہ تک محدود تھی، لیکن بہت جلد جوہر صقلی ایک نومسلم غلام نے اس مملکت کی وسعت میں اضافہ شروع کردیا، نہ صرف مصر پر قبضہ ہوگیا، بلکہ فاطمیوں کی فتحمند فوجیں اور زیادہ کامیابی اور حوصلہ مندی کے ساتھ آگے بڑھنے اور کامیابی حاصل کرنے لگیں، اسماعیلی صرف اسی پر قانع نہیں تھے کہ وہ ایک حکومت کے بانی ہیں، ایک مملکت کے مالک ہیں، وہ نظم وترتیب کے ساتھ اپنے دعاۃ اطراف واکنافِ عالم میں بھیجا کرتے تھے، یہ داعی تاجروں کے روپ میں سیاحوں کے لباس میں، مسافروں کے بھیس میں شہر شہر اور قریہ قریہ پہنچتے تھے، نہایت خفیہ طور پر دعوت کا کام شروع کرتے تھے، کامیابی ہوجاتی تھی تو دعوت کا پیام اور زیادہ پھیلنے لگتا تھا، ناکامی کی صورت میں وہ جگہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے تھے، دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں اس جماعت کو اجتماعی اور انفرادی طور پر بڑی بڑی مصیبتوں سے سابقہ پڑا، اس جماعت کے افراد نے بڑے استقلال واستقامت کے ساتھ ہر تکلیف برداشت کی، موت تک کو لبیک کہا لیکن جس دھن میں لگے ہوئے تھے اس سے غافل نہ ہوئے، مرتے تھے، تباہی اور ہلاکت کے شکار بنتے تھے، ظلم اور سفاکی کی چکی میں پیسے جاتے تھے، اطمینان وعافیت سے محروم تھے، خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، آج یہاں، کل وہاں، صبح کہیں، شام کہیں، لیکن اپنے مقصد سے غافل نہیں تھے، اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے، کسی بڑی سے بڑی مصیبت سے ہراساں اور خائف نہیں ہوتے تھے، کسی قہار سے قہار حکومت

اور طاقت سے مرعوب اور دہشت زدہ نہیں ہوتے تھے اسب سے ٹکر لینے کو تیار رہتے تھے، اور جب وقت آجاتا تھا تو پورے سکون واطمینان کے ساتھ موت کو لبیک کہتے تھے، اور پوری بے نیازی اور بے پروائی و بے خوفی کے ساتھ اس دنیا سے ہنستے مسکراتے رخصت ہو جاتے تھے،

اسماعیلی داعیوں کی آمد

شروع ہی سے اسماعیلی داعی وقتاً فوقتاً سندھ میں آتے رہے، اپنا کام کرتے رہے، لیکن منصورہ میں انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، ناکامی سے دل برداشتہ ہونا تو یہ جانتے ہی نہیں تھے، ہر ناکامی ان کے سمند عزم پر تازیانہ کا کام کرتی تھی، اور یہ پہلے سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتے تھے، منصورہ میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو یہ داعی ملتان کی طرف بڑھے، یہاں کامیابی ان کی منتظر تھی، پہلے تو یہاں خفیہ طور پر دعوت کا کام شروع ہو گیا، جب وہ برگ و بار لایا اور عوام کی ایک معقول تعداد ہم نوا ہو گئی تو مصر کے اسماعیلی خلیفہ اور امام العزیز باللہ (متوفی ۳۸۶ھ) نے ایک فوجی مہم حلیم بن شیبان کی سرکردگی میں روانہ کی، یہ مہم ایسے راستہ سے ملتان پہنچی کہ اس سے اور سندھ کی حکومت سے کسی مقام پر ٹکر نہیں ہوئی اس مہم کا راستہ کیا تھا؟ یہ بات واضح طور پر نہیں معلوم، ایک خیال جو بڑی حد تک قرین قیاس ہے یہ ہے کہ یہ مہم خراسان کے راستہ سے آئی ہوگی، اور یہ بات تاریخی شواہد سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خراسان اسماعیلی امامت سے بہت زیادہ متاثر تھا، اور یہاں اسماعیلیوں کا خاصا اثر ورسوخ تھا، ایک دوسرا قیاس یہ بھی ہے، اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ یہ مہم مکران کے راستہ آئی ہو، کیونکہ مکران کا والی بھی اسماعیلی دعوت سے بہت متاثر تھا، اور خطبہ فاطمیوں کا پڑھتا تھا، بہرحال یہ مہم کسی راستہ سے بھی آئی ہو، اس سے اور سندھ کی حکومت سے کسی جگہ بھی تصادم نہیں ہوا، اس واقعہ سے حلیم بن شیبان کی احتیاط پسندی اور دور اندیشی ظاہر ہوتی ہے،

فاطمی خلافت کی فوجی مہم

یہ فوجی مدد جو پہنچی تھی ایک باقاعدہ پلان کے ساتھ اس نے کام کیا، اس نے یہ نہیں کیا کہ ایک بیک کمود سر ہوتے ہی ملتان کی حکومت پر حملہ کر دیا ہو، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم پڑھ آئے ہیں، دعوت کے ذریعہ اسماعیلی داعیوں نے فضا پہلے ہی ہموار کر لی تھی، اور رائے عامہ کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا، یہ مہم جب ملتان کے قریب پہنچ گئی تو اسماعیلی داعیوں نے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ اہل شہر نے اپنے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی بنو منبعہ چونکہ اس اچانک بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، گھبرا گئے، ابھی وہ کوئی اقدام اس بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلہ میں نہیں کر پائے تھے کہ یہ مہم پہنچی اور حلیم بن شیبان بہت معمولی سی جدوجہد کے بعد بنو منبعہ کو ختم کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، یہ جنگ اسلحہ اور ہتھیاروں کی اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی فکر و دانش کی، اسماعیلی بڑی ہوشیاری سے ایک فن کار کی طرح نقشہ بناتے تھے اور اس پر قدم بہ قدم عمل کرتے تھے، ان کی کامیابی کا یہی راز تھا، بہرحال حلیم بن شیبان کی حکمتِ عملی کامیاب رہی، اور بغیر کسی بڑی خونریزی اور جنگ کے ملتان کی حکومت اس کے ہاتھ میں آ گئی! اور بغیر کسی خرخشہ کے اطمینان اور بے فکری کے ساتھ وہ حکومت کرنے لگا۔ رعایا کا بڑا طبقہ پہلے ہی سے ہم نوا ہو چکا تھا، حکمران خاندان فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا، سندھ کی حکومت میں یہ سکت نہیں تھی کہ وہ ملتان کی حکومت سے الجھ کر خواہ مخواہ اپنی مشکلات میں اضافہ کرتی۔ قدرت کی طرف سے حلیم بن شیبان کو یہ ایسی سہولتیں حاصل تھیں، جن سے اگر وہ پورا پورا فائدہ نہ اٹھاتا تو کفرانِ نعمت کا موجب ہوتا، چنانچہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کامل یکسوئی کے ساتھ کاروبار حکومت سنبھال کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا، حلیم بن شیبان کو حکومت چلانے کا سلیقہ تھا۔ اس نے جو حکومت قائم کی، وہ ہر اعتبار سے مضبوط و مستحکم ثابت ہوئی، اس نے اس انداز میں حکومت کی کہ کبھی بھی داخلی یا خارجی دشواری سے اسے سابقہ نہیں پڑا، وہ رعایا

کو خوش رکھنے کی بھی کوشش کرتا تھا - اور حکومت کے رعب و وقار میں کسی قسم کی کمی بھی نہیں گوارا کرتا تھا - دوسرے الفاظ میں وہ رعایا کو کسی جائز شکایت کا موقع بھی نہیں دیتا تھا، اور جو اپنی بدقسمتی سے حکومت کی تعزیر و عقوبت کی زد میں آجاتا تھا، اسے پھر سبق آموز سزا بھی مل کر رہتی تھی، اس نے حکومت کا ڈھانچہ کچھ ایسے اسلوب پر قائم کیا کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نئی حکومت ہے - ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ کوئی مضبوط اور مستحکم اور کہن سال حکومت ہے، جو زمانہ کے سرد و گرم دیکھ چکی ہے اور بڑے انقلابات کے بعد اس نے یہ استحکام حاصل کیا ہے -

حلیم بن شیبان کا دورِ حکومت

حلیم بن شیبان متعدد حیثیات سے چند خاص امتیازات کا حامل ہے -

۱- ہندوستان میں وہ پہلا شخص ہے جس نے اسماعیلیوں کی حکومت قائم کی -

۲- ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلم قومیت سے روگرداں ہو کر سیاسی اتحاد و پیمان کی طرح ڈالی ——— اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ مسلمان والی اور حاکم، ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ رعایت اور مروت کرتے تھے، اگر جنگ و پیکار کی نوبت آ بھی جاتی تھی تو وہ باہمی جنگ کے حدود سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی، لیکن حلیم بن شیبان نے سندھ کے والی کو یکسر نظر انداز کر دیا - اور آس پاس کے ہندو راجاؤں سے پیمان صلح و مودت استوار کیا، سیاسی معاہدے کئے، اور جنگی تعاون کا پروگرام بنایا!

بات یہ تھی کہ حلیم بن شیبان خلافت فاطمیہ کا داعی اور مناد تھا - وہ جانتا تھا اگر کبھی کوئی نازک وقت پڑا، تو سندھ سے مدد تو کیا ملے گی، ہاں اگر اس کے بس میں ہوا تو وہ استیصال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گا، مصر اور یمن اس قدر دور دراز واقع ہیں کہ ان سے کسی فوری امداد کی توقع نہیں کی جا سکتی - لہٰذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ہندوؤں

سے میل جول بڑھائے، اور امداد باہمی کا معاہدہ کرلے یعنی اگر ملتان پر سندھ، یا خلافت عباسیہ کے عساکر حملہ آور ہوں، تو راجہ اس کی مدد کریں، اور اگر اس کی برعکس صورت ہو تو ملتان کی حکومت، اپنے تمام ذرائع اور وسائل امداد و اعانت میں صرف کر دے، یہ بات مذہبی اور ملی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی عجیب اور افسوسناک ہو، لیکن کوئی شبہ نہیں سیاسی اعتبار سے یہ بڑی گہری اور مستحکم تدبیر تھی، اور شاید اس تدبیر کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک عرصۂ دراز تک ملتان پر فاطمی بلا فصل و غش حکومت کرتے رہے۔

ملتان کے مندر کا انہدام حلیم بن شیبان نے اپنے دور حکومت میں کچھ باتیں ایسی کیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

۱۔ ملتان میں ایک بہت بڑا مندر تھا، اس میں کئی من وزنی سونے کی مورتی تھی، یہ مندر بین الہند عظمت کا حامل تھا، دور دراز مقامات سے لوگ اس کی یاترا کے لئے آتے تھے، اس کے لئے بڑے بڑے اوقاف تھے، لاکھوں روپے کے چڑھاوے چڑھتے تھے، دیو داسیوں کے جھرمٹ تھے، مہنتوں اور پنڈتوں کا جم غفیر تھا، عبادت کرنے والوں اور پوجا میں مصروف رہنے والوں کی ایک جماعت تھی، اب تک مسلمانوں نے اس مندر سے تعرض نہیں کیا تھا نہ اس کے کسی معاملہ میں مداخلت کی تھی، یہ مندر مسلمانوں کے لئے ڈھال اور سپر کا کام دیتا تھا، اگر کوئی بڑا ہندو لشکر حملہ آور ہوتا تھا اور مسلمان قوتِ مدافعت سے محروم ہوتے تھے تو وہ اس مندر کو نذر آتش کر دینے کی دھمکی دیتے تھے، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہندو لشکر بے نیل و مرام واپس لوٹ جاتا تھا، لیکن حلیم بن شیبان نے اس مصلحت کی کوئی پروا نہیں کی، نہ گزشتہ تعامل اور رسومات پر عمل کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس نے بے تامل بت شکنی کے جوش میں اس مندر کو اور اس کی مورتی کو چور چور کر دیا،

یہ اقدام غلط بھی تھا اور مصالح سیاسی کے خلاف بھی، لیکن حلیم بن شیبان یہ کر گزرا اس حرکت کا اثر ان تعلقات و مواعید اور عہدناموں پر بھی پڑ سکتا تھا جو حلیم بن شیبان

اور دوسرے پڑوسی ہندو راجاؤں کے مابین ہو چکے تھے، لیکن ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر اُس نے یہ کام کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس اقدام سے ان معاہدوں پر کوئی اثر نہیں پڑا جو ہندو راجاؤں سے ہو چکے تھے: ان کے استحکام میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اپنی اہمیت اتنی تسلیم کرالی تھی کہ وہ اندرونی طور پر اپنے حدود مملکت میں جو چاہے کر گزرے، اور وہ ہندو قوم کے لئے کتنا ہی تکلیف دہ اور اشتعال انگیز ہو لیکن اس کا کوئی اثر ان تعلقات سیاسی پر نہیں پڑ سکتا تھا، جو ملتان اور دوسرے ہندو رجواڑوں میں قائم ہو چکے تھے،

یہی ایک واقعہ، یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ذہن و دماغ کے اعتبار سے جلیم بن شیبان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، بلکہ غیر معمولی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا، سندھ کی حکومت نے زیادہ سے زیادہ روادارانہ برتاؤ ہندوؤں کے ساتھ کیا، لیکن یہ ہمیشہ اس کے درپئے تخریب رہے، ملتان کی حکومت نے سب سے بڑے نہیں تو چند بہت بڑے مندروں میں سے ایک کو زمین کے برابر کر دیا، لیکن نہ اس پر یورش ہوئی، نہ یلغار کی گئی، نہ تعلقات ٹوٹے، نہ عہد نامے منسوخ ہوئے، جلیم بن شیبان کے تدبر کا یہ شاہکار ہے۔

محمد بن قاسم کی مسجد

اب ایک دوسرا واقعہ لیجئے،

ملتان میں ایک مسجد تھی، یہ مسجد محمد بن قاسم نے ملتان فتح کرنے کے بعد اپنے دورِ حکومت میں تعمیر کرائی تھی، یہ اب تک قائم تھی، اور اس میں پابندی سے نماز پنجگانہ ادا ہوتی رہتی تھی، لیکن جلیم بن شیبان کو چونکہ امویوں سے اُن کے معلوم و معروف حرکات کے باعث خوش فہمی نہ تھی، لہٰذا اس نے اس میں بھی تامل نہیں کیا کہ اس مسجد میں تالا ڈالدے، اُس نے اس مسجد کو حدود ممنوعہ میں شامل کرایا، اور خود ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی، اور یہاں نماز ہونے لگی،

جلیم بن شیبان نے صرف مسجد بنانے اور اسے آباد کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے فاطمی

مسلک کے تبلیغ کا کام بھی، زور شور سے شروع کر دیا، وہ جانتا تھا، جب تک مذہبی اعتبار سے وہ زیادہ سے زیادہ اپنی پوزیشن مستحکم نہیں کرے گا، اس وقت تک حکومت کی بنیادیں ڈانواڈول رہیں گی، حلیم بن شیبان نے اپنے مسلک کی تبلیغ و ترویج کے سلسلہ میں کافی جدوجہد کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں ایک عرصۂ دراز تک ملتان قرامطہ اور باطنی تحریک کا مرکز رہا ہے، اور یہاں کے اٹھے ہوئے فتنے دوسرے مقامات پر قیامت بن کر مسلط ہوئے ہیں، نہ جانے کتنے اکابر و صلحا کے قتل کے پروگرام، یہاں بنے اور ان پر دوسرے مقامات پر کامیابی سے عمل کیا گیا،

یکساں پالیسی

تاریخ میں ملتان کے فاطمیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے (حالانکہ نتائج و اثرات کے اعتبار سے یہ دور خاص اہمیت کا حامل ہے)، اس لئے ان کے حالات جستہ جستہ ملتے ہیں، اور حکمرانوں کی تاریخ آغاز و انجام کی تلاش میں بہت دشواری ہوتی ہے، بسا اوقات صرف قیاس اور شواہد سے کام لینا پڑتا ہے۔

بہرحال حلیم بن شیبان کے بعد تخت حکومت پر ہمیں شیخ حمید متمکن نظر آتا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ ۳۷۲ھ میں تخت نشین ہوا، اس کا عہد بھی واقعات و حوادث کے اعتبار سے کئی خصوصیتوں کا حامل ہے، شیخ حمید حلیم کا (غالباً) بیٹا تھا، متعدد بیانات اور شواہد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس نے حتی الامکان وہی پالیسی قائم رکھی، جو حلیم کی تھی،

۳۸۱ھ میں لاہور کے راجہ جے پال سے محمود غزنوی کے باپ امیر سبکتگین کی جنگ ہوئی اس جنگ میں راجہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، جنگ کا آغاز اگرچہ راجہ کی طرف سے ہوا تھا لیکن امیر نے غایت رواداری اور شرافت سے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کا راج پاٹ بھی اسی کے حوالہ کر دیا، ۳۸۱ھ میں راجہ کی بدعہدی اور غداری کے باعث دوسری جنگ ہوئی، اس جنگ میں بھی پانسہ امیر کے ہاتھ رہا، اور راجہ نے بُری طرح شکست کھائی، اس مرتبہ دریائے سندھ تک کا علاقہ غزنی کے ماتحت ہو گیا (یہ حصہ موجودہ ضلع پشاور کی سمت سے ہوا تھا)

…تحصیل، ضلع مردان، سرحد میں دریائے سندھ کے کنارے واقع … ماں ایک پہاڑ (؟) … آج تک جے پال کا … ملتا ہے

اس جنگ میں حلیم بن شیبان کی پالیسی کے مطابق شیخ حمید نے امیر کا ساتھ نہیں دیا، اسکی کوئی مدد نہیں کی، اس کے لئے کوئی سہولت نہیں بہم پہنچائی گئی، بلکہ حسب معاہدہ جے پال کی علانیہ یا خفیہ حسب موقع مدد کرتا رہا، امیر نے جب جے پال کو شکست دے دی تو ملتان کی طرف متوجہ ہوا، وہ ہندوکو تو معاف کر سکتا تھا کہ وہ اس سے برسر جنگ رہے، اور اسکی تخریب کے درپے رہے لیکن ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اسلام کا دعویٰ بھی کرے اور مسلمانوں کی تخریب بھی کرتا رہے، دوستوں کو چھوڑ دے اور دشمنوں سے پیمان وفا باندھے، دشمنوں کا ساتھ دے اور دوستوں کی جڑ کاٹنے میں مصروف ہو جائے،

اس باز پرس نے شیخ حمید کو پریشان کر دیا، ایک طرف منصورہ کی حکومت تھی جو کسی معرکہ میں اس کی دوست نہیں تھی بلکہ ہر وقت اس تاک میں رہتی تھی کہ موقع ملے تو اسے ہضم کر لے، دوسری طرف لاہور کا راجہ تھا جو مسلسل اور پے بر پے شکستیں کھا رہا تھا، اور امیر سبکتگین سے مقابلہ کی قوت سے محروم ہو چکا تھا، تیسری طرف امیر تھا جس کا مقابلہ کرنا شیخ کے بس سے باہر تھا، جب راجہ جے پال بہت سے ہندو راجاؤں کی مدد اور فوجی اعانت کے باوجود یہ کام نہ کر سکا تو شیخ حمید کیسے کر سکتا تھا، جس کا اس وسیع سرزمین پر کوئی یار اور مددگار نہ تھا، لہٰذا صورت حال کا صحیح اندازہ کر کے اس نے امیر سے صلح کر لی، اور خراج پر معاملہ طے ہو گیا، اور جب تک شیخ زندہ رہا، اپنے معاہدہ پر قائم رہا، یعنی اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے ترکوں کو شکایت کا موقع ملتا، شیخ حمید کے بعد اس کا بیٹا، شیخ نصر اقتدار و اختیار کا مالک بنا، اس نے بھی باپ کی پالیسی پر عمل کیا اور ترکوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنے ہی میں عافیت سمجھی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتوح داؤد بن نصر، سریرآرائے حکومت ہوا، یہ (غالباً) ۳۹۴ھ میں تخت نشین ہوا،

ابوالفتوح اور محمود غزنوی کی ٹکر

ابوالفتوح داؤد بن نصر بڑا من چلا آدمی تھا، موقع پرستی اس کے خمیر میں شامل تھی یہ بھی

اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ آس پاس کے مسلمان ملکوں سے کسی نازک موقعہ پر مدد نہیں مل سکتی، ہاں ان سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ضرور ہے، لہٰذا اس نے ہندو رجواڑوں اور راجوں سے پھر تجدید عہد کی، اور ۳۹۵ھ میں اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ بات ظاہر کر دی کہ اس کی پالیسی شیخ حمید اور شیخ نصر کی نہیں ہے، بلکہ خود کی وضع کردہ ہے، جس میں حلیم کی پالیسی بھی شامل ہے، خود کی وضع کردہ ہم نے اس لئے کہا کہ اگرچہ اس نے ہندوؤں سے رشتہ جوڑا تھا، لیکن وہ ملت دشمنی میں اتنا آگے نہیں نکل گیا تھا، جتنا ابوالفتوح داؤد،

۳۹۵ھ میں ایک ہندو راجہ سے جو ایک ریاست بھاٹیہ کا فرماں روا تھا، محمود غزنوی کی جنگ ہوئی، اس جنگ میں ابوالفتوح نے محمود کی کسی قسم کی مدد نہیں کی، البتہ راجہ بھاٹیہ کی ہر طرح سے اعانت کی، یہ بات محمود غزنوی کو ناگوار گزری، لیکن ٹال گیا، دوسرے سال ۳۹۶ھ میں وہ ایک لشکر لے کر غزنی سے صرف یہ مقصد لے کر چلا کہ ابوالفتوح کی سرکوبی کرے، راستہ میں لاہور پڑتا تھا، لاہور کے راجہ اور ملتان کے حکمران میں فوجی معاہدہ ہو چکا تھا، اس نے محمود کے لشکر کو اپنے حدود مملکت سے گذرنے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ بجائے اس کے کہ محمود غزنوی اور ابوالفتوح میں براہِ راست جنگ ہوئی، راجہ نند پال ——— جے پال کا جانشین ——— اور محمود غزنوی میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی، اس معرکہ کا انجام راجہ کی شکست فاش کی صورت میں رونما ہوا، اب محمود بھٹنڈہ ہوتا ہوا ملتان پہنچا، اب قیامت سر پر تھی، ابوالفتوح کو اپنے دوست اور کرم فرما راجہ آنند پال (راجہ لاہور) کا انجام معلوم ہو چکا تھا، اور اس واقعہ کا علم ہونے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی تھی، اس نے سوچا، جب اتنا بڑا راجہ جس کے پاس نہ فوج کی کمی تھی نہ روپیہ کی یوں شکست کھا کر دربدر مارا مارا پھرنے پر مجبور ہو گیا ہے، تو میں کیا کر لوں گا، لیکن یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ قلعہ کا پھاٹک کھول دے، اور بغیر کسی شرط کے محمود غزنوی کو خوش آمدید کہے۔

چنانچہ ابوالفتوح نے قلعہ بند ہو جانے کو مقابلہ کرنے کے بجائے ترجیح دی۔ غزنوی نے محاصرہ

کر لیا، سات روز تک یہ محاصرہ جاری رہا، شہر والے بھی صورت حالات کی نزاکت سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے، وہ ایک وفد بنا کر محمود غزنوی کے حضور میں پہنچے اور دونوں میں صلح کرا دی، محمود غزنوی اگرچہ فتحمند تھا، اور زیادہ سے زیادہ ذلت بخش شرائط پیش کر کے انہیں منوا سکتا تھا، لیکن اس کی عالی ظرفی نے اسے گوارا نہ کیا کہ مجبور اور بے کس دشمن پر زیادہ دباؤ ڈالے، اس نے صرف

۱- دو لاکھ درہم سالانہ خراج

۲- دریائے سندھ کے متصل علاقہ سے الحاق۔

پر صلح کر لی، جنگی مصالح سے اس علاقہ کا غزنی کے تابع اور زیر نگیں رہنا انسب تر تھا، ابوالفتوح کو یہ شرطیں ماننا پڑیں اس طرح اس کی عزت بھی بچ گئی، اور جان بھی، اور حکومت بھی، لیکن ابوالفتوح فطرت کی طرف سے بڑی سرکش ضدی طبیعت لے کر آیا تھا، غزنوی کے جاتے ہی پھر اپنے رنگ پر پلٹ آیا، وہی سرکشی، وہی باغیانہ انداز، وہی خودسری، اور خود رائی، اس کے بعض حاشیہ نشینوں نے اسے سمجھایا کہ ہاتھی سے گنّے نہ کھائے جو معاہدہ ہو گیا ہے، اس پر قائم رہے، اور عافیت و اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہے، لیکن وہ نہ مانا محمود کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے آزمودہ را آزمودن جہل است کے مقولہ پر عمل کیا، اور پھر ایک لشکر لے کر ملتان پر چڑھ دوڑا، اس مرتبہ اس نے کسی قسم کی رعایت نہیں کی، اور ملتان کو حکومت غزنی کے ساتھ باقاعدہ ملحق کر کے اس فتنہ کا خاتمہ کر دیا، جو نہ صرف غزنی کے لئے بلکہ مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت بن چکا تھا! یہ واقعہ ۴۰۱ھ کا ہے ـــــــــ ابوالفتوح داؤد کی زندگی تو بچ گئی یعنی محمود نے اسے صرف گرفتار کر لینے پر اکتفا کیا، سزائے قتل نہیں دی لیکن اس کے جوش غضب اور جوش انتقام کی زد میں ملتان کے شہر بھی آگئے، اور وہ لوگ خاص طور پر آتے، جو ابوالفتوح کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔

حلیم بن شیبان کی مسجد | حلیم بن شیبان کے بارے میں ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ جب

ملتان پر قابض ہوا تو اس نے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد پر تالا لگا دیا اور ایک دوسری مسجد بنوائی یہاں نماز پنجگانہ ادا ہونے لگی، اب دیکھئے تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دہراتی ہے! محمود غزنوی نے جب ملتان پر قبضہ کر لیا، اور یہ پورا صوبہ غزنی سے ملحق کر لیا، دشمنوں اور مخالفین کو سزائیں دے لیں، ابوالفتوح کو گرفتار کر کے غورک کے زندان خانہ میں نظر بند کر دیا، تو اس نے سب سے پہلے پہلا کام یہ کیا کہ جو مسجد حلیم بن شیبان نے بنائی تھی اسے بند کر دیا، اور محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کا تالا توڑ دیا ——— اب حلیم بن شیبان کی مسجد ارض ممنوعہ تھی، کوئی وہاں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا، اور محمد بن قاسم کی مسجد کے دروازے نمازیوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے! تاریخ نے اس طرح کے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں، ان میں اگرچہ کوئی ندرت نہیں، لیکن اتنے سبق آموز ہیں کہ ان کا ذکر کئے بغیر چارہ نہیں!

منصورہ پر اسماعیلیوں کا قبضہ

اسماعیلیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ شکست کھانے کے باوجود ہار ماننا نہیں جانتے تھے!

سنہ ۴۰۱ھ میں ملتان کا صوبہ سر ہوگیا، اسماعیلیوں کی حکومت ختم ہوگئی، اسماعیلی فرماں روا گرفتار کر کے نظر بند کر لیا گیا اور محمود غزنوی پورے طور پر مطمئن ہو کر غزنی واپس چلا گیا، لیکن اسماعیلی نچلے بیٹھنے والے نہیں تھے، وہ اپنی تدبیروں اور اسکیموں سے غافل نہیں تھے، ایک پل کے لئے بھی ان پر غفلت طاری نہیں ہونے پاتی تھی۔ وہ برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ جو کچھ کھو چکے ہیں، اسے کس طرح حاصل کریں؟

منصورہ پر اب تک ہباری خاندان حکومت کر رہا تھا، مرور ایام کا اثر جس طرح واقعات و حوادث پر پڑتا ہے، اسی طرح اشخاص و افراد پر قوموں اور ملتوں پر حکومتوں اور انسان کے قائم کئے ہوئے نظاموں پر بھی پڑتا ہے، گذشتہ صفحات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ منصورہ پر ہباری حکومت کس شان سے قائم ہوئی تھی، کتنی خوں ریزیوں کے بعد قائم ہوئی تھی، لیکن اب وہی ہباری حکومت تقویم پارینہ بن چکی تھی، نہ اس میں کوئی دم خم تھا، نہ رعب و سطوت، نہ استحکام تھا، نہ وقار شاہی،

وہ صرف ایک بے جان ڈھانچہ کی صورت میں موجود تھی، اور ہوا کا ایک جھونکا اس کے وجود کو ختم کر سکتا تھا، اسکی زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا، چنانچہ یہی ہوا،

ملتان کے ستم رسیدہ، تباہ حال، آشفتہ روزگار، خانماں برباد اور شکست یافتہ اسماعیلیوں نے اپنا جائزہ لیا، تو محسوس کیا کہ اگرچہ وہ شکست کھا چکے ہیں، اگرچہ ان کا دم خم ختم ہو چکا ہے، اگرچہ ان کی حکومت فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے، لیکن ان میں اب تک زندہ رہنے اور زندگی کو قائم رکھنے کی اُمنگ ہے۔ ان کا سینہ زندگی کی اس تمنا کو بروئے کار لانے کے جذبہ سے معمور ہے، وہ اب بھی کسی مقصد کے لئے مر سکتے ہیں اور، جو لوگ زندگی حاصل کرنے کے لئے موت کو لبیک کہنے پر تیار ہوتے ہیں، وہ کبھی نہ کبھی ہنچ سے کامیاب ضرور ہوتے ہیں۔

ملتان کے اسماعیلیوں نے اپنا بکھرا ہوا شیرازہ مجتمع کیا، اور منصورہ کی ہباری حکومت کا تختہ اُلٹ دیا ——— !

ملتان کی اسماعیلی حکومت ختم ہو گئی !

منصورہ میں اسماعیلی حکومت قائم ہو گئی !

بادشاہ مر گیا،

بادشاہ زندہ باد!

حکومت منصورہ کا خاتمہ لیکن یہ حکومت پندرہ سولہ سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی اگرچہ سومنات کے بعد ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی جب اس طرف سے گذرا تو منصورہ والوں نے اس کی فوج کو بہت پریشان کیا، جاٹوں اور میدول کو ہشکار دیا، انہوں نے اور زیادہ اشتعال انگیز حرکتیں کیں، محمود کو جب تاب نہ رہی تو اس نے منصورہ پر اچانک حملہ کیا، شیخ خفیف فرمانروائے منصورہ مقابلہ پر آیا، اور جی توڑ کر مقابلہ کیا لیکن تاب نہ لا سکا اور شکست کھانے پر مجبور ہو گیا۔

منصورہ کی اسماعیلی حکومت ختم ہو گئی، لیکن اسماعیلیوں کو فاطمی خلافت سے جو تعلق تھا وہ بدستور

قائم رہا، چنانچہ جیسے ہی ظاہری حکومت ختم ہوئی، باطنی حکومت کا آغاز ہوگیا یعنی خلافت فاطمی کی طرف سے ایک زمیندار سومرہ نامی کو روحانی تاجدار تسلیم کر لیا گیا اور جلد ہی اُس نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے ——— چنانچہ کچھ عرصہ بعد (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) یہ خاندان بھی مسند باطن سے تخت ظاہر پر رونما ہوا، اور کم وبیش پچھتر سو سال تک یہ بھی حکومت کے جوہر دکھاتا رہا۔

منصورہ فتح کر لینے کے بعد محمود غزنوی زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہرا، تھکا ہوا تھا، فوج پر ماندگی غالب آچکی تھی، گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ غزنی سے لے کر سومنات تک کی یلغار اسی کا حصہ تھی، پھر واپسی میں دوسری اُلجھنوں نے اور پریشان کر دیا، لہٰذا محمود نے مناسب یہی سمجھا کہ واپس چلا جائے اور سندھی جاٹوں کی سرکوبی کسی آئندہ موقع کے لئے ملتوی رکھے، محمود کا یہ اصول تھا کہ ایک مہم ختم کرتے وقت یہ فیصلہ اس نے کر لیا کہ جلد آنا ہے اور آتے ہی سندھی جاٹوں کا قلع قمع کرنا ہے۔

سندھی جاٹوں کا استیصال

اس ذہنی قرارداد کے ماتحت ۴۱۸ھ میں محمود دوبارہ ملتان آیا یہاں اس نے سندھی جاٹوں کی سرکوبی کا پروگرام بنایا اور نکل کھڑا ہوا، یہ جاٹ بالکل اجڈ اور گنوار تھے، مقابلہ کے لئے نکل پڑے، غزنوی کے لشکر کی ٹکر نہ سہ سکے، اور بڑی آسانی سے نیست و نابود ہو گئے، ان کے خاتمہ کے بعد، مالِ غنیمت اور لونڈیوں، غلاموں کا بہت بڑا انبار لے کر محمود غزنوی پھر اپنے دارالسلطنت غزنی پہنچ گیا ——— مقصود چونکہ صرف جاٹوں کی سرکوبی تھی، کسی دوسری طرف اس نے توجہ نہیں کی

اِنتشار و اختلال کی صدیاں

غزنوی، قباچہ ــــ خوارزم شاہ کی ترکتازیاں

سومرہ خاندان کا عروج و زوال ــــ سمہ قوم محکومی سے حاکمیت تک

تقریباً ساڑھے چار سو سال تک ،سومرہ، یا سامرہ خاندان نے سندھ کے علاقہ پر حکومت کی ، یہ خاندان بھی اسمٰعیلی (آغا خانی) تھا ، اس خاندان کی اصل و نسل کے بارے میں مورخین مختلف الآرا ہیں ، کوئی انہیں راجپوت ہندو قرار دیتا ہے کسی کا خیال ہے یہ راجپوت تو تھے لیکن مسلمان ہو گئے تھے ، علامہ سید سلیمان ندوی مغفور کی تحقیق یہ ہے کہ مخلوط النسل عرب خاندان ، بہرحال ان کی اصل و نسل کچھ بھی ہو ، یہ بات متفقہ ہے ، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ لوگ جس مسلک کے پیرو تھے ، وہ وہی تھا جو آج بھی آغا خانیوں کی صورت میں عرب اور بیرون عرب کے ممالک میں موجود ہے ، اسماعیلیوں کا ایک خاص وطیرہ یہ بھی ہے کہ جس ملک میں رہتے ہیں ، وہاں کے نام اختیار کر لیتے ہیں ، وہاں کی زبان بولتے ہیں وہاں کا لباس پہنتے ہیں ، وہاں کی معاشرت اختیار کر لیتے ہیں ، ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے عقائد پر اثر انداز نہیں ہوتی ، آج بھی بمبئی کھمبات اور دوسرے مقامات کے خوجوں یعنی آغا خانیوں کو دیکھ لیجئے ، نام ہندوانہ ، لباس ہندوانہ ، زبان مقامی ، لباس ہندوانہ لیکن عقائد کے اعتبار سے کٹر اسماعیلی یہ صورت صرف آج ہی نہیں ہے ہمیشہ سے چلی آتی ہے ، چنانچہ سومرہ خاندان کو بھی ہم اس انداز کا حامل دیکھتے ہیں ۔

غزنوی کی واپسی کے بعد بہرحال سلطان محمود غزنوی نے جب ملتان فتح کر لیا ، تو سومرہ نامی شخص نے ، مصر کی فاطمی حکومت کے داعی کی حیثیت سے پوشیدہ طور پر تبلیغ و دعوت کا کام شروع کر دیا ، ۴۲۲ھ میں سومرہ کا لڑکا راجہ پال باپ کے انتقال کے

بعد جانشین بنا، یہ "راجہ" اگرچہ کسی حکومت کا مالک نہیں تھا، لیکن اس خطاب سے اس لئے مخاطب کیا جاتا تھا کہ دولت مند تھا، بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ فاطمیوں نے اسے "شیخ" کا خطاب مرحمت کیا تھا، اور تمام سندھ کے اسماعیلیوں کے دلوں پر یہ حکومت کر رہا تھا، راجہ پال نے بار بار ــــ محمود غزنوی کے واپس جانے کے بعد ــــ ملتان اور سندھ میں بغاوتیں برپا کرائیں، لیکن سندھ پر حکومت کرنے کی حسرت پوری نہ کر سکا۔ اس لئے کہ محمود غزنوی اگرچہ اب اپنے وطن واپس جا چکا تھا لیکن اس کا قائم کیا ہوا انتظام موجود تھا، اس کے نام کی دہشت بھی اپنا کام کر رہی تھی، نظم مملکت میں اگرچہ تھوڑا بہت اختلال کبھی کبھی رونما ہو جاتا تھا، کہ سومرہ کی سازشیں کامیاب ہو جائیں اور حکومت کا تختہ الٹ جائے، لیکن اسماعیلی کسی حالت میں بھی ہار ماننے کے قائل نہیں تھے، وہ ہر شکست، ہر ناکامی، ہر پسپائی کے بعد اور زیادہ جوش و ہمت کے ساتھ تازہ دم ہو کر اپنی کوششیں جاری کر دیتے تھے، اس راہ میں کتنے ہی اور کیسے شدائد و مہالک کا سامنا کرنا پڑے، لیکن ان کے تیور میں فرق نہیں آتا تھا، وہ پوری عزیمت اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے تھے، چنانچہ غزنوی کے جانے کے بعد بھی ان کی سرگرمیاں نہ صرف یہ کہ سرد نہیں پڑیں، بلکہ ان میں اور اضافہ ہو گیا

نئی اسماعیلی حکومت ــــ سومرہ

بیس سال تک یہ خفیہ کشمکش جاری رہی، یہاں تک کہ محمود غزنوی کا انتقال ہو گیا، اس کے جانشین اتنی بڑی حکومت کو سنبھالنے کی اہلیت اور صلاحیت سے محروم تھے، دور دراز کے مقامات پر خاص طور سے زیادہ اختلال و انتشار کا اثر پڑا، آخر ۴۴۳ھ میں، جب غزنوی سلطنت کا چراغ حیات جھلملا رہا تھا، اور ہر آن اس کے بجھنے کا اندیشہ پیدا ہو رہا تھا، اسماعیلی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، اور سارے سندھ پر سومرہ خاندان کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی، اب جو شخص اورنگ نشین حکومت ہوا، اس کے حوالے میں یہ تو ثابت ہے کہ راجہ پال کا لڑکا نہیں تھا، کیونکہ وہ لاولد فوت ہو چکا تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ شخص تھا خاندان سومرہ ہی سے، اور اس کا لقب بھی سومرہ تھا، اس نے نیک نامی، اولوالعزمی اور بلند ہمتی کے ساتھ فرائض حکومت انجام دیئے۔ پندرہ برس حکومت کر کے یہ مر گیا، پھر اس کا بیٹا

راجہ سنگھر تخت نشین ہوا، اس نے بھی تقریباً اتنی ہی مدت تک حکومت کی۔ اس کے بعد انتقال ہو گیا۔ یہ بھی لاولد تھا اس لئے اس کی بیوی نے نظم مملکت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رانی کے دو بھائی تھے، جو رانی کی مدد کرتے تھے، اور نظم مملکت میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے، پھر شہاب الدین غوری نے سندھ پر حملہ کیا، ملتان اور دیبل وغیرہ علاقہ فتح کر لیا، سندھ کا والی علی کرماخ کو بنایا جو ۵۸۲ھ تک اس منصب پر مامور رہا، پھر ۶۰۱ھ میں یہ علاقہ بہ عہد ناصر الدین قباچہ، پھر ہمیں آزاد اور خودمختار نظر آتا ہے۔ پھر ۶۰۸ھ میں جب قباچہ دلی کی مرکزی حکومت سے آزاد ہو کر خود مختار فرماں روا بن گیا، تو اس نے سندھ پر خاص توجہ کی، اس نے سندھ کے متعدد مقامات فتح کر لیے اور ٹھٹھہ کے علاوہ سندھ کا سارا رقبہ تقریباً زیر نگین کر لیا، سومرہ خاندان کا اثر و اقتدار اب بھی موجود تھا اقباچہ نے اس طرف توجہ کی اور سومروں کو کچلنے کی سرگرم کوششیں شروع کر دیں، لیکن ٹھٹھہ اب تک ان کے تصرف میں تھا اور یہاں ان کی چھوٹی سی ریاست قائم تھی، پھر ۶۲۰ھ سے ۶۲۱ھ تک جلال الدین خوارزم شاہ سندھ کی سرزمین کو پامال کرتا رہا، اس نے ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا اور یہاں بیٹھ کر دوسرے مقامات پر تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری رکھا، خوارزم شاہ جب چنگیز کی آمد کے باعث مکران ہوتا عراق چلا گیا، تو پھر قباچہ نے سندھ پر توجہ کی اور اس مرتبہ ٹھٹھہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

نیا اسماعیلی مرکز

لیکن اسماعیلی اس مدوجزر اور شکست و ہزیمت، اختلال و انتشار سے ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوئے، ایک مرکز ہاتھ سے جاتا رہتا، دوسرا بنا لیتے چنانچہ اب انہوں نے ایک دوسرا مرکز قائم کر لیا، ایک سومرہ سردار محمد تور نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کیا اور یہی اسماعیلیوں کی حکومت اور دعوت کا مرکز بن گیا۔ اس نے ۶۲۵ھ تک حکومت کی، اس کے بعد جو دور آتا ہے، وہ تاریخ کا عجیب و غریب دور ہے، دہلی میں حکومتیں بدل رہی تھیں، بدنظمی اور انتشار کے آثار دور دراز کے علاقوں میں خاص طور پر نظر آتے تھے، سندھ کی حالت اور زیادہ ابتر تھی۔ اگرچہ باد مخالف میں سومرہ خاندان کا چراغ مملکت ٹمٹما رہا تھا، لیکن تیل ختم ہو چکا تھا۔ صرف ایک جھونکا اسے گل کر دینے کے لئے کافی تھا، خانہ جنگیوں نے اور سندھ پر بار بار دوسرے فرماں رواؤں

کی طرف سے مسلح اور بھرپور حملوں نے سومرہ خاندان کی حکومت کو متزلزل کر دیا، اور ۷۵۲ھ میں یہ حکومت بالکل ختم ہو گئی۔

اب ایک نئی طاقت اُبھر رہی تھی، یہ سمہ قوم تھی، مکران کو چھوڑ کر مغربی سندھ سے جنوبی سندھ تک سمہ قوم کی طاقت پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ قوم اب تک محکوم و درماندہ تھی، لیکن دم خم سے معلوم ہوتا تھا کہ حالات جیسے ہی ذرا بھی سازگار ہوتے، یہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے گی، اور سومرہ خاندان کی حکومت ختم کر دے گی۔

بعض وقت بہت چھوٹا سا واقعہ بہت بڑے واقعہ کا سبب بن جاتا ہے۔

سومرہ خاندان کے افراد نشۂ حکومت میں سرشار رہتے تھے، اپنی قوت و طاقت پر نازاں رہتے تھے۔ جو چاہتے تھے کرتے تھے کسی کو مجال دم زدن نہیں تھی، اخلاقی حالت بھی پست سے پست تر ہوتی چلی جا رہی تھی، شراب خوب پیتے تھے اور گزک کا استعمال بھی کرتے تھے، گزک کے لئے بھینسے کا گوشت بہت پسند کرتے تھے، ایک دن کوئی سومرہ کسی سمہ کے گھر سے بغیر معاوضہ کے جبراً ایک بھینس چھین لے گیا، اُسے ذبح کیا، کباب تیار کئے، اور شراب کا دور چلنے لگا، سمہ جب گھر واپس آیا تو بیوی نے ماجرا سنایا، اور طعنہ دیا، تم لوگ اتنے بے بس ہو گئے ہو کہ اگر تمہاری عورتوں کو بھی سومرہ اسی طرح چھین لے جائیں، تو کچھ نہ کر سکو گے، زبان کا گھاؤ تلوار سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، بات سمہ کے دل میں بیٹھ گئی اس نے اپنے چند دوستوں سے یہ بات کہی، آپس کے صلاح مشورہ کے بعد ایک جماعت تیار ہو گئی، جس نے بہت سے سومرہ خاندان پر حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، سومرہ اپنی کمزوری اور سمہ کی بہادری سے واقف تھے۔ انھوں نے چاہا بات دب جائے اور صلح پر ختم ہو جائے لیکن بات اب اتنی بڑھ چکی تھی کہ ان کے خاتمہ پر ختم ہوئی، سمہ کے سردار اُنار نے اپنی جماعت کو مسلح کیا اور سومرہ پر فیصلہ کن حملہ کر دیا، سومرہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، اُنار نے محمد تور اور ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا اور اپنا نیا دارالسلطنت بنایا جس کا نام ساموئی رکھا۔

اس طرح دیکھتے دیکھتے ایک خاندان کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور دوسرا خاندان حکومت

تخت پر متمکن ہوگیا، سندھ میں یہ اکثر ہوتا رہتا تھا، لیکن اس مرتبہ یہ حادثہ اس طرح رونما ہوا کہ پہلے سے کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے اور یوں لمحوں کے اندر سومرہ ختم ہو جائیں گے اور سمہ ان کی جگہ لے لیں گے۔

اسماعیلیوں کا خاتمہ

یہ وقت اسماعیلیوں کے لئے خاص طور پر بہت ہی مایوس کن اور تباہ کن تھا۔ قسمت مخالف ہو چکی تھی، حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے حکومتیں مٹ رہی تھیں، اقتدار کا چراغ گل ہو رہا تھا، اثر و رسوخ کی بنیادیں ہل رہی تھیں، دنیا کے گوشہ گوشہ سے اسماعیلیوں کی سطوت و ہیبت ختم ہو رہی تھی۔

۵۲۴ھ میں آمر با حکام اللہ کے انتقال کے بعد اسماعیلیوں میں اختلاف و افتراق کی بنیاد پڑ گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یمن خود مختار ہو گیا، سندھ اور ہند کے علاقے یمن ہی کے ماتحت تھے ادھر مصر پر کچھ روز بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کا قبضہ ہو گیا، اور فاطمی حکومت کی بچی کچھی ا(ک) مسند اٹھ گئی، اب سندھ کا تعلق یمن سے ہو گیا، یعنی وہاں کے داعی یہاں آنے جانے لگے، ۶۵۴ھ میں فتنۂ تاتار اٹھا اور ہلاکو خان نے نزاری حکومت کا تختہ الٹ دیا، اس طرح اسماعیلیوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار و اختیار کی باگ اس طرح نکل گئی کہ پھر وہ ان کے ہاتھ نہ آسکی، یوں سمجھنا چاہیئے کہ اسماعیلی جب اقتدار حکومت سے محروم ہوئے تو پھر کہیں بھی نہ جم سکے، اب ان کی حیثیت رعایا کی ہو گئی جو امن پسند تھے وہ عافیت کی زندگی بسر کرتے جو ہنگامہ آرا طبیعت کے مالک تھے، وہ تعزیر و انتقام کے مستحق قرار پاتے

سمہ خاندان کا تسلط

سمہ قوم کے برسر اقتدار آنے کے بعد حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ آغاخانی داعیوں سے سومرہ لوگ منحرف ہو گئے، لیکن کسی نہ کسی درجہ میں اپنی انفرادیت قائم رکھی اور اپنے جذبۂ دینی کی پرورش بھی کرتے رہے اور اپنی خفیہ تنظیم کا وجود بھی کسی نہ کسی طرح قائم رکھا

سب سے پہلا سومرہ، جو راجہ سوم رائے کے نام سے معروف تھا، محمود غزنوی کی فتح ملتان

کے بعد نمایاں ہوا، اور ۷۵۲ھ میں یہ خاندان ساڑھے چار سو سال تک انقلابات دور باد حوادث کا مقابلہ کرتے کرتے ختم ہوگیا اور پھر یہ کبھی نہ ابھر سکا یعنی سیاسی طاقت اور اقتدار نہ حاصل کر سکا!

وضاحت طلب داستان

ہم نے تاریخ ہند کے اس اہم حصہ کو قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے، اس لئے کہ ہماری نظر میں تاریخ ہند (عہد مسلمانان) کا وہ حصہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ لائق غور وخوض ہے، جو عربوں سے شروع ہوتا ہے،

عرب جب سندھ میں داخل ہوئے، تو اس سرزمین پر بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، ایک شخص بھی ایسا نہ تھا، جو خدائے واحد کے سامنے سر جھکاتا ہو، یا رسالت محمدیؐ پر ایمان لایا ہو، عربوں نے تلوار کا استعمال صرف میدان جنگ میں کیا، وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ رحم ورعایت اور مروت واحسان کا سلسلہ جنگ کی خوں ریزیوں کے ہجوم میں بھی جاری رکھا، اور اسی لئے بغیر کسی خاص سعی و کوشش کے یہاں اسلام پھلا پھولا، پروان چڑھا، اور ایک مختصر مدت میں حالت یہ ہوگئی کہ آبادی کا غالب ترین حصہ اسلام قبول کر چکا تھا، اور جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ بھی اسلام سے بہت زیادہ قریب آگئے تھے، اب اسلام یہاں مسافر اور اجنبی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا، وہ یہاں مقیم ہوگیا تھا، اس نے یہاں کا وطن اختیار کر لیا تھا، وہ یہاں کی زبان پر معاشرت پر رسم ورواج پر، تقویم پر، لباس اور غذا پر، تعلیم وتہذیب پر، معاشرت اور سماج پر اپنے ایسے گہرے نقش قائم کر چکا تھا، جو ان مٹ تھے، جو آج بھی باقی ہیں اور تا قیام قیامت باقی رہیں گے!

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ عربوں کا ہر حملہ جو کسی دوسرے ملک پر ہوتا تھا، ہوس ملک گیری، حصول مال وزر، اور حب جاہ ومنفعت کے لئے نہیں ہوتا تھا، ایک طرف ان کی جلالت کا یہ عالم تھا کہ

سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی!

دوسری طرف ان کے خلوص نیت کی یہ کیفیت تھی کہ مقصود،

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی!

وہ صرف کلمۂ الٰہی کی سربلندی کے لئے کفن سر سے باندھ کر گھر سے باہر نکلتے تھے، خلوص کبھی بھی بے اثر

نہیں رہتا، چنانچہ ان کے اسلامی خلوص کا پرتو کفر آشناؤں پر پڑتا اور جو لوگ ان کے بدترین دشمن ہو سکتے تھے، وہی بہترین دوست بن جاتے تھے۔

مسلمانوں کی تاریخ حیرت انگیز فتوحات سے لبریز ہے، وہ ہمیشہ کم تعداد ہونے کے باوجود اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد رکھنے والی، اور اسلحہ وساز وسامان جنگ کے اعتبار سے برتر اور بہتر افواج پر غالب آئے، یہ کرشمہ ہر ملک میں، ہر ویپ میں، ہر سرزمین پر ہمیں نظر آتا ہے لیکن سندھ میں عرب فاتحوں کے ساتھ مفتوح ہندوؤں اور بودھوں کا جو رویہ ہم دیکھتے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ ہندو اور بودھ عربوں کے اخلاق وطہارت پاکیزگی کردار وعمل اور حسن معاملات سے اتنے متاثر تھے کہ انہیں آتا دیکھ کر خود ہی قلعہ کے پھاٹک کھول دیتے تھے، خود ہی وفود لے کر ان کے پاس جاتے تھے، اور فائز المرام واپس آتے تھے، خود ہی بہ رضا ورغبت اپنے دفینوں اور خزانوں کا سراغ لگا کر انہیں بتاتے اور ان کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ رعایا اس لئے خوش تھی کہ وہ پہلی مرتبہ ایسے حاکموں سے روشناس ہوئی تھی جو سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرتے تھے، جو کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے، جو امیر سے غریب کا اور غریب سے امیر کا حق دلاتے تھے، جو نہ امیر کے ساتھ رعایت کرتے تھے، نہ غریب کی دل شکنی کرتے تھے، جن کے دربار میں ہر وہ شخص تقرب حاصل کر لیتا تھا، جس کی نیت صادق ہو، جس کا عمل بے داغ ہو، جن کی رواداری اور وسعت قلب، بت شکن ہونے کے باوجود اجازت دیتی تھی، کہ جو چاہے بتوں کو پوجے، جو مسجدیں بناتے تھے، وہی مندروں کو بھی باقی رکھتے تھے، یہ کردار اپنوں کا نہیں تھا، یہ وہی رعایا تھی جس نے بودھ اور ہندو عوام راجوں کے ظلم سہے تھے، اور ان مظالم کی یاد آج بھی اس کے دلوں میں نفرت اور بیزاری کا احساس پیدا کر دیتی تھی، اب آسے ایسے حکمران ملے تھے جن کی صورت انسانوں کی سی تھی، لیکن سیرت فرشتوں کے مانند تھی۔

اور عوام اس لئے ان پر جان دیتے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کی کوئی چیز نہیں چھینی، ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوا، ان کے اثر واقتدار میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا، آن

کی دولت و ثروت جوں کی توں محفوظ ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ محفوظ ہے، ان کا اقتدار و اختیار چھینا نہیں گیا بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا، ان کے شخصی قانون (پرسنل لا) میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی: وہ شراب پی سکتے ہیں، سود لے سکتے ہیں، رقص و نغمہ کی محفلیں مندروں کے اندر برپا کر سکتے ہیں، اپنی سماج، اپنے دھرم اور اپنے رواج کی ایک ایک شق، ایک ایک چیز پر عمل کر سکتے ہیں، جس منصب پر وہ پہلے فائز تھے، اب بھی وہ ان کے ہاتھ میں ہے، جو اختیار انہیں پہلے حاصل تھا، اب بھی وہ ان سے محروم نہیں کئے گئے، جو اعتماد ان پر سابقہ حکومت کرتی تھی، اب وہ اس سے بھی کچھ زیادہ اعتماد کے اہل اور سزاوار قرار دیئے گئے ہیں، پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ان پردیسیوں کا کھلے دل سے خیر مقدم نہ کرتے؟

اسلام کیسے پھیلا

دوسروں کو دیکھ کر انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ حاصل کرتا ہے ـــــ بے شک ان لوگوں کو اپنا دھرم عزیز تھا، اپنی سماج سے پیار تھا، اپنے رواج پسند تھے لیکن اب ان کے ساتھ ایک دوسرا دھرم بھی تھا، اب یہ ایک اور سماج کو بھی دیکھ رہے تھے، اب ان کی نظر ان رسوم پر ان رواجوں پر بھی تھی جو یہ نئے آئے ہوئے حاکموں کے ہاں دیکھ رہے تھے، انسان کی فطرت ہے کہ ایسے موقع پر وہ ضرور دل ہی دل میں اپنا اور غیر کا موازنہ کرتا ہے، اپنا احتساب کرتا ہے اور دوسرے پر تنقید کرتا ہے، اپنی خامیوں کو ٹٹولتا ہے، اور دوسرے کی خامیوں پر نظر رکھتا ہے، اور جب کوئی آخری فیصلہ کرتا ہے، تو دنیا کے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ یہ ادھر سے نکل کر ادھر پہنچ گیا!

مسلمانوں کو نماز پڑھتے ایک دوسرے سے مواخات اور مساوات کا برتاؤ کرتے، حاکم کو محکوم سے اور محکوم کو حاکم سے ملتے انہوں نے دیکھا، پھر موازنہ کیا، پھر احتساب کیا، بہت سے ایسے تھے جو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے، باپ دادا سے ترکہ میں پائے ہوئے تھے دھرم کو چھوڑ بیٹھے اور اس نئے دین کو اختیار کر لیا۔

یہ داستان اتنی دل آویز تھی کہ اسے لاکھ ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا، لیکن

ممکن نہ تھا کہ ضروری اور اہم گوشے نظر انداز کر دیئے جاتے، اس لئے سب سے پہلے ہم نے تسخیر سندھ کی طرف توجہ کی اور پہلے یہی داستان بیان کر ڈالی۔

اب قلم کا مسافر دوسری سمت اختیار کرتا ہے، اب وہ درۂ خیبر کے راستے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے گا اور اس راستے سے آنے والوں کے کارناموں، کردار و سیرت، طور و طریق، اور انداز و اسلوب کو بیان کرے گا، ہندوستان پر مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی، ایک ہزار سال کی مدت کم نہیں ہوتی، اس مدت میں بہت سے نئے خاندان ابھرے، بہت سی نئی حکومتیں قائم ہوئیں، بہت سی نئی شخصیتیں نمودار ہوئیں، ان سب کو بھی ان کا حق ملے گا، ان کی بھی وہ تمام باتیں زیر بحث آئیں گی، جو کسی نہ کسی حیثیت سے لائق اعتنا ہیں۔

اب وہ باب جو سندھ پر مشتمل تھا ختم ہوتا ہے اور وہ باب جو درۂ خیبر کے نشیب و فراز سے تعلق رکھتا ہے شروع ہوتا ہے ——— خدا کرے قلم اپنا فرض دیانت کے ساتھ ادا کرے!

حصّہ دہم

فتح ہند ــــ خیبر کے راستہ سے

اے آبِ رودِ گنگا تُو جانتی ہے ہم کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
اقبال ——————————————

محمود غزنوی

فتح و ظفر، اور تہوّر و شجاعت کی حیرت انگیز داستان

خیبر کا راستہ بہت قدیم ہے —— شاید اتنا ہی قدیم جتنا قدیم یہ دیس ہے!

سندھ کے سلسلہ میں ہم تاریخ کے خاص خاص حصص پیش کر چکے ہیں، اب شمالی ہند اور دوسرے اقطاع ہند کی باری آتی ہے، لیکن، قبل اس کے کہ قلم کا مسافر آگے بڑھے، ایک بات یہاں واضح کر دینی ضروری ہے ہماری اس تاریخ کا مقصد صرف مسلمان ہیں! ہم نے مسلمانوں کی کشور کشائی اور فتح و کامرانی کی داستان بیان کی ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے سینکڑوں اور ہزاروں برس پہلے اس دیس کا کیا رنگ تھا؟ اس پر ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی، ایک تو اس لئے کہ اس طرح ہم اپنے موضوع سے ہٹ جاتے، دوسرے اس لئے کہ مسلمانوں سے قبل کی تاریخ جو ہندوستان کی ہے، اُسے تاریخ کہنا ہی غلط ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ محفوظ رکھی، واقعات کے تحفظ اور استقصا میں جد و جہد کی مؤرخانہ کاوش سے ہر ہر واقعہ کی چھان بین کی، پھر جانچا، پرکھا، اور جیسا پایا کہہ دیا۔ مسلمان مؤرخ اس اعتبار سے دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ

انہی نے تاریخ نویسی کا صحیح اسلوب دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے دُنیا کو بتایا کہ تاریخ کیا ہوتی ہے؟ کس طرح لکھی جاتی ہے۔ ان مسلمان مؤرخوں نے تاریخی تنقید و احتساب کا فن ایجاد کیا شعرا مصاحب، مطرب، ندیم اور حاشیہ نشین بادشاہوں کی شان میں قصیدے پڑھتے رہے۔ بہادری میں انہیں رستم و اسفندیار، سخاوت میں حاتم دوراں، عدل و انصاف میں نوشیرواں، کشورکشائی اور فرمانروائی میں سکندر، دولت، دارا، حشم، فریدون۔ قرار دیتے رہے لیکن یہ مسلمان مؤرخ ——— پوری غیر جانبداری سے پوری احتیاط کے ساتھ تاریخ لکھتے رہے۔ اُن کے کارنامے بیان کرتے رہے۔ تعریف کے موقع پر مدح کی تنقیص کا موقع آیا تو سخت سے سخت تنقید کر ڈالی، نہ یہ زر و مال کے حریص تھے، کہ چند سکوں کے لئے اپنی متاع نثار کر دیتے، نہ یہ اتنے بزدل تھے کہ جان بچانے کے لئے جھوٹ بولتے نہ یہ اتنے متعصب تھے کہ اپنے ہم مذہب بادشاہ و سلطان کو چشم غیر میں برتر اور بہتر ثابت کرنے کے لئے سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید قرار دے دیتے، حق کا تقاضا ہوا تو انہوں نے مسلمان سلطان کے مقابلہ میں ہندو راجہ کی تعریف کی۔ بغیر کسی جھجک کے مسلمانوں کی کمزوریوں کے بیان میں بھی ان کا قلم اتنی ہی روانی سے چلا، جتنا تعریف میں چلا کرتا تھا، ان کی ایک سطر بھی، نہ مبالغہ کی حامل ہے، نہ مصلحت کی، نہ دروغ کی، انہوں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ پایا، جو کچھ محسوس کیا بلے کم و کاست پوری صداقت اور دیانت کے ساتھ اسے سپرد قلم کر دیا، اب خواہ اس کی زد مسلمانوں پر پڑتی ہو یا غیر مسلموں پر، مسلمانوں کی نیک نامی ہو یا بدنامی۔ انہیں سچ عزیز تھا، مسلمان عزیز نہ تھے یہی ان کا طغرائے امتیاز ہے، یہی وہ وصف ہے جس میں دُنیا کی کوئی قوم ان کی حریف نہیں بن سکتی!

اس کے برعکس ہندوؤں اور دوسری قوموں کی تاریخ کیا ہے؟ وہ مجموعہ ہے افسانوں، کہانیوں نظموں، روایتوں اور داستانوں کا، جن سے لطف سخن تو لیا جاسکتا ہے لیکن کسی واقعہ کی صحت کی تصدیق نہیں کی جاسکتی، ان ماخذوں میں مبالغہ ہے، غلط بیانی ہے، رائی کا پہاڑ ہے، پہاڑ کی رائی ہے عصبیت ہے تعصب ہے، سب ہی کچھ ہے اور بہ افراط ہے، کچھ سیاحوں کے سفرنامے ہیں، جن

سے صرف چند چیزوں پر روشنی پڑتی ہے وہ بھی ناقص، بقول ایک بلند پایہ مؤرخ اور ادیب کے "یہ چیتھڑوں سے گدڑی سی گئی ہے جو کہیں کہیں سے مسک بھی جاتی ہے"! لہٰذا ہم نے اس طرف توجہ نہیں کی، صرف بیان واقعہ کے طور پر جہاں ضرورت محسوس کی ہے، قدیم ہند کی تاریخ کا ضمناً تذکرہ کر دیا ہے!

امیر سبکتگین

یوں تو ہندوستان پر سکندر اعظم سے ماقبل و مابعد متعدد حملے ہوئے، لیکن اصلی اور فیصلہ کن حملہ محمود غزنوی کے دور میں ہوا، اس حملہ نے بھارت کو مستقل طور پر مسلمانوں کا نشیمن بنا دیا، سلسلۂ سخن کو مربوط رکھنے کے لئے ہم اپنی داستان محمود کے باپ سبکتگین کے دور سے شروع کریں گے۔

لاہور کے راجہ جے پال کا پہلا معرکہ امیر سبکتگین سے ۳۶۹ھ میں ہوا، راجہ اپنی فوج لے کر خود افغانستان کی طرف بڑھا غزن کے علاقہ میں ان پر بپا ہوا لیکن امیر کی افواج کے سامنے راجہ کی فوجیں کچھ نہ کر سکیں، آخر راجہ نے شکست تسلیم کی، خراج دینے کا وعدہ کیا اور واپس چلا آیا، راجہ کے ساتھ امیر کے سفیر بھی تھے، جو خراج کی رقم لینے آتے تھے، لاہور پہنچ کر راجہ کو غیرت آئی اور اس نے ان سفیروں کو گرفتار کر لیا، اب سبکتگین کے لئے پھر وجہ جواز پیدا ہو گئی، چنانچہ اس نے پھر حملہ کیا، اس مرتبہ بھی راجہ کے حصہ میں شکست آئی وہ بری طرح پسپا ہوا، اس کے بہت سے سپاہی مارے گئے، اس کا تمام مال و اسباب چھن گیا اور لپشاور تک کا علاقہ امیر کے قبضہ میں آگیا۔ جہاں اب تک جے پال کی بلاشرکت غیرے حکومت تھی، یہ واقعہ ۳۸۰ھ کا ہے۔

سبکتگین کا دورِ حکومت

امیر سبکتگین اپنی ہمت عالی سے غلام سے امیر بن گیا تھا۔ غزنی پر حکمرانی کرنے لگا، لیکن اس کی زندگی آفات و حوادث کی آماجگاہ تھی، داخلی اور خارجی حوادث اسے ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں دیتے تھے، ایک طرف لاہور کا مہاراجہ جے پال تھا جس کی من چلی طبیعت اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی، اور وہ خود چھیڑ چھیڑ

کو بار بار شکست کھانے کے باوجود جنگ کی دعوت دیا کرتا تھا، دوسری طرف بلخ اور بدخشاں کی داخلی شورشیں، سازشیں اور شورشیں تھیں جنہوں نے سبکتگین کو پریشان اور آشفتہ بنا رکھا تھا، سبکتگین ایک حکومت کا بانی تو بن گیا لیکن اس حکومت کو مستحکم کرنے کا وقت اسے نہ ملا اس کی ساری صلاحیت اور قوت صرف حفظ و دفاع میں صرف ہوئی، وہ اپنی اولوالعزمی کا کوئی زندہ جاوید ثبوت دنیا کے سامنے نہیں پیش کر سکا، لیکن اس کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ اس نے ہر طرح کے ناموافق اور نامساعد حالات کے باوجود جو حکومت قائم کر لی تھی، اسے قائم رکھ سکا۔

سلطان محمود کی تخت نشینی اور فتوحات کا آغاز

پھر امیر کے انتقال کے بعد حالات اور زیادہ ابتر ہو گئے۔

ہر اعتبار سے تخت نشینی کا مستحق محمود تھا لیکن وقت اور موقع کی بات، باپ کی وفات کے وقت وہ موجود نہ تھا، دوسرا بھائی مالک تاج و نگین بن گیا، لیکن محمود نے غایت درجہ شفقت اور تدبر سے کام لے کر اس مرحلہ کو بھی سر کر لیا، اور ۳۸۷ھ میں صاحب طبل و علم بن گیا

محمود جب تخت پر بیٹھا تو حالات سبکتگین کے عہد سے کہیں زیادہ نامساعد تھے، بغاوتیں شورشیں اور سازشیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں، لیکن چند ہی سال کی مدت میں بڑی خوبی کے ساتھ وہ ان تمام چیزوں پر غالب آ گیا، خراسان پر اس کا قبضہ مکمل ہو گیا، غزنی کی سالمیت تسلیم کر لی گئی

طبعاً محمود بڑا جیالا اولوالعزم اور من چلا شخص تھا، جو حکومت اسے باپ سے ورثہ میں ملی تھی وہ اس کے لئے کافی نہیں تھی، جو حکومت اس وقت اس کے قبضہ میں تھی اس پر بھی اس کی حوصلہ مندی قناعت کرنے پر راضی نہیں تھی، وہ بڑی آسانی سے آس پاس کی نسبتاً کمزور اسلامی مملکتوں پر ڈاکہ ڈال سکتا تھا، اور ان کی آزادی ختم کر کے اپنی فرماں روائی کا ڈنکا بجا سکتا تھا، لیکن اس نے عمداً اس سے احتراز کیا، اس نے اپنی ایک پالیسی مرتب کر لی، اور اس پر سختی سے عمل درآمد شروع کر دیا، پالیسی یہ تھی کہ معاصر مسلم حکومتوں سے از خود چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے، نہ ان کی آزادی اور استقلال پر حملہ کیا جائے، ہاں حالات مجبور کر دیں تو بات دوسری ہے

دوسرے یہ کہ جدوجہد کا اصلی مرکز ہندوستان کو بنایا جائے، محمود اس بات کو بھولا نہیں تھا کہ بدعہد جے پال بار بار وعدہ خلافیاں کر چکا تھا، بدعہدیاں کر چکا تھا، معاہدے توڑ چکا تھا، قول و قرار سے پھر چکا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ بار بار اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ کا آغاز کر چکا تھا جنگ و پیکار کی دعوت دے چکا تھا، ہر وقت آمادۂ فساد رہتا تھا، کیوں نہ ایک نیا اور وسیع میدان جدوجہد کا ہموار کیا جائے؟ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ اس کی ترکتازیوں اور سرگرمیوں کا مرکز بھارت ہی رہے گا، کوئی دوسرا ملک نہیں۔

(۱) جے پال اب تک زندہ تھا اور اپنی شرارتوں سے باز نہیں آیا تھا تاریخ فرشتہ نے صراحت کے ساتھ اس کی مفسدہ پردازیوں کا ذکر کیا ہے، یہ محمود کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بطور خود جے پال سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا پڑی بلکہ جے پال ہی اپنی حرکتوں کے باعث اس معرکہ کا سبب بنا۔ چنانچہ ۳۹۲ھ میں حوالی پشاور میں ایک زبردست اور خونریز جنگ ہوئی اس جنگ کا نتیجہ بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ راجہ بری طرح ہارا، بڑی بے ترتیبی کے ساتھ اس کی فوج بھاگی بے اندازہ مال غنیمت محمود کے ہاتھ آیا، راجہ نے پھر اطاعت کا عہد کیا، خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا، محمود نے راجہ سے قول و قرار لے کر اسے معاف کر دیا، اس کی حکومت بھی اسے بخش دی، لیکن دریائے جہلم کے کنارے تندنہ نامی قلعہ پر قبضہ کر لیا، اس قبضہ سے فوجی مصالح کے باعث دستبردار نہیں ہوا، (۲) دوسرے سال ۳۹۵ھ میں اس نے ایک اور مغرور اور متمرد راجہ سے برسر پیکار ہوا جو بھاٹنہ کا فرماں روا تھا، اس راجہ کو اپنی قوت و شوکت پر ناز تھا، شروع میں تو یہ محمود کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لایا، لیکن جب محمود اس کے سر پہ پہنچ گیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے، یہ علاقہ اتنا دشوار گذار تھا کہ راجہ کو یقین تھا محمود کے قدم نہیں پہنچ سکتے اور اگر کسی طرح وہ گرتا پڑتا پہنچ بھی جائے تو صحیح سلامت واپس نہیں جا سکتا، بھاٹنہ کے راجہ کو ایک بھروسہ یہ بھی تھا کہ ملتان کا مسلمان فرماں روا جو باطنی مذہب کا پیرو تھا، اس کا حلیف تھا اور یقین تھا کہ بہ وقت ضرورت حسب معاہدہ وہ اس کی مدد کرے گا، لیکن اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے

وہ بھاٹنہ کی مدد کیا کرتا ؛ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ کو ذلت بخش شکست ہوئی اور اس نے وفور غیرت سے خودکشی کر لی، محمود نے ملتان کی سرکوبی کسی آئندہ موقع کے لئے اٹھا رکھی، اور بھاٹنہ فتح کرنے کے بعد غزنی واپس چلا گیا، ایک سال آرام کرنے کے بعد ۳۹۶ھ میں محمود پھر اپنے دارالسلطنت سے نکلا اس مرتبہ پیش نظر ملتان کی سرکوبی تھی، ملتان تک پہنچنے کے لئے فوج کو لاہور سے گذارنا تھا لیکن لاہور کے راجہ نندپال نے (جو جے پال کے بعد تخت نشین ہوا تھا) اندیشہ ہائے دور دراز کے ماتحت محمود کو راستہ دینے سے انکار کر دیا، چنانچہ پہلی جھڑپ نندپال سے ہوئی، وہ محمود کا وار نہ سہ سکا مجبور ہو کر بھاگ کھڑا ہوا، محمود ملتان پہنچا اور فرماں روائے ملتان ابوالفتوح کے سر پہ تلوار بن کر پہنچ گیا، لیکن ابوالفتوح بھی ایک زیرک آدمی تھا، اس نے صورت حالات کی نزاکت کا اچھی طرح احساس کر لیا، باطنی عقائد سے (بظاہر) توبہ کی اطاعت کا حلف اٹھایا، آئندہ ہر مرحلہ پر امداد و اعانت کا وعدہ کیا، خراج ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس طرح موت کے چنگل میں پہنچ کر صحیح سلامت نکل آیا، محمود نے اسے معاف کر دیا، اور اس سارے علاقہ (موجودہ سرحد اور پنجاب) کا والسرائے ایک نومسلم شخص سکھپال کو بنا کر پھر اطمینان سے غزنی روانہ ہو گیا، ممکن تھا محمود بھی یہاں کچھ اور ٹھہرتا اور زیادہ وسیع و مستحکم پیمانہ پر انتظامات کر کے غزنی کا قصد کرتا، لیکن ایلک خاں نے خراسان میں شورش برپا کر رکھی تھی اور یہ بات محمود کے اصول سیاست کے خلاف تھی کہ کسی ایسے شخص کو نظر انداز کر دیا جائے، جو مملکت کے لئے خطرہ کا موجب بن رہا ہو۔

ایلک خاں کی خودغرضی کا انجام

ایلک خاں ترکستان کا امیر (فرماں روا) تھا، اس کی بیٹی سے محمود کی شادی ہوئی تھی، بظاہر ان دونوں میں ایسا مستحکم رشتہ تھا کہ اب کسی بدمزگی یا فساد کا کوئی امکان نہیں تھا، لیکن محمود جب اپنی فوج لے کر ہندوستان گیا تو یہاں میدان خالی دیکھ کر ایلک خاں کی طبیعت لہرائی، ملک گیری کی ہوس ہر رشتہ اور تعلق سے بے نیاز ہوتی ہے، ایلک خاں کو بیٹی سے زیادہ اپنا مستقبل عزیز تھا، چنانچہ موقع غنیمت سمجھ کر وہ خراسان پر چڑھ آیا، وہ بہت بڑا آدمی تھا اور فوج کی کمی تھی۔ نہ

زوسامان جنگ کی، دولت کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی، وسائل وذرائع بھی بہت زیادہ تھے، حلیفوں اور دوستوں کی بھی کمی نہ تھی، غرض بہ ظاہر احوال حالات ہر طرح سے سازگار تھے، اور لیقین تھا کہ ایلک خان اس مقصد میں کامیاب ہوگا، خراسان اور غزنی پر قبضہ کر لے گا، اور محمود اپنی بقیہ زندگی ہندوستان ہی میں بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

لیکن محمود، محمود تھا اسے جیسے ہی ایلک خاں کی شرارت اور مفسدہ پردازی کی اطلاع ملی، وہ طوفان بادوباراں کی طرح کڑکتا اور گرجتا روانہ ہو گیا۔

بلخ کے قریب گھمسان کا رن پڑا، محمود ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا، وہ اس طرح بلخ میں اپنے دشمن سے معرکہ آرا ہوا جیسے وہ بالکل تازہ دم ہے، ایسی خوں ریز لڑائی ہوئی کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی، اس لڑائی کا انجام ایلک خاں کی ہلاکت کی صورت میں نمایاں ہوا، اس جنگ میں محمود کی غیر متوقع کامیابی نے اسے جہاں اپنوں میں ہر دلعزیز اور محبوب بنا دیا، وہاں اغیار پر اور حریفوں پر اس کی دہشت بٹھا دی، محمود فاتح و کامراں کی حیثیت سے اس جنگ کو ختم کر کے پھر اپنے پایۂ تخت میں آ کر بیٹھ گیا، اور آئندہ کے منصوبے بنانے لگا کہ اب کہاں کا قصد کرے؟

متحدہ مورچہ کی تیاری یوں تو امیر سبکتگین سے جے پال نے خود ہی چھیڑ چھاڑ کر کے لڑائی کا سامان پیدا کیا تھا، لیکن اب محمود کی پیہم اور کامیاب یورشوں اور یلغاروں فتحمندیوں اور کامیابیوں نے ہندو راجاؤں کے اوسان خطا کر دیئے، آنند پال بھی جے پال کی طرح محمودی لشکر سے ہار چکا تھا، جان کی امان پا چکا تھا، حقوق و مراعات حاصل کر چکا تھا، پھر بھی شکست کا کانٹا دل میں برابر کھٹکتا رہتا تھا، ذلت کی یاد غیرت کو مہمیز کرتی رہتی تھی، بے بسی اور بے کسی کی زندگی بغاوت اور سرکشی کے طوفان ابھارتی رہتی تھی ادھر ہندوستان کے دوسرے راجہ اور مہاراجہ بھی محمود کی ان کامرانیوں کو خوف و دہشت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، لاہور کی حکومت کا خاتمہ اور آنند پال کا زوال یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ اب شامت آنے میں

دیر نہیں ہے۔

آج وہ، کل ہماری باری ہے!

لاہور کا مورچہ اگر آخری اور قطعی طور پر سر ہو گیا تو پھر سارے ہندوستان میں غزنوی یلغار کو روکنے کی سکت کسی میں باقی نہیں رہ جائے گی، اور محمود سب کو روندتا، پامال کرتا، شکست دیتا آگے بڑھے گا، اور جہاں تک چاہے گا بڑھتا چلا جائے گا۔ اس خیال نے باہمی رقابت اور نفسانفسی کے باوجود تعاون باہمی اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا کیا، آنند پال نے صورت حالات کا جائزہ لیا اور حقیقت کی تہ تک بڑی آسانی سے پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کر لیا لوہا گرم ہے، چوٹ لگانے کا بھی وقت ہے

سکھپال پر ڈورے

چنانچہ دھرم کے نام پر اپیلیں کی گئیں، ایک نے دوسرے کو فتوحات محمودی کے عواقب اور انجام سے ڈرایا اور مستقبل کی ایسی خوفناک اور بھیانک تصویر کھینچی کہ سب دہل اٹھے اور سب کو اپنے بچاؤ کی فکر پڑ گئی، مذہب کے نام پر عوام کو اور تحفظ دولت و ثروت کے نام پر خواص کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنا بہت آسان ہوتا ہے، چنانچہ محمودی یلغاروں کے خلاف بہت جلد ایک ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جس نے اس سرے سے لے کر اس سرے تک بھارت میں بحرانی کیفیت پیدا کر دی، نہ روپیہ جمع کرنے میں کوئی دقت پیش آئی، نہ سامانِ جنگ اور رسد کی فراہمی میں کسی قسم کی رکاوٹ سے دوچار ہونا پڑا۔

سب سے بڑا مرحلہ سکھ پال کا تھا، یہ نومسلم تھا اور محمود نے اس پر اس درجہ اعتماد کیا تھا کہ اسے اپنا نائب بنا کر، اور پشاور کو اس کا صدر مقام بنا کر اور تقریباً سارے (موجودہ مغربی پاکستان) کو اس کی تحویل میں دے کر وہ غزنی چلا گیا تھا، ہندو راجاؤں نے سوچا اگر کسی طرح سکھ پال قبضہ میں آ جائے تو پھر بغیر کسی زحمت کے محمود کے سارے مقبوضات چھینے جا سکتے ہیں پھر محمود کو آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہیں غزنی میں بیٹھے بیٹھے سن لے گا کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اس پر پانی پھر گیا، بھارت کے مقبوضات اس کے قبضہ سے نکل گئے اور ان پر حسب سابق بھارت کے لوگ پھر قابض اور متصرف ہو گئے۔

آنند پال کی فوجی تیاریاں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں پھر قنوج، گوالیار، کالنجر، دہلی اور گجرات کے راجاؤں نے بھی دل کھول کر مالی اور عسکری مدد دی تھی، بلکہ لاؤ لشکر لے کر جمع ہو گئے تھے کہ مقبوضات محمودی پر متحدہ حملہ کریں۔

سکھ پال کی کور نمکی

ادھر خوبیٔ قسمت سے سکھ پال بھی بہکاوے میں آ گیا، اس نے محمود کی عنایات خسروی کو فراموش کر دیا، اب تک وہ سلطان کے نائب کی طرح کام کر رہا تھا۔ اب اس نے سوچا اگر ہم لوگ کامیاب ہو گئے تو بہت ممکن ہے اس علاقہ کی بادشاہی میری تحویل میں آ جاتی، بہرحال یہ ثابت ہے کہ سکھ پال کی وفاداری ڈانواڈول ہو گئی، اور وہ مرتد ہو کر پورے طور پر آنند پال کا رفیق و دمساز بن گیا، میدان جنگ پشاور کے قریب ایک جگہ قرار پائی،

محمود غزنوی اپنے مقبوضات سے خواہ کتنی ہی دور رہے، لیکن حالات سے ایک پل کے لئے بھی غافل نہیں رہتا تھا، اس کا انتظام جاسوسی بہت مکمل تھا، دم بدم کی خبریں اسے ملتی رہتی تھیں، اور وہ ان کے مطابق اپنے اقدام و عمل کی راہیں متعین کرتا رہتا تھا، جب اسے راجگان ہند کے ایکے کی خبر ملی، پھر سکھ پال کی غداری اور نمک حرامی کی خبر پہنچی، پھر آنند پال اور راجگان ہند کے عسکری اجتماع کا حال معلوم ہوا تو وہ ذرا بھی پریشان اور ہراساں نہیں ہوا، اس نے پوری شان عزیمت و استقامت کے ساتھ اپنا لشکر لیا ——— جیسے کوئی تلوار اٹھا کر کمر سے باندھتا ہے ——— اور بھارت کی طرف چل پڑا،

(۱۱) راجگان ہند کی شکست فاش

محمود تن تنہا تھا اور مقابلہ میں راجگان ہند کا متحدہ لشکر تھا، تعداً محمود کمتر تھا اور اس کے حریف برتر، محمود کے پاس سامانِ جنگ بھی کم تھا، اپنا ہی جتھا کم تھے، دشمنوں کے پاس سامانِ جنگ کی فراط تھی اور سپاہ حد شمار سے خارج تھی، انہی دشمنوں میں ایک نیا گروہ بھی تھا یہ کھوکھر تھے، بڑے لڑاکو، بڑے جنگجو، بڑے بہادر، بڑے نڈر، بڑے وحشی اور سرفروش، لڑنا، مرنا ان کی

سرشت تھی ۔ مارنا مرنا ان کی جبلت تھی ان کی زندگی کا مشغلہ ہی یہی تھا کہ آدمیوں کا شکار کریں یہ آدمیوں کے آدم زاد شکاری آنند پال کے لشکر کی زینت تھے، اور محمودی لشکر پر چڑھ دوڑنے کے لئے بیتاب اور مضطرب تھے، بظاہر یہ نظر آ رہا تھا کہ اس مرتبہ محمود کو ایسی شکست ہوگی کہ گذشتہ ساری فتوحات پر پانی پھر جائے گا اور اس کے حریف اس طرح جیتیں گے کہ ان کی گزشتہ ساری ہزیمتوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا ——— لیکن قدرت مسکرا رہی تھی۔

یہ جنگ ۱۴۰۱ھ میں پوری خوں فشانی اور ہلاکت خیزی کے ساتھ برپا ہوئی تھی، فرشتہ نے اس جنگ کا حال کافی تفصیل و تطویل سے لکھا ہے۔ خود محمود بھی زیادہ پر امید نہیں تھا، وہ بار بار سجدے میں گرتا تھا اور خدائے قدوس سے گڑگڑا گڑگڑا کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتا تھا بہرحال جنگ شروع ہوئی، بہت جلد اس نے گھمسان کے رَن کی صورت اختیار کر لی، محمود کا پلّہ یوں بھی کمزور تھا، لیکن جب سر بہ کف کھوکھروں نے قیامت برپا کی تو شکست کے آثار پورے طور پر ظاہر ہو گئے، کھوکھر اس دلیری اور بہادری سے خندقیں پھاند پھاند کر محمود کے لشکر پر گرے کہ ذرا سی دیر میں انہوں نے بہت سے آدمیوں کو کشتہ کر دیا، عین اسی حالت میں کہ جنگ کا فیصلہ محمود کے خلاف اور راجگان ہند کے حق میں صادر ہونے ہی والا تھا قسمت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا راجہ آنند پال کا فیل کوہ پیکر ایک آتشبازی سے کچھ اس طرح بھڑک کر بھاگا کہ پھر سارے لشکر ہی کو بھیڑ چال کی طرح پسپا ہونے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا، اب کیا تھا محمود کی بن آئی اس نے اپنے لشکر کے سامنے پر زور تقریر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کے پاؤں جم گئے اور جو لوگ اب تک جم کر لڑ رہے تھے، وہ بھاگ کھڑے ہوئے، محمودی لشکر کے سرداروں نے بھاگتے ہوؤں کا تعاقب کیا اور انہیں کھدیڑ کھدیڑ کر موت کے گھاٹ اتارا،

مال غنیمت کی کثرت

اس جنگ نے نقشہ پلٹ دیا۔ آنند پال اور ہندو راجاؤں کے نہ صرف بے شمار سورما اور ساونت مارے گئے، بلکہ ان سب کو بڑی ذلت اور خواری سے دوچار ہونا پڑا، محمود کو اس جنگ میں بہت

سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا اگرچہ اس کا ارادہ صرف اس جنگ کو سر کر کے واپس جانے کا تھا، لیکن جب خلافِ توقع اتنی بڑی اور نمایاں کامیابی اسے مرحمت فرمائی تو اس نے اسے کفرانِ نعمت سمجھا کہ خدا کی اس دین سے فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ راجگانِ ہند کی سرکوبی کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا، اب میدان صاف تھا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا، جن میں یہ سکت تھی وہ پہلے ہی دن ہند کے معرکہ میں بری طرح پٹ کر گھائل ہو چکے تھے، چنانچہ سلطان کا لشکر بڑھتے بڑھتے نگر کوٹ (کانگڑہ) پہنچا یہاں بڑا مضبوط قلعہ تھا اُسے سر کیا اور آس پاس کے کسی راجہ کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس مذہبی مقام کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دے اور اسے للکارے، بغیر کسی مداخلت اور مزاحمت کے محمود نے یہ ناقابلِ تسخیر قلعہ بھی فتح کر لیا یہاں پشت ہا پشت سے چڑھاوے چڑھتے چلے آ رہے تھے، منوں سونا جمع تھا، ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے تھے، چاندی کی سلیں اور اینٹیں محمود کا انتظار کر رہی تھیں، محمود نے اہالیانِ قلعہ کی جان بخشی کی، مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کیا، مندر کی حرمت اور تقدیس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیا اور مالِ غنیمت سے اپنا دامن بھر کر واپس ہوا اور غزنی پہنچ گیا۔

محمود غزنوی جب بھی غزنی پہنچتا تھا مالِ غنیمت کے بوجھ سے لدا ہوا پہنچتا تھا، لیکن اس مرتبہ اتنا مختلف النوع اور عجیب قسم کا مالِ غنیمت اسے حاصل ہوا تھا کہ شکرِ نعمت کے طور پر اس نے یہ مال کئی دن تک عوام کے مشاہدے کے لئے وقف رکھا، لوگ آتے تھے اور محمود کی فیروز مندی کو سراہتے اور آئندہ کامران زندگی بسر کرنے کی دعا دیتے اور واپس چلے جاتے، مالِ غنیمت کی اس نمائش نے محمود کی دھاک اور ساکھ میں پہلے سے کئی گنا زیادہ اضافہ کر دیا۔

تھانیسر، قنوج، گوالیار، متھرا

"رونا رے ہوئے ہیں کو کبہ شہریار کے"

محمود صرف سستانے کے لئے غزنی جاتا تھا، وہاں تازہ دم ہو کر نئی امنگ اور نئے ولولے کے ساتھ پھر دشمنوں کی سرکوبی اور غداروں کی تعزیر و ترہیب کے فرائض انجام دینے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ دوری منزل، موانع راہ، مشکلات سفر، یہ سب اس کے نزدیک بے معنی الفاظ تھے، نہ وہ ان کی پروا کرتا تھا، نہ انہیں خاطر میں لاتا تھا، صرف فیصلہ کرنے کی دیر تھی، فیصلہ کیا، اور اس نے عملی جامہ پہنانے میں اتنی دیر بھی نہیں لگتی تھی جتنی ارادہ کرنے، اور اٹھ کھڑے ہونے میں ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ محمود کی ساری کامیابیوں اور کامگاریوں کا راز صرف یہی ہے کہ وہ سراپا عمل تھا۔ لوگ فکر و تخیل کے بندے ہوتے ہیں وہ کردار و عمل کا بندہ تھا!

راجگان ہند کو ہزیمت دینے اور نگر کوٹ (کانگڑہ) فتح کرنے کے بعد، محمود غزنی میں آکر مقیم ہو گیا اور مملکت کے اندرونی معاملات کی اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ ہو گیا، وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا، وہاں ایک نئی دنیا بسا لیتا تھا اور اس کی تعمیر و تشکیل میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا تھا، کچھ دنوں بعد اسے اطلاع ملی کہ اب تھانیسر اس کے خلاف سازشوں اور دراندازیوں کا سب سے بڑا گہوارہ بنا ہوا ہے، شکست کا بدلہ لینے اور مقبوضات محمودی واپس لینے کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں، یہ سنتے ہی وہ اپنا لشکر لے کر تھانیسر کی طرف بڑھا (غالباً سنہ ۴۰۳ھ) اور جس آسانی اور سہولت سے اس نے کانگڑہ کو فتح کر لیا تھا اسی آسانی اور سہولت سے تھانیسر پر بھی قبضہ کر لیا،

کانگڑہ کی طرح تھانیسر بھی بہت بڑا مذہبی مرکز تھا، فرشتہ نے یہاں کے بتوں اور مندروں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، لیکن جن راجگان ہند کو اپنے بچاؤ کی فکر تھی، وہ مذہب کا نام لیتے اور دھرم

کی مالا جپنے کے باوجود اپنے سب سے بڑے نہیں تو بہت بڑے تیرتھ کو بچانے نہ پہنچ سکے، نہ یہ ہمت ہوتی کہ محمود کو للکارتے، نہ یہ حوصلہ ہوا کہ مندر کی حفاظت کے لئے کچھ پیش بندیاں کرتے

محمود کسی شہر، قلعہ یا مندر کو فتح کرتا تھا تو ایک اصول پر سختی سے عمل کرتا تھا یعنی معاملات مذہبی میں تو کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا تھا، نہ عوام کو لوٹ کھسوٹ کا شکار بننے دیتا تھا، لیکن تاوان جنگ کے طور پر مندروں کے زرومال پر ضرور قبضہ کر لیتا تھا، یہی اس نے تھانیسر میں بھی کیا،

غزنی اور قنوج کا فاصلہ

غزنی اور قنوج کا فاصلہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار میل ہے — اس فاصلہ کو تصور میں لائیے اور محمود کے زمانہ پر غور کیجئے، حالات کو نگاہ میں رکھیے، راستہ ناہموار، دشمن ملک، نامانوس فضا، غیر مطمئن ماحول بے انتہا مسافت، اور ساتھ ہی ساتھ رسد کا بندوبست کہ اتنی بڑی فوج ساتھ ہو گی، اسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے، کھانا وقت پر ملتا رہے، پانی بہ سہولت حاصل ہو، اور پھر مزید ستم یہ کہ موسم وہ جس سے کبھی سابقہ نہیں پڑا، راستہ ایسا جس پر سے کبھی گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن ان باتوں میں سے کوئی بات بھی عنان گیر نہ ہو سکی، محمود ایک بڑا لشکر لے کر قنوج کی طرف بڑھا، (۴۰۹ھ) یہ لشکر تقریباً سوا لاکھ آدمیوں پر مشتمل تھا، ان سوا لاکھ آدمیوں کو مع اپنے گھوڑوں اور جانوروں کے ہر روز کم از کم دو وقت کھانا کھاتا تھا، اور کئی بار پانی پینا تھا، ان سوا لاکھ آدمیوں کی پندرہ سو میل کی مسافت قطع کرنی تھی، یہ سوا لاکھ آدمی ایسے راستے پر چل رہے تھے جس سے قطعاً ناواقف تھے، یہ سوا لاکھ نفوس اس علاقہ میں، اس سرزمین پر، اس ملک میں بادیہ پیمائی کر رہے تھے، جہاں کا ذرہ ذرہ ان کا دشمن تھا، ان کا دربار آزاد تھا، انہیں کھا جانے اور نگل جانے کے لئے آمادہ اور تیار تھا، لیکن ان سوا لاکھ آدمیوں کا سپہ سالار اور بادشاہ وہ شخص تھا جو صرف خدا پر بھروسہ کرتا تھا اور ہر دشواری اور مصیبت سے بے نیاز ہو جاتا تھا، وہ پورے اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ اپنا سوا لاکھ کا لشکر لئے بے فکری اور بے پروائی اور اطمینان، ولولہ اور امنگ کے ساتھ بڑھ رہا تھا،

اور یہ قنوج ؟

یہ بھی کوئی معمولی جگہ نہ تھی، قنوج نے صدیوں میں وہ مقام حاصل کیا تھا، جو آج اسے حاصل تھا، صدیوں کی اس طویل مدت میں قنوج کسی شکست سے دوچار نہیں ہوا، کسی سے دبا نہیں، کسی کی ماتحتی نہیں قبول کی: ان کا دعویٰ تھا وہ ہندوستان کا سب سے زیادہ معزز شہر ہے، اس کا راجہ جس طرح اپنی عالی نسبی پر نازاں تھا، اسی طرح اسے اپنے بخت ونصیب پر بھی ناز تھا اس کے پاس بے شمار دولت تھی، اس کے پاس بے شمار فوج تھی، اور یہ فوج بہادروں اور سامنتوں پر مشتمل تھی، اس کی عظمت وجلالت کے آگے راجگان ہند سر جھکاتے تھے، ہندوستان کی حکومتیں بدلتی رہیں، راج پاٹ میں انقلابات آتے رہے، پایۂ تخت اور دارالحکومت بھی ادھر سے ادھر ہوتے رہے، لیکن ہر دور میں ہر زمانہ میں قنوج کو وہی عظمت حاصل ہوتی رہی جو ایک ملک کے دارالسلطنت اور پایہ تخت کو حاصل ہوتی ہے۔

محمود بغیر کسی طرح کا نقصان اٹھائے اپنا لشکر گراں لے کر قنوج کے سامنے پہنچ جائے گا، متصور یہی تھا کہ جنگ ہوگی اور جنگ لڑے گا، لیکن راجگان ہند میں تنہا راجہ اجے پال (والی قنوج) ایسا ہوشمند اور فرنیس تھا کہ اس نے طوفان سے پہلے طوفان کا اندازہ کر لیا، اس نے قبل اس کے کہ حادثہ واقع ہو، اسے پہچان لیا، محمود اسے نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن اس نے محمود کو سمجھ لیا تھا اس نے مقابلہ کرنے کے بجائے محمود کے پاس اپنی سفارت بھیجی، دوستی اور رفاقت کا عہد کیا، سلطان کو سلطان مانا، نذر عقیدت واحترام پیش کی، اور پیمان وفا باندھ لینے کا اقرار کیا،

محمود سخت کے مقابلہ میں سخت اور نرم کے مقابلہ میں نرم تھا، یہ رنگ دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا، اس نے نہ صرف راجہ کی جان بخشی کی، بلکہ اس کی مملکت بھی اسے بخش دی، اس سے پیمان وفا استوار کیا اور اسے یقین دلایا کہ اب ہم تم ہر حالت میں ایک دوسرے کے شریک وسہیم رہیں گے جو تمہارا دوست، وہ ہمارا دوست جو تمہارا دشمن وہ ہمارا دشمن، راجہ اس نوازش شاہانہ سے خوش ہو گیا، اس نے سلطان معظم کی ایک پُرتکلف دعوت کی اس مخلصانہ دعوت نے دوستی اور رواداری کے

رشتہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔

متھرا کی شکست و تاراجی

کچھ دن قنوج میں مقیم رہنے کے بعد محمود پھر وطن کی طرف واپس پلٹا، واپسی میں وہ متھرا پہنچا، متھرا کی شہرت اس کے کانوں میں پڑ چکی تھی، یہاں کے مندروں، مہنتوں، پجاریوں اور پانڈوں کے خواص سے اس کے کان آشنا ہو چکے تھے، لہٰذا یہاں پڑاؤ کیا، متھرا والوں کو بڑا زعم تھا، انہوں نے نہ صرف یہ کہ سلطان کی پیشوائی نہیں کی بلکہ اس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا، متھرا والے جانتے تھے ہمارے چاروں طرف بڑے بڑے ہندو رجواڑے ہیں، ہمیں کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا چاہے وہ سکندر مقدونی ہو یا محمود غزنوی! ——— محمود کو یہ بات کھل گئی، اس نے سوچا جب یہ بات ہے تو نذرانہ کیوں نہ متھرا سے وصول کیا جائے؟ چنانچہ اس نے عوام کو اور شہریوں کو تو ان کے حال پر چھوڑ دیا مندر کے احترام و تقدیس پر بھی حرف نہیں آنے دیا لیکن مال و زر کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی، ساری دولت سمیٹ لی۔ متھرا کی آہ و فغاں کی آوازیں ان آزاد، خود مختار اور طاقتور رجواڑوں کے صحن و بام تک پہنچتی رہیں جو آس پاس واقع تھیں، لیکن سب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں کسی میں ہمت نہ پڑی کہ وہ گھر سے نکلتا اور میدان جنگ میں پہنچتا، جو سونا چاندی اور ہیرے جواہرات کا ذخیرہ یہاں موجود تھا، وہ اونٹوں پر لد کر غزنی روانہ ہو گیا، یہ لدے پھندے اونٹ بھی اتنی ہی بے فکری اور اطمینان سے غزنی پہنچ گئے جس طرح محمود کا لشکر متھرا پہنچا تھا!

یہی وہ واقعہ ہے جس کی خبر جب خلیفۂ بغداد القادر باللہ کو پہنچی، تو اس نے ایک جشن مسرت ترتیب دیا، بغداد کے اردگرد دیوار پر چراغاں کی روشنی جگمگائی، اور خلیفہ نے محمود کو "سلطان یمین الدولہ" کا خطاب مرحمت فرمایا، یہ خطاب تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ محمود نے استعمال کیا اور اس کے بعد تو وہ ہر فرماں روا کے نام کا جزو بن گیا!

انند پال کا خون ناحق

محمود کی طرف سے جب قنوج کے معاصرین کو اطمینان ہو گیا، تو وہ راجہ انند پال پر چڑھ دوڑے۔ دشمنوں کی نظر میں اس کا جرم یہ تھی

کہ اس نے محمود سے دوستی کیوں کی ؟ لڑا کیوں نہیں ؟ راجہ اجے پال پر یہ حملہ ایک سوچی سمجھی سازش کے ماتحت اس سرعت کے ساتھ ہوا کہ نہ وہ مدافعت کر سکا نہ مقابلہ کی تیاریاں کر سکا، دوست اور معاصر راجاؤں نے راجہ اجے پال کا سر کاٹ کر اپنی ہوس انتقام پوری کی، اس مہم کا سرخیل راجہ کالنجر تھا، محمود سے اسے جتنی دشمنی تھی وہ ساری اجے پال کی طرف منتقل ہو گئی، محمود کا وہ کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن اجے پال کو اس نے قتل کر دیا ـــــ شاید یہ سمجھ کر کہ یہ گردن اجے پال کی نہیں محمود کی ہے!

(8) محمود کو جب راجہ اجے پال کے قتل کی خبر ملی تو وہ بہت برہم ہوا، اسے وہ تمام پیمان یاد آ گئے جو اس کے اور اجے پال کے مابین ہوئے تھے، وہ اسے گوارا نہ کر سکا کہ جو اس کا دوست ہو جو اس کی رفاقت کا دم بھرے، جسے وہ اپنی حفاظت اور پناہ میں لے چکا ہو، وہ اس بے لبسی کے ساتھ قتل کر دیا جائے اور وہ کچھ نہ کرے، یہ سنکر غضب ناک حالت میں وہ اپنا لشکر لے کر پھر (۴۱۲ھ) ہندوستان میں تیر کی طرح پہنچا، اور کالنجر کا فیصلہ کرنے سے پہلے گوالیار کا محاصرہ کر لیا، کیونکہ بغیر گوالیار کو سر کئے، کالنجر کی مہم کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، گوالیار نے حلفِ اطاعت اٹھا کر جان اور حکومت واپس پالی، پھر اس نے کالنجر کی طرف توجہ کی، راجہ بھاگ گیا دوسرے راجہ جو اس قتل ناحق میں شریک تھے محمود کے انتقام سے نہ بچ سکے، آخر جب راجہ گنڈا (کالنجر) نے دیکھا کہ مخلصی کی کوئی صورت نہیں ہے تو وہ ہاتھ باندھ کر اظہار اطاعت کے لئے سلطان کے حضور میں حاضر ہوا، بہت سا زر و جواہر اور کئی سو ہاتھی نذر کئے، محمود نے یہ فروتنی دیکھ کر اسے بھی معاف کر دیا'

ادھر سے مطمئن ہو کر محمود نے پھر غزنی کا عزم کیا، لاہور اب تک ہمیشہ درد سر کا باعث بنتا رہا تھا، جے پال کو بار بار معاف کیا گیا، مگر اس کی سرکشی میں فرق نہ آیا پھر آنند پال کی بغاوتیں اور غداریوں کو نظر انداز کر دیا مگر وہ بھی کبھی نہیں چوکا، اب واپسی میں آنند پال کا جو جانشین تھا اس کے اطوار بھی باغیانہ نظر آئے، محمود نے سوچا بہتر یہی ہے کہ اس مہم میں یہ مرحلہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سر کر لیا جائے، چنانچہ اس نے (9) (۴۱۳ھ) قنوج کی دوسری مہم کے بعد،

لاہور کا محاصرہ کر لیا، راجہ قلعہ بند ہو گیا - اور جب کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھی تو بال بچوں کو لے کر اجمیر بھاگ گیا۔ محمود نے پنجاب کو مملکتِ غزنوی سے ملحق کر لیا، اور اپنے محبوب و معتمد غلام ایاز کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا، اب گویا دریائے ستلج تک کا علاقہ غزنی قلمرو میں شامل ہو گیا اور وہ جو ہر آن فتنہ و فساد بغاوت اور سرکشی، سازش اور شرارت کی آندھیاں اٹھتی رہتی تھیں، ان کا یکسر خاتمہ اور قلع قمع ہو گیا۔

پنجاب کا سلطنت غزنی کا جز بن جانا بہت سے دور رس نتائج کا موجب بنا، اس طرح پنجاب ایک اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا، یہاں مسلمانوں کی عام آمدورفت شروع ہو گئی، بہت سے خاندان غزنی اور دوسرے مقامات سے آکر یہاں بس گئے، اسلامی تہذیب و تمدن اور حضارت و ثقافت کو پھلنے پھولنے کا اس سرزمین پر موقع ملا، صوفیاء کرام کے جتھے پہنچے اور وہ نہایت خاموشی کے ساتھ دین متین کی تبلیغ و ترویج میں مصروف ہو گئے، ان کی سیرت، ان کے کردار، ان کے زہد و پاکبازی ان کے افکار، تلقین سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج اسلام کے حلقہ میں داخل ہونے لگے۔

الحاق پنجاب کے نتائج

اگر پنجاب اس طرح مسلمانوں کی تحویل میں نہ آجاتا تو آگے چل کر ہندوستان سے مسلمانوں کا رابطہ اتنا گہرا نہ ہو سکتا جتنا ہوا، اور جس نے ہندوستان کو ایک نیم اسلامی ملک بنا دیا، پاکستان کے بادشاہوں کی فہرست جب مرتب کی جائے گی تو اس فہرست میں سب سے پہلا جو نام ہوگا وہ سلطان یمین الدولہ محمود غزنوی کا ہوگا۔

محمود غزنوی باری باری ان تمام دشمنوں کی قوت کو پاش پاش ——— کر دینا چاہتا تھا جو اس کے لئے ذہنی الجھنوں کا باعث ثابت ہو چکے، اس کے مہمات کے اسباب و علل کا اگر کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا،

۱- محمود نے اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ کبھی نہیں کی

۲- انہی قوتوں سے نبرد آزما ہونا، جو اس کی راہ میں مزاحم ہوئیں، یا جنہوں نے اسے زک دینے کی کوشش کی،

۳- ان کی سرکوبی میں ذرا تامل نہیں کیا، جنہوں نے بغاوتوں، سازشوں اور فتنوں کے پھیلانے میں حصّہ لیا۔

اب ہم ہند میں محمود کی آخری اور نہایت معرکہ آرا مہم فتح سومنات کا ذکر کرتے ہیں۔

فتح سومنات

(تاریخ کا حیرت انگیز معرکہ!)

محمود کی وفات سے خاندان غزنویہ کے اختتام تک!

ہندوستان میں محمود کا آخری کارنامہ فتح سومنات ہے اور کوئی شبہ نہیں صرف محمود ہی کا نہیں تاریخ کا یہ عجیب و غریب کارنامہ ہے، اتنی بڑی، اتنی دلچسپ اور اتنی مقدس نتائج کی حامل مہم ہمیں تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، اگر وہ ناکام ہو جاتا، تو دنیا اسے خودکشی کا مجرم قرار دیتی، اس کی بے تدبیری کا مذاق اڑاتی، اسے اپنے بہادر سپاہیوں اور سرداروں کی ہلاکت اور بربادی کا ذمہ دار ٹھہراتی، اسے ملامت کرتی اور اس کا ذکر جب کبھی کرتی حقارت سے کرتی، لیکن وہ ناکام نہیں ہوا، اس نے کامیابی حاصل کی، ایسی عظیم و جلیل کامیابی جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ کے اوراق قاصر ہیں، لہٰذا دنیا مجبور ہو گئی کہ اس کی اس جرأت رندانہ کے سامنے خراج تحسین پیش کرے، اس کی اس فقید المثال جرأت اور مہم جوئی کی داد دے اور مان لے کہ وہ دنیا کا بہت بڑا فاتح تھا۔ اتنا بڑا فاتح کہ اس کے سامنے سکندر اور نپولین کی عظمت اسی وقت تک ہے جب تک سلطان محمود غزنوی کے کارناموں پر نظر نہیں پڑتی، ان کارناموں کے مشاہدہ کے بعد چشم تصور اور نگاہ تنقید میں بس وہی وہ رہ جاتا ہے!

سومنات پر حملے کے اسباب و محرکات

قبل اس کے کہ ہم سومنات کی داستان فتح بیان کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس حملہ کے اسباب و محرکات پر بھی ایک نظر ڈال لیں:

محمود بت شکن، موحد تھا، وہ چاہتا تھا ساری دنیا خدائے واحد و ذوالجلال کے سامنے سر عبودیت خم کرے۔ لیکن وہ اسلام کا پیرو تھا، اس لئے وہ ان حکمرانوں کی تقلید نہیں کر سکتا تھا جو ان پیغمبر کے امتی تھے جن کا قول تھا کہ اگر تیرے ایک گال پر کوئی تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے

پیش کر دیا لیکن انہوں نے اسپین میں روم میں قسطنطنیہ میں اور دوسرے مقامات میں دین عیسوی کو تلوار کے زور سے رائج کیا جس نے اس دین کے قبول کرنے سے انکار کیا؛ اسے اپنی دولت سے، جاگیر سے، تجارت اور زراعت سے، حقوق شہریت سے اور سب سے آخر میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا، ان عیسائی فرماں رواؤں نے بت پرستوں اور یہودیوں پر جو لرزہ خیز اور سفاکانہ مظالم تبدیل عقائد کے سلسلہ میں کئے، انہیں اگر جمع کیا جائے تو ایک مہیب اور ہولناک اور روح فرسا "تاریخ شقاوت" تیار ہو جائے، جسے پڑھ پڑھ کر دہشت کے باعث لوگ بے ہوش ہو جائیں، محمود نے ایسی حرکتیں نہیں کیں اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اپنے دین کو حق سمجھتا تھا، اس لئے سختی سے اس کے احکام و اوامر پر عمل کرتا تھا، اس کے دین کا واضح اور غیر مبہم حکم یہ تھا کہ "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں جبر و جور روا نہیں، یہی وجہ تھی کہ اس نے کسی ایک شخص پر بھی تبدیل عقائد کے سلسلہ میں جبر و جور نہیں کیا، یہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہیں اور محمود کے مسلمان ہونے کے باعث اس کے ساتھ جانبدارانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں یہ قول الفنسٹن اور دوسرے انگریز مؤرخین کا ہے جنہوں نے ہمیشہ مسلمان سلاطین کا جن میں محمود بھی شامل ہے ——— جب کبھی تذکرہ کیا تو،

قصور ڈھونڈھ کے پیدا کئے جفا کے لئے!

یہ مؤرخین صاف الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں کہ محمود کی ساری عمر ہندوستان پر تاخت و تاراج کرتے گزری لیکن ایسی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ محمود نے کبھی کسی ایک شخص کو دین بدلنے پر مجبور کیا ہو، یہ سب سے بڑی شہادت ہے جو محمود کے حق میں پیش کی جا سکتی ہے الفضل ما شہدت بہ الاعداء فضل و کمال کی تعریف یہی ہے کہ دشمن تک اس کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں!

تاریخ فرشتہ میں تاریخ کے دوسرے ادوار کی طرح محمود کے دور پر بھی مکمل اور سیر حاصل تبصرہ موجود ہے، فرشتہ نے اپنی کتاب میں ایک اور بات بھی لکھی ہے، یہ کہ محمود کے لشکر میں ہندو سپاہی اور ہندو سردار بھی تھے، اور یہ اسی مقام پر فائز تھے جس پر مسلمان سپاہی اور مسلمان سردار فائز تھے، اس نے متعدد ہندو سرداروں کے نام بھی لکھے ہیں، یہی ایک واقعہ محمود کی بے تعصبی

رواداری اور عالی ظرفی کی شہادت کے لئے کافی ہے ۔ !

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

تو محمود جب اس درجہ روادار اور غیر متعصب تھا ، پھر اس نے کانگڑہ اور تھانیسر اور آخر میں سومنات کے مندر پر حملہ کیوں کیا ؟

محمود کی زندگی ، اس کی سیرت ، اس کے کردار ، اس کے مزاج وطبیعت اس کی رفتار وگفتار ، اس کے اصول ومقصد ، اس کے مسلک اور انداز کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ مناودر پر دو جذبے کارفرما نظر آتے تھے ۔

۱۔ ایک تو یہ کہ یہ مندر اپنے ظاہری تقدس کی آڑ لے کر نہایت اطمینان اور یکسوئی سے ان سازشوں اور فتنوں کے مرکز بن جاتے تھے ، جو محمود اور مسلمانوں کے استیلا کے خلاف ابھرتے رہتے تھے ۔ ظاہر ہے کوئی فرماں روا بھی ان باتوں کو اپنی سیر چشمی اور اولو العزمی کے باوجود گوارا نہیں کر سکتا ، بلکہ مجبور ہے کہ پوری قوت سے ان فتنوں کا سر کچل دے ۔

۲۔ دوسرے یہ کہ جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں ، محمود بڑا غیور موحد تھا ، وہ اگرچہ ہندوؤں پر جبر نہیں کرتا تھا ، لیکن اپنے حملوں میں نفسیاتی ضرب ضرور لگاتا تھا ، وہ ان بتوں کو جو صدیوں سے عقیدت اور بندگی کے مرکز بنے ہوئے تھے جن کے سامنے چڑھاوے چڑھتے تھے جن کے بارے میں عوام کو یہ گمان تھا کہ یہ خالق ارض وسماواں میں فعّال لما یرید ہیں ، یہ جو چاہیں کر سکتے ہیں ، یہ خفا ہوں تو معتوب کو تہس نہس کر کے رکھ دیں ، خوش ہوں تو اسے دولت کونین سے نہال کر دیں ، ان کا قہر دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی : ان کے رحم وعنایت کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی ، ان بتوں کو محمود اپنے گرز گراں سے پاش پاش کر دیتا تھا اور بہ زبان حال دریافت کرتا تھا ، اگر یہ فعّال لما یرید ہیں اگر یہ خالق ارض وسما ہیں ، اگر یہ اختیارات خدائی کے حامل ہیں تو پھر کیوں پاش پاش ہو گئے ، کیوں میرے گرز گراں کی تاب نہ لا سکے ، اس بے ادبی پر مجھے تہس نہس کر کے کیوں نہیں رکھ دیتے ، اور اس سوال کا جواب نہ کسی پنڈت کے پاس تھا نہ مہنت کے پاس ،

بلاشبہ ہندوستان میں اسلامی تبلیغ و ترویج کا کام زیادہ تر صوفیائے عظام نے انجام دیا بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، لیکن محمود کے ہاتھوں بااختیار اور با اقتدار بتوں کی بے بسی اور بے کے مناظر نے بھی لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا کیا ہوگا "جب یہ اتنے بے بس ہیں، تو ہم انہیں کیوں پوجتے ہیں؟" اور پھر صوفیائے کرام کے وعظ و تلقین نے انہیں اور زیادہ اسلام کی طرف مائل دیا، اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اس پس منظر میں ذرا سومنات کا جائزہ لیجئے

سومنات کا بت سارے بتوں کا سرتاج اور سردار مانا جاتا تھا۔

اس بت کے معجزے زباں زدِ خاص و عام تھے، فرشتہ نے بڑی تفصیل سے کئی اوراق اس بت کے خوارق عادات اور دوسری چیزیں بیان کی ہیں

اس بت کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ راج محل کی متعدد رہنے والی راجکمار بھی یہاں دیوداسی بن کر آتی تھیں اور ساری زندگی اس صنم اعظم کے سامنے رقص و نغمہ کے کمال دکھانے اور پجاریوں کی ہوس رانیوں کی بھینٹ چڑھنے میں گزار دیتی تھیں،

فرشتہ کا بیان

ایک یہ قول بھی (بقول فرشتہ) چل پڑا تھا، اور سارے ملک میں گ لگا رہا تھا کہ محمود کی کامیابیاں اس لئے عمل میں آئیں کہ یہ صنم اعظم ان بتوں، مندروں اور راجوں سے خفا تھا، جو محمود کے ہاتھوں مفتوح ہوئے، پاش پاش ہوئے شکست یاب ہوئے، اگر محمود سومنات کا رُخ کرے تو آن کی آن میں اسے فنا کے گھاٹ صنم کا قہر و جلال اتار دے گا

سومنات ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ دولت مند بت خانہ تھا، اس کے لئے بڑی بڑی جاگیریں متعدد راجاؤں اور مہاراجوں کی طرف سے وقف تھیں گو کے اخراجات سفر اور تاوان جنگ کا انتظام یہاں پہلے سے موجود تھا

محمود کے کانوں تک یہ باتیں پہنچتی تھیں اور وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتا تھا —— آخر نے

فیصلہ کرلیا کہ وہ سومنات کو فتح کرے گا۔ محمود کے فیصلہ کو عملی جامہ پہننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی یا پیشگی فیصلہ کرتے ہی فوجیں تیار ہو گئیں!

خطرات و مہالک کی فہرست

قبل اس کے کہ فتح سومنات کا ذکر کیا جائے، ذرا اس مہم کے خطرات اور مہالک بھی نظر کے سامنے رکھئے کہ ورنہ اس کے صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔

۱۔ سب سے پہلی چیز تو فاصلہ ہے غزنی سے سومنات کا فاصلہ کم و بیش دو ہزار میل سمجھئے،

۲۔ لاہور کے بعد سے سومنات تک کا سارا طویل و عریض علاقہ "دشمن" محمود کی فوج پر چہار طرف سے حملہ کا امکان تھا

۳۔ بڑے بڑے وسیع اور طویل و عریض جنگلات جو اب تک انسانی قدم سے آشنا نہیں ہوئے تھے محمود کی گذرگاہ کا شرف حاصل کرنے والے تھے،

۴۔ تین سو میل کا وہ بے آب و گیاہ ریگستان بھی طے کرنا تھا، جسے طے کئے بغیر سومنات کے دروازے پر جاکر محمودی خیمہ زن نہیں ہو سکتے تھے،

۵۔ لاہور سے لے کر سومنات تک یہ انتظام کرنا تھا کہ دشمن سے عقب بالکل محفوظ رہے، اگر پسپائی کی ضرورت پڑے تو بغیر کسی مزاحمت اور اندیشہ کے واپس ہو سکے،

۶۔ لاہور سے لے کر سومنات تک رسد کا نہایت مکمل انتظام کرنا تھا کہ راستہ میں کہیں بھی لشکر کو پانی اور غذا کی تکلیف نہ ہو،

۷۔ اس دو ہزار میل لمبے راستہ میں قدم قدم پر دشمن کی مزاحمت کا اندیشہ تھا، اس لئے کہ وہ گھر سے نکل کر اور تمام وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھا کر جب چاہے حملہ آور ہو سکتا تھا، اور یہاں صورت بالکل برعکس تھی،

۸۔ دشمن کو ہر وقت ہر طرف سے تازہ دم کمک پہنچ سکتی تھی اور یہاں کمک پہنچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

۹۔ احتیاط اور پیش بندی کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ طویل راستہ کم سے کم آدمیوں کے ساتھ طے کیا جائے لیکن ضروریات و احتیاط و مصالح کا تقاضہ یہ تھا کہ لشکر زیادہ سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل ہو، کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ سپاہی بھی بہر حال اس متحدہ لشکر کے مقابلہ میں بہت کم تھے جس کا مقابلہ کرنا تھا اور جسے شکست دینے کا منصوبہ بنا کر یہ مہم شروع کی جا رہی تھی

۱۰۔ ناکامی کی صورت میں ایک سپاہی کے بھی زندہ و سلامت بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا، اس حقیقت سے سپاہی بھی خوب واقف تھے اور محمود بھی

۱۱۔ راستہ نہایت ناہموار تھا ——— صرف ناہموار ہی نہیں انجان بھی! اس راستہ سے اس سے پہلے نہ محمود گذرا تھا نہ اس کے لشکر کا کوئی سپاہی، پھر بھی اسے طے کرنا تھا

۱۲۔ یہی حال موسم کا تھا، غزنی کی آب و ہوا اور موسم سے کوئی مناسبت ہی نہیں تھی ان موسموں کو جو راستہ کے ہر ہر صوبہ میں ایک نئی صورت اختیار کر لیتے تھے، لہٰذا موسم کا بھی مقابلہ کرنا تھا

سومنات کی طرف

جس طرح ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتے وقت انسان کسی قسم کی جھجک اور خطرہ نہیں محسوس کرتا، اسی طرح غزنی سے چل کر سومنات کا سفر اختیار کرنے میں محمود نے نہ کوئی جھجک محسوس کی، نہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کیا!

۴۱۵ھ میں وہ غزنی سے چلا اور ملتان پہنچا جو کوتاہیاں انتظامات کی رہ گئی تھیں، یہاں انہیں مکمل کیا، اس باب میں اختلاف ہے کہ یہاں سے آگے کر اس نے کہاں پڑاؤ کیا، بعض مؤرخ اجمیر کا نام لیتے ہیں، بعض اسے تسلیم نہیں کرتے لیکن مؤرخین کی عام روایت یہی ہے کہ وہ اجمیر پہنچا، محمود نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جو اگرچہ خطرات سے گھرا ہوا تھا، لیکن بہر حال پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا، چنانچہ وہ کچھ اور جنوبی سندھ کے راستے کو چھوڑ کر راجپوتانہ کے ریگستان سے ہوتا ہوا دفعتہً کوہستان اراولی کے دامن سے نمودار ہو کر کاٹھیاواڑ کے پایۂ تخت میں پہنچ گیا، یہاں کا راجہ جب تک محمود نہیں آیا تھا بڑا باہمت اور صاحب تدبیر تھا، لیکن جب وہ آگیا تو اس کی ہمت اور تدبیر کا مصرف فرار کا راستہ تلاش کرتا رہ گیا، اس معرکہ کو چٹکی بجاتے سر کرتا محمودی

لشکر بغیر کسی مزاحمت کے گجرات میں داخل ہوا اور سومنات کے سامنے پہنچ گیا۔

دعائیں اور بد دعائیں

مندر کے پجاریوں کا خیال تھا کہ صنم اعظم کا قہر و جلال اس لشکر کو خاک سیاہ کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، پھر انہوں نے اپنی دعاؤں اور بد دعاؤں پر تکیہ کیا لیکن اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں برآمد ہوا، بہت سے راجہ اور مہاراجہ اپنی اپنی فوجیں لے کر سومنات کی مدد اور محمود کے مقابلہ کو آموجود ہوتے تھے، تھانیسر نگر کوٹ (کانگڑہ) اور متھرا کی طرح سومنات بے یار و مددگار نہیں ثابت ہوا، اس کے بہت سے مددگار بڑی بڑی فوجیں لے کر پہنچ گئے، کئی روز تک خوں ریز اور ہولناک جنگ جاری رہی مندر کے پروہت اور پجاری تو دعا اور بد دعا کے سوا کچھ نہ کر سکے، لیکن راجپوتوں اور دوسرے سپاہیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر طرف سے تازہ دم فوجیں کمک کے طور پر پہنچ رہی تھیں اور یہاں صرف وہی جانباز اور سرفروش تھے، جن میں لحہ بہ لحہ کمی تو ہو رہی تھی، لیکن اضافہ کا کوئی امکان نہیں تھا،

صورت حالات نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی تھی،

محمود کا نفسیاتی فیصلہ! — سومنات کی فتح

یہ رنگ دیکھ کر محمود نے ایک عجیب فیصلہ کیا، وہ خود دُور رہ کر فوجیں لڑانے کے بجائے عین میدان جنگ میں پہنچکر تلوار سونت کر لڑنے لگا، سپاہیوں نے جب اپنے سلطان اور شہنشاہ کی جانبازی اور فداکاری کا یہ رنگ دیکھا تو ان میں بھی ایک نیا حوصلہ اور جوش پیدا ہو گیا، وہی جو ابھی سہمے اور پریشان نظر آ رہے تھے، اس جوش اور دور شور سے لڑنے لگے کہ حریف کے چھکے چھڑا دیئے،

اور جس جنگ کا فیصلہ کئی دن کی معرکہ آرائیوں اور خوں ریزیوں سے نہیں ہو سکا تھا، وہ چند لمحوں کے اندر سر ہو گئی۔ محمود بسجدۂ شکر اس غیر متوقع کامیابی پر بجا لایا، اور فوج نے بھاگتے ہوئے سورماؤں کا پیچھا کیا، لیکن وہ کہاں ہاتھ آتے تھے، کشتیوں میں بیٹھے اور فرار ہونے میں کامیاب

ہو گئے، محمود کا لشکر بغیر کسی روک ٹوک اور مزاحمت کے سومنات میں داخل ہو گیا،

جس طرح سومنات کا قلعہ اپنی نظیر آپ تھا، اسی طرح سومنات کا مندر بھی اپنا جواب نہیں تھا، مندر کا سب سے بڑا ہال ۵۶ ستونوں پر قائم تھا، چھت میں اور ستونوں میں قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے، محمود صنم اعظم کے سامنے پہنچا، یہاں مہنت اور پجاری دم بخود کھڑے ہوتے تھے لرزتے تھے جو ابھی چند لمحات قبل تک محمود کی جان کے گاہک تھے، اس کی شکست کے جو یا تھے، ہلاکت اور بربادی کے دعا گو تھے اور اب اس کے سامنے کھڑے جان کی امان طلب کر رہے تھے کہ یہ خود مار ڈالنا چاہتے تھے، اسی سے زندگی کی دریوزہ گری کر رہے تھے ——— کتنا اور کتنا حیرت خیز تھا یہ واقعہ

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا؛ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

محمود نے پوری عالی ظرفی کے ساتھ جاں بخشی کا فرمان صادر کر دیا

صنم اعظم کا حشر

اب ایک دوسرا سوال درپیش تھا، مندر کے پجاری اور مہنت چاہتے تھے کہ صنم اعظم کی جان بخشی کر دی جائے، اور محمود اس کے لئے تیار نہیں تھا، مہنتوں اور پجاریوں نے دام بڑھانے شروع کئے یہاں تک کہ وہ اس پر رضا مند ہو گئے کہ اس بت کے بقدر بلکہ اس سے دوگنا سونا اور جواہرات پیش کر دیں، لیکن یہ بیچ جاتے،

محمود کے رفقا اور سردار اس پیش کش کو منظور کر لینے پر راضی ہو گئے لیکن محمود نے اپنے ساتھیوں پر ایک حقارت کی نظر ڈالی اور کہا،

"کیا تم یہ چاہتے ہو، قیامت کے دن میں محمود بت فروش کے نام سے پکارا جاؤں نہیں میں چاہتا ہوں کہ مجھے محمود بت شکن کے نام سے یاد کیا جائے؟"

یہ کہہ کر اس نے اپنا گرز گھما کر جو بت کے مارا ہے تو اس کے دو ٹکڑے ہو گئے ———
خدا کی قدرت بت جب پاش پاش ہو کر گرا تو معلوم ہوا یہ ٹھوس نہیں تھا اس میں خلا تھا اور وہ زر و جواہر سے بھرا ہوا تھا، یہ نقد جواہر اس مقدار سے کئی گنا زیادہ تھا جو مہنت اور پجاری

...کو بچانے کے لئے ادا کر رہے تھے،

رواداری کا ایک اور ثبوت

محمود کو گجرات کا علاقہ آب و ہوا اور صفائی کے اعتبار سے بہت پسند آیا، یہاں وہ فتح سومنات کے بعد قریباً ایک سال تک رہا، پھر ۴۱۷ھ میں غزنی واپس چلا گیا

جاتے وقت پھر محمود نے رواداری اور بے تعصبی کا ایسا ثبوت دیا، جو آپ اپنی مثال ہے انہا (تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق) ایک زاہد اور مرتاض ہندو کو یہاں کی حکومت سونپی، اور ...ان سے عہد اطاعت لے کر باطمینان تمام چلا گیا، اس امر کا اسے ذرا بھی اندیشہ نہیں تھا کہ یہ زاہد اور مرتاض ہندو بھی کہیں سکھ پال نہ ثابت ہو، لیکن محمود کو اپنے دست و بازو اور خدا کے فضل و کرم پر اعتماد تھا، وہ جانتا تھا، جس طرح میں نے سکھ پال کو اس کی کورنمکی کا مزہ چکھایا تھا اسی طرح یہ زاہد اور مرتاض دابشیلم بھی اگر غدر و بدعہدی کرے گا، تو اپنے کئے کی سزا پائیگا

محمود کی وفات، کارنامے، باقیات

۴۲۱ھ میں محمود اس دنیا سے رخصت ہو گیا، لیکن اس کے کارنامے زندہ ہیں اور تا ابد زندہ رہیں گے!

وراثت میں محمود کو ایک چھوٹی سی حکومت ملی تھی، لیکن محمود نے اپنے وارثوں کے لئے جو ترکہ چھوڑا تھا وہ دنیا کی بہت بڑی مملکت پر مشتمل تھا،

محمود عجیب اور متضاد خصوصیات کا جامع تھا، وہ جس طرح میدان رزم کا یکہ تاز تھا، اسی طرح بزم و انجمن کی آرائش و زیبائش بھی اس کے دم سے تھی اس کا دربار جس طرح فنون جنگ کے ماہروں سے لبریز رہتا تھا، اسی طرح علما، ادبا، فقہا اور شعرا بھی وہاں موجود رہتے تھے، کون ہے جو فردوسی طوسی کے شاہنامہ سے ناواقف ہو جس کی تکمیل محمود ہی کی زرپاشیوں کی بدولت ہوئی تھی،

عدل و انصاف میں بھی محمود اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، وہ اصول کے معاملہ میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا تھا، رعایا حسن سلوک کے ساتھ سب سے پیش آتا تھا، فرشتہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شریف

خاتون کی عزت بچانے کے لئے اپنے ملک کے ایک امیر کو اس نے رات کی تاریکی میں قتل کر دیا، پھر رات کی تاریکی میں قتل کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ممکن ہے اس کی صورت دیکھ کر اور اسے پہچان کر رعایت کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ اور انصاف رعایت کی بھینٹ چڑھ جاتا

محمود کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے ملوک و سلاطین اس کے نام سے لرزتے اور کانپتے تھے ہند کے راجہ اور مہاراجہ ہوں یا وسط ایشیا کے ملوک و سلاطین سب ہی اس کی عظمت کیا کرتے تھے، اس کے دبدبہ سے خائف رہتے تھے اور اس کی جبین کشادہ پر نظر رکھتے تھے۔ اور اگر ان میں سے کوئی اس سے متصادم ہونے کی جرأت کرتا تھا، تو کیفر کردار کو پہنچ کر دیتا تھا؛

مذہبیت دین داری اور خدا ترسی محمود کی سرشت بن گئی تھی، وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، علوم اسلامیہ پر وسیع نظر رکھتا تھا۔ فقہ میں اس کی ایک کتاب بھی بیان کی جاتی ہے، علما کی قدر دانی دل کھول کر کرتا تھا، جب میدان رزم کی گرہ کشائیوں سے فارغ ہوتا تھا تو بزم و انجمن کو سجاتا تھا، اور یہاں کا موضوع گفتگو علمی مسائل، مذہبی مباحث اور کلامی نظائر ہوتے تھے،

خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ (بقول فرشتہ) ایک مرتبہ اس نے ایک بات پر برہم ہو کر خلیفہ بغداد کو دھمکی دی کہ اپنے ہاتھیوں کی فوج گراں لے کر اگر میں بغداد پر چڑھائی کر بیٹھا تو یہ سارا دم خم ہو جائے گا، خلیفہ نے جواب میں الف لام م لکھ کر بھیج دیا، یہ ایک معمہ بن گیا، کوئی حل نہ کر سکا، دربار کے ایک صاحب نظر عالم نے کہا، خلیفہ نے آپ کو سورہ الم ترکیف یاد دلائی ہے، جس میں خدا نے فرمایا ہے کہ اصحاب فیل کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا، یہ سنتے ہی محمود کانپنے لگا اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور وہ اتنا رویا کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی، اس نے خلیفہ سے معذرت کی، اور اپنی غلطی پر نادم اور پشیمان ہوا، پھر اس طرح کی کوئی حرکت اس سے تا عمر سرزد نہیں ہوئی۔

تاریخ فرشتہ میں محمود کی درباداریوں، بزم آرائیوں، عدل و انصاف، مہر و مروت، جود و سخا، بذل و عطا، فہم و فراست، فکر و تدبر کے متعدد واقعات مندرج ہیں، لیکن تطویل کے خوف سے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

زوال کی داستان

امیر سبکتگین کو محمود جیسا بیٹا ملا جس نے غزنی کو دنیا کی بہت بڑی مملکت بنادیا، جس نے خاندان غزنویہ کو سربلند کردیا جس کی اہمیت اور طنطنہ نے دنیا کو لرزہ براندام کردیا، لیکن محمود کو ایسے جانشین نہ ملے جو باپ کے ترکہ کی حفاظت نہ کر سکے، اگر چہ یہ خاندان تقریباً دوسو برس تک زمانہ ۳۶۷ھ تا ۵۸۲ھ تخت حکومت پر متمکن رہا، لیکن زوال محمود کے فوراً بعد شروع ہوگیا، زوال کی ابتدا خانہ جنگی سے ہوئی جو باپ کے انتقال کے بعد تخت کے حصول پر شروع ہوئی تھی۔

محمود کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا، لیکن اسے آرام کے لمحات میسر نہ آئے زیادہ تر آویزشوں میں الجھا رہا، مسعود نے ہندوستان پر دو یلغاریں کیں لیکن ان یلغاروں میں اور محمود کی یلغاروں میں زمین آسمان کا فرق تھا، مسعود کے بعد جو لوگ اس تخت اجلاس پر بیٹھے، وہ اور زیادہ زوال کا سبب بنے۔ آخری دور میں غوریوں کی مخالفت ابھری اور اس نے اس خاندان کی عظمت و جلالت کا خاتمہ کردیا، غزنوی خاندان کا آخری فرماں روا خسرو ملک غوریوں کے ہاتھ گرفتار ہوگیا (۵۸۲ھ) اور اس طرح غزنوی خاندان کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا،

اس خاندان کے آغاز و انجام کی تاریخ یہ ہے۔

۱۔ پہلا بادشاہ،

امیر ناصرالدین سبکتگین (۳۶۷ھ)

۲۔ آخری بادشاہ،

خسرو ملک، ۵۸۲ھ

بھارت ـــ مسلمانوں کے دورِ مملکت میں

•

سلطان شہاب الدین غوری ـــــــــــــــ

ـــــــــــــ اُس کے غلام اور غلامانِ غلام

۱۔ قطب الدین ایبک

۲۔ تاج الدین یلدز

۳۔ ناصر الدین قباچہ

۴۔ بہاؤ الدین طغرل

۵۔ محمد بن بختیار خلجی

۶۔ شمس الدین التمش

۷۔ غیاث الدین بلبن

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ

آثار پدید است صنادید عجم را

سلطان شہاب الدین غوری

گذشتہ صفحات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ غزنوی خاندان کو غوریوں نے ہٹا دیا، اور خود سریرآرائے حکومت بن گئے،

غوری سلطان کا اصل فرماں روا سلطان غیاث الدین تھا اور اپنے چچا علاؤ الدین "جہاں سوز" جیسے شقی اور سفاک فرماں روا کے بعد تخت پر بیٹھا۔ (۵۵۸ھ) غیاث الدین کا ایک بھائی تھا، شہاب الدین غوری، یہ غزنی کا صوبہ دار مقرر ہوا (۵۶۷ھ) غیاث الدین اور شہاب الدین فطرت اور مزاج کے اعتبار سے جہاں بڑے غیور شجاع اور دلیر تھے، وہاں خاص رحم دل اور علم پرور تھے، شہاب الدین نے علماء کی جو سرپرستیاں کیں، اور خاص طور پر امام فخر الدین رازی سے جس طرح استفادہ کیا، وہ تاریخ کا روشن صفحہ ہے، ایک عجیب بات یہ ہے کہ تخت حکومت کے لئے ہم تاریخ کے اوراق میں بیٹے کو باپ کے خلاف صف آرا دیکھتے ہیں، بھائی بھائی کو قتل کر دیتا ہے، لیکن غیاث الدین، اور شہاب الدین میں اتنی محبت تھی کہ دونوں بیک وقت حکومت کر رہے تھے، اور ایک دوسرے پر ہمہ وقت جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، شہاب الدین کا لقب معز الدین محمد بن سام تھا، اسے مذہب سے بڑی شیفتگی تھی، چنانچہ قرامطہ (اسماعیل) کی سرکوبی میں اس نے کوئی دقیقہ نہ رکھا تھا اور بالآخر عین فتحمندی اور عروج کے زمانہ میں ایک سیاہ کار باطنی (اسماعیلی) فدائی کے ہاتھوں لڑتے میں جام شہادت نوش کیا،

شہاب الدین اولاد نرینہ سے محروم تھا لیکن اسے اس محرومی کا کوئی صدمہ نہیں تھا، اس نے

اپنے غلاموں کو بیٹوں کی طرح پالا، ان کی تربیت کی، انہیں زیورِ علم سے آراستہ کیا، انہیں فنونِ جنگ سکھائے اور انہی کو اپنی حکومت سونپ دی وہ جب اس دنیا سے سدھارا تو اس کے انہی کار آزمودہ، جہاں دیدہ اور وفادار غلاموں نے ہندوستان کی سرزمین کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا، سوائے اسلام لے کر آئے اور ان کے دم قدم کی برکت سے یہاں اسلام پھیلا، علم پھیلا، تہذیب پھیلی، تمدن پھیلا، اور ایک نیا دور جس کی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی، شروع ہو گیا،

محمود غزنوی نے پنجاب اور پھر گجرات سے آگے قدم نہیں بڑھایا تھا، لیکن شہاب الدین غوری نے پنجاب اور سندھ کو زیرنگین کرنے کے بعد (۵۸۲ھ) شمالی ہند کی طرف یلغار کی۔ اور وہاں جو اصل ہندوستان تھا ———— اپنی بادشاہت قائم کی اور سارے بھارت پر دھاک بٹھا دی۔ ایک اور بات جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ ہے کہ شہاب الدین کی اولوالعزمی نے پہلی مرتبہ ہندوستان کو متحدہ ممالک بنانے کے راستہ پر لا ڈالا، ورنہ اس سے پہلے یہاں ہزاروں ریاستیں تھیں چھوٹی سے چھوٹی بھی اور بڑی سے بڑی بھی، اور ان ریاستوں کا کام صرف باہمی جنگ و پیکار کے سوا کچھ نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ عوام ہر وقت غیر مطمئن حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، وہ کسی حالت میں بھی سکون کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے، لیکن غوری کے اور ممالیک کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان ایک جھنڈے تلے آ رہا ہے، متحدہ شکل و صورت اختیار کر رہا ہے، طوائف الملوکی ختم ہو رہی ہے۔ لوگوں میں اعتماد اور اطمینان پیدا ہو رہا ہے، وہ زندگی کا کاروبار یکسوئی اور فراغِ خاطر کے ساتھ انجام دینے کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں،

غوری کی ان ترکتازیوں اور یلغاروں کا ایک ثمر شیریں یہ بھی ہاتھ آیا کہ شمالی ہند میں علماء صوفیا اور اخیار و ابرار کے قافلے پہنچنے لگے اور انہوں نے پند و تذکیر اور افکار و تلقین سے لوگوں کو کفر کی وادی سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر گامزن کرنا شروع کر دیا۔

اگرچہ شہاب الدین کے کارنامے محمود غزنوی سے ٹکر نہیں کھاتے لیکن نتائج اور اثرات کے اعتبار سے اس کے کارنامے غزنوی سے کہیں زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سودمند ثابت ہوئے، یہ غوری

ہی کی ہمت و استقامت کا پھل تھا کہ مسلمانوں کے قدم اس دیس میں جم گئے، اور پھر کبھی نہ اکھڑے!

ہندوستان پر اس وقت پرتھوی راج حکمرانی کر رہا تھا، یہ اجمیر کا راجہ تھا اور دلی کی حکومت بھی اسے وراثت میں مل چکی تھی، یہ بڑا دلیر اور منچلا بادشاہ تھا، اس کی تعریف میں جو گیت عوام میں گائے جاتے تھے، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ بہادری اس کے قدم چومتی تھی، دلاوری اس پر نثار ہوتی تھی، اولوالعزمی اس کے گھر کی ادنیٰ کنیز تھی، شان فرماں روائی و کج کلاہی اسے زیب دیتی تھی، اس کے من چلے پن کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپنے خالہ زاد بھائی راجہ جے چند (قنوج) کی بیٹی کو بھرے دربار سوئمبر کے بعد گھوڑے پر بٹھایا اور رہوا ہو گیا، کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکا آس پاس کے راجاؤں پر اس کی دہشت قائم تھی، اور اس واقعہ نے دہشت اور شوکت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا، کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے سرتابی کر سکتا یا اس کی مرضی کے خلاف لب کشائی کر سکتا، پرتھوی راج کو اپنی قوت و طاقت پر بھی بہت ناز تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا، اس لئے کہ اس کے پاس نہ مال و زر کی کمی تھی، نہ سپاہ و لشکر کی، گھوڑے تھے، ہاتھی تھے، اونٹ تھے، بیل تھے، نیزے تھے، تلواریں تھیں، تیر تھے، جنگ کے میدانوں کو سر کئے ہوئے اور بڑے بڑے بہادروں سے پنجہ ملاتے ہوئے، سامنت تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا!

شہاب الدین غوری کی پہلی ٹکر اسی سے ہوئی۔

۵۸۵ھ میں غوری بھٹنڈہ کے قلعہ کی طرف یورش کناں بڑھا، اس قلعہ پر پرتھوی راج کا پرچم ملوکیت لہرا رہا تھا، پرتھوی راج کو جب یہ خبر ملی تو وہ ایک لشکر گراں لے کر تھانیسر آ گیا، غوری کے پاس صرف ۱۰، ۱۲ ہزار سپاہی تھے اور رائے پتھورا (پرتھوی راج) کا لشکر دو لاکھ سے زیادہ نفوس پر مشتمل تھا، شہاب الدین اتنی بڑی جنگ کی نہ تیاری کر کے آیا تھا، نہ انتظام، شہاب الدین غوری کے لئے موقعہ تھا، کہ وہ اس جنگ سے دامن بچا لے، اور اپنا لشکر صحیح سلامت واپس لے جائے لیکن غوری غیور بھی

بہت تھا، اُس نے اپنے رفیقوں سے کہا، اگر رائے پتھورا کے لشکر سے آمنا سامنا نہ ہو گیا ہوتا تو ممکن تھا میں یہ کرتا، لیکن اب لڑے بغیر واپس جانا شانِ مردانگی کے خلاف ہے، یہ لڑائی فرائن (کرپال) کے میدان میں ہوئی اور اس میں مسلمانوں کو زبردست شکست ہوئی، محمود غوری بُری طرح زخمی ہوا اور بے ہوشی کی حالت میں اسے بہ دقت میدان جنگ سے ہٹایا جا سکا، اس جنگ میں غوری کس دلیری سے لڑا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب ایک مرصع ہاتھی پر بیٹھے ہوئے رائے پتھورا کے نائب نے تلوار سے غوری پر حملہ کیا تو اس نے پلٹ کر گھوڑا ہاتھی پر بڑھا دیا، اور ہاتھی کی سونڈ کا سہارا لے کر ایسا گرز لگایا کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے!

لیکن صرف بہادری ہی کسی جنگ کا فیصلہ نہیں کرتی، کچھ دوسرے عوامل اور موثرات بھی ہوتے ہیں جو کامیابی کے لئے شرط اول کی حیثیت رکھتے ہیں!

اس شکست سے غوری بہت متاثر ہوا، غیاث الدین نے لاکھ لاکھ تسلی اور تشفی کی باتیں کیں، لیکن اس کا صدمہ کم نہ ہوا، وہ ان غوری سپاہیوں سے خفا ہو گیا جو اس جنگ میں ثابت قدم نہیں رہ سکے تھے، اس نے قسم کھا کر ہر لذت اپنے اوپر حرام کر لی، اُس نے وہ کپڑے بھی نہیں تبدیل کئے جنہیں پہنے ہوئے وہ میدان جنگ میں شکست سے دوچار ہوا تھا،

۵۸۸ھ میں وہ پھر ہندوستان کی طرف ایک لشکر لے کر بڑھا، اس مرتبہ یہ فوج صرف غوریوں ہی پر مشتمل نہیں تھی، ہر قسم کے مسلمانوں کو اذنِ عام تھا کہ جو چاہے مجاہدین کی صف میں شریک ہو جائے، یہ جنگ ملوکیت نہیں تھی جہاد تھا، مسلمان جوق در جوق اور فوج در فوج اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے، اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ اس مرتبہ بھی جنگ کا میدان ترائن ہی قرار پایا، غوری کی سپاہ ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، اور رائے پتھورا کا لشکر گراں حسب سابق اس مرتبہ بھی تین لاکھ سواروں اور پیادوں کا مجموعہ تھا، جس میں جنگی ہاتھی جو صرف اسی حصہ کے لئے سدھائے گئے تھے، بہت کافی تھے، غوری نے سب سے پہلے رائے پتھورا کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔ تاکہ اتمام حجت ہو جائے،

۱۔ اسلام، یا

۲۔ اطاعت!

سفرا نے بھی دو شرطیں پیش کیں، یا تو اسلام قبول کر کے ہمارے بھائی بن جائیے، پھر ہمارا دکھ آپ کا دکھ اور آپ کا سکھ ہمارا سکھ ہوگا، ورنہ پھر ہتھیار رکھ دیجئے اور اطاعت قبول کر لیجئے! رائے پتھورا کے پندار پر یہ اتمام حجت ایک ہتھوڑے کی طرح لگی، وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا، اس نے بڑے سخت اور نا ملائم الفاظ میں یہ پیش کش مسترد کر دی اور جنگ کی دعوت دی، اس نے کہا، اب ہمارا فیصلہ میدان جنگ ہی میں ہوگا، پرتھوی راج کا یہ پندار اس لئے اور زیادہ بڑھ گیا تھا کہ تقریباً ایک سو پچاس راجاؤں اور مہاراجوں نے شریک جنگ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ اپنی سپاہ کے ساتھ میدان میں موجود تھے اور ان سب نے دیوتاؤں کو گواہ کر کے یہ عہد کیا تھا کہ مر جائیں گے مگر پیٹھ نہیں دکھائیں گے ——— بظاہر رائے پتھورا کی فوج کے ہارنے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا، اس مرتبہ بھی غوری اور رائے پتھورا کی فوج میں ایک اور تین کی نسبت تھی۔

شہاب الدین کے کانوں میں جب رائے پتھورا کے الفاظ گونجے تو اس نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا "اگر وہ فیصلہ میدانِ جنگ پر چھوڑتا ہے تو ہم بھی اس پر تیار ہیں"۔

دوسرے روز شہاب الدین غوری کی فوجیں میدانِ جنگ میں صف بستہ ہوتی نظر آ رہی تھیں، پرتھوی راج کا لشکر بھی آن بان اور شان کے ساتھ موجود تھا، اور حملہ کرنے کے لئے آمادہ

جنگ شروع ہوئی

بہت جلد اس نے جنگ مغلوبہ کی صورت اختیار کر لی، کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا، راجپوت بھی جان کی بازی لگا کر لڑ رہے تھے، اور مسلمان بھی موت سے نڈر ہو کر داد شجاعت دے رہے تھے رائے پتھورا کو اپنے سدھے ہوئے ہاتھیوں پر بہت ناز تھا لیکن مسلمان ان ہاتھیوں سے بھی خوف زدہ نہیں ہوئے، انہوں نے ان کا بھی اپنے تیروں اور نیزوں سے ایسی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا کہ خود

یہ ہاتھی ان سے پناہ مانگنے لگے،

غوری کے سرفروش سپاہی اس زور شور سے لڑ رہے تھے کہ ان کی ہمت اور جرأت دیکھ کر بھارت کے سورما لرز اٹھتے تھے، جب ان کی چٹکیاں تیروں کا مینہ دشمن پر برساتی تھیں، تو پرے کے پرے اور صفیں کی صفیں منتشر ہو جاتی تھیں اب تک غوری فوج کو لڑا رہا تھا، خود اپنی سپاہ خاصہ کو لئے الگ کھڑا تھا، جب اس نے دیکھ لیا کہ رائے پتھورا کی فوج لڑتے لڑتے اپنا جوش و خروش ختم کر چکی ہے، تو اس نے نفسیاتی تدبیر کی، اس کی سپاہ خاصہ، جو بارہ ہزار نڈر اور دلاور سپاہیوں پر مشتمل تھی، اب تک الگ کھڑی تھی، اب دفعتًہ وہ اپنی سپاہ خاصہ کو لے کر آگے بڑھا، ان بارہ ہزار آدمیوں نے تین لاکھ کے لشکر پر ایسی تندی اور تیزی کے ساتھ حملہ کیا کہ تہلکہ برپا ہو گیا، راجپوت حوصلہ ہار گئے اور جب کسی طرح سر بر نہ ہو سکے، تو بھاگ کھڑے ہوئے، خود پرتھوی راج بہادری اور شجاعت کے باوجود میدان میں نہ ٹھہر سکا، اور راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن پکڑا گیا، اور جان سے ہاتھ دھونے پر مجبور ہوا، اس جنگ میں بھی کافی ہلاک اور زخمی ہوئے، لیکن رائے پتھورا کے سپاہی ہزارہا ہزار کی تعداد میں مقتول اور مجروح ہوئے، اور اس طرح آن کی آن میں ایک بہت بڑے راجہ اور اس راجہ کی ایک بہت بڑی مملکت کا خاتمہ ہو گیا، سچ کہا ہے اس مالک الملک نے، وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر

قنوج کی شکست

رائے پتھورا کی شکست کے بعد غوری نے دلی اور اجمیر کی ریاستوں کا الحاق نہیں کیا، اپنے ایک معتمد غلام قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام بنایا، اور چلا گیا، لیکن راجہ دلی کی سرکشی اس کی محرومی کا باعث ہوئی، ۵۸۹ھ میں اس نے دلی کو فتح کر کے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا، جس کی ذمہ داری خود راجہ کی تنگ نظری اور بدعہدی پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔

غوری نے قنوج کے راجہ جے چند سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی، لیکن اجمیر اور دلی کے بعد اسے اپنی فکر ہوئی، اور وہ جنگی تیاریاں زور شور سے کرنے لگا، اگرچہ قنوج اب وہ قنوج نہیں تھا، جو ہرش

کے زمانہ میں تھا، یا جس کی مملکت ہم محمود غزنوی کے دور میں دیکھ چکے ہیں، پھر بھی اس کے دبدبہ اور طنطنہ عظمت اور وسعت دھاک اور ساکھ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اس کی یہ جنگی تیاریاں تو مفتوحہ علاقوں کے لئے ایسے خطرہ کا سبب بن سکتی تھیں، جن کا فوری تدارک نہ کیا جاتا، تو نہ جانے کیا حشر ہوتا اس مہم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسے سر کرنے کے لئے خود شہاب الدین غوری کو واپس آنا پڑا، سنہ ۵۹۰ھ میں چنداور کی جنگ ہوئی، اس جنگ نے مسلمانوں کے مقبوضات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا، جے چند نے شکست کھائی، اور بھاگ کھڑا ہوا، یہ ریاست غوری مملکت کا ایک جزو بن گئی، اور اب مسلمان بنارس تک حکمرانی کرنے لگے۔

انتظامی لحاظ سے بھارت کو تین صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱- علی گڑھ

۲- بدایوں

۳- اندور

اور ان تینوں صوبوں کے گورنر سلطان شہاب الدین کے وفادار اور جاں نثار غلام بنائے گئے، دلی پر بدستور قطب الدین ایبک سلطان کا غلام سلطان کی طرف سے حکمرانی کر رہا تھا،

۵۹۹ھ میں سلطان غیاث الدین کا انتقال ہو گیا، اب مکمل طور پر زمام سلطنت شہاب الدین کے حصہ میں آئی، اور وہ نہایت شان و تجمل کے ساتھ غزنی اور بھارت پر حکومت کرنے لگا، بھارت کا کام اتنے عمدہ طریقہ سے سرانجام پا رہا تھا، اور اس کے نائب و گورنر اس خوبی سے اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے کہ پھر اسے یہاں آنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، سوا ایک مرتبہ کے جب وہ کھوکھروں کی سرکوبی کے لئے آیا تھا، اور انہیں مطیع و منقاد کر کے رخصت ہو گیا تھا،

اس مہم کو سر کرنے کے بعد سلطان شہاب الدین غزنی واپس جا رہا تھا کہ راستہ میں چند فرامطہ نے (اسماعیلی مذہب کے پیرو تھے) ۶۰۲ھ سے عالم خواب میں شہید کر دیا، یہ اسماعیلی اس سے

اس لئے برسرِ پرخاش تھے کہ اس نے ان کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، وہ ان کے عقائد اور عقائد سے زیادہ ان کی پراسرار سرگرمیوں سے بہت برہم تھا، اور ان کا کام ہی یہ تھا کہ ملت کے ان بڑے بڑے لوگوں کو دھوکے سے قتل کر دیں جو ان کے مخالف ہیں۔

شہاب الدین کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود بن غیاث الدین غوری فرماں روا ہوا اور اس نے شہاب الدین کے تمام غلاموں کو ان کے مناصب پر بحال رکھا

خاندان ممالیک

سلطان محمود بن غیاث الدین غوری کو یہ معلوم تھا کہ شہاب الدین اپنے غلاموں کو کتنا عزیز رکھتا تھا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان غلاموں کو مرحوم چچا نے کیسے کیسے جہانداری کے منصب سونپے تھے اور یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ یہ غلام اگرچہ اب تک غلام ہی ہیں، لیکن انہیں وہ حشمت و عظمت حاصل ہے، جو ملوک وسلاطین کو بھی نہیں حاصل ہوتی، اس نے مصلحت یہی سمجھی کہ انہیں آزاد کر دے، اور وہ ان کی بادشاہی تسلیم کر لے، اور اس نے کمال تدبر اور دانش سے یہی مناسب خیال کیا، چنانچہ ۶۰۲ھ میں اس نے قطب الدین ایبک کو دلی کا اور تاج الدین یلدز کو غزنی کا بادشاہ (غلامی سے آزاد کر کے) تسلیم کر لیا، چنانچہ باضابطہ جشن تاجپوشی بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منایا گیا۔

سلطان شہاب الدین غوری کے حسب ذیل غلام اسی کی زندگی میں عرصہ ترقی کے منازل طے کر رہے تھے:-

۱- قطب الدین ایبک ——— دلی

۲- تاج الدین یلدز ——— غزنی

۳- ناصر الدین قباچہ ——— سندھ

۴- بہاء الدین طغرل ——— بیانہ اور گوالیار

۵- محمد بن بختیار خلجی ——— اودھ

۶- التمش (شمس الدین) (ایبک کا متبنیٰ)

۷۔غیاث الدین بلبن،

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

قطب الدین ایبک

اسے سلطان شہاب الدین غوری نے خریدا تھا، اچھی تربیت دی، عمدہ تعلیم دلائی، فنونِ جنگ سکھائے، جوہر قابل موجود تھا، چمک گیا رائے پتھورا کی شکست کے بعد شہاب الدین اسے اپنا نائب مناب بنا کر واپس چلا گیا، اب اس کے اور جوہر کو دنیا نے دیکھا، وہ تھا حکمرانی کا انداز، اس نے بڑی خوبی سے حکومت کی، بڑا بیدار مغز اور دور اندیش تھا، دلی کی مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار، اسی کی اولوالعزمی اور جہانداری کے کرشمے ہیں۔

قطب الدین نے ۵۹۱ھ میں اجمیر کو بھی دلی اور میرٹھ وغیرہ کی طرح اپنی حکومت سے ملحق کر لیا، یہاں ایک مسجد تعمیر کی جو "ڈھائی دن کا جھونپڑا" کے نام سے اب تک موجود ہے، اور اپنی لطافت ونزاکت اور خوبیٔ تعمیر کے لحاظ سے آپ اپنا جواب ہے، ۵۹۲ھ میں ایبک نے ایک اور کارنامہ انجام دیا یعنی انہل وارہ (ٹین)، پر قبضہ کر لیا، ۵۹۹ھ میں اس نے کالنجر کا وہ قلعہ فتح کر لیا، جسے بالاتفاق ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا، اس طرح بندیل کھنڈ کے چندیل پورے طور پر قابو میں آگئے، اور ایک طاقتور حریف ختم ہو گیا۔ ۶۰۷ھ میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گرا، اور اس صدمہ کی تاب نہ لا کر لاہور میں وفات پا گیا، اس کا مقبرہ ممکن ہے بنا ہو، لیکن اب تو اس کی صرف قبر چوک انارکلی سے ذرا فاصلہ پر ایک دیوار سے لگی ہوئی موجود ہے، اور سامنے جسٹس اچھرو رام کی حویلی ہے جس کے پھاٹک کے سامنے قبر اور دبتی ہوئی نظر آتی ہے، میں نے خود ۱۹۵۰ء میں قبر کی زیارت کی، اور فاتحہ پڑھ کر واپس آگیا۔

۲۔تاج الدین یلدز

تاج الدین یلدز، سلطان شہاب الدین غوری کا سب سے چہیتا غلام تھا اسے اس نے غزنی کا کاروبار مملکت سپرد کیا تھا، سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد جب اس کا بھتیجا محمود غور کا فرماں روا اور سلطان بنا تو اس نے چچا کے جذبات کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے یلدز کو غزنی کا بادشاہ تسلیم کر لیا،

لیکن یلدز صرف غزنی پر قناعت کرنا نہیں چاہتا تھا، اس کی تمنا تھی کہ موجودہ صوبہ سرحد اور پنجاب کو بھی اپنی تحویل میں رکھے، قطب الدین ایبک تاج الدین یلدز کا داماد تھا، لیکن اس نے یلدز کا یہ دعویٰ نہیں قبول کیا، اور ان علاقوں کو اپنی مملکت میں شریک رکھنے پر مصر رہا، آخر نوبت لڑائی تک پہنچی، قطب الدین فتحیاب رہا اور یلدز کو شکست سے دوچار ہونا پڑا قطب الدین اتنے جوش میں تھا کہ تعاقب کناں غزنی تک پہنچ گیا، یہاں آکر پانسہ پلٹا اور وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن سلطان محمود نے قطب الدین اور تاج الدین دونوں کو اپنے علاقہ کا بادشاہ اور سلطان تسلیم کر کے خلعت شاہی اور خط آزادی سے سرفراز کیا، یلدز کو زیادہ عرصہ تک خدمت کرنے کا موقعہ نہ ملا لیکن مجموعی حیثیت سے اس نے نظم و انتظام اور ضبط و امن قائم رکھنے کی بڑی جد و جہد کی، اور کافی حد تک اس میں کامیاب رہا۔

۳۔ ناصر الدین قباچہ یہ سندھ کا گورنر تھا، لیکن جب سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کی خبر سنی تو وہاں کا بادشاہ بن بیٹھا، یہ قطب الدین ایبک کا داماد تھا، لیکن اس رشتہ کے باوجود حکومت کے لئے دونوں میں کشمکش بھی ہوئی اور جنگ کی بھی نوبت آئی، ملتان تک اس کا قبضہ تھا، اور یہ علاقہ ایبک اس سے نہ چھین سکا۔ تاج الدین یلدز سے بھی اس کی آویزش جاری رہی، سندھ اور بلوچستان کے لئے یلدز سے پنجاب کے لئے ایبک سے ۶۱۸ھ میں اسے جلال الدین خوارزم شاہ سے ——— جو سندھ میں چنگیز کے چنگل سے بچ کر آگیا تھا ——— مقابلے کرنے پڑے، اگرچہ اسے طرح طرح کی بیرونی اور خارجی مشکلوں سے سابقہ پڑا، لیکن عزم و ہمت والا آدمی تھا، اپنی جگہ ڈٹا رہا اور توسیع مملکت کی کوششوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوا، چنگیز کی سفاکی اور درندگی سے خستہ اور درماندہ اور عاجز ہو کر جو علماء، امراء اور ادباء شعراء سندھ پہنچے ان کی قباچہ نے بڑی اچھی طرح پذیرائی کی، انہیں ہر طرح سے نوازا اور حتی الامکان ان کے راحت و آسائش کا پورا پورا بندوبست کیا ۶۲۴ھ میں ایبک کے جانشین التمش سے اس کی لڑائی ہوئی، ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی، جب کوئی چارہ ساز باقی نہ رہا، التمش کے سامنے جان کی امان مانگنے

کے بجائے دریا میں کود کر جان دے دینے کو ترجیح دی ،

۴۔ بہاء الدین طغرل اسے سلطان شہاب الدین غوری نے بیانہ اور گوالیار کی تسخیر پر مامور کیا تھا یہ بڑا دریا دل، عالی ظرف اور سیر چشم شخص تھا ، اس نے ایک نیا قلعہ سلطان کوٹ کے نام سے تعمیر کرایا ، قطب الدین ایبک نے سازش کر کے قبل اس کے کہ یہ گوالیار کا قلعہ فتح کرتے ، محصورین سے ساز باز کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا طغرل کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی ، بہت برہم ہوا اگر زندہ رہتا تو ممکن تھا جنگ کی نوبت پہنچ جاتی ، لیکن بہت سی خوبیوں اور قابل رشک صلاحیتوں کے باوجود موت نے مہلت نہ دی ، اور عین عالم شباب میں اس دنیا سے اس مختصر سی علالت کے بعد رخصت ہو گیا ۔ یہ اگر زندہ رہتا تو کچھ بعید نہ تھا، کہ یہ ایبک کا سب سے زیادہ کامگار اور کامیاب حریف ثابت ہوتا، اس لئے کہ دوسری خوبیوں اور داد و دہش کے صفات کے ساتھ ساتھ اس میں جنگی اور عسکری صلاحیتیں بھی بہت تھیں ، لیکن قضائے الٰہی کے آگے کس کی چلی ہے !

۵۔ محمد بن بختیار خلجی یہ اگرچہ باقاعدہ غلام نہیں تھا لیکن کسی خاص حیثیت کا بھی حامل نہیں تھا کس مپرسی اور پریشان حالی میں زندگی بسر کی ، غوری کے زمانہ میں بہت سی مایوسیوں اور محرومیوں کے بعد اسے اودھ میں کارگزاری کا موقعہ ملا ، اور پھر اس نے وہ کارنامہ انجام دیا جو آج بھی تاریخ کا حیرت انگیز ترین واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ۵۹۹ھ میں اس نے صوبۂ بہار کی کئی ریاستوں کو جو رقبہ میں بھی چھوٹی تھیں اور زیادہ طاقتور بھی نہ تھیں بڑی آسانی سے فتح کر لیا ، اس سے اس کی ہمت بلند ہوئی ، فتحمندی کا جوش اور ولولہ پیدا ہوا ، کشور کشائی اور جہانگیری کے خواب دیکھنے لگا ، کبھی کبھی خواب حقیقت میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں ، چنانچہ اس کا خواب بھی حقیقت بن گیا !

صوبہ بنگال پر ایک برہمن خاندان کا راجہ لکشمن حکومت کر رہا تھا ، محمد بن بختیار خلجی ، بنگال فتح کرنے کے ارادہ سے دو ڈھائی سو سوار لے کر نکلا ۔ ——— اتنی بڑی حکومت ، اور اتنی مختصر فوج ——— جب پایۂ تخت کے قریب پہنچا تو اتنا تیز آیا تھا کہ بہت سے سوار پیچھے رہ گئے ، اب صرف اٹھارہ سوار ساتھ تھے ، محمد بن بختیار اس طرح جیسے آگے کوئی خطرہ نہیں ہے ، اور کامیابی ہاتھ باندھے

کھڑی ہے، بغیر کسی جھجک اور تامل کے ان سواروں کو لے کر گھوڑے دوڑاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا، اور قلعہ کی طرف بڑھا، شہر والوں نے ان مٹھی بھر سپاہیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، قلعہ کے دروازے کھلے ہوئے تھے، محافظین کو ان ۱۸ سواروں سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا، وہ سمجھے یہ گھوڑوں کے تاجر ہیں، اور راج محل میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے آرہے ہیں، جیسے ہی یہ لوگ پھاٹک کے اندر داخل ہوئے، فوراً تلواریں سونت لیں اور محافظوں اور دربانوں کو آن کی آن میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور نخط مستقیم رنواس کی طرف بڑھے، راجہ کھانا کھا رہا تھا، دفعتہً غل مچا اور فریاد و فغاں کی آواز پہنچی وہ اتنا ہراساں ہوا کہ کھانا اور جوتا چھوڑ کر چور دروازے سے صرف جان ساتھ لے کر بھاگا

فوراً ہی محمد بن بختیار کی حکومت قائم ہو گئی؛ بعد میں وہ سوار بھی جو پیچھے رہ گئے تھے آ گئے، چند روز میں ایک فوج مرتب ہو گئی، راجہ لکشمن بھاگ کر ڈھاکہ کے پاس ایک مقام بیرم پور میں پہنچا، اور پناہ گزیں ہو گیا، محمد بن بختیار نے لکھنوتی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ٹھاٹھ کے ساتھ حکومت کرنے لگا

یہ واقعہ اب بھی ایک خواب معلوم ہوتا ہے، ہاں یہ خواب ہی ہے لیکن ایسا خواب جس نے حقیقت کا جامہ پہن لیا تھا، اور جسے تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے! ————

۶۰۲ھ میں کہ وہ تبت اور ترکستان پر ترک تازیوں کے منصوبے بنا رہا تھا بیمار پڑا، اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کے ساتھ ہی اس کی اولوالعزمی بھی دفن ہو گئی ————

شمس الدین التمش

یہ بھی ایک معمولی آدمی تھا لیکن قطب الدین ایبک کی نظر پر چڑھ گیا، اس نے اپنا متبنیٰ بنا لیا، بیٹی کی شادی کر دی؛ اس کے بعد بدایوں کا صوبہ دار بنا اور ایبک کے بعد یہی اورنگ نشین ہوا سوتیلے بھائیوں نے اسے غلام بنا کر بازار میں فروخت کیا تھا، قسمت نے اس غلام کو بھارت کا اتنا بڑا بادشاہ بنا دیا کہ اس سے قبل کی تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

۶۱۲ھ میں تاج الدین یلدز بادشاہ ہند بننے کے خیال سے پھر آگے بڑھا ترائن کے قریب شمس الدین التمش سے مقابلہ ہوا، گرفتار کر کے بدایوں بھیج دیا گیا۔ اور وہیں فوت ہوا، یلدز کے

بعد التمش نے قباچہ سے مقابلہ کیا اور اسے شکست دی اور اپنا قبضہ مستحکم کر لیا ۶۲۴ھ میں التمش کے بیٹے نے باپ کا حکم پا کر بنگال کے خود ساختہ بادشاہ غیاث الدین کو مقابلہ کر کے گرفتار کر لیا اور یہاں بھی التمش کی فرماں روائی بے روک ٹوک تسلیم کر لی گئی،

اب راجپوتانہ کی باری تھی، بغیر یہاں تسلط قائم کئے گجرات و مالوہ پر تسلط نہیں قائم کیا جا سکتا تھا، چنانچہ التمش نے اس طرف بھی توجہ کی، رن تھنبور کا قلعہ اپنے استحکام کے لحاظ سے دنیا کے چند ناقابل تسخیر قلعوں میں شمار ہوتا تھا، ہندوؤں میں عام طور یہ مشہور تھا کہ ماضی میں اس پر ستر سے زیادہ حملے ہوئے اور کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا، اس قلعہ کے اب بھی جو آثار موجود ہیں، انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے استحکام کے بارے میں جو روایتیں مشہور تھیں، وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں تھیں، یہ قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھا، اس لئے نیچے سے اوپر چڑھنا اور اوپر بیٹھے ہوئے حریف کے ریلوں کو روکنا بہت مشکل تھا، لیکن ۶۱۳ھ میں التمش نے ایک زبردست معرکہ کے بعد اسے بھی سر کر لیا، ۶۲۴ھ میں مارواڑ کے صدر مقام پر کامیابی سے قبضہ کر لیا، ۶۲۵ھ میں اس نے قباچہ کو شکست دی، اس نے خودکشی کر لی اور ملک سندھ بھی دلی کی بادشاہی کے ماتحت ہو گیا' قباچہ کی موت نے التمش کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اب اس کا کوئی حریف باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اور وہ نہایت اطمینان سے بھارت کے طول و عرض پر حکومت کرنے لگا، التمش کے فتوحات اور کارنامے اتنے روشن، تابناک اور مشہور تھے کہ خلافت عباسیہ بغداد نے باقاعدہ اپنے سفیر بھیج کر ۶۲۶ھ میں دلی بھیجے اور سند بادشاہی مرحمت فرمائی، اگرچہ خلفائے بغداد کا کوئی اثر بھارت کی حکومت پر نہیں پڑ سکتا تھا، لیکن ان کی روحانی اور دینی عظمت ہر مسلمان کے دل میں موجود تھی، اس سند نے التمش کا دل فخر و مسرت سے بھر دیا اور اس کی شہنشاہی ایک متفق علیہ مسئلہ بن گیا،

التمش کی فیروزمندیوں اور کامرانیوں کا سلسلہ سیل رواں کی طرح جاری تھا!

۶۲۳ھ میں جب گوالیار کے راجہ نے سرکشی کا اظہار کیا، تو التمش خود سرکوبی کے لئے پہنچا اور محاصرہ کر لیا، آخر گوالیار بھی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گرا، پھر ۶۳۱ھ

میں مالوہ پر بھی التمش کا پرچم لہرانے لگا، اور بھیل وا جین اس کے قبضہ و تسلط میں آ گئے

۶۳۳ھ میں التمش کا انتقال ہو گیا، اس نے صرف ۲۶ سال حکومت کی، لیکن اس مختصر سی مدت میں اس نے وہ کارنامے انجام دیئے، جو چھ سو برس کی حکومت میں بھی دوسروں کے لئے ممکن نہیں تھا۔

التمش کے بیٹے نالائق اور نااہل ثابت ہونے، پر اس کی چہیتی بیٹی رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھی، لیکن عورت کی حکومت مردوں کو گوارا نہ ہوئی، ۶۳۷ھ میں وہ مع اپنے شوہر التوفیہ کے دہلی پر چڑھائی کرتی ہوئی ماری گئی اور اس کا بھائی معزالدین بہرام شاہ تخت نشین ہوا، یہ بھی نااہل ثابت ہوا، اس کے عہد میں مغلوں (تاتاریوں) نے پیہم حملے کئے، لاہور کو تو بالکل تاراج کر دیا، لیکن یہ اپنے مشاغل میں منہمک رہا، کچھ نہ کر سکا، ۶۳۹ھ میں یہ قید کر لیا گیا اور اس کا بھتیجا علاء الدین مسعود تخت پر بٹھا دیا گیا۔ الغ خاں فوجی سربراہ قرار پایا اور اس کے دور میں پھر مغل چڑھ آئے، ایک بڑا لشکر تیار ہوا جس نے ان کا منہ پھیر دیا، اس کامیابی کے بعد یہ بھی عیاشی میں پڑ گیا، آخر یہ بھی قید کر لیا گیا، اور التمش کا چھوٹا بیٹا ناصرالدین محمود تخت نشین کیا گیا (۶۴۴ھ) یہ بڑا نیک، عابد اور دیندار شخص تھا، لیکن نظم مملکت سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا، چند سال بعد اپنے ایک غلام اور سردار غیاث الدین بلبن کو کاروبار مملکت سونپ دیا، اور خود ریاضت و عبادت میں مصروف ہو گیا،

۷۔ غیاث الدین بلبن

بلبن بھی ایک غلام تھا، جو بازار سے خریدا گیا تھا، رفتہ رفتہ اپنی قابلیت اور اہلیت سے امیر کبیر بن گیا، اس کی بیٹی سے ناصرالدین محمود کی شادی ہوئی تھی، ۶۶۴ھ میں ناصرالدین فوت ہو گیا، چونکہ لاولد تھا اور بلبن پہلے ہی سے رئیس الوزرا اور نائب شاہ بن چکا تھا، لہٰذا کرسی وزارت سے تخت شاہی تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہیں پیش آئی، وہ بڑی آسانی سے بادشاہ، شہنشاہ اور سلطان معظم و محتشم بن گیا، اور لوگوں نے اس کی خداوندی کے سامنے ادب و احترام کے ساتھ سر جھکا دیا۔

بلبن میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک فرماں روا میں ہونی چاہئیں، وہ بہادر تھا، صاحب

عزم نہ کردار تھا، بلند حوصلہ اور اولوالعزم تھا، خطاکاروں کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر کوئی سخت گیر نہیں تھا، اور مظلوموں کا اس سے بڑا کوئی دستگیر نہیں تھا، وہ عدل وانصاف کے مقابلہ میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتا تھا، وہ حق دلانے کے معاملہ میں بڑا چوکس تھا، بدایوں کے صوبہ دار نے ایک آدمی کو بلاقصور قتل کرا دیا، بلبن کو اطلاع ملی تو اس نے فوراً صوبہ دار کی اسی طرح جان لی جس طرح اس نے اس مظلوم کی جان لی تھی، اور ڈاک کے سربراہ کو بھی پھانسی دے دی کہ اس نے اطلاع کیوں نہ دی ایک طرف یہ سختی تھی، دوسری طرف یہ عالم تھا کہ بیواؤں، محتاجوں، یتیموں، ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتا تھا، علما اور مشائخ کی تعظیم وتکریم دل سے کرتا تھا، ان کی نصیحتیں سنتا تھا ان کے وعظ وپند پر توجہ کرتا تھا، ان کی ہدایتیں قبول کرتا تھا۔

بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے تاتاریوں (مغلوں) کے مسلسل اور پیہم حملوں کے خلاف ایسے دفاعی مورچے قائم کئے کہ اس فتنہ کا بڑی حد تک استیصال ہو گیا، پنجاب کے بہت سے علاقے تاتاریوں کی یورش سے بنجر اور بے آب وگیاہ ہو گئے تھے، آبادی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی بلبن نے ان علاقوں کو پھر بسایا، لاہور کی رونق پھر قائم کی، اور اپنے محبوب اور مدبر بیٹے محمد کو ملتان میں اپنا نائب بنا کر بھیج دیا۔

بلبن کا زمانہ اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ اس نے غیر سوشل عناصر کے استیصال میں بھی بڑی جدّ وجہد کی، لٹیروں، ڈاکوؤں اور قزاقوں کی سرکوبی کے لئے اس نے جنگل کے جنگل صاف کر دیئے، جو پکڑا گیا اس کی گردن اڑا دی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں کھونٹ امن قائم ہو گیا، لوگ اپنی جان مال کی طرف سے مطمئن ہو گئے اور عافیت کی زندگی بسر کرنے کے پھر سے خوگر ہو گئے،

سرکشی اور بغاوت کسی قیمت پر بھی بلبن برداشت نہیں کر سکتا تھا، حکومت کی مرکزیت اور جمعیت کی ہر حالت میں توقیر کرانا چاہتا، ۶۷۸ھ میں بلبن کے ایک غلام طغرل نے جو بنگال کا صوبہ دار تھا بغاوت کی، بلبن ضعیف دکبن سال ہونے کے باوجود خود دلی سے بنگال گیا، اور طغرل اور اس کے ساتھیوں کو عبرت انگیز طور پر موت کے گھاٹ اتار کر واپس آیا اور اپنے بیٹے بغرا خان کو سردار

بنا آیا، ۶۸۴ھ میں تاتاریوں (مغلوں) نے پھر ایک زبردست حملہ کیا، تیمور لنگ اس حملہ کا سربراہ تھا، محمد نے ایسی خوبی سے مقابلہ کیا کہ تاتاریوں نے دو مرتبہ حملہ کیا، اور ہر دو مرتبہ بُری طرح شکست کھانے پر مجبور ہوئے، محمد تعاقب میں آگے نکل گیا، صرف چند ساتھی ساتھ تھے، تاتاریوں نے گھات لگائی اور شہزادے کی جان لے لی؛ اس حادثہ نے بلبن کی کمر توڑ دی، بڑھاپا پہلے ہو چکا تھا، اب دُنیا سے دل بیزار ہو گیا، بنگال سے بغرا خاں کو جانشین بنانے کے لئے بلایا، وہ نہ آیا تو اس کے بیٹے کیقباد کو جانشین بنا کر اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ (۶۸۶ھ) کیقباد آوارہ مزاج، اوباش طبع اور دنی فطرت انسان تھا، وہ اس بوجھ کو نہ اُٹھا سکا، جو سلطنت اسے ورثہ میں ملی تھی اسے اس نے اپنی نااہلی اور نالائقی سے گنوا دیا۔

بلبن نے اس سلطنت کو اپنے حسن انتظام، تدبر، دانشمندی عسکری قابلیت اور زور بازو سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا، لیکن کیقباد نے اسے آن کی آن (۶۸۹ھ) میں اپنے کرتوتوں کے باعث ختم کر دیا، اس کے ساتھ ہی یہ خاندان بھی ختم ہو گیا اور افق حکومت پر دوسرا ستارہ طلوع ہوا، جس کا ذکر آگے آئے گا،

اگر بغرا خاں بنگال چھوڑ کر دلی آجاتا تو بہت ممکن تھا، دلی کی حکومت کچھ عرصہ تک اور اس کے خاندان میں رہتی، لیکن وہ دلی پر بنگال کی رعنائیوں کو ترجیح دیتا تھا، اس نے یہ گوارا کر لیا کہ بیٹا بادشاہ بن جائے، اور خود صوبہ دار رہے، لیکن یہ گوارا نہ ہوا کہ بنگال سے آئے اور کاروبار مملکت سنبھال لے۔

بھارت پر مسلمانوں کی حکومت

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات و دوام

جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام!

مسلمانوں کے تحائف

وحدت ملکی، نظم و انتظام، مساوات، تعمیرات نو بہ نو، اسلام

جس دور کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں، اور جس کا تذکرہ کرنے والے ہیں ان میں فتوحات اور کشورستانی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہمیں ارعاداری کی نظر آتی ہے، وہ تہذیب و تمدن اور ثقافت و حضارت کی ترویج ہے۔ مسلمان جب اس دیس میں آئے تھے تو یہاں کا لباس دھوتی اور چادر کے سوا کچھ نہ تھا، —— لیکن مسلمان اپنے ساتھ ایک پورا لباس لائے، اور یہ لباس ہر اعتبار سے ستر پوش اور نظر فروز تھا، اس کی تراش خراش اس کی وضع قطع اس کے اسلوب اور طرز میں ایک خاص قسم کا بانکپن تھا، ایک مخصوص طرز کی شوبھا تھی، اسی طرح مسلمانوں نے جب اس سرزمین پر قدم رکھا ہے تو دال اور ترکاری کے علاوہ یہاں کے کھانوں کا "مینو" بالکل سادہ تھا —— لیکن مسلمان اس پر کس طرح قناعت کر سکتے تھے؛ وہ اپنے ساتھ پورا مطبخ پورا باورچیخانہ، پورا آبدارخانہ لائے، زردہ، پلاؤ، بریانی، کباب، قورمہ، قلیا، فیرنی، کھیر، آب جوش وغیرہ سینکڑوں قسم کے کھانوں سے انہوں نے اس دیس کو روشناس کیا، اسی طرح مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں علم و فن کی درماندگی حد درجہ قابل رحم تھی، علوم کا چلن عام طور پر نہیں تھا، سنسکرت مقدس زبان تھی، جسے صرف برہمن ہی حاصل کر سکتے تھے، طب کی طرف توجہ تھی، لیکن نہ اتنی کہ وہ کوئی ہندوستان گیر فن بن جاتا، فلسفہ سے بھی ہندوؤں کو مس تھا لیکن ایک خاص قسم کا فلسفہ جو فلسفہ بھی تھا اور مذہب بھی اور کچھ نہیں، اور تاریخ سے تو اس دیس کے قدیم باشندوں کو کد تھی، بیرونی کی کتاب "الہند" ہمارے اس دعوے کا بہترین ثبوت ہے، مسلمان اپنے ساتھ علوم و فنون کے قافلے بھی لائے انہوں

نے یہاں آکر تاریخ کا درس دیا، شاعری کو پروان چڑھایا، کلام اور مناظرہ کی داغ بیل ڈالی، فلسفہ اور منطق کو نئی زندگی بخشی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ترویج علم کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں مکتب، مدرسے، پاٹھ شالے اور علم کدے قائم کر دیئے اور کسی طرح کی تخصیص روا نہ رکھی، علم اس لئے تھا کہ شائع ہو، ہر اس شخص کی جو علم حاصل کرنا چاہے حوصلہ افزائی کی گئی، نہ صرف یہ کہ اس کے راستہ میں کسی قسم کی دشواری حائل نہیں رکھی گئی بلکہ زبان سے زیادہ سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی گئیں اور اس کا نتیجہ حسب دلخواہ برآمد ہوتا،

مسلمان جب ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، تو یہاں کے منادر اور قلعے اور مکان ایک خاص قسم کے طرز تعمیر کے حامل تھے، کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ آبادی کا بندوبست، اس طرز تعمیر پر قدرت کی مہریں چاہے جتنی زیادہ لگی ہوں، لیکن اس میں دلآویزی، دلکشی اور رعنائی کے عناصر بہت کم تھے، مسلمانوں نے یہاں باغات لگائے، عمارتیں بنائیں، مسجدیں تعمیر کیں، قلعے بنائے، محلات و قصور اور ایوان تعمیر کئے، مقبروں کی طرح ڈالی، قبرستان بنائے، خانقاہوں کی بنیاد ڈالی، حوض، تالاب کنوئیں اور باؤلیاں تیار کیں، بڑے بڑے مینار اور گنبد کھڑے کر دیئے اور ان سب چیزوں میں حسن و آرائش کا ایسا تناسب رکھا کہ مسلم تعمیرات نے تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا، مسلمان مٹ گئے، اور مٹائے جا رہے ہیں، لیکن ان کے آثار و نقوش کھنڈر بن جانے، تباہ ہو جانے اور بڑی حد تک مٹ جانے کے باوجود آج بھی باقی ہیں اور ان کی عظمت و رفعت کے بہترین گواہ ہیں،

عورت کا حال بھارت میں بہت زیادہ ابتر تھا، اسے کسی قسم کے حقوق نہیں حاصل تھے، نہ وہ اس قابل سمجھی جاتی تھی کہ علم حاصل کرے، نہ اسے اس کا مستحق قرار دیا جاتا تھا کہ ترکہ اور ورثہ حاصل کرے، نہ معاملات و مسائل میں اس کی رائے لی جاتی تھی، وہ صرف اس لئے تھی کہ لڑکی کی حیثیت سے باپ کے گھر میں، بیوی کی حیثیت سے شوہر کے گھر میں، اور بڑھاپے کے دور میں اولاد کے گھر میں چاکری اور خدمت کرے، پھر جب چاکری کرتے کرتے وہ بیوہ ہو جاتی تو پھر لکڑیوں کی چتا تیار کرے، اس پر تیل چھڑکے اور نیا لباس پہن کر بھڑکتی ہوئی آگ کے اس تنور میں جل کر بھسم ہو جاتی، اس کے برعکس مسلمانوں نے

اپنی بیگمات کے ساتھ جو سلوک اور برتاؤ مرعی رکھا۔ یہ دیکھ کر بہتوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ یہ باور کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ عورتیں بھی روح رکھتی ہیں، دل رکھتی ہیں، حقوق رکھتی ہیں، زندہ رہنے اور اعزاز و احترام کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حق رکھتی ہیں، انہیں باپ کا شوہر کا، اولاد کا ترکہ بھی مل سکتا ہے، اور اس ترکہ پر یہ بلا شرکت غیرے قابض ہو کر جس طرح چاہیں اسے صرف کر سکتی ہیں، یہ نئی اور عجیب بات تھی، لیکن اس سے آنکھیں نہیں بند کی جاسکتی تھیں، اسے دیکھنا پڑتا تھا، ماننا پڑتا تھا!

مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں کا نظم و امن ابدامنی، لوٹ مار، قزاقی اور ڈکیتی کی نذر ہو چکا تھا، نہ راستے محفوظ تھے، نہ منزلیں، مسافروں کے قافلے دن دہاڑے لوٹ لئے جاتے تھے، لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے لٹ جاتے تھے، لیکن مسلمانوں نے یہ چیز بھی ختم کر دی، انہوں نے لیٹروں ڈاکوؤں اور قزاقوں کی ایسی سرکوبی کی کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکے، وہ جہاں پہنچے ان کا تعاقب کیا گیا، وہ دشوار گزار جنگلوں میں جا چھپے، تو یہ جنگل کاٹ کر پھینک دیئے گئے، ہر حالت میں ان کا سراغ لگایا گیا، اور انہیں قرار واقعی سزا دی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں کھونٹ نظم و امن قائم ہو گیا، اور لوگ امن و عافیت اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے، اسی طرح مسلمانوں نے اپنے دور مملکت میں، سیاسی اصلاحات نافذ کئے، نیا بندوبست کیا مالگذاری، مالیانہ اور آبیانہ کی مناسب شرحیں مقرر کیں، کسانوں کی حالت سدھاری، رشوت خوروں کو عبرت انگیز سزائیں، افسروں اور حاکموں میں خدمت کا جذبہ پیدا کیا، مظلوموں کی دادرسی کی، ظالموں کو عبرت انگیز سزائیں دیں، اور حالات اس طرح درست کرائے کہ رعایا دل سے اپنے اِن فرماں رواؤں کو جنہیں پہلے وہ بالکل نہ جانتی تھی ترقی اقبال اور درازئ عمر کی دعائیں دینے لگی،

مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ دیس ہزاروں ریاستوں کا مجموعہ تھا، ان چھوٹی بڑی ریاستوں کی حیثیت، آزاد اور خود مختار واحدہ کی تھی، لیکن مرکز کی تابع نہیں تھیں، معاملات داخلہ و خارجہ انہی کی صوابدید پر تھے۔ یہ جی بھر کے آپس میں لڑتی تھیں، اور ملک میں بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کرتی تھیں، اشوک کے عارضی اور وقتی دور کے بعد سب سے پہلی مرتبہ مسلمانوں نے وحدتِ ہند اور مرکزی حکومت کا

تصور پیدا کیا، اسے عملی جامہ پہنایا، اور ایک ایسی مرکزی حکومت قائم کر دی، جس کا دبدبہ شمالی ہند ہی پر نہیں جنوبی ہند جیسے دور دراز مقام تک پر تھا، اور جس کی مرکزیت کو کوئی بغاوت کوئی شورش اور کوئی بدامنی، حتیٰ کہ مغلوں (تاتاریوں) کی بے پناہ مہلک اور غارت گر یلغار بھی تباہ نہ کر سکی، بھارت کی موجودہ وحدت اور سالمیت مسلمانوں ہی کی عطا کردہ ہے، جسے ایک ہزار برس تک مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں قائم رکھا، پھر ڈیڑھ سو برس تک انگریز اس پر عامل رہے، اور اب موجودہ حکومت ہند پوری مضبوطی سے اس وحدتِ ملکی کا دامن تھامے ہوئے ہے۔

جس زمانہ میں نہ ریل تھی نہ تار، نہ دورسل و رسائل کی ترسیس، نہ ریڈیو، نہ ہوائی جہاز، مسلمانوں نے ڈاک کا ایسا بہتر اور مکمل انتظام کیا کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑی آسانی سے ڈاک بغیر کسی اختلال کے پہنچتی رہتی تھی، یہ اتنی بڑی سہولت اور آسائش تھی جس سے اہل ہند شکر گزاری کے ساتھ متمتع ہونے لگے۔

مسلمانوں کے اس حسن انتظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ صنعت زراعت اور تجارت کی کساد بازاری ختم ہو گئی اور ان چیزوں کو خوب فروغ حاصل ہوا، روپیہ کی قیمت اتنی زیادہ بڑھ گئی اور ضروریات حیات اتنی سستی ہو گئیں کہ پانچ روپے مہینے میں ایک کنبہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے لگا۔

مسلمان اپنے ساتھ اہل ہند کے لئے بہت سے تحفے لے کر آئے تھے

اور ان تحفوں میں سب سے بیش بہا قیمتی اور گراں مایہ تحفہ تھا، رواداری اور مساوات عامہ کا!

ایک طرف ناروا داری کا یہ عالم کہ وید کے اشلوک اگر کسی اچھوت کے کان میں پڑ جائیں تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے، نہ صرف غیر ملکیوں اور غیر مذہب والوں، دیار ہند کے رہنے والے ملیچھ اور ناپاک سمجھتے تھے، بلکہ اپنے ہم کرداروں، ہم قوموں اور ہم مذہبوں کو بھی وہ ناپاک اور ملیچھ سمجھتے تھے، یہ ہندو تھے، لیکن مندروں میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے، یہ ویدوں پر اعتقاد رکھتے تھے، لیکن وید کا کوئی اشلوک پڑھنا تو درکنار سن بھی نہیں سکتے تھے، یہ اپنے دھرم کی کوئی رسم بغیر برہمنوں کی سربراہی کے انجام نہیں دے سکتے تھے، لیکن انہی لوگوں نے حیرت، تعجب اور رشک

کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا —— آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
تو —— : قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا ، اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اور یہ مسلمان دوسرے مذاہب والوں کے معاملہ میں بھی بڑے سیر چشم اور روادار تھے ، ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھا لیتے تھے ، ان کے ساتھ کسی قسم کی چھوت چھات نہیں کرتے تھے ، ان کی مذہبی کتابیں پڑھتے تھے ان کے دھرم کی باتیں توجہ سے سنتے تھے ، اس رواداری اور مساوات نے انہیں مجبور کر دیا کہ سوچیں اسلام کیا ہے ؟ اور جب وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تو اسلام قبول کرنے سے کیسے بچ سکتے تھے ؟

ایک اور چیز بھی تھی

بھارت کے دیس میں مذہبی تحقیق ، رد و کد ، اعتراض و سوال ایک ناقابلِ برداشت جرم تھا ، لیکن مسلمانوں کے ہاں یہ چیز عام تھی ، وہ آپس میں مناظرے کرتے تھے ، اختلافِ رائے کرتے تھے ، ایک دوسرے پر تنقید و احتساب کرتے تھے ، لیکن پھر بھی مذہب سے برگشتہ نہیں ہوتے تھے ، بلکہ اور زیادہ اس کے مداح و ثنا خواں ہو جاتے تھے ، بھارت کے رہنے والوں نے یہ عجیب اور نئی چیز دیکھی ، دل ہی دل میں اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ، اور پھر —— بہت عرصہ بعد —— خود بھی اس راستہ پر چل پڑے ، یہ آریہ سماج ، یہ برہمو سماج ، یہ سکھ مت ، یہ کبیر پنتھی مذاہب اور مسالک عالمِ وجود میں آ سکتے تھے اگر بھارت کے رہنے والوں نے مسلمانوں سے استفادہ نہ کیا ہوتا ، ہندو مت کا یہ تجدد تمام تر رہین تھا ، مسلمانوں سے استفادہ کا ،

غرض تاریخ کے اوراق جتنے بھی کھنگالے جائیں گے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح تر ہوتی چلی جائے گی کہ مسلمانوں نے اس دیس کو بہت کچھ دیا ! اور جو کچھ دیا ، ناشکری کے باوجود بھارت

اس سے استفادہ اب تک کر رہا ہے، اور ہمیشہ کرتا رہے گا،!

اس ضروری خاکہ کو پیش کرنے کے بعد اب ہم سلسلۂ کلام پھر وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے چھوڑا تھا!

خلجی خاندان

جنوبی ہند پر مسلمانوں کی پہلی کامیاب تاخت

جب کیقباد بلبن کے ایوانِ عظمت کو نہ سنبھال سکا تو جلال الدین فیروز خلجی آگے بڑھا، اور دربار کے امرا نے تاج شہریاری اس کے سر پر رکھ دیا، یہ دربار بلبنی کا ایک امیر تھا، لیکن قسمت میں بادشاہت لکھی تھی، خلاف توقع حالات میں تخت حکومت پر بیٹھ گیا (۶۸۹ھ)

بڑا رحمدل، سیر چشم، اور مرنجان مرنج بادشاہ تھا، ۶۹۱ھ میں مغلوں (تاتاریوں) نے پھر یورش کی، دلی کے بادشاہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور کامیاب ہوا، بہت سے تاتاری گرفتار ہو گئے، ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا، اور انہیں دلی میں بسا لیا گیا، اب تاتاری اسلام سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، بہت سے مسلمان ہو بھی چکے تھے، ان گرفتار شدگان میں بھی کافی مسلمان تھے، ۶۹۴ھ میں جلال الدین کے بھتیجے علاء الدین خلجی نے دیوگری (جنوبی ہند) پر کامیاب یلغار کی، یہ بھی تاریخ کا ایک حیرت انگیز اور عجیب واقعہ ہے، علاء الدین کا لشکر تعداد میں کم تھا، راستہ پر خطر تھا، ۵۰۰ میل تک کسی دوست کا نام ونشان تک نہ تھا لیکن علاء الدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ مہم سر کر لی اور مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ یقیناً مال غنیمت وہ اپنے ساتھ لایا، اتنا مال غنیمت کسی ایک مہم میں اس سے پہلے کسی فاتح کو نہیں ملا تھا،

علاء الدین خلجی کی جانشینی

۶۹۵ھ میں علاء الدین نے چچا (جلال الدین فیروز خلجی) کو قتل کر دیا اور مالک تاج وتخت ہو گیا، اس کے عہد میں، بلکہ یوں سمجھئے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی (۶۹۶ھ) مغلوں نے پھر بڑے وسیع اور منظم پیمانہ پر

یلغار کی، اور دلی تک بڑھتے ہوئے چلے آئے، اور شہر کا محاصرہ کر لیا، علاء الدین نے ایسا جم کر مقابلہ کیا، اور اس کے بھائی الماس بیگ، اور ظفر خاں اور تغلق نے اس شان کے ساتھ جنگ لڑی کہ تاتاریوں (مغلوں) کے چھکے چھوٹ گئے، وہ بری طرح شکست یاب ہوئے، ان کے بہت سے آدمی قتل اور زخمی ہوئے، ظفر خاں تعاقب کرتا ہوا بہت دور نکل گیا، اس میں اس کی جان کام آئی، دوسری مرتبہ ۷۰۳ھ میں پھر تاتاری لشکر آیا، لیکن پھر بغیر لڑے ہوئے واپس چلا گیا، ۷۰۵ھ میں پھر مغلوں نے یورش کی اس مرتبہ بھی علائی لشکر سے ذلت بخش شکست کھائی، دو مغل شہزادے جو سردار لشکر بھی تھے، بہت سے مغلوں کے ساتھ گرفتار ہوئے، ان سب کی گردنیں ماردی گئیں، اور ان کے سروں سے دلی میں ایک برج تعمیر کیا گیا ——— تاریخ اسی طرح اپنے آپ کو دوہراتی رہتی ہے، یہ وہی تاتاری ہیں جو خود مقتولین کے سروں کے مینار تیار کیا کرتے تھے، آج ان کے سروں کا برج تیار ہوا تھا،

علاء الدین کی دہشت

علاء الدین خلجی اپنے وقت کا بہت بڑا سپہ سالار، بہت بڑا کشور کشا، اور بہت بڑا فاتح تھا، وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا، لیکن اس میں حکمرانی اور فرماں روائی کی صلاحیتیں فطری طور پر موجود تھیں، اور وہ ان صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا! ——— وہ بڑا سخت گیر، جابر اور سفاک بھی تھا، جو آدمی مجرم ثابت ہو جاتے، اُسے ایسی عبرت انگیز سزا دیتا تھا، کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے، سننے والے تھرا جاتے تھے، وہ کسی قسم کی رو رعایت اور مہر و مروت کا خوگر نہیں تھا، وہ اپنے چچا جلال الدین فیروز خلجی کا صرف بھتیجا نہیں محبوب اور عزیز داماد بھی تھا، لیکن اس کی جان لینے میں بھی اس نے تامل نہیں کیا، علماء اور مشائخ سے بھی خوش نہیں تھا، اگرچہ یہ علما اور مشائخ اس کی خون آشامی اور سفاکی کے باوجود حق بات اس کے منہ پر کہنے سے نہیں چوکتے تھے، ۷۰۰ھ میں اس نے رن تھنبور کا قلعہ سر کیا، جو اب پہلے سے بھی زیادہ دشوار گزار اور ناقابلِ تسخیر بن گیا تھا، یہ اس کا اتنا بڑا کارنامہ تھا، جس نے اس کی دھاک بٹھادی اور آس پاس کے راجہ مہاراجہ اس سے بہت زیادہ

مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے!

علاء الدین کا نظم و انتظام علاء الدین کو سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ رعایا بدحالی کی شکار نہ ہونے پائے، اس سلسلہ میں اس نے ایسے اقدامات کئے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، اس نے جاگیریں ضبط کر لیں، اجناس اور ضروریات زندگی کی قیمتیں مقرر کر دیں، اس بات کا سختی سے لحاظ رکھا کہ مقرر کردہ قیمتوں سے ایک پائی بھی زیادہ پر کوئی چیز فروخت نہ ہو، ایک مرتبہ اس طرح کی اطلاع ملی تو اس نے بقالوں اور تاجروں کو ایسی عبرت انگیز سزا دی کہ پھر بلیک مارکٹ کا اس کے دور حیات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

چتوڑ کی فتح چتوڑ بھی راجپوتانہ کا سب سے مستحکم اور بہت مضبوط قلعہ تھا، علاء الدین نے اسے بھی (۳۰۳ھ) فتح کر لیا، اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے وہ بذات خود فوج لے کر بڑھا، آٹھ مہینہ تک اسے جنگ اور محاصرہ کی شدت جاری رکھنی پڑی، لیکن اس کی پیشانی پر بل نہیں آئے۔ وہ جو فیصلہ کر چکا تھا، اس پر قائم رہا۔ اور اس وقت واپس ہوا، جب اپنے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی، اس سلسلہ میں اجین، مانڈو، دہار کے قلعے بھی سر کر لئے گئے چتوڑ کے راجہ نے حلف اطاعت اٹھایا، اور زندگی کی آخری سانس تک اس عہد پر قائم رہا۔

دکن کی مہم ۳۰۶ھ میں علاء الدین نے اپنے چہیتے اور معتمد غلام ملک کافور کو، دکن کی مہم سر کرنے کے لئے بھیجا، اس مہم میں نمایاں کامیابی ہوئی، اور تاریخ میں پہلی مرتبہ جنوبی ہند دلی کے ماتحت ہوا اور دیوگری کا باقاعدہ دلی سے الحاق ہو گیا۔

۷۱۶ھ میں علاء الدین اس دنیا سے رخصت ہو گیا، بڑا بیٹا خضر خاں جو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند تھا (جس کی شادی بڑے چاؤ سے علاء الدین نے رانی کنولا دیوی (دیوگری) کی بیٹی دیول دیوی سے کی تھی) کافور اب جزو کل کا مالک تھا، اس نے خود حکومت پر قابض ہونے کا منصوبہ بنایا، لیکن وہ قتل کر دیا گیا اور علاء الدین کا چھوٹا بیٹا قطب الدین ۷۱۶ھ میں تخت نشین ہوا، یہ حد درجہ نالائق اور نااہل ثابت ہوا، بھائیوں کو قتل کرا دیا، خود کاروبار مملکت ایک غلام خسرو خاں کو

سپرد کر کے عیاشی میں پڑ گیا، آخر اسی خسرو خاں نے اسے قتل کر دیا اور ظلم و سفاکی کے ایسے مناظر دکھائے کہ ساری دلی چیخ اٹھی، علاء الدین کا ایک معتمد سردار غازی ملک (تغلق) پنجاب کا گورنر تھا، یہ بڑا بہادر تھا، اس کا جی چاہا کہ آقا کا بدلہ لے اور نظم مملکت استوار کرے لیکن اس کا بیٹا جونا خاں (محمد تغلق) دلی میں تھا، اندیشہ تھا کہیں خسرو خاں اسے نہ ہلاک کر دے، جب جونا خاں باپ کے پاس صحیح سالم پہنچ گیا، تو وہ فوج لے کر دلی کی طرف بڑھا، خسرو خاں باقاعدہ بادشاہ بنا ہوا دلی پر حکمرانی کر رہا تھا، عزت والوں کو بے عزت، اور بے عزتوں کو صاحب مال و املاک بنا رہا تھا، قلعہ شاہی میں بھی اس نے ایسی سفاکیوں کے مظاہرے کئے جو اس کی کور نمکی پر دال ہیں (۷۲۰ھ) بہر حال غازی ملک فوج لے کر بڑھا، خسرو بھی مقابلہ کے لئے نکلا، موجودہ نئی دلی کے قریب رن پڑا، خسرو خاں شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا، پھر گرفتار کر کے قتل کیا گیا،

غازی ملک نے شہر کے ارباب حل و عقد کو جمع کیا، اور اقرار کیا کہ وہ جسے بھی بادشاہ منتخب کر لیں گے (کیونکہ خاندان خلجی ختم ہو چکا تھا) میں دل سے اس کی اطاعت کروں گا۔ لوگوں نے اس کا نام پیش کیا، اور وہ غیاث الدین تغلق کے نام سے اورنگ نشین (۷۲۰ھ) ہو گیا!

علاء الدین پر تبصرہ

علاء الدین خلجی ایک برق خاطف کی طرح چمکا اور ایک شعلہ مستعجل کی طرح فوراً ہی نابود ہو گیا،

لیکن علاء الدین نے جو کارنامے انجام دیئے، وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے، وہ بڑا دلیر، بڑا مدبر، اور بڑا موقع شناس بادشاہ تھا، عزم و ہمت کے اعتبار سے وہ اپنی نظیر آپ تھا، وہ شراب کا رسیا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ رعایا میں یہ مرض بڑھتا جاتا ہے تو پہلے خود اس نے شراب سے توبہ کی پھر ایسی سختی سے امتناع مسکرات کے اصول پر عمل کیا کہ ڈھونڈھے سے کوئی شرابی نہیں ملتا تھا۔!

خلجی کا نظام جاسوسی بھی بہت مکمل تھا، رتی رتی حالت کی خبر اسے ملتی رہتی تھی، اور وہ خبر ملتے ہی فوراً صورت حال کا جائزہ لے کر مناسب فیصلہ کرتا تھا، بلیک مارکٹ کا اس نے بالکلیہ استیصال کر دیا تھا، راستوں کو پر امن بنا دیا تھا، سڑکیں بنوائیں، ڈاک کا بڑا اچھا انتظام کیا، ابن بطوطہ لکھتا ہے

کہ دلّی سے دولت آباد تک کا راستہ چالیس دن کا ہے، ہم نے یہ چالیس دن اس طرح طے کئے گویا کسی باغ میں سیر کر رہے ہیں، سڑکوں پر دو رویہ درخت لگے تھے، اور ہر طرح کی آرام و آسائش کے انتظامات درست تھے۔

عہد علائی کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے، جتنے ماہران فن، بزرگان دین علمائے کرام، شعرائے عظام اس کے زمانہ میں ہوئے کسی عہد کو نصیب نہیں ہوئے، حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی، شیخ علاء الدین صابر وغیرہ اسی عہد کے بزرگوں میں ہیں ——— !

علمائے ظاہر میں صرف ۴۶ وہ لوگ تھے، جو درس و تدریس کے مشغلہ میں مصروف تھے، فن قرأت کے جاننے والے بھی بہت سے تھے، اہل وعظ میں مولانا حسام الدین، جلال الدین اور شہاب الدین وہ لوگ تھے جنہیں نوادر روزگار میں شمار کیا جاتا تھا، طبقۂ شعراء میں صدرالدین عالی، فخرالدین، عارف اور امیر خسرو کو دنیا کبھی نہیں بھول سکتی، اطبا میں مولانا بدرالدین کی حذاقت اور مسیحائی کا یہ عالم تھا کہ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی، ان کی بارگاہ پر ان کی نسبت مشہور تھا کہ اگر چند جانوروں کا قارورہ ملا دیا جائے تو وہ بآسانی بتادیا کرتے تھے کہ ان ان جانوروں کا قارورہ ہے! مغنّی، مطرب، اور اہل نجوم بھی بہت سے تھے۔

علاء الدین کے عہد میں مسجدیں، خانقاہیں، حوض، مینار، حصار بہت زیادہ تیار و تعمیر ہوئے مؤرخ ضیا برنی نے عہد علائی کے خصوصیات و امتیازات میں یہ بات لکھی ہے کہ اس کے عہد میں،

۱۔ اناج، پارچہ جات اور دوسرے ضروریات زندگی بہت ارزاں اور سہل الحصول تھے۔

۲۔ اس نے فتوحات کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا، اور اتنی زیادہ دولت حاصل کی کہ اس کے پیشروں میں ایک بھی مثال نہیں پیش کی جاسکتی،

۳۔ اس کی فوج کے صرف سوار چار لاکھ ۷۲ ہزار نفوس تھے، انہی پر پیادوں کا اندازہ کر لیجئے۔ اتنی بڑی فوج رکھنے کے باوجود اس نے کچھ ایسا اقتصادی ڈھانچہ بنایا کہ خزانہ پر کسی قسم کا غیر معمولی بار نہیں پڑنے پایا،

۴۔ جس باغی نے سر اُٹھایا، فوراً ہی اسے کچل دیا گیا۔

۵۔ تاتاری (مغول) ایک مستقل فتنہ تھے، لیکن اس فتنہ کی جس شان اور اہتمام سے علاء الدین نے سرکوبی کی، یہ اس کا حصہ تھا، مغلوں کا زور اس نے توڑ دیا، ان کی ساری وحشت اور بربریت مسل کر رکھ دی! ——— لوہے کو لوہا کاٹتا ہے،

۶۔ راستوں کی حفاظت کا اس درجہ انتظام کیا کہ بے غل وغش کارواں آتے اور جاتے تھے، اور کسی قسم کے حادثہ سے دوچار نہیں ہوتے تھے،

۷۔ تاجروں پر ایسا کنٹرول کیا اور ایسی نگاہ رکھی کہ حاضر و غائب سب ایماندارانہ کاروبار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

——— یہ تھا وہ علاء الدین جس کا کوئی بیٹا اس قابل نہیں ہوا کہ باپ کی جگہ سنبھال سکتا!

تغلق خاندان

شاندار فتوحات، اور شاندار کارناموں کی داستان!

غیاث الدین تغلق کا وجود مسلمانان دہلی اور باشندگان ہند کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا، وہ بڑا عادل اور منصف مزاج فرماں روا تھا، رعایا کی فلاح و صلاح کی فکر میں ہر وقت منہمک رہتا تھا، فنون عربیہ کا ماہر تھا، اپنے آقا بلبن کے دور حکومت میں اس نے جو کارنامے انجام دیئے تھے، وہ خود کم وقیع نہ تھے، اور اب تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد توسیع مملکت نظم و انتظام اور رفاہ عوام کے سلسلہ میں جو کچھ کیا تھا، وہ بھی تاریخ کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ اس کے عہد میں خوشحالی عام ہوگئی، درمیانی دور کی افراتفری میں جو کساد بازاری پیدا ہوگئی وہ دور ہوگئی تھی، حکومت کے عمال اور ملازمین کو تنخواہیں وقت پر اور نقد ملنے لگیں، بہت سے ویران علاقوں کو اس نے ازسر نو آباد کیا، بہت سی بنجر اور غیر مزروعہ زمینوں کو اس نے قابل کاشت بنایا، آب پاشی کے لئے نہریں کھدوائیں، اور ایسا انتظام کیا کہ رعایا فارغ البالی اور سکون و طمانیت کی زندگی بسر کرنے لگی، ملک کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک امن و امان قائم ہو گیا۔

دور فتوحات

۷۲۱ھ میں غیاث الدین تغلق کے ولی عہد محمد تغلق نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ جنوبی ہند کے ہندو راجاؤں کی سازش اور شرارت کا استیصال کرنے کے لئے ورنگل پر چڑھائی کی، تلنگانہ میں زور شور سے میدان قتال گرم ہوا، آخر بڑی جدوجہد اور سعی و کوشش کے بعد تغلق نے یہ مہم سر کرلی، صرف ایک سال کی مدت میں یعنی ۷۲۳ھ میں تلنگانہ کی حکومت سلطنت دہلی کا ایک جزو بن گئی، ورنگل پر تغلق کا پرچم لہرانے لگا اور اتنے دور دراز مقام

پر آسانی سے سلطنت دہلی کے احکام و فرامین نافذ ہونے لگے۔

پھر ایک سال بعد ۷۲۴ھ میں غیاث الدین تغلق نے بنگال پر وہاں کے حکمران کی درخواست پر شورش اور بدامنی کی وجہ سے فوج کشی کی، یہ منزل بھی اگرچہ دلی سے بہت دور تھی، اور اس کا سر کرنا بظاہر بہت مشکل تھا، لیکن تغلق نے بڑی آسانی سے یہ معرکہ بھی سر کر لیا،

ترہٹ کی حکومت بڑی مستحکم تھی، اس کا پایۂ تخت قدرت کی بنائی ہوئی فصیلوں (جنگلوں) سے گھرا ہوا تھا، لیکن غیاث الدین کے عزم و ہمت نے ان فصیلوں کو توڑ کر پھینک دیا، راجہ گرفتار ہوا اور ترہٹ بھی دلی کا باج گذار بن گیا، یہاں اپنے حکام و عمال مقرر کر کے غیاث الدین تغلق کامیابی کے ساتھ اپنے پایۂ تخت دلی کی طرف مراجعت فرما ہوا، ان فتوحات نے اس کے رعب و دبدبہ میں بہت اضافہ کر دیا۔

غیاث الدین کی وفات

بنگال سے جب وہ فاتح اور کامگار واپس ہوا تو ولی عہد نے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ اس کا استقبال کیا، وسیع پیمانہ پر ضیافت کا انتظام کیا، اس ضیافت میں ایک حادثہ کے سلسلہ میں غیاث الدین تغلق ہلاک ہو گیا، اور اس کا بیٹا اور ولی عہد سلطنت محمد تغلق سریر آرائے حکومت ہوا۔

محمد تغلق کا تعارف

محمد تغلق میں وہ تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک اولوالعزم فرماں روا میں ہونی چاہئیں، اس کی ہمت عالی، اور اس کا عزم بلند، کٹھن سے کٹھن اور خطرناک سے خطرناک مرحلہ کو یوں سر کر لیتا تھا، جیسے یہ کوئی بہت معمولی کام ہو، وہ بڑا زیرک، منصوبہ باز، دور اندیش اور مہم جو تھا، اگر یہ کہا جائے کہ وہ ان لوگوں میں تھا، جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، اس کے زمانہ کے لوگ اس کا ساتھ نہ دے سکے، اس لئے کہ یہ لوگ اس کی اسکیموں، منصوبوں اور نقشوں کے دور رس نتائج کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھے، اپنے وقت سے دو سو برس بعد اگر محمد تغلق پیدا ہوتا تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، اگرچہ قدم قدم پر اس کی مخالفتیں کی گئیں، اس کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ اس کی اسکیموں اور منصوبوں

کو ناکام بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس کے خیالات اور تصورات کو عملی جامہ پہنانے کی منظم تدبیریں کی گئیں، اس کی دوراندیشی اور فراست سے ملک کو محروم رکھنے کی جدوجہد کی گئی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا نہیں ہوسکا۔ پھر بھی اسے ناکام نہیں کہا جاسکتا، وہ ناکام ہونے پر بھی کامیاب رہا اس کی ناکام اسکیم جو تباد لۂ آبادی سے تعلق رکھتی تھی، اگر عمل میں نہ آتی ہوتی تو آج جنوبی ہند میں مسلمانوں کا وجود ہی نہ ہوتا، یا اگر وہ ہوتے بھی تو تعداد کے اعتبار سے ہیچ، اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے ناقابل ذکر ہوتے، لیکن یہ محمد تغلق کی ناکام اسکیم ہی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز اور دفاعی مورچہ دکن ثابت ہوا، یہاں ان کی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں، یہاں مسلمانوں نے بہت سے نئے شہر بسائے، یہاں مسلمانوں کی تہذیب ثقافت اور حضارت پھیلی، یہاں مسلمانوں نے شاندار پُرشکوہ اور یادگار عمارتیں بنائیں، جن کی نفاست اور نزاکت اور فن تعمیر کے انداز پر آج بھی غیر مسلم مؤرخین عش عش کر اٹھتے ہیں، یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ بعد میں مہم جو اور بلند ہمت مسلمانوں نے متعدد شاندار حکومتیں قائم کیں، جو اپنی وسعت، آمدنی، آبادی اور نظام مملکت کے اعتبار سے اپنا ایسا غیر فانی نقش چھوڑ گئی ہیں، جو مرور ایام کے باوجود تاباں اور درخشاں ہے، جو اب تک ماند نہیں پڑا، اور جو ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

تغلق کے ساتھ بے انصافی

محمد تغلق کے ساتھ اس کے ہم قوموں نے، عوام نے اور خواص نے مؤرخوں نے اور شاعروں نے، فوجی سرداروں اور ملکی امیروں نے، سب نے زیادتی کی ہے، اور اس زیادتی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ورنہ وہ اپنے کارناموں اور منصوبوں کے اعتبار سے تمام مسلم سلاطین ہند کے مقابلہ میں ایک مرتبۂ خاص پر فائز ہے۔

ایک الزام اس غریب پر یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ سخت گیر تھا، تعزیر و عقوبت کے معاملہ میں بہت سخت تھا، لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر وہ سخت گیر نہ ہوتا، عمال اور حکام پر احتساب نہ کرتا، ان کی ایک ایک حرکت کو نگاہ میں نہ رکھتا، اور ان کے ایک ایک کام کا جائزہ نہ لیتا تو وہ اپنی اسکیموں کو بروئے کار نہیں لاسکتا تھا، وہ ان منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا،

جن پر عمارت کی فلاح و فلاح کا دارومدار تھا! ——— اس کے اس انداز خدمت کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کے عہد میں ہمیشہ خزانہ بھرپور رہا، اور کاروبار مملکت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ سخت مزاجی اور سخت گیری کے باوجود داد و دہش کا جہاں تک تعلق تھا سخاوت اور دریا دلی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا، وہ جب کسی کو مستحق سمجھتا تھا تو جاگیریں بھی دیتا تھا، انعام بھی عطا کرتا تھا، لاکھوں اشرفیاں بھی دے ڈالتا تھا، بیمار کی بھی خبر گیری کرتا تھا، بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کرتا تھا، رعایا اور دوسرے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتا تھا، مسافروں پر نوازش شاہانہ کی بارش کرتا تھا ہنر مندوں اور فن کاروں کو زیادہ سے زیادہ نوازتا تھا، شاعروں، طبیبوں اور ماہرین فن کی امداد و اعانت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا تھا، ان سب خوبیوں کے باوجود یہ "کمزوری" اس میں ضرور تھی، کہ جس بات کو صحیح سمجھ لیتا تھا، اس پر اڑ جاتا تھا، ہر قیمت پر اسے منواتا تھا، اور کسی طرح بھی اس سے دستبردار نہیں ہوتا تھا

دفاعی مورچہ مغلوں کے حملوں کو وہ بلبن کے عہد میں اپنی آنکھ سے دیکھ چکا تھا، یہ حملے ہر وقت ہو سکتے تھے، ان کے خطرات و مہالک کو اس نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا، چنانچہ اس نے کوہستان سلیمان کے پار دفاعی مورچہ مستحکم کرنے کا پروگرام بنایا، اسے عمل میں لایا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں (تاتاریوں) کی یلغار اور یورش کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا،

دوسری طرف اس نے دکن میں اسلامی نوآبادی کی ضرورت محسوس کی، اور دولت آباد کے نام سے ایک نیا شہر بسایا، اس نے کوشش کی کہ دلی کو اٹھا کر وہیں لیجائے، اس نے دلی کے مالکان مکانات و باغات، ان کے مکان اور باغ دام دے کر خرید لئے، انہیں وہاں رہنے اور بس جانے کی ترغیب دی، اس نے سوچا تھا، اس طرح دکن میں جو مسلمان آباد ہوں گے، وہ علم، معاشرت، تہذیب، تمدن کسی اعتبار سے بھی درماندہ نہ رہیں گے، رہی دلی تو وہ بارہا اجڑ چکی ہے، بس چکی ہے، آج اجڑے گی پھر بس جائے گی، لیکن لوگوں نے اس کی عظیم مصلحت کو نہ سمجھا، یہ اسکیم ناکام اور ادھوری رہ گئی، پھر بھی اس سے آگے چل کر مسلمانوں کو جو گراں بہا فائدے پہنچے، نہ ان سے انکار کیا جا سکتا

ہے، نہ ان کا استحقاق کیا جا سکتا ہے، دولت آباد کو اس نے ان مخالفتوں کے باوجود ایک پر بہار شہر بنا دیا تھا، یہاں کی مسجدیں، سرائیں، مدرسے، خانقاہیں، مکاتب، محلات، ایوان و عمارات، اپنی نظیر آپ تھے، درحقیقت اگر اس طرح اس نے دولت آباد کو نو آباد کار مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز بنانے کی سعی نہ کی ہوتی، تو دکن مسلمانوں کے عین قدم سے بالکل محروم رہ جاتا۔

تانبے کا سکہ

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، محمد تغلق اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا، اس کی جدتیں اور اس کی ذہانتیں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لئے وہ اندھا دھند اس کی مخالفت کرتے تھے۔

مسلسل خشک سالی، تقاوی کی تقسیم اور دوسرے مصارف کا اثر خزانۂ شاہی پر پڑا، محمد تغلق نے غایت درجہ فراست اور دانائی سے کام لے کر عارضی طور پر سونے اور چاندی کو "معیار زر" کے طور پر منسوخ کر دیا، اور تانبے کا روپیہ اور اشرفی کو "سکۂ رائج الوقت" کی حیثیت سے چلا دیا، اس طرح سکہ کا مقصد پورا ہو گیا، اور کاروبار میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا ہونے لگی تھیں وہ دور ہو گئیں، موجودہ زمانہ میں ہم کاغذ کے سکہ کو سونے اور چاندی کے سکہ پر ترجیح دیتے ہیں، تغلق کے زمانہ میں عارضی طور پر تانبے کا سکہ بھی اس کی بدنامی کا باعث بنا، جب تغلق نے کچھ عرصہ بعد یہ سکہ واپس لیا تو بہت بڑی تعداد جعلی سکوں کی تھی، ان سب کو بھی اس نے قبول کر لیا، اور ان کے بدلہ میں اصل سکے دے دیتے۔ (۷۳۲ھ)

چین پر پیش قدمی

۷۳۸ھ میں اس نے چین پر پیش قدمی کا پروگرام بنایا، اور اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج اس کارنامہ کو انجام دینے کے لئے روانہ کر دی، یہ لشکر نیپال کو پامال کرتا ہوا تبت کی سرحد تک پہنچ گیا، لیکن اس کے بعد رسد کی بدنظمی اور راستہ کی مشکلات کے باعث مزید پیش قدمی نہ کر سکا، مجبوراً لوٹ آیا، اس کم ہمتی پر تغلق بہت برہم ہوا، اس نے فوج کے تمام افسروں اور قابل ذکر لوگوں کو اس "جرم" میں سخت سزائیں دیں۔

قحط، بغاوتیں، وفات

تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ اتنا سخت قحط پڑا کہ بستیاں کی بستیاں ویران ہوگئیں، ہزاروں آدمی مرگئے، اس قدرتی حادثہ کا تغلق کے دل پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ بذات خود اُس نے حالات کا جائزہ لیا، اور خود ہی اپنی سربراہی میں اس بلا کو ٹالنے کی بڑی کامیاب کوشش کی، اور ایک اسکیم تیار کی جس کی رُو سے سارا قحط زدہ علاقہ آئندہ کے لئے کھلیان بن جاتا، لیکن چونکہ وقتی طور پر اس نافع اسکیم سے بھی جاگیرداری اور زمینداری کو نقصان پہنچ رہا تھا، لہٰذا وہ سنگ راہ بن کر کھڑے ہوگئے اور ایڑی چوٹی کا زور اسے ناکام بنانے میں لگا دیا۔

ان سب چیزوں نے مل ملا کر ان صوبے داروں کو شہ دی جو دلّی سے دُور تھے کہ بغاوت کریں، اور بے فکری سے تخریبی کارروائیوں میں مصروف و منہمک ہو جائیں، چنانچہ انہوں نے ایسا کیا بھی، لیکن محمد تغلق نے باغیوں کے استیصال میں ساری قوتیں صرف کردیں، ۷۴۱ھ میں بنگال اور دکن کے دور دست علاقے بغاوت اور سرکشی کے مرکز بن گئے، تغلق فوراً آگے بڑھا اور دولت آباد پہنچا، یہاں سے تلنگانہ اور مالابار کا دورہ کیا، سرکشوں اور باغیوں کو عبرت انگیز اور سبق آموز سزائیں دیں، جن حکام وعمال پر نادہندگی کا ذرا بھی شبہ ہوا، انہیں برطرف کردیا اور ان کی جگہ نئے نئے حکام وعمال مقرر کئے، پھر جب دکن سے واپس جانے لگا، (۷۴۲ھ) تو اس نے عام اجازت دے دی کہ اب جس کا جی چاہے وہ پھر دلّی جا کر آباد ہو سکتا ہے۔

لیکن ۷۴۸ھ میں بادشاہ کے جانے کے بعد دکن میں ایک آزاد مسلم حکومت، ظفر خاں کی سربراہی میں قائم ہوگئی، اس زمانہ میں تغلق گجرات میں تھا، یہاں بھی وہ اسی لئے آیا تھا کہ سرکشوں کی سرکوبی کرے، اور باغیوں کی تادیب کرے، یہاں خلاف توقع اسے زیادہ عرصہ تک یعنی تقریباً ۳ سال تک مقیم رہنا پڑا، پھر اسے سندھ کے اُمرا کی بغاوت کی اطلاع ملی، وہ فوراً گجرات سے چلا اور بحری راستہ سے ٹھٹھہ آیا، یہاں عاشورہ کا روزہ اس نے مچھلی سے افطار کیا جس سے بیمار پڑگیا، اور ایسا بیمار پڑا کہ چند ہی دن میں چٹ پٹ ہوگیا (۲۱ محرم ۷۵۲ھ) موت جب آجاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت

بھی نہیں بچا سکتی۔

فیروز شاہ تغلق

فخر الدین محمد تغلق لاولد تھا، اس لئے اس کا بھتیجا فیروز تغلق مسند نشین مملکت ہوا کیونکہ شرعی اعتبار سے بھی اس منصب کا مستحق تھا۔

فیروز شاہ تغلق چچا کے برعکس نرم طبیعت کا آدمی تھا، داد و دہش میں بھی یکتا تھا، جہاں سزا دینا جانتا تھا، وہاں معاف کرنا بھی جانتا تھا، اسکے عہد میں وہ لوگ جو محمد تغلق سے باغی ہو گئے تھے، رام ہو گئے، بہتوں نے از خود اطاعت قبول کر لی بعضوں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا، بنگال خود مختار بن چکا تھا، فیروز شاہ نے لشکر کشی کی، بنگال کو فتح تو نہ کر سکا، لیکن وہاں کے بادشاہ سکندر سے پیمان دوستی استوار کر لیا، (۷۵۹ھ) اسی طرح سندھ کا جام بھی برگشتہ ہو گیا تھا (۷۶۲ھ) یہاں بھی فیروز شاہ لشکر گراں لے کر پہنچا، اس نے معافی مانگی تو معاف کر دیا۔

فیروز شاہ کا ذوق

فیروز شاہ کو تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی، اس نے بہت سی عمارتیں بنوائیں جن کے نشان اب تک موجود ہیں، دلّی کے رہنے والے اب بھی "فیروز شاہ کا کوٹلہ" دیکھنے جاتے ہیں، اور وہاں کے سبزہ زار پر فرصت کے اوقات صرف کرتے ہیں، فیروز شاہ کی لاٹ بھی جو اشوک کے زمانہ کی تھی اور جسے فیروز شاہ نے برآمد کیا تھا، اب تک اپنے نقوش کے ساتھ اس کوٹلہ کی زینت بنی ہوئی ہے، کوٹلہ میں ایک شاندار مسجد بھی موجود ہے، جس میں بیک وقت ہزاروں آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں، محلات و قصور دست برد زمانہ کی نظر ہو گئے۔

فیروز شاہ نے بہت عمارتیں بنوائیں، نہریں کھدوائیں، کنوئیں تیار کرائے، مسافر خانے تعمیر کئے مدرسے اور مکتب اور خانقاہوں کی بنیاد ڈالی، باغات لگائے اور نئے نئے شہر بسائے، اس نے ایک نئی دلّی بھی بسائی، جس کی آبادی اور رونق کی داستان ہم تاریخ کے صفحات پر دیکھ سکتے ہیں، دلّی کے علاوہ ایک اور شہر "حصار فیروزپور" بسایا، جمنا سے وہاں تک ڈیڑھ سو میل لمبی نہر کھدوائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اب تک خاک اڑا کرتی تھی، وہاں سبزہ خود رو کی حکومت ہو گئی، اپنے مرحوم چچا فخر الدین محمد تغلق عرف جونا کے نام پر ایک نیا شہر بسایا جو "جونپور" کے نام سے اب تک

موجود ہے، اور جس نے آگے چل کر سلطنت شرقی کے پایۂ تخت کی حیثیت سے بڑا نام پایا۔

شمس سراج مصنف نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں بڑی بسط و تفصیل سے بتایا ہے کہ فیروز شاہ نے بہت سے نئے شہر بسائے، بہت سی پرانی بستیوں کو نیا آب و رنگ دے کراز سر نو الگ۔ بڑے اور پر رونق شہر میں تبدیل کر دیا، نہ جانے کتنے باغ لگا ڈالے، نہریں کھدوائیں، پل بنوائے، سرائیں تیار کیں، شفا خانے اور حمام تعمیر کئے۔ یہ سب عوامی چیزیں تھیں، اور ان کے جملہ مصارف خزانہ شاہی سے ادا ہوتے تھے،

فیروز شاہ کی دستبرداری اور وفات

فیروز شاہ تغلق میں بہت سی خوبیاں تھیں، اچھی صفات جن کے باعث وہ ایک ایسی منزلت اور عظمت کا حامل ہے، جو کم بادشاہوں کے نصیب میں آتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا عہد حکومت عام طور پر، اور آخری عہد حکومت خاص طور پر مرکزی سلطنت کی کمزوری کے باعث نئی نئی حکومتوں اور ریاستوں کی تخلیق کا موجب بنتا رہا؛

شاید آخر عمر میں فیروز شاہ نے خود بھی اس حقیقت کو محسوس کر لیا، چنانچہ وفات سے چند ماہ پیشتر وہ اپنے پوتے تغلق شاہ کے حق میں تخت حکومت سے دستبردار ہو گیا، اور ۷۹۰ھ میں وفات پا گیا۔

حکومت میں اختلال

فیروز شاہ کی وفات کے بعد خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، نئے نئے دعوے داران سلطنت پیدا ہونے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان ہی ختم ہو گیا، وزیر سلطنت خاں جہاں دلی سے جونپور چلا گیا اور وہاں خود بادشاہ بن کر حکومت کرنے لگا، یہی حکومت سلطنت شرقیہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے، جونپور میں ایک نئی حکومت کی داغ بیل پڑ رہی تھی، اور دلی کی حکومت "لامکان" بنتی جا رہی تھی، خود دلی میں بھی اس کے احکام و فرامین کی وقعت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

تیمور کا حملہ

اسی اثنا میں تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور تھوڑی سی مشقت کے بعد اس نے دلی پر قبضہ کر لیا (۸۰۱ھ) تیمور اگرچہ تاتاری النسل تھا لیکن مسلمان

ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے دلی فتح کرنے کے بعد اور دوران جنگ میں اور دلی کے راستے میں مسلمانوں کے قتل عام میں کوئی تامل نہیں کیا، تیمور نے پہلے لاہور فتح کیا تھا، پھر دلی، ان دونوں جگہوں کو خوب جی بھر کے لوٹا۔

لامرکزیت کا دور

تیمور خوب اچھی طرح دلی اور لاہور کو لوٹ کھسوٹ کر جب واپس جانے لگا، تو حاکم ملتان خضر خاں کو دہلی کی حکومت عطا فرمادی، اس نے اس عطیہ شاہی کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا، اور کئی سال کی جنگ و پیکار کے بعد ۸۱۷ھ میں دلی پر باقاعدہ قابض اور متصرف ہو گیا، یہی خضر خاں جس کی سیادت اگرچہ مشتبہ ہے لیکن خاندان سادات کا بانی عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، صرف ۳۷ سال میں خضر خاں کا خاندان سادات بھی حکومت کی مسند دوسروں کے لئے خالی کرنے پر مجبور ہو گیا، اب یہاں لاہور کا سردار بہلول لودھی حکومت کرنے لگا۔

ایک نیا خاندان

لودھی خاندان ۹۳۲ھ تک زندہ رہا، پھر بابر نے اسے ختم کر کے اپنی بادشاہت قائم کی،

حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد سے لے کر بابر کی آمد تک لامرکزیت ہی کا دور کسی نہ کسی طور پر قائم رہا۔ اس عرصہ میں جو حکومتیں دلی میں قائم ہوئیں ان کی حیثیت "از دلی تا پالم" سے زیادہ نہیں تھی، جو حکومتیں دوسرے اقطاع ہند میں قائم ہوئیں ان کے کچھ کارنامے ہیں،

لہٰذا اب ایک الگ باب میں "ملوک طوائف" کا ذکر کرتے ہیں، تاکہ یہ بات ذرا وضاحت کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ لامرکزی دور میں، اس خطۂ ارض نے جہاں اتنی محنت کے بعد ایک مرکزی حکومت قائم ہوئی کیا کیا رنگ بدلے اور کیسی کیسی صورتیں اختیار کیں! —— قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش نے جس محنت سے اور جد و جہد کے بعد ایک مرکزی حکومت قائم کی تھی، وہ فیروز کے بعد لامرکزیت کی نذر ہو گئی اور جب تک بابر نہیں آ گیا یہی کیفیت باقی رہی

ملوک طوائف

نئی نئی حکومتیں ——— ان حکومتوں کے کارنامے

عروج و زوال ساتھ ساتھ چلتے ہیں، عروج کی انتہا زوال ہے، اور زوال کی انتہا عروج ہے۔

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو یہ ہزارہا متفرق، پراگندہ اور منتشر حکومتوں کا مجموعہ تھا، لیکن انہوں نے بہت جلد اس ملک میں ایک ایسی مرکزی حکومت قائم کر لی، جو صرف اشوک کے عہد میں کچھ عرصہ کے لئے عالم وجود میں آئی تھی، پھر مسلمانوں کی آمد تک کہیں نظر نہیں آئی، مسلمانوں نے دلی میں بیٹھ کر ایک جانب بنگال اور کامروپ (آسام) پر حکومت کی، دوسری طرف دیوگری، ورنگل اور تلنگانہ (جنوبی ہند) پر اپنا پرچم لہرایا، یہ حکومت مرکزیہ کئی سو سال تک قائم رہی، لیکن مجموعۂ حسنات و فضائل ہونے کے باوجود فیروز شاہ تغلق اتنی بڑی حکومت کو واحد اور منظم نہ رکھ سکا، یہ مختلف حکومتوں میں تقسیم ہو گئی، یہ چھوٹی حکومتیں تھیں، لیکن لوازم شاہی اور شان کج کلاہی سے بھرپور اور معمور۔

اب ہم ان کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں، تاکہ صحیح صورت سامنے آجائے۔

۱۔ سندھ مرکزی حکومت کے زوال نے سندھ کو بھی جو دور دست علاقہ تھا آزاد کر دیا، اس کی آزادی کی بنا یوں پڑی کہ فیروز شاہ تغلق کے پوتے نے جسے اس نے جانشین بنا کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، جام بانھیبہ بن خیر الدین کو ۷۹۰ھ میں اختیار چترشاہی عنایت کیا اور یہیں سے آزادی اور خود مختار حکومت کی بنا پڑ گئی، یہ حکومت ۹۲۲ھ تک قائم رہی، اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا، پہلا جام امن نصیر الدین تھا، دوسرے جام کا نام فیروز الدین نظام الدین تھا

۲۔ بنگال بنگال میں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی تھی، بلوچ ... اور اچھوتوں نے بھی کافی تعداد

اسلام قبول کر لیا تھا، اور نو آباد کار مسلمان بھی کافی تعداد میں تھے، یہاں علما اور صوفیا کی بھی بہت بڑی تعداد تھی، جو تبلیغ اسلام میں مصروف منہمک رہتی تھی۔

محمد تغلق کے زمانہ میں جب خود مختاری کی وبا پھیلی تو یہاں بھی شورش ہوئی۔ پہلے سنارگاؤں میں یہ بدعت آئی، پھر مغربی بنگال میں آخر ملک الیاس حاجی نے ۷۴۲ھ میں سلطان شمس الدین کے نام سے سنارگاؤں کو مطیع کرنے کے بعد موروثی بادشاہت کی طرح ڈال دی، یہ خاندان تقریباً ایک سو سال تک حکومت کرتا رہا،

۱۔ پہلا بادشاہ شمس الدین تھا جس نے ۷۴۲ھ سے ۷۵۹ھ تک حکومت کی،

۲۔ آخری بادشاہ غیاث الدین محمود بن حسین تھا، جو ۹۴۰ھ میں تخت پر بیٹھا۔ اور یہی آخری بادشاہ اس خاندان کا ثابت ہوا۔

۴۔ بہمنی سلطنت

دکن کی آزاد اسلامی حکومت تھی، جس نے علاء الدین ظفر خاں کی سرکردگی میں زندگی کی آنکھیں کھولیں، ظفر خاں نے اگرچہ مرکز سے قطع تعلق کر کے حکومت قائم کی تھی، لیکن دکن میں جس شان و تجمل سے اس خاندان نے حکومت کی، اور جس دبدبہ سے ہندو راجاؤں کا مقابلہ کیا، اور اپنا وجود قائم رکھا، وہ اس کی امنگ حوصلہ اور جذبہ ملی کا بہترین شاہد ہے۔ علاء الدین ظفر خاں کا بے شک مرکز سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس نے بہمنی سلطنت قائم کرنے کے بعد جس بہادری اور استقلال سے مسلمانوں کو دکن میں عزت اور سرخ روئی سے زندہ رکھا، یہ ایسا کارنامہ ہے جو عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا، اور کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا، اس سلطنت کے قیام سے مسلمانوں کو دکن میں وہ استحکام اور فروغ حاصل ہوا، جس نے ان کے ملی مجد و وقار میں گراں بہا اضافہ کیا، اور جس کی بدولت وہ بڑے تجمل کی زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوئے

۱۔ پہلا بادشاہ علاء الدین حسن ظفر خان ۷۴۸ھ میں تخت نشین ہوا، ۷۵۹ھ تک حکومت کرتا رہا

۲۔ آخری فرماں کلیم اللہ تھا، جس نے حکومت کی مسند ۹۳۳ھ میں خالی کر دی

جب تک بہمنی حکومت قائم رہی اس نے بیجا نگر تلنگانہ، کونکن، گونڈوانہ اور اڑیسہ کے

ہندو راجاؤں سے خم ٹھونک کر دوبدو مقابلہ کیا، بعد میں جب زوال شروع ہوا تو یہ پانچ ریاستوں میں بٹ گئی،

۱- بیجا پور
۲- احمد نگر
۳- برار
۴- گولکنڈہ۔
۵- بیدر

۴- خاندیس، خاندیس بھی فیروز شاہ تغلق کے بعد علم خود مختاری لے کر آگے بڑھا، اور "لامرکز" ہو گیا، یہی حال مالوا کا ہوا، خاندیس کا دارالحکومت "برہان پور" تھا، یہ حکمران فاروقی سلاطین کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں،

فاروقی سلاطین نے بھی بڑے ناموافق حالات میں اپنی حکومت کا پرچم لہرائے رکھا، آس پاس کے ہندو حکمرانوں سے آئے دن لڑائیاں رہتی تھیں، یہ ان سے ڈٹ کر لڑتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ اپنی حکومت کا نظام بھی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ یہ حکومت تقریباً ڈھائی سو سال تک صفحۂ تاریخ پر موجود رہی،

۱- پہلا بادشاہ ملک راجہ تھا، جو ۷۷۲ھ میں تخت نشین ہوا، ۸۰۱ھ تک دادِ حکومت دیتا رہا۔
۲- آخری فرماں روا بہادر شاہ کے نام سے مشہور تھا، یہ ۱۰۰۸ھ تک برسرِ حکومت رہا،

۵- مالوا یہاں کا صوبہ دار دلاور خاں غوری تھا۔ تیمور کے حملہ کے بعد جب دلّی کی سلطنت تقریباً ختم ہو گئی، اور عام طور سے لامرکزیت کا دور دورہ شروع ہو گیا تو دلاور خاں نے بھی آزادی اور خود مختاری کو اپنا شعار بنا لیا اور مالوے کا صوبہ ایک آزاد اور خود مختار حکومت میں تبدیل ہو گیا۔

مالوا ——— تاریخ کا بڑا المناک اور حسرتناک حصہ ہے۔ یہاں کے فرماں رواجس طرح داد و دہش میں

اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، اسی طرح تعمیرات میں بھی انھوں نے ایسے نقوش جمیل یادگار چھوڑے ہیں جن کی یاد اور جن کی دید آج بھی کیف و رعنائی خیال کی موجب ہوتی ہے، مالوا کا پایۂ تخت مانڈو تھا، اب مانڈو کی کوئی حیثیت نہیں، ایک خرابہ ہے، لیکن یہاں کے کھنڈر، ٹوٹے ہوئے محلات اور عمارتیں دیکھنے کے بعد دل پر خاص اثر پڑتا ہے، یہ حکومت بھی کافی عرصہ تک قائم رہی، لیکن ۹۳۷ھ میں ختم ہوگئی اس لئے کہ جب اخلاف اپنے اسلاف کے نقش قدم کو چھوڑ دیں، اور زندگی کا مقصد عیش و تنعم کو قرار دے لیں، تو یہی ہوتا ہے، چنانچہ قدرت کے اس اصول سے شاہان مالوا بھی نہ بچ سکے۔

۱- اس خاندان کا پہلا فرماں روا دلاور خاں غوری تھا، جو ۸۰۴ھ میں مالک تاج و اورنگ ہوا اور ۸۰۸ھ تک فرماں روائی و دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ کرتا رہا،

۲- آخری فرماں روا محمود شاہ ثانی تھا، جو ۹۳۷ھ تک برسر حکومت رہا، اس کے بعد یہ حکومت ایک دوسرے خاندان میں بداعمالیوں اور رنگ رلیوں کے باعث منتقل ہوگئی

۲- گجرات

لامرکزیت کے اس دور کی پیداوار گجرات کی آزاد اور خودمختار حکومت ہے دلی کی مرکزی حکومت کے زوال، اور تیمور کے قتل عام نے اس نئی حکومت کو جنم دیا، پہلا فرماں روا ظفر خاں قرار پایا،

یہ حکومت بڑی مضبوط اور مستحکم تھی، یہاں کے فرماں رواؤں نے اپنی شان شوکت کا آس پاس کے راجاؤں پر سکہ بٹھا دیا تھا، راجپوتانہ، مالوا اور سورتھ کے حاکموں سے جنگیں ہوئیں اور ان جنگوں میں مسلمانوں ہی کا پلہ بھاری رہا، اس خاندان کے ایک باہمت اور اولوالعزم بادشاہ احمد شاہ نے احمد آباد بسایا، جو آج بھی گجرات کا سب سے سرسبز اور شاندار شہر ہے، احمد کے پوتے محمود نے ۵۴ برس حکومت کی، اور اس تحمل سے کہ باید و شاید! اس نے جونا گڈھ، کچھ اور بڑودہ کے کئی علاقے تسخیر کر لئے، پرتگیزوں کو لوہے کے چنے چبوا دیئے، جو بحری قزاقی کے فن میں کمال رکھتے تھے، پھر اس محمود شاہ کے ایک جانشین بہادر شاہ نے پرتگیزوں کو دیو میں قلعہ بنانے کی اجازت دی، جس سے ان کے قدم دیار ہند میں جم گئے اور اب تک وہ جانے کا نام نہیں لیتے۔

گجرات کی یہ شاندار حکومت عہد اکبر تک قائم رہی، اس نے اپنے دور میں بڑے وسیع کارنامے انجام دیئے، نئے شہر بسائے، کاروبار اور تجارت کو فروغ دیا، اسی پر شاہ دہلی بہلول لودھی تک کو رشک تھا، فن تعمیر میں بھی اس حکومت نے جو نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں وہ آج تک سرمۂ اہل نظر ہیں احمد آباد اور گجرات کی اسلامی عمارتیں اب بھی اپنی نظیر نہیں رکھتیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا کہ انہوں نے تعمیر کے طرز میں ایجاد و اختراع سے بھی کام لیا، اور یہ جدت کی اعتبار سے کافی رہی و سنگ تراشی کی نفاست آپ اپنا جواب تھی، غیر مسلم فرنگی مورخین تک اعتراف و تسلیم پر مجبور ہوئے ہیں، گجرات کی مسجدیں اور مقبرے آج بھی موجود ہیں اور انہیں دیکھنے کے لئے آج بھی سیاح پہنچتے ہیں،

۱۔ مملکت گجرات کا پہلا بادشاہ ظفر خاں تھا، جو مظفر خاں کے نام سے ۸۱۰ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا، اور ۸۱۳ھ تک شان تجمل سے حکومت کرتا رہا،

۲۔ آخری فرماں روا بھی مظفر شاہ تھا جو ۹۸۰ھ تک حکومت پر قابض رہا،

۷۔ سلطنت شرقیہ

ہم بتا چکے ہیں کہ دلی کی مرکزیت کے زمانہ میں فیروز شاہ تغلق کا وزیر مملکت جہاں خاں دلی سے جونپور چلا گیا تھا، اور وہاں اس نے ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرلی تھی، اور ۸۸۱ھ تک قائم رہی تھی، یہ حکومت بھی اپنے علمی اور تعمیری کارناموں کی بنا پر خاص منزلت کی حامل ہے،

۱۔ پہلا بادشاہ خان میاں ۷۹۶ھ سے ۸۰۲ھ تک حکومت کرتا رہا،

۲۔ آخری بادشاہ حسین شاہ تھا جو ۸۸۱ھ تک مسند حکومت پر متمکن رہا

۸۔ خاندان سادات

ملتان کا حاکم خضر خاں تیمور کی بخشش سے دلی کا بادشاہ بن بیٹھا، کئی سال کی جد و جہد کے بعد ۸۱۷ھ میں دلی پر قابض ہوا،

یہ سلطنت ۳۷ سال تک صفحۂ وجود پر موجود رہی، آخری بادشاہ علاء الدین تھا، جس کی وسعت مملکت کا یہ عالم تھا کہ دلی کے منچلوں نے اس پر پھبتی کہی تھی ——— بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم، جب تک بہلول لودھی مدد کرتا رہا یہ سلطنت زندہ رہی، جب بہلول کی نیت بدلی تو مدد کرنے

کے بجائے وہ خود ہی حاکم اور فرماں روائے دلی بن گیا،

۱۱۔ خاندان لودھی

بہت سے افغان سپاہی خلجی اور تغلق کے زمانہ میں اپنے اہل وعیال سمیت دلی آکر بس رہے تھے، یہ شاہی فوج میں بڑے بڑے عہدوں اور منصوبوں پر فائز تھے، ایک قبیلہ لودھی بھی تھا جو اپنے حسن اخلاق تہذیب و شجاعت کی بنا پر خاص طور پر نمایاں اور ممتاز تھا

اسی خاندان کا ایک شخص بہلول لودھی : اب دلی کے تخت حکومت پر متمکن تھا،

سلطنت شرقیہ کی شکست

۸۸۳ھ میں بہلول نے سلطنت شرقیہ (جونپور) کو شکست دی اور بہار تک کے یہ علاقے پھر سلطنت دہلی کے ماتحت ہو گئے۔

سکندر لودھی

بہلول کا جانشین سکندر لودھی تھا، یہ ۸۹۴ھ میں تخت نشین حکومت ہوا اس نے نظم مملکت استوار کیا، حالات کو درست کیا، بگڑے ہوئے حالات سنوارے، لوگوں میں اعتماد اور اعتبار کا جذبہ پیدا کیا، دلی کی حالت مسلسل یورشوں اور یلغاروں سے بہت زبوں ہو چکی تھی، سکندر نے دلی کو چھوڑا اور آگرہ کے قریب ایک نیا دارالسلطنت بنایا، جو آج بھی "سکندرہ" کے نام سے مشہور و موجود ہے،

سکندر کا عہد

سکندر کے عہد کی خاص بات یہ ہے کہ فارسی باقاعدہ دفتری اور سرکاری زبان بن گئی اور ہندو بھی بڑے شوق اور ذوق سے اسے سیکھنے لگے، سکندر ۹۲۳ھ تک حکمران رہا، اس کا عہد ہر اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے،

ابراہیم لودھی

سکندر کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی سریر آرائے مملکت ہوا، لیکن اس میں وہ صلاحیت نہ تھی جو باپ میں تھی، اوضاع و اطوار میں بھی، یہ باپ دادا سے بالکل جدا تھا، لیکن اپنے بہادر سپاہیوں پر قابو نہ رکھ سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے عہد میں پھر خلفشار پیدا ہوا، اس سے فائدہ اٹھا کر تیمور کے پڑپوتے ظہیر الدین بابر نے پہلے تو پنجاب پر قبضہ کر لیا، پھر ۹۳۲ھ میں اس سے اور ابراہیم لودھی سے باقاعدہ جنگ ہوئی، اس جنگ میں بابر کا پلہ بھاری رہا، اور ابراہیم کے نصیب میں شکست آئی، ابراہیم اگرچہ میدان جنگ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا، اور بہادری سے مقابلہ

کرتا رہا، لیکن قسمت مخالف ہو چکی تھی، لڑتا ہوا مارا گیا۔ ابراہیم کی ہلاکت نے لودھی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، اور ہندوستان پر بابر کی حکومت قائم ہو گئی، بابر اس دیس میں ایسا آیا کہ پھر نہ گیا، اور یہ خاندان کئی سو برس تک یہاں حکومت کرتا رہا، پھر جب قضا و قدر نے اس خاندان کو ختم کیا، تو اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا!

This the best History of Islam written by Rais Ahmed Jafery
19/12/78

دورِ عروج و اقبال

عہدِ مغلیہ

(۱)

ظہیر الدین بابر سے محی الدین اورنگ زیب عالمگیر تک

کبھی ہم نے کی تھی حکمرانی "سارے بھارت" پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا!

دورِ کامرانی

مغل عہد حکومت کے خصائص اور ممیزات

اب ہم عہد مغلیہ کی داستان شروع کرتے ہیں اس داستان کے ہم نے دو حصے کر دیئے ہیں،
پہلا حصہ داستان عروج سے متعلق ہے، یہ دور بابر سے شروع ہوتا ہے، اور عہد ہمایوں کے مختصر قصہ کو چھوڑ کر عہد عالمگیر تک قائم رہتا ہے، یہ وہ دور ہے جب مغلوں کا آفتاب اقبال نصف النہار پہنچ گیا تھا، انہوں نے تقریباً سارے ہندوستان کو اپنا زیر نگین کر لیا تھا، ان کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ بنگال اور دکن تک ان کا گز اور سکہ چل رہا تھا، راجپوت تک ان کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔
۲- دوسرا دور ہے 'دورِ زوال'۔ یہ عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے ادھر عالمگیر نے آنکھ بند کی ادھر زوال و انحطاط اور ادبار کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے، خانہ جنگیاں، سازشیں، رنگ رلیاں عیش پرستیاں ان سب چیزوں نے آخر کار اس عظیم و جلیل حکومت ہی کو ختم کر دیا، اور ایک بدیسی قوم یہاں آکر حکمران ہو گئی جس سے ہندوؤں کو بھی نقصان پہنچا، لیکن جس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہ رکھا۔

قبل اس کے کہ ہم عروج و زوال کا یہ افسانہ شروع کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اوراق میں ان لوگوں کی کہانیاں ہم پڑھیں گے، جن اصحاب ہم کے کارناموں سے ہم واقفیت حاصل کریں گے، جن کی بزم و رزم کے واقعات ہمارے مطالعہ میں آئیں گے، ان کی زندگی کارناموں کے اثرات و نتائج، جد و جہد انداز حکومت، اسلوب فرماں روائی، طرز حکمرانی، اور خصائص و کمالات کا پس منظر اور پیش منظر بھی پیش نظر رکھیں، آگے بڑھنے سے پہلے ہم ... پر نظر ڈالنا ضروری اور ایسا ضروری ہے جس کا مطالعہ کئے

بلکہ مغلوں کے کئی سو سال کے عہد حکومت کا ہم جائزہ ہی نہیں لے سکتے، اندازہ ہی نہیں کر سکتے!

۱۔ علمائے کرام

یہ عہد اس اعتبار سے خاص طور پر ممتاز ہے کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے علما ہر طرح کے تھے، علمائے سو بھی اور علمائے حق وخیر بھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تخت شاہی مسند علم سے ٹکرایا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ یہ مسند الٹ گئی، لیکن علماء کا من حیث الجماعت جو وقار تھا، اس میں فرق نہیں آیا، اس لئے نہیں آیا کہ ان علمائے سے قطع نظر، جو حب و جاہ کے متوالے تھے، اس جماعت نے درس وتدریس تعلیم وتعلم اور افہام وتفہیم کا سلسلہ غیر منقطع طور پر مسلسل جاری رکھا خواہ حکومت کی طرف سے سرپرستی ہو یا مخالفت، ان علماء میں ہمیں ایسے علمائے حق بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے بادشاہوں سے ٹکر لی، خود فنا ہو گئے، لیکن اپنے غیر فانی نقوش چھوڑ گئے۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط
لیکن اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے!

انہوں نے ہر طرح کے مصائب کا مقابلہ کیا، لیکن اپنی آن اور شان میں فرق نہیں آنے دیا، اکبر کے مقابلہ میں ملا عبدالنبی کے مجاہدات کبھی فراموش نہیں ہو سکتے!

۲۔ شعرائے نامدار

اس عہد میں ہمیں شعرا کی بھی ایسی منتخب جماعت نظر آتی ہے، جو اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی اور کہیں نظر نہیں آتی، ان کی زبان منجھ چکی تھی، ان کے خیالات میں ندرت تھی، جدت تھی، رعنائی تھی، شگفتگی تھی، المنز تھا، ذہانت تھی، بالیدگی فکر ونظر کا سامان تھا،

شعرا کے یہ قافلے زیادہ تر ایران سے آتے، اور یہاں آکر انہوں نے بزم شعر وسخن میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، ان کے قصیدے، ان کی غزلیں، ان کی مثنویاں، ان کے قطعات ورباعیات ان کے ہجویات ومطائبات، ان کے الفاظ کا، ان کی فکر کا سیل رواں، ان سب سے زندگی کے سوتے پھوٹتے پڑ رہے ہیں آبلے پڑ رہے ہیں، انہوں نے فلسفہ کو شعر کا لباس پہنایا، شعر کو فلسفہ بنا دیا، اس فنکاری اور کمال کے ساتھ کہ عقل حیران رہ گئی، اور ذہانت عش عش کر اٹھی، شعر نے "کارگہ شیشہ گراں" کی حیثیت اسی دور

میں حاصل کی، اوزان و بحور اور ردیف و قوافی میں ان کی جدت طرازیاں اپنی مثال آپ ہیں،

۳۔ صوفیائے عظام یوں تو غزنوی اور غوری، ایبک اور التمش وغیرہ کے دور میں بھی ہمیں صوفیائے کرام اس دیس میں وعظ و تلقین اور تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں لیکن عہد مغلیہ میں بلند پایہ اور عالی منزلت صوفیا کے جو قافلے اس کفر زار کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں، حقائق و معارف کی ایک دنیا انہوں نے آباد کر دی تھی، ان کی مجلس وعظ جہاں سیاہ قلب مسلمانوں کا پھر سے دین سے رشتہ جوڑتی تھی، وہاں کفر و طغیان کے قلعوں میں ان کی تبلیغ رخنے بھی پیدا کر دیتی تھی، ان کے پاس نہ تلوار تھی، نہ دولت، لیکن یہ جہاں پہنچ جاتے تھے خلقت ان کے فیض سے استفادہ کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتی تھی، یہ فاقے کرتے تھے، لیکن مال و دولت پر للچائی ہوئی نظریں نہیں ڈالتے تھے، ان کے پاس نہ جاگیر تھی نہ گاؤں گراؤں، لیکن ان کے لنگر سے ایک دنیا شکم سیر ہوتی تھی، ان کے حجروں میں چراغ کی روشنی نہیں تھی، لیکن انوار الٰہی سے وہ جگمگاتے رہتے تھے، ان کے منہ سے نکلے ہوئے بول فرمان شاہی کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، لیکن جو ان کے منہ سے نکل جاتا تھا، وہ پورا ہوتا تھا، ان کی زندگی خدا کے لئے وقف تھی، خدا ان کی دستگیری کرتا تھا، بڑے بڑے منکر اور ملحد اور کافر ان کے سامنے آتے، ان کی سیرت، کردار اور انفاس طیبہ سے متاثر ہو کر خدائے واحد کی جناب میں سربسجود ہو جاتے تھے، زنگ کفر دور ہو جاتا تھا، اور آئینہ قلب مصفا اور مجلا ہو جاتا تھا!

یہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے، یہ بادشاہوں اور بادشاہت کی پروا نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی بادشاہ ان سے ٹکراتا، کوئی بادشاہت انہیں اپنا حریف خیال کرتی تھی، تو بھی ان کے تیور اور آن میں فرق نہیں آتا تھا، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور دوسرے بزرگان طریقت و معرفت کے کارنامے رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے!

۴۔ بے لاگ مورخ متعدد مواقع پر ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ علم تاریخ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے، انہی نے اسے ایک فن کی طرح مدون کیا اور برتا، ملوک و سلاطین میں ہمیں ایسی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں، جن کی نگاہ تلوار کا حکم رکھتی تھی، جن کی

شمشیر آبدار، خاطی اور معصوم سب پر چلتی رہتی تھی، جن کے قہر و جلال کی کوئی تاب نہیں لا سکتا تھا، بڑے بڑے اہل ابنیہٗ صاحبان طرۂ دستار اصحاب جاہ و جلال ان کے سامنے کانپتے اور لرزتے ہوئے حاضر ہوتے تھے، دل کی دل میں رکھتے تھے، اور منہ سے وہی کہتے تھے جو ایمائے سلطانی ہوتا تھا!

لیکن اس ہجوم عام میں ہمیں وہ بے لاگ مؤرخ بھی نظر آتے ہیں، جو بغیر خوف اپنی زندگی مستقبل اور توقعات سے بے نیاز ہو کر حق بات کہنے میں ذرا نہیں جھجکتے، جن کا قلم بڑی بے دردی سے ملوک و سلاطین پر تنقید کرتا ہے، ان کی کمزوریاں اجاگر کرتا ہے، ان کی غلطیوں کو فاش کرتا ہے اور ان کی کوتاہیوں کے بیان میں ذرا بھی نہیں ڈرتا ——— مثلاً ملا عبدالقادر بدایونی، یہ عہد اکبری کے بزرگ تھے، علم معقول و منقول میں ماہر تھے، ابوالفضل اور فیضی کے ہم درس اور خواجہ تاش تھے، ملا مبارک کے شاگرد تھے لیکن جب اظہار حق پر آتے ہیں تو نہ شہنشاہ جہاہ کی پرواکرتے ہیں نہ استاد والا جاہ کی نکتہ چینی کرتے وقت مروت ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتی، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مروت اور حق گوئی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں، ملا عبدالقادر نے جس طرح اکبر کے دین الٰہی اور ملا مبارک کے کلام نافرجام کی دھجیاں اڑائی ہیں، وہ تاریخ کا غیر فانی نقش بن چکی ہیں

۵ نظم و انتظام مملکت

اس دور میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مملکت کا نظم و انتظام اور زیادہ بگڑ گیا تھا، راستے پرخطر تھے لیکن حکومت کی سختی اور نگرانی نے ان پرخطر راستوں کو مامون بنا دیا تھا، باغیوں اور سرکشوں کی کمی کبھی بھی نہیں رہی، اس دور میں بھی نظر آتے ہیں لیکن سر اٹھاتے ہی کچل دیئے جاتے ہیں، عمال حکومت کی یہ سرشت شاید ہمیشہ سے چلی آتی ہے کہ مجبوروں کو ستائیں بے چاروں پر ظلم کریں، ناداروں کو لوٹیں، اس عہد میں بھی اس طرح کے لوگ تھے لیکن ان کی سرکوبی میں انہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں کبھی تامل نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ نظم و انتظام کا سلسلہ جتنا مستحکم اس دور میں نظر آتا ہے اور کبھی نہیں دکھائی دیتا اور

۔ امن و امان

کسی اچھی حکومت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اندرون مملکت خلفشار، بدنظمی اور ہنگامہ آرائی سے محفوظ ہو، مغلوں نے اس طرف پوری توجہ کی، اور ایسے

مستحکم پیمانہ پر امن و امان قائم کیا کہ اس طویل و عریض مملکت میں بدامنی اور شورش کا کہیں وجود نظر نہیں آتا، اور اگر کہیں نظر بھی آتی ہے تو ہم یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ نمایاں ہوتے ہی وہ ختم بھی کر دی گئی، رعایا میں پھر وقار پیدا ہو گیا، اور وہ بے فکری اور آسودگی کے ساتھ اپنے روز مرہ کے کاروبار میں مشغول ہو گئی،

۷۔عدل و انصاف

عہد مغلیہ میں ایک اور چیز اپنی پوری تابناکی اور رعنائی کے ساتھ جو نظر آتی ہے، وہ ہے بے لاگ عدل و انصاف، مغل فرماں روا اس طرف خاص طور پر توجہ کرتے تھے، ہندو ہو یا مسلمان عیسائی ہو یا پارسی، ان کے دربار میں جو فریاد لے کر آتا تھا وہ محروم و مایوس نہیں جاتا تھا، دامن مراد گوہر آرزو سے بھر کر جاتا تھا، یوں تو بابر ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، عالمگیر سب ہی اس صفت میں یکتا نظر آتے ہیں، لیکن جہانگیر خاص طور پر اپنے خاندان میں ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے، اس کی زنجیر عدل کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے،

۸۔بندوبست مال گزاری

اس عہد میں ایک اور چیز جو ابتک معیار و اساس کا درجہ رکھتی ہے، وہ ہے لگان بندی، مال گزاری اور بندوبست کا نیا نظام

عہد مغلیہ سے پہلے بھی کسان تھے، زمیندار تھے، جاگیر دار تھے، بادشاہ تھے، اور ان سب کے مابین داد و ستد کا سلسلہ بھی جاری تھا، لیکن اکبر نے اپنے دیوان، وزیر اور مشیر فیضی، ٹوڈرمل اور دوسرے لوگوں کی صلاح سے جو نظام قائم کیا، اس کی تفصیل تو "آئین اکبری" دیکھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے لیکن اتنا ہر شخص کو آج بھی جاننا چاہیئے کہ اکبر کا بنایا اور نافذ کیا ہوا یہ نظام مال و محصول آج تک جزوی تغیرات کے ساتھ قائم ہے، انگریز بھی باہمہ دعوائے ہمہ دانی اس سے استفادہ کرنے اور اس پر عمل کرنے پر مجبور ہو گئے،

۹۔قدیم کا تکملہ

مغلوں نے ان نامکمل مہمات کو مکمل کیا، جو ان کے پیش رو، حالات کی ناساعدت یا حوادث کے نزول، یا اتفاقات کی مجبوری کے باعث ادھوری چھوڑ گئے تھے

مہمات کی تکمیل اور تجدید میں مغلوں نے وہ تمام پاپڑ بیلے، جو کسی نئی مہم میں بیلنے پڑتے ہیں، انہوں نے استقلال و استقامت کے ساتھ وہ تمام مہمیں سر کرلیں، جو قضا و قدر نے ان کے لئے پہلے سے مقدر کردی تھیں، اور جو گویا ان کی زندگی تک رہی تھیں

۱۰۔ فتوحات جدیدہ

اس اعتبار سے بھی ہمیں مغلوں کا دور ایک امتیازی وصف کا حامل نظر آتا ہے کہ انہوں نے فتوحات جدیدہ کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ قائم کردیا اور اس معاملہ میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی، انہوں نے جہاں رانا سانگا کو شکست دی، اور رانا اودے پور کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا وہاں دکن میں، خاندیس میں، مالوا میں اور دوسرے مقامات میں ان مسلمان بادشاہوں اور مسلم مملکتوں کو بھی اپنی لشکرکشی کا نشانہ بنایا، جو آزادی اور خود مختاری کی زندگی بسر کرنے کی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے، اس سلسلہ میں بڑی خونریزیاں ہوئیں، قتل عام ہوا، خوفناک لڑائیاں لڑی گئیں، لیکن مغلوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس دیس میں کسی مقام پر انسان بستے ہوں، اور وہ مغل حکومت کے زیرنگیں نہ ہوں بلکہ آزاد اور خود مختار ہوں!

۱۱۔ متحدہ ہندوستان

مغلوں کا یہ طرزعمل اس بنیادی اصول پر مبنی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ لیکن تیزی اور سرعت کے ساتھ ہندوستان کو ایک متحدہ ملک بنا رہے تھے، اگرچہ خلجی اور التمش وغیرہ کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس دیس کو ایک مرکزی حکومت کا تابع بنانے کی کوششیں کی گئیں اور وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئیں، لیکن مغلوں کے عہد میں یہ کوشش ایک حقیقت بن گئی، مغلوں کا رقبۂ سلطنت اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع تھا، اس مناسبت سے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کا تابع رکھنے میں دشواریاں بھی حائل تھیں، لیکن انہوں نے ہر دشواری کا جان پر کھیل کر مقابلہ کیا، ہر طوفان سے ٹکرائے، ہر قوت سے زورآزمائی کی اور ایسے متحدہ ہندوستان کی تشکیل کردی، جو ان کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی قائم رہی، اور اس کے فوائد و مصالح بھارت کے باشندوں کو اتنے بھائے کہ وہ تشکیل و قیام پاکستان کی مخالفت بھی اس دلیل سے کرتے رہے کہ متحدہ ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا،

حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ یہ متحدہ ہندوستان مسلمانوں نے قائم کیا تھا، اور اب اگر وہ منقسم ہو رہا تھا تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی، تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی تھی

۱۲۔ مستقل رہائش کا فیصلہ مغلوں نے اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں متحدہ ہندوستان پر زیادہ زور دیا، اور اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں وہ زیادہ کامیاب بھی رہے، اس کی وجہ صرف ایک ہے، غزنوی اور غوری تو مسافر کی طرح یہاں فاتح بن کر آئے تھے، فتح کیا اور واپس چلے گئے، انہیں اس سرزمین سے کوئی خاص تعلق خاطر نہیں تھا، غزنوی اور غوری کے بعد ایبک اور التمش وغیرہ اگرچہ یہیں رہے، اور یہیں مرے، لیکن یہ حسن اتفاق تھا، وہ درحقیقت اپنے ان آقاؤں کے غلام تھے، جو غزنی اور غور میں بادشاہت کر رہے تھے، بعد میں یہ خود مختار ہو تے، لیکن عہد خود مختاری میں بھی یہ کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکے، جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اب دائمی طور پر یہ رہنا اور بسنا چاہتے ہیں،

اس کے برعکس بابر نے ہندوستان فتح کرتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اب یہیں زندہ رہنا اور مرنا ہے اب فرغانہ وطن نہیں رہا، بھارت وطن بن گیا ہے، چنانچہ اس نے امرا اور سرداروں سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں تو اب یہیں کا توطن اور بودوباش اختیار کر رہا ہوں تم میں سے جو میرے ساتھ رہنا چاہے رہے جو وطن واپس جانا چاہے چلا جائے، بابر نے یہ بات یوں ہی برسبیل تذکرہ" نہیں کہدی تھی، واقعی طور پر کی تھی، چنانچہ جو لوگ اس کے ساتھ رہنا چاہتے تھے، رہ گئے اور جو نہیں رہنا چاہتے تھے، وہ چلے گئے، ان جانے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں بابر نے اور جن سے بابر کو بڑا گہرا قلبی لگاؤ تھا لیکن وطن کی کشش ذاتی تعلق سے بڑی چیز ہوتی ہے، وہ بابر کے لئے وطن نہ چھوڑ سکے، اور بابر ان کے لئے یہ ایثار نہ کر سکا کہ اپنا وطن اختیاری ترک کر دیتا!

خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

یہ صرف شاعرانہ تخیل نہیں ایک اٹل حقیقت ہے،

۱۳۔ ہندو مسلم اتحاد یوں تو ہم غزنوی کی فوج میں بھی ہندو سپاہیوں کو دیکھتے ہیں، لیکن

ہندو مسلم اتحاد کا صحیح تخیل عہد مغلیہ کی پیداوار ہے،

مغلوں نے جب اس دیس میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کر لیا، تو محسوس کیا، اب زندگی یوں نہیں نبھ سکتی کہ ہندوؤں سے وہی کافر کا برتاؤ کیا جائے، اور ہر وقت تبر و تیر سے ان کا مقابلہ کیا جائے ——— جب ایک ہی ملک میں دونوں کو رہنا ہے تو پھر کیوں نہ میل محبت خلوص اور تعاون دوستی اور رفاقت کی زندگی بسر کی جائے، ادھر مسلمانوں کے مستقل رہ پڑنے سے ہندوؤں نے بھی یہی محسوس کیا کہ دوست بن کر رہنا، دشمن بن کر رہنے سے زیادہ بہتر اور سود مند ہے، اس اتحاد خیال نے ہندو مسلم اتحاد کی تشکیل کی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان عوام و خواص مذہبی اختلاف کے باوجود دل جل کر رہنے کا گر سیکھ گئے، جہاں مسلمانوں نے ان کے ساتھ اتنی رواداری برتی کہ ان کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی، ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، فوج میں بھی بڑے سے بڑے اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر انہیں فائز کیا، مسلم ممالک ——— مثلاً افغانستان ——— تک میں انہیں گورنر اور سپہ سالار بنا کر بھیجا، تجارت تمام کی تمام انہی کے ہاتھ میں رہنے دی، اور ان کی نفع اندوزی سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا، وہاں ہندوؤں نے بھی اتنی عالی ظرفی اور فراخ دلی دکھائی کہ ذوق و شوق سے فارسی سیکھنے لگے، اس زبان میں شاعری کرنے لگے، ادب و انشا میں بہت سے مسلمانوں سے بازی لے گئے، جو عہدہ دیا گیا اس پر پوری دیانت اور وفاداری سے (بجز چند مستثنیات کے) فائز رہے اور اپنی ذمہ داریاں خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، دولت بھی خوب کمائی اور جب موقع آیا تو خون بہانے سے دریغ نہ کیا، اس صورت حال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا، اور فاتح و مفتوح میں برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے، اور روز بروز ان میں استحکام پیدا ہوتا گیا

۱۴- رشتہ و پیوند کے تعلقات

مغلوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے سلسلہ میں ایک قدم اور بڑھایا،

یعنی راجپوت خاندانوں میں شادی کی طرح ڈالی چنانچہ عالمگیر تک جتنے مغل سلاطین گزرے ہیں، سب کے سب ہی ہندو مہارانیوں کے بطن سے تولد ہوئے، جہانگیر رانی جودہ بائی (جے پور) کے بطن سے پیدا ہوا، جہانگیر کی شادی راجکماری جودھ پور سے ہوئی، اس شادی سے پہلے اکبر نے اتنی دلچسپی کا اظہار کیا کہ خود اکبر نے بہو یعنی دولہن کا ڈولا اٹھایا، اسی راجکماری کے بطن سے شاہجہان اعظم پیدا ہوا جس کے کارنامے صفحۂ ارض پر نقش دوام بن چکے ہیں۔

ان شادیوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی روابط میں بہت زیادہ استحکام پیدا ہوا، راجپوت اور ہندو بادشاہ پرست تو تھے ہی۔ اب ان کی شاہ پرستی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا، چنانچہ ہمیں تاریخ میں "درشنیہ برہمنوں" کا نام بھی ملتا ہے، یہ وہ لوگ تھے کہ جب تک صبح صبح بادشاہ سلامت کے درشن نہ کر لیں، کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے، انہی کی تسکین قلب کے لئے قلعوں میں جھروکہ کا انتظام کیا گیا، جہاں سے بادشاہ کا درشن کیا جاتا ہے، لال قلعہ (دہلی) میں یہی جھروکہ اب تک موجود ہے۔

۱۵۔ رواداری مذہبی

یوں تو ہر عہد کے مسلمان بادشاہوں نے مذہبی رواداری کا غیر مسلموں کے ساتھ ثبوت دیا لیکن مغل اس معاملہ میں بھی دوسروں سے گوئے سبقت لے گئے، اکبر تو اس معاملہ میں یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ محل شاہی میں اس نے پیاز اور لہسن کی درآمد بند کر دی تھی، اور سارے ملک میں گاؤکشی کے بارے میں حکم امتناعی نافذ کر دیا تھا، دوسرے مغل بادشاہ اس حد تک تو نہ جا سکے لیکن انہوں نے بھی حتی الامکان کوئی ایسی بات نہیں کی جو ان کی دل آزاری کی موجب ہو، ہندو اہل قلم نے عالمگیر اورنگ زیب کو بہت بدنام کیا ہے کہ وہ مذہبی دیوانہ تھا، لیکن عالمگیر تک کے فرامین موجود ہیں، جن میں بنارس وغیرہ کے مندروں کو معافیات دی گئی تھیں، اور یہ مندر ان معافیوں سے آج بھی پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں!

۱۶۔ شجاعت اور دلیری

مغلوں کی سلطنت کو جن وجوہ سے استحکام و دوام حاصل ہوا ان میں ایک بڑی وجہ، مغل فرماں رواؤں کی غیر معمولی جرأت و ہمت اور شجاعت و دلیری بھی ہے، خاص طور پر بابر سے لے کر عالمگیر تک تو اس شجاعت اور

دلیری کے ایسے کارنامے نظر کے سامنے آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

بابر کو اس کے ہم قوم پیچھے دھکیلتے رہے، حالات ناسازگار رہے، مشکلات قدم قدم پر پیش آتی رہیں، لیکن اس نے فتح ہند کا فیصلہ کر لیا، اور مہیب و ہولناک دشواریوں کو ذرا بھی خاطر میں نہ لایا، مقابلہ لودھیوں سے ہوا، جن کے پاس دولت بھی تھی اور فوج بھی حد و شمار سے خارج، لیکن وہ ذرا بھی دل برداشتہ نہ ہوا، آخر اس نے آگرہ اور دلی پر قبضہ کر کے دم لیا، پھر تخت ہند پر قابض ہو لے کے بعد رانا سانگا اور دوسرے لوگوں سے نہایت ناساعد حالات میں جنگ لڑنا پڑی، اور اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج کے ساتھ لڑنا پڑا، لیکن وہ خود تلوار سونت کر میدان میں کودا اور جیت کر لوٹا، اسی طرح ہمایوں کو قسمت نے کیسے کیسے کنوئیں نہ جھنکائے، شیر شاہ سوری بابر کی فوج کا ایک سپاہی شہنشاہ ہند بن گیا، ہمایوں کو کہیں اماں نہ ملی، بھائیوں نے رفاقت سے منہ موڑ لیا، دوستوں نے ترک تعلق کر لیا، ایران بھاگ کر پہنچا، لیکن بارہ سال بعد پھر واپس آیا، اور ہندوستان پر قبضہ کر کے اس طرح کاروبار سلطنت چلانے لگا جیسے یہ مصائب اُسے پیش ہی نہیں آئے تھے، اس کا بیٹا اکبر بچپن میں یتیم ہو گیا، صرف ۱۴ سال کی عمر میں، ۱۸ سال کی عمر میں زمام حکومت ہاتھ میں لی، لیکن اس شان سے کہ دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو گئے، ہاتھیوں کا سامنا کرتا، دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ سے جست لگا کر کود جاتا، گھمسان کے رن میں تلوار ہاتھ میں لے کر کود پڑتا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، وہ کبھی نہیں ہارا، کبھی ناکام نہیں ہوا، اس لئے ضعیف الاعتقاد ہندوؤں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سارے اس کے تابع ہیں، اب جہانگیر کو دیکھئے ساری زندگی عیش و عشرت میں گزار دی، نور جہاں پر اس شان سے عاشق ہوا کہ لیلیٰ مجنوں کا فسانہ تازہ کر دیا، شراب کا بھی رسیا تھا، خوب پیتا تھا، لیکن عین بادہ خواری اور سرور و نشاط کے وقت اگر کوئی اطلاع ملی، اس نے شراب کا پیالہ پٹکا، گھوڑے پر بیٹھا اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا، شاہجہان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چتوڑ کے رانا کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی جنگی مہارت سے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا، عالمگیر جس طرح بچپن میں اتنا بہادر تھا کہ بڑھتے ہوئے ہاتھی سے لڑنے لگا

اسی طرح ۹۰ سال کی عمر میں بھی اس کے شہود کا یہ عالم تھا کہ آپ سے صدہا میل دور دکن میں بیٹھا مرہٹوں کی شرارت، سازش، شورش، ہنگامہ آرائی اور یلغار کو روکتا اور کچلتا رہا!

یہی وہ شجاعت اور دلیری تھی، جس نے مغلیہ سلطنت کو وہ استحکام بخشا جو کسی دوسری حکومت کو نہ حاصل ہو سکا!

۱۷۔ تدبر اور فراست

تدبر اور فراست کے اعتبار سے بھی مغل فرماں روا یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتے تھے، ان کا ہندوستان میں مستقل اقامت اختیار کر لینا ہندو راجاؤں سے رشتہ و پیوند کے تعلقات قائم کرنا، ہندوستان کی حکومت کو متحدہ حکومت بنانا بنگال اور دکن تک کے علاقوں کو جو بے انتہا دور دست تھے، مرکزی حکومت کا تابع کرنا، اور تابعیت پر مجبور کرنا، ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ رواداری، ایر چشمی، اور فراخ حوصلگی کا برتاؤ کرنا، دشمنوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں، اور جنگ میں فتح کے بعد بھی اچھا سلوک کرنا، اگر تدبر اور فراست کے ذیل میں نہیں آتا ہے تو پھر اسے کیا کہا جائے گا؟ اور ہم مغلوں کے طویل دور میں دیکھتے ہیں کہ یہ پالیسی تقریباً یکساں طور پر برابر کارفرما رہی ہے اس میں کبھی کوئی بنیادی تغیر نہیں ہوا

۱۸۔ اثر، تاثیر، تاثر

مسلمانوں کے میل جول، مغل بادشاہوں کے حسن سلوک صوفیا کی تبلیغ دین علما کے وعظ و پند اور تلقین، زبان (فارسی) کے اشتراک نے ہندوؤں پر محسوس اور غیر محسوس طور پر بہت گہرا اثر ڈالا، جو لاکھوں لوگ مسلمان ہو گئے انہیں چھوڑ دیتے، جو مسلمان نہیں ہوتے، اور اپنے دھرم پر سختی کے ساتھ قائم رہے، انہیں بھی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، ان کا لباس بدل گیا، ان کی معاشرت کی معاشرت میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا، ان کی زبان فارسی ہو گئی، ان کے خیالات میں بھی تغیر پیدا ہو گیا، وہ بت پرست قوم کے ایک فرد رہے، لیکن توحید سے نامانوس نہ رہے، یہ اثرات اتنے دوررس اور فیصلہ کن ثابت ہوئے کہ انہوں نے سارے ملک کی تقدیر پر گہرا اثر ڈالا،

۱۹۔ عام خوشحالی

مغلوں نے چونکہ ملکی بنا پر حکومت کی، اس لئے ملک کی صلاح و فلاح سے

وہ کبھی غافل نہیں رہے، انہوں نے ملک کی معاشیات، زراعت، تجارت، کاروبار اور صنعت کو فروغ دینے کے وسائل سوچے، اور انہیں بروئے کار لائے، یہ اس کا نتیجہ تھا کہ مغلوں کے دور میں ایک طرف تو حکومت کا خزانہ ہمیشہ بھرپور رہا، دوسری طرف عوام بھی خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہے، روپیہ کی قیمت خرید اتنی بڑھ گئی کہ اس زمانہ کا ایک روپیہ ہمارے موجودہ زمانہ کے بیس پچیس روپیہ کے برابر تھا!

غرض جس اعتبار، اور جس حیثیت سے بھی دیکھئے، مغلوں کا طویل دورِ حکومت، بھارت کے لئے یکسر آیۂ رحمت ثابت ہوگا، انہوں نے اس ملک کو وہ کچھ دیا، جو یہاں کے پشتینی راجہ اور مہاراجہ بھی نہ دے سکے، پھر کتنے تعجب کی بات ہے کہ آج آزاد بھارت میں جب غلامی کی مدت کا حساب لگایا جاتا ہے تو وہ انگریزوں کے وقت سے نہیں شروع کی جاتی، بلکہ ان مسلمان بادشاہوں کے وقت سے شمار کی جاتی ہے، جنہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا، جنہوں نے یہاں باغوں کا جال پھیلا دیا، نہریں کھدوائیں اور سارے ملک کو سرسبز و شاداب کر دیا، نئے نئے شہر بسائے، آج اگر ان شہروں اور قصبوں کو ہندوستان کے جغرافیہ سے خارج کر دیا جائے، جو صرف مسلمانوں نے اس ملک میں بسائے اور آباد کئے، تو یہ شاید سب ملک بالکل ہیچ ہو کر رہ جائے گا، اگر مسلمانوں کے بسائے اور آباد کئے ہوئے شہروں کو عارضی طور پر بھارت کے موجودہ باشندوں سے خالی کرا لیا جائے تو وہاں آبادکاری اور بحالیات کا ایک ایسا محکمہ قائم کرنا پڑے گا، جسے لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے لئے شہر بسانے پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کو پردیسی قرار دیا جائے اور ان کے ان احسانات کو فراموش کر دیا جائے، جنہوں نے بھارت کی عظمت اور رفعت میں چار چاند لگائے تھے —— یہ جو آج دُور دُور مقامات سے سیاح اور زائر بھارت کی زیارت کو آتے ہیں، اگر تاج محل، لال قلعہ اور دوسری مسلم عمارات کسی طرح مٹالی جائیں تو وہ یہاں آکر کیا دیکھیں گے؟

ہم اُٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا ؛

اب ہم بابر سے لے کر عالمگیر کی داستان اقبال شروع کرتے ہیں !

ظہیرالدین بابر

من چلا، دلیر اور مہم جو

بابر کا باپ شیخ عمر، فرغانہ نامی چھوٹی سی ریاست کا والی تھا، بابر ابھی بارہ برس کا بھی نہ تھا کہ داغ یتیمی سہنا پڑا (۸۹۹ھ) یتیم ہوتے ہی اس پر مصائب بارش کی طرح برسنے لگے، کبھی بھی اسے یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع نہیں ملا، دشمن حریف، مخالف، دراندازکاٹ چھانٹ میں مصروف رہے، اور وہ خانہ بدوشوں کی طرح ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا رہا، لیکن آدمی جیالا، اور حوصلہ مند تھا، مصائب کا ہجوم بھی، اس کے عزم وتہور میں تزلزل نہ پیدا کر سکا، وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ دنیا کا بڑا بادشاہ بنے گا، ان پسپائیوں، ہزیمتوں، ناکامیوں اور پریشانیوں میں بھی اس کا ستارۂ اقبال رہ رہ کے چمکتا رہا، ۹۱۰ھ میں بھی آشفتہ روزگار اور پریشان حال بابر ہمیں کابل کے تخت پر بصد جاہ وتمکین متمکن نظر آتا ہے،

بابر کی تگ وتاز کا مقصد زیادہ تر ماوراالنہر پر قبضہ وتسلط تھا، لیکن ادھر ہندوستان نے دعوت تبغہ دی۔ کرم نما وفرود آ کہ خانہ، خانہ تست!

ہندوستان کی بات ہی اور تھی، وسیع وعریض ملک دولت بے انتہا کا مالک، سونے، چاندی اور جواہرات کا معدن، پھر لقمۂ تر، ماوراالنہر کو چھوڑ، وہ ہندوستان کی طرف لپکا، ابراہیم لودھی کی حکومت اگرچہ اچھی تھی، نہ رعایا کو کوئی خاص تکلیف تھی، نہ نظم مملکت میں کوئی نمایاں نقص تھا، لیکن خود ابراہیم کے ایک عزیز علاء الدین نے کابل پہنچ کر بابر کو اکسایا، بابر تو مہم جو اور خطرات پسند تھا ہی آمادہ ہو گیا ابتدائی تین حملے کوئی خاص فیصلہ نہ کر سکے، چوتھی مرتبہ (۹۳۰ھ) میں وہ ابراہیم لودھی کے صوبہ دار

دولت خاں کی غداری کے باعث لاہور پر قابض ہو گیا۔

پانی پت کی پہلی جنگ

اب ابراہیم لودھی نے بھی زیادہ سنجیدگی سے صورت حال پر غور کیا، اور ایک بہت بڑی فوج لے کر مقابلہ کو پہنچ گیا، میدان جنگ پانی پت قرار پایا، بظاہر بابر کی فتح کا کوئی امکان نہیں تھا، بابر کی فوج صرف ۱۲ ہزار افسراد پر مشتمل تھی اور لودھی کی فوج اس سے کئی گنا زیادہ تھی، لیکن بابر جیت گیا اور لودھی کے حصہ میں شکست اور موت آئی، وجہ یہ تھی کہ لودھی کی فوج "جدید سامانِ جنگ اور فنونِ حرب" سے ناواقف تھی، بابر کے پاس توپ تھی، بندوق تھی، اور ابراہیم لودھی کے سپاہی صرف تیر و تفنگ پر بھروسہ کئے ہوئے تھے، پھر ایک بات اور بھی تھی، مسافرت اور غربت کے باعث بابر کے مقصد میں زیادہ خلوص پیدا ہو گیا تھا ابراہیم اور اس کے لشکریوں میں یہ بات نہیں تھی نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی یہ فیصلہ کن جنگ صرف چند گھنٹوں میں ختم ہو گئی، اور بابر، دلی اور آگرہ پر یعنی دوسرے الفاظ میں مملکتِ ہند پر قابض ہو گیا

فتح کے بعد بابر نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا کر مستقل بود و باش یہیں کی اختیار کرے گا! (۹۳۲ھ)

رانا سانگا سے ٹکر

بابر نے ہندوستان فتح کر لیا ــــــ اور بظاہر حالات سازگار ہو گئے، لودھی خاندان کے بقیہ افراد نے اطاعت قبول کر لی، میوات کے سب سے بڑے اور با اثر آدمی حسن خاں نے حلقۂ اطاعت گلے میں ڈال لیا، اس کے ساتھ سپاہ کی بڑی تعداد تھی وہ بھی دوست بن گئی، اور بابر شاید خود اپنے ہی مقولہ،

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

پر عمل کرنے لگا، لیکن عیش کی لمبی گھڑیاں بھی جلد ختم ہو جاتی ہیں، اور اگر بدقسمتی سے وہ مختصر ہوں، پھر تو ان کے ختم ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی، چنانچہ چتوڑ کا رستم زماں اور سکندر اعظم، رانا سانگا، اپنا لاؤ لشکر لے کر بابر کے مقابلہ کو نکلا، اس یلغار کی خبر سنکر بابر کے لشکر پر مرگ آسا سکوت طاری ہو گیا، اور اس خوف و دہشت کے معقول وجوہ بھی تھے۔

ایک طرف،

۱- رانا سانگا خود بڑا جری، بہادر، کار آزمودہ تجربہ کار اور ناقابلِ تسخیر سپاہی اور سپہ سالار تھا، اس کا جسم جنگ کے تمغوں (زخموں) سے بھرا ہوا تھا، اس کے ساتھ جو ذاتی لشکر تھا اس میں اسی ہزار سوار اور ۵ سو ہاتھی تھے،

۲- سکندر لودھی کا بیٹا محمود لودھی، دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ رانا سانگا سے آکر مل گیا کہ بابر کو شکست دے، اور اپنے ہندو حلیف کی مدد سے تختِ ہند پر قبضہ کر لے۔

۳- حسن خاں میواتی بھی قول و قرار سے پھر گیا، اس نے بابر سے، دوستی اور وفاداری کا جو پیمان باندھا تھا اُسے توڑ دیا، بارہ ہزار سواروں کے ساتھ وہ بھی رانا سانگا کے لشکر کے ساتھ آملا،

۴- ایک اور رقیب و حریف مملکت، صلاح الدین اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ رانا سانگا کی امداد و اعانت کے لئے وارد ہوا اور بابر کے خلاف لڑنے کا اعلان کر دیا۔

۵- علاوہ ازیں رانا سانگا کے ہندو دوستوں میں جو راجہ اور مہاراجہ تھے، وہ بھی بابر کو بھارت سے نکالنے کے لئے ساتھ تھے، اور ان راجاؤں کی تعداد ایک سو بیس سے متجاوز تھی،

۶- رانا سانگا کے ساتھ اس کا اور دوستوں اور حلیفوں کا جو لشکر تھا، اس کی تعداد (آکسفرڈ ہسٹری) دو لاکھ سے زیادہ تھی!

اور دوسری طرف،

۱- ہم پڑھ چکے ہیں کہ بابر کی فوج لودھیوں سے آخری معرکہ سر کرتے وقت، صرف بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھی،

۲- اس یلغار کی خبر سنکر ہر طرف سے مطیع اعتقاد لوگوں کی سرکشی اور بغاوت پر مائل ہونے کی خبریں آنے لگیں،

۳- کول (علی گڑھ) سنبھل (مراد آباد) اور قنوج وغیرہ مقامات کے بابری قلعہ داروں کو اپنا مستقر چھوڑ کر آگرہ آکر پناہ لینی پڑی،

۳۔ بعض قلعہ دار حالات کی ناسازگاری اور کسی قسم کی کمک سے مایوس ہو کر قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔

۴۔ جتنے ہندوستانی سپاہی اور سردار مغل لشکر میں تھے، وہ اس مایوس کن حالت کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کرنے لگے لشکر بابری سے قطع تعلق کر کے جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا۔

۵۔ شاہی منجم نے جس کی پیشین گوئیوں کے مغل سپاہی اور افسر بہت زیادہ قائل تھے، پیشین گوئی کر دی تھی کہ بابر اور بابری لشکر کی خیر نہیں، اس پیشین گوئی نے ہراس اور دہشت میں کئی گنا اضافہ کر دیا

ان حوصلہ شکن، روح فرسا اور مایوس کن حالات میں بابر نے کیا کیا،

۱۔ بابر کے عزم و استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا، اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جنگی تیاریاں جاری رکھیں۔

۲۔ اس نے اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو یقین دلایا کہ یہ جنگ توسیع مملکت کے لئے نہیں حصول ثواب جہاد کے لئے لڑ رہا ہے (تزک بابری)

۳۔ اپنے قول کا ثبوت دینے کے لئے اس نے شراب خود ہی ترک کر دی، توبہ کی، شراب کے گراں قیمت برتن تڑوا دیئے، اور ان کا سونا چاندی غریبوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیا۔

۴۔ غزنی سے ابھی ابھی کئی اونٹوں پر لد کر شراب کے قرابے آئے تھے، ان سب میں نمک ڈلوایا، اور شراب انگوری کو سرکہ میں تبدیل کر دیا،

۵۔ مسلمانوں سے جو غیر شرعی محاصل وصول کئے جاتے تھے، وہ یک لخت معاف کر دیئے،

اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اس نے اپنے سپاہیوں، امیروں اور سرداروں کو مخاطب کر کے ایک موثر تقریر کی جس میں جہاد پر زور دیا، ابنائے دول کی بے ثباتی کا ذکر کیا، حیات آخرت کے دوام کا تذکرہ کیا موت کے یقینی اور قطعی ہونے کی اہمیت بتائی، ایک بلند مقصد کے لئے کٹ مرنے اور جان دے دینے کے کردار کو پیدا کر لینے کی تلقین کی، بابر نے اپنی تزک میں خود یہ تقریر لکھی ہے اور واقعی اس کے اثر انگیز ہونے میں شبہ نہیں، اس تقریر نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھیر دیا۔ لوگوں کے دلوں سے

موت کی دہشت کافور ہو گئی، وہ ایک بلند مقصد (اسلام) کے لئے جان دینے اور لینے پر تیار ہو گئے سب نے قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ مر جائیں گے لیکن میدان جنگ سے پیٹھ نہیں پھیریں گے، آگرہ سے تیس میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کنواہہ پر دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا[1]۔ بابر بذات خود اپنے لشکر کا سپہ سالار تھا، بابر کی توپوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا، بڑے بڑے سامنتوں کے چھکے چھوٹ گئے، گھمسان کا رَن پڑا، دیکھتے دیکھتے سب سے پہلے راجپوت میدان چھوڑ کر بھاگے، ان بھاگنے والوں کے آگے آگے جو شخص تھا، وہ چتوڑ کا سکندر اعظم اور رستم زماں رانا سانگا تھا (تاریخ ہند کینزم) البتہ ایک حسن خاں میواتی تھا، جس نے بھاگنے کو عار سمجھا، جس نے رانا سانگا کے ساتھ بھی فرار ہونا شرافت، شجاعت اور قول و قرار کے خلاف سمجھا، جو آخر وقت تک لڑتا رہا، اور لڑتے لڑتے میدان جنگ میں ہلاک ہوا مغلوں کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی، اور بقول لین پول کے اگر بابر راجپوتوں کا پیچھا کرتا رہتا تو اسی جنگ میں راجپوت قوت مزاحمت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔ (۹۳۳ھ)

وفات

اس مرحلہ کے سر کرنے کے بعد، بابر نے چندیری ممالک شرقی، اور بنگالہ کی طرف توجہ کی ہر حرکہ میں کامیاب اور فتحمند رہا، ۹۳۷ھ میں بیمار پڑا، اور آگرہ میں وفات پائی نعش کابل بھیجی گئی، وہیں تدفین عمل میں آئی اور ایک عالی شان مقبرہ بنا، جو آج تک زیارت گاہ خلائق ہے +

---

[1] یہ گاؤں اب بھی موجود ہے، اور ریاست بھرت پور میں شامل ہے۔

ہمایوں اور شیر شاہ

کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھا ہے

بابر کو بہت کم وقت ملا، اگر زیادہ دنوں زندہ رہتا تو شاید اس کے کارنامے بھارت کی تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے، پھر بھی وہ اتنے دقیع ہیں کہ نہ ان کی اہمیت کم کی جاسکتی ہے، نہ انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے بابر کی وفات کے بعد اس کا چہیتا اور محبوب بیٹا نصیر الدین ہمایوں مالک چتر و اورنگ ہوا، یہ بڑا نرم دل اور سراپا محبت و شفقت انسان تھا، اس کی یہ نیکی اور نرمی اس کے لئے بلائے جان بن گئی، اپنے بھائیوں کی بڑی سے بڑی غلطی اور غداری کو اس نے بڑی آسانی سے معاف کر دیا، بابر کے انتقال کے بعد اس کے ایک سوتیلے بھائی مرزا کامران نے کابل اور پنجاب پر خود مختاری کا ڈنکہ بجانا شروع کر دیا، ہمایوں نے سرکوبی کرنے کے بجائے اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیا گجرات اور مالوے میں شورش اور جنگ و پیکار کا سلسلہ شروع ہوا لیکن ہر مرتبہ ہمایوں کی کامیابیوں کو اس کے بھائیوں اور بداندیش سرداروں نے ناکامیوں سے بدل دیا، لیکن ہمایوں نے اپنوں کے خلاف کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھایا۔

دشمن جاں بھائی گجرات کا بہادر شاہ ہمایوں سے برسر پرخاش تھا، اس نے ایک بڑا لشکر فراہم کر لیا تھا، سکندر لودھی کا بیٹا محمود لودھی بھی اس کے ساتھ آکر مل گیا تھا، علاء الدین جس نے بابر کو بھارت پر حملہ کے لئے اکسایا تھا، یہاں ہمایوں سے لڑنے کے لئے پیش پیش نظر آتا ہے ہمایوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بہادر شاہ کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، خود بہادر شاہ فرار ہو گیا، ۱۵۳۵ء نتیجہ یہ ہوا کہ گجرات اور مالوے پر مغلیہ پرچم لہرانے لگا، ہمایوں ابھی مالوے ہی میں تھا کہ بنگال اور بہار

سے تشویش انگیز اطلاعیں آنا شروع ہوئیں، ہمایوں نے گجرات کی حکومت اپنے ایک بھائی مرزا عسکری کو تفویض کی، اور خود آگرہ آ گیا، مرزا عسکری نے یہ حکومت بغیر کسی جنگ کے یونہی چھوڑ دی، اور احمد آباد سے گجرات بھائی کی ساری فتحمندیوں پر پانی پھیر کر روانہ ہو گیا،

فرید خاں شیر شاہ سوری

اس اثنا میں ایک نئی قوت اُبھر رہی تھی، یہ تھا فرید خاں جو آگے چل کر شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ غوری خاندان کی ایک شاخ کا فرد تھا، بابر کی فوج میں ملازم تھا لیکن اب سارے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ تیار کر رہا تھا، اس نے رفتہ رفتہ بڑی جمعیت فراہم کر لی، اور بہت زیادہ قوت حاصل کر لی، اور عین اس وقت جب ہمایوں بنگال کو از سر نو فتح کر کے جشن کامرانی منا رہا تھا، ایک طرف بھائیوں نے آگرہ اور دوآب پر اپنی بادشاہت کا بندوبست کیا، دوسری طرف فرید خاں (شیر شاہ) سارے قنوج تک کے تمام راستوں پر قابض ہو گیا آرے کے قریب ہمایوں کے لشکر میں جنگ ہوئی ہمایوں کا لشکر ہار گیا، (۹۴۶ھ) خود ہمایوں غرق آب ہوتے ہوتے بچا، ہمایوں ابھی آگرہ سے بہت دور تھا کہ شیر شاہ نے آگرہ پر قبضہ کر لیا (۹۴۷ھ) اب ہمایوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ لاہور جائے، لیکن یہاں بھی شیر شاہی لشکر تعاقب کرتا پہنچا، یہاں کے حالات ہمایوں کی آمد سے پہلے ہی کامران مرزا کے سبب مایوس کن تھے،

مزید ستم یہ ہوا کہ خود کامران مرزا دوسرے بھائیوں کے ساتھ شیر شاہ سے مرعوب ہو کر لاہور سے کابل بھاگ گیا، ہمایوں کو اپنے حدود مملکت میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہ دی، سندھ و راجستان کی صحرا نوردی کے زمانہ میں ہمایوں کو خدا نے ایک چاند سا بیٹا — جلال الدین اکبر مرحمت فرمایا (۹۴۹ھ) جو آگے چل کر سورج سے زیادہ چمکا آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر بیچارہ ایران میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا وہاں سے ایک لشکر آیا تو کابل اور بدخشاں کی حکومت بھائیوں سے چھین لی، لیکن انہیں کوئی سزا نہ دی،

شیر شاہ کا دورِ حکومت

شیر شاہ تھا تو ایک معمولی سپاہی لیکن دل و دماغ اور ہمت و حوصلہ

اور تدبیر و فراست کے اعتبار سے وہ نہایت اونچا انسان تھا، اتنی بڑی بادشاہت اس نے بڑی آسانی کے ساتھ ایک مضبوط بادشاہ ——— ہمایوں ——— سے چھین لی اور پھر اس شان و دبدبہ سے حکومت کی کہ اس کے کارناموں کے سامنے ہمایوں کی شخصیت اور اس کے کارنامے ماند پڑ گئے۔

شیر شاہ کی حکومت بنگال سے لے کر پشاور تک تھی، نظم و انتظام ایسا اچھا تھا کہ ہر طرف امن وامان کے آثار دکھائی دیتے تھے، جو جرنیلی سڑک جس کے دورو یہ سایہ دار درخت ہیں، اور جو صوبہ سرحد تک چلی جاتی ہے، شیر شاہ ہی کی بنوائی ہوئی تھی، اس نے بہت سی عمارتیں بنائیں، قلعے تعمیر کئے، مسجدوں کی بنا ڈالی، وہ سہسرام (آرہ۔بہار) کا ایک معمولی افغان زادہ تھا، لیکن بہت جلد وہ شہنشاہ ہند بن گیا، اسے ہمایوں کو شکست دینے کے بعد بھی بہت سے راجاؤں رئیسوں، سرداروں اور امیروں سے کڑائی لڑنی پڑی، ہر جنگ میں وہ کامیاب و کامران رہا، مارواڑ کے راجہ سے اس کی زبردست جنگ ہوئی، اس جنگ کا یہ پہلو خاص طور پر غور طلب ہے کہ دشمن کے کئی ہزار آدمی کام آئے، اور شیر شاہی لشکر کا ایک سپاہی بھی ہلاک نہیں ہوا، کالنجر کا قلعہ بھی ہر اعتبار سے ناقابل تسخیر تھا، لیکن شیر شاہ نے اسے بھی فتح کر لیا (۹۵۲ھ) یہی شیر شاہ کی آخری مہم تھی، ایک حادثہ آتش زدگی کی لپیٹ میں آگیا، اور فتح کی خبر سن کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

سوری کی وفات ہمایوں کی یلغار اور موت

شیر شاہ کے عہد حکومت پر ایک نظر ڈالی جائے تو ماننا پڑے گا، قدرت نے اسے حکمرانی اور فرمانروائی کے لئے پیدا کیا تھا، اس لے اپنی مختصر مدت حیات اور مختصر تردور حکومت میں جو کارنامے انجام دیئے، وہ بہت سے بادشاہ پچاس برس میں بھی انہیں انجام دے پاتے، اس نے نیا بندوبست قائم کیا، وہی تھوڑی سی ترمیم کے بعد دور اکبری میں قائم رہا، اور اب بھی موجود ہے،

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا، لیکن یہ بڑا بدخو، سفاک اور مغرور تھا، نہ یہ پٹھانوں کو خوش رکھ سکا، نہ رعایا کو، امیروں اور سرداروں کو ذلیل کرنا، عزت والوں اور سربلندوں کو برسرعام لوگوں کی نظروں سے گرانا، پست لوگوں کو بلند کرنا، اور بلند لوگوں کو پست، اس کا شعار

بن گیا تھا، ۹۶۱ھ میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کے مرتے ہی سوری خاندان کا دبدبہ ختم ہو گیا، حکومت کے نئے نئے مدعی پیدا ہونے لگے، ہمایوں نے حالات سے فائدہ اٹھایا، بڑی آسانی سے ۹۶۲ھ میں رہتاس کے قلعہ پر قابض ہو گیا۔ پھر لاہور پہنچا، وہاں سے دلی ——— یہیں ہمایوں اپنے کتب خانے کے زینہ سے گر کر وفات پا گیا (۹۶۳ھ) ہمایوں کے مرتے ہی، پھر شورش شروع ہوئی، پٹھانوں کی مدد سے ہیمو بقال نے یکا یک دو آبہ سے بڑھ کر دلی پر قبضہ کر لیا، اور "راجہ بکرما جیت" کا لقب حاصل کر کے حکومت کرنے لگا۔ اکبر کا اتالیق بیرم خاں بڑے غصہ کے ساتھ مقابلہ کے لئے بڑھا، پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں راجہ بکرما جیت قتل ہوا۔ پٹھان تتر بتر ہو گئے۔ اور مغلوں کی سلطنت از سر نو مستحکم ہو گئی، یہ واقعہ ۹۶۴ھ کا ہے!

اکبر کی تخت نشینی اور بیرم خان

اکبر ابھی بالکل نو عمر تھا، کاروبار مملکت ہاتھ میں لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، بیرم خان اس کا اتالیق مقرر ہوا، اور حق یہ ہے کہ بیرم خان نے جس وفاداری، دیانت داری، صداقت اور خلوص کے ساتھ اپنی گراں بار ذمہ داریاں انجام دیں یہ اسی کا حصہ تھا، اس نے کسی قسم کی غلط منفعت نہیں حاصل کی، وہ دوسروں سے اقتدار و اختیار چھینتا رہا، لیکن اپنے لئے نہیں، اپنے آقا زادہ اکبر کے لئے اس نے اپنی زندگی کا مقصد وحید یہ بنا لیا تھا کہ اکبر بالغ ہو کر جب زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے تو اسے ایک ایسی حکومت ملے جو ہر خلفشار سے پاک ہو، ہر طوفان جھیل چکی ہو، رعایا شاد ہو، ملک آباد ہو، خزانہ بھر پور ہو، باغی ختم ہو چکے ہوں، سرکش سرنگوں کئے جا چکے ہوں، دشمن نیست و نابود ہو چکے ہوں، دوستوں، رفیقوں، اطاعت شعاروں اور جاں نثاروں کے جتھے ہر جگہ اپنے بادشاہ والا جاہ کے ایک اشارہ پر اپنا خون بہا دینے کے لئے موجود ہوں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بیرم خان اپنے مقصد جلیل میں ناکام رہا، اس نے جو چاہا وہی ہوا، جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہر نوع کامیاب ہوا!

اکبر سے عالمگیر تک

رُکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

جلال الدین اکبر کا دورِ حکومت اکبر کو ایک بڑی اور وسیع سلطنت ملی تھی، لیکن عجیب حالات میں!

۱- ہمایوں نے ہندوستان کی حکومت ۱۴ سال کی، جلاوطنی کے بعد حاصل تو کر لی تھی، لیکن ابھی وہ اسے مستحکم تسلیم نہ کرنے پایا تھا کہ ایک حادثہ کا شکار ہو کر اس دُنیا سے رخصت ہو گیا،

۲- خود اکبر صرف ۱۴ سال کا لڑکا تھا، اس عمر میں، اور وہ بھی ناخواندہ محض ہونے کی حالت میں اتنا بڑا بار اُٹھانا اس کے لئے ناممکن تھا،

۳- دربار میں اور دربار سے باہر ہر طرف سازشوں کا بازار گرم تھا، کوئی سازش اور بغاوت بھی اگر کامیاب ہوتی، تو یہ حکومت بڑی آسانی سے چھن بھی سکتی تھی۔

۴- اُمرائے دربار میں کئی ایسے تھے، جو "ریجنٹ" بن سکتے تھے، بننا چاہتے تھے، لیکن یہ سوچ کر کہ ریجنٹ حالات کو ساعد کر کے بادشاہ خود بھی بن سکتا ہے، حلقۂ انتخاب تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا،

آخر قرعۂ انتخاب بیرم خاں پر پڑا، اس نے پوری صداقت اور وفاشعاری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے، دوآب کا سارا علاقہ جون پور تک اس نے دشمنوں سے صاف کرایا اور اکبری مملکت کا جز بنا دیا، مالوے کا صوبہ دار خود مختار بادشاہ بن گیا تھا، اس کی سرکوبی کی" اور فتح کرنے کے بعد یہ تحفہ بھی اپنے آقا کے حضور میں پیش کر دیا!

بیرم خاں کا انجام ان کارناموں کے بدلے میں بیرم خاں کو کیا ملا؟

حسد، مخالفت، دشمنی، منافرت، سازش اور غدار بیرم خاں کا جی چاہا کہ مقابلہ میں ڈٹ جائے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، ہجرت کے ارادہ سے سفر کعبہ کا پروگرام بنایا، لیکن راستہ میں چند دشمنوں نے اسے حاجی بننے سے پہلے شہید کر دیا۔

ازبکوں کی شورش

اس مرتبہ ہمایوں کے ساتھ بہت سے ازبک سردار بھی آئے تھے، یہ بڑے جیالے، من چلے، بہادر اور دلیر تھے، مالوے کی مہم بھی انہی سرداروں میں سے ایک عبداللہ خاں ——— نے بیرم کی سربراہی میں سر کی تھی، لیکن جلد ہی اپنی قوت و طاقت کا احساس کرنے کے بعد یہ سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے، تین سال تک یہ آگ بھڑکتی رہی، کبھی شعلہ کی صورت میں، کبھی چنگاری کے رنگ میں، لیکن اکبر اگرچہ ناخواندہ تھا، نوعمر تھا، ناتجربہ کار تھا، مگر بڑا مدبر اور دور اندیش تھا، اس نے ازبکوں کا ہوشیاری کے ساتھ استیصال کر کے (۹۷۲ھ) اس شورش کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

اکبر کی رواداری

ہندوؤں کے ساتھ تخت حکومت پر بیٹھتے ہی اکبر نے رواداری فراخ دلی، عالی حوصلگی اور اخوت و مساوات کا برتاؤ شروع کر دیا، اس نے جزیہ یک قلم معاف کر دیا، گاؤ کشی کے امتناع کا فرمان نافذ کر دیا، ہندو جاتریوں پر جو محصول لگتے تھے وہ یک قلم منسوخ کر دیئے، ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، جے پور کے راجہ نے اس سے اپنی لڑکی بیاہنا چاہی، اکبر نے اسے منظور کر لیا، (سنہ ۹۶۹ھ) اس طرح راجپوتوں اور مغلوں میں رشتہ داریاں بھی شروع ہو گئیں، عالی ولی عہد سلطنت نورالدین جہانگیر اسی راجکماری کے بطن سے تھا، راجکماری کے بھائی بھگوان داس کو امرائے دربار میں بڑی جگہ دی، اس کے بھتیجے مان سنگھ کو منصب اعلیٰ پر فائز کیا، اور کوئی شبہ نہیں کہ ان راجپوت سرداروں نے بھی بادشاہ پرستی، عزیز داری اور رفاقت کا حق ادا کر دیا۔

چتوڑ کے رانا سے لڑائی

لیکن اس فراخ دلانہ برتاؤ کے باوجود اسے بعض ہندو راجاؤں سے محاربات بھی کرنے پڑے اس لئے کہ کھنچی ہوئی تلوار کے مقابلہ میں وہ سر جھکانے کا عادی نہیں تھا!

چتوڑ کے رانا سے اکبر کی عشق: اکبر خود فوج گراں لے کر بڑھا، رانا اودے سنگھ خود تو جنگلوں میں روپوش ہو گیا، اس کا ایک عزیز اور قائم مقام جے مل مقابلہ کو سامنے آیا، کئی مہینے تک یہاں معرکہ آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا، آخر ۹۷۵ھ میں یہ مستحکم ترین قلعہ اکبر نے فتح کر لیا، اکبر نامہ کے بیان کے مطابق ۳۰ ہزار کے قریب نفوس اس معرکہ میں ہلاک یا زخمی ہوئے، اکبر نے یہ ریاست ضبط کر لی، اور اسے اجمیر کے صوبہ کا ایک جزو بنا دیا۔ پھر ۹۷۶ھ میں اکبر نے رنتھمبور کا قلعہ چٹکی بجاتے میں فتح کر لیا! —— ان معرکوں کے بعد ہندوؤں کی طرف سے پھر کسی قسم کی سرکشی ظہور میں نہیں آئی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ سرے سے شورش ہی کا خاتمہ ہو گیا، بغاوتیں اور شورشیں اگر ہندوؤں کی طرف سے نہیں ہوتیں، تو مسلمانوں کی طرف سے ہوتیں اور اکبر نے انہیں کچلنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا:

بنگال و اڑیسہ کے پٹھانوں سے مقابلہ

بنگال میں خاص طور پر بہار و اڑیسہ میں عام طور پر پٹھان موجود تھے، اور یہ اپنی عظمت رفتہ کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے رہتے تھے، بنگال پٹھانوں کا گڑھ بن گیا تھا، یہاں انہوں نے بادشاہت قائم کر لی تھی، اور بڑے طمطراق سے حکومت کر رہے تھے، یوں تو کوئی چھیڑ چھاڑ ہوتی، لیکن ۹۸۲ھ میں اکبر خود ایک بڑی فوج لے کر چلا، راستہ میں اس نے گنگا اور جمنا کے سنگم پر الٰہ آباد تعمیر کرنے کے احکام صادر کئے۔ بنگال کا بادشاہ داؤد خاں، پٹنہ میں آکر قلعہ بند ہو گیا تھا، یہیں رن پڑا، اکبر خود حملہ آور فوج کا نگران تھا، داؤد خاں مقابلہ نہ کر سکے فرار پر قرار کیا، پھر جب اکبری ناظم بنگالہ منعم خاں کا انتقال ہوا، تو پھر داؤد نے سر اٹھایا۔ اور ۹۸۴ھ کے معرکہ میں داؤد کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے، اور بنگال پر مکمل طور سے اکبری حکومت قائم ہو گئی، اور حسین قلی خاں نیا ناظم اطمینان سے حکومت کرنے لگا،

دوسرے فتوحات

۱۔ ۹۸۱ھ میں اکبر نے مالوا پر حملہ کیا، عبداللہ خاں باغی صوبہ دار بھاگ کھڑا ہوا، اکبر نے یہاں کا نیا انتظام کیا

۲۔ ۹۹۴ھ میں اکبر نے مرزا عزیز کوکلتاش کو فوج دے کر احمد نگر فتح کرنے بھیجا، لیکن یہ مہم بغیر کامیابی حاصل کئے واپس گئی، ۱۰۰۳ھ میں اس مرتبہ شہزادہ مراد کو اکبر نے بھیجا اور بڑھتا ہوا احمد نگر

تک پہنچ گیا، لیکن سلطانہ چاند بی بی نے ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ مراد بھی ناکام رہا، البتہ ۱۰۰۵ھ میں برار پر قبضہ کر لیا، ۱۰۰۸ھ میں اکبر مالوا آیا، اور عبدالرحیم خانخاناں کو یہ مورچہ سر کرنے پر مامور کیا، خانخاناں نے خاص جدوجہد کے بعد یہ مرحلہ سر کر لیا، اور احمد نگر کی حکومت سلطنت مغلیہ سے ملحق ہو گئی!

۴۔ ۱۰۰۹ھ میں خاندیس کی آزادی اور خود مختاری بھی ختم ہو گئی، اور یہ علاقہ بھی سلطنت مغلیہ کے ممالک محروسہ میں داخل ہو گیا۔

اکبر کی وفات

۱۰۱۴ھ میں اکبر وفات پا گیا، سکندر لودھی کے "سکندرہ" میں دفن ہوا، شاندار مقبرہ تعمیر ہوا، اکبر نے تقریباً ۵۰ سال حکومت کی، اس میں کمزوریاں بھی تھیں خامیاں بھی تھیں، نقائص بھی تھے لیکن اس میں اچھائیاں بھی تھیں، خوبیاں بھی تھیں حسنات بھی تھے!

مجموعی حیثیت سے اکبر کا عہد شاندار عہد تھا، اس کی شخصیت، بلند تر بیت شخصیت تھی، اس کا کردار، رفیع و اعلیٰ تھا، اس کی سیرت بلند اور بہتر تھی

اکبر نے بڑے نامساعد حالات میں حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تھی، لیکن اس نے تمام دشواریوں پر قابو پا لیا اور اپنے پیچھے ایک ایسی منظم اور مستحکم حکومت چھوڑ گیا، جو مسلمانوں کے فروغ و استحکام میں بہت زیادہ ممد و معاون ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ جس نے ہندوؤں کو بھی وہ نعمتیں دیں، جو اس سے قبل خواب و خیال تھیں، اس نے ہندوستان کی حکومت کو مرکزی حکومت بنا دیا، اور تمام باغیوں اور سرکشوں کا سر کچل دیا، اس نے غیر مسلموں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا کرنے کی کوشش کی، اور وہ کامیاب رہی، اس نے رواداری پر عمل کیا اور غیر مسلموں پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کی، بلکہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، جسے وہ آج تک فراموش نہیں کر سکے ہیں!

اکبر اور مذہب

مذہب کے معاملہ میں اکبر اب تک بدنام ہے، اور شاید ابھی بہت مدت تک بدنام رہے گا، لیکن اگر اس عہد کی تاریخ علماء کی ذہنیت اور غلط قسم کی مذہبیت کا جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا، خالص مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اکبر اتنا برا نہیں ہے جتنا سمجھا جا رہا ہے! ——— اور اگر ہے بھی تو اس کی ذمہ داری اس کی عظمت، الحاد دوستی اور مذہب پر لادینی پر اتنی

نہیں ہے جتنی خود علمائے کرام کی ——— جس طرح ترک بڑے کٹر مذہبی تھے اور مذہب کی عزت و حرمت پر کٹ مرنا اپنا فخر اور شعار سمجھتے تھے، لیکن علماء اور صوفیا نے متصوفین نے انہیں مذہب سے آشنا برگشتہ کر دیا کہ وہ عام طور پر لامذہب سمجھے جانے لگے، یہی حالت اکبر کی تھی:

۱- اکبر شروع میں بڑا دیندار اور مذہبی انسان تھا، مسجد کی جاروب کشی تک میں تامل نہیں کرتا تھا۔ علماء کا اس درجہ احترام کرتا تھا کہ ملا عبدالنبی، صدر الصدور امور مذہبی نے ایک مرتبہ اسے زعفرانی رنگ کے لباس میں ملبوس دیکھا تو طمانچہ مار دیا، اور وہ شخص جس نے رانا سانگا جیسے جری اور دلیر دشمن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، یہ طمانچہ کھا کر خاموش ہو گیا،

۲- جملہ مذہبی معاملات اس نے ملا عبدالنبی اور مخدوم الملک شیخ الاسلام مولانا عبداللہ سلطان پوری کے حوالے کر دیئے تھے، ان کے کسی معاملہ میں مداخلت نہیں کرتا تھا، انہیں مکمل آزادی دے رکھی تھی۔

۳- ان حضرات نے اس اقتدار سے فائدہ نہیں اٹھایا، ذرا ذرا سی بات پر تعدی اور دست درازی کے مظاہرے کئے، جانچ کی گئی تو مولانا عبداللہ خائن ثابت ہوئے، ملا عبدالنبی خائن تو نہیں ثابت ہو سکے لیکن انہوں نے بھی اقتدار کا اتنا غلط فائدہ اٹھایا کہ اکبر کا دل کھٹا ہو گیا،

۴- اکبر کو مناظروں کا شوق تھا، ان مناظروں میں اکبر نے دیکھا کہ یہ علمائے کرام بال کی کھال نکالنے میں کمال رکھتے ہیں، لیکن اصل نکتہ سے بہک جاتے ہیں، تنگ دل اور تنگ نظر بھی ہیں، ذرا ذرا سی بات پر کفر کے فتوے، اور تعزیر کے ڈنڈے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور تعدی شروع کر دیتے ہیں،

۵- اتفاق سے اکبر کو فیضی اور ابوالفضل جیسے لوگ ہاتھ آ گئے، جو بلا کے ذہین اور انتہا قابل علوم معقول و منقول کے جامع، ادب و انشا کے امام اور فلسفہ و منطق کے استاد تھے ان دونوں بھائیوں نے اکبر کو اور رسان پر چڑھایا، اس کے عقائد میں تزلزل پیدا کیا، اسے علماء سے متنفر کر دیا،

۶- نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکبر جو مسجد میں جھاڑو دیتا تھا، آگرہ سے اجمیر تک پا پیادہ سفر کرتا تھا، حضرت شیخ سلیم کے اسم گرامی پر اپنے ولی عہد جہانگیر کا نام سلیم رکھتا تھا، خود ہی ایک نئے دین کا بانی بن گیا اور اس طرح اس نے اپنی اس ذہنی کوفت کو تسکین دی جو غلط قسم کے علماء نے پیدا کر دی تھی۔

ہ۔ پھر بھی نہ یہ دین چلا نہ اس نے دین چلانے کی کوئی خاص جد و جہد کی، بلکہ رفتہ رفتہ اس خیال سے دستبردار ہو گیا،

۔ جہانگیر نے ابوالفضل کو جو کہ سارے فتنہ کا بانی مبانی تھا مروا دیا، اور جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد اکبر کے مذہبی خیالات درست ہو گئے تھے، اور وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا۔

جہانگیر کے اس قول کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے اپنے مذہبی انقلابات کے کسی دور میں بھی نہ عامۂ مسلمین کے عقائد و خیالات سے تعرض کیا، نہ ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالا، نہ کبھی اسلام سے بے تعلقی کا اعلان کیا، بلکہ ایک مسلمان کی طرح وہ تمام رسوم بجالاتا رہا، جو مسلمانوں کے شعائر میں داخل ہیں،

نورالدین جہانگیر کا دورِ مملکت

بظاہر اکبر کے بعد اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ اس کا بڑا بیٹا اور ولی عہد سلطنت مالک تاج و نگین ہو سکے گا، شراب خوب پیتا تھا، بے اعتدالیوں کا شروع ہی سے بادشاہ تھا، رند مشرب بھی تھا، طبیعت میں بغاوت کے عناصر بھی تھے، ایک دفعہ باپ کے مقابلہ کو آمادہ ہو گیا پھر باپ اور بیٹے میں ایسی جدائی ہوئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا، اب یہ کبھی نہیں مل سکیں گے، اکبر کی حالت بھی یہ تھی کہ وہ جہانگیر سے ناراض رہتا تھا، خاص طور پر ابوالفضل کے قتل سے وہ بہت برہم اور متاثر رہتا تھا، اس نے اپنے پوتے یعنی جہانگیر کے بیٹے خسرو کو اپنے پاس رکھا، اسے بہت چاہنے لگا، درباروالوں کی کوشش یہ تھی کہ خسرو ولی عہد سلطنت قرار دیا جائے، خسرو راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا، مرزا عزیز کوکلتاش کا داماد تھا، ہر طرح سے دربار میں اس کے موافق حالات تھے، لیکن عجیب بات تھی کہ ان نالائقیوں کے باوجود اکبر کو جہانگیر سے عشق تھا، وہ اس سے بے تابانہ محبت کرتا تھا، جب وہ بستر مرگ پر دراز تھا، جہانگیر آیا، باپ کے قدموں سے لپٹ گیا، اکبر نے اسے کلیجہ سے لگا لیا، اپنے سامنے تاج شہریاری پہنایا، آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے، لبوں پر دبیدنی زانہ کا تبسم تھا، اسی حالت میں وہ اس جہان فانی سے گزر

گیا، جو لوگ خسرو کی آس لگائے بیٹھے تھے، وہ منہ دیکھتے رہ گئے،

جہانگیر کے صفات و ملکات

جہانگیر کو خدا نے عجیب صفات دیئے تھے، وہ رند الست تھا ہر وقت شراب کے نشہ میں دھت رہتا تھا، وہ عاشق بیتاب تھا، نور جہاں اس کے دل پر حکومت کرتی تھی، بقول مولانا شبلی اس کی جبین پیشانی :

جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن !

وہ مناظر قدرت کا دلدادہ تھا، کشمیر کو کشمیر اسی نے بنایا تھا، اتفاقیات پر تذلل رہ پڑتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ مستعد، فرض شناس اور اولوالعزم بھی بلا کا تھا، جہاں رزم کا وقت آیا اس نے بزم کی بساط الٹی، شراب کا پیالہ پھینکا، نور جہاں سے منہ موڑا، گھوڑے پر بیٹھا، اور ایک سورما کی طرح میدان میں پہنچ گیا۔ اور جب تک معرکہ سر نہ کر لیا نہ شراب و کباب سے تعلق رکھا، نہ مہوشان گلفام، نغمہ و موسیقی اور عیش و طرب سے، یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ رند لاابالی تھا، لیکن استحکام و وقار میں اس کی حکومت پیشرو سے کسی طرح کم نہیں تھی، زوال قریب بھی نہیں آنے پایا، اور اقبال و عروج کا چتر برابر سایہ فگن رہا !

چتوڑ کی اطاعت

یہ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں کہ چتوڑ کا مہارانا کتنا سرکش تھا، اکبر نے اس کے زور کو توڑا، چتوڑ کو فتح کر لیا، اور اسے اجمیر کا ایک حصہ بنا دیا، لیکن یہاں کا مہارانا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا، اس کی سرکشی اب بھی قائم تھی، مغلیہ فوجیں جب تاخت و تاراج کر کے واپس چلی جاتی تھیں، یہ جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں سے نکل آتا تھا، جب وہ پھر سرکوبی کے لئے پہنچتی تھیں، تو یہ پھر جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں چھپ جاتا تھا، جہانگیر نے فیصلہ کیا یہ صورت حال ختم ہونی چاہیئے؛ چنانچہ اس نے اپنے ولی عہد شہزادہ خرم شاہجہاں کو اس مہم پر مامور کیا۔ وہ گیا اور اس خوبی سے اس نے ناکہ بندی کی کہ آخر رانا کو ہتھیار ڈال دینے پڑے اور اس نے باقاعدہ اطاعت کا اعلان کر دیا (۱۰۲۳ھ) جہانگیر نے چتوڑ کے مہارانا کو واپس کر دیا، اور پنج ہزاری منصب پر فائز کیا گیا، پھر وہ تا زندگی مغل حکومت کا باج گذار رہا اور کوئی سرکشی

اس سے ظہور میں نہیں آئی، بلکہ دکن کی مہمات میں اپنے سواروں کے ساتھ وہ ہمیں مغل افواج کا ہم رکاب نظر آتا ہے۔ اس واقعہ نے جہانگیر کی منزلت میں اضافہ کر دیا۔

قلعہ کانگڑہ کی مسجد

ایک مصیبت یہ تھی کہ ہندو راجاؤں اور مہاراجوں کے جو مقامات دور دراز یا دشوار گذار مقامات پر واقع تھے وہ شکست کھا کر اطاعت کا وعدہ کر لیتے تھے مغل افواج کے جانے کے بعد پھر سرکشی پر اتر آتے تھے، رن تھن بور، چتوڑ، کالنجر وغیرہ کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں، یہی حال کانگڑہ کا تھا، کانگڑہ عہد اکبری میں فتح ہو چکا تھا، لیکن عہد جہانگیری میں وہ پھر سرکش اور باغی نظر آتا ہے، جہانگیر اس بات کو برداشت نہ کر سکا، اس نے کانگڑہ کا محاصرہ کر لینے کا حکم دیا، اور جب تک وہ فتح نہیں ہو گیا، وہ چین سے نہیں بیٹھا، کانگڑہ فتح ہو جانے کے بعد جہانگیر وہاں کے قلعہ میں داخل ہوتا، اور وہاں ایک مسجد کی بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھی (۱۰۳۰ھ)

ملک عنبر حبشی پر جہانگیر کا بھرپور وار

گذشتہ اوراق میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عہد اکبری میں احمد نگر فتح کر لیا گیا تھا اور باقاعدہ مغل حکومت کے ماتحت ہو گیا تھا، لیکن یہاں مغلوں نے جو زیادتیاں کی تھیں وہ رنگ لائے بغیر نہ رہیں، چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہاں مرتضیٰ نظام شاہ نے مسند شاہی پر قدم رکھا اور ایک حبشی غلام ملک عنبر نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی، ملک عنبر میں بہت سی صلاحیتیں تھیں، اگر حالات سازگار ہوتے، اور قسمت یاور ہوتی تو ممکن تھا متحدہ دکن کا بادشاہ بن جاتا، اس نے پہلے طے کر لیا کہ اس علاقہ سے ہر قیمت پر مغلوں کو نکالنا ہے، چنانچہ اس نے گوریلا لڑائی کا فن ایجاد کیا مرہٹوں کو سب سے پہلے اس نے فوج میں بھرتی کر کے بعد میں ان کے اندر حکومت کرنے کا جذبہ پیدا کریں اس کے گوریلا دستے کھلے میدان میں باقاعدہ مسلح اور منظم مغل افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، لیکن رسد پر چھاپے مار کر خزانہ لوٹ کر بے خبر شہریوں پر تاخت و تاراج کر کے افواج شاہی پر یکا یک عالم بے خبری میں بھرپور وار کر کے بھاگ کھڑے ہوتے تھے، یہاں کا صوبہ دار عبدالرحیم

خانخاناں تھا، وہ ان چھاپہ مار لڑائیوں کا مقابلہ نہ کر سکا، ہٹ کر برہان پور چلا آیا۔ اور احمد نگر پر نظام شاہی حکومت قائم ہو گئی (۱۰۱۸ھ)۔

جہانگیر کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی، وہ بہت برہم ہوا، اس نے شہزادہ پرویز کو ایک نئی فوج دے کر یہ مہم سر کرنے کے لئے بھیجا، راجہ مان سنگھ برار سے ایک لشکر لے کر اس کی مدد کو چلا، گجرات سے عبداللہ خاں کمک کے لئے بڑھا، لیکن عنبر کے گوریلا دستوں کا سدباب یہ لوگ بھی نہ کر سکے۔

اب جہانگیر کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا، وہ خود آگرہ سے نکل کر مالوہ آیا اور یہاں سے شہزادہ خرم کو ایک فوج دے کر مہم سر کرنے کے لئے بھیجا، خانخاناں کو بھی حکم دیا کہ شریک مہم رہے، خرم (شاہجہان) بڑا زیرک تھا، وہ جس طرح چتوڑ کے رانا کو بے بس کرنے اور اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر چکا تھا، اسی طرح یہاں بھی اس نے ایسی چال چلی کہ ملک عنبر کے گوریلا دستے بیکار محض ہو کر رہ گئے، اس نے مسلح سپاہیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں دور دور تک پھیلا دیں، ہر ناکے پر انہیں پہرہ دینے پر مامور کر دیا، ہر گھاٹی میں بھیج دیا، اور حکم دیا کہ عنبر کے آدمی جہاں ملیں انہیں موت کے گھاٹ اتار دو، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گوریلا دستے بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعوں میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے، اب مغل فوجیں ترتیب و تنظیم کے ساتھ قلعہ شکن آلات سے مسلح ہو کر بڑھیں اور انہوں نے بہت جلد ملک عنبر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، باپ کی اجازت سے خرم نے امان دی، اور کامیاب و کامران وہاں سے ہٹ آیا (۱۰۲۶ھ)، ملک عنبر نے اس جنگ میں احمد نگر اور اضلاع شمالی سے دستبرداری اختیار کر لی، ۱۰۳۵ھ میں جب اس نے وفات پائی تو صرف چند ضلعے دولت آباد، جنیر اور ناسک وغیرہ رہ گئے تھے، عنبر کے بیٹے فتح خاں نے دیکھا کہ یہ بوجھ سنبھل نہیں سکتا تو اس نے ۱۰۴۰ھ میں مغلوں کی باقاعدہ اطاعت مکمل طور پر قبول کر لی، اور ۱۰۴۲ھ میں ہم دیکھتے ہیں کہ نظام شاہی حکومت ہی معدوم ہو گئی۔

نظام شاہی حکومت

نظام شاہی حکومت کا بانی احمد نظام شاہ تھا، یہ حکومت ۸۹۶ھ میں عالم وجود میں آئی تھی، صرف ڈیڑھ سو برس کی عمر پائی، ۱۰۴۲ھ

میں باہمی منافرت، خانہ جنگی اور مغل دباؤ کے سامنے بے بس ہو کر موت کی دعوت کو لبیک کہنے پر مجبور ہو گئی، اگر ملک عنبر اس حکومت کو نیا خون دے کر کچھ دن اور زندہ نہ رکھتا تو شاید یہ اب سے بہت پہلے اپنی انفرادیت اور زندگی سے محروم ہو چکی ہوتی،

جہانگیر کی وفات

۱۰۳۷ھ میں کشمیر کے راستہ سے واپس آتے ہوتے لاہور میں جہانگیر کا مرض دمہ میں انتقال ہو گیا، شہزادہ خرم کے اتنے وقیع کارنامے لوگوں کے سامنے تھے کہ دراندازوں کی ایک نہ چلی، وہ اگرچہ آگرہ سے دور تھا لیکن بلوایا گیا، اور تخت حکومت پر باطمینان متمکن ہو گیا، احتیاطاً شہریار اور دوسرے بھائی جو رقیب یا حریف بن سکتے تھے قتل کر دیئے گئے، تاکہ کوئی کانٹا باقی نہ رہے۔

شاہجہان تخت حکومت پر

شاہجہان ۱۰۳۷ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا، اور ۱۰۶۸ھ میں سعادت مند بیٹے کے ہاتھوں معزول اور نظر بند ہوا۔

اس تیس اکتیس سال کی مدت کا اگر جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا، شاہجہان (خاندانی نام شہاب الدین) عجیب وغریب ذہنی اور دماغی صلاحیتیں اس کی ولی عہدی کے زمانہ ہی سے اجاگر ہو چکی تھیں، تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد ان میں اور زیادہ جلا اور صیقل پیدا ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے، قدرت بھی شاہجہان پر بہت مہربان تھی!

شاہجہان کی برکت

شاہجہان کے عہد میں بھارت جتنا خوشحال، دولتمند، سرسبز اور شاد کام نظر آتا ہے، اس سے پہلے اور بعد کبھی نظر نہیں آتا، دنیا جہان کی دولت بھارت کی طرف کھنچ رہی تھی، ممالک غیر (فرنگستان وغیرہ) کے لوگ سونا اور چاندی کے ذخیرے لاتے تھے، یہ ذخیرے یہاں کے باشندوں کو سونپ کر مال تجارت لے کر واپس جاتے تھے، اس افراط زر نے یہاں کے لوگوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا،

اس خوشگوار صورت حالات سے شاہجہان نے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس نے اس ملک کو نئے نئے باغوں عمارتوں قلعوں شہروں مقبروں اور مسجدوں سے پاٹ دیا، وہ جہاں گیا اپنی یادگار اس

نے ضرور قائم کی موجودہ دلی اس کی آبادی ہوئی ہے جس طرح آگرہ اکبر کے سبب "اکبر آباد" کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح یہ نئی دلی شاہجہان آباد کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ بہت بڑا اور نیا شہر شاہجہان اعظم کی حوصلہ مندیوں کا ایسا ثبوت ہے جو آج تک موجود ہے اور رہتی دنیا تک موجود رہے گا۔

شاہجہانی تعمیرات

یوں تو شاہجہان نے بہت سی مسجدیں بنوائیں جو اپنی سنگینی، مضبوطی، استحکام پائیداری، نفاست اور خوب صورتی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں لیکن دلی کی مسجد جامع اس کے ذوق تعمیر کا شاہکار ہے، اسے اگر عروس المساجد کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

قلعے بھی شاہجہانی دور میں بہت سے تعمیر ہوئے، لیکن لال قلعہ جہاں اپنی نزاکت کے اعتبار سے تختہ گل نظر آتا ہے تو اپنی سنگینی اور استحکام کے لحاظ سے وہ کوہ مرتبت بھی ہے، اس قلعہ کی موتی مسجد اور دوسرے محلات و قصور، تاریخ میں اپنا مقام خاص رکھتے ہیں، اجمیر میں شاہجہان نے مسجد بنوائی، سندھ کے ٹھٹھہ میں بھی اور دوسرے مقامات میں بھی، غرض اس نے ہندوستان کے چپہ چپہ پر اپنے نقوش قائم کر دیئے۔ اشوک صرف اتنا کر سکا تھا کہ جگہ بہ جگہ اس نے لاٹ نصب کر دیئے تھے، یہی اس کی عظمت کا ثبوت مانے جاتے ہیں، لیکن شاہجہان کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس نے لاٹ نہیں، اس سرزمین پر ان گنت باغ، قلعے، شہر، مسجدیں اور مقبرے کھڑے کر دیئے، جن کی عظمت و جلال کے سامنے آج بھی آسمان خم ہوتا ہے اور زمین فخر کرتی ہے۔

روضۂ تاج گنج

شاہجہان کو اپنی بیوی ارجمند بانو سے محبت نہیں عشق تھا، یہ نورجہاں کی بھانجی اور اعتماد الدولہ کی بیٹی تھی، حسن صورت میں لاجواب حسن سیرت میں بے نظیر شاہجہان حقیقی معنوں میں شاہجہان تھا، دنیا کا حسن اس کے قدموں پر لوٹتا تھا، لیکن اس نے ارجمند بانو سے جو پیمان وفا باندھا تھا، اسے زندگی کی آخری سانس تک نباہا۔ ارجمند بانو خوش قسمت تھی کہ شوہر کے زانو پر سر رکھ کر عالم جاوداں کو سدھاری، شوہر نے بیوی کو زندہ جاوید کرنے کے لئے روضۂ تاج گنج تعمیر کیا ——— خالص سنگ مرمر کی جنت! اس روضہ کا شمار دنیا کے ہفت عجائبات میں

ہوتا ہے۔ دور دراز مقامات سے سیاح آتے ہیں اور اسے عقیدت و عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں، تاج محل بنا کر شاہجہان نے ارجمند بانو کو بھی زندہ جاوید کر دیا، اور خود بھی زندہ جاوید بن گیا۔ ایسی لازوال محبت کی مثالیں دنیا نے کم دیکھی ہوں گی، کابل میں محمود غزنوی اور بابر کا مقبرہ ہے، اور کوئی شبہ نہیں عظیم الشان ہے، سکندرہ میں اکبر کا، دلی میں ہمایوں کا، لاہور میں جہانگیر کا، آگرہ میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ موجود ہے، اور بلاشبہ یہ مقبرے دنیائے تعمیرات میں اپنا جواب آپ ہیں، لیکن تاج گنج کا مقبرہ ان سب میں یکتا ہے، انہی سب میں نہیں دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

خصوصیات شاہجہانی

عہد شاہجہانی کی برکت اور شاہجہان کے حسن نیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس دور میں رعایا فارغ البالی اور معاشی اعتبار سے ہر طرح مطمئن اور آسودہ حال تھی، دوسری طرف شاہجہان تعمیرات پر اور داد و دہش پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا، پھر بھی جب تخت حکومت سے اتر کر وہ اکبر کے قلعہ میں نظربند و محبوس ہوا، تو حالت یہ تھی کہ کروڑوں روپیہ کے ملبوسات، زیورات، جواہرات اور نادرۂ روزگار تخت طاؤس کے علاوہ خزانہ شاہی میں ۲۴ کروڑ روپیہ نقد موجود تھا، اور ۱۶ کروڑ کی مالیت کا سونا چاندی! ——— یہاں اس امر کو ذہن نشین رکھیئے کہ عہد شاہجہان کا روپیہ اپنی قوت خرید کے لحاظ سے پاکستانی روپیہ سے بیس گنا زیادہ تھا ——— پھر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اتنا زر نقد کبھی کسی بادشاہ نے نہیں چھوڑا، تو کیا یہ مبالغہ ہوگا؟

شاہجہان کا کردار

یہ نہ سمجھنا چاہیئے، شاہجہان صرف ایک خوش ذوق اور شاعر مزاج فرماں روا تھا۔ وہ خوش ذوق بھی، شاعر مزاج بھی تھا، قدرت کی فیاضیوں سے تمتع حاصل کرنا بھی جانتا تھا، ساتھ ہی ساتھ جیالا اور دلیر بھی تھا، مدبر اور دوراندیش بھی تھا، میدان رزم کا سورما، اور دھن کا دھنی بھی تھا، اس نے شاہزادگی کے زمانہ میں جو کارنامے انجام دیئے تھے، وہ اس کی عظمت و بزرگی کا کافی ثبوت ہیں، پھر تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد، اس نے جو مہمیں کابل بدخشاں تک کی رچیں کا ذکر ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں، وہ اس کی جنگی مہارت اور فراست کا ناقابل تردید

ثبوت ہیں!

مہمات دکن دکن مغلیہ سلطنت کے لئے ایک مستقل درد سر بن گیا تھا لیکن مغلوں نے بھی پورے عزم واستقلال کے ساتھ اس درد سر کو رفع کرنے کا اور اس پر غالب آنے کا تہیہ کر لیا تھا!

۱۰۴۰ھ میں دربار شاہجہانی کا ایک امیر کبیر خان جہاں لودھی' بادشاہ کے عتاب کا شکار رہتا، عتاب سے بچنے کے لئے اپنی پوری سپاہ و جمعیت لے کر وہ دکن پہنچ گیا، دکن کے مفسدہ پردازوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی، وہ مغلوں سے برسر پرخاش تھے ہی، اب انہیں اپنے ذرائع ووسائل اور سپاہ لشکر اور ساز وسامان کے علاوہ ایک منجھا ہوا سردار ایک باضابطہ فوج ہاتھ آگئی تھی، گھی کے چراغ جلنے لگے، اور مغلوں کا چراغ اقبال جھلملانے لگا،

شاہجہان کب خاموش بیٹھ سکتا تھا، وہ آگرہ سے اٹھا، اور ایک فوج لے کر برہان پور آن کی آن میں پہنچ گیا، یہ کسی کو وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ خود شاہجہاں سرکوبی کے لئے پہنچے گا، لیکن جب یہ واقعہ حقیقت کی صورت میں نمودار ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، جو لڑنے اور شکست دینے کا پروگرام بنا رہے تھے، وہ راہ فرار تلاش کرنے لگے، خود خان جہاں شمال کی طرف بھاگا، مغل سپاہ نے تعاقب کیا، اور کالنجر کے قریب گھیر کر مار لیا (۱۰۴۰ھ) اب شاہجہان کو یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی وہ واپس چلا گیا،

شاہجہان کے جانے کے بعد ایک نیا دشمن ابھرا، یہ ساہو تھا، سیواجی کا باپ بیجاپور کی مسلمان حکومت اس کی پشت پناہی کر رہی تھی، دکن کی دوسری اسلامی ریاستیں بھی اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کر رہی تھیں!

شاہجہان بپھر اٹھا، اور سر پر آن کی آن میں پہنچ گیا ---------- اس نے بیجاپور کا بُد قلع قمع کر دیا - اور گول کنڈہ کو بھی خراج گذار بنا لیا (۱۰۴۵ھ) یہ سب کچھ تو تیزی اور مستعدی کے ساتھ ہوا کہ دشمنوں اور باغیوں کے حوصلے پست ہو گئے، مغل حکومت کی سطوت اور شوکت میں

اضافہ ہوگیا، شاہجہان اعظم کی عظمت اور منزلت میں چار چاند لگ گئے!

شاہجہان نے دکن کو چار صوبوں میں تقسیم کیا ——

۱۔ خاندیس،

۲۔ برار

۳۔ دولت آباد —— اور

۴۔ تلنگانہ!

ان ولایات کا ناظم اعلیٰ، اورنگ زیب کو بنایا، اور خود واپس چلا آیا!

شاہجہان کی اولاد

شاہجہان کے چار بیٹے تھے، چاروں ایک ہی ماں ارجمند بانو کے بطن سے تھے

۱۔ دارا شکوہ،

۲۔ شہزادہ شجاع

۳۔ اورنگ عالمگیر

۴۔ مراد بخش،

یہ چاروں اگرچہ بہادر امیر، صاحب علم و قلم اور صفات شاہی کے حامل تھے، لیکن چاروں میں ان بن رہتی تھی، چاروں کا مزاج جداگانہ تھا، سیاست کے جوڑ توڑ میں ہر ایک دوسرے سے بازی لیجانا چاہتا تھا —— اورنگ زیب چاروں میں سب سے زیادہ مستقل مزاج بہادر، سیاست داں اور صاحب عزم و تدبیر تھا، وہ میدان جنگ میں نماز پڑھتا تھا، مست ہاتھی سے لڑ جاتا تھا، یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتا تھا، لیکن مستقبل کی فکر سے غافل نہیں رہتا تھا اور نہ چپ و راست اور پس و پیش سے غافل رہتا تھا،

عالمگیر کا دور صوبہ داری

عالمگیر میں حکومت کرنے کی خداداد صلاحیت تھی، دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں ایک طرف اسنے نظم و انتظام درست کیا، باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کی، دوسری طرف رعایا کی فلاح اصلاح سے بھی غافل نہیں رہا، اس لئے دور دور

مقامات سے غلہ منگایا، اور سستے داموں فروخت کیا، بیج دیئے کہ کسان بوئیں اور اگائیں، تقاوی تقسیم کی کہ جو دشواریاں زراعت اور خلافت کے راستے میں حائل ہوں انہیں دور کریں، بارش بھی وقت پر ہونے لگی، کھیت لہلہانے لگے، سبزۂ خود رو اپنی بہار دکھانے لگا، مزروعہ اراضی کی پیمائش ہوئی، جمع بندی کی گئی، لوگوں کو روزگار ملنے لگا، آسودہ حالی بڑھنے لگی، خوش حالی میں اضافہ ہونے لگا، بد دلی دور ہوگئی، یکسوئی پیدا ہوگئی، نئی نئی بستیاں بسنے لگیں، خود اورنگ آباد بنا گیا! ———
جو اپنی صفائی آرائش و زیبائش کے عمارات و محلات کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہوگیا!

بھائیوں میں کشمکش عالمگیر کا تخت پر قبضہ

اورنگ زیب اگرچہ پایۂ تخت سے دور تھا، لیکن دلی اور اورنگ آباد میں جو سیاست چل رہی تھی، اس کے زور و شور میں کوئی فرق نہیں آیا، بھائیوں کی رقابت دشمنوں کی عداوت سے زیادہ خوفناک بن گئی تھی، اور اورنگ زیب کی عسکری کامیابیاں انہی رقابتوں کے باعث ناکامیوں میں بدل گئیں، ۱۰۶۷ھ تک یہ اندرونی کشمکش جاری رہی، اسی سال شاہجہاں بیمار پڑا اور بے صبر شاہزادوں میں جنگ زرگری شروع ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں اگرچہ شاہجہاں تندرست ہوگیا، لیکن حصول شاہی کی جنگ پر کوئی اثر نہ پڑا، اصل معرکہ داراشکوہ اور اورنگ زیب میں تھا، داراشکوہ ہار گیا، اورنگ زیب جیت گیا، باپ کو قلعہ میں نظر بند کیا، اور اس کی زندگی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، ۱۰۶۸ھ کے لپیٹ میں شکست خوردہ بھائی داراشکوہ اور رفیق کار بھائی مراد بخش دونوں کو ہلاک کر دیا، تیسرا بھائی شجاع ہاتھ نہ آیا، اراکان کی پہاڑیوں میں ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کی کوئی خیر خبر نہ معلوم ہوئی، اگر وہ خاندان خلافت کا کوئی فرد ہوتا تو شاید اب تک امت اس کا انتظار کرتی، لیکن وہ ایک بادشاہ خاندان کا فرد تھا، کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے یقین کر لیا، اس جہان سے گزر گیا،

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

اراکان کی پہاڑیاں ہوں یا لال قلعہ کا پھاٹک، جب دونوں جگہ سر پھوٹ سکتا ہے تو پھر ترجیح کا سوال ہی

نہیں پیدا ہوتا، باپ کو نظر بند اور بھائیوں کو قتل کر کے عالمگیر ہر طرف سے مطمئن ہوگیا، اور یکسو ہو کر بادشاہت کرنے لگا، داراشکوہ کے دونوں بیٹوں سے اپنی لڑکیوں کی شادی کی، اور چاروں کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔

عہد عالمگیری

صاف اور سچی بات یہ ہے کہ عالمگیر کی داراشکوہ سے جنگ قطعاً مذہبی نہ تھی، خالص سیاسی تھی، اسلامی حکومت کو اکبر اور جہانگیر سے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔ تو داراشکوہ سے بھی نہیں پہنچ سکتا تھا، بلکہ داراشکوہ چونکہ اکبر سے زیادہ تعلیم یافتہ، نکتہ ور، اور صاحب فہم و فراست تھا، اس لئے ممکن تھا اس کا عہد اکبر سے زیادہ کامیاب ہوتا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دارا اور عالمگیر میں مذہبی دشمنی تھی، وہ غلط کہتے ہیں، دشمنی ضرور تھی، لیکن محض ذاتی، خالص سیاسی اور سراسر "جنگِ زرگری"! ہمارے اس دعوے کا ثبوت ان مکاتیب سے ملتا ہے، جو دکن سے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں عالمگیر نے باپ اور بہن کو لکھے تھے، ان میں دارا کی سخت گستاخانہ شکایتیں ہیں، لیکن کہیں اس کے مذہبی اطوار زیر بحث نہیں لائے گئے ہیں، پھر آخر میں جب شاہجہان کو دارا کی طرفداری کے الزام میں عالمگیر نے نظر بند کیا، تب بھی نہ باپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ایک ملحد و زندیق کی طرفداری کرتا ہے، نہ بھائی کو یہ الزام دیا کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہے، دونوں بھائی حکومت کے لئے لڑ رہے تھے، جو جیت گیا اس نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی،

عالمگیر کے اقدامات مذہب کی روشنی میں

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی نظر میں رکھنی چاہیئے،

عالمگیر کے متعلق سب کو تسلیم ہے، وہ بڑا دیندار اور مذہبی آدمی تھا، صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا، مذہب اس کا اوڑھنا بچھونا تھا، ہم اس دعوے سے اختلاف نہیں کرتے اسے تسلیم کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس قدر مذہبی ہونے کے باوجود کہ فاسق بھائی کی حمایت کے جرم میں باپ کو نظر بند کر دیا، اور فاسق بھائی کی گردن اڑا دی، لیکن اس کی حکومت خالص شخصی حکومت تھی کسی معنٰی میں بھی اسلامی حکومت نہیں تھی، چند غیر مذہبی مراسم کو بند کر دینے اور چند غیر مذہبی محاصل

منسوخ کر دینے سے اسلامی حکومت نہ قائم ہوتی ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ فتاوائے عالمگیری اس کا ایک کارنامہ ہے، اور کارنامہ کو ہم عزت اور قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن یہ خالص علمی کام تھا اسلامی حکومت کسی کتاب کے ترتیب و تدوین سے عمل میں نہیں آیا کرتی، عہد عالمگیری کے قوانین و ضوابط ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں بھی وہ "اسلامیت" نظر نہیں آتی جو ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری اور لابدی ہے، جو بادشاہ مذہب کے احترام میں بھائی کی گردن اڑادے اور باپ کو قید کر لے، وہ برسر اقتدار اور برسر حکومت ہونے کے بعد اسلامی حکومت قائم کرنے سے کیوں قاصر رہا؟ — اس کا جواب ہمارے ذمہ نہیں، ان اصحاب کے ذمہ ہے، جو اس کی مذہبیت کو ہر الزام کے مقابلہ میں شفیع بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، ہندوؤں پر جزیہ لگانا اور دکن کی مفسد حکومتوں کو ختم کر دینا ایک اچھا کام تھا، لیکن صرف یہ دونوں کام اسلامی حکومت کے کفیل نہیں ہو سکتے، انہیں کسی طرح بھی اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی، ایک خاص نکتہ اور غور طلب ہے:

اکبر جیسے لامذہب شخص کے دور میں بھی ہمیں مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی جیسے اصحاب نظر آتے ہیں جو امور مذہبی کے سرکاری طور پر انچارج تھے، ان معاملات کو انجام دینے کے لئے انہیں حسب ضرورت عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے، خزانہ کا ایک حصہ بھی ان کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ مصارف معلومہ میں اسے خرچ کرنے کے مجاز تھے، گویا من حیث الجماعت علماء برسر اقتدار تھے،

علما کی حیثیت عہد عالمگیری میں

لیکن عالمگیر کے عہد میں ہمیں علما کی کوئی تنظیم نظر نہیں آتی! —— کوئی عالم ایسا نظر نہیں آتا، جو سرکاری طور پر امور مذہبی کا انچارج ہو، یہ صحیح ہے کہ حسب مرضی وہ علمائے سے صلاح و مشورہ کر لیا تھا، لیکن علما کی رائے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی، یہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا بلکہ:

" ملک شخص واحد ہی کی ملکیت سمجھا جاتا تھا، اسی بنیاد پر عالمگیر نے اپنی مقبوضہ سلطنت کو اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا، قوانین و احکام کے نفاذ میں

علمائے اسلام سے برابر مشورہ کرتا رہا : لیکن ان کی کوئی باقاعدہ اور صاحب اختیار جماعت نہ تھی ۔ کلی اقتدار کا مالک بادشاہ وقت ہی مانا جاتا تھا ، عوام اور علما کو قوت و ہمت بلکہ نیت ہی نہ ہوتی تھی کہ اپنے حقوق منوائیں اور ملکی معاملات میں حصہ لینے کی کوشش کریں !

(تاریخ پاکستان و بھارت صفحہ ۵۶۸)

یہ ایک بالغ نظر مورخ اور وقائع نویس کی رائے ہے ، اور واقعات و حقائق کی بنا پر ہم اس رائے کی تائید پر مجبور ہیں ، اس سے اختلاف کی کوئی وجہ ہمیں نہیں نظر آتی ،

لہٰذا ہم اگر یہ تسلیم کرلیں کہ تخت حکومت پر عالمگیر کا تسلط مذہبی جذبہ سے زیادہ ذاتی اور سیاسی محرکات کا نتیجہ تھا تو ہم عالمگیر اور تاریخ کے ساتھ انصاف کریں گے ۔

عالمگیر کی شخصیت کی عظمت

اور یہ تسلیم کرلینے کے بعد بھی عالمگیر کی بلند و بالا شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ، وہ بہرحال ایک انسان تھا کوئی فرشتہ نہ تھا ، غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں ، فرشتوں سے نہیں ہوتیں ، وہ انسان تھا اس سے غلطیاں سرزد ہوئیں ، لیکن اس کے حسنات سیئات پر غالب تھے ، خوبیاں بہت تھیں ، نقائص بہت کم ، وہ تاریخ کا بہت بڑا آدمی تھا ، اس کی شخصیت عظیم و جلیل تھی ، وہ فضائل و ملکات کا مجموعہ تھا اور بہت بڑا بادشاہ ، بہت بڑا فاتح ، بہت بڑا سپہ سالار ، بہت بڑا مدبر اور بہت بڑا انسان تھا ! وہ جس راستہ پر چاہتا گامزن ہو سکتا تھا ، عیش و طرب کا راستہ اس کے لئے کھلا ہوا تھا ، وہ دنیا کی ہر لذت حاصل کر سکتا تھا ، وہ ساری زندگی بادہ و جام اور مئے و گلفام میں گزار سکتا تھا ، لیکن اس نے ایسا نہ کیا ۔ اس کی زندگی سادہ تھی ، وہ شاہیت کے اس شکوہ و تجمل کو تو نہ کھو سکا جو اس کے چہرے سے ہویدا تھی ، لیکن اس کا لباس ، اس کی وضع قطع ، اس کا رہن سہن اس کا انداز حیات یکسر سر فقیرانہ تھا ، وہ سادہ کھاتا تھا ، سادہ پہنتا تھا ، سادہ زندگی بسر کرتا تھا ، اگرچہ دنیا کی بہت

بڑی حکومت اس کی مٹھی میں تھی ، وہ قرآن پڑھتا تھا ، نماز پڑھتا تھا ، خدا کو یاد کرتا تھا ، خدا سے ڈرتا تھا خدا کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا تھا ، انہی باتوں نے اسے صحیح معنوں میں "اورنگ زیب" اور عالمگیر بنا دیا ؛

پچاس سال کی طویل مدت

عالمگیر کا عہد ہر اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہے ، وہ چالیس سال کی عمر میں تخت حکومت پر جلوہ فرما ہوا ، پچاس برس تک حکومت کی ، شروع کے ۲۵ سال وہ شمالی ہند میں رہا ، اور یہاں کے سرکشوں کو اس نے اسطرح قابو میں کیا کہ آخری ۲۵ سال جب وہ دکن میں رہا ، تو یہ سر اٹھانا تو بڑی چیز ہے ، کلبلا بھی نہ سکے اسے ان کی مزاج پرسی کے لئے ایک مرتبہ بھی دکن سے شمالی ہند نہیں واپس آنا پڑا ، پچاس سال کی طویل مدت اس نے اس طرح حکومت کی ، کہ اگر اس کے اخلاف میں بھی وہی بات ہوتی تو شاید آیندہ ایک ہزار سال تک مغلیہ حکومت متزلزل نہ ہوتی !

داستان فتوحات

عہد عالمگیری کے فتوحات اور مہمات کی داستان بڑی طویل ہے ، پچاس سال کی مدت یوں بھی کم نہیں ہوتی ، اور جب یہ پچاس سال کارناموں سے لبریز ہوں تو نگاہ انتخاب درماندہ ہوجاتی ہے ، کس کو چھوڑے اور کسے لے ، لیکن یہ طویل داستان مختصر الفاظ میں ہمیں سنانی ہی پڑے گی ،

۱۔ سرحدی پٹھانوں سے ٹکر

عہد عالمگیری میں صوبۂ سرحد کے پٹھان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ شورش پسند ہو گئے تھے ، یوں تو انہوں نے بابر اور اکبر کے زمانہ میں بھی شورشوں کا سلسلہ جاری رکھا ، لیکن عالمگیر کے عہد میں یہ شورش حد کمال کو پہنچ گئی تھی ، خوشحال خاں خشک کا نام آج بھی سرحدی پٹھانوں میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی اس بر آمادہ نہ ہوا کہ سر جھکائے ۔

جب یہ شورش مقامی حکام فرو نہ کر سکے تو عالمگیر خود ایک لشکر لے کر بڑھا حسن ابدال میں مقیم ہوا اور ناکہ بندی کر کے اپنے دستوں کو آغر خاں کی سپہ سالاری میں آگے بڑھایا ، یہ آغر خاں خود بھی پٹھان تھا ،

اس مہم میں سرحدی شورش اور فتنہ کا ایسا سدِباب ہوا کہ پھر ایک عرصۂ دراز تک یہاں سے کوئی فتنہ رونما نہیں ہوا۔ (۱۰۸۱ھ)

۲- آسام کی باج گزاری

عالمگیر کی طرف سے اس کے مشہور امیر میر جملہ نے جو بنگال کا صوبہ دار تھا، کوچ بہار پر قبضہ کیا، راجہ بھوٹان بھاگ گیا، پھر اس کی فوجیں آسام میں داخل ہوئیں وہاں کے راجہ نے اطاعت کا عہد کیا، خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ میر جملہ نے خراج لیا، پیمانِ اطاعت استوار کیا۔ اور واپس چلا آیا (۱۰۷۳ھ)

۳- مرہٹوں کی سرکوبی

دکن کی "اسلامی ریاستوں کی پشت پناہی نے سیواجی کو ابھارا، یہ مرہٹوں کا ایک لشکر بنا کر کھڑا ہو گیا، مرہٹے کسان تھے اور کھیتی باڑی کرکے پیٹ پالتے تھے، ملک عنبر نے انہیں پہلی مرتبہ جنگجو بنایا اور تلوار تھمائی، رفتہ رفتہ یہ ہندوستان پر بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے، ساہو سیواجی کے باپ کو بیجاپور کی حکومت نے چھوٹی سی جاگیر دی، یہی جاگیر اب حکومت بن رہی تھی، سیواجی اپنے لیٹروں کو لے کر جدھر چاہتا نکل جاتا، اور لوٹ مار کرکے بستے شہریوں اور دیہاتیوں میں سراسیمگی پیدا کر دیتا، عالمگیر کے ایک سردار شائستہ خاں نے سیواجی پر فوج کشی کی، سیواجی میدانی لڑائی سے بھاگتا تھا، اسے گوریلا جنگ ہی آتی تھی، شائستہ خاں کوکن کے تمام قلعوں پر قابض ہو گیا، پونا بھی فتح کر لیا، اور خاص سیواجی کی حویلی میں مقیم ہوا، دکن کا صوبہ دار اورنگزیب کا بیٹا شہزادہ معظم تھا، اس نے اتنی سرزنش کافی سمجھی راجہ جے سنگھ نے سفارش کی اور دربارِ عالمگیری سے معافی مل گئی (۱۰۷۵ھ)

لیکن مرہٹوں نے اس معافی کی قدر نہ کی، پھر اٹھے سورت پہنچے، حاجیوں کی کشتیاں لوٹ لیں، اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے، سیواجی کو جب راہِ فرار نہ ملی تو مجبور ہو کر تن تنہا مسلمانوں کے لشکر میں معافی مانگنے آیا، لشکر کا سردار جے سنگھ تھا، اس نے مغلیہ روایات کے ماتحت یہ اطاعت قبول کر لی پھر آگرہ جا کر عالمگیر کے دربار سے پنج ہزاری منصب پایا (۱۰۷۶ھ)

کچھ دن آگرہ میں رہ کر سیواجی اپنے بیٹے کو وہیں آگرہ میں چھوڑ کر پھر بھاگ کھڑا ہوا اور ۱۰۸۵ھ

میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا، اور ابوالحسن تاناشاہ (گول کنڈہ) اور بیجاپور سے اسے مالی مدد ملی، اور آئندہ ہر طرح اعانت کا وعدہ ہوا،

پھر خود عالمگیر پہنچا، سیواجی اس کا مقابلہ نہ کرسکا، ۱۰۹۰ھ میں وہ وفات پاگیا، اور اس کا بڑا بیٹا سنبھا وارث حکومت ہوا، اب عالمگیر دکن میں طویل قیام کے ارادہ سے (۱۰۹۳ھ) پہنچ چکا تھا، وہ دلی میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ دکن کی تمام مسلمان ریاستیں کس طرح مرہٹوں کو شہ دے رہی ہیں اور مرہٹے کس طرح ترقی اور طاقت حاصل کررہے ہیں، لہٰذا اس نے فیصلہ کرلیا ان تمام نام نہاد اسلامی حکومتوں کو بھی ختم کرکے سلطنت مغلیہ میں شامل کرلے اور مرہٹوں کی بھی ایسی سرکوبی کرے کہ پھر وہ سر نہ اٹھاسکیں،

بیجاپور کا خاتمہ

ایک لشکر کو تو اس نے مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کردیا، اور خود بیجاپور پر لشکرکشی کی، بیجاپور کی حکومت زور شور سے لڑی لیکن عالمگیر کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی شکست کھائی اور ختم ہوگئی، (۱۰۹۷ھ) یہ یوسف عادل شاہ نے قائم کی تھی، آخری فرماں روا سکندر عادل شاہ تھا، جو ۱۰۸۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا اور ۱۰۹۷ھ سلطنت تک اپنی مسند پر فائض رہا

گولکنڈہ کا خاتمہ

عالمگیر نے ایک دوسرا لشکر اپنے بیٹے شہزادہ معظم کی سرکردگی میں گول کنڈہ کی تسخیر کے لئے بھیجا، یہاں یہ دعویٰ تھا کہ ہم سلطنت مغلیہ کو تسخیر کرلیں گے، لیکن یہ دعویٰ میدان جنگ میں ایک تنکے سے زیادہ صحیح ثابت نہ ہوسکا مغل فوجوں کا قطب شاہی حکومت مقابلہ نہ کرسکی، حیدرآباد اور گولکنڈہ پر جس کے سونے اور جواہرات کے بل پر مرہٹے اچھل رہے تھے مغلوں کا مکمل تسلط اور قبضہ ہوگیا، (۱۰۹۸ھ) یہ حکومت سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۱۸ھ میں قائم کی تھی، اس کا آخری فرماں روا ابوالحسن تاناشاہ تھا، ۱۰۸۳ھ میں اورنگ نشین ہوا، اور ۱۰۹۸ھ میں حکومت سے محروم ہوا، یہ حکومت بھی سلطنت مغلیہ کی ایک سرکار بن گئی،

دکن کی حکومتیں مٹ گئیں

عالمگیر کو ان نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کے استیصال پر ذرا بھی ملامت نہیں کی جاسکتی، یہ اپنی جگہ

برِ صحیح ہے کہ دکن کی یہ اسلامی حکومتیں اپنی تہذیب و تمدن، معاشرت اور خصائص علم پروری، ادب نوازی شانِ حکومت، ہر اعتبار سے ایک دل آویز مجموعہ تھیں، لیکن انہوں نے مرکزی حکومت کے خلاف اتنی معاندانہ ذہنیت پیدا کرلی تھی کہ مرہٹوں تک کے عروج و اقتدار کا سبب بن گئیں، اب عالمگیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ پہلے انہیں ختم کرے پھر مرہٹوں سے نبٹے!

مرہٹوں سے پھر ٹکر ادھونی کا قلعہ مرہٹوں کا گڑھ تھا، عالمگیر کی طرف سے فیروز جنگ، اسے سر کرنے پر مامور ہوا، اس نے بڑی دلاوری اور جاں بازی کے ساتھ اسے سر کر لیا، سنبھا گرفتار ہوا، بدزبانی کے جرم میں قتل ہوا، سنبھا اتنا سفاک تھا کہ اس کی لوٹ سے ہندو مسلمان کوئی نہیں بچتا تھا، چنانچہ جب یہ گرفتار ہوا تو جس گاؤں سے اسے لے کر گزرتے تھے، لوگ خوشیاں مناتے تھے کہ ایک پاپی سے نجات ملی۔

ساہو، سیواجی کا پوتا سنبھا کے بیٹے ساہو کو عالمگیر نے اپنی نگرانی میں لے لیا، اس کی تعلیم کا انتظام کیا، تربیت کا بندوبست کیا، اس کے وقار میں کوئی فرق نہ آنے دیا، اسے اُمرائے شاہی میں داخل کر لیا، عالمگیر کی ان کرم فرمائیوں کو ساہو کبھی نہ بھول سکا ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ ان احسانات کو یاد کرتا رہا

عالمگیر کی آخری مہم عالمگیر کی آخری مہم راجا رام کی سرکوبی تھی یہ سنبھا کا بھائی تھا، اور اب گدی کا وارث بن بیٹھا تھا، عالمگیر خود بڑھاپے کے باوجود ایک لشکر گراں لے کر دکن پہنچا، (۱۱۰۹ھ) مرہٹے یہاں پوری طاقت سے لڑے، لیکن ان کی قوت پاش پاش ہو گئی ست گڑھ، ستارا، اور دوسرے مقامات بڑی جدوجہد کے بعد سر ہو گئے، اور مغلیہ حکومت کا پرچم یہاں لہرانے لگا، اگر عالمگیر دلی سے دکن میں نہ آتا تو کوئی شبہ نہیں، دکن کی حکومتیں شمالی ہند پر چھا جاتیں، مغل حکومت ختم ہو جاتی، اور پھر ان حکومتوں کو مرہٹے ختم کر دیتے،

عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر چند روز بیمار رہ کر عالم آخرت کو سدھارا، دفات کے وقت عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی، جہانگیر کی طرح یہ بھی دمہ کا

مریض تھا، اسکا رقص میں جان گئی، عالمگیر نے وصیت کی تھی کہ تجہیز و تکفین خالص اسلامی سادگی کے ساتھ انجام دی جائے ! لاش احمد نگر سے (جہاں وفات ہوئی تھی) اورنگ آباد لائی گئی، اور یہیں دفن ہوئی اس کا مزار اب تک زیارت گاہ خلائق ہے !

عالمگیر کے عہد میں مغل حکومت کا رقبہ اور زیادہ وسیع ہوگیا، دشمنوں کی اس طرح سرکوبی ہوئی کہ یا تو وہ نیست و نابود ہو گئے، یا اتنے کمزور پڑ گئے کہ پھر کسی بڑے خطرہ کا سبب نہ بن سکے، رعایا کی خوشحالی بھی قائم رہی، اس کی آسودگی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، کاروبار سلطنت کی تنظیم ایسے پیمانہ پر ہوئی کہ کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس پر عالمگیر کی نظر نہ ہو، وہ براہ راست واقفیت نہ رکھتا ہو اور خود اسکے احکام و فرامین بہت بڑا ادبی سرمایہ بھی ہیں، اس کی انشا، فصاحت و بلاغت معیار سمجھی جاتی ہے، اس کے مکاتیب اور فرامین خالص ادبی نقطۂ نظر سے بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں اکبر سے لے کر شاہجہان تک ہر بیٹے نے ——— جہانگیر نے اکبر کے خلاف، خسرو نے جہانگیر کے خلاف ——— باپ سے مقابلہ کی ٹھانی، لیکن عالمگیر کے ایک بیٹے اکبر کی بغاوت کا انجام ایسا دردناک ہوا کہ آخر وقت تک عالمگیر کے بیٹے باپ کے نام سے کانپتے رہے ۹۰ برس کی عمر میں بھی اس کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا، جیسے شیر! ——— کہ وہ جتنا بوڑھا ہوتا ہے انتہائی خوفناک ہوجاتا ہے!

بے تعصب اور رواداری عالمگیر عالمگیر میں کتنی کمزوریاں تھیں لیکن یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا! تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے !

۱۔ عالمگیر نے سیواجی جیسے غدار کے پوتے کے ساتھ جو روادارانہ برتاؤ کیا، جس طرح اس کی پرورش کی، تربیت کی، امرائے دربار میں داخل کیا، ہم پڑھ چکے ہیں !

۲۔ ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ اس نے بار بار سیواجی کی غلطیوں کو معاف کیا، اور ہر معافی کے بعد وہ اور زیادہ شوخ و دلیر ہوتا گیا، لیکن عالمگیر کے لطف عمیم میں کوئی فرق نہیں آیا وہ بار بار

معاف کرتا رہا!

۳۔ مہاراجہ جسونت سنگھ وہ شخص ہے جو عالمگیر سے مخالف بھائیوں کا ساتھی بن کر لڑا۔ لیکن تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد نہ صرف یہ کہ عالمگیر نے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا، بلکہ اس کے تمام مراعات بحال کرائے، خطاب بھی، منصب بھی، دولت بھی، اقتدار و اختیار بھی!

۴۔ عالمگیر نے ہندوؤں سے جزیہ لیا، لیکن وہی شرعی جزیہ، جو ایک فقیر بھی بآسانی دے سکتا ہے اس کے مقابلہ میں مسلمانوں سے جو زکوۃ لی گئی وہ اس جزیہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔

۵۔ مندروں کے ساتھ بھی عالمگیر نے روادارانہ برتاؤ کیا۔ اس نے بنارس کے متعدد مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دیں، جن کا تذکرہ سر جادو ناتھ سرکار بھی اپنی تاریخ میں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اگر وہ ہندوکش اور ہندو بیزار اور متعصب ہوتا تو کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ وہ مندروں کو مالی امداد دیتا۔

۶۔ عالمگیر کی فوج میں ہمیں ہندو سپاہی اور سردار، دربار میں ہندو امرا اور منصب دار نظر آتے ہیں، وہ دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا۔ انہیں بڑی سے بڑی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں، نازک سے نازک مواقع پر ان کی نیت اور کام پر بھروسہ کیا جاتا تھا کبھی بھی انہیں مسلمانوں سے ہیچ اور کمتر نہیں سمجھا گیا۔ ہمیشہ ان کے وقار اور اجلال کا احترام کیا گیا، اور ان کے ساتھ کبھی ایسا رویہ نہیں اختیار کیا گیا کہ وہ احساس کمتری کے مرض میں مبتلا ہوں

۷۔ عالمگیر نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کی اس نے نظام شاہی، عادل شاہی حکومتیں ختم کر دیں ——— وہ اس سلوک کی مستحق بھی تھیں ——— لیکن ہندو راجاؤں اور سرداروں کی بار بار کی سرکشی اور بغاوت اور غداری کے باوجود ان کے ساتھ کبھی ایسا نہیں کیا، ان کے جرائم معاف کئے ان کی مکاری سے درگذر کی، ان کے منصب بحال کئے ان کا راج پاٹ واپس کیا، ان کے اختیارات پھر سے عالی ظرفی اور بلند حوصلگی سے کام لے کر انہیں تفویض کر دیئے، للہذا اگر مسلمان شکایت کریں تو کسی حد تک وہ قابل عذر ہو سکتی ہے، لیکن ہندوؤں کو کسی طرح بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے خلاف لب کشائی کریں۔

عہدِ مغلیہ

(۲)

دورِ زوال و ادبار

بہادر شاہ اوّل سے بہادر شاہ ظفر تک

از ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

نہیں قدرت کے آئین مسلّم سے کوئی چارہ

زوال و ادبار کی کار فرمائی اور سلطانی کے سامنے سب بے بس ہو جاتے ہیں، لیکن یہ طوفان اور آندھی کی طرح نہیں آتا، اس سیلاب کی طرح آتا ہے، جو اندر ہی اندر زمین کو کاٹتا رہتا ہے، اپنی جگہ بناتا رہتا ہے، پھیلتا رہتا ہے، اور ایک روز دفعتاً بے سان وگمان بڑی بڑی عمارتیں، مکانات، محلات، حویلیاں تاشے کی طرح بیٹھ جاتی ہیں، بلبلے کی طرح تیرنے لگتی ہیں، اور دیکھتے دیکھتے غرق آب ہو جاتی ہیں، یہ سیلاب اگر سامنے سے آئے تو اس کا تدارک بھی کیا جاسکتا ہے لیکن یہ اس طرح رفتہ رفتہ آتا ہے کہ پھر اس کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔

مغلیہ سلطنت کا زوال عالمگیر کے آنکھ بند کرتے ہی شروع ہو گیا تھا، یہ زوال بہت آہستہ آہستہ جڑیں کھوکھلی کرتا رہا، ڈیڑھ سو برس کی مدت گذر گئی، اور ایک دن دنیا نے دیکھ لیا کہ عالمگیر کا جانشین لال قلعہ کا مالک فرمانروائے ہندوستان انگریزوں کی ایک عدالت میں مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہے، یہ زوال ۱۷۰۷ء سے شروع ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء میں تکمیل کو پہنچا

قدرت کا اصول

جس طرح آدمی مرتے ہیں پھول مرجھاتے ہیں، درخت اکھڑتے ہیں، عمارتیں گرتی ہیں، اسی طرح قومیں اور ملتیں بھی حکومتیں اور بادشاہتیں بھی مرتی ہیں ــــــ کل من علیہا فان ۵ ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے،

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں!

لیکن جب کوئی مرتا ہے تو ضرور ہے کہ معلوم کیا جائے یہ کیوں مرا؟ کس مرض میں مرا؟ علاج اور تیمارداری سے مرض کا مداوا ممکن تھا یا نہیں؟ اسی طرح جب کسی قیصریت کا چراغ بجھتا ہے تو طبع جستجو پسند یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہ کون سے اسباب و محرکات تھے جنہوں نے بادشاہت کو ختم کر دیا، اور آیا ان کا تدارک کسی طرح ممکن تھا یا نہیں؟

عروج کے اسباب بیان کرنے میں زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں پیش آتی، اس لئے کہ وہ اتنی بڑی قوت بن جاتا ہے کہ جو بات بھی اس کی طرف منسوب کی جائے اذہان دعقول بلا حیل وحجت اسے تسلیم کر لیتے ہیں، البتہ زوال کی نشان دہی میں دشواری پیش آتی ہے، اس لئے اور جو وجہ بھی بتائی جائے اس پر جرحیں شروع ہو جاتی ہیں۔

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے،
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا،

یہ جرحیں، شب فراق کی طرح طویل سے طویل تر ہوتی چلی جاتی ہیں! نہ ان کی مزاحمت آسان ہوتی ہے، نہ جواب دہی!

لیکن مغلوں کے اسباب زوال تلاش کرنے میں زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لئے کہ وہ اتنے نمایاں ہیں کہ تقریباً ناقابلِ تردید بن گئے ہیں! عالمگیر نے بہت بڑی حکومت اپنے ورثا کے لئے چھوڑی تھی جو کابل سے لے کر آسام تک اور دکن سے لے کر کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی، اتنی بڑی حکومت کا اتنی آسانی سے ختم ہونا تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے، لیکن جس طرح طربیہ نشاط قلب وروح کے لئے ضروری ہے، اسی طرح المیہ عبرت وموعظت کے درس کا کام دیتا ہے، تاریکی ہو تو ہم روشنی کی قدر وقیمت محسوس نہیں کر سکتے، روشنی نہ ہو تو تاریکی کے عیوب ونقائص سے ہم بہرہ ور نہیں ہو سکتے، زندگی کی تکمیل کے لئے دونوں لازم وملزوم ہیں! ——— ایک سے لطف اٹھائیے، دوسرے سے سبق حاصل کیجئے!

اسبابِ زوال

مغلوں کے اسباب زوال کی یوں تو ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جا سکتی ہے، لیکن اس طویل فہرست کو اگر ہم مختصر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ :-

۱- ایک بڑا سبب خانہ جنگی تھا، یہ خانہ جنگی اتنے تواتر اور تسلسل کے ساتھ رہی کہ لوگوں میں غیر یقینی صورت پیدا ہو گئی، اور وہ حکومت کے استحکام کی طرف سے مایوس ہو گئے۔

۲- خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ کمزوری کا جذبہ بھی ابھرا، اب تک مغل فرماں روا اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرتے تھے، اب وہ اپنے اعوان و انصار پر تکیہ کرنے لگے، اور ان اعوان و انصار نے تاریخ میں ہمیشہ نقصان زیادہ پہنچایا ہے، اور فائدہ بہت کم!

۳- سعدی کی یہ نصیحت کہ

دشمن نہ حقیر و بیچارہ شمرد!

ایک بہت بڑی حقیقت ہے ———— پھر ہم دیکھتے ہیں جب مغل طاقتور تھے تب تو ان کی یہ حالت تھی کہ سیواجی جیسے معمولی لیٹرے کی سرکوبی اور دکن کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کی شورش پسندی کے استیصال کے لئے عالمگیر نے زندگی کے آخری ۲۵ سال دکن میں گزار دیئے لیکن جب مغل کمزور ہونے لگے، تو بڑے دشمن کو کمزور اور حقیر سمجھنے لگے، ہم پڑھ چکے ہیں، خلجی اور التمش نے فتنۂ مغول یا فتنۂ تاتار کو روکنے کے لئے کیا کیا کارنامے انجام دیئے تھے، لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ سکھ ابھرے، ابھرتے رہے، بہت بڑی طاقت بن گئے، لیکن یہ مغل امپائر کچھ نہ کر سکی، اسی طرح مرہٹے جو عہد عالمگیری میں کچھ نہ کر سکے تھے، اب پروان چڑھے، وہ رفتہ رفتہ ایک حکومت کے مالک بن گئے، پھر آگے بڑھے تو انہوں نے سارے ہندوستان میں ایک تہلکہ مچا دیا، لیکن ان کا کوئی کچھ نہ کر سکا، جب تک وہ زیادہ ابھرے نہیں تھے، نظر انداز کئے جاتے رہے جب ناقابل مزاحمت بن گئے تو تسلیم و اعتبار کی پالیسی اختیار کر لی گئی، نادر شاہ درانی ایران سے اٹھا، اور طوفان باد و باراں کی طرح دلی پہنچ گیا، لیکن دلی کا بادشاہ

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کا وظیفہ پڑھتا رہا، پھر وہ دلی میں آیا، اور اس نے سنہری مسجد میں بیٹھ کر ایک معمولی سی بات پر قتل عام شروع کر دیا لیکن شہنشاہ معظم کچھ نہ کر سکے، پھر اس نے تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا لے لیا مگر شہنشاہ فلک بارگاہ ذرا مزاحمت نہ کر سکے، اس نے ہندوستان کو خوب لوٹا، دلی کو روندا، سونے چاندی سے جھولی بھری اور چلا گیا، اور عیش پرستیوں کا دور شروع ہو گیا ——— اس طرح بادشاہت کی ساکھ بھی مٹ گئی، اور دبدبہ بھی جاتا رہا، لوگوں نے سمجھ لیا خالی لفافہ ہے!

مغلوں کے دورِ عروج میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا تھا وہ تھی حکومت کی مرکزیت اور ملک کی وحدت اور اسی مرکزیت اور وحدت کی خاطر بڑی بڑی جنگیں ہوئیں، سڑکوں، میدانوں اور شہروں میں پانی کی طرح خون بہا، ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کی گردنیں کٹیں، دور و دراز مقامات پر ہر طرح کے خطرات سے بے پروا ہو کر یلغاریں کی گئیں اور بڑے بڑے سرکشوں کو مطیع کیا گیا، انگریزوں میں اطاعت کا طوق ڈالا گیا۔ لیکن عہدِ زوال میں ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت پھر ہندو دورِ حکومت کی طرح متعدد آزاد اور خود مختار شاہیوں اور ریاستوں کا مجموعہ بن گیا ہے، درجنوں ریاستیں تھیں، جو اپنے دبدبہ اور طنطنہ میں دلی سے بازی لئے جا رہی تھیں، بہت سے خاندان تھے، جن میں بادشاہت پیدا ہو رہی تھی، پل رہی تھی، بڑھ رہی تھی، بہت سی ریاستیں تھیں جنہوں نے اطاعت کا جوا گردن سے اتار پھینکا تھا، اور علی الاعلان اپنی آزادی کا ڈھول بجا رہی تھیں، دلی کی بادشاہت سمٹتے سمٹتے لال قلعہ تک محدود ہوتی جاتی تھی، اور نئی نئی ریاستیں، نئی نئی حکومتیں، نئی نئی بادشاہتیں، ایک ایسی سیلابی ندی کی طرح جس کا پاٹ ہر آن بڑھتا رہتا ہے پھیلتی جا رہی تھیں! ——— اور دلی کی بادشاہت بے بسی کے ساتھ یہ جگر فگار اور دلدوز منظر دیکھ رہی تھی!

۵۔ حد یہ ہے کہ ملکی عناصر ——— سکھ، ہندو اور مسلمان ——— اگر خود مختاری کی طرف مائل ہو رہے تھے، تو ایک بات بھی تھی غیر ملکی تاجر، فرانسیسی، انگریز اور پرتگیز جو یہاں صرف تجارت کرتے آئے تھے، قلعے بنانے لگے، فوجیں مرتب کرنے لگے، ارضی سیاسیات میں حصہ لینے لگے، متصادم طاقتوں میں سے کسی ایک کی برملا پشت پناہی اور کسی دوسرے کی علانیہ فوجی مزاحمت کرنے

لگے، اور نہ صرف دلّی کی بے بس بادشاہت اس اُبھرے ہوئے سورج کے لئے روک نہ بن سکی، بلکہ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ عناصر بھی جو حصولِ اقتدار و اختیار کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے، متحد ہو کر، ان غیر ملکیوں کی سرکوبی نہ کر سکے، بلکہ مزید ستم یہ کہ ضرورت کے وقت ان کی امداد و اعانت کے جویا رہنے لگے ——— اور کچھ نہ ہوتا تو بھی صرف یہی واقعہ ایک بڑی سے بڑی سلطنت کو ختم کر دینے کے لئے کافی تھا!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں یہی وہ چند عوامل تھے جنہوں نے رفتہ رفتہ مغل حکومت کو، مرہٹوں کو، سکھوں کو ختم کر دیا، اور ایک غیر ملکی طاقت جو نہ مسلمان تھی، نہ ہندو، نہ سکھ، اقتدار کی تلوار، اور اختیار کی بندوق لے کر مسندِ شہریاری پر متمکن ہو گئی، کوئی اُسے نہ ٹوک سکا، نہ روک سکا!

عہدِ زوال کے روشن پہلو

لیکن عجیب بات ہے، عین اس وقت جب مسلمانوں کا آفتابِ اقبال گہنا رہا تھا، مغل حکومت تیزی سے روبہ زوال ہو رہی تھی، ہم دیکھتے ہیں کہ ذہنی، روحانی، علمی، ادبی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے ایسی محیر العقول ترقیاں زوال کے گہوارہ میں پرورش پا رہی تھیں جو اگر کسی آزاد ملک میں، اور خود مختار حکومت کے زیرِ سایہ نمودار ہوتیں تو ایسی انقلاب آفریں ثابت ہوتیں، جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی جن کے نتائج اتنے خوش آئند اور دور رس ثابت ہوتے کہ ہر طرح کی جدوجہد، زور و قوت اور سعی و کوشش کے باوجود پوری آب و تاب کے ساتھ نظروں کے سامنے ہیں!

نہایت اختصار، لیکن وضاحت کے ساتھ ہم ان چیزوں کا ذکر کریں گے!

ایک نئی زبان اُردو

بھارت کے رہنے والے ہندو اور غیر مسلم اپنی ایک خاص زبان رکھتے تھے، پھر مسلمان آئے تو ان کے ساتھ فارسی بھی آئی اور بہت جلد فارسی بھارت کی دفتری اور سرکاری زبان بن گئی، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے ایک نئی زبان جو غیر معمولی تہذیبی اثرات و نقوش کی حامل تھی، عالمِ وجود میں آ گئی، یہ اردو تھی! ———

——— ہندو فارسی اس لئے سیکھتے تھے کہ سرکاری ملازمت میں آسانی ہوتی، لیکن اردو ان میں

سے بہتوں کی مادری زبان بن گئی، اس نے بہت بڑا تہذیبی اثر یہ ڈالا کہ ہندوؤں سے نمستے اور مسلمانوں سے السلام علیکم چھڑادیا اور ایک نیا بدل "آداب عرض" کا دیا، اسی طرح اور بہت سے تہذیبی نقوش ہیں جو صرف اردو زبان ہی کی بدولت عالم وجود میں آگئے اور جن کے اثرات اب تک کارفرما ہیں، اگر کہیں یہ زبان مسلمانوں کے عہد عروج میں پیدا ہو گئی ہوتی، تو جس طرح سندھ کے ہندو عربی حروف عربی رسم الخط، اور بہت سے عربی الفاظ و محاورات کو "شیر اناجی" بن کر بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اسی طرح کم از کم شمالی ہند کے ہندو، آزاد اور خود مختار صاحب اقتدار و اختیار ہونے کے باوجود، اردو کو سرکاری زبان بنانے پر مجبور ہو جاتے۔

۲۔ مردم خیز قصبات اس عہد زوال کی، ایک اور چیز جو اپنے اثرات و نقوش اعتبار سے یادگار اور غیر فانی صورت اختیار کر چکی ہے، وہ ہے شہری مضافات میں ـــــ خاص طور پر اودھ میں ـــــ قصبات کا وجود بـ ـــــ یہ چیز خالص مسلم عہد کی پیداوار ہے، اور وہ بھی زیادہ تر عہد زوال کی، یہ قصبات نہ دیہات تھے، نہ شہر ان دونوں کے بین بین یہ قصبے مسلمانوں کے ذہنی مراکز تھے، روحانی، علمی اور اخلاقی اقدار کے منبع اور سرچشمہ تھے، یہاں سے جو سوتے پھوٹے، جو تحریکیں اٹھیں، جو انوار و ہدایت کے چشمے ابلے، ان کا اگر شہروں سے مقابلہ اور موازنہ کیا جائے تو یہ کہیں زیادہ گراں مایہ ثابت ہوں گے پھر یہ قصبے تہذیبی اور ثقافتی، روابط اور تعلقات کے پیدا کرنے میں بھی زیادہ معین و مددگار ہوئے، ان قصبوں نے شہروں پر اثر ڈالو، اور ان کی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں معین و مددگار ثابت ہوئے،

ایک عجیب امتیاز یہ عہد زوال، ایک اور حیثیت سے بھی ممتاز و یگانہ نظر آتا ہے! ـــــ اس عہد میں جتنی اور جیسی عظیم و جلیل شخصیتیں پیدا ہوئیں، انہوں نے جو تحریکیں چلائیں، ان کے فیوض و برکات اور رشد و ہدایت سے جس طرح لوگ ـــــ خواص اور عوام ـــــ مستفید ہوئے، ان کے فضل و کمال اور علم کا دائرہ جس طرح پھیلا، صوفیا میں شاہ ولی اللہ دہلوی علماء میں علمائے بحرالعلوم، مجاہدین میں حضرت سید احمد

شہید شعرا میں میر، درد، غالب اور دوسرے صاحبان علم و معرفت، اصحاب سجادہ و طریقت، ارباب زہد و اتقا، امامان ادب و شعر و لغت پیدا ہوئے، انہیں دیکھ کر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ جب کسی قوم کے اقبال و عروج کا سورج ڈوب رہا ہو، اذان و اقتدار کا سورج کیسے طلوع ہو سکتا ہے؟ تو یہ غم، اور نغمۂ شادی باہم کس طرح ہو سکتے ہیں؟ موت کے ساتھ ساتھ زندگی کس طرح نمودار ہو سکتی ہے؟ لیکن حقائق اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کیا بھی جائے، تو وہ بے نتیجہ اور بے اثر رہتا ہے، یہ حقیقت ہے کھلی ہوئی اور آفتاب سے بھی زیادہ تابندہ اور روشن تر حقیقت کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کی حکومت ختم ہو رہی تھی مسلمانوں کا رہا سہا جلال و وقار مٹ رہا تھا، مسلمانوں کا دبدبہ اور طنطنہ آفتاب لب بام ہو چکا تھا، ذہنی، علمی، ادبی، اور روحانی، اعتبار سے مسلمان شباب کی منزل میں قدم رکھ رہے تھے، جو شخصیتیں اس دور میں ہمیں نظر آتی ہیں، وہ اپنی گراں مائگی اور علوئے رفعت کے اعتبار سے ان شخصیتوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہیں، جن کا نظارہ ہم دور عروج و ارتقا میں کر چکے ہیں، یہ بڑی عجیب بات ہے ——— لیکن اتنی ہی سچی بھی ہے!

لامرکزیت کے کرشمے

بظاہر یہ چیز بڑی خوش آئند نظر آتی ہے کہ مسلمان دہلی میں کمزور پڑ گئے، لیکن دوسرے مقامات پر ابھرے، اور چھا گئے، ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال ایک وسیع مملکت بن چکا ہے، دکن میں ایک آزاد مسلم حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے، اور وہ ایک مستقل اور خود مختار حکومت کے روپ میں نظر آرہا ہے نجیب آباد، بریلی، اور فرخ آباد نئی اور آزاد خود مختار حکومتوں کے پایۂ تخت ہیں اور ان مسلم حکومتوں کے دوش بدوش ہندو حکومتیں بھی قائم ہو رہی ہیں، ترقی کر رہی ہیں، عروج و استحکام حاصل کر رہی ہیں، قوت و طاقت پیدا کر رہی ہیں۔ پونہ ایک بڑی حکومت ہے۔ گوالیار کی قوت و طاقت کو سب مانتے ہیں۔ جے پور اور جودھ پور میں بھی آزادی کی لہر اٹھتی دکھائی دے رہی ہے، رام پور "ایک ملک" بن گیا ہے، سندھ میں ایک نیا خاندان ابھرا، ——— اور

اس نے اپنی حکومت قائم کر لی، پنجاب میں سکھ ابھرے، اور ان کا رنجیت سنگھ اقتدار و اختیار کی آخری منزل پر پہنچ گیا، اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی، ہندو مسلم ریاستیں ہیں جن کا مرکز سے اگرچہ یوں ہی برائے نام تعلق ہے، لیکن دوسرے "دوستوں" اور "رفیقوں" کے بل پر جنگی خود مختاری کا بادبان ہوا میں لہرا رہا ہے، جب ہوا مخالف ہوتی ہے، رفتار سست ہو جاتی ہے، جب موافق ہوتی ہے، رفتار بڑھ جاتی ہے ——— کبھی خطرناک حد تک کبھی حد اعتدال میں!

بھارت، اب رنگا رنگ حکومتوں کا مجموعہ ہے، یہ حکومتیں مسلمانوں کے پاس بھی ہیں اور ہندوؤں کے پاس بھی ان سب کے پاس اپنا بادشاہ یا راجہ ہے، اپنی فوج ہے، اپنا پرچم ہے اپنا خزانہ ہے آپس میں حلیف بھی ہیں اور حریف بھی، ان میں دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی، ان میں صلح بھی ہوتی رہتی ہے اور جنگ بھی، لیکن کوئی مرکز نہیں ہے، جو انہیں حد اعتدال میں رکھ سکے، جو انہیں راہ راست پر گامزن کر سکے، جس سے یہ مرعوب ہوں، جس کے سامنے یہ جواب دہ ہوں، جس کا یہ استحکام ان کے استحکام کا سبب ہو!

جس طرح بغیر سردار کے فوج نہیں رہ سکتی، اسی طرح مرکز کے بغیر یونٹس (واحدے) اپنی زندگی قائم نہیں رکھ سکتے، خواہ ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کتنی ہی زیادہ ہو، خواہ وہ کیسے ہی "فریدوں فر، دارا حشم، کیواں مرتبت" ہوں چنانچہ مرکز کی شکست و ریخت کے بعد یہ شاندار واحدے بھی بہت جلد تحلیل ہو گئے، فلم میں ہم دیکھتے ہیں ایک منظر یک بیک تحلیل ہو گیا، اور دوسرا نمایاں ہو گیا، اسی طرح جب مرکز نہیں رہتا تو واحدے بھی اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتے وہ تحلیل ہو جاتے ہیں، اور کوئی دوسرا منظر نظر کے سامنے آ کر باعث جذب و کشش بن جاتا ہے!

روشنی اور تاریکی

بہر حال یہ ڈیڑھ سو برس کا عہد انحطاط و زوال متعدد حیثیتوں سے قابل غور و فکر ہے، اس میں روشنی اور تاریکی ملی ہوئی ہے، تاریخ کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسی عہد میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ شاندار اور ناقابل فراموش حکومت کا خاتمہ ہوا، اور ایک ایسی قوم یہاں کے تاج و تخت کی مالک بن گئی، جو کسی اعتبار سے

بھی اپنی شاہانہ بالادستی میں کمی گوارا کرنے پر رضامند نہیں ہوئی، وہ الگ تھلگ رہتی تھی، مخلوط شادی بیاہ کی قائل نہ تھی، اپنی زبان اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی ترک نہیں کی، بلکہ زبردستی اس وسیع ملک کے باشندوں کو اس زبان کے سیکھنے پر مجبور کیا، پھر یہی نہیں، بلکہ یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی ساری آمدنی بعد ڈھو کر اپنے دیس میں لے جاتی ہے، ملک کے باشندوں کو کنگال کر کے اس نے اپنا دامن سیم و زر سے بھر لیا، اس تاریک پہلو کے مقابلہ میں روشن پہلو یہ نظر آتا ہے کہ علم بڑھا زبان نے جنم لیا، تہذیب پھلی پھولی باہمی فہم و تفہیم کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے۔

ضروری تھا کہ عہد زوال کے حالات و معاملات پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے ہم دیکھ لیتے کہ جس دور میں قدم رکھ رہے ہیں، اس کے عناصر کیا تھے؟ عوامل اور محرکات کیا تھے؟ اسباب و بواعث کیا تھے؟ ان چیزوں پر نظر ڈالے بغیر ایک نئے دور میں داخل ہو جانے، جس کی آب و ہوا زبان و معاشرت تہذیب و تمدن و فکر و خیال اور انداز و اطوار سے یکسر ناواقف ہو ایسا شخص اس سے سر و سامانی کے ساتھ کچھ حاصل نہیں کر سکتا، ہاں تماشا بنکر دوسروں کی دلچسپی اور ازدیاد لطف و تفریح کا موجب ضرور بن سکتا ہے!

عالمگیر کے بعد

عالمگیر نے اپنی زندگی میں اس کا انتظام کر دیا تھا کہ وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خون ریزی اور خانہ جنگی نہ ہو، نیز یہ کہ ہر لڑکا اپنی جگہ پر اطمینان اور شان کی زندگی بسر کرے، نہ ایک دوسرے کا دست نگر ہو، نہ محکوم، تدبیر یہ سمجھ میں آئی کہ تینوں بیٹوں پر حکومت تقسیم کر دے، چنانچہ زندگی ہی میں اس نے جو انتظام کیا وہ یہ تھا:۔

۱۔ کابل سے بنگال تک سارا علاقہ بڑے بیٹے شہزادہ معظم کو عطا کیا گیا، جس میں پنجاب اور دلی وغیرہ سب شامل تھے۔

۲۔ گجرات اور وسط ہند کا سارا علاقہ منجھلے بیٹے شہزادہ اعظم کو بخش دیا ——— کہ لے اور شہنشاہی کر۔

۳۔ جنوبی ہند کی وسیع و عریض مملکت چھوٹے بیٹے شہزادہ کام بخش کو سونپ دی۔

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

لیکن ادھر باپ کی آنکھ بند ہوئی، ادھر بھائیوں نے تلواریں سنبھال لیں، بڑا بھائی معظم، جو اب بہادر شاہ اول کے نام سے سریر آرائے مملکت ہوا تھا، غالب آیا، دونوں بھائی، اعظم اور کام بخش بادشاہی کی حسرت لئے ہوئے عالم سفلی سے عالم بالا کو سدھارے! (۱۱۱۹ھ) اس بادشاہ کے عہد میں کوئی خاص حادثہ رونما نہیں ہوا، سوا اس کے کہ سکھوں کے بندا بیراگی نے شورش پر کمر باندھی، سرہند میں سکھوں نے سر اٹھایا، لیکن ایک معمولی سی حرب کی تاب نہ لا سکے بلبلہ کی طرح بیٹھ گئے (۱۱۲۱ھ)

بیٹوں کی عمر باپ لے چکا تھا، ۵۰ برس حکومت کر کے اور کچھ زیادہ عمر پا کر عالمگیر نے ۱۱۱۸ھ کے آخر میں (ذی قعد) وفات پائی، ۱۱۲۲ھ میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر پا کر اور قریباً چار سال حکومت کر کے بہادر شاہ نے سفرِ جناں پر کمر باندھی،

معظم یعنی بہادر شاہ اوّل کے چار بیٹے تھے، لیکن بڑے جہاندار شاہ نے باقی تینوں بھائیوں اور کئی بھتیجوں کو ملک عدم بھیج کر اپنا دربار سجایا، لیکن ایک بھتیجا جو ذرا سے دور تھا بہار سے لشکر لے چلا اور شاہی لشکر کو شکست دے کر بادشاہ بن گیا، جہاندار شاہ کا محل میں گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دیا گیا، اب فرخ سیر کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، اس کی بادشاہت بلے چون وچرا تسلیم کر لی گئی، (۱۱۲۳ھ) یہ واقعہ سال کے آخری مہینہ (ذی الحجہ) کا ہے اور جہاندار شاہ اسی سال محرم میں تختۂ حکومت پر قائض ہوا گویا ایک سال کی مدت میں وہ بادشاہ بھی بنا، قید بھی ہوا، اور سفرِ آخرت پر بھی مجبور کر دیا گیا!

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

گویا عالمگیر کی وفات کے وقت سے لے کر (۱۱۱۸ھ) فرخ سیر کی تخت نشینی کے وقت تک (۱۱۲۳ھ) آدھے درجن سے زیادہ شاہزادے جو آپس میں سگے بھائی بھتیجے تھے، موت کی نذر ہو گئے، یہ واقعات و حوادث پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ آفتاب جو نصف النہار تھا جس کی طرف نظر نہیں اٹھتی تھی، جس کی عظمت اور رفعت کی ایک دنیا گواہ تھی ابری طرح گہن چکا ہے، اور تیزی سے مائل بزوال ہو رہا ہے، بادشاہتیں جب اس طرح جلد جلد بدلنے لگیں، اور شاہی خون آتنا ارزاں ہو جائے تو اسے استحکام اور فروغ کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟

فرخ سیر

فرخ سیر کی کامیابی میں سادات بارہ کا بڑا ہاتھ تھا، یہ بڑے جیالے، منچلے، بہادر اور دلیر تھے تیغ کیا چیز ہے یہ توپ سے لڑ جاتے تھے!

لیکن قلمداری اور حکمرانی کے فن سے ناواقف تھے، پھر بھی سیاست اور امارت کو ساتھ لے چلنے پر مصر تھے

معاملات حکومت اپنی تحویل میں لے لئے تھے، اپنی قربانیوں اور جاں نثاریوں کا صلہ یہ چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کے اشارہ پر رقص کرے، دوسرے اُمرائے دربار کو، اور وہ انہیں حقیر سمجھتے تھے، وہی دربار جو نظم مملکت کا مرکز تھا، اب سازش، اور اکھاڑ پچھاڑ کا مرکز بن گیا، وہی بادشاہ جس کے سامنے دوسرے بادشاہوں کے سر جھکتے تھے، اب اپنے بادشاہ گر ماتحتوں کے سامنے سر جھکانے لگا، کچھ دنوں تک تو فرخ ان کے اشاروں پر چلا لیکن وہ بھی بادشاہ تھا، آخر ان بن ہو گئی، اور اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ سادات بارہ کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوا (۱۱۳۱ھ)

بندا بیراگی

پھر انہی سادات نے فرخ سیر کے بیٹے رفیع الدرجات کو تخت نشین کر دیا (۱۱۳۱ھ) فرخ سیر کے قتل میں سادات بارہ کے ساتھ اس کا خسر راجہ اجیت سنگھ (جودھپور) اور رتن چند (وزیر مالیات) بھی شریک تھا، رفیع الدرجات نے تخت نشین ہوتے ہی جزیہ کے احکام منسوخ کر دیئے، جو عالمگیر کے عہد سے رائج چلے آرہے تھے لیکن یہ بادشاہ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا، پھر اس کا دوسرا بھائی رفیع القدر شاہجہاں ثانی کے نام سے سادات کے اشارہ چشم و ابرو متمکن ہو گیا لیکن چند ہی ماہ میں وفات پا گیا، اس کی وفات کے بعد روشن اختر کہ جو اسی خاندان کا ایک فرد تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ یہ روشن اختر محمد شاہ کے نام سے تخت حکومت پر متمکن ہوا، اور اسی کے عہد میں سادات بارہ کا خاتمہ ہوا۔

روشن اختر یا محمد شاہ کے عہد پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے، فرخ سیر، رفیع الدرجات اور رفیع القدر کے بارے میں صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اُنہیں اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ کوئی کارنامہ دکھا سکیں، زندگی کے جو لمحات بھی میسر آئے، وہ اس اضطراب کی نذر ہو گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟

فرخ سیر کے عہد کا صرف ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ اس کے عہد میں بندا بیراگی نے پھر سر اُٹھایا اور غریب و بے شاہ شہریوں اور دیہاتیوں پر قیامت کے مظالم توڑے، آخر ۱۱۲۵ھ میں گرفتار ہو کر قتل ہوا، اور اپنے کیفر کردار کو پہنچا!

اب تک مغلیہ سلطنت کی سطوت قائم تھی لیکن۔

شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

کی مصداق عالمگیر کے بعد سے اب تک کسی بادشاہ کو اطمینان سے حکومت کرنے نظام مملکت درست کرنے اور معاملات ملکی کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، جو بھی تخت پر بیٹھتا تھا اپنی فکر میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے، یہی وجہ تھی کہ بادشاہت ایک تمسخر بن گئی وہی بادشاہت جو ابھی چند سال پہلے عظمت و جلال سے عبارت تھی، یہ انقلاب صرف ۱۱ - ۱۲ سال میں ہوا۔

محمد شاہ کا عہد حکومت

نادر شاہ درانی کی آمد، مسلمانوں کا قتل عام، اور تباہی و بربادی

فرخ سیر کے قتل، رفیع الدرجات اور رفیع القدر کی بے کسانہ موت نے سادات بارہ کو بہت حقیر ذلیل کر دیا تھا، عوام ان پر آوازے کستے تھے انہیں بر سر عام برا بھلا کہا جاتا تھا لیکن قوت ان کے ہاتھ میں تھی، کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا، لیکن روشن اختر (محمد شاہ) زیرک اور سمجھدار آدمی تھا، اس نے کچھ ایسی چال چلی کہ سادات بارہ کا سارا زور ایک سال میں ختم ہو گیا (۱۱۳۲ھ) اور قطب الملک اور سید حسین جن کے ہاتھ میں عملاً حکومت کی باگ ڈور تھی ہلاک ہوئے اور محمد شاہ نے ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی (۱۱۳۳ھ)

محمد شاہ

شروع میں محمد شاہ کا چلن اچھا رہا، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد دیندار عالمگیر کا پوتا فواحش اور منکرات کا عادی بن گیا، شراب و کباب عیش و عشرت، فضول خرچی اور بے راہ روی نے دلی کو بھانڈوں، مولی، طوائفوں سازندوں اور دلالوں کا شہر بنا دیا، عام قاعدہ ہے جیسا راجہ ویسی پرجا، عوام بھی اس ڈھرے پر جا لگے اور انہوں نے بھی وہی وطیرہ اختیار کر لیا جو بادشاہ سلامت کا تھا۔

نادر شاہ

نادر شاہ ایران کا بادشاہ تھا، حوصلہ مند اور جری، ہندوستان کی بدنظمی کی اُسے برابر اطلاعیں مل رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا یہ سونے کی چڑیا ہے، یہاں اتنا زر و جواہر مل سکتا ہے جو پشت ہا پشت تک کام آئے گا، پھر صوبہ دار ــــ بربان الملک نے بھی نادر شاہ سے ساز باز کی،

اس کا حوصلہ بڑھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ نادر شاہ دلی کی طرف چل پڑا، یہاں کسی کو ہوش بھی نہیں تھا کہ قیامت سر پر آئی جا رہی ہے! بادشاہ، امراء اور سرداران فوج کو اس طرف متوجہ بھی کیا جاتا تھا، تو وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، انہیں ذرا بھی اس کی امید نہیں تھی کہ نادر واقعی آ جائے گا، اور آ کر قیامت برپا کر دیگا لیکن وہ آیا، (۱۱۵۱ھ)، اور اسے کوئی نہ روک سکا، بلکہ برہان الملک علی الاعلان اس سے مل گیا، اور گھر کا بھیدی بن کر اسے خزانوں اور بیش بہا چیزوں کی تفصیل بتائی، جن کے لالچ میں وہ اتنی دور کا سفر کر کے یہاں آیا تھا، بادشاہی لشکر نادری لشکر کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکا، صلح کی درخواست پیش ہوئی، نادر شاہ نے یہ درخواست ازراہ عنایت منظور کر لی، لیکن اس طرح کہ بادشاہ کو نظر بند کر لیا، خزانہ پر پہرہ لگا دیا، اور لال قلعہ میں مقیم ہو گیا، اور یہاں آ کر تخت طاؤس کے علاوہ کروڑوں روپیہ کا زر و جواہر اپنے قبضہ میں لے لیا، (۱۱۵۱ھ) کچھ ایرانیوں سے دلی والوں کی چل گئی، نادر اتنا بپھرا کہ سنہری مسجد میں ننگی تلوار لے کر بیٹھ گیا، اور نو گھنٹہ تک قتل عام کراتا رہا، پھر نظام الملک کی استدعا پر اس نے تلوار میان میں رکھی، اور

"بریش سفیدت بخشیدم"!

کہہ کر نیچے اترا، اس قتل عام میں تقریباً ایک لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، اور اربوں روپیہ کا ساز و سامان اور مال و اسباب دلی کے رئیسوں اور امیروں کی حویلیوں سے، ایرانیوں نے لوٹ لیا، مکانات میں آگ لگا دی، اور شہر میں جھاڑو پھیر دی، ایسا معلوم ہوتا تھا، نادر کی صورت میں چنگیز آیا ہے! ۱۱۵۲ھ میں نادر مال غنیمت کا پشتارہ لے کر واپس گیا، معاصر مؤرخین کا اندازہ ہے کہ اپنے ساتھ ساٹھ کروڑ روپیہ نقد اور پچاس کروڑ مالیت کا سامان لے گیا۔

جاتے جاتے اس نے محمد شاہ کی لڑکی سے اپنے لڑکے کی شادی کر دی، بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی، اور جس شہر میں کل نوحہ و فغاں، فریاد و شیون، آہ و فریاد کی صدائیں در و دیوار سے بلند ہو رہی تھیں، وہیں سے چنگ و رباب اور رقص و موسیقی کا طوفان امنڈ پڑا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس شہر پر کوئی مصیبت ہی نہیں آئی تھی، یہاں عیش و طرب کی محفل برابر نہ جانے کب سے قائم ہے، نہ کہیں غم تھا

نہ پریشانی، ایک عالم طرب و نشاط تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔

احمد شاہ

نادر شاہ چلا گیا!

لیکن جاتے جاتے یہ ثابت کر گیا کہ مغل حکومت ختم ہو چکی ہے، عالمگیر کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ابھی چالیس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک لٹیرا آیا اور اس نے دلی کو تاراج کر دیا، مغل حکومت کا دبدبہ ختم کر دیا اور دنیا کو بتا گیا کہ یہ وہ حکومت ہے جسے ملکی اور غیر ملکی دونوں جب چاہیں غارت کر سکتے ہیں، نادر شاہ کے جانے کے بعد محمد شاہ نے عقل کے ناخن لئے اور سنبھل کر حکومت کرنے لگا، حکومت کا انتظام پھر قائم ہو گیا، اس کے عہد میں (۱۱۶۱ھ) احمد شاہ ابدالی نے بھی حملہ کیا، جو نادر شاہ کا پروردہ تھا، لیکن شکست کھا کر واپس گیا،

احمد شاہ ابدالی کی شکست کے چند ہی روز بعد محمد شاہ وفات پا گیا! (۱۱۶۱ھ) اس کی وفات نے سلطنت کا شیرازہ اور زیادہ درہم برہم کر دیا

عماد الملک

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا، جو ہر اعتبار سے نااہل اور نالائق تھا، اس کے عہد میں صفدر جنگ اور نظام الملک کے پوتے عماد الملک نے بڑا زور باندھا، ان دونوں میں رقابت اور چشمک تھی، ہر ایک زور و قوت کے لئے ایک دوسرے سے برسر پیکار تھا، دونوں ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے مرہٹوں سے ساز باز کرتے رہتے تھے، اور یہ مرہٹے ایک مدت سے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بادشاہت کا خاتمہ کریں، اور تخت حکومت پر قبضہ کریں! ——— روہیلے بھی اب ایک بڑھتی ہوئی قوت تھے، یہ بھی اس بساط پر اپنی چالیں چل رہے تھے،

عماد الملک اپنے اقتدار کے لئے ضروری سمجھتا تھا کہ احمد شاہ کو راستہ سے ہٹائے، چنانچہ اس نے بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھروائی، اسے نابینا کر کے قید کر لیا اور معز الدین جہاندار شاہ کے پوتے، اور عالمگیر کے پرپوتے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا!

عالمگیر ثانی کے عہد کا سب سے اہم واقعہ صرف ایک ہے!

عماد الملک نے احمد شاہ ابدالی سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی، وہ بھی دوسرا نادر تھا، اگرچہ بہت سے صفات حسنہ کے اضافہ کے ساتھ ۱۱۷۰ھ میں عماد الملک کی شرارتوں کا جواب دینے کے لئے اس نے دلی پر چڑھائی کی، مغلیہ حکومت میں اتنا دم کہاں تھا کہ اسے روک سکتی؟ عماد الملک جواب تک ابدالی کا سب سے بڑا دشمن تھا اس سے جان کی امان کا طالب ہوا، ابدالی نے عماد الملک اور بادشاہ دونوں کو "معاف" کر دیا، لیکن دلی کو نہ معاف کیا، افغان سپاہیوں نے ایسی لوٹ مچائی کہ نادر شاہ کے دور کی یاد تازہ ہو گئی، فرق صرف اتنا تھا کہ قتل عام کا حکم صادر نہیں کیا، صرف لوٹ مار پر اکتفا کی!

ابدالی نے اگرچہ عماد الملک کو معاف کر دیا تھا، لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد یہ پھر جو چاہے کرے، چنانچہ اس نے نجیب الدولہ (روہیلہ سردار) کو وزیر جنگ کے منصب پر فائز کیا، صفدر جنگ مر چکا تھا اس کے بیٹے شجاع الدولہ سے عہد لیا کہ بادشاہ کی اطاعت کرے گا، پنجاب کا صوبہ اپنے بیٹے تیمور کو تفویض کیا، یہ سارے انتظامات اس لئے تھے کہ عماد الملک سر نہ اٹھا سکے، پنجاب پر اس کا قبضہ رہے اور دلی کی بادشاہت کا بھرم قائم رہے۔

ساز باز

لیکن عماد الملک نچلا بیٹھنے والا آدمی نہ تھا!

احمد شاہ ابدالی کے جاتے ہی اس نے پینترا بدلا، مرہٹے ایک بڑی طاقت بن چکے تھے، دلی کا مرکز جیسے جیسے کمزور ہو رہا تھا، مرہٹے زور پکڑ رہے تھے، صرف پونا ہی ان کے قبضہ میں نہ تھا، گوالیار، بڑودہ ناگپور، اندور وغیرہ ان کے مضبوط اڈے تھے، عماد الملک نے پھر مرہٹوں سے ساز باز کی، اور انہیں سبز باغ دکھا کر پنجاب پر یورش کرنے پر اکسایا، ادھر اس نے حالات ایسے پیدا کئے، اور مرہٹوں کا دباؤ بڑھا کر اپنا ایسا رنگ جمایا کہ نجیب الدولہ کا دلی میں ٹکنا مشکل ہو گیا، وہ نجیب آباد واپس چلا گیا، اب مرہٹوں کے سہارے درحقیقت عماد الملک دلی پر حکومت کر رہا تھا، لیکن دل کی خلش موجود تھی، اس نے مرہٹوں کو پنجاب پر قبضہ کرنے کا حوصلہ دلایا تھا، اور وہ بڑھتے ہوئے دریائے اٹک تک پہنچ چکے تھے، تیمور

مزاحمت نہ کرسکا، وہ راستہ سے ہٹ گیا، (۱۱۷۲ھ) لیکن ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اگر احمد شاہ ابدالی پھر آ گیا، اس نے مرہٹوں کو شکست دے دی اور عالمگیر ثانی نے اسے سارا کچا چٹھا کہہ سنایا، تو پھر اس کی خیر نہیں، چنانچہ اس نے طے کیا کہ سب سے پہلے راستہ کا یہ کانٹا دور ہونا چاہیئے۔

عالمگیر ثانی پیروں فقیروں کا قائل تھا عماد الملک نے اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا، فیروز شاہ کے کوٹلہ میں اسے ایک شاہ صاحب کا نادیدہ مشتاق بنا کر رات کو بھیجا، وہیں وہ بیچارہ بادشاہ قتل کر دیا گیا، لاش جمنا کی ریت پر پھنکوا دی جو دن بھر جلتی رہی[1] پھر دوسرے روز ڈرتے ڈرتے چھپتے چھپاتے تجہیز و تکفین عمل میں آئی، عماد الملک کی سفاکیوں اور شرارتوں سے تنگ آکر عالمگیر ثانی کا بیٹا عالی گہر جو آگے چل کر شاہ عالم کے نام معروف ہوا، دلی چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لئے بنگال چلا گیا تھا، لہٰذا اب اس کی طرف سے کسی قسم کا خدشہ عماد الملک کو باقی نہیں تھا کہ وہ آئے گا اور تخت سلطنت کا وارث بن کر کھڑا ہو جائے گا، لہٰذا اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اس نے ایک اور مہرہ بٹھا دیا، اور خود عملی طور پر حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی

لیکن عالی گہر کو جیسے ہی باپ کی وفات کی اطلاع ملی، وہ فوراً پلٹ پڑا، کہ دلی پہنچے اور بادشاہت پر قبضہ کرے، لیکن اعلان شاہی راستہ ہی میں کر دیا، (۱۱۷۳ھ)

---

[1] شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی یگانہ تاریخ ہند میں بڑی بسط و تفصیل سے اس بے دردانہ قتل کے واقعات مؤثر خانہ کاوش سے تحریر کئے ہیں، ہم نے صرف خلاصہ پر اختصار کی غرض سے اکتفا کیا ہے۔

شاہ عالم ثانی کا دور

مرہٹوں کا عروج۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد۔ مرہٹوں کی شکست فاش، انگریزوں کی کامرانیاں۔ مرکز کا انحلال۔ فرنگی اقبال کا آغاز، مغل زوال کی انتہا

شہزادہ عالی گہر، باپ کی وفات کے بعد شاہ عالم ثانی کے پرشکوہ نام سے تخت حکومت پر بیٹھے، یہ بہت دنوں تک اس منصب اور اس مسند پر فائز رہے، لیکن ان کے طویل دور حیات کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مرکز اور زیادہ کمزور ہو گیا، دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی، مختلف مقامات پر نئی نئی حکومتیں جو کچھ پہلے سے قائم تھیں کچھ اب عالم وجود میں آئیں اور زیادہ زور پکڑ گئیں، انگریز اس ملک میں تاجر بن کر آئے تھے، لیکن شاہ عالم ثانی کے طفیل وہ بادشاہ اور فرماں روا (عملی طور پر) اور بعض مقامات پر حقیقی طور پر) بن گئے تھے، یہ صحیح ہے کہ شاہ عالم ثانی کی زندگی تک مغل سلطنت کی مرکزیت کا دبدبہ بڑی حد تک قائم رہا، لیکن اس دبدبہ کی پشت پر چونکہ قوت وسطوت نہیں تھی، اس لئے شاہ عالم کے بعد یہ دبدبہ بھی ختم ہو گیا،

ساکھ کا خاتمہ

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، یوں تو زوال کی ابتدا عالمگیر کی وفات کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی، لیکن نادر شاہ درانی کے حملوں، احمد شاہ ابدالی کی تاخت مرہٹوں کی آویزش نے ساکھ اور ختم کر دی، رعب اٹھ گیا، بھرم کھل گیا، جو حکومت مرہٹوں کو چوتھ لینے سے نہ روک سکے، جو غیر ملکی فرماں روا (درانی اور ابدالی) کی تاخت وتاراج اور قتل عام اور لوٹ مار کا تدارک نہ کر سکے، وہ ملک کا نظم وانتظام کس طرح قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے، وہ اپنی مرکزیت کے گرد لوگوں کو کس طرح جمع کر سکتی ہے؟ اور پھر

جب کہ فرماں روائے وقت، عیاشی، بادہ نوشی اور نغمہ و رقص اور لہو و لعب کو اپنا شعار حیات بنا چکا ہو جب بادشاہ رنگ رلیوں میں معروف و منہمک ہو جاتا ہے تو جاں نثاران دولت بھی اپنے حلوے مانڈے سے سروکار رکھنے لگتے ہیں، ملک کی سالمیت اور استحکام سے دونوں غافل ہو جاتے ہیں، اپنے تعیش اور راحت و آرام کو ہر چیز پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔

اقبال و عروج کی داستان جتنی دلچسپ روح پرور اور طربناک ہوتی ہے، انحطاط و ادبار کی کہانی اتنی ہی رنجدہ مایوس کن اور روح فرسا ہوتی ہے لیکن بغیر بیان کئے بھی چارہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اقبال و عروج کی داستان سرائی پر قلم طرارے بھرتا ہے اور ادبار و انحطاط کے بیان پر اس کی محشر خرامی سست روی سے بدل جاتی ہے نشاط اور افسردگی میں بھی فرق ہے اور کوئی شبہ نہیں بہت بڑا فرق ہے! بہرحال اس کے خاص خاص واقعات یہ ہیں،

عماد الملک کی شہ پر مرہٹے پنجاب کو روندتے ہوئے اٹک تک بڑھ گئے تھے، ابدالی کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ غیظ و غضب کا پیکر بنا ہوا طوفان اور آندھی کی طرح پھر بڑھا، مرہٹے پیچھے ہٹے، آخر پانی پت کا میدان میدان جنگ بنا،

اس جنگ کو جیتنے کے لئے مرہٹوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، عماد الملک نے جب اپنی تدبیر پٹ پڑتی دیکھی تو پہلے بھرت پور کے جاٹ راجہ کے پاس پناہ گزیں ہوا، پھر گوالیار پہنچا اور روپوش ہو گیا مرہٹے اپنے ساتھ بہت بڑا لشکر لائے تھے۔ اب پونا مرکزی حیثیت رکھتا تھا، اندور گوالیار، بڑودہ، ناگپور (ہلکر، سندھیا، گائیکواڑ، بھونسلے) پونا کے تابع تھے، اس جنگ میں اگرچہ مرہٹوں کا توپ خانہ ابراہیم گاردی مسلمان کے تحت تھا اور وہ پوری وفاداری کے ساتھ ہندو آقاؤں کے لئے مسلمانوں کو چنے کی طرح بھون رہا تھا۔ نیز پیشوا کی مسلمان بی بی مستانی بیگم کا لڑکا شمشیر جنگ[1] بھی ہندو اور مرہٹہ اقتدار کے لئے سردھڑ

---

[1] یہ شمشیر جنگ مسلمان ہو گیا تھا، اسی کی اولاد کو باوتی کہ وہ کی جاگیر ملی، نیز اندور سے منصب اور وظیفہ مقرر ہوا، یہ خاندان اب تک مسلمان ہے اور بھارت میں آباد ہے۔

کی بازی لگائے ہوتے تھا، ہندوستان کے دوسرے ہندو رجواڑے اور مسلمان غدار بھی مرہٹوں کے ساتھ تھے، مرہٹہ فوج کا سالار اعظم سداشیو راؤ پیشوا کا بھائی تھا، وسواس راؤ پیشوا کا بیٹا اس لئے ساتھ آیا تھا کہ ابدالی کو مار کر دلی کے لال قلعہ میں نوبت اور نقارہ بجاتا ہوا خود تخت حکومت پر بیٹھے، اور مغل سلطنت اور شاہی کے خاتمہ کا اعلان کر دے، مرہٹہ لشکر کی تعداد غیر مسلم مؤرخین تک تین لاکھ کے قریب بتاتے ہیں، ابدالی نے اگرچہ فراست اور تدبر سے کام لے کر نجیب الدولہ (نجیب آباد) رحمت خاں (بریلی) احمد خاں بنگش (فرخ آباد) شجاع الدولہ (اودھ) کو اپنا رفیق بنالیا تھا، پھر بھی اس کا لشکر مرہٹوں کے مقابلہ میں تعداد اور سازو سامان کے اعتبار سے بہت کم تھا، بایں ہمہ جب لڑائی شروع ہوئی تو مرہٹے بری طرح ہارے، وسواس راؤ قتل ہو گیا، اور شیو راؤ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا، دو لاکھ کے قریب مرہٹہ سپاہی مارے گئے، افغانوں نے دور دور تک تعاقب کیا، اس طرح مرہٹوں کا زور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، مرہٹہ ایمپائر کا تصور خواب بھی نہ رہا مرہٹوں کی کمر ایسی ٹوٹی کہ پھر وہ نہ ابھر سکے، یہ واقعہ ۱۱۷۴ھ کا ہے مرہٹوں کے اس قتل عام کے وقت ہر مرہٹہ گھر سے نوحہ و ماتم اور فریاد و فغاں کی دل دوز صدائیں بلند ہونے لگیں، کوئی مرہٹہ گھر ایسا نہیں تھا جو اپنے کسی عزیز کے لئے ماتم گسار نہ ہو، پیشوا پر اس واقعہ کی ایسی دہشت طاری ہوئی کہ پھر وہ زندہ نہ رہ سکا، مایوسی اور حرماں کے مرض میں مبتلا ہو کر دنیا سے سدھار گیا!

احمد شاہ ابدالی کو یہ فتح مبین ایسی حاصل ہوئی تھی کہ وہ بڑی آسانی سے شہنشاہ ہندوستان بن سکتا تھا، ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت ور اور بے پناہ "اینٹی مسلم" حکومت مرہٹہ پارہ پارہ اور منتشر ہو چکی تھی، اودھ بریلی فرخ آباد، نجیب آباد حلقہ بگوش ہو چکے تھے، دلی کی بادشاہت رحم و کرم پر تھی، بنگال و دکن اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے، لیکن ابدالی نے کمال بے نفسی سے یہ حکومت جیت کر پھر شاہ عالم کو سونپ دی،

تو دانی حساب کم و بیش را!

اور خود واپس چلا گیا!

اب وقت تھا کہ اس خداداد موقع سے شاہ عالم ثانی فائدہ اٹھاتے، لیکن ان کی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ اتنی بڑی حکومت نہ سنبھال سکے، وہ اپنے ماتحتوں کو مطیع نہ رکھ سکے بلکہ انہوں نے کمال فیاضی، رواداری اور مہمان نوازی سے کام لے کر ۱۱۷۸ھ میں یعنی ابدالی کے جانے کے فوراً چار سال بعد بنگالے کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر دی، گویا اعلان کر دیا کہ ہم نہ حکومت کر سکتے ہیں، نہ انتظام جس کا جی چاہے آئے اور حکمران بن جائے اور کاروبار نظم و انتظام سنبھال لے!

نجف خاں

ابدالی کے جانے کے بعد، ایک سردار نجف خاں نے بادشاہ کی ساکھ پھر سے قائم کرنے کی کوشش کی، مرہٹے اب سر اٹھانے لگے تھے، انہیں دبایا، روہیلوں اور جاٹوں کا اثر کم کیا، جو دہلی پر چھانے چلے جا رہے تھے لیکن ۱۱۸۵ھ میں وہ وفات پا گیا اور بادشاہ سلامت پھر کسمپرسی کے شکار ہو گئے، چنانچہ نجیب الدولہ کا پوتا غلام قادر روہیلہ قلعہ پر حکمرانی کرنے لگا، اس نے بادشاہ کو اندھا کر دیا، (۱۲۰۱ھ) سندھیا گوالیار سے اٹھا ——— مسلمانوں کے دیرینہ احسانات اور سیاسی مصالح سے متاثر ہو کر ——— اس نے غلام قادر کو ہلاک کیا شاہ عالم نے اسے "فرزند دلبند" کا خطاب اس کارنامہ پر مرحمت کیا،

انگریزوں نے جو یہ رنگ دیکھا: تو وہ بھلا کیوں بیٹھتے ہو۔ انہوں نے مرہٹوں سے فرداً فرداً لڑائی چھیڑی، دوسری حکومتوں کو زیر کیا، اور دلی کے بادشاہ کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا، (۱۲۱۸ھ)

ایسٹ انڈیا کمپنی

۱۸۲۰ھ میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہو گیا!

سلطنت ہند یعنی دلی کے متولی اب انگریز تھے، بہت سے رجواڑوں سے نبٹ چکے تھے، بعض سے نبٹ رہے تھے، انگریز جو کچھ کر رہے تھے وہ "کمپنی" کے نام پر، کمپنی صرف کاروباری اغراض کے لئے قائم ہوئی تھی، لیکن تجارت کی کوٹھی گورنمنٹ ہاؤس بننے میں دیر نہ لگی، اگرچہ ظاہری طور پر اب بھی خطبہ بادشاہ کے نام کا پڑھا جا رہا تھا، سکہ بھی بادشاہ کا چل رہا تھا، انگریز کمپنی جو کچھ کرتی تھی، بطور خود کرتی تھی، اپنے

حکم اور اپنی مرضی سے کرتی تھی لیکن نام بادشاہ کا ہوتا تھا، اور بادشاہ اتنی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا کہ اپنے نام کے غلط استعمال کو روک سکے، رفتہ رفتہ اس پر قانع ہوگیا تھا کہ وہ گوشہ عافیت میں زندگی بسر کرے اور انگریز اس کی طرف سے جہانبانی کریں، وہ تو دل سے یہی چاہتے تھے، چنانچہ بادشاہ کو انہوں نے طاق پر رکھ دیا، اور خود قیصر ہند بننے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے، وسائل و ذرائع بروئے کار لانے لگے، کہ اب انہیں حکومت کی چاٹ پڑ چکی تھی، اور وہ تجارت پر قناعت کرنا نہیں چاہتے تھے،

شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ معین الدین اکبر شاہ ثانی کے نام سے رونق افروز بزم مملکت ہوئے، ۱۲۵۳ھ تک لال قلعہ میں بیٹھ کر مملکت خیال پر حکومت کرتے رہے، سراج الدین بہادر شاہ ظفر انہی کے پوتے تھے، جو ۱۲۷۴ھ تک لال قلعہ میں موجود رہے، لیکن اس طرح کہ دلی شہر بھی ان کی مملکت سے خارج تھا، اور انگریزوں کے وظیفہ پر وہ زندگی بسر کر رہے تھے، ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا، یہ آخری کوشش تھی، انگریزوں کی حکومت ان کے ظلم و عدوان، ان کی شقاوت اور سفاکی کے خلاف سکھ سپاہیوں اور ہندو مسلم والیان ریاست کی بدولت کامیاب نہ ہوسکی، غدر ناکام ہوا، بہادر شاہ ظفر پکڑے گئے، ان کے بیٹوں کے سر تحفہ میں ان کی خدمت میں پیش کئے گئے، اور پھر "بغاوت" کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا، اور رنگون جلاوطن کر کے بھیج دیئے گئے، وہیں وفات پائی،

مارا دیار غیر میں مجکو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

شاہان تیمور کی اولاد نے قتل کرنے، اکبر اور عالمگیر کے پوتے بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے، غدر کے بعد کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی اور حکومت برطانیہ کے تاج شہریاری میں ایک آبدار ہیرا ہندوستان پر چمکنے اور جگمگانے لگا: اور باہمی خلفشار کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت پر ایک اجنبی قوم حکمراں ہوگئی!

حصہ یازدہم

انگریزوں کا عہدِ استیلا

انگریزوں کا عہدِ استیلا

تجارت کی کوٹھی ایوانِ حکومت کے رُوپ میں

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ

مسلمانوں کی حکومت، اقتدار، شان و شکوہ، انفرادیت کا خاتمہ

سجن و زنداں، دار و رسن، قتل و غارت اور ظلم و شقاوت کی کہانی،

دورِ افرنگ

فرنگی اقتدار و عروج کے عہد بہ عہد کی داستان

فرانسیسیوں سے آویزش، ریاستوں سے سازباز، کذب و دروغ کا طومار

بے وفائیاں، عہد شکنیاں، فریب کاریاں، خود غرضیاں، بے رحمیاں

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

بنگال پر انگریزوں کا قبضہ

فرخ سیر کے عہد میں بنگال کا ناظم مرشد قلی خاں تھا، یہ بڑا خوش تدبیر اور منتظم تھا۔ اس سے قبل دکن میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ بنگال کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اسے رشک جنان بنا دیا، نظم و انتظام درست ہو گیا، رعایا میں اطمینان و [illegible] قائم ہو گیا اور عہد عالمگیری کا امیر تھا، اس کے زمانہ میں اڑیسہ میں نمایاں خدمات انجام دے چکا تھا، عالمگیر اسے بہت عزیز اور محبوب رکھتا تھا، انگریزوں کے قدم اسی دور میں بنگال آئے، لیکن وہ پنپ نہ سکے، مرشد قلی خاں ان سے سخت بیزار اور متنفر تھا، لاکھ لاکھ کوششیں کیں، تحائف گزارے، دلّی میں سفارت بھیجی بادشاہ پگھل بھی گیا لیکن مرشد قلی خاں نے فرنگیوں کے قدم جمنے نہ دیئے، ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا خویش شجاع الدولہ اس منصب پر فائز ہوا، وہ اڑیسہ کا گورنر تھا، اس طرح بہار و اڑیسہ بھی بنگال میں شامل ہو گئے، شجاع الدولہ کا دور بھی شان سے گزر گیا، اس کی بھلائیوں نے برائیوں کو ڈھانپ لیا تھا، ۱۱۵۲ھ میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں اس منصب پر فائز ہوا، لیکن مہابت جنگ علی وردی خاں نے اسے ٹکنے نہ دیا چند ہی روز میں اسے ہٹا کر سپہ سالار سے ناظم بنگالہ بن گیا (۱۱۵۳ھ) سے تقریباً سولہ برس تک بڑے دبدبہ اور شان سے خدمت کرتا رہا، دشمن کو ہر طرح سے زیر کرنے میں کمال رکھتا تھا، ۱۱۶۹ھ میں اسّی سال دنیا کی بہار دیکھ کر یہ مرا تو اس کا نواسا سراج الدولہ مسند نشین ہوا، کیونکہ اولاد نرینہ سے محروم تھا، سراج الدولہ کم عمر اور نوجوان تھا، بہادر تھا لیکن صاحب تدبیر نہ تھا، انگریز، قاسم بازار اور کلکتہ میں تجارت شروع کر چکے تھے علی وردی اور شجاع الدولہ سے زک کھا چکے تھے، لیکن تاک میں تھے، سراج الدولہ جب مسند پر بیٹھا تو بہت سے عزیز اور رشتہ دار مسند حکومت کا دعوٰی کرنے والے پیدا ہو گئے، انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا بھڑا دیا سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کیا، انگریز شکست فاش کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے، سراج الدولہ کلکتہ میں فاتحانہ

لہ مرشد آباد — اسی مرشد قلی خاں کا بسایا ہوا اور اسی کے نام سے مشہور ہے، یہ شہر اب بھی مغربی بنگال (بھارت) کا ایک حصہ ہے۔ مسٹر ریڈکلف کی بدولت بھارت میں شامل ہو کر ہاتھ سے نکل گیا۔

شان سے داخل ہوا، گرفتار شدہ انگریز سپاہیوں کی جان بخشی کی، مانک چند نو شہرہ کا حاکم مقرر کیا، یہ حادثات مسند حکومت پر متمکن ہوتے ہی پیش آ گئے (۱۱۶۹ھ)

سراج الدولہ کا قتل

انگریزوں نے سراج الدولہ کے بھتیجے میر جعفر کو آلہ کار بنا کر حکومت کا مدعی بنایا، ادھر کلکتہ کے امی چند سے سازش کر کے، ارکاٹ سے فوج لائے، فوج کا سپہ سالار کلائیو تھا، اور امیر البحر واٹسن اور کلکتہ پر حملہ کر دیا، مانک چند کی مدد کو سراج الدولہ پہنچا، اس مرتبہ انگریزوں نے صلح کی استدعا کی جو قبول ہوئی، صلح کے بعد سراج الدولہ مرشد آباد چلا گیا اور میر جعفر نے اندر اندر جب سراج الدولہ کے ہندو امرا، سرداران فوج اور امرائے ملک کو ورغلا لیا، تو انگریز مرشد آباد پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے، پلاسی کے میدان میں لڑائی ہوئی، یہ لڑائی بھی سراج الدولہ آسانی سے جیت لیتا لیکن میر جعفر کی سازش کامیاب ہو چکی تھی، سپاہ نے کچھ نہ کیا صرف چند جاں نثار لڑتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سراج الدولہ کو شکست ہوئی، (۱۱۷۰ھ) انگریزوں نے گرفتار کر کے بے دردی سے اسے قتل کر دیا اور شہر (مرشد آباد میں) اس کی لاش کی تشہیر کرائی،

میر جعفر کا دور

انگریزوں نے میر جعفر کو فرماں روائے بنگال مان لیا، اس نئے فرماں روا نے سب کچھ انگریزوں کو دے دیا اور ان کے اشارہ پر رقص کرنے لگا، ادھر جعفر کا خویش میر قاسم جو دربار پر اور جعفر پر بری طرح حاوی تھا، اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگا، اس نے انگریزوں سے "خدمت" کے وعدے کر کے ہموا بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۷۴ھ میں جعفر کو معزول کر کے میر قاسم کو مسند پر بٹھا دیا،

قاسم نے حکومت پر قابض ہونے کے بعد آلہ کار بننے سے انکار کر دیا، نظم مملکت کی طرف توجہ کی، اپنی آزادی کی حفاظت کی، رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، انگریز پریشان ہو گئے اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ آخر تنگ آ کر قاسم مرشد آباد سے مونگیر چلا گیا انگریزوں نے دباؤ ڈالا کہ انہیں چنگی کے محصول سے مستثنیٰ کر دیا جائے جب قاسم مجبور ہو گیا تو یہ بات مان لی، لیکن دیسی تاجروں کو بھی یہ رعایت دے دی، انگریز جل گئے، اور لڑائی کا آغاز کر دیا، ۱۱۷۷ھ کی لڑائی میں اس کا پلہ فرانسیسی سردار سمرو کی مدد سے بھاری رہا، لیکن

اسی سنہ کی دوسری جنگ میں قاسم کے ایک سردار نجف خاں نے غداری کی ——— یہی بعد میں شاہ عالم کے ساتھ دلی پہنچا جس کا نجف گڑھ اب تک موجود ہے ——— انگریزوں سے مل گیا انگریزوں نے شب خون مار کر فتح حاصل کر لی، اور پھر میر جعفر کو مسند نشین کر دیا، میر قاسم اودھ شجاع الدولہ کے پاس پہنچا، شجاع الدولہ نے اسے نظر بند کر کے بکسر کے مقام پر انگریزوں اور شاہ عالم کی سرپرستی میں جنگ کی لیکن ہار گیا، شاہ عالم نے شکست کے بعد انگریزوں سے دوستی کر لی، اور بنگال، بہار اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کے حوالے کر دی، میر جعفر کے انتقال کے بعد (غالباً ۱۱۷۹ھ) انگریز پورے طور پر بنگال کے مالک بن گئے۔

سندھ قبضۂ فرنگ میں مغلوں کی کمزوری نے تمام دور دست علاقوں میں ان کا اثر و رسوخ ختم کر دیا تھا، ہر جگہ نئے نئے حالات پیدا ہو رہے تھے، نئی نئی حکومتیں بن رہی تھیں، نئے نئے بادشاہ جلوہ فرما ہو رہے تھے، ۱۱۴۹ھ میں جب سندھ پر بس نہ چلا، تو میاں نور محمد خاں کلہوڑہ پورے سندھ کے "ٹھیکہ دار" بادشاہ دلی کی طرف سے سندھ کی بادشاہت ان کے ہاتھ میں آ گئی، لیکن تیسرے ہی سال نادر شاہ درانی دلی کو لوٹ کر ادھر پہنچا، بیٹے کو یرغمال میں ساتھ لیتا گیا، ایک کروڑ روپیہ نقد لیا اطاعت کا عہد لیا، خراج کا قول لیا، بھکر کو سندھ سے کاٹ کر قندھار سے ملحق کر دیا (۱۱۵۲ھ) اور واپس چلا گیا، پھر دوسرے سال ابدالی طوفان آیا، بادشاہ سلامت میاں نور محمد نے جیسلمیر میں پناہ لی، وہیں موت کے شاہین نے اپنے پنجہ میں داب لیا، بیٹا سر بلند خاں سندھ پر فائز رہا لیکن نااہل ثابت ہوا، ۱۱۸۰ھ میں ارکان دولت نے اسے قصر شاہی سے جیل خانے میں پہنچا دیا، وہیں وفات پائی، اب چھوٹا بھائی غلام شاہ تخت نشین ہوا، لیکن اب تالپور ابھر رہے تھے اور ان سے آویزش شروع ہو چکی تھی ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں وہ مالک تاج و علم ہو گئے، انہوں نے سندھ کو آپس میں تقسیم کر لیا، اور اس خاندان کی تین حکومتیں قائم ہو گئیں۔

۱- ایک حیدرآباد میں جس کا پہلا فرماں روا میر فتح علی خاں اور آخری میر محمد حسین علیخاں تھا،

۲- دوسرے میر پور خاص میں اس کا پہلا فرماں روا میر تھارا خاں اور آخری میر شیر محمد خاں تھا،

۳۔ تیسرے خیرپور میں جس کا پہلا فرماں روا میر سہراب خاں تھا،

یہی لوگ سندھ کے "میر" ہیں جو اب تک کچھ نہ ہونے پر بھی بہت کچھ ہیں، یہ تینوں حکومتیں متحد ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے الجھتی رہیں، اور کمزور ہوتی رہیں!

میروں کی حکومت کا خاتمہ ۱۷۸۳ء (۱۱۹۸ھ) میں میروں کی حکومت قائم ہوئی تھی، ۱۸۴۳ء (۱۲۶۰ھ) میں انگریزوں نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا

۱۔ ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے بھکاری بن کر سندھ میں تجارتی حقوق حاصل کئے ——— اس واضح شرط کے ساتھ کہ سندھ کی سرزمین پر للچائی ہوئی نظر نہیں ڈالیں گے۔ نہ اندرونی معاملات میں مداخلت کریں گے!

۲۔ ۱۸۳۸ء میں افغانستان پر انگریزوں نے فوج کشی کی، اور خلاف معاہدہ ان کا لشکر سندھ کی سرزمین کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھا، اور شکار پور و بھکر پر قبضہ بھی کر لیا،

۳۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے زبردستی ان رؤساؤں کو اپنا باج گذار بنا لیا جس پر انگریز مؤرخین تک نے ملامت کی ہے!

۴۔ ۱۸۴۳ء / ۱۲۶۰ھ میں جنرل نیپیر ——— جس کے نام سے منسوب نیپیر روڈ اب تک کراچی میں موجود ہے) ——— نے میروں سے زبردستی جنگ چھیڑی، حیدرآباد اور میرپور خاص کے میروں کو جلاوطن کر کے ان دونوں حکومتوں کو ختم کر دیا، خیر پور نے سر اطاعت جھکا دیا، بیٹوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر ختم کر دیا۔ لہٰذا وہ ایک ریاست کی حیثیت سے اب تک موجود ہے، لیکن اس کے حدود بھی بہت کم کر دیئے گئے۔

۵۔ نیپیر کی امداد و اعانت میں جہاں آغا خان اول پیش پیش تھے، وہاں سندھ کے دوسرے "مسلمان" اُمراء، رؤسا، اور شرفا بھی کسی سے پیچھے نہ تھے،

حیدرآباد پر انگریزوں کا تسلط نظام الملک آصف جاہ دکن میں صوبیدار بن کر آیا تھا، لیکن مرکز کی کمزوری سے حکمران مطلق بن بیٹھا، نام اگرچہ ماتحتی کا تھا، لیکن عملاً خود مختار تھا، اس کے بعد سے یہی خاندان اب تک وہاں کا ——— پہلے حقیقی طور پر اب نام نہاد

طور پر ـــــــ حکمران چلا آرہا ہے۔

نظام الملک کے بعد جنوبی ہند فرانس اور برطانیہ کے تاجروں کی آماجگاہ بن گیا، انگریزوں نے جہاں بڑے نامور بھیجے وہاں فرانس کے ڈوپلے کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان لوگوں کی اصلی تکنیک "سازش" تھی یہ مسلمان حکمرانوں کو پہلے آپس میں لڑاتے تھے، پھر خود جیتنے والے کے مددگار بن کر، یا اس سے بھڑ جاتے تھے یا زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کر لیتے تھے مراعات کاروباری اور حقوق سیاسی اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا!

فرانسیسیوں کی سازشیں

فرانسیسیوں نے سازشوں کا جو جال خاندان آصفجاہی اور ارکاٹ کے نواب اور مرہٹہ سرداروں سے مل کر تیار کیا تھا، اور جو خوفناک جنگ کی صورت میں رونما ہوا اس میں نظام الملک کا ہونہار بیٹا ناصر جنگ ہلاک ہوا (۱۷۵۰ء / ۱۱۶۲ھ) پھر نظام الملک کا ایک اور بیٹا صلابت جنگ تخت نشین ہوا جس سے فرانسیسیوں نے بڑی آسانی سے اڑیسہ کے چار ضلعے جاگیر میں حاصل کر لئے، ادھر مرہٹوں نے خاندیش پر قبضہ کر لیا اور دوسرے مقامات پر حملے شروع کر دیئے ۱۷۶۰ء / ۱۱۷۲ھ کی جنگ کے بعد ادوگیر میں نظام نہ صرف خاندیش سے دستبردار ہوا بلکہ بیجا پور اور دولت آباد پر بھی ان کا قبضہ تسلیم کر لینے پر مجبور ہو گیا،

انگریز اور نظام

صلابت جنگ کے بعد اس کا بھائی نظام علی تخت نشین ہوا ـــــ موجودہ فرماں روا اسی کی اولاد میں سے ہیں ـــــــ!

نظام بڑا دوراندیش اور صاحب تدبیر اور بہادر ثابت ہوا اس نے مرہٹوں سے جی بھر کے انتقام لیا اور پچھلے تمام متروکات واپس لے لئے، فرانسیسی سپہ سالار ڈوپلے نے اس کی فوج کو جدید طرز پر مکمل کر کے اسے جنوبی ہند میں بہت بڑی طاقت بنا دیا تھا!

انگریز بھی جنوبی ہند میں موجود تھے اور نظام اور فرانسیسیوں سے خائف ۱۷۹۸ء میں ڈیوریموں کا انتقال ہوا، انگریزی لشکر قریب ہی تھا اس نے خاندان آصفیہ کے غداروں کی مدد سے چھاونی کو گھیر کر اپنا تسلط

قائم کرلیا اور اب نظام فرانسیسیوں سے کٹ کر انگریزوں کا حلیف بننے پر مجبور ہوگیا، اور یہ "دوستی" نازک سے نازک مواقع پر بھی قائم رہی، خود انگریزوں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر نظام ان کا دوست نہ ہوتا، تو وہ غدر میں سلامت نہیں رہ سکتے تھے، اسی طرح تحریک خلافت کے زمانہ میں انگریزوں کا نظام نے ساتھ جان و مال سے دیا، اسی طرح پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں!

سلطنت میسور کا خاتمہ

جنوبی ہند میں ایک اور مسلمان حکومت میسور کی تھی، جسے حیدر علی کے زور بازو نے قائم کی تھی، اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کی شہادت نے اسے ختم کردیا ٹیپو سلطان نے مرہٹوں کو خوب پیٹا، نظام کے وار بھی سہہ لئے لیکن انگریزوں کی سیاست، سازش اور اپنوں کی غداری، عداوت اور جاہ طلبی کا مقابلہ نہ کرسکا، ہار گیا!

حیدر علی سے لڑائی

مرہٹوں کو ساتھ لے کر انگریز پہلی مرتبہ حیدر علی سے نبرد آزما ہوئے، لیکن حیدر علی نے دونوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ من مانی شرائط پر صلح نامہ پر دستخط کرنے پر انگریز مجبور ہوگئے، (۱۷۶۹ء / ۱۱۸۴ھ) اس کے بعد دوسری جنگ ۱۷۸۴ء / ۱۱۹۷ھ میں ہوئی اس میں بھی انگریزوں کو ذلت بخش شکست ہوئی،

ٹیپو سلطان

بیس برس تک حکومت کرکے حیدر علی اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کا بیٹا ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا، ۱۷۸۲ء / ۱۱۹۵ھ ٹیپو کا عہد بہت شاندار تھا حدود مملکت میں اتنی توسیع ہوئی کہ ایک لاکھ مربع میل کا بادشاہ بن گیا، مرہٹوں کی دراز دستیوں کا سدِ باب بھی بڑی حد تک ہوگیا تھا، نظام بھی اسے تہس نہس اور غارت کرنے پر تلا ہوا تھا، مرہٹوں سے مل کر انگریزوں کی سرپرستی میں وہ برابر چھیڑ چھاڑ بلکہ جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رکھتا تھا،

انگریز اگرچہ ٹیپو کے حلیف تھے معاہدے کرکے پیمان دوستی مستحکم کرچکے تھے، لیکن برابر "اکھاڑ پچھاڑ" کی فکر بس مصروف و منہمک رہتے تھے، انگریز از روئے معاہدہ پابند تھے کہ جب کسی دشمن سے ٹیپو کی لڑائی ہوتی وہ مدد کریں ———— وہ مدد کرتے تھے، لیکن ٹیپو کی نہیں اس کے دشمنوں کی!

۱۷۹۲ء / ۱۲۰۶ھ میں نظام مرہٹوں اور انگریزوں سے جو جنگ ہوئی اسے ٹیپو اپنے غداروں اور نمک حراموں

کے باعث نہ جیت سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ضلعے مرہٹوں، نظام اور انگریزوں کے حوالے کرنے پڑے، تاوان بھی ادا کرنا پڑا، اور آخر میں کورگ سے بھی دست بردار ہونا پڑا، کورگ کا مطالبہ انگریزوں نے اس وقت کیا جب معاہدہ پر دستخط ہو چکے تھے تاوان کی رقم دی جا چکی تھی، اور سلطان کے بیٹے یرغمال کے طور پر تحویل میں آ چکے تھے۔ ٹیپو کورگ سے دستبردار تو ہو گیا لیکن خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا،

ٹیپو سلطان کی شہادت

ٹیپو انگریزوں کو سمجھ گیا تھا، وہ ان سے نفرت کرنے لگا تھا، وہ ان کے عزائم سے واقف ہو گیا تھا، وہ ان کی سیہ کاریوں کا راز آشنا ہو گیا تھا، وہ انہیں تباہ کر دینا چاہتا تھا، اس نے اپنے معاصرین کو اس فتنہ کی طرف توجہ دلائی مگر کوئی متوجہ نہ ہوا، ادھر انگریز بھی اسے فتح کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، سلطان کا دیوان میر صادق[1] انگریزوں سے باقاعدہ مل چکا تھا، نائب دیوان پورنیا بھی انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا، اور بھی کئی امیر و سردار آقا کشی میں ایک دوسرے سے بازی لئے جا رہے تھے، ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں "اتحادیوں" کا لشکر سرنگا پٹم پر بڑھا ——— یہ اتحادی، مرہٹہ، انگریز اور نظام تھے ——— اندر سے دیوان اور نائب دیوان اور دوسرے امرا اور ہندو شریک سازش تھے، جنگ شروع ہوئی اور ہو گئی، حضرت سلطان اور اس کے چند جاں نثار آخر وقت تک لڑتے رہے، سلطان امان طلب کر کے جان اور مال اور کسی حد تک حکومت بھی بچا سکتا تھا، لیکن اس کا عقیدہ تھا

کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیات جاوداں سے

لڑتے لڑتے میدان جنگ میں اس نے جان دی اور واصل جنان ہوا،

سلطان کی شہادت کے بعد اس کے بیٹوں کو وظیفہ دے کر مختلف مقامات پر بھیج دیا گیا، کچھ علاقہ اتحادیوں نے لے لیا، باقی پر میسور کی ریاست بن گئی! جس کا پہلا دیوان سلطان کا نائب دیوان پورنیا تھا!

سرنگا پٹم سے انگریزوں کو اتنی دولت ملی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور یہ ساری دولت بلا شرکت غیرے ان کے ہاتھ آگئی!

---

[1] یہ وہی میر صادق تھا جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے :۔ جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگ آدم، ننگ دین، ننگ وطن

اودھ پر انگریزوں کا اقتدار

محمد امین برہان الملک کا ذکر ہم دلی کی واردات میں پڑھ چکے ہیں یہ ایک ایرانی تاجر تھا، دلی پہنچ کر سپاہی بن گیا پھر اللہ آباد کی صوبہ داری پر فائز ہوا پھر نادرشاہ سے مل کر دلی کو لٹوا دیا، پھر اپنی حکومت کا تانا بانا بننے لگا اولاد نرینہ تھی نہیں لہٰذا داماد اور بھانجا صفدر جنگ جانشین ہوا، صفدر جنگ نے وزارت کے ساتھ ساتھ اودھ کی صوبہ داری بھی برقرار رکھی، ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں فوت ہوا، وفات تک دارالحکومت فیض آباد میں ہوئی تھی، تدفین دلی میں ہوئی جہاں "مقبرۂ صفدر جنگ" اب تک شکوہ و تجمل کے ساتھ موجود ہے۔

شجاع الدولہ کا کردار

اودھ کی حکومت کا باقاعدہ آغاز صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ کے عہد سے ہوا، یہ اتنا بڑا سیاست داں تھا کہ اگر آج زندہ ہوتا تو بین الاقوامی مدبرین کی صف اول کے پہلے نمبر پر ہوتا، تعمیر و تخریب دونوں کا بادشاہ تھا، تعمیر ایسی کہ فیض آباد کو رشک جنت بنا دیا، تخریب ایسی کہ بریلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، دوست ایسا کہ مرہٹوں تک سے عہد وفا نباہ دیا، دشمن اور دوست کش ایسا کہ حافظ رحمت خاں کی جان لے کر رہا (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء) مدبر ایسا کہ ساتھ نہ دینے کے باوجود احمد شاہ ابدالی کا معتمد رہا، اور دور اندیش اتنا کہ جب تک مرہٹے ختم نہ ہو گئے ان کا معتمد بنا رہا، اسی کے ذریعہ وہ ابدالی سے صلح و سلام کی سلسلہ جنبانی کرتے رہے، حریص سلطنت اتنا کہ میر قاسم کو پناہ دینے کے بجائے نظر بند کر کے انگریزوں پر بکسر میں چڑھ دوڑا اور ہوشیار اتنا کہ ہارتے ہی ان سے ایسی دوستی کر لی کہ ان کی کمک پر دوسری ہمسایہ مسلم حکومتوں کو ختم کرنے لگا، منتقم اتنا زبردست تھا کہ روہیلوں کا وجود ہی ختم کر دیا، ان حوصلہ مندیوں اور چالاکیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرخ آباد، رنگش، بریلی اور حافظ رحمت خاں کا نجیب آباد وغیرہ پر قابض ہو گیا، صرف رام پور کی ایک چھوٹی سی ریاست الگ بن گئی، انگریزوں نے طے یہ کیا کہ انہیں بیس چھ آنے مالگذاری کے ملتے رہیں، باقی حق شجاع الدولہ کا، اس کے عہد میں اودھ ایک ملک بن گیا، اس کی حکومت ایک مملکت بن گئی، ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں وفات پائی، اور اس کی وفات نے سلطنت اودھ کو متزلزل کر دیا

آصف الدولہ کا عہد شجاع الدولہ نے آزادی کا جو بھرم قائم کر رکھا تھا، وہ اس کے بیٹے آصف الدولہ کے دور میں قائم نہ رہ سکا، ظاہری ٹیپ ٹاپ مبہت تھی، لیکن انگریزوں کا عملی دخل بڑھنے لگا تھا، آصف الدولہ فیض آباد سے لکھنؤ آ گیا اور اب لکھنؤ عروس البلاد بن گیا، لیکن انگریزوں کی زیر سیادت،

۱۷۹۷ء / ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا، وراثت کے جھگڑے انگریزوں کی مدد سے سعادت علیخاں جیتا لیکن اس طرح کہ الہ آباد انگریزوں کو دینا پڑا، اس کے علاوہ لاکھوں روپیہ کی نقد رقم، لیکن انگریزوں نے قناعت تو سیکھی نہیں تھی، لارڈ ولزلی نے دباؤ ڈال کر ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۵ھ میں اودھ کا بہت بڑا حصہ کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا، اور سعادت علی خاں کچھ نہ کر سکا سوا اطاعت کے! ——— اب تک انگریز صرف الہ آباد کے مالک تھے، اب روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، اعظم گڑھ، بستی، گورکھ پور پر ایک ہی ڈانٹ میں قابض ہو گئے، بنارس کے اضلاع اس سے پہلے ہی مل چکے تھے! اس طرح چشم زدن میں اودھ کی مملکت ایک معمولی سی ریاست بن گئی انقلاب اس طرح آتا ہے!

سعادت علی خاں کی بے بسی ۱۸۱۴ء / ۱۲۲۸ھ میں سعادت علی خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غازی الدین حیدر بادشاہ تخت پر بیٹھا، اسے انگریزوں نے اور زیادہ دبایا اور جو کچھ چاہا حاصل کر لیا، غازی الدین کے بعد نصیر الدین حیدر پھر محمد علی شاہ پھر امجد علی شاہ، پھر واجد علی شاہ علی الترتیب تخت پر بیٹھے، لیکن ہر نئے فرماں روا کو انگریز دباتے رہے، یہاں تک کہ ۱۸۵۶ء میں بغیر کسی وجہ کے، باہمہ اطاعت و نیازمندی اودھ کا الحاق کر لیا اور واجد علی شاہ کو وظیفہ دے کر کلکتہ بھیج دیا اور اس طرح وہ تمام معاہدے پس پشت ڈال دیئے گئے، وہ تمام احسانات فراموش کر دیئے گئے جو بادشاہان اودھ نے انگریزوں سے کئے تھے، ان تمام نیاز مندیوں کو نظر انداز کر دیا گیا، جن کا مظاہرہ اودھ کے تخت نشین سعادت علی خاں کے وقت سے واجد علی شاہ تک کرتے آئے تھے، لکھنؤ کے انگریز ریذیڈنٹ سلیمن اور ہند کے انگریز حاکم کل لارڈ ولزلی تک کو رحم آیا، اور کمپنی کو اس ظالمانہ اقدام سے روکنا چاہا لیکن ان کی ایک نہ چلی اودھ کا الحاق ہو گیا اور واجد علی شاہ نظر بند ہو گئے،

سکھوں کا خاتمہ

سکھ مذہب کے بانی گرو نانک نیم مسلمان شخص تھے بلکہ بعض مؤرخین کے نزدیک مسلمان ہی تھے، وہ کعبہ شریف بھی گئے تھے یہی بات ان کے مسلمان ہونے کے ثبوت میں کہی جاتی ہے، بہر حال وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں لیکن مسلمانوں سے متاثر بہت تھے، ان کا مذہب تمام تر اسلام کا عکس ہے، خدا کی وحدانیت، اونچ نیچ اور چھوت چھات سے بیزاری۔ ان کی مذہبی کتاب "گرنتھ" میں مسلمان صوفیا کے اقوال و اشعار کافی موجود ہیں، گرو نانک کے بعد ان کے جانشینوں نے سیاست میں پاؤں نہیں اڑایا، وہ آرام سے رہے جنہوں نے سیاست میں حصہ لیا انہوں نے اس کے نتائج بھی بھگتے، رفتہ رفتہ مغلوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی، ۱۷۶۲ء/۱۱۷۵ھ میں احمد شاہ ابدالی نے ان کی سرکوبی کی، ان کے شرپسندوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتے وقت سردار آلا سنگھ کو سرہند کی عملداری دے دی، اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مسلمان بادشاہ کی امداد سے ہم دیکھتے ہیں کہ سکھ ایک چھوٹے سے رقبہ پر حکومت کرنے لگے۔

رنجیت سنگھ

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں سکھوں میں سرکشی، رہزنی اور قتل و غارت کا مادہ پیدا ہو چکا تھا وہ سرہند کی حکومت نے اور بڑھا دیا، ابدالی کے چلے جانے پر اس کی وفات کے بعد پنجاب کے وارثوں میں جنگ زرگری شروع ہو گئی، سکھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور گجرانوالہ کے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ نے زمان شاہ ابدالی والی کابل کی عنایت سے لاہور کی حکومت کا پروانہ اور راجہ کا خطاب حاصل کر لیا، رفتہ رفتہ رنجیت سنگھ عروج و قوت کا حامل بن گیا،

اب انگریز بھی دلی تک پہنچ چکے تھے، انگریزوں اور سکھوں میں ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ میں ایک معاہدہ ہوا، اب رنجیت سنگھ کی ہمت اور بڑھ گئی، اس نے ۱۸۱۸ء/۱۲۳۴ھ میں ملتان پر قبضہ کر لیا، پھر ایک سال بعد وہ کشمیر پر بھی قابض ہو گیا، پنجاب اور کشمیر کے علاقے کابل کے ماتحت تھے، وہاں کے لوگ اپنے جھگڑوں میں پڑے ہوئے تھے، انگریزوں سے معاہدہ ہو چکا تھا، دلی سے کوئی اندیشہ نہیں تھا، سکھ کھل کھیلے، یوں تو سبھی ظلم کرتے تھے، لیکن مسلمانوں پر سفاکانہ مظالم کی انتہا اپنے دورِ حکومت میں کر دی، رنجیت سنگھ نے پشاور اور صوبہ سرحد پر بھی قبضہ کر لیا، اس کی مسلم آزاری کے باعث حضرت سید احمد شہید کچھ جانبازوں کے ساتھ جہاد

کرتے ہوئے بڑھے اور پشاور سکھوں سے چھین لیا، (۱۸۳۰ء / ۱۲۴۶ھ) لیکن مسلمان خوانین نے حضرت کو شہید کرا دیا اور سکھ پھر قابض ہو گئے، رنجیت کا ۱۸۳۹ء / ۱۲۵۴ھ میں انتقال ہوا، سارا دم دمامہ اسی کی ذاتی صلاحیت اور جد و جہد کا تھا انگریزوں کو موقع ملا، وہ بڑی آسانی سے سارے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر ۱۸۴۹ء / ۱۲۵۴ھ میں سکھوں کو شکست دے کر سارے پنجاب پر قابض ہو گئے اور اس طرح سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا صرف معمولی سی چند سکھ ریاستیں باقی رہ گئیں، جنہوں نے انگریزوں کی سیادت قبول کر لی، رنجیت سنگھ کا سارا اثاثہ داخل خزانہ ہوا، اس کا بیٹا دلیپ سنگھ لندن جا کر عیسائی بن گیا۔

مرہٹوں کا استیصال انگریزوں کے ہاتھوں

انگریزوں نے مسلمانوں کی طرف سے اطمینان کر کے یعنی انہیں کچل کر دوسروں کی طرف توجہ کی، گوالیار، اندور، ناگپور، بڑودہ بڑی مرہٹہ حکومتیں تھیں، پونا کا مرکز ان کے سامنے بے دست و پا تھا انگریزوں نے سب کو آپس میں لڑایا، پھر جیسا موقعہ دیکھا اس کا ساتھ دیا، جو علاقہ چاہا لے لیا، مرہٹے کمزور ہوتے گئے، انگریزوں کے قدم جمتے گئے، ۱۸۱۸ء میں حسب معمول معاہدوں اور عہدناموں کو چاک کر کے انگریزوں نے پونا کی ریاست ختم کر دی، صرف ستارا میں ذرا سی مرہٹہ ریاست باقی رہنے دی گئی، وہ بھی ۱۸۴۸ء میں ڈلہوزی نے ضبط کر لیا، انگریز باقی ریاستیں بظاہر باقی رہیں، لیکن کامل طور پر انگریزوں کے متولی اور مالک بن گئے۔

اب عملی صورت یہ تھی کہ تقریباً سارے بھارت پر انگریزوں کا قبضہ تھا، اگرچہ دلی میں ایک بادشاہ موجود تھا اور نام نہاد طور پر سب اس کے ماتحت اور رعایا تھے!

ڈلہوزی

ڈلہوزی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک بھارت کا حاکم اعلیٰ رہا، اس عرصہ میں اس نے برطانوی حکومت کو دنیا کی سب سے بڑی مملکت بنا دیا، وہ ہر اصول، ضابطہ، قاعدہ، معاہدے اقرارنامے سے بالا تھا، جن ریاستوں نے حلقہ اطاعت گلے میں ڈال لیا تھا، انہیں بھی بغیر کسی وجہ کے ختم کر دیا اور کمپنی کی ملکیت بنا لیا، ایک اور اصول یہ بنایا کہ جس ریاست کا والی لاولد مرے وہ کمپنی کی ملکیت ہو جائے گی، اس طرح بہت سی ریاستیں ہضم کر لیں، برما پر قبضہ کر لیا، افغانستان سے جنگ چھیڑ دی عجیب منصوبہ ا

آدمی تھا، ستارا ناگپور، جھانسی، جیت پور، سنبھل پور اور بہت سی ریاستیں ضبط کرلیں۔ نظام سے برار لے لیا گیا، (۱۸۵۳ء) اور بھی اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں لیکن گنجائش نہیں۔

فرنگی اثرات اور کارفرمائیاں

اب تک ہندوستان کی دفتری زبان فارسی تھی اب انگریزی کا چلن ہونے لگا عدالتیں بھی انگریزی قائم ہونے لگیں۔ دل بدلنے کے لئے تعلیم کا ڈھانچہ بھی بدل دیا گیا، ہر چہار طرف سے جال پھینکے جانے لگے کہ اس دیس کی ہر چیز کو انگریز دل اور انگریزی کا غلام بنالیا جائے۔ چنانچہ یہ مقصد بہمہ وجوہ پورا ہوا!

۱۸۵۷ء کا غدر

۱۸۵۶ء میں ڈلہوزی کا جانشین کیننگ بن کر آیا! انگریزوں کی دراز دستیوں، فریب کاریوں چالاکیوں، بدعہدیوں، سفاکیوں ظلم آرائیوں اور رکیک حرکتوں نے اہل ہند کو انگریزوں سے بیزار اور متنفر کر دیا، مواد اندر اندر پھوٹ رہا تھا، مئی ۱۸۵۷ء میں بغاوت یا غدر کا نام پاکر یہ مادہ پھوٹ نکلا اور انگریزوں کو موقع مل گیا کہ وہ مکمل طور پر ہر نمائش اور تصنع سے بے پروا ہو کر اس ملک پر قابض ہو جائیں، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے، غدر کو فرو کرنے کے لئے مسلم والیان ریاست کی امداد و اعانت کے باوجود مسلمانوں پر خاص طور پر جو مظالم کئے ان کا ذکر کرتے ہوئے خود انگریز مؤرخین شرماتے ہیں اور ندامت کا اظہار کرتے ہیں ان کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان"! فرنگی مظالم کا ایسا آئینہ ہے جو خود ظالم کے ہم قوم نے تیار کیا ہے، اس آئینہ میں انگریز کی سیرت، کردار اور جبلت کو بہت اچھی طرح سے دیکھا جاسکتا ہے

سکھ اور انگریز

اس جنگ میں سکھوں نے خاص طور پر اور ہندوؤں نے عام طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا! نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان پس گئے، مٹ گئے، تباہ ہو گئے، غدر فرو ہونے کے بعد بھی ان کے بڑے آدمیوں کو پھانسی ملی، محلے کے محلے صاف ہو گئے، جائیدادیں ضبط ہوگئیں، جاگیریں چھین لی گئیں، دولت لوٹ لی گئی، ملازمت کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ہندوؤں اور سکھوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دی گئیں، نوازا گیا، انعام دیا گیا،

انگریزوں کا ظلم غدر کے سلسلہ میں کئی لاکھ ہندوستانیوں کا جن میں مسلمان زیادہ تھے، اور غیر مسلم کم انگریزوں نے صفایا کیا، صرف دلی میں ۲۷ ہزار نفوس مارے گئے، بہتوں نے خودکشی کرلی، بہت سی عورتیں کنوئیں میں گر کر خودکشی پر مجبور ہوگئیں، لال قلعہ کے پاس جتنے مسلم محلے تھے زمین کے برابر کر دیئے گئے، قلعہ کے محلات شاہی منہدم کر دیئے گئے، بادشاہ (ظفر) کے لڑکے کا سر اس کے سامنے پیش کیا، بادشاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا، اور اسے حبس دوام کی سزا دے کر رنگون بھیج دیا،

انگریز بادشاہ غدر کے بعد کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی اور حکومت برطانیہ نے باقاعدہ اس ملک کو اپنا غلام بنالیا۔

بادشاہوں کی فہرست یہ ہے!

۱۔ ملکہ وکٹوریہ ——— ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۱ء تک حکومت کی،

۲۔ ایڈورڈ ہفتم
۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک برسرحکومت رہے،

۳۔ جارج پنجم ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۶ء تک تخت پر متمکن رہے،

۴۔ ایڈورڈ ہشتم صرف ایک سال برسرحکومت رہے (۱۹۳۶ء)

۵۔ جارج ششم،
۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۲ء تک بادشاہ رہے۔

۶۔ ملکہ الزبتھ ۱۹۵۲ء سے موجودہ عورت بادشاہ

حصہ دوازدہم

پاکستان

پاکستان

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت
بہ آں ملت سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

(اقبال)

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد

۱- ہندوؤں کا سیاسی شعور ——

۲- مسلمانوں کی بے شعوری ——

۳- تحریک خلافت ——

۴- ہندو مسلم اتحاد ——

۵- آزادی کا قافلہ ——

۶- نفاق کے شعلے ——

کشمکش اور کشاکش

۱۸۵۷ء کا غدر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا، وہ صرف حکومت ہی سے محروم نہیں ہوئے، بلکہ ہر چیز سے محروم ہو گئے، ان کی دولت چھنی، عزت لٹی، جاگیریں چھین گئیں، ذرا سے شبہ پر پھانسی کا پھندا ان کے گلے تک پہنچا، اور وہ ہلاک کر دیئے گئے۔

انگریز سب سے زیادہ مسلمانوں ہی سے خفا تھے اور آئندہ کے لئے بھی انہیں مسلمانوں ہی سے خطرہ تھا، ہندو سو سال سے محکومی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے، لہٰذا حکومت کا یہ انقلاب ان کے لئے کوئی معنیٰ نہیں رکھتا تھا، مغلوں کے بجائے انگریز سہی، بہرحال اگر انگریز مسلمانوں سے خفا تھے تو خود مسلمان بھی ان سے نالاں اور متنفر تھے، انگریز اگر انہیں باغی اور سرکش سمجھ رہے تھے تو مسلمان بھی انہیں ظالم، سفاک اور کافر سمجھتے تھے، انگریز اگر ان سے ایک گز ہٹتے تھے، تو وہ انگریزوں سے ایک میل پرے ہٹ جاتے تھے ——— انگریز اس لئے خائف تھے کہ انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، اور مسلمان اس لئے متنفر تھے کہ انگریز غاصب، خود غرض احسان فراموش اور ظالم و سفاک ثابت ہوئے تھے،

ناقابلِ عبور خلیج

اس ذہنی کشمکش اور کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی، وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے، ان کی تہذیب سے نفرت کرتے تھے، ان کے علوم سے نفرت کرتے تھے، ان کی زبان سے نفرت کرتے تھے، وہ انگریزی لباس کو

"من تشبه بقوم فهو منهم" کی آڑ لے کر حرام قرار دے چکے تھے، وہ انگریزی علوم کو بھی خباثت ورذائل اور "کفر" کا مجموعہ قرار دے کر حرام قرار دے چکے تھے، وہ انگریزی زبان کو بھی کافروں کی زبان سمجھتے تھے اس لئے وہ بھی حرام مطلق قرار دے دی گئی تھی، وہ ہر اس چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور حرام قرار دے دیتے تھے، جس میں ذرا بھی انگریزیت اور فرنگیت کی جھلک نظر آئے۔

انگریزوں نے مدرسے کھولے، کالج بنائے، یونیورسٹیاں قائم کیں، لیکن مسلمانوں نے ان کا بائیکاٹ کیا، وہ انگریزوں سے کسی درجہ میں بھی تعاون کو "تعاون علی الاثم والعدوان" سمجھتے تھے، وہ ہرگز انگریزوں سے ربط ضبط بڑھانے، حالات پر قانع ہونے، قسمت پر شاکر ہونے اور وفادار وجاں نثار رعایا بننے کو تیار نہیں تھے، انہیں مرجانا منظور تھا، لیکن یہ منظور نہ تھا کہ بدلے ہوئے حالات کے سانچہ میں اپنے آپ کو ڈھال لیں، اس چیز کو وہ اپنی غیرت قومی اور حمیت ملی کے خلاف سمجھتے تھے، کسی شرط پر اور کسی درجہ میں بھی وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔

دورِ غربت و فلاکت

جاگیریں چھن چکی تھیں، زمینداریاں چھن رہی تھیں، ملازمت ہی آخری چارہ کار رہ گیا تھا، لیکن ملازمت جب ملتی کہ وہ انگریزی پڑھ کر کلرک بننے کی صلاحیت پیدا کرتے، انگریزی علوم حاصل کر کے ڈاکٹر بنتے، انجینئر بنتے، بیرسٹر اور وکیل بنتے، ماسٹر اور پروفیسر اور پرنسپل بنتے، اب وہ دور تو تھا نہیں کہ جس پر شاہجہاں کی نظر پڑی وہ نہال ہوگیا، یہ غلامی کا دور تھا، خود بادشاہ جمجاہ حوالات میں بند اور پھانسی کے منتظر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمت نہ ملی، روزگار کے ذرائع مسدود ہوگئے، روپیہ پیسہ تھا نہیں، نوبت فقر و فاقہ تک پہنچ گئی، جو دوست تھے وہ آنکھیں بدلنے لگے، جو عزیز تھے وہ کترانے لگے، جو زیر بار احسان تھے انہوں نے ملنا چھوڑ دیا، جو محلوں میں رہتے تھے، پالکی اور بگھی پر سوار ہو کر کاشانہ سے باہر نکلتے تھے، جن کی ڈیوڑھی پر ملازموں اور باندیوں کا تانتا لگا رہتا تھا، جو زر لفت کمخاب اور مشروع کے کپڑے پہنتے تھے اور جن کے دسترخوان پر ہر قسم کے الوان نعمت موجود رہتے تھے اب صبح دال روٹی کھاتے تھے تو شام کا سہارا نہیں ہوتا تھا، شام کو روکھی سوکھی مل جاتی تو صبح کی فکر تنگ کرنے لگتی تھی۔

چہ کند بادار فسوز ندم!

شرافت یک رہی تھی، نسب کا فخر، حسب کا غرور، خاندان کا تجمل خاک میں مل رہا تھا، ایک عجیب کسمپرسی اور تباہ حالی، بیکاری اور بے روزگاری پریشانی اور ادبار کا عالم تھا:

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے!

یہ غالب کا تغزل نہیں حقیقت اور واقعہ کی سچی تصویر ہے!

سرسید احمد خاں

یہ حالات تھے جب سرسید احمد خاں (جواد الدولہ، عارف جنگ سید احمد خاں بہادر) میدان عمل میں اترے!

سرسید نے محسوس کر لیا جو ہونا تھا وہ ہو چکا، حکومت جا چکی، اب وہ واپس نہیں مل سکتی، مسلمانوں نے اگر

زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز

پر عمل نہ کیا تو ایک نسل کے بعد وہ اس دیس میں اگر زندہ رہے تو اچھوتوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہوں گے!

چنانچہ سید نے اپنی قوم کو جو پیام دیا اور اس کے سامنے جو پروگرام رکھا اس کا خلاصہ یہ تھا:۔

۱۔ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے،

۲۔ حکومت سے تعاون کیا جائے،

۳۔ زندگی کے میدان میں جد وجہد کا سلسلہ جاری رکھا جائے!

سرسید کے اس پیام اور پروگرام کی سخت مخالفت کی گئی، علماء کے حلقہ سے ان پر درجنوں کفر کے فتوے صادر ہوئے صلحائے امت نے انہیں گمراہ، غالی، بدنہاد اور غدار ملت قرار دیا، قوم کے مالدار طبقہ نے سنی کی ان سنی کر دی عوام نے انہیں منہ نہ لگایا، لیکن وہ دھن کے پکے تھے، ان حالات سے وہ ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوئے، انہوں نے اپنی جد وجہد جاری رکھی، اپنا پیام ملک کے ایک ایک گوشہ میں پہنچایا، اپنے پروگرام کو نافذ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، وہ نہ کفر کے فتوے سے مرعوب ہوئے، نہ رفیقان راہ کی گریز پائی نے ان میں بد دلی پیدا کی، نہ دوستوں عزیزوں اور ساتھیوں کی مخالفتوں اور دماندازیوں نے ان کا حوصلہ پست کیا، نہ حکومت کی بے نیازی ان کے راستہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہوئی، نہ انگریزوں کے

تمرد اور غرور حکومت نے انہیں حواس باختہ کیا، نہ قوم کی سرد مہری اور ارباب ملت کے استغنا نے ان کے عزم کو کمزور کیا، وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں لگے رہے، گالیاں کھاتے تھے، کفر کے مار سہتے تھے، لیکن قوم کے لئے تن من دھن سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، اپنی ساری پونجی اسی کام کے لئے وقف کر دی، اپنے دوستوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا اور قوم کے در پر دھتکارے جانے کے باوجود بھکاری بن کر پہنچے، اور اس وقت تک نہ ٹلے جب تک جھولی میں کچھ پڑ نہ گیا، انہوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے اور قوم کی عملی خدمت کرنے، اور قوم کو پروان چڑھانے کے لئے بے سروسامانی اور ہجوم مخالفت کے عالم میں؛

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا توکلت عسلی اللہ تعالےٰ !

کہہ کر ۱۸۷۵ء کے وسط میں بہ مقام علی گڑھ اپنے "مدرسۃ العلوم" کی بنیاد ڈال دی —— یہی مدرسۃ العلوم آگے چل کر علی گڑھ کالج بنا اور اب علی گڑھ یونیورسٹی کے نام سے مشہور و معروف ہے!

علی گڑھ کے سپوت

سرسید نے ہمت سے کام لے کر یہ کارنامہ انجام دے ڈالا، بہت جلد اس کے خوشگوار نتائج بھی سامنے آگئے، شروع میں ان کی جتنی سخت و شدید مخالفت ہوئی تھی، بعد میں اسی زور شور سے ان کی تحریک پروان چڑھی اور کامیاب ہوتی مسلمان انگریزی مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونے لگے، علی گڑھ کالج تو گویا ان کا مرکزی تعلیمی ادارہ بن گیا ان درسگاہوں سے ڈگری لے لے کر جو طلبہ نکلے، وہ زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہے، انہوں نے بہت جلد وہ کمی پوری کر لی، جو غفلت کے باعث پیدا ہوگئی، اس کالج سے ایسے ایسے عالی دماغ طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے کہ انہوں نے نہ صرف بھارت اور پاکستان میں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اپنے فکر و تدبر کے لوہے منوا لئے، آج کون ہے جو جسٹس سید محمود، محمد علی، شوکت علی، آفتاب احمد خان، ڈاکٹر ضیاء الدین، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، لیاقت علی خان اور دوسرے صدہا سربرآوردہ علیگ اصحاب کی خدمت اور قیادت کے وصف سے انکار کر سکے، اسی "کفر" کے قلعہ سے اسلام کے وہ مجاہد اور سورما نکلے جنہوں نے استعمار و طاغوت کے قصور و محلات و ایوان میں تزلزل پیدا کر دیا۔

زلزل در ایوان کسریٰ فتاد!

ان کے کارنامے، ان کی خدمات اور ان کے ایثار کے واقعات تاریخ کا ناقابل فراموش جز بن چکے ہیں جنہیں نہ بھارت فراموش کر سکتا ہے، نہ پاکستان ——— نہ عالم اسلام!

سرسید کی اس خالص تعمیری اور تعلیمی تحریک کا اصل محرک یہ تھا کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ملک کی سب سے بڑی اکثریت ——— ہندو ——— نے انگریزی تعلیم میں فروغ حاصل کر کے مدرسوں کالجوں، یونیورسٹیوں، سرکاری دفتروں اور ایوان حکومت پر عملی قبضہ کر لیا ہے، عدالتیں ان کے وکیلوں اور بیرسٹروں اور ججوں اور حاکموں سے بھری ہوئی ہیں، درسگاہیں ان کے معلموں اور پروفیسروں سے معمور ہیں، حکومت کے دروازے ان کے لئے آغوش شوق کی طرح کھلے ہوئے ہیں، اور وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں، سرسید نے سوچا اگر ہندو یونہی آگے بڑھتے رہے اور مسلمان یونہی پستے، مٹتے اور گھٹتے رہے، تو اس کا انجام یہ اور صرف یہ ہوگا کہ مسلمان مٹ جائیں گے، اور ہندو ان سے بازی لے جائیں گے، لہٰذا انہوں نے کسی مخالفت اور مانع کی پروا نہ کی عزم و خلوص کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے،

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

سرسید کی باتوں میں، کاموں میں، تحریکوں میں خلوص تھا، یہ خلوص بے نتیجہ اور بے اثر نہیں رہا، رنگ لایا، وہی لوگ، جو کفر کے فتوے دے رہے تھے، آج ان کے پوتے اور پرپوتے اسی "کافر" کی درسگاہ سے سند فراغت لے کر نکلتے ہیں، اور ملک و ملت کی خدمت میں منہمک ہو جاتے ہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی سرسید کے خلوص نیک نیتی اور صداقت کا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟ اگر سرسید نے مسلمانوں کی ناخدائی خوف لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر نہ کی ہوتی تو پاکستان بن سکتا تھا، نہ مسلمان زندہ رہ سکتے تھے!

وضع احتیاط مسلمان ہندوؤں سے ہر دوڑ میں پیچھے رہے، لیکن جب وہ تلافی مافات پر آمادہ ہوئے تو بہت جلد آگے بھی نکل گئے۔

سرسید کی ساری توجہ صرف ایک بات پر مرکوز ہو گئی کہ مسلمان اپنی تعلیمی کمی پوری کریں، تعلیم اور سیاست

تعمیر اور تخریب کاروبار ایک ساتھ نہیں چلتا، چل ہی نہیں سکتا، لہٰذا عملی سیاست کو انہوں نے مسلمانوں کے لئے "شجر ممنوعہ" قرار دے دیا تھا، وہ چاہتے تھے جب تک مسلمان اپنی تعلیمی پستی دور نہ کرلیں کسی اور طرف ایک لمحہ کے لئے بھی متوجہ نہ ہوں!

ہندوؤں کی سیاسی تحریکیں اور جماعتیں

لیکن ہندو اپنی تعلیمی خامیاں دور کر کے بہت آگے نکل چکے تھے جس طرح مسلمانوں کے دور حکومت میں جی لگا کر انہوں نے فارسی پڑھی تھی اسی طرح اب انگریزی پڑھ لی تھی، مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی وہ اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز ہوتے رہتے، اب فرنگی راج میں بھی بلند تر سرکاری مناصب کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے تھے، معاش، معیشت اور تعلیم سے مطمئن ہو کر اب وہ یکسوئی کے ساتھ سیاست کے میدان میں کود پڑے، ہندوؤں کی یہ سیاسی تحریکیں بیک وقت منفی بھی تھیں اور مثبت بھی، یعنی سلبی بھی، اور ایجابی بھی!

ا۔ ان تحریکوں کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ مسلمانوں کو زک دی جائے، ان کا وقار ختم کر دیا جائے، ان کے مذہبی جذبات مجروح کئے جائیں، اور انہیں ایک ناکارہ جماعت بنا کر رکھ دیا جائے، ان کی قوت ختم کر دی جائے، اور یہ باور کرا دیا جائے کہ ماضی میں وہ جا ہے جو کچھ بھی رہے ہوں حال تاریک ہے، اور مستقبل تاریک تر!

۲۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ رفتہ رفتہ حکومت کی باگ ان کے حوالے کردیں، ——— صرف ان کے! ——— دوسرے الفاظ میں بھارت کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ان کے ہاتھ میں آجائے، اور مسلمانوں کا اس میں کچھ بھی حصہ نہ ہو!

سب سے پہلی سیاسی انجمن

اب ہم ذیل میں مختصر طور پر ہندوؤں کی سیاسی تحریکوں کا ذکر کرتے ہیں:-

۱۸۵۱ء میں ہندوستان کے اندر سب سے پہلی سیاسی انجمن قائم ہوئی جس کا نام "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" تھا۔

یہ انجمن ایسے زمانہ میں قائم ہوئی تھی جو ہندوستان کے سیاسی بچپن کا زمانہ تھا اس لئے چند معمولی کاغذی کارروائیوں کے حدود سے یہ آگے نہ بڑھ سکی۔

اس انجمن کے قیام کے چند سال بعد، چند مذہبی، نیم مذہبی اور سیاسی انجمنیں قائم ہوئیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ برہمو سماج ——— بنگال میں ۲۔ پرارتھنا سماج ——— مہاراشٹر میں

۳۔ آریہ سماج ——— پنجاب میں ۴۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی ——— مدراس میں

کم و بیش یہ انجمنیں ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں قائم ہوئیں، ان کے بانی گرونانک (بانی سکھ دھرم) کی طرح اسلام سے اس کی تعلیمات سے اس کی عالمگیر برادری سے، اس کی سماجی اور معاشرتی بلندی سے۔ اس کی مساوات انسانی و طبقاتی سے پوری طرح متاثر تھے، انہوں نے اسلام نہیں قبول کیا، اسلام کا بنیادی مسئلہ توحید ہے، ان تمام انجمنوں نے بھی بت پرستی کے خلاف اپنے حدود میں جہاد کیا اور توحید الٰہی پر زور دیا عورتوں کے حقوق میں بھی اسلام کی دیکھا دیکھی انہوں نے کچھ ترمیمیں کیں، اور ان کا وجود تسلیم کرنے کی کوشش کی، یہ عجیب بات ہے اسلام سے اپنے بنیادی نظریات مستعار لینے کے باوجود اسلام کے خلاف جتنی سرگرم معاندانہ کوششیں انہوں نے جاری رکھیں، سناتن دھرم اور جین مت کے پیروؤں نے نہیں کیں، برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے تو گرونانک کی طرح تقریباً مسلمان تھے لیکن ان کے جانشینوں نے یہ رنگ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہنے دیا۔

کچھ اور انجمنیں

مذکورہ جماعتوں کے بعد ہمیں کچھ اور انجمنیں بھی ابھرتی نظر آتی ہیں:-

۱۸۷۶ء میں یا اس کے قرب میں چند اور اہم انجمنیں قائم ہوئیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مہاجن سبھا ——— مدراس میں ۲۔ سروجانک ——— پونہ میں

۳۔ انڈین ایسوسی ایشن ——— بنگال میں ۴۔ بمبئی ایسوسی ایشن ——— بمبئی میں

سروجانک سبھا تلک کی پیداوار تھی، انڈین ایسوسی ایشن سر سریندر ناتھ بنرجی کی قوت عمل کا مظہر تھی بمبئی ایسوسی ایشن کے بانیوں میں دادا بھائی نوروجی تھے۔

ان سب انجمنوں میں ہندو ہی ہندو تھے، ان سب کا مقصد پراچین ہندوستان کا احیاء اور مسلم اقتدار کا خاتمہ تھا۔

اس بات پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیجئے کہ مسلمانوں کی طرف سے کسی طرح کی جارحانہ سرگرمیوں کا اظہار نہیں ہوا تھا، لیکن ان کے خلاف منظم اور مسلسل طور پر تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

کانگرس کی تشکیل ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۵ء کو آل انڈیا یونین کی تشکیل ہندو سیاست دانوں کی شرکت سے ہوئی۔ یہی انجمن ایک سال بعد ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا کانگریس بن گئی، جسے ایک انگریز مسٹر ہیوم نے قائم کیا تھا۔

بظاہر کانگریس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کا سیاسی شعور بیدار ہو لیکن عملی مقصد یہ تھا کہ ہندو ابھریں اور مسلمان پامال ہوں، یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے شروع میں اس سے کسی طرح کا تعاون نہیں کیا۔

انجمن مخالفت ذبیحہ گاؤ ۱۸۹۳ء میں مسٹر بال گنگا دھر تلک نے ایک انجمن مخالفت ذبیحہ گاؤ قائم کی۔ اور اس تحریک نے ہندوؤں میں اثر کیا۔

مسٹر تلک جتنے کٹر اور پکے دشمن انگریزوں کے تھے اتنے ہی مسلمانوں کے بھی تھے اسی سال موصوف نے ہندوؤں میں تقاریب محرم کے مقابلہ کا ایک نیا تہوار گنپتی رائج کیا، اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کے خلاف حکومت نے جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ ان کے خلاف سخت و شدید ایجی ٹیشن شروع کیا، اپنی ان حرکتوں کے باعث وہ ہندوؤں میں بہت مقبول ہوئے اور ہندو قوم کے شاہ بے تاج بن گئے، مسٹر تلک کے دونوں اخبارات مرہٹہ (انگریزی) کیسری (مرہٹی) مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف یکساں شدت سے پروپگنڈے کے لئے وقف تھے،

تلک کا نام آج بھی عقیدت سے لیا جاتا ہے، ان کا جب انتقال ہوا تو مسلمانوں نے بھی ان کا سوگ منایا تھا، لیکن تلک نے کن داعیات و جذبات سے متاثر ہو کر سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا، وہ اس انجمن کے قیام سے ظاہر ہے۔

مجلس تحفظ اسی سال ۱۸۹۳ء جسٹس محمود نے علیگڈھ میں ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی،

وہ تلک کی اور دوسرے ہندوؤں کی مخالفتِ اسلام و مسلمان تحریک سے خائف ہو چکے تھے، اس انجمن کے سامنے انہوں نے مخلوط انتخاب کے خلاف ایک مدلل اور مبرہن یادداشت پیش کی، گویا قومی انفرادیت کی مسلمانوں میں یہ پہلی لہر تھی،

لیکن ہمیں کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ اس مجلس نے کبھی کوئی جارحانہ اقدام کیا ہو، اس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ صرف اس لئے قائم ہوئی تھی کہ مسلمانوں کو برادرانِ وطن کی دراز دستیوں سے بچائے تحفظ کا جذبہ بہرحال قابلِ اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا،

سیواجی فسٹول

۱۸۹۵ء میں مسٹر تلک نے ایک دوسری تحریک شروع کی جس کا نام تھا (سیواجی فسٹول) اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ تمام مرہٹہ ہیروؤں کو یاد رکھا جائے اور ان کے کارناموں کو تازہ رکھا جائے اس مقصد کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا جائے۔

ہائے گڑھ میں ایک تقریر کرتے ہوئے مسٹر تلک نے سیواجی اور افضل خاں کا تذکرہ کیا اور فرمایا:-

> افضل خاں کے حادثۂ قتل پر تحقیق و تدقیق بیکار ہے ہم تسلیم کرتے ہیں سیواجی نے پہلے سے خاکہ تیار کر کے اپنے پروگرام کے مطابق دھوکہ سے افضل خاں کو قتل کر دیا، کیا افضل خاں کو قتل کر کے سیواجی نے کوئی گناہ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب مہابھارت کے واقعات سے مل سکتا ہے، کرشن جی نے گیتا میں تلقین کی ہے کہ ہمیں (اگر ضرورت ہو تو) اپنے استادوں اور عزیزوں کے قتل میں بھی تامل نہ کرنا چاہیئے۔ اور ہم پر ان قاتلانہ اقدامات کے سلسلہ میں کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ اگر ہم ذاتی اغراض کے ماتحت یہ نہ کریں (بلکہ قومی اغراض کے ماتحت کریں) سیواجی نے غیر ملکیوں کو اپنی ادر وطن سے نکالنا چاہا۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کیا وہ کوئی گناہ نہ تھا!

ان کارناموں نے مسٹر تلک کو ہندوؤں میں اتنا مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا کہ وہ ہندو قوم کے ہیرو بن گئے۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں انہیں "لوکمانیہ" کا خطاب ملا جس کے معنی ہیں محبوب قوم۔

لیکن مسلمانوں کی تنگ ظرفی بھی ملاحظہ ہو، انہی دنوں مسٹر تلک کو جنگِ آزادی کا سپہ سالار بھی ان زہریلے

خیالات کے باوجود مان لیا! —— مولانا حسرت موہانی ان کے خاص معتقد تھے۔ ان کی تعریف میں کئی نظمیں بھی جوشِ عقیدت سے سرشار ہو کر لکھیں!

مسلم لیگ کا قیام ان مسلسل جارحانہ عناد آمیز اور سراسر متعصبانہ تحریکوں کے بعد ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ مسلم لیگ قائم ہوئی اس کے بانیوں میں نواب سلیم اللہ خاں نواب وقار الملک اور مولانا محمد علی تھے۔

اور اس سلسلہ میں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ مسلم لیگ صرف اس لئے وجود میں آئی تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرے، اس لئے نہیں کہ کسی دوسری ملت کے حقوق پر حملہ کرے اور اسے نیچا دکھائے۔

ہوم رول لیگ اور سوراج لیگ ۱۹۱۷ء میں ہوم رول لیگ قائم ہوئی اس کا مقصد ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا حصول تھا۔ اس نام کی دو انجمنیں تھیں، ایک مسٹر اینی بسنت نے قائم کی تھی اور دوسری مسٹر تلک نے

بعد میں گاندھی جی نے بھی اس میں شرکت کر لی اور اس کا نام ہوم رول لیگ ہو گیا۔ اب اس کے ناخدا گاندھی جی تھے، جن لوگوں نے نام بدلنے کی مخالفت کی ان سے بھرے مجمع اور کھلے جلسہ میں گاندھی جی نے کہا وہ مستعفی ہو سکتے ہیں۔

مجلس خلافت اور جمعیۃ علما پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک) میں ترک اتحادیوں سے ہار گئے تھے خلافتِ اسلامیہ کا مرکز قسطنطنیہ تھا، خلافت کا وقار خطرہ میں تھا اور ترکی مقبوضات پر اتحادی قبضہ کر رہے تھے، ان حالات میں ۱۹۱۹ء میں مجلس خلافت علی برادران کے جوشِ عمل نے قائم کی، اسی سال خلافت کے سرمایہ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی زیرِ قیادت جمعیۃ علما قائم ہوئی،

مہاسبھا کی تشکیل سوامی شردھانند رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے، اپنی مدتِ اسیری ختم ہونے سے پہلے وہ رہا کر دیئے گئے۔ اور ۱۹۲۲ء میں انہوں نے آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی بنیاد رکھی، کانگرس نے اس کے سامنے سپر ڈال دی اور اس نے وسیع پیمانہ پر شدھی

(تبلیغ) سنگھٹن (تنظیم) کا کام مسلمانوں کے خلاف شروع کر دیا - گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مجلس خلافت کے دور میں ہندو مسلم اتحاد کی جو داغ بیل پڑی تھی، وہ مہا سبھا نے ختم کر دی!

انڈین یونین ۱۹۲۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد صاحب آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر نے ایک انجمن "انڈین یونین" کے نام سے بنائی جس کی ممبری کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کا ممبر کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا جو کسی مذہبی یا فرقہ وارانہ انجمن کا ممبر ہو - مولانا نے مجلس خلافت سے علیحدگی اختیار کر لی - لیکن اس بے داغ کردار کے باوجود کانگرس کا ایک معقول طبقہ مولانا کو بھی "فرقہ پرست" کہتا رہا ——— اب بھی کہتا ہے!

چند اور انجمنیں ۱۹۲۹ء میں چند نئی انجمنیں عالم وجود میں آئیں۔

مجلس احرار ——— لاہور میں

خدائی خدمتگار ——— پشاور میں

جمیعتہ علماء ——— کانپور میں

مسلم نیشلسٹ پارٹی ——— لکھنؤ میں

مجلس احرار کا قیام بقول پنڈت جواہر لال نہرو اس لئے عمل میں آیا کہ اس مجلس کے بانیوں میں سے ایک کو کانگریس کی مجلس عاملہ میں نہیں لیا گیا -

خدائی خدمت گار کے روح رواں خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب تھے، انہوں نے یہ دیکھ کر کہ علی برادران خلافت سے قطع تعلق کر چکے ہیں، کانگریس میں شرکت کر لی لیکن علی برادران کی جگہ نہ حاصل کر سکے۔

مسلم نیشلسٹ پارٹی، مجلس خلافت اور مولانا شوکت علی کے مقابلہ میں قائم کی گئی تھی - اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد، سکریٹری مسٹر تصدق احمد خان شروانی، اور خزانچی ڈاکٹر انصاری تھے۔

مسلم کانفرنس اور تحریک خاکسار آخر میں یہ دو نئی تحریکیں عالم وجود میں آئیں اور مسلمانان ہند پر چھا گئیں،

۱۹۳۰ء میں مسلم کانفرنس سر آغا خان کی صدارت میں قائم ہوئی مسلم لیگ کمزور ہو چکی تھی، اس کے کئی ٹکڑے

ہو چکے تھے اس انجمن نے اس کی جگہ لے لی۔

اسی سال مسٹر مشرقی نے تحریک خاکسار کی بنیاد ڈالی اور ہر خاکسار کے لئے یہ لازم قرار دیا کہ جب وہ کسی انگریز کو دیکھے تو اپنی خاکساری کا مظاہرہ اسے سلامی دے کر کرے۔

مسلم یونٹی بورڈ

۱۹۳۲ء مولانا شوکت علی مرحوم و مغفور نے نواب اسمٰعیل خاں وغیرہ کے اشتراک عمل سے "مسلم یونٹی بورڈ" قائم کیا تاکہ مسلمانوں کا ایک پلیٹ فارم اور ایک مرکز بن سکے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا شوکت علی اور سید مرتضےٰ بہادر وغیرہ اسی جماعت کے ٹکٹ پر مرکزی اسمبلی کے ممبر ہوتے تھے۔

تحریک خلافت، عروج و زوال

گزشتہ جنگ عظیم ختم ہو چکی ہے، جرمنی اور جرمنی کے ساتھ حکومت عثمانیہ کو شکست ہو چکی ہے، خلافت اسلامیہ انگریزوں کے رحم و کرم پر ہے جب ترک جرمنی کے ساتھ میدان جنگ میں کود رہے تھے اور حکومت برطانیہ ان کے خلاف صف آرا ہوئی تھی تو حکومت نے مسلمانان ہند کو یقین دلایا تھا کہ یہ جنگ مذہبی نہیں ہے، ہم ترکی مقبوضات پر قابض ہونا نہیں چاہتے لیکن جب جنگ کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی، انگریز جیت گئے تو تمام وعدے طاق نسیاں کی زینت بن گئے۔

برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے ترکوں کے سامنے ایسے ذلت بخش شرائط صلح پیش کئے جو ان کے لئے پیام موت تھے، خود حکومت ہند کو بھی ان شرائط کی سختی کا اور حکومت برطانیہ کی وعدہ خلافی کا احساس تھا، چنانچہ وائسرائے کی طرف سے مسلمانان ہند کے نام ایک خاص اعلان شائع ہوا، جس میں اعتراف کیا گیا کہ شرائط اگرچہ سخت اور توقع کے خلاف ہیں لیکن مسلمانان ہند کو اب صبر و ضبط کے ساتھ یہ مرحلہ بھی برداشت ہی کر لینا چاہیئے

ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ لگ گئی، وہ بھڑک اٹھے، ان کے دل غم و غصہ سے، نفرت و حقارت سے، برہمی اور اشتعال سے بھرے ہوئے تھے، لوہا گرم تھا صرف چوٹ پڑنے کی دیر تھی مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ نکلے تھے، صرف کسی سپہ سالار کی ضرورت تھی۔

گاندھی جی کی تشریف آوری

ان حالات میں گاندھی جی مرکز امید بن کر مطلع سیاست پر نمودار ہوئے، وہ جنوبی افریقہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر چکے تھے، وہ

رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں اپنے جوہر دکھا چکے تھے، وہ چمپارن کی ستیہ گرہ کی کامیاب رہنمائی کر چکے تھے، مسلمانوں کی نظریں ان پر پڑیں اور انہوں نے بے تامل گاندھی جی کو اپنا رہنما بنالیا، اصل بات یہ تھی کہ مسلمان خود مشترک قیادت، مشترک مرکز کے جویا تھے، تلک کے تعصب، ہٹ دھرمی اور مسلم آزاری کی وجہ سے یہ امید پوری نہ ہوسکی، اب ایسا شخص میدان میں آیا تھا جو تلک کے مقابلہ میں غیر متعصب، فراخ حوصلہ، رواداد اور پاکیزہ خصائل کا حامل تھا، پھر علی برادران جیسے عظیم المرتبت، یار وفادار اسے حاصل تھے، انہوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا، اور آنکھیں بند کر کے اس کی قیادت قبول کر لی، اسے اپنا رہنما بنالیا اور مسلمانان ہند کو نصیحت کی کہ وہ بھی اس کی رہنمائی بے چون وچرا تسلیم کر لیں۔

مسلمان عمل چاہتے تھے، جہاد چاہتے تھے، ترکوں کی مدد کرنا چاہتے تھے، اپنی بے لبسی اور بے کسی کے باوجود گتھ جانا چاہتے تھے، حریف پنجہ فگن سے زور آزمائی پر تلے ہوئے تھے، سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں آ تر چکے تھے وہ تلوار نہیں چلا سکتے تھے، سر کو کٹا سکتے تھے، وہ بندوق کا استعمال نہیں کر سکتے تھے، لیکن سینہ پر گولیاں تو کھا سکتے تھے، وہ کسی کی جان لے نہیں سکتے تھے، لیکن اپنی جان تو دے سکتے تھے۔

سکوت مرگ آسا

یہ زمانہ تھا جوش کا عقل اور دماغ مفلوج تھے، جذبات کی حکمرانی تھی، دور اندیشی کا سوال ہی نہیں تھا، جو کچھ تھی، فکر امروز تھی،

یہ زمانہ تھا ترک موالات کا، عدم تعاون کا، ایثار و قربانی کا، مر مٹنے اور تباہ و برباد ہونے کا، سب کچھ لٹا دینے اور دار و رسن کا استقبال کرنے کا، یہ زمانہ تھا طوفان کا، حوادث کا، انقلاب کا ایک طوفان جس نے ملک کے طول و عرض میں تلاطم برپا کر دیا، ایسے حوادث کا جنہوں نے رونما ہو کر ملک کی سیاسیات میں ایک نئی زندگی ایک نئی تڑپ اور نیا ابھار پیدا کر دیا، ایسے انقلاب کا جس نے بلند کو پست اور پست کو بلند کر دیا، جس نے لیڈروں کو عامی بنا دیا، جس نے عامیوں کو زعیم و قائد بنا دیا جس نے حکومت کا رعب ختم کر دیا، جس نے پولیس کی لاٹھیوں اور فوج کی گولیوں کا ڈر دل سے نکال دیا، جس نے جیلخانوں کو نشاط خانہ اور پھانسی کے تختہ کو حاصل زندگی بنا دیا۔ وہ انقلاب جس نے بچوں میں جوانی کا سا جوش، جوانوں میں نوجوانوں کا سا ولولہ بڈھوں میں عہد طفلی کی سی ترنگ پیدا کر دی، وہ انقلاب جس نے زرداروں کو بے زر کر دیا، گھر والوں کو خانماں برباد کر دیا

وکیلوں کو کنگال کر دیا۔ بیرسٹروں کو مفلس بنا دیا، ڈپٹی کلکٹروں، مجسٹریٹوں۔ کلکٹروں اور اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کو عام لوگوں کے طبقہ میں لا کر کھڑا کر دیا، وہ انقلاب جس کی ایک لہر نے بڑے بڑے "سروں" کو بے سر کر دیا، جس نے بے مغزوں کو "سر" بنا دیا، جس کی بدولت اسکولوں پہ تالے پڑے کالجوں کے دروازے بند ہوئے یونیورسیٹیوں پر بادِ خزاں کے جھونکے چلے، عدالتوں میں سناٹا چھا گیا، حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی، جس نے نیا خون، نئی زندگی، نئی قیادت اور نئی لہر پیدا کی جس نے محمد علی جناح کے سے با اصول بختی سے اپنی سوچی سمجھی رائے پر قائم رہنے والے افراد کی سیاسی زندگی ختم کر دی جس نے دو نئی شخصیتیں محمد علی اور شوکت علی نام کی پیدا کیں۔ یہ دونوں بھائی بجائے خود ایک بہت بڑا طوفان تھے، ایک بہت بڑا حادثہ تھے، ایک بہت بڑا انقلاب تھے، یہ طوفان کی طرح اٹھے اور سارے ملک پر چھا گئے۔ یہ حادثہ کی طرح واقع ہوئے اور ہر زندگی ان کی لپیٹ میں آگئی، یہ انقلاب کی طرح ابھرے اور ہر مخالف طاقت کو انہوں نے زیر و زبر کر کے رکھ دیا، رحمہا اللہ! یہ دونوں بھائی بادل کی طرح گرجے، اور ان کی گرج سے ہندوستان کا ہر دل دہل اٹھا: بجلی کی طرح کوندے، جس کی روشنی سے ہر خانۂ تاریک روشن ہو گیا، آندھی کی طرح پھیلے بڑھے، چلے جس کے سامنے تن آور درخت سربسجود ہو جاتے ہیں، جس کا مقابلہ فلک بوس مینارے بھی نہیں کر پاتے، جس کی زد بڑے بڑے جہازوں کے بادبان اور لنگر شکستہ اور گستہ کر دیتی ہے، ان کی گرج ایسی ہی تھی! ان کی چمک کا یہی حال تھا! ان کی ہمہ گیری کی یہ کیفیت تھی! بالآخر یہ اپنی بہار دیکھ کے اور دنیا کو اپنی بہار دکھا کے اس جہان فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کر گئے۔ ایک مسجد عمرؓ میں نبیوں اور پیغمبروں کے زیر سایہ شمیم جنت سے لطف اندوز ہو رہا ہے، دوسرا سرمد شہید کے پہلو بہ پہلو شاہجہان اعظم کی جامع مسجد کے سامنے آسودۂ خاک ہے! ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

گاندھی جی کی قیادت

علی برادران نے گاندھی جی کی قیادت قبول کر لی اور انہیں "باپو" تک کہنے لگے۔ لیکن گاندھی جی نے مسلمانوں کے بل پر مہاتما بننے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ یہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کی زبان سے سنیئے، ۲۵۔ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور کے ایک

عظیم الشان اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا :۔

کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے اس سے پہلے وہ صاحب بہادروں کی تفریح گاہ تھی، مگر جس دن سے محمد علی، شوکت علی اسمیں شریک ہوئے، اسی دن سے اسمیں جان پڑ گئی، چنانچہ کلکتہ کانگرس میں لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگرس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا، اور یہ حقیقت ہمیں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہند و رہنما، مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا، ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی نے دورہ کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لئے، حتیٰ کہ کانگرس کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لئے آپ کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی!۔

کانگرس اور گاندھی جی کے بارے میں اگر یہ شہادت ناکافی ہے تو ایک دوسری شہادت لیجئے، یہ شہادت ہے ہندوستان کے مشہور محقق، سیاستدان اور تاریخ سیاسیات کے ماہر خصوصی ڈاکٹر امبیدکر کی، موصوف اپنی کتاب "پاکستان کے بارے میں چند خیالات" THOUGHTS ON PAKISTAN میں لکھتے ہیں :۔

"۹ جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی اور متفقہ طور پر ترک موالات کا اصول طے ہوا، ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ ترک موالات کے اصول اور پروگرام کو واضح طور پر مرتب کرے ۲۲۔ جون ۱۹۲۰ء کو مسلمانوں نے وائسرائے کو ایک پیام بھیجا کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء سے پہلے ترکوں کے شکایات رفع نہ ہوئے تو تحریک ترک تعاون شروع کر دی جائے گی، ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی کا جلسہ الہ آباد میں ہوا اور طے ہوا کہ ایک مہینہ کا وائسرائے کو نوٹس دے کر ترک موالات کا پروگرام شروع کر دیا جائے۔ پہلی اگست ۱۹۲۰ء کو نوٹس دے دیا گیا اور ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کو تحریک ترک تعاون شروع کر دی گئی ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک ترک موالات خلافت کمیٹی نے شروع کی تھی، کانگرس کے اسپیشل سیشن کلکتہ زیر صدارت لالہ لاجپت رائے نے جو کچھ کیا وہ صرف

یہ کہ خلافت کانفرنس کا مسلک قبول کر لیا!"

محمد علی اور امبیڈکر کی ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی کو مہاتما اور کانگرس کو کانگرس خلافت کمیٹی اور علی برادران نے بنایا، کانگرس تک نے خلافت کی پیروی کی، لیکن اقتدار حاصل کر لینے کے بعد مجلس خلافت اور علی برادران کے ساختہ پرداختہ گاندھی جی اور ان کی کانگرس نے جو سلوک علی برادران اور مجلس خلافت کے ساتھ کیا، وہ بڑی دردناک کہانی ہے، ہندو مسلم اتحاد کے چمن کو شردھانند پنڈت مالوی اور خود کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں نے تاراج کیا، وہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا!

مجلس خلافت نے کانگرس سے آزادی ہند کے معاملہ پر مفاہمت کی، ہندو مسلم اتحاد کا بیڑا اٹھایا، اور کامیاب ہوئی مسلمانوں نے رضا کارانہ طور پر گاؤکشی تک بند کر دی، لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دی گئیں، فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا، منافرت اور افتراق کے جذبے ابھارے جانے لگے، محمد علی شوکت علی مسلمانوں کی گالیاں کھاتے رہے، مگر اس وقت تک کانگرس سے جدا نہ ہوئے جب تک بالکل مایوس نہ ہو گئے، اور ان کے مایوس ہو جانے اور الگ ہو جانے کے بعد کانگرس باقاعدہ ایک ہندو ادارہ بن گئی!

کانگرس کا اقتدار

انڈیا ایکٹ کے نفاذ تک کے کانگرسی عہد حکومت پر تبصرہ

صوبائی آزادی کے دور میں کانگرس کی دست درازیاں اور مسلم آزاریاں

مسلمانوں نے تحریک ترک موالات و خلافت اور سوراج کے زمانہ میں ایثار و قربانی کا جو مظاہرہ کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی، وہ کم تعداد میں تھے، لیکن جب آزادی ہند کے لئے جیل خانے کا پھانسی پانے کا، تباہ ہونے کا وقت آیا تو وہ ہندوؤں سے آگے بڑھ گئے، لیکن کانگرس نے انہیں ان کا صحیح مقام دیا، نہ ہندوؤں نے، دونوں کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو دبایا جائے، ان کی آواز بلند نہ ہونے دی جائے، انہیں صرف تابع بنا کر رکھا جائے

نہرو رپورٹ

ہندو تو ہندو کانگرس جیسے بین الاقوامی ادارے کی طرف سے مسلمانوں کے قلب و جگر پر کاری وار ہوتے رہتے تھے، مسلمان جتنی جتنی صلح و اتحاد کی کوشش کرتے تھے اتنا ہی انہیں نظر انداز کیا جاتا تھا، اور یہ نہرو رپورٹ کا ذکر اس موقع پر بہت ضروری ہے، کہ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے چرچے نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک تموج پیدا کر دیا، ٹوٹے ہوئے دل پھر جڑنے لگے شکستہ تعلقات پھر استوار ہونے لگے، مشترک معاملات میں متحدہ محاذ پھر بن گیا، ہندوؤں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مسلمانوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا مشترک جلوسوں اور جلسوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔

چودہ نکات

مسلمان سائمن کمیشن کے وقت ہی سے چونک چکے تھے، مسٹر جناح آئے دن کے مناقشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آچکے تھے وہ چاہتے تھے کہ مستقل مفاہمت اور مصالحت اور مخلصانہ تعاون کی کوئی صورت نکل آئے یہ جھگڑے ختم ہوں اور صلح و سلام کا دور شروع ہو، انہوں نے ۱۹۲۷ء میں اپنے "چودہ نکات" مرتب کئے، یہ مسلمانوں کے کم از کم اور زیادہ سے زیادہ معقول مطالبات تھے، ۲۰ مارچ

۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلم زعماء کا ایک اجتماع ہوا، اس نے بھی یہ نکات منظور کر لئے۔ ان نکات کی تشکیل میں مولانا محمد علی مرحوم کے مشوروں کو بھی خاصا دخل تھا لیکن تھا یہ سب کچھ جناح کا دماغی شاہکار، ہندو سب سے زیادہ جداگانہ انتخاب سے بھڑکتے تھے، ان نکات میں جداگانہ انتخاب مشروط طور پر ترک کر کے مخلوط انتخاب پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی، اور اس طرح ہندوؤں کی طرف پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ دست تعاون مسلمانوں نے بڑھایا اور کہہ دیا کہ اگر ہمارے یہ معمولی مطالبات منظور کر لئے جائیں تو ہم جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں گے سائمن کمیشن کے سفارشات خواہ کچھ ہوں، ہم اس میثاق پر قائم رہیں گے۔

مشکلات راہ مسٹر جناح کے یہ نکات مسلم لیڈروں نے تسلیم کر لئے، مولانا محمد علی مرحوم نے خاص طور پر انہیں پسند کیا، اس وقت تک جناح عوامی لیڈر نہیں تھے، صرف تعلیم یافتہ طبقہ انہیں مانتا تھا، مولانا محمد علی مرحوم عوامی لیڈر تھے۔ انہوں نے ان نکات کو تسلیم کیا اور ان کی تبلیغ و تلقین کے لئے اپنی زبان و قلم کو وقف کر دیا اور مسٹر جناح کی بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔

اب ایک دوسری مشکل پیش آئی۔ ہندوؤں نے یہ بات بڑی خوشی سے مان لی کہ مسلمان انتخاب کے لئے راضی ہو گئے۔ لیکن ان کے دوسرے مطالبات جن کی منظوری پر مخلوط انتخاب مشروط تھا، ماننے سے صاف انکار کر دیا، یعنی نہ وہ یہ ماننے پر تیار تھے کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے، نہ یہ مان رہے تھے کہ سرحد کو مساوی اصلاحات دیئے جائیں۔ نہ وہ مرکزی اسمبلی میں ⅓ نیابت کے حامی تھے، وہ کوئی مطالبہ بھی نہیں مان رہے تھے۔

نہرو رپورٹ سائمن کمیشن کے سفارشات ابھی پارلیمنٹ کے سامنے پیش نہیں ہوئے تھے، لیکن ہندوستانیوں میں اس کی تشکیل اس کی کارروائیوں اور اس کی حیثیت کے بارے میں ایک ہیجان برپا تھا اسی اثنا میں مسٹر برکن ہیڈ وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا، ہندوستانی اس درجہ منقسم مختلف اور ایک دوسرے سے بیزار ہیں کہ وہ ایک متحدہ دستور اساسی بھی نہیں بنا سکتے،

اس چیلنج کو ہندوستان کے سیاستدانوں نے اور کانگرس نے منظور کر لیا، طے ہوا کہ ایک دستور اساسی بنایا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ کی صورت میں حکومت کے سامنے اسے پیش کر دیا جائے، چنانچہ پنڈت موتی

لال نہرو کی صدارت ایک مجلس تشکیل دستور قائم کی گئی،

اگست ۱۹۲۸ئ میں یہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں پیش ہوئی مجلس خلافت کی طرف سے مولانا شوکت علی مرحوم نے ان کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ مسلمان اس رپورٹ کو منظور نہیں کر سکتے، کیونکہ اس میں کوئی بھی اہم مطالبہ مسلمانوں کا منظور نہیں کیا گیا تھا، پنجاب میں انہیں اقلیت بنا دیا گیا تھا، بنگال میں ہندو اقلیت ان پر مسلط کر دی گئی تھی، سندھ کی علیحدگی بھی واضح الفاظ میں تسلیم نہیں کی گئی تھی، مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں بھی مسلمانوں کو دینے سے انکار کر دیا گیا تھا، غرض ان کے جائز مطالبات میں سے کوئی بھی اہم اور بنیادی مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا،

مسلمانوں نے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا تھا جو ناقابل قبول ہو، لیکن اکثریت کے زعم میں ایک مطالبہ بھی نہرو رپورٹ میں منظور نہیں کیا گیا!

گول میز کانفرنس

سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۷۔اپریل ۱۹۲۹ء میں مرتب کر لی، لیکن قبل اس کے کہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہو، کنزرویٹو حکومت کا تختہ الٹ گیا اور مزدور حکومت برسر حکومت ہو گئی۔

مسٹر جناح نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۹ جون ۱۹۲۹ء کو مسٹر میکڈانلڈ کو جنہیں وہ اپنے قیام ولایت کے زمانہ سے جانتے تھے، حسب ذیل مکتوب لکھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

> "سائمن کمیشن کا سیاسی ہندوستان مکمل مقاطعہ کر چکا ہے اگر اسی بنیاد پر معاملات آگے بڑھائے گئے تو سارا ہندوستان بھڑک اٹھے گا، ہندوستان اب برطانیہ کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچئے یہ اعتماد رفتہ آپ کس طرح واپس لا سکتے ہیں؟ —— آپ کے لئے واحد چارۂ کار یہ ہے کہ آپ ایک واضح اعلان کریں جس میں بتایا گیا ہو کہ ہندوستان کو جلد از جلد درجۂ نوآبادیات حکومت برطانیہ دے دے گی۔"

لارڈ اروِن کا اعلان

لارڈ اروِن وائسرائے ہند رخصت پر ولایت گئے۔ وہاں سے واپس آ کر ۳۱ اکـ

اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انہوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی منزل مقصود درجۂ نوآبادیات ہے اور حکومت سیاسی ارتقا کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس بھی منعقد کرنے کو تیار ہے۔ اس اعلان کا گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے خیر مقدم کیا، لیکن شرط تعاون یہ رکھی کہ گول میز کانفرنس میں کانگرس کے مندوبین کو اکثریت حاصل ہو۔

گاندھی جی کا رویہ گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی (۱۹۳۲ء) اور سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ "فرقہ وارانہ مسئلہ" یہاں زیر بحث لایا ہی نہ جائے اس پر اس وقت گفتگو ہو جب ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ہو جائے، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا، اب گاندھی جی نے یہ فرمایا، اچھا میں مسٹر جناح کے "چودہ نکات" مانے لیتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمان دوسری اقلیتوں کے فرقہ وارانہ مطالبات کی تائید نہ کریں، ظاہر ہے اسے مسلمانوں نے نہیں مانا۔ اب انہوں نے فرمایا۔ کانگرس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اسے پہلے مانو پھر میں بات کروں گا۔ اسے نہ حکومت مان سکتی تھی، نہ دوسری سیاسی جماعتیں، لہٰذا گاندھی نے فرمایا پھر میرا یہاں بیٹھنا بیکار ہے اور ہندوستان واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

کمیونل اوارڈ گول میز کانفرنس نے ایک "مجلس اقلیت" بنائی تھی جو فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے قائم کی گئی تھی، لیکن وہ بھی ناکام رہی، آخر کار گاندھی جی کے مشورہ اور مسز نائیڈو کی تائید سے پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے ہندو لیڈروں نے وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ سے درخواست کی کہ وہ ثالث بن کر تصفیہ کر دیں، مسٹر جناح نے مسلمانوں کی طرف سے اس ثالثی کے ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔

پھر جب وزیر اعظم نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور جسے مسلمانوں نے صرف اس لئے قبول کیا کہ کوئی دوسرا حل موجود نہ تھا —— تو سب سے زیادہ شور مچانے والے اس "اوارڈ" کی مخالفت میں وہی تھے جنہوں نے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی "ہندو نوازی" پر بھروسہ کر کے انہیں پنچ مان لیا تھا۔

مسئلہ وفاق گول میز کانفرنس میں سب سے زیادہ اہم مختلف فیہ اور نازک مسئلہ وفاق کا تھا، یعنی ہندوستان کے صوبے کامل طور پر آزاد اور خود مختار ہوں یا وہ ایک

وفاق سے وابستہ ہوں۔ اس مسئلہ پر تینوں پارٹیوں (حکومت، کانگرس، مسلم لیگ) کے نقطہ ہائے نظر جداگانہ تھے۔

حکومت اس لئے وفاق کی حامی اور مؤید تھی کہ انڈیا ایکٹ اور وفاق کے نفاذ کے بعد مرکزی اسمبلی میں سے نامزد گروہ ختم ہو جائے گا۔ صرف منتخب گروہ رہ جائے گا۔ اور یہ گروہ سرکار کا وفادار نہیں لہذا تلافی کی صورت حکومت نے یہ نکالی کہ وفاق میں والیان ریاست کو بھی شریک کر لیا جائے۔ اور وہ اس وفاق میں اپنے نمائندے نامزد کر کے بھیجیں۔ یہ نمائندے ظاہر ہے ریاستی عوام کے نمائندے نہیں ہوں گے۔ والیانِ ریاست کے پسند کردہ ہوں گے، لہذا اسمبلی میں آکر یہ سابق نامزد گروہ کا کام کریں گے اور حکومت کے اشارہ پر رقص کریں گے۔ اس طرح حکومت ہندوستان کو اندرونی آزادی دینے کے بعد بھی اس کی مزلی اور سرپرست بنی رہے گی۔

کانگرس وفاق کی اس لئے مخالف تھی کہ وہ یہ چاہتی تھی کیا تو والیانِ ریاست وفاق میں شریک ہی نہ کئے جائیں، اور اگر ان کی شرکت ضروری ہے تو فیڈریشن کو حق ہونا چاہئیے کہ وہ بھی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کر سکے، نیز یہ کہ وفاق میں جو ریاستی نمائندے آئیں وہ عوام کے منتخب کردہ ہوں، نہ کہ والیان ریاست کے نامزد۔

مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر جناح کہتے تھے کہ وفاق اس لئے ناقابل قبول ہے کہ یہ صوبوں کی آزادی اور خود مختاری کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ انہیں اپنی غلامی میں لے لیتا ہے، لہذا اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ مسٹر جناح نے وفاق کی اس شدومد سے مخالفت کی کہ انہیں آخری گول میز کانفرنس میں مدعو ہی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ وہ لندن میں مستقل طور پر اقامت گزیں تھے، چنانچہ ۷، فروری ۱۹۳۵ء کو مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:-

"میں آغاز ہی سے وفاق کا سرگرم مخالف ہوں۔ اسی لئے مجھے گول میز کانفرنس کی آخری نشستوں میں شریک نہیں کیا گیا۔"

مجلس تشکیل وفاق FEDRAL STRUCTURE COMMITTEE میں مسٹر جناح

نے جو معرکہ آرا مدلل اور برجستہ تقریر دفاق کے خلاف کی تھی۔ اس نے مجلس کے صدر لارڈ سینکے کو حواس باختہ کر دیا تھا اور انہوں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا "مسٹر جناح نے ہمارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا"

انڈیا ایکٹ: ہندو مسلم مفاہمت، دستوری اور فرقہ وارانہ معاملات پر مسٹر جناح کی مساعی کے باوجود نہ ہو سکی، اب حکومت نے ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ نافذ کر دیا یعنی صوبوں کو اندرونی آزادی مل گئی

کانگرس کا طرز عمل: ۱۹۳۷ء کے اوائل میں صوبائی مجالس کے انتخاب کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئے، تمام ہندو صوبوں میں کانگرس غیر معمولی اکثریت کے ساتھ جیتی - کچھ عرصہ تک کانگرس نے وزارت قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ وہ گورنروں سے یہ وعدہ لینا چاہتی تھی کہ وہ وزارت کے کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے، اس عرصہ میں مسلم لیگ نے شرافت کا ثبوت دیا اور کہیں وزارت نہیں بنائی ہر صوبہ میں مسلم لیگ کانگرس کے بعد سب سے بڑی جماعت تھی، اخلاقاً اور اصولاً کانگرس کا فرض تھا کہ وہ مسلم لیگ کے اشتراک و تعاون سے وزارتیں بناتی، لیکن اس نے مسلم لیگ پارٹیز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ مسلم لیگ کے ممبر مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں، کانگرس کے پیثاق PLEDGE پر دستخط کریں مسلم لیگ پارٹی توڑ دیں تو وہ وزارت میں شریک کئے جا سکتے ہیں، مسلم لیگیوں نے پوری آن اور خود داری کے ساتھ یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا اور ان مسلمانوں کو شریک وزارت کر لیا جن کے ساتھ نہ مسلم قوم تھی، نہ کوئی مسلم جماعت، جو ایوان اسمبلی میں اگر کسی کے نمائندے تھے تو صرف اپنی ذات کے جو کل تک کانگرس سے کوئی تعلق بھی نہ رکھتے تھے بلکہ اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے - اس طرز عمل نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی -

مغربی جمہوریت سے اندیشہ: کانگرس کے اس رویہ نے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا - اب پہلی بار مسٹر جناح نے محسوس کیا کہ مغربی جمہوریت ہمارے درد کا درماں نہیں بن سکتی - آخر یہ کیسی جمہوریت ہے جو مسلم قوم کی اکثریت کو محروم کر دے اور اقلیت کو سرفراز کر دے؟ جو مسلمان جماعتیں اسمبلی میں مسلم ممبروں کی اکثریت اپنے ساتھ رکھتی ہیں وہ تو نظر انداز

کردی جائیں، اور جو مسلم ممبر نہ قوم کی پشت پناہی کے حامل ہیں، نہ ایوان میں جن کی کوئی پارٹی ہے وہ سرفراز ہوں اور سیاسی سربلندی حاصل کریں۔

۵۔ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی یونین میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا:۔

"ہندوستان میں ہماری سیاسی تربیت مغربی جمہوریت کے اصولوں کے ماتحت ہوئی ہے یہ دستور جو ہم پر مسلط کیا گیا ہے اکثر و بیش برطانوی طرز اصول پر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس ملک میں اور برطانوی مملکت میں اہم بنیادی فرق ہے۔ برطانیہ میں اکثریت کی جماعتیں تغیر پذیر ہوتی رہتی ہیں، ان کی صورت و سیرت، ان کی ہیئت اور کیفیت ان کی قوت و طاقت آئے دن بدلتی رہتی ہے، آج اگر وہاں کنزرویٹو پارٹی برسر حکومت ہے تو کل لبرل جماعت سریر آرائے حکومت ہے اور پرسوں قلمدان وزارت مزدور جماعت کے ہاتھ میں آگیا لیکن ہندوستان کی صورت حالات بالکل برعکس ہے۔

یہاں ایک مستقل ہندو اکثریت ہے۔ اور باقی جو ہیں وہ اقلیت ہیں۔ جو کسی ممکن اور قابل قیاس زمانہ میں اکثریت نہیں بن سکتیں"

مذہب روایات کا اختلاف نہیں ہے، اس لئے وہاں سیاسی جماعتیں مذہبی بنیاد پر نہیں بنتیں، اور ہندوستان میں یہ اختلاف بدرجہ اتم موجود ہے۔ لہٰذا یہاں کی سیاسی جماعتیں مذہبی بنیاد پر بنتی ہیں۔ اور مذہب ایسی چیز ہے کہ ہندو ہندو کی طرف اور مسلمان مسلمان کی طرف بہر حال جھکے گا۔ ہندو اکثریت ہی میں رہیں گے اور مسلمان اقلیت ہی میں رہیں گے اور یہ اکثریت و اقلیت دائمی ہوگی لہٰذا مغربی جمہوریت کے فروغ دینے کا اس ملک میں مطلب یہ ہوا کہ ہندو اکثریت کی غلامی میں مسلم اقلیت دے دی جائے۔ مسلمان اسے کسی طرح منظور نہیں کر سکتے، پھر کیا ہو؟ یہ سوال اب مسٹر جناح کے دماغ میں گردش کرنے لگا تھا۔

کانگرس کی اردو کشی کانگرس نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک شروع کر دیا جو ایک فاتح ایک مفتوح کے ساتھ کرتا ہے، سب سے پہلا حملہ اردو زبان پر ہوا جو ہندو مسلم اتحاد کی بہترین یادگار تھی۔ اس کے بارے میں گاندھی جی نے فرمایا:۔

"اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے اپنے زمانۂ حکومت میں بنایا اور پھیلایا"

حالانکہ اردو، ہندی زبان سے کتنی متاثر ہے۔ اس کا اندازہ ایک ہندو رسالہ زمانہ (کانپور) کے ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے:-

"اردو کے مشہور و مستند لغت فرہنگ آصفیہ میں کل لفظ ۵۴ ہزار ہیں

ان میں سے ہندی ۲۹ ہزار ہیں	ان میں سے عربی ۷ ہزار چھ سو ہیں
ان میں سے فارسی ۶ ہزار چار سو ہیں	ان میں سے سنسکرت ۵۰۰ ہیں

ان میں سے انگریزی وغیرہ ۲ سو ہیں"

کانگریس کا مسلمانوں کی تعلیم پر حملہ

اپنے دور حکومت میں کانگریس نے ایک وار دھا اسکیم بنائی، یہ تعلیمی اسکیم تھی، اور اسلامی روح کے قطعاً منافی۔ اس اسکیم کی رو سے لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم رائج کی گئی تھی، موسیقی تعلیم کا لازمی جزو تھا، عدم تشدد کو دنیا کے بہترین عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا، ظاہر ہے ان اصولوں میں سے کوئی اصول بھی ایسا نہ تھا جو اسلام کے اصول سے ٹکراتا نہ ہو، اسلام لڑکوں اور لڑکیوں کے اشتراک و اختلاط کو قطعاً جائز نہیں رکھتا، موسیقی اسلام میں حرام ہے، جس قوم کو ید اللہ علی ابن طالب، سیف اللہ خالد بن ولید اور سرداران اہل جنت حضرات حسنین علیہما السلام پر ناز ہو، وہ عدم تشدد کو بہترین اور برتر عقیدہ کی حیثیت سے ہرگز قبول نہیں کر سکتے، مذاہب عالم کی "مشترک سچائی" اب سابق مذاہب میں موجود نہیں ہے، پھر ایک مسلمان "مشترک سچائی" کا اصول مان کر تمام مذاہب عالم پر مہر تصدیق کس طرح ثبت کر سکتا ہے؟ مسلمانوں نے اس اسکیم کے خلاف احتجاج کیا، جلسے کئے، جلوس نکالے مظاہرے کئے لیکن کانگریس حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اور سی پی میں اس اسکیم کی ابتدا کی اور "ودیا مندر اسکیم" کو عملی جامہ پہنا دیا۔

کانگریس کے کچھ اور مظالم

دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا ایک اہم اور شاندار اجلاس پٹنہ میں مسٹر جناح کی زیر صدارت منعقد ہوا، صدر مجلس استقبالیہ عزیز ملت سید عبد العزیز

بیرسٹر ایٹ لا تھے، بہار میں بھی مسلمانوں پر یو پی کی طرح مظالم توڑے جا رہے تھے، اس اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی کہ بہار میں بھی اگر حالات سازگار نہ ہوں تو مرکزی مسلم لیگ کی اجازت سے سول نافرمانی شروع کی جا سکتی ہے

اپنے خطبہ استقبالیہ میں سید عبدالعزیز صاحب نے کانگرسی دورِ حکومت پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے اس کا کچھ حصہ اگر پیش نظر رہے تو اچھا ہے:-

بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دے کر مسلمانوں کو بالعموم اور مسلمان طلباء کو بالخصوص کانگرس حکومت اور اس کے ناعاقبت اندیش ہوا خواہوں نے بے حد صدمہ اور رنج پہنچایا ہے، اس نغمہ میں بت پرستی کا تخیل اور اس کی تصنیف مسلمانوں سے منافرت پر مبنی ہے۔

قربانی کے مسئلہ میں رسم و رواج کی ایسی قید لگائی جا رہی ہے کہ مسلمان اپنے فرائض کو برت نہیں سکتا، چونکہ یہاں قربانی عام طور سے گھروں کے اندر کی جاتی ہے اور اگر چوکیدار کو اس کی اطلاع بھی ہوتی تو عام طور پر ہندو چوکیدار اور ہندو پولیس افسران کے ہونے کے باعث بہت سے علاقوں کی قربانیوں کا اندراج تھانہ کے رجسٹر میں نہیں ہوتا۔ اور پولیس کی مصلحت بھی زیادہ تر یہی ہے کہ کم سے کم جگہوں کے متعلق قربانیوں کا اندراج ہو،

ایک اور فہرست

مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے بھی ایک بیان میں کانگرس کی دراز دستیوں کا راز فاش کیا تھا (خلاصہ)

"کانگرسی وزارتوں نے عہدے سنبھالنے کے ساتھ ہی بعض الٹی حرکتیں کیں، انہوں نے مقامی حکام کے نام تحریری اور زبانی ہدایات جاری کر دیں کہ اہم معاملات میں وہ اپنے ہاں کی کانگرس کمیٹی کے عہدیداروں سے مشورہ حاصل کر لیا کریں۔ انہوں نے احکام جاری کئے کہ پبلک عمارتوں اسکولوں اور دوسرے مقامات پر کانگرسی جھنڈے نصب کئے جائیں، ان کے منصوبے کیا تھے، مختصراً یہ کہ:-

۱۔ گئو ماتا کی بہر صورت رکھشا ہونی چاہیئے، اسی بنا پر بہار، بلیا اور دیگر مقامات میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔

۲۔ مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہ دینی چاہیئے، چنانچہ اس مقصد کو سامنے

دکھ کر تلوکری میں وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کئے گئے اور اسی طرح دوسرے کثیر التعداد مقامات پر خوں ریزیاں رونما کی گئیں، جن کی حقیقت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

۳۔ مسلمانوں کے مذہب کو پامال کر دینا چاہیئے، کیونکہ یہ دلیش ہندوؤں کا ہے، اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے اذانیں روکی گئیں، مساجد میں نمازیوں پر حملے کئے گئے، نماز کے اوقات میں مسجدوں کے سامنے شور و غوغا کرتے ہوئے باجے کے ساتھ فاتحانہ انداز میں جلوس گذارے گئے، بقر عید کے موقعوں پر گائے کی قربانی کو جبریہ روکا گیا۔ اور مسلمانوں کے قبرستانوں مسجدوں اور دوسرے مقدس و محترم مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔"

مہا سبھائی ہندو کی شہادت

پنڈت راوی شنکر شکلا وزیر اعظم سی پی نے ایک پبلک بیان میں ان الزامات کو "جھوٹ کا ہمالیہ" قرار دیا،

مسٹر شکلا کے اس جواب کا جواب ان کے پیش رو ڈاکٹر کھرے سابق کانگرسی وزیر اعظم سی پی نے دیا، جو مرہٹہ اخبار "ہتواد" ناگپور میں مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا جو حسب ذیل ہے:-

"مجھے پنڈت شکلا کا وہ بیان جو جبل پور سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعہ اشاعت پذیر ہوا ہے اور جس میں مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کے فرد الزامات کو جھوٹ کا ہمالہ کہا گیا ہے دیکھ کر تعجب ہوا۔ اگر پنڈت شکلا کا یہ بیان شائع نہ ہوا ہوتا تو میں اس معاملہ کا تذکرہ پریس کے ذریعہ نہ کرتا، اس کے علاوہ یہ مناسب بھی نہیں ہوگا کہ اگر اس موقع پر میں واقعات کو جس طرح کہ مجھے معلوم ہیں پبلک کے سامنے نہ لے آؤں، میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ وزارت قبول کرنے کے پندرہ روز کے اندر ہی میرے اس وقت کے رفیق کار مسٹر ڈی، پی مصرا نے مجھ سے درخواست کی کہ مسٹر نیاز احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا جو اس وقت جبلپور میں تعینات تھے تبادلہ کر دیا جائے بلا کسی ظاہری سبب کے مسٹر مصرا کی اس درخواست کا صرف ایک ہی سبب میں سمجھ سکا

وہ یہ تھا کہ مسٹر نیاز احمد خاں نے مشہور مقدمہ حسینہ کے اغوا کی تفتیش کی تھی، یہ مسلمان افسر کو ایذا پہنچانے کی مثال نمبر ایک ہے میرے بعض ہما کوشلی رفیق یہ چاہتے تھے کہ میں مسٹر انعام الرحیم آئی سی ایس کو جو اس وقت بعہدہ ڈپٹی کمشنر ایوت محل میں تعینات تھے، اور جو اس صوبہ میں واحد مسلم آئی سی ایس افسر تھے منتقل نہ کروں، یہ مسلمان افسر کو ایذا پہنچانے کی دوسری مثال ہے، اگرچہ میں نے اپنے رفقائے کار کے ان ارشادات کی تعمیل نہیں کی، کیونکہ میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا خواہشمند تھا،

ایک اور مثال مسٹر شریف کا مشہور معاملہ ہے، اس معاملہ میں مسٹر شریف جو اس وقت وزیر تھے بعض قیدیوں کو جن میں چند مسلمان بھی تھے، میعاد سے پہلے رہا کر دینے پر سخت باز پرس کی گئی تھی۔ شریف صاحب کے معافی مانگنے پر کانگرس اسمبلی پارٹی نے اپنے ایک جلسہ میں مسٹر شریف کی اس حرکت سے درگذر کر دیا تھا لیکن ہائی کمان اور کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اسمبلی پارٹی کی تجویز نظر انداز کرتے ہوئے ایک ٹریبونل مقرر کر دیا کہ یہ شریف کے معاملہ کی تحقیقات کرے اور انجام کار شریف صاحب کو نکال باہر کیا۔

ایک بالکل اسی قسم کے معاملہ جس کا تعلق مسٹر مصرا کے خلاف تحریری شکایت کی، لیکن ہائی کمان نے مسٹر مصرا کے حق میں یک طرفہ فیصلہ دے دیا اور شکایت کرنے والوں سے کوئی جواب طلب کئے بغیر ان سے کہا کہ وہ مسٹر مصرا سے معافی مانگیں، اپنی ان حرکتوں سے کانگرس ورکنگ کمیٹی اور ہائی کمان نے مسلمانوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ ایک ہی قسم کے دو واقعات میں امتیازی سلوک پر معترض ہوں کیونکہ مسٹر شریف مسلمان ہیں اور مسٹر مصرا ہندو، ان کے علاوہ مشہور ریان والا واقعہ بھی ہے جس میں وزیر قانون نے ایک مسلمان کے ہندو قاتل کو رہا کر دیا، لیکن ہائی کمان نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ مسٹر شریف کے معاملہ میں بہت شور مچایا گیا اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اس معاملہ میں مسلمانوں نے ہائی کمان پر جانبداری کا الزام لگایا کیونکہ جس وزیر نے

یہ حرکت کی وہ ہندو ہے۔

میں ہر کمیٹی یا کمیشن کے سامنے اس سلسلہ میں جو کچھ جانتا ہوں بیان کرنے کے لئے تیار رہوں۔

پیر پور رپورٹ ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے کانگرسی حکومتوں کے ظلم و ستم کی تاریخ مرتب کرنے، حالات جمع کرنے، واقعات فراہم کرنے اور معلومات مرتب کرنے کے لئے راجہ سید محمد مہدی (آف پیر پور) کی صدارت میں ایک مجلس تحقیقات مرتب کی۔

تقریباً آٹھ مہینے تک ملک کا دورہ کرنے، کانگرسی صوبوں کے حالات فراہم کرنے، واقعات کی چھان بین کرنے کے بعد، ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو کمیٹی نے اپنی رپورٹ مسلم لیگ کے سامنے پیش کر دی (اب یہ رپورٹ مسلم لیگ کی طرف سے انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہے)، اس رپورٹ کے مدلل واقعات سے بھی کانگرس ہائی کمان متاثر نہیں ہوئی، وہ اپنے ظلم و ستم کی روش پر قائم رہی۔

ایک لرزہ خیز مقدمہ کانگرس کے دور حکومت میں مسلمانوں پر کیا گذری؟ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور انہیں کس طرح ہدف ستم بنایا گیا۔ یہ بڑی طویل داستان ہے۔ اس داستان کا ایک لرزہ خیز حصہ درج ذیل ہے:۔

"اگر کانگرسی دور کی تمام ظالمانہ عجوبہ کاریوں سے قطع نظر کر بھی لیا جائے، تو صرف چاند ور لسواڑی پی) کا ایک ہی واقعہ انسانیت سوز بربریت کا مرقع ہے۔

اس قصبہ کی کل آبادی تین ہزار کے قریب ہے، یہاں صرف چند گھر کھاتے پیتے مسلمانوں کے ہیں۔ جو کچھ کھیت وغیرہ رکھتے ہیں ورنہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مزدور پیشہ ہے جو ہندوؤں کے کھیتوں میں عموماً کام کرتے ہیں،

یہاں ایک مرتبہ جگدیو پٹیل نامی اپنی مسلم آزاری کے باعث ایک لڑائی میں ہلاک ہو گیا، اس واقعہ سے کانگرسی حکومت اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے مسلم حکام کو تحقیقات نہ کرنے دی ہندو حکام کو تحقیقات پر مامور کیا،

۷-اپریل ۳۹ء کو کانگرس حکومت کی ستم رانی کا ڈرامہ شروع ہوا۔گاؤں کے تمام راستوں پر پولیس تعینات ہوگئی۔کہ کوئی مسلمان باہر نہ جا سکے، گاؤں کی ساری مسلم آبادی کو پکڑ لایا گیا، جمعہ کا روز مسلمانوں کی ایذارسانی کے لئے بہت ہی موزوں سمجھا گیا، ان تمام مسلمانوں کو اپریل کی سخت دھوپ میں صبح سے شام تک کھڑا رکھا گیا۔ واقعہ کے پورے بائیس ۲۲ تیئس ۲۳ روز بعد ان مسلمانوں کو مختلف ہندوؤں سے شناخت کرایا گیا۔ان شناخت کرنے والوں میں جھگڑے کے روز مجروح ہونے والا کوئی ہندو نہ تھا۔بیمار مسلمانوں کو بھی پکڑ کر شناخت کے لئے لایا گیا۔انہیں دن بھر کچھ بھی کھانے کو نہیں دیا گیا، اور ان گیارہ آدمیوں کے علاوہ جو پہلے گرفتار ہو چکے تھے، مزید ایک سو اکیاون مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ان میں بوڑھے جوان کم عمر بیمار اور معذور سب ہی تھے،

ان تقریباً ڈیڑھ سو مسلمانوں کو رات کے وقت مقامی اسکول کے کمرے میں جس کا رقبہ ۳۰×۲۰ ہے ٹھونس دیا گیا۔رات کو بھی انہیں کھانا نہیں دیا گیا۔اور نہ رشتہ داروں کو دینے دیا گیا اس گرمی کے موسم میں دن بھر بھوکا پیاسا رکھ کر رات کو بھی بلا دانہ پانی رکھا گیا، اور سانس گھٹنے والی کوٹھری میں بند کر دیئے گئے۔بارہ بجے رات سے اسی کوٹھری میں انہیں ہتھکڑیاں پہنائی جانے لگیں اور جب ہتھکڑیاں ختم ہوگئیں تو انہیں جانوروں کی طرح رسی سے باندھ کر چھوڑ دیا گیا، کانگرسی حکومت نے تو پوری کوشش کی کہ فرنگی کال کوٹھری کے مقابلہ میں دیسی کال کوٹھری بسواں میں قائم کر دے مگر ان مسلمانوں کی سخت جانی نے یہ مراد پوری نہ ہونے دی۔انہیں ۹-اپریل کی صبح کو ملکا پور لایا گیا اور ملکا پور سے بلڈانہ موٹر لاری میں جانوروں کی طرح بھر کر لے جایا گیا۔انہیں چھتیس گھنٹہ بھوکا پیاسا رہنے کے بعد بلڈانہ میں رات کے وقت ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے کھانے کو ملا۔۴۸ ان میں سے ۵۰ مسلمانوں کو لاری میں بھر کر اکولہ جیل بھیجا گیا

۷-اور ۸-اپریل کی شناخت کے موقع پر بعض بیمار مسلمان دھوپ کی شدت سے

نڈھال ہو گئے اور چکر آنے کے باعث انہیں متلی پر متلیاں آنے لگیں۔ مگر انہیں اسی طرح کھڑے رہنے پر مجبور کیا گیا ان صدمات کی تاب نہ لاکر ایک غریب ۱۱۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو جنت سدھار گیا۔ ایک بیوہ ضعیفہ جس کا جوان لڑکا اس ہنگامہ خیز حالات میں گرفتار کیا گیا مارے صدموں کے ۱۴۔ اپریل کو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ایک منہار ن ۱۹ اپریل کو جب کہ ان بے گناہوں کو ملکا پور لے جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اپنے داماد کے لئے روٹی لائی۔ کیونکہ گذشتہ چوبیس گھنٹے سے وہ بھوکا تھا اسے روٹی نہ دینے دیا گیا۔ اس کے اصرار اور التجا پر ایک ہندو افسر نے کہا "جب جگدیو پر حملہ ہوا تھا تب تو کہاں تھی؟ اب ہمارا راج ہے" یہ واقعہ "اہنسا اور صداقت" کی حکومت کا زندہ جاوید کارنامہ ہے

اس واقعہ نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ اور نفرت کی لہر دوڑا دی۔ ہر جگہ احتجاجی جلسہ اور نفرت کی تجویز منظور ہوئی۔ حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اتنی بڑی تعداد کے ملزم بنانے سے مقدمہ بالکل ہی کمزور ہو جائے گا۔ اور گواہ کبھی اتنے زیادہ آدمیوں کو عدالت میں ٹھیک طور پر نہ پہچان سکیں گے، اس لئے ایک سو ان گرفتار شدہ مسلمانوں میں سے ایک سو چودہ مسلمانوں کو ہر طرح کی ایذا پہنچانے اور ایک ماہ سے زاید جیل میں رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ کم از کم یہ ایک سو چودہ ضرور بے گناہ تھے، اور انہیں جو ستم سہنے پڑے، اس کے بعد ۴۲ مسلمانوں کا متعدد دفعات کے تحت جس میں قتل۔ ضرب رسانی بلوہ، سازش سبھی کچھ ہے چالان کیا گیا، پولیس نے استغاثہ کی طرف سے پچاسی گواہ پیش کئے، عدالت ماتحت نے تمام ملزمین کو سشن سپرد کر دیا

کانگرسی وزراء اور اصحاب اختیار کی آتش انتقام گاؤں کے تمام مسلمانوں کو جسمانی ایذا پہنچانے اور کثیر تعداد کو جیل بھیج دینے سے سرد نہ ہوئی۔ بلکہ تمام کام کرنے والوں اور کمانے والوں کو جیل میں بھیج دینے کے بعد حکومت نے لسوڑہ میں تعزیری پولیس تعینات کر دی۔ اور اس کے خرچ کا سارا بار کئی ہزار روپے سالانہ کا صرف مسلمانوں پر ڈالا

گیا۔ اور ان کی وصولی کے لئے وارنٹ جاری کئے گئے کہ ان کی جائیداد مکان اور جس کے پاس یہ نہ اُس کا اثاثہ ضبط کر کے خزانہ میں داخل کیا جائے۔

سشن جج ناگپور نے سماعت کے بعد ۳۴ ماخوذین میں سے چھ مسلمانوں کو پھانسی چوبیس کو حبس دوام اور ایک کو ایک سو روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔ بقیہ کو بری کر دیا۔ فاضل سشن جج نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ گواہ کیسے ہیں سچے یا جھوٹے، بلکہ فیصلہ میں صرف یہ اصول رکھا کہ اتنے آدمیوں نے فلاں فلاں کو پہچانا، لہٰذا یہ مجرم ہے، مسلمانوں کو ایسی سنگین سزائیں دینے کے باوجود کانگرسی وزارت کی ماتحت پولیس اور حکام کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرنے سے فاضل سشن جج اپنا قلم نہ روک سکے چنانچہ "ببوہ کی کال کوٹھری" کا تذکرہ کرتے ہوئے فیصلہ میں لکھا ہے کہ "یہ وحشیانہ سلوک نازی جرمنی میں قابل عمل ہو تو ہو مہذب برطانوی حکومت کے سایہ میں ایسا کیا جانا محکمۂ انتظام کے لئے ایک نہایت ہی بدنما داغ ہے" فیصلہ میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہندو اسیروں نے رائے دینے میں فرقہ پرستانہ ذہنیت سے کام لیا ہے۔"

ہائی کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی گئی مقدمہ کی پیروی کے لئے نواب صدیق علیخاں صاحب کی کوششوں کی بدولت مسٹر قاسم علاؤالدین سوجی ایم اے ایل ایل بی بار ایٹ لا بمبئی کی خدمات حاصل کی گئیں اپیل کی سماعت ناگپور کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر گلبرٹ اسٹون اور مسٹر جسٹس جزر دیون بوس کے سامنے شروع ہوئی، مسلمانوں کی خوش قسمتی سے جس وقت یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں پہنچا کانگرسی وزارت حکومت کو خیرباد کہہ چکی تھی اور ایڈوکیٹ جنرل کانگرسی حکومت کے نامزد کردہ نہ تھے، مسٹر سوجی کی پانچ روزہ کی ابتدائی بحث کے بعد مسٹر والٹروش ایڈوکیٹ جنرل نے عدالت کے سامنے یہ بیان دیا کہ مسل کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "ان اکتیس ملزموں میں سے انیس کے خلاف سازش قتل و بلوہ کا جرم ثابت نہیں ہے، عدالت کا وقت ضائع نہ ہو اس لئے

میں پہلے ہی اس بات کی وضاحت کئے دیتا ہوں کہ میں انہیں ماخوذین کے خلاف جرم کے مرتکب ہونے کے متعلق زور نہیں دوں گا۔" ان انیس میں ایک ملزم وہ بھی تھا جس کو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی تھی اور ضمانت پر رہا تھا۔ بقیہ اٹھارہ میں سے ایک کو پھانسی اور سترہ کو حبس دوام کی سزائیں ہوئی تھیں، ایڈووکیٹ جنرل کے اس بیان کے بعد مسٹر سوبجی نے عدالت سے یہ درخواست کی ان ملزمین کو ضمانت پر رہا کر دینا چاہیئے،

چنانچہ عدالت نے ایک عارضی فیصلے کے ذریعہ ان انیس ماخوذین کو ضمانت پر رہا کئے جانے کا حکم صادر کیا یہ حکم مسٹر جسٹس بوس نے لکھا جس سے چیف جسٹس نے اتفاق کیا فاضل ججوں نے اس حکم میں تحریر کیا کہ "اپیل کی سماعت کے ابتدائی دنوں ہی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ بہت سے ملزمین کے خلاف جرم کے ثبوت کا دارومدار "باہمی سازش" کے کمزور ستونوں پر ہے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ اس مفروضہ باہمی سازش کا وجود ثابت نہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل نے مجلس وکلاء کی شاندار روایات کی صحیح پیروی کرتے ہوئے اس کا اعتراف کر لیا ہے، اس لئے ان ملزمین کو جن کے خلاف ایڈووکیٹ جنرل نے جرم کو مشکوک مان لیا ہے جیل میں رکھنا مناسب نہیں، بنا بریں انہیں ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

دس روز اپیل کی سماعت کے بعد ۲ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کو عدالت عالیہ نے اس تاریخی مقدمہ میں اپنا تاریخی فیصلہ سنایا اور تمام ماخوذین کو بے داغ رہا کر دیا۔ سر گلبرٹ اسٹون چیف جسٹس ناگپور ہائیکورٹ نے فیصلہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے۔ یہ ایک اندوہناک مقدمہ ہے۔ یہ تعریف صحیح ثابت ہوتی ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقدمہ میں ۳۴ آدمی قتل کے الزام میں ماخوذ ہیں اور ایسے گواہ جن کی شہادتیں جھوٹی بنائی ہوئی یا سکھائی ہوئی ہیں۔ یکے بعد دیگرے شہادت دینے کو چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے سات گواہ ایسے ہیں جو کم عمر بچے ہیں۔ جنہیں جھوٹی شہادت دینے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ ایسے مقدمہ میں جھوٹی شہادت دینا سکھائی ہوئی شہادتوں کی بنا پر آدمیوں کو شناخت کرنا یہ بتاتا ہے کہ

گواہ یا اس کو سکھانے والا دوسرے انسان کو پھانسی پر چڑھا دینے کے لئے بلا اس خیال کے یہ انسان قصور وار ہے یا نہیں اپنی تمام کوششیں صرف کر رہا ہے انسانی اطوار کی پستی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے مخالف کی جان لینے کی کوشش بچوں کی زبان سے دروغ حلفی کے ذریعے کی جائے !!

چند ہی سطر آگے چل کر جج موصوف لکھتے ہیں :۔

" ۱۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو بسوہ میں مسلمانوں کی مسجد کے سامنے یا قریب چند منٹ کے لئے ایک ہنگامہ ہوا ۔ جس میں متعدد ہندو اور مسلمان زخمی ہوئے اور ایک ہندو ان زخموں کے صدمہ سے جو اسے لگے تھے بعد میں قضا کر گیا ۲۰۔ مارچ کو صوبائی اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی گئی اس کے مباحثہ میں اکثر ارکان نے ایسی تقریریں کیں گویا یہ قطعیت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ کس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے اور جہاں تک ایک ممبر کا تعلق ہے انہوں نے اشارہ کیا کہ کس شخص نے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا ہے ۔ اس مباحثہ میں اس وقت کے وزیراعظم نے بھی "قتل" کا لفظ استعمال کرتے اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ واقعہ بلوہ کا نہیں ہے بلکہ قتل کی ایک ایسی گہری سازش ہے جس پر پوری طرح عمل کیا گیا کوئی باک محسوس نہ کی !

یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنا جگر فگار، کتنا دلدوز، کتنا لرزہ خیز ہے ؟ پھر یہ واقعہ اپنی نوعیت میں منفرد نہیں کانگرسی دور حکومت کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔

روسیاہوں کی سرخ روئی

اب ہم تین خاص واقعات کی طرف اشارہ کرنا مزید ی سمجھتے ہیں ۔

۱۔ مسٹر یوسف شریف وزیر سی پی کو اس لئے کانگرس ہائی کمان نے وزارت سے برطرف کر دیا کہ انہوں نے ایک مسلمان مجرم کو اس کی علالت کے باعث قبل از وقت رہا کر دیا تھا۔

مسٹر مصرا وزیر سی پی کی پولیس نے ایک نابالغ مسلم لڑکی حسینہ کے اغوا لعدن) بالجبر کا مقدمہ درج کیا مگر اسے دبا دیا گیا حسینہ کے کیس میں سیٹھ گووند داس (ممبر بھارت مرکزی اسمبلی) مالک چترا آدرش فلم کمپنی بھی شریک

تھے، جن لوگوں نے ان دونوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، انہیں کانگریس نے ناقابل التفات قرار دیا، اور مصرا صاحب کی وزارت پر حرف نہیں آنے دیا!

۳۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر تمیز الدین اور کانگریس کے ٹکٹ پر سر عبدالحلیم غزنوی کھڑے ہوئے تھے، مسٹر سبھاش چندر بوس کے بڑے بھائی مسٹر سرت چندر بوس نے اس سلسلہ میں یہ جان کر کہ کاشتکار مسلمان اور زمیندار ہندو ہیں، بنگال کے تمام ہندو زمینداروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا،

"میرے دوست سر عبدالحلیم غزنوی مرکزی اسمبلی کے لئے اُمیدوار ہیں، انہوں نے ملک کی بیش بہا خدمتیں انجام دی ہیں، مناسب ہے کہ اس مشکل وقت میں ان کے بہترین تجربات سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر ان کی حمایت کریں اور اپنے مسلمان ملازمین اور کاشتکاروں کو ہدایت کریں کہ وہ سر غزنوی کو ووٹ دیں، ان کی کامیابی کے لئے آپ دوسری تدابیر بھی اختیار کریں"

ان واقعات نے مسلمانوں کو کانگریس سے بالکل مایوس کر دیا! اور وہ سوچنے لگے کہ اب کیا کریں؟

مسلم لیگ میدانِ عمل میں

۱- اقبال کا نظریہ ______

۲- قائدِ اعظم کا ظہور ______

۳- ایک نئی مملکت کا تصوّر ______

۴- راہ کی دشواریاں ______

۵- غیر مسلم عناصر کی مخالفت ______

۶- مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت ______

۷- فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ______

۸- بہار کے مسلمانوں کا قتلِ عام ______

۹- انگریزوں کا سکوت ______

احساسِ خودی

مسلمانوں کا ایک طبقہ عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس درجہ بعد المشرقین ہے یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے، درحقیقت "دو قومی نظریہ" غدر کے بعد ہی سے عالم وجود میں آگیا تھا، پاکستان بننے سے ذرا پہلے تک مسلم لیگ نے اس امر کی سخت کوشش کی کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو، متحد رہے، البتہ مسلمانوں کے حقوق پامال نہ ہونے پائیں لیکن اس کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں، آخر اس نے پاکستان کے مطالبہ کو اپنایا، اور یہ مطالبہ سارے مسلمانانِ ہند کا مطالبہ بن گیا، اور بالآخر پاکستان کے قیام پر ان لوگوں کو بھی راضی ہونا پڑا، جو شروع میں اس تصور اور نظریہ کے سخت مخالف تھے!

کوئی تحریک بھی دفعتاً عالم وجود میں نہیں آجاتی، کوئی نظریہ بھی فوراً قوم کے دل و دماغ پر مسلط نہیں ہو جاتا اس میں کچھ دیر لگتی ہے کچھ وقت لگتا ہے، افہام و تفہیم اور تبلیغ و تلقین کے لئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے، چنانچہ پاکستان کی تحریک کو بھی ان مرحلوں سے گذرنا پڑا، اب ہم مختصر طور پر ان مراحل کا تذکرہ کریں گے:

اقبال کا نظریہ — دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس عام الہ آباد میں منعقد ہوا، صدر اجلاس مفکر ملت علامہ اقبال تھے، انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا!

• جہاں تک میں نے مسلم افکار کا مطالعہ کیا ہے میں اس بنا پر بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اگر یہ اصول فرقہ واری کے مستقل فیصلہ کی اساس قرار دیا جائے کہ ہندی مسلمانوں کو پورا پورا حق ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں اپنی ثقافت و روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پورے طور پر آزادانہ ترقی کرنے کے مستحق ہیں ۔ تو مسلمان ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنے کے لئے بیقرار ہے ۔ یہ اصول فرقہ واری پر مبنی نہیں ہے ۔ فرقہ واریاں بھی کئی قسم کی ہیں وہ قوم جو دوسری قوموں پر نگاہ بد رکھے ، اور بدنیتی جس کے خمیر میں ہو وہ قوم ذلیل اور کمینہ ہے ، میں دوسری قوموں کے رواج ، قانون اور مذہبی معاشری مجالس کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یہ تو قرآن مجید کی تعلیمات کی رُو سے میرا فرض عین ہے کہ بوقت ضرورت میں دیگر اقوام کے معابد کی حفاظت کروں لیکن اس پر بھی مجھے اپنی قوم سے عشق ہے جو کہ میری حیات اور مسلک کا منبع ہے جس نے کہ مجھے اپنا مذہب اپنا ادب ، اپنی فکر اپنا تمدن دے کر میرے وجود کی تشکیل میں حصہ لیا ہے ۔ اور اس طرح اپنے تمام ماضی کا احیا کر کے زندہ اور موثر عامل سے مجھے میرا موجود تصور بخشا ہے ،

نہرو رپورٹ کے مصنفین نے بھی فرقہ واری کے اس اعلیٰ پہلو کے فوائد کو تسلیم کیا ہے ، سندھ کی علیحدگی پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ وسیع قومی نقطہ نگاہ سے یہ کہنا کہ فرقہ وارانہ صوبے نہیں بنانے چاہئیں ، ایک لحاظ سے یہ کہنے کے مترادف ہے کہ وسیع بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے الگ الگ قومیں بھی نہیں ہونی چاہئیں ، ان دونوں بیانات میں کچھ صداقت تو ہے لیکن بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے داعی کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ کامل قومی خود اختیاری کے بغیر ایک بین الاقوامی ریاست کی تشکیل امر محال ہے ، اسی طرح کامل ثقافتی خود اختیاری اور اعلیٰ القسم کی فرقہ واری کے بغیر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر مشکل ہوگی ۔

جب کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی پورے طور پر یک رنگی نہیں پائی جاتی تو فرقہ وارانہ طبقات کو تسلیم کئے بغیر ہندوستان میں فرنگی جمہوریت کا نفاذ درست قرار نہیں دیا

جا سکتا۔ مسلمانوں کا اسلامی ہند کی تشکیل کا مطالبہ کاملاً صحیح ہے۔ میری تمنا ہے کہ پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حکومت خود اختیاری خواہ وہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ملے یا اس سے باہر ہندی مسلمانوں کے لئے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیئے ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس تقسیم سے مسلمانوں کا احساس ذمہ داری و حب وطن مزید ترقی کرے گا۔ اور شمال مغربی ہند کے مسلمان ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے بہترین مدافعتی فوج ثابت ہوں گے، خواہ یہ حملے خیالات کے ہوں یا سنگینوں کے اگر آزاد نیپال کے ۱۹ ہزار گورکھے جو فوج میں بھرتی کئے جاتے ہیں منہا کر دیئے جائیں تو ہندوستانی فوج میں ۶۲ فی صدی پنجابی ہیں۔ انہیں سرحدی اور بلوچی سپاہی شامل ہیں جن کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے اس سے آپ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی مدافعانہ قوت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں آنریبل مسٹر شاستری نے اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ میں انہیں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان صرف آزادانہ ترقی کرنا چاہتے ہیں، جو کہ وحدانی طرز حکومت کے ماتحت تقریباً ناممکن ہے اور قوم پرست ہندو سیاسیین اسی طرز حکومت کے شیدا ہیں تاکہ سارے ہندوستان پر ان کا مستقل غلبہ قائم رہے۔"

پاکستان کا تصور شروع میں یہ تجویز اتنی ناممکن العمل نظر آتی تھی کہ خود مسلمان اس کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن صوبوں میں ہندو سامراج کا دور حکومت دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔

قائد اعظم کا ظہور مسٹر جناح نے پریکٹس ترک کر کے دور گوشہ نشینی کو الوداع کہہ کر مسلمانان ہند کی قیادت کا بار گراں اپنے دوش ناتواں پر اٹھا لیا تھا، مسلمانان ہند پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو رہے تھے، ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ ساری قوم کے لئے فرمان کی حیثیت رکھتا تھا، قائد اعظم نے پاکستان کے مطالبہ کو قومی مطالبہ بنا دیا، اور بہت جلد بھارت کے طول و عرض میں اسی مطالبہ کی گونج سنائی دینے لگی۔

۲۲- مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قائد اعظم کی زیر صدارت مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا، اس اجلاس میں قائد اعظم کے ایما سے مسٹر فضل الحق نے حسب ذیل تجویز پیش کی

۱- کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس دستوری معاملات کی نسبت لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کی کارروائی کی جو ان تجاویز مورخہ ۲۷- اگست ۱۷- ۱۸ اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء سے ظاہر ہے توثیق کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وفاقی اسکیم جس کی دستور ہند بابت ۱۹۳۵ء میں تشریح کی گئی ہے۔ اس ملک کے حالات کے اعتبار سے قطعاً ناموزوں اور ناقابل عمل ہے اور مسلم ہندوستان کے لئے کسی طرح قابل قبول نہیں۔

۲- ملک معظم کی حکومت کی جانب سے وائسرائے بہادر کے اعلان مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی نسبت یہ اجلاس اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت ہند کے دستور بابت ۱۹۳۵ء کا جہاں تک تعلق ہے اس اعلان کے ذریعہ یقین دلایا گیا ہے کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات سے مشورت کے بعد دستور پر نظر ثانی کی جائے گی مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہ ہو سکے گا جب تک کہ پورے دستوری خاکہ پر از سر نو غور نہ کیا جائے تاوقتیکہ اس کی بابت مسلمانوں کی رضامندی اور توثیق حاصل نہ ہو جائے کوئی غور کردہ خاکہ قابل قبول نہیں ہو سکتا

۳- قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ غور کردہ رائے ہے کہ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو۔

جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کر کے ان کو جداگانہ علاقوں میں منقسم کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے، ان رقبہ جات میں جہاں بلحاظ تعداد مسلمانان اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خود مختار ہو۔

ان آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی حفاظت کے ملئے ان ہی کی مشورت سے معین اور مؤثر تحفظات مہیا کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں دستور میں ان کے لئے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی خود ان کے مشورت کے ذریعہ حفاظت ہو سکے۔

یہ اجلاس مجلس کو اختیار دیتا ہے کہ مذکورہ صدر بنیادی اصول کے بموجب ایسی دستوری اسکیم مرتب کرے جس میں ان مختلف مجوزہ ریاستوں کو سارے مسائل مثلاً دفاع، خارجی معاملات، رسل و رسائل، چنگی اور دیگر ضروری امور کا اختیار دیا گیا ہو۔

ہنگامۂ مخالفت کانگرس نے شدت کے ساتھ اس مطالبہ کی مخالفت کی، مسلمانوں کے ایک طبقہ نے بھی مخالفت میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں لیکن مسٹر جناح کی آواز کو کوئی نہ دبا سکا۔

دسمبر ۱۹۴۱ء میں ایک بیان کے سلسلہ میں قائداعظم نے فرمایا۔

"ہندوستان میں جو اختلافات یہاں کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں، وہ ان اختلافات سے ہزار گنا زیادہ ہیں جو یورپ کی مختلف اقوام کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں نسل، مذہب، زبان اور تہذیب کے اعتبار سے جتنا تنوع اور اختلاف ہے آتنا دنیا کے کسی حصہ میں بھی نہیں ہے مگر خوش قسمتی سے مسلمانوں کے وطنی علاقے شمال مغرب اور شمال مشرق میں الگ واقع ہوئے ہیں۔ اور ان علاقوں میں مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت موجود ہے جو سات کروڑ نفوس پر مشتمل ہے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کو بقیہ ہندوستان سے الگ کر کے انہیں آزاد اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت دے دی جائے۔ مسلمان نہایت غیر مبہم طور پر اس کے خواہاں ہیں کہ اس نیم براعظم میں وہ خود بھی آزاد ہوں اور ہندو اور ہندوانڈیا بھی آزاد ہو، برخلاف اس کے ہندوؤں کی تمام چالیں اور تجویزیں اور ان کی پیش کی ہوئی تمام اسکیموں کی بنیاد اس مقصد

پر ہوتی ہے کہ سارے ہندوستان پر ہندو راج مستولی کر کے دس کروڑ مسلمانوں کو اس کے ماتحت غلام رکھا جائے جس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان محض برطانیہ کا طوق غلامی اتار کر ہندوؤں کا طوق غلامی پہن لیں، اخواہ صریح ناواقفیت کی بنا پر ہو یا غیر ممالک کی رائے عامہ کو اپنی موافقت میں گمراہ کرنے کی غرض سے آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا معاملہ چین، سوویٹ روس بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے حالات کے متوازی ہے اور ان ممالک کے باشندوں نے جو تجربات حاصل کئے ہیں ان کی روشنی میں یہاں کے مسائل بھی حل کئے جا سکتے ہیں، اگر کوئی ذی فہم انسان اس دعویٰ کا سرسری جائزہ بھی لینے کی زحمت کرے تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ہندوستان اور ان کے ممالک کے مسائل کا تقابل صریحاً لایعنی اور گمراہ کن ہے۔

ہندوستان ایک قومی اسٹیٹ نہیں ہے، نہ ایک ملک ہے بلکہ ایک نیم براعظم ہے جس میں متعدد قومیتیں ہیں، منجملہ ان کے ہندو اور مسلمانوں کی دو بڑی بڑی قومیں ہیں جن کے تہذیب و تمدن، زبان و ادب، فن تعمیر، اسم و اصطلاحات، معیار قدر و تناسب اصول و قوانین، ضوابط و اخلاق و معاشرت، رسم و رواج، نظام، تقویم، تاریخ و روایات، رجحانات و عزائم، نظریۂ حیات، غرض تمام چیزیں ایک دوسرے سے صریحاً مختلف ہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے ایک دوسرے کے یکسر مخالف و متضاد ہیں۔"

مسٹر جناح کی ان تصریحات سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے محرکات و عوامل کیا ہیں؟

تخریب میں تعمیر | پاکستان کو روکنے کی جتنی کوششیں ہو رہی تھیں، بالآخر وہ پاکستان کے راستہ میں اور زیادہ ساز گار ہو جاتی تھیں،

۱۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۱۹۴۴ء) کے دوران میں کانگرس حکومت سے لڑتی رہی، صلح کی شرط صرف یہ رکھی کہ مسلم لیگ نظر انداز کر دی جائے، پاکستان کا مطالبہ نہ مانا جائے۔

۲۔ بہت سے مسلمانوں کو بھی کانگرس نے اپنا تابع بنا رکھا تھا، یہ ہر وقت کانگرس کی رہنمائی کرتے رہتے تھے،

۳۔جب یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا تو منظم طور پر فسادات شروع کئے گئے، لیکن اس نے کانگرس کا کیس اور کمزور کر دیا۔

۴۔کابینہ وفد (۱۹۴۶ء) نے ایک تجویز مفاہمت پیش کی، مسلم لیگ نے مان لیا، کانگرس نے تسلیم نہیں کیا، اس تجویز کی رو سے ہندوستان کی وحدت قائم رہ سکتی تھی، اس رویہ نے پاکستان کو اور یقینی بنا دیا۔

۵۔عبوری حکومت میں (۱۹۴۶ء) کانگرس سارے ہندوستان کی مالک بن گئی لیکن اس کے باوجود،

الف۔ بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اور کانگرس اسے نہ روک سکی۔

ب۔ گڑھ مکتیشر میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، کانگرس کوئی تلافی نہ کر سکی،

ج۔ کلکتہ بمبئی اور دوسرے مقامات پر خوں ریز فسادات ہوئے، کانگرس نے کچھ نہ کیا ــــــ!

ان سب واقعات سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا، لیکن پاکستان کا راستہ صاف ہوتا گیا۔ ضروری ہے کہ ان فسادات کا سرسری جائزہ لے لیا جائے۔

اب ہندوستان دہکتا ہوا کوہ آتش فشاں بن گیا، جس کا کھولتا ہوا لاوا ہری بھری کھیتیوں اور خوش و خرم انسانوں کو جھلسانے لگا!

بینی آباد کا فساد

بمبئی اور کلکتہ میں فساد کی آگ بھڑک رہی تھی کہ بینی آباد ــــــ صوبہ بہار کا ایک قصبہ ــــــ میں عجیب و غریب قسم کا ہندو مسلم فساد ہوا اور یہی سارے ہندوستان کی فساد آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کا سبب بنا۔

یہ فساد کلکتہ کے حادث سے متاثر ہو کر کیا گیا۔ اور اس کی سب سے نادر اور عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ اس میں چن چن کے نیشنلسٹ مسلمان بھی قتل کئے گئے۔ وہ مسلمان جن کی ساری زندگی کانگرس کی خدمت کرتے اور کانگرس کے لئے اپنی قوم سے لڑتے گذری تھی۔

فساد اور اشتعال کی گرم بازاری میں نادان اور ناسمجھ کوتاہ اندیش اور نافہم "عوام" عقل و ہوش کھو بیٹھتے ہیں دوست دشمن کی تمیز نہیں کر پاتے اور جو سامنے آجاتا ہے اسے بے دریغ ہلاک کر دیتے ہیں۔

بینی آباد کے کانگرسی کارکن حافظ محمد شفیع کو اپنی کانگریسیت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ انہوں نے پولیس

کو واپس کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ ہم یہاں فساد نہیں ہونے دیں گے، لیکن فساد ہوا، اور اس فساد میں سب سے پہلے جو شخص اپنے دوستوں کے ہاتھوں قتل ہوا وہ حافظ صاحب مرحوم تھے، ان کے والد بزرگوار تھے، اور ان کا فرزند سعادتمند تھا، جب حافظ محمد شفیع مرحوم کا یہ حشر ہوا تو ان سے مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں کا جو انجام ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگالینا کچھ دشوار نہیں ہے۔

نواکھالی کا خونیں ڈرامہ

متعدی مرض کی طرح کلکتہ کا فساد سارے ہندوستان میں پھیلنے لگا، بمبئی آباد کی خبریں بنگال میں اور خاص کر مشرقی بنگال میں پہنچیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کلکتہ کی خبروں سے کافی اشتعال تھا، بمبئی آباد کی خبروں نے آگ پر تیل کا کام کیا،

اور دفعتہً ایک روز اخبارات میں مشرقی بنگال کی دلدوز اور جگر خراش خبریں چھپنے لگیں۔ نواکھالی کے فساد میں اگرچہ جانی نقصان بہت زیادہ نہیں ہوا، لیکن دہشت اور سراسیمگی بہت زیادہ پھیل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقہ کی تعدی اور ظلم کی فریاد لے کر بہار کی طرف اور کلکتہ کی طرف بھاگنے لگے،

نواکھالی کے فساد میں انسانیت روپوش ہو گئی تھی۔ کتنی ہی کم مقدار میں سہی، لیکن یہاں بھی بیباکی سے خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر اور مذہب کو پس پشت ڈال کر ایک فرقہ کے لوگوں کو مارا، قتل کیا۔ اغوا کیا جبری تبدیل مذہب کے بھی بعض واقعات ہوئے، لوٹ مار کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا نواکھالی میں انسان نہیں بستے درندے رہتے ہیں، جو ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں، نوچ رہے ہیں، کاٹ رہے ہیں، کھا رہے ہیں، کچھ واقعہ تھا، اور بڑی حد تک مبالغہ۔ اخبارات کے پروپیگنڈے نے واقعہ کو دبا دیا اور مبالغہ کو حقیقت بنا دیا، دنیا نواکھالی پر نفریں بھیجنے لگی۔

بہار میں ہلاکت کی گرم بازاری

نواکھالی کی خبریں پوری مبالغہ آفرینی اور حاشیہ آرائی کے ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلائی جا رہی تھیں، دوسرے مقامات دور تھے۔ اس لئے ان پر اثر بعد میں ہوا، دیر میں ہوا، بہار پڑوس میں تھا، اس لئے وہاں لوگوں پر فوری اثر ہوا۔ اور ایسا اشتعال پھیلا کہ حکومت کے بس میں اس کا روکنا نہ رہ گیا،

اس ٹریجڈی کا سب سے الم انگیز پہلو یہ تھا کہ بہار کی اشتعال انگیزی اور ہنگامہ آرائی میں ایسے

لوگ بھی شریک تھے۔ جو اپنے تئیں کانگریسی کہتے تھے،

بہار میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ "یوم نواکھالی" منایا گیا اور اس جوش وخروش کا انجام یہ ہوا کہ وہاں بے گناہوں اور بے قصوروں کا قتل عام شروع ہو گیا، بہار میں جس وسیع پیمانہ پر دیہات کے دیہات جلا دیئے گئے اور وہاں کے بسنے والوں کو جس بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا گیا، اس کا ثبوت لاشوں سے بھرے ہوئے وہ کنوئیں ہیں جنہیں خان عبدالغفار خاں نے اپنی چشم اشکبار کے ساتھ ملاحظہ فرمایا، اور وہ اعلان ہے، جس میں خود گاندھی جی نے اعتراف کیا کہ بہار میں ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کا قتل عام جس بے دردی اور شقاوت کے ساتھ وسیع پیمانہ پر کیا، نواکھالی کے افسوسناک حوادث کو اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

جائز مطالبہ یہ قتل عام، یہ سفاکی، یہ درندگی، یہ بہیمیت دیکھ کر بہار کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں پناہ گزین کی حیثیت سے بنگال پہنچے، سندھ گئے، پنجاب میں بس گئے، ہزاروں مسلمان دیہاتوں سے بھاگ بھاگ کر شہر پہنچے، اور پناہ گزینوں کے کیمپ میں مقیم ہو گئے۔

مسلم لیگ کی طرف سے اس سلسلہ میں تین مطالبے پیش کئے گئے:۔

۱۔ بہار کے فسادکی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے اور جو لوگ ملزم ثابت ہوں انہیں پوری پوری سزا دی جائے، جو لڑکیاں اغوا کی گئیں ہیں ان کا سراغ لگایا جائے اور جن کا مذہب جبراً تبدیل کیا گیا ہے انہیں واپس لایا جائے۔

۲۔ حکومت اپنی ذمہ داری پر تبادلۂ آبادی کی اسکیم پر عمل درآمد کرے اور مہاجرین کو بنگال میں یا جہاں وہ پسند کریں پہنچا دیا جائے۔

۳۔ یا کم از کم یہ کرے کہ صوبہ میں مسلمانوں کے تین چار مراکز قائم کر دے اور صوبہ کی بکھری ہوئی اور منتشر مسلم آبادی کو ان مراکز میں جمع کر دے تاکہ آئندہ اس طرح کے خوں ریز حملے ان پر نہ ہو سکیں،

حکومت بہار نے ان میں سے کسی مطالبہ کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اب تک تحقیقاتی عدالت قائم نہیں ہوئی ہے۔ اور مسلم منطقہ قائم کرنے کی تجویز تو قابل غور بھی نہیں سمجھی گئی۔

گڈھ مکتیشر ادھر تو بہار میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ادھر بنگال کے پڑوسی صوبہ بہار کی آگ، بہار کے

پڑوسی صوبہ یو۔پی میں پھیل رہی تھی، وہاں یوم نواکھالی تو کچھ زیادہ شد و مد کے ساتھ نہیں منایا گیا: لیکن یوم نواکھالی کے خفیہ پروگرام پر علانیہ عمل درآمد بڑی کامیابی سے ہوا۔

یو۔پی میں گڈھ مکٹیشر ایک چھوٹی سی بستی میرٹھ کے قریب ہے، جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، ہر سال اشنان کے موقع پر بالعموم، اور کمبھ کے میلہ پر بالخصوص یہاں لاکھوں جاتری کا اجتماع ہوتا ہے اس میلہ میں دہلی، میرٹھ وغیرہ کے مسلمان تاجر، سامان تجارت لے کر پہنچتے ہیں۔ اور خود گڈھ مکٹیشر کے مسلمان بھی اس میں شریک ہوتے ہیں، اس سال بھی یہی ہوا۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں یہ میلہ ہوا اور لاکھوں کا یہ ہجوم دفعتہً چند سو مسلمانوں پر وحشی درندوں کی طرح ٹوٹ پڑا اس فساد کی خصوصیت بھی یہی تھی کہ اس میں مرد ہی نہیں مارے گئے عورتیں بھی ماری گئیں، ان کی آبروریزی کی گئی، انہیں اغوا کیا گیا۔ انہیں فروخت کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ہارون رشید جو محکمہ صحت کے انچارج تھے بیدردی سے قتل کر دیئے گئے، ان کی اہلیہ محترمہ کے کپڑے اتار دیئے گئے اور مجمع میں سے کسی ایک شخص کو بہ حیثیت شوہر منتخب کر لینے کا حکم دیا گیا، انہوں نے انکار کیا تو انہیں مارتے مارتے ادھ مؤا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ دریا کے کنارے پیش آیا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ اور تو نہ آیا وہ دریا میں کود پڑیں، اور نیم بیہوش حالت میں بہت دور جا کر نکلیں، ایک آدمی نے انہیں دیکھ لیا، وہ ان کی بہتی ہوئی لاش کو گھسیٹتا ہوا کنارے لایا، کچھ رمق زندگی کی باقی تھی، علاج معالجہ سے اچھی ہو گئیں اب اپنے وطن لاہور میں ہیں۔

گڈھ مکٹیشر کے شہیدوں کی بے گور و کفن لاشیں کئی دن تک شارع عام پر پڑی سڑتی رہیں، کوئی ان کی نماز پڑھنے والا، کوئی انہیں دفن کرنے والا بھی نہ تھا، آہ!

جو عورتیں اور لڑکیاں اس ہجوم نے اغوا کیں، ان کا آج تک پتہ نہیں چلا، حکومت کی کوششیں اس سلسلہ میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکیں۔

گڈھ مکٹیشر کے ہولناک اور مہیب حوادث کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم پنڈت اور ہوم ممبر قدوائی نے ایک مشترک بیان میں اقرار کیا کہ اس حادثہ نے ہماری گردنیں شرم سے جھکا دی ہیں!؟

——— لیکن یہ شرم سے جھکی ہوئی گردنیں مجرموں کا سراغ نہ لگا سکیں انہیں کیفر کردار تک نہ پہنچا سکیں اُن لڑکیوں کو نہ ڈھونڈھ سکیں، جو بے حجابی اور بے پردگی کے عالم میں جھونٹے پکڑ پکڑ کر گھسیٹی گئیں اور نہ جانے کہاں پہنچا دی گئیں۔

مرض کی روک تھام اگر شروع میں نہ کی جائے تو وہ سنبھالے سے نہیں سنبھلتا، کلکتہ سے اگر بہار نے اور بہار سے یوپی نے اور یوپی سے پنجاب نے اور پنجاب سے سرحد نے اگر سبق حاصل کیا ہوتا تو ہرگز اتنے بے گناہوں کا خون پانی کی طرح نہ بہتا، لیکن،

گوش سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو؟

دستور ساز اسمبلی

ہندو جنتا کی اس خون ریزی اور سفاکی نے پاکستان کو ممکن بنا دیا! ملک فساد کی آگ میں جل رہا تھا، بنگال سے، بہار سے، یوپی سے، درد مندوں اور سینہ فگاروں کی آہیں بلند ہو رہی تھیں، بیوائیں فریاد کر رہی تھیں، یتیم چیخ رہے تھے، بربادی آبادی کا مرثیہ پڑھ رہی تھی، کنوئیں لاشوں سے پٹے ہوئے تھے، سڑکوں پر قطع و بُرید کی ہوئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، بھگدڑ مچی ہوئی تھی، بے بس، اور بے سہارا لوگ افراتفری کے عالم میں دولت چھوڑ کر گھر چھوڑ کر، کپڑے چھوڑ کر، اناج چھوڑ کر، بھاگ رہے تھے، بے تحاشا بھاگ رہے تھے، فاقہ کش حالت میں نیم عریاں حالت میں آہ وزاری کرتے ہوئے فریاد و فغاں کرتے ہوئے، بلکتے ہوئے روتے ہوئے چیختے ہوئے!

لیکن کانگریس کی طرف سے "آگے بڑھنے" کا کام جاری تھا، پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اسے فرصت نہ تھی اس کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ ۹۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوگا، ضرور ہوگا، خواہ مسلم لیگ اس میں شریک ہو یا شرکت سے انکار کر دے ہم آگے بڑھ رہے ہیں، ہم رک نہیں سکتے، جو ہمارے ساتھ آجائیگا وہ آگے بڑھے گا، جو پیچھے رہ جائے گا، وہ پیچھے رہے گا۔

مسٹر جناح کا اعلان

کامل تین مہینہ تک مسٹر جناح اس کے منتظر رہے کہ اصلاح احوال کی کوشش کانگریس کی طرف سے ہو، فسادزدہ لوگوں کے درد کا درماں وہ مہیا کرے ——— ہٹ اور ضد کو چھوڑ کر معقولیت اور رواداری کے راستہ پر آجاتے زمرہ بندی کو جو اسٹیٹ

پیپر کی بنیادی دفعہ ہے تسلیم کرلے، فی الحال دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی کردے، اس وقت جذبات بھڑکے ہوئے ہیں، عناد اور مخالفت کی کارفرمائی ہے، خوش اعتمادی اور حسن ظن کا کہیں کوسوں پتہ نہیں، ایک دوسرے کو شک اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ان حالات میں دستور سازی کا کام یکسوئی چاہتا ہے، اعتماد چاہتا ہے تعاون چاہتا ہے، خوشگوار فضا چاہتا ہے اور اس وقت یہ سب چیزیں ناپید ہیں۔

لیکن مسٹر جناح کی دونوں باتیں رد کر دی گئیں، اصلاح احوال کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، زمرہ بندی کا اصول تسلیم نہیں کیا گیا، اور دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہیں کیا گیا، مسٹر جناح نے کانگرس سے اپیل کی، لیکن اس کا جواب نہ ملا، مسٹر جناح نے لارڈ ویول سے اپیل کی، اس کا جواب ملا، لیکن دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے کہ وہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کے اجلاس میں ضرور شریک ہوں، اس ضد کا جواب مسٹر جناح یہی دے سکتے تھے کہ دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کردیں، چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوگی۔

حکومت کی گھبراہٹ

مسٹر جناح یہ اعلان کر کے سندھ کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔ جہاں صوبائی اسمبلی کا نیا انتخاب ہو رہا تھا۔ اور یہاں دستوری اسمبلی کے انعقاد کی تیاریاں ہونے لگیں۔

شاید کانگرس کی طرح حکومت برطانیہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ مسلم لیگ صرف دھمکی دے رہی ہے عمل نہیں کرے گی، لیکن جب اسے اندازہ ہوگیا کہ مسلم لیگ عمل بھی کرے گی تو اسے اپنی غلط روی کا احساس ہوا، اس نے محسوس کر لیا کہ مسلم لیگ کی عدم موجودگی میں جو دستور بنے گا، وہ مسلم قوم پر نافذ نہیں کیا جاسکتا یہ نازک سنگین اگر ایسا کیا جائے تو وہ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی ـــــــ آخر مسٹر اٹیلی وزیراعظم برطانیہ نے مسٹر جناح، مسٹر لیاقت علی خاں، مسٹر نہرو اور مسٹر بلدیو سنگھ کو صلاح مشورہ کے لئے لندن طلب کیا،

کانگرس نے جب دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ باقی رکھا اور کابینہ اسکیم ماننے سے انکار کر دیا، تو اب حکومت برطانیہ بھی مایوس ہوگئی، اب تک گفتگو کا رخ یہ تھا کہ لیگ اور کانگرس میں مفاہمت ہوجائے، اب یہ ہوگیا کہ لیگ اور کانگرس الگ الگ حکومت بنالیں۔

پاکستان کا قیام

مشرقی پنجاب میں خون کا ایک نیا سمندر ——

جبری ترکِ وطن کی داستان ——

ایک کروڑ سے زیادہ نفوس کی خانماں بربادی ——

حکومت برطانیہ کا اعلان

کانگرس اب بھی پاکستان کی مخالف تھی نیشنلسٹ مسلمان اب بھی پاکستان کا نام سننا نہیں چاہتے تھے سکھ اور دوسری جماعتیں بھی پاکستان کو ناممکن سمجھ رہی تھیں ——— لیکن پاکستان نمودار ہو رہا تھا!

بہار، گڈھ مکتیشر، کلکتہ، بمبئی اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں کا قتل عام رائگاں نہیں جا سکتا تھا!

مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور یگانگت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا،

صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے نئے انتخاب میں مسلم لیگ کی ہندوستان گیر سو فی صد کامیابی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا ——— اور یہ انتخاب صرف ایک مسئلہ پر لڑا گیا تھا

آخر جب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تو حکومت برطانیہ بھی تشکیل پاکستان پر رضامند ہو گئی،

۳۰۔ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے ہند نے لندن کے سفر سے واپسی پر مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ سے صلاح و مشورہ کے بعد حسب ذیل اعلان کیا:۔

۲۰۔ فروری ۱۹۴۷ء کو ملک معظم کی حکومت نے اس ارادہ کا اعلان کیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانوی ہند کو حاکمانہ اختیارات تفویض کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت حکومت کو امید تھی کہ ہندوستان کی اہم جماعتیں وزارتی وفد کا پلان ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت سے اشتراک عمل کریں گی۔ اور ایک ایسا دستور اساسی وضع کر لیں گی جو تمام افراد متعلقہ کے لئے قابل قبول ہو لیکن افسوس کہ یہ امید پوری نہ ہوئی، مدراس

بمبئی، یوپی، بہار سی پی، برار آسام، اڑیسہ، صوبہ سرحد اور دہلی، اجمیر، میواڑ اور کورگ کے اکثریت کے صوبوں کے نمائندے تو پہلے ایک جدید دستور وضع کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے لیکن مسلم لیگ پارٹی جس میں بنگال پنجاب اور سندھ نیز برطانوی بلوچستان کے اکثریت کے نمائندے شامل ہیں موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے سے انکار کر بیٹھے

ملک معظم کی حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ خود اہل ہند کی مرضی کے مطابق اختیارات منتقل کئے جائیں۔ اس کام میں بڑی آسانی ہو جاتی اگر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں اتفاق آرا یا سمجھوتہ ہو جاتا لیکن جب یہ نہ ہو سکا تو ایسا طریقہ انتقال اختیارات سوچنے کا بار حکومت پر آن پڑا جس سے اہل ہند کی مرضی کا یقین ہو سکے۔ چنانچہ ہندوستان کے سیاسی زعماء سے پوری طرح مشورہ کرنے کے بعد ملک معظم کی حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے خود ایک پلان تیار کرے جو ذیل میں دی جاتی ہے، حکومت بات صاف صاف واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے لئے کوئی دستور اساسی خود مرتب یا وضع کرے، بلکہ یہ کام تو خود ہندوستانیوں کے کرنے کا ہے، اس پلان میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو ایک متحدہ ہندوستان کے قیام کے سلسلہ میں مختلف فرقوں میں گفتگو و مشاورت کرنے میں مانع ہو۔

لیگی صوبوں کی دستور ساز مجلس ملک معظم کی حکومت کا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ موجودہ مجلس دستور ساز کے کاموں میں رخنہ پیدا کرے۔ اب جب کہ مندرجہ ذیل صوبوں کے لئے ایک موقع نکالا گیا ہے حکومت کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اس اعلان کے بعد ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے جن کی اکثریت مجلس دستور ساز میں پہلے سے شریک ہے اب اس کی محنتوں کے پھل میں اپنا مناسب حصّہ لیں گے اسی کے ساتھ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اس مجلس دستور ساز کا تیار کردہ دستور ملک کے ان حصّوں پر نافذ نہیں کیا جا سکتا جو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

پیراگراف نمبر ۴ ملک معظم کی حکومت کو اطمینان ہے کہ جو طریقہ کار ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے، یہی وہ بہترین طریقہ ہے جس سے ایسے علاقوں کے رہنے والوں کی مرضی کا اس

سوال کے متعلق معلوم کی جاسکتی ہے کہ آیا ان کا علیحدہ دستور تیار کیا جائے یا نہیں یعنی ــــــ :ــــ

الف۔ آیا وہ موجودہ دستور ساز میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا

ب۔ ایک جدید اور جداگانہ مجلس دستور ساز میں جانا چاہتے ہیں جس میں ان حلقوں کے نمائندے شریک ہوں گے جنہوں نے موجودہ اسمبلی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

جب یہ بات طے ہو جائے گی تب اس امر کا فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ کس کو یا کن کو اختیارات منتقل کئے جائیں۔

بنگال اور پنجاب کی تقسیم بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز کو (یورپین ممبروں کے سوا) ہدایت کی جائے گی کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر مجتمع ہوں، ایک حصے میں مسلم اکثریت والے اضلاع کے نمائندے ہوں اور دوسرے حصے میں باقی اضلاع کے۔ اضلاع کی آبادی معلوم کرنے کے لئے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار قطعی سمجھے جائیں گے۔ ذیل کے نقشہ میں ان صوبوں کے ان اضلاع کی فہرستیں بھی دے دی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

ان مجالس قانون ساز کے دونوں حصوں کے ممبران الگ الگ بیٹھیں گے اور ان کو اس سوال پر رائے دینے کا حق دیا جائے گا کہ آیا ان کے صوبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا نہیں۔ اگر ان دو حصوں میں سے کسی حصہ کی معمولی اکثریت نے بھی تقسیم کی موافقت میں رائے دی تو تقسیم کر دی جائے گی۔ اور اس کے لئے انتظامات بھی کر دیئے جائیں گے۔

رائے دینے سے پہلے ان دونوں مجالس قانون ساز (بنگال و پنجاب) کے ممبروں کو الگ الگ مجتمع ہو کر تقسیم کے سوال پر رائے دینے سے پہلے ہر حصہ کے نمائندوں کو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ اگر دونوں حصوں کے نمائندوں نے صوبہ کو منقسم کرنے کے بجائے متحدہ رکھنا پسند کیا تو پھر وہ بحیثیت مجموعی کس مجلس دستور ساز میں شریک ہونا چاہے گا۔ اس لئے اگر کسی مجلس قانون ساز کا کوئی ممبر مطالبہ کرے تو اس مجلس قانون ساز کے تمام ممبروں کو (یوروپین ممبروں کے سوا) جلسہ منعقد کیا جائے گا اور اسی جلسہ میں اس سوال کا فیصلہ کیا جائے گا کہ صوبہ بحیثیت مجموعی کون سی مجلس دستور ساز میں شریک ہوگا اور

اسے متحدہ رکھا گیا۔

اور اگر تقسیم کی موافقت میں فیصلہ ہوا تو اس مجلس قانون ساز کے ہر حصہ کو اپنے حلقہ ہائے انتخاب کی طرف سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ پیراگراف ۹ کے کس جزو کو قبول کرتا ہے۔

تقسیم کے سوال کے فوری حل کے لئے بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز کے ممبران مسلم اکثریت والے اضلاع (جن کی تصریح نقشہ میں کی جاتی ہے) اور غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کے نمائندے دو حصوں میں منقسم ہو کر الگ الگ مجتمع ہو جائیں گے،

حد بندی کا کمیشن ان صوبوں کی قطعی تقسیم کے لئے ظاہر ہے کہ ان کے حدود کی مفصل تحقیق و تعین کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے جوں ہی ان دونوں یا ان میں سے ایک صوبہ کو تقسیم کر دینے کا فیصلہ ہو جائے گا، گورنر جنرل ایک "تعین سرحد" کا کمیشن مقرر کر دیں گے۔ اس کمیشن کے ارکان اور مسائل تصفیہ طلب کا تعین گورنر جنرل اصحاب متعلقہ سے مشورہ کے بعد کریں گے۔ اس کمیشن کو ہدایت دی جائے گی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کے حدود اس بنیاد پر کرے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت والے رقبہ باہمی یکسانیت رکھتے ہوں فرقہ وارانہ یکسانیت و اختلاط کے علاوہ دوسرے مسائل بھی ملحوظ رکھنے ہوں گے اسی طرح بنگال صوبہ کی تقسیم کے بارے میں بھی ہدایات دے دی جائیں گی، ان صوبوں کے عارضی حدود ہوں گے جو ذیل کے نقشہ (فہرست) میں دیئے جاتے ہیں۔

سندھ کدھر جائے گا سندھ کی مجلس قانون ساز کا ایک اجلاس خصوصی طلب کیا جائے گا جس کے ارکان (یورپین ممبروں کے سوا) اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ پیراگراف نمبر ۴ میں دی ہوئی کس شکل کو پسند کرتا ہے۔

صوبہ سرحد کے مخصوص حالات صوبہ مغربی و شمالی (صوبہ سرحد) کی حیثیت ایک خاص نوعیت کی ہے اس کے تین نمائندوں میں سے دو تو موجودہ مجلس دستور ساز میں پہلے ہی سے شریک ہو گئے ہیں لیکن اس کی جغرافیائی پوزیشن اور دوسرے امور کے پیش نظر یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر پنجاب کلاً یا جزواً موجودہ دستور ساز میں شریک ہونے سے انکار کر دے تو صوبہ سرحد کو اس کا موقع

ملنا چاہیئے کہ اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرے لہٰذا ایسی صورت میں صوبۂ سرحد کی موجودہ مجلس قانون ساز کے رائے دہندوں سے استصواب کیا جائے گا کہ وہ پیراگراف نمبر ۴ کی دو شکلوں میں سے کس کو پسند کرتے ہیں یہ استصواب رائے عامہ گورنر جنرل کی نگرانی اور صوبائی حکومت کے مشورہ سے کیا جائے گا،

برطانوی بلوچستان نے ایک ممبر منتخب کر لیا ہے لیکن وہ موجودہ ممبر دستور ساز میں شریک نہیں ہوا۔ اس صوبہ کی جغرافیائی پوزیشن کے پیش نظر اسے اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرنے کا موقع دیا جائے گا کہ وہ مذکورہ بالا پیراگراف نمبر ۴ کی جس شکل کو چاہے پسند کرلے۔ گورنر جنرل غور کر رہے ہیں کہ یہ مقصد کس طرح بوجوہ احسن حاصل کیا جائے گا۔

آسام غیر مسلم صوبہ ہے

گو آسام میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے لیکن سلہٹ کا ضلع جو بنگال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ایسا ضلع ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایک مطالبہ یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اگر بنگال کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں تو ضلع سلہٹ کو مسلم بنگال سے ملا دیا جائے گا لہٰذا یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ بنگال کو تقسیم کر دینا چاہیئے اور گورنر جنرل کی نگرانی میں اور صوبۂ آسام کی حکومت کے مشورہ سے سلہٹ کے باشندوں سے استصواب رائے کیا جائے کہ آیا وہ صوبہ آسام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں یا مشرقی بنگال کے نئے صوبہ میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں۔ اگر رائے شماری سے یہ معلوم ہوا کہ سلہٹ کے باشندے صوبہ مشرقی بنگال سے ملحق ہونا پسند کرتے ہیں؛ تو حدود معین کرنے والا کمیشن اسی طرح کا مقرر کیا جائے گا اور انہیں ہدایت کے ساتھ جیسا بنگال اور پنجاب کے لئے کہا گیا ہے، اس کمیشن کو یہ ہدایت بھی کر دی جائے گی کہ سلہٹ ضلع کی مسلم اکثریت والے رقبہ اور اس سے متصلہ اضلاع کے مسلم اکثریتی رقبوں کو جو یکجانیت رکھتے ہوں آسام سے الگ کر کے مشرقی بنگال میں ملا دے، اور باقی صوبہ آسام کو شریک رکھے۔

مسلم بنگال اور مسلم پنجاب

۱۵ اگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہو جائے تو ضروری ہو گا کہ جدید انتخابات کرائے جائیں، اس انتخاب کا معیار ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے پلان کے مطابق ۱۰ لاکھ کی آبادی پر ایک نمائندہ کا ہوگا۔ اسی طرح اگر سلہٹ کو آسام سے کاٹ کر مشرقی بنگال میں شامل کر دینے کا فیصلہ ہوا تو اسے بھی نیا انتخاب کرنا ہوگا۔ ہر حلقہ کو جتنی نمائندگی کا حق ملے گا

اس کی تفصیل یہ ہے۔

صوبہ	عام نشستیں	مسلم	سکھ	میزان
ضلع سلہٹ	۱	۲	*	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	*	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	*	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

مختلف حلقوں کے نمائندوں کو جیسا منڈیٹ (ہدایت نامہ) دیا جائے گا ویسا عمل کریں گے یعنی یا تو موجودہ مجلس دستور ساز میں شریک ہو جائیں گے، یا جدید مجلس دستور ساز میں!

تقسیم کے بعد کے انتظامات

۱۶ اگر کسی تقسیم کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے انتظامی نتائج پر جس قدر جلد ممکن ہو ان لوگوں میں گفتگو شروع کر دینی ہوگی۔

الف۔ اپنے اپنے حلقہ کے جانشین حکام کے نمائندوں کے درمیان گفتگو ہوگی، ان تمام محکموں کے متعلق جو مرکزی حکومت کے پاس ہیں بشمول دفاع، مالیات اور رسل و رسائل،

ب۔ مختلف جانشین حکام اور ملک معظم کی حکومت کے درمیان گفت و شنید ہوگی معاہدات کے سلسلہ، اور ان کے امور کے متعلق جو انتقال اختیارات کے سلسلہ میں پیدا ہوں گے۔

ج۔ ان صوبوں کے بارے میں جن کے دو دو حصے کر دیئے جائیں گے ان تمام مضامین یا شعبہ جات کے متعلق گفتگو کرنی ہوگی جو صوبے کے ماتحت ہوا کرتے ہیں مثلاً آمدنی اور اخراجات کی تقسیم پولیس اور دیگر ملازمتیں ہائیکورٹ اور دیگر صوبائی ادارے وغیرہ،

آزاد قبائل کا سوال

۱۷ صوبہ مغربی و شمالی (سرحد) کے قبائل کے ساتھ ذمہ دار جانشین حکام کو مفاہمت و معاہدہ کرنا ہوگا۔

دیسی ریاستیں نوٹ کرلیں!

۱۸ ملک معظم کی حکومت یہ امر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مذکورہ بالا

فیصلوں کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہے اور ہندوستانی ریاستوں کے متعلق اس کی پالیسی وہی ہے جو وزارتی وفد نے مئی ۱۹۴۶ء کے پلان میں بیان کر دی ہے ۱۹ اس غرض سے کہ اختیارات لینے والے حکام اپنے کو اس کام کے لئے تیار کرلیں۔ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا امور جتنی جلد ممکن ہو مکمل کر لئے جائیں موجودہ مجلس دستور ساز اور جدید مجلس دستور اپنے اپنے دستور وضع کرنے کا کام جلد شروع کر دیں۔

درجہ نو آبادیات

نمبر۲ جیسا کہ ہندوستان کی اہم پارٹیاں اس بات پر زور دیتی رہی ہیں کہ جلد سے جلد اختیارات منتقل کر دیئے جائیں، ملک معظم کی حکومت بھی اس رائے سے متفق ہے، اور اسی غرض سے اس نے جون ۱۹۴۸ء انتقال اختیارات کی تاریخ پہلے ہی سے مقرر کر دی ہے جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ حکومت کی تجویز ہے کہ موجودہ سیشن میں تفویض اختیارات کا بل پیش کر دے اور اسی سال ڈومینین (درجہ نو آبادیات) کی بنیاد پر ایک یا دو جانشینوں کو اختیارات منتقل کر دے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجالس دستور ساز کو اس فیصلہ کا حق ہی باقی نہ رہے گا کہ ہندوستان اگر چاہے تو برطانوی دولت مشترکہ میں رہے یا اس سے علیٰحدہ ہو جائے۔

ہز اکسیلنسی گورنر جنرل مذکورہ امور کو عملی شکل میں لانے کے لئے ضابطہ امور کے متعلق وقتاً فوقتاً اعلانات کرتے رہیں گے۔

مسلم بنگال اور مسلم پنجاب

پنجاب اور بنگال کے جن اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ یہ ہیں (۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق)

پنجاب :۔ قسمت لاہور ۔ اضلاع گوجرانوالہ۔ گورداسپور۔ لاہور۔ شیخوپورہ۔

قسمت راولپنڈی ۔ اضلاع اٹک۔ گجرات۔ جہلم۔ میانوالی۔ راولپنڈی۔ شاہ پور۔

قسمت ملتان ۔ اضلاع ڈیرہ غازیخان۔ جھنگ۔ لائل پور۔ منٹگمری۔ ملتان۔ مظفر گڑھ۔

بنگال :۔ قسمت چاٹگام۔ اضلاع چاٹگام، نواکھالی۔ پٹرا۔

قسمت ڈھاکہ ۔ اضلاع باقر گنج، ڈھاکہ، میمن سنگھ

قسمت پریسیڈنسی ۔ اضلاع جیسور، مرشدآباد۔ نادیا

قسمت راجشاہی :- اضلاع بوگرا - دیناج پور، مالدا، پبنا - راج شاہی، اور رنگ پور

سنگ گراں

جب تک پاکستان نہیں بنا تھا کوشش یہ ہو رہی تھی کہ وہ نہ بن سکے، اب اس کا نہ بننا ناممکن ہو گیا، تو جدوجہد یہ کی جانے لگی کہ وہ زندہ نہ رہ سکے، چنانچہ :-

۱- فسادات کی رفتار اور تیز ہو گئی،

۲- مشرقی پنجاب میں لاکھوں مسلمان قتل کئے گئے، عورتوں کی عزت لوٹی گئی، بچے ذبح کئے گئے۔ کھیتوں میں آگ لگا دی گئی، زیورات چھین لئے گئے، مکانات ڈھا دیئے گئے۔ جانور ہتھیا لئے گئے۔

۳- سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

۴- کپورتھلہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن ایک مسلمان بھی اب وہاں نہیں،

۵- مغربی پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں نے انخلا کر کے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی مشرقی پنجاب خالی کر دیں، دو قومی نظریہ کے علمبردار قائداعظم اس کے لئے تیار نہیں تھے، لیکن یک قومی نظریہ کے پاسبان جواہر لال نے، اس پر سختی سے عمل درآمد کرایا، اور مشرقی پنجاب سے مسلمان، مغربی پنجاب میں آ کر پناہ لینے لگے۔

۶- دہلی میں، خاص دارالمملکت ہند میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اور حکومت ہند کچھ نہ کر سکی،

۷- بھرت پور اور اس کے گرد و نواح میں مسلمانوں کا قتل عام بے دردی کے ساتھ ہوا،

۸- اس طرح تقریباً ۶۰ لاکھ مہاجروں کا بار ایک نئی حکومت پر پڑ گیا، اور ۴۰ لاکھ کے قریب ہندو نشان جیسے وسیع ملک کے حصہ میں آئے۔

۹- دلی سے جو ٹرینیں پاکستانی ملازموں اور دستاویزوں کو لے کر چلتی تھیں، ان میں آگ لگا دی جاتی تھی کہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکیں

۱۰- مغربی پنجاب سے جو ہندو اور سکھ ترک وطن کر کے آئے، وہ اپنے ساتھ لوٹا اور گلاس تک لیتے گئے اور مشرقی پنجاب سے جو مسلمان آئے، وہ جان تک بہ مشکل سلامت لے جا سکے!

لیکن ــــــــــــــــ

پاکستان بن گیا!

پاکستان بن جانے کے بعد

نہ میز، نہ کرسی، نہ قلم نہ دوات، نہ کاغذ، نہ رجسٹر!

فوج باہر، خزانہ خالی مشکلات ومصائب کا ہجوم

لیکن

"نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!"

تاریخ کا عجوبہ

پاکستان بن گیا —— واقعی تاریخ کا بہت بڑا عجوبہ تھا!

بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ بن سکے گا!

اور اب یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ وہ قائم بھی رہ سکے گا یا نہیں!

ایٹلی اور چرچل کی مثال

دوسری جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد مسٹر ایٹلی نے مسٹر چرچل سے نئے انتخابات کا مطالبہ کیا، مسٹر چرچل نے یہ مطالبہ فوراً منظور کر لیا، اور فوری انتخابات کے احکام صادر کر دیئے، بظاہر انہوں نے یہ بات مان لی تھی، لیکن درحقیقت یہ بہت بڑا نفسیاتی حربہ تھا، مسٹر ایٹلی یہ چاہتے تھے کہ انتخاب کا اعلان ہو، پروپیگنڈے کا موقع ملے، رائے دہندوں کو ہموار کرنے کی سہولت حاصل ہو، پھر الیکشن کا معرکہ سر کیا جائے، لیکن مسٹر چرچل یہ مہلت نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوری انتخابات کے احکام صادر کر دیئے، تاکہ مسٹر ایٹلی کچھ نہ کرسکیں ان کی پارٹی ہار جائے۔

لیکن انگلستان کی پبلک نے بیدار مغزی کا ثبوت دیا، فوری انتخابات کے باوجود مسٹر چرچل کی پارٹی ہار گئی، ایٹلی کی جماعت کو کامیابی ہوئی اور مزدور حکومت برطانیہ میں قائم ہو گئی —— گویا مسٹر چرچل

نے جو نقشہ بنایا تھا، وہ کامیاب نہ ہو سکا انہیں شکست ہوئی!

پُر فریب مفاہمت

بالکل یہی معاملہ قائدِ اعظم کے ساتھ کیا گیا! قائد اعظم یہ چاہتے تھے کہ اٹیلی کے اعلان کے مطابق جون ۱۹۴۸ء میں دونوں آزاد ملکوں کو اختیاراتِ حکومت سونپے جائیں تاکہ نظم و نسق میں کوئی فرق نہ پڑے، اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ تمام معاملات سرانجام پا جائیں، لیکن ماؤنٹ بیٹن جواہر لال کی دوستی رنگ لائی، فیصلہ کر دیا گیا کہ پاکستان کو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء اور بھارت کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اختیاراتِ حکومت تفویض کر دیئے جائیں گے، گویا اعلان کردہ مدت سے تقریباً ایک سال پہلے!

ایسا کیوں کیا گیا؟

اس میں مصلحت یہ تھی کہ ہندوستان کے پاس ایک جمی جمائی حکومت ہے سکریٹریٹ ہے، ایوان اسمبلی ہے، فوج ہے، خزانہ ہے، بین الاقوامی ساکھ ہے، تمام شعبہ ہائے حکومت برسرِ کار ہیں، ریلیں چل رہی ہیں، ٹکسال میں نوٹ چھپ رہے ہیں، سکے ڈھل رہے ہیں، اس کے برعکس پاکستان ایک نیا ملک ہے، جس کے پاس سکریٹریٹ اور ایوان اسمبلی تو کجا، دارالحکومت تک نہیں، جس کی پولیس منتشر ہے جس کی فوج نامکمل ہے، اور اس نامکمل فوج کا کچھ حصہ ملایا میں ہے، کچھ ہانگ کانگ میں، کچھ انڈونیشیا میں، کچھ جاپان میں، اس لئے کہ اب تک تو یہ فوج انگریزوں ہی کی فوج ہے، بھارت کے پاس آرڈیننس فیکٹری ہے، اسلحہ بنتے ہیں، بارود تیار ہوتی ہے، پاکستان کے پاس کوئی فیکٹری نہیں، تقسیم کے سلسلے میں جو سازو سامان جنگ اس کے حصے میں آیا ہے وہ بعد میں دیا جائے گا، پاکستان کے پاس روپیہ بھی نہیں، اس لئے کہ ابھی تک حساب فہمی نہیں ہوئی جب حساب فہمی ہوگی تب روپیہ دیا جائے گا، ابھی نہیں!

غرض پاکستان اس طرح بنا کہ گو اسکا شمار دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت میں ہوتا تھا اور گو وہ دنیا کی بڑی حکومتوں میں پانچویں نمبر پر تھا، لیکن اس کی بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ عزم و حوصلہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا، نہ روپیہ، نہ میز، نہ کرسی، نہ قلم، نہ دوات، نہ کاغذ، نہ رجسٹر نہ فوج، نہ پولیس، نہ ریل، نہ ڈاک و تار کا نظام، گویا،

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی !

یقین تھا کہ چند ہی روز میں پاکستان خود استدعا کرے گا، ہم آزادی سے در گزرے، ہمارا الحاق پھر سے کر لیجئے۔

بھارت کی زیادتیاں صرف ان حرکتوں پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ پاکستان کو ہست سے نیست کرنے کے لئے اور بھی بہت سے وسائل و ذرائع پوری بے تکلفی کے ساتھ عمل میں لائے گئے۔

ا۔ سندھ میں کوئی فساد (ہندو مسلم) نہیں ہوا تھا، نہ اس کا امکان تھا، لیکن ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق سندھ کے ہندوؤں نے پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ ترک وطن شروع کر دیا۔

اور وہ !

الف۔ تمام نقد سرمایہ لیتے گئے،

ب۔ تمام اسباب منقولہ لیتے گئے۔

ج۔ دوکانوں اور مکانوں کی بڑی بڑی پگڑیاں دن دہاڑے وصول کر لیں،

د۔ ملازمت سے بغیر کسی وجہ کے مستعفی ہو گئے، سندھ کا نظام حکومت ایسا کیوں ہوا

اس لئے کہ اسی طرح سندھ کا نظام حکومت مفلوج کیا جا سکتا تھا!

اور وہ ہو گیا! سپاہی موجود افسر غائب، افسر موجود سپاہی ندارد، میونسپلٹی خالی ہو گئی، پورٹ ٹرسٹ میں خاک اڑنے لگی، سندھ سکریٹریٹ سونا ہو گیا۔ سندھ کے مدرسے اور کالج ویران ہو گئے۔

صرف یہی نہیں!

سندھ کی تجارت انہی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ساہوکارہ کے یہ مالک تھے، بینک یہ چلا رہے تھے امپورٹ اکسپورٹ ان کے ہاتھ میں تھا، لین دین کے یہ مالک تھے!

ان کے جاتے ہی بینک بند ہو گئے۔ تجارت سرد ہو گئی، دوکانیں بند ہو گئیں، کاروبار شل ہو گیا!

——— بھارت سے جو مسلمان آئے تھے وہ لٹ کر، مٹ کر، پٹ کر، اتنی جلدی اس نقصان

عظیم کی تلافی نہیں کر سکتے ——— نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ خود چیخ اٹھیں گے ہمیں ایسا پاکستان نہیں چاہیئے

۲- فوج کا بڑا حصہ پاکستان سے باہر تھا ——— لہٰذا نظم و انتظام میں برابر خلل پڑ رہا تھا،

۳- فوج کے باہر رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت نے بالکل خلاف معاہدہ اور خلاف دستور و اصول ماؤنٹ بیٹن کی شہ پاکر مہاراجہ کشمیر سے ساز باز کیا، اور اس کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، اور پاکستان فریاد کے سوا کچھ نہ کر سکا، اس لئے کہ بے بس تھا!

۴- جوناگڑھ، ماناودر، مانگرول، کاٹھیاواڑ کی ان ریاستوں نے بھارت کے طے شدہ اصول کے مطابق پاکستان سے الحاق باقاعدہ کر لیا تھا لیکن بھارت نے اس الحاق کو تسلیم نہیں کیا، ان تینوں ریاستوں پر زبردستی قبضہ کر لیا، بلکہ مانگرول اور ماناودر کے فرماں رواؤں کو گرفتار بھی کر لیا،

۵- مغربی پنجاب میں ساٹھ لاکھ مہاجروں کا قافلہ داخل ہو رہا تھا جسے یہ نئی مملکت پناہ دینے پر اپنی بے سروسامانی اور بے بضاعتی کے باوجود مجبور تھی۔

۱- سرحد میں بھی کوئی خاص فساد نہیں ہوا تھا ——— سارے پاکستان میں کہیں بھی بہار اور گڑھ مکتیشر کی روایت نہیں دہرائی گئی تھی لیکن سرحد سے بھی ہندوؤں کا جبری انخلا حکومت ہند کی تحریک پر شروع ہو گیا تاکہ وہاں کا نظام بھی مفلوج ہو جائے، اور ہوا،

۷- صرف مشرقی پنجاب ہی سے نہیں اطراف و اکناف ہند سے مہاجر مسلمانوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں سب کچھ کھو کر پناہ ڈھونڈنے کے لئے آرہی تھیں، اس لئے نہ ان کی عزت محفوظ تھی، نہ جان، نہ مال، ——— یہ ایک اور مصیبت تھی جس سے پاکستان کو دوچار ہونا پڑا تھا۔

۸- پاکستان کے حصہ کا سارا فوجی سامان ہندوستان کے قبضہ میں تھا اور اس کے ملنے کی کم از کم فی الحال کوئی تدبیر نہیں نظر آرہی تھی،

۹- پاکستان کے حصہ کا سارا روپیہ بھی ہندوستان کی تحویل میں تھا، یہاں بھارت کے نوٹ چل رہے تھے، بھارت کا سکہ چل رہا تھا، اور پاکستان مجبور تھا کہ اس صورت حال کو برداشت کرے۔

۱۰- پاکستان کا کوئی بینک نہیں تھا، بھارت کا امپیریل بینک پاکستان کا خزانچی بنا ہوا تھا، اور

پاکستان اس معاملہ میں بھی بے بس اور بے کس تھا کہ اس صورت حال کو برداشت کرے۔

۱۱۔ بیمہ کمپنیاں بھی زیادہ تر ہندوؤں کی تھیں، اور ان کے مالک اپنے ساتھ سب کچھ لے کے جا چکے تھے،

پاکستان متزلزل حالت میں

غرض جس اعتبار سے بھی دیکھئے حالات یہ تھے کہ بظاہر پاکستان کے قائم رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا، ہر آن یہ اندیشہ تھا کہ وہ فنا ہو جائے گا، چنانچہ بھارت کے مدبرین، سیاست داں، وزرا علی الاعلان پاکستان کی اقتصادی حالت کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور پیشین گوئی کیا کرتے تھے کہ چند دنوں یا ہفتوں سے زیادہ پاکستان اپنی آزادی نہیں قائم رکھ سکے گا، اور بظاہر یہ پیشین گوئیاں، قرینہ قیاس سے بالکل مطابق تھیں!

نگاہِ مردِ مومن کا کرشمہ

لیکن اقبال کا یہ قول صرف شاعری نہیں حقیقت ہے۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

پاکستان بننے کے بعد قائد اعظم صرف ایک سال زندہ رہے اور اس ایک سال کی مختصر مدت میں پاکستان کا شمار اقتصادی سیاسی اور عسکری حیثیت سے دنیا کی باوقار مملکتوں میں ہونے لگا،

۱۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان قائم ہو گیا، اور اس نے فوراً ہی نظام مالیات کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۲۔ فوج نامکمل تھی۔ ابتر تھی، منتشر تھی لیکن تھوڑے سے وقفہ میں یہی فوج مکمل بن گئی، مجتمع ہو گئی، بھارت نے ساز و سامان جنگ روک لیا، لیکن دوسرے ممالک سے خرید اگیا۔

۳۔ مالی حالت بڑی سقیم تھی، خصوصاً اس لئے کہ بھارت نے وہ روپیہ روک لیا تھا جو پاکستان کے حصہ کا اس کے قبضہ میں تھا، لیکن پہلا میزانیہ قیام پاکستان کے معاً بعد وزیر مالیات نے اسمبلی میں جو پیش کیا وہ توفیر کا بجٹ تھا!

۴۔ بار بار اقلیتوں کو دہشت زدہ کیا جانے لگا کہ پاکستان میں انہیں آسودگی نہیں حاصل ہو گی، ظلم ہو گا ان پر، ان کی جان، مال، آبرو ہر چیز خطرہ میں رہے گی، ان کے شہری حقوق چھین لئے

جائیں گے، ان کی شہری آزادی سلب کر لی جائے گی، لیکن قائد اعظم نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اقلیتوں کے پاکستان میں اتنے ہی پر جوش اور مخلص نگہبان ہیں، جتنے بھارت میں مسلم اقلیت کے پر جوش اور مخلص نگہبان تھے۔

۵- غیر ممالک اس نوزائیدہ مملکت کے نام سے بھی ناواقف تھے، قائد اعظم نے مختلف ممالک میں ثقافتی وفود بھیجے اور ان وفود کے ذریعہ دنیا کو پاکستان، اسکے وجود اس کی اہمیت اور اس کی حیثیت سے روشناس کرایا۔

۶- پاکستان جب قائم ہوا تو برطانیہ کے ہائی کمشنر کے سوا کوئی غیر ملکی نمائندہ کراچی میں موجود نہیں تھا لیکن قائد اعظم نے غیر ممالک سے ربط و تعلق کا سلسلہ فوری طور پر شروع کر دیا، اور چند ہی روز میں نہ صرف جملہ ممالک اسلامیہ سے بلکہ امریکہ، روس، فرانس اور دنیا کی دوسری بڑی مملکتوں سے سفارتی روابط قائم ہو گئے۔

۷- بھارت سے اگرچہ تلخی موجود تھی، اور بھارت کے ارباب حل وعقد کے نت نئے بیانات اس تلخی میں اور اضافہ کر رہے تھے لیکن قائد اعظم نے دوسرے ممالک کی طرح بھارت سے بھی اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی سرگرم کوشش کی۔

۸- یہ بات اصولی طور پر طے ہو گئی تھی کہ اگرچہ اب پاکستان اور بھارت دو جدا جدا مملکتیں ہونگی لیکن ان کے باشندوں کے مابین صدیوں سے جو تعلقات چلے آرہے ہیں ان کا تقاضہ یہ ہونا چاہیئے کہ جس طرح امریکہ اور کناڈا جداگانہ وجود رکھنے کے باوجود رسل ورسائل اور آمدورفت کے اعتبار سے ایک ہیں، اسی طرح بھارت اور پاکستان بھی رہیں گے، چنانچہ قائد اعظم نے ان دونوں ممالک کے مابین پرمٹ یا پاسپورٹ کا کبھی خیال نہیں کیا، لیکن بھارت نے اس معاملہ میں پہل کی اور پرمٹ کی پابندی سفر پر لگا دی!

۹- یہ بات بھی اصولی طور پر دونوں مملکتوں کے مابین طے پا چکی تھی کہ بھارت اور پاکستان میں سے جو جہاں رہنا چاہے رہے، اس پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوگی، لیکن بھارت نے اس معاملہ میں بھی طے شدہ

اصول سے انحراف کیا، اور نقل وطن کرنے والے مسلمانوں کی جائیدادوں پر، کمپنیوں کے حصص پر، بینک کے روپیہ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، بلکہ صرف اسی پر کافی نہیں سمجھا، ایک نئی اصطلاح وضع کی، "انٹنڈنگ ایولی" یعنی "عازم تخلیہ" یہ اتنا عام قانون تھا کہ جس مسلمان کو چاہا عازم تخلیہ قرار دے کے اس کے مال و منال اور جائیداد پر قبضہ کر لیا،

ان سب سے اہم مسئلہ مہاجرین کا تھا، قائد اعظم نے اسے حل کرنے کے لئے اپنی صحت تک کی پروا نہ کی، نہ اس کا لحاظ کیا کہ پاکستان کی مالی حالت کتنی سقیم ہے! انہوں نے ایک بیان میں یہ الفاظ واضح فرمایا کہ پاکستان کا دیوالیہ ہو جانا مجھے منظور ہے، مگر یہ منظور نہیں کہ مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں کسی قسم کا خلل پڑے۔

پاکستان مستحکم ہو گیا غرض قائد اعظم نے پاکستان کو ایک ہی سال میں اتنا مضبوط اور مستحکم کر دیا کہ جو لوگ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ یہ ختم ہو جائے گا یہ اعتراف کرنے پر اپنے تئیں مجبور پانے لگے کہ پاکستان اس لئے بنا ہے کہ قائم رہے، اس لئے نہیں کہ فنا ہو جائے!

اندرونی اور داخلی طور پر پاکستان کو بہت سی مشکلوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے عزم و استقامت کے ساتھ ان دشواریوں اور مشکلوں کا مقابلہ کیا، اور بالآخر کامیابی کے ساتھ ان پر غالب آیا!

آج پاکستان کا سکہ ہندوستان سے زیادہ قیمتی ہے، آج پاکستان کی فوج ہر خطرہ کا مقابلہ کر سکتی ہے، آج پاکستان کے باشندے پہلے سے کہیں زیادہ مطمئن ہیں!

ختم ہو گیا

ضمیمہ (۱)

پاکستان کے گورنر جنرل

۱۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح تھے۔ جنہوں نے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو نظم مملکت کا چارج لیا، ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان کا ایک مختصر سی علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

۲۔ قائد اعظم کے بعد پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل الحاج خواجہ ناظم الدین منتخب ہوئے، جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور قائد اعظم کے نہایت معتمد رفقاء میں سے تھے۔

۳۔ ۱۹۵۲ء میں خان لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین اپنے منصب سے مستعفی ہو گئے اور مسٹر غلام محمد جو اب تک وزیر مالیات تھے، اس منصب پر مامور کیے گئے، غلام محمد لاہور کے رہنے والے ہیں، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں، کئی سرکاری مناصب پر فائز رہ چکے ہیں، کچھ عرصہ تک ریاست حیدر آباد کے وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں، پھر وہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد بمبئی کی ٹاٹا کمپنی کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور بیش قرار مشاہرہ پر وہاں کام کرنے لگے، ٹاٹا کمپنی کے ارباب حل و عقد موصوف کی صلاحیت سے واقف تھے اور اس سے انہوں نے بہت اچھی طرح فائدہ اٹھایا!

ضمیمہ (۲)

پاکستان کے وزرائے اعظم

۱۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں تھے!

خاں لیاقت علی خاں کرنال کے رہنے والے تھے، علی گڑھ سے بی اے کیا، ولایت سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے یو پی (مظفر نگر) میں بھی جائیداد تھی، وہیں کی اقامت اختیار کر لی، یو پی کونسل کے ممبر رہے، سیاسیات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، چنانچہ مسلم لیگ میں بھی شریک رہے ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا جو انقلابی جلسہ بمبئی میں ہوا اس میں قائد اعظم کی نگاہ انتخاب نے انہیں پرکھ لیا اور سکریٹری بنا دیا، ان کی سکریٹری شپ بہت کامیاب رہی، ان کے دور میں مسلم لیگ نے وہ فروغ حاصل کیا کہ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی، عبوری دور حکومت میں (۱۹۴۶ء) چند ماہ کے لئے حکومت ہند کے وزیر مالیات رہے، انہوں نے جو میزانیہ بھارت اسمبلی میں پیش کیا۔ وہ "غریبوں کا بجٹ" کہلاتا ہے، عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دیں اور سرمایہ داروں پر محاصل عائد کئے۔

تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان قائم ہوا تو قائد اعظم نے انہیں پہلا وزیر اعظم منتخب کیا، لیاقت علیخان نے وزیر اعظم کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیئے وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے، پاکستان کی موجودہ عسکری قوت تمام تر انہی کی مخلصانہ اور سرگرم کوششوں کا نتیجہ ہیں، انہوں نے امریکہ کا بھی (۱۹۵۰ء) میں دورہ کیا، صدر ٹرومین نے ان کا شاہانہ استقبال کیا امریکہ کے اس دورہ میں لیاقت علی خاں نے اپنی لیاقت اور پاکستان کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا، انہیں امریکہ کے وائٹ ہاؤس میں اور کناڈا کے پارلیمنٹ میں تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا گیا

صلاحیت پر اعتماد ملے ایسی یادگار تقریریں کیں جن کی لطافت و لطیف میں مخالف بھی رطب اللسان ہیں۔

لیاقت علی خاں راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے (۱۹۵۱ء) کہ ایک بدبخت پاکستانی نے کسی نامعلوم جذبہ سے متاثر ہو کر پستول سے فائر کیا اور وہ وہیں شہید ہو گئے، قاتل وہیں ختم کر دیا گیا، اس لئے حادثہ کی اصلیت اور نوعیت کا صحیح سراغ اب تک نہ لگ سکا۔

لیاقت علی خاں کے حادثۂ شہادت پر نہ صرف پاکستان میں بلکہ دور دراز ممالک میں ماتم کیا گیا،

۲۔ لیاقت علی خاں کے حادثۂ شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین اس منصب پر مامور ہوئے، خواجہ صاحب کو نظم مملکت کا دیرینہ تجربہ ہے، ۱۹۲۴ء سے وہ بنگال کے وزیر چلے آ رہے ہیں ان کے عہد میں قادیانیت کے مسئلہ میں پنجاب ایک بہت بڑے بحران کا شکار رہا، غذائی حالت بھی ملک کی خراب ہو گئی، چنانچہ اپریل ۱۹۵۳ء کو جبکہ کچھ ہی دن پہلے یہ اسمبلی سے اپنا بجٹ منظور کرا کے اپنی حکومت کو اور زیادہ بظاہر مستحکم ثابت کر چکے تھے، گورنر جنرل نے اپنے مخصوص اختیارات کی رو سے ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا، انہوں نے گورنر جنرل کے اس اقدام کو غیر آئینی بتایا، لیکن اس کے بعد خاموشی سے ان کے فیصلہ کو قبول کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ اب سیاسیات کی پُرخار وادی سے عملی طور پر دستکش ہو چکے ہیں، اور ایک خاموش شہری کی طرح زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔

۳۔ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد مسٹر محمد علی نے وزارت عظمیٰ کا چارج لیا،

محمد علی صاحب، امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے بوگرا (بنگال) کے رہنے والے ہیں، امریکہ سے پہلے کناڈا میں اور وہاں سے پہلے برما میں پاکستان کے سفیر تھے، کسی سفارتی ضرورت کے سلسلہ میں عارضی طور پر اگرچہ تشریف لائے تھے، اور وزیر اعظم سے صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ وزیر اعظم صاحب برطرف کر دیئے گئے، اور وہ جگہ انہیں مل گئی جس کا پہلے سے کوئی خیال نہیں تھا!

محمد علی نے وزارت عظمیٰ کا جب چارج لیا تو وہ پاکستان کی مجلس دستور ساز کے ممبر تھے۔ نہ لیگ کے، لیکن جلد ہی اسمبلی نے ان کی وزارت عظمیٰ پر مہر توثیق ثبت کر دی، اور مسلم لیگ نے

صدر عالی قدر منتخب کر لیا، ان کے عہد کا سب سے قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مشرقی بنگال کی
...ن ساز کے انتخاب میں مسلم لیگ کو زبردست شکست ہوئی ۳۰۰ سے زیادہ ممبران کے ایوان میں
...ں بھی مسلم لیگ نہ حاصل کر سکی، چنانچہ اب مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے وسائل زیر غور ہیں!

ضمیمہ (۳) سیاسی اصلاحات

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے لے کر (۱۹۴۷ء) تقسیم ہند تک ہندوستان کن کن سیاسی اصلاحات سے دو چار ہوا، اس کا مختصر سا خاکہ درج ذیل ہے:۔

[illegible]ء اس سال مرکز اور صوبوں میں مجلس قانون ساز کا قیام عمل میں آیا تمام ممبر حکومت نامزد کرتی تھی تمام عہدے سرکاری ممبران کے ہاتھ میں تھے۔

[illegible]۱۸ء لارڈ رپن نے وائسرائے ہند نے حکومت برطانیہ کے مشورہ سے ہندوستان کے شہروں میں بلدیاتی نظام قائم کیا اور کسی حد تک اس میں نمائندہ عناصر کی جگہ نکالی۔

[illegible]ء پارلیمنٹ نے ایک مسودہ قانون منظور کیا جس کی رو سے مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی لیکن نامزدگی قائم رہی البتہ اب نامزدگی ذرا اصول کے ماتحت ہو گئی یعنی بلدیات، یونیورسٹی، سینیٹ، ایوان تجارت، زمیندار طبقہ اور دوسرے مفادات کے نمائندوں کو بھی نامزد کیا جانے لگا

[illegible]ء اسی سال "منٹو مارلے اصلاحات" کا نفاذ ہوا، ان اصلاحات کی رو سے نامزد ممبروں کے ساتھ منتخب ممبروں کا بھی اضافہ ہوا۔ لیکن عہدے اب تک حکومت کے حکام کے ہاتھ میں تھے۔

[illegible]ء اس سال "مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات" کا نفاذ ہوا۔ اور صیغہ جات منتقلہ و غیر منتقلہ کی تخصیص کے ساتھ صوبوں میں اور مرکز میں وزارتوں کا قیام عمل میں آیا۔ یعنی کچھ محکمے، مثلاً پولیس وغیرہ سرکاری حکام کے ہاتھ میں رہے یہ وزرا گورنر کے سامنے جواب دہ تھے۔ صوبوں کی کونسلوں کے سامنے جواب دہ نہیں تھے۔

[illegible] پارلیمنٹ نے انڈیا ایکٹ منظور کیا، فیڈریشن کا قیام ملتوی رہا اور صوبوں کو نام نہاد "آزادی" دے دی گئی۔ اب حکومت کے تمام صیغہ جات منتقلہ قرار دیئے گئے۔ اور منتخب نمائندوں کو وزارت کے بنانے کا حق دیا گیا۔ یہ وزیر صوبائی اسمبلیوں کے سامنے جوابدہ قرار پائے،

اس صفحہ سے پہلے والے صفحات کٹے ہوئے ہیں

Muhammad Yaqub